افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

الفاتحۃ ۱ — البقرۃ ۲

فاران فاؤنڈیشن

تدبرِ قرآن

— جلد اوّل —

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

تدبرِ قرآن

جلد اوّل

مقدمہ و تفاسیر

آیت بسم اللہ، سورۃ فاتحہ (۱)، سورۃ بقرہ (۲)

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن

لاہور — پاکستان

اہتمام — حسن خاور

مطبع — فلک شیر پرنٹرز، ابراہیم روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت — نومبر 2009ء — ذیقعد 1430ھ

ادارہ — فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

میں اس بات کا آرزومند تھا کہ میری ناچیز تالیفات، بالخصوص 'تدبرِ قرآن' کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری کوئی ایسا شخص اٹھائے جو اس فکر کا حامل ہو جو ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ آرزو پوری کر دی ــ عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ میرے پرانے رفقاء میں سے ہیں۔ وہ نہ صرف میرے فکر سے، بلکہ بحیثیتِ مجموعی پورے فکرِ فراہی سے بڑی گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اب اس فکر کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھا لیا ہے اور وہ اپنے ادارہ: فاران فاؤنڈیشن کو، اس کے قیام کے دن سے ہی، اسی مقصد کے لیے، مختص کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی صلاحیتوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں گے اور خدا نے چاہا تو آئندہ تھوڑے عرصہ میں، ان کے اور ادارہ 'تدبرِ قرآن و حدیث' کے تعاون سے وہ قرآنی فکر و فلسفہ بالکل واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے گا جو اس عہد کے چیلنج کا اصلی جواب ہے۔

اپنی ناچیز تالیفات سے متعلق اگر میں مشہور فلسفی، عمانوئیل کانٹ کے لفظوں میں یہ بات کہوں تو غالباً بے جا نہ ہوگی کہ "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے سوچا وہ سب لکھ دیا ہے، لیکن یہ ایک امرِ واقعی ہے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ اچھی طرح سوچ کر لکھا ہے"۔ تفسیر 'تدبرِ قرآن' پر میں نے اپنی زندگی کے پورے ۵۵ سال صرف کیے ہیں۔ جن میں سے ۲۳ سال صرف کتاب کی تحریر و تسوید کے نذر ہوئے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ وہ مدت بھی ملا دی جائے جو استاذِ امام رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کے غور و تدبر پر صرف کی ہے اور جس کو میں نے اس کتاب میں سمونے کی کوشش کی ہے تو یہ کم و بیش ایک صدی کا قرآنی فکر ہے جو آپ کے سامنے تفسیر 'تدبرِ قرآن' کی صورت میں آیا ہے۔ اگرچہ میں اپنے فکر کو حضرت الاستاذ علیہ الرحمۃ کے فکر کے ساتھ ملانا بے ادبی خیال کرتا ہوں، لیکن چونکہ واقعہ یہی ہے کہ میں نے عمر بھر استاذ ہی کے سُر میں اپنا سُر ملانے کی کوشش کی ہے اور میرا فکر ان کے فکر کے قدرتی نتیجہ ہی کے طور پر ظہور میں آیا ہے، اس وجہ سے یہ جوڑ ملانے کی جسارت بھی کر رہا ہوں۔ اگر یہ بے ادبی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے۔

میں نے یہ بات تعلّی کے طور پر نہیں، بلکہ بیانِ واقعہ کے طور پر کہی ہے اور مقصود اس سے یہ ہے کہ جو حضرات

میری کسی تحریر پر تنقید کرنے کا شوق رکھتے ہوں وہ شوق سے تنقید کریں، لیکن میرے دلائل ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں؛ اپنی اس خواہش کے احترام کی مجھ سے توقع نہ رکھیں کہ میں وہی کچھ لکھوں جو انھوں نے استادوں سے سنا اور اپنی مانوس کتابوں میں پڑھا ہے۔ کتاب و سنت کے سوا میں کسی چیز کو حجت نہیں سمجھتا اور غور و تدبر، میرے نزدیک، انسانی فضائل میں سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ فضیلت ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ ایک مدتِ دراز سے قرآن و حدیث پر غور و تدبر کی جو راہ مسدود ہے وہ اب کھل جائے اور اگر اس راہ میں مجھ سے کوئی خدمت بن آتی ہے تو مجھے اس سے جھجکنا نہیں چاہیے۔ اگر نیت نیک ہے تو ان شاء اللہ مجھے اس کوشش کا اجر ملے گا۔

یہاں اُن دو باتوں کا ذکر بھی قارئینِ تدبرِ قرآن کی دلچسپی کا باعث ہوگا جو حسنِ اتفاق کے طور پر اس کتاب سے وابستہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن مجید کی کل آیات ۶۲۳۶ ہیں اور ان کی تفسیر، تدبرِ قرآن کے کم و بیش اتنے ہی صفحات میں آئی ہے۔ گویا ہر آیت کی تفسیر کے لیے اس کتاب کا تقریباً ایک صفحہ مختص ہوا۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید کا زمانۂ نزول ۲۳ سال ہے اور تدبرِ قرآن کا زمانۂ تحریر و تسوید بھی ۲۳ سال ہے۔ میں اس باب میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ 'ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ'۔

اس تمہیدی گزارش کے بعد اب وہ چند اصلاحات بھی سن لیجیے جو تدبرِ قرآن کے نئے دور کے نئے ایڈیشن میں ملحوظ رکھی گئی ہیں:

۱۔ تمام جلدوں کو حجم کے اعتبار سے متوازن کرنے کے لیے کتاب کو ۸ کی جگہ ۹ جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ آخری چار جلدیں تو اپنی موجودہ صورت ہی پر باقی رہیں گی، لیکن ابتدائی چار جلدیں، پانچ جلدوں میں کر دی گئی ہیں تاکہ ان کے حجم کا عدم توازن دور ہو جائے۔
۲۔ پورے متن پر نہایت اہتمام سے نظرِ ثانی کی گئی ہے اور اس کام میں خود مصنف نے بھی حصہ لیا ہے۔
۳۔ بعض عنوانات مزید واضح کر دیے گئے ہیں تاکہ ان سے پوری رہنمائی حاصل ہو سکے۔
۴۔ عنوانات میں یکسانی و ہم رنگی کا اہتمام کیا گیا ہے۔
۵۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے، مزید ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا گیا ہے۔
۶۔ متنوں میں بعض جگہ کسی آیت کی تفسیر یا کسی لفظ کا ترجمہ سہواً رہ گیا تھا، اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔
۷۔ پچھلے ایڈیشنوں میں بعض جگہ آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ان کا حوالہ مجملاً دیا گیا تھا، اب وہ آیات پوری نقل کر دی گئی ہیں۔
۸۔ ہر صفحہ کی پیشانی پر زیرِ تفسیر سورہ کا نام اور اس کا نمبر درج کر دیا گیا ہے۔
۹۔ ہر جلد کے آخر میں نئی مفصل فہرستِ مضامین دی گئی ہے۔

خاص تفسیر سے متعلق مستقبلِ قریب میں جو کام انجام دینے کی سکیم ہے، ان میں سے دو کام بڑی اہمیت رکھنے والے ہیں:

ایک یہ کہ 'نظام القرآن' کے نام سے پورا متنِ قرآن مع ترجمۂ قرآن اپنی معنوی تقسیم کے لحاظ سے ——— مطابق ترجمۂ تدبرِ قرآن ——— ایک ہی جلد میں اس طرح چھاپنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ اس میں ہر سورہ سے متعلق تجزیاتی نوعیت کے اصولی مباحث شامل ہوں اور اس سے آیات کے باہمی نظم کی طرف بھی رہنمائی ہو تاکہ ایک عام قاری بھی قرآن مجید کی تلاوت کرے تو اس کے نظم کی رہنمائی سے، جو فہمِ قرآن کی کلید ہے، محروم نہ رہے۔ اسے عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ تدبرِ قرآن سے ترتیب دے رہے ہیں۔ اس کام کو نہایت اعلیٰ معیار پر انجام دینے کے لیے ضروری تیاریاں کر لی گئی ہیں۔ ان شاء اللہ یہ جلد سامنے آجائے گا۔ یہ کام اس کے علاوہ ہے جو برادرم خالد مسعود صاحب سلمہٗ تدبرِ قرآن پر مبنی ترجمہ و حواشی کے سلسلہ میں کر رہے ہیں۔

دوسرا یہ کہ مضامین کی جو فہرستیں تفسیر کی موجودہ جلدوں کے ساتھ لگی ہوئی ہیں ان کو مزید وسعت دے کر ایک جامع اور مکمل انڈکس کی شکل دی جا رہی ہے تاکہ یہ ان لوگوں کے لیے کار آمد ہو سکیں جو قرآن مجید پر ریسرچ کا کام کرنا چاہتے ہوں۔ یہ انڈکس ایک پوری جلد میں آجائے گا اور یہ جلد اس کتاب کی دسویں جلد ہو گی: تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

یہ اپنے ارادے اور منصوبے ہیں۔ ان میں سے پورے وہی ہوں گے جن کا پورا ہونا اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا۔ ہم اس کے فیصلوں پر پوری طرح راضی و مطمئن ہیں۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

لاہور

۲۲ر مئی ۱۹۸۳ء

۸ر شعبان ۱۴۰۳ھ

تدبرِ قرآن

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حامداً و مصلیاً

اس کتاب پر میں کوئی مقدمہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اب سے بہت پہلے میں نے 'تدبر قرآن' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کے غالباً دو تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ کتاب میں نے اسی مقصد کے لیے لکھی تھی کہ یہ میری تفسیر کے لیے مقدمے کا کام دے گی۔ چنانچہ ارادہ یہی تھا کہ اسی کو تفسیر کے شروع میں لگا دیا جائے گا، لیکن اب جب اس نگاہ سے اس کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بہت پہلے لکھے جانے کی وجہ سے اس میں بعض کمیاں بھی رہ گئی ہیں اور اس کے بعض مقامات میں غیر ضروری طوالت بھی ہے۔ اگر اسی کو بعینہٖ کتاب کے ساتھ جوڑ دیا گیا تو یہ اس کتاب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ چنانچہ دوسرے ضروری کاموں کو نظر انداز کر کے مجھے اس مقدمے کے لیے قلم سنبھالنا پڑا۔ وبیداللہ التوفیق۔

۱۔ اس تفسیر کا مقصد اور فہم قرآن کے وسائل

اس کتاب کے لکھنے سے میرے پیشِ نظر قرآن حکیم کی ایک ایسی تفسیر لکھنا ہے جس میں میری دلی آرزو اور پوری کوشش اس امر کے لیے ہے کہ میں ہر قسم کے بیرونی لوث اور لگاؤ اور ہر قسم کے تعصب و تحزب سے آزاد اور پاک ہو کر ہر آیت کا وہ مطلب سمجھوں اور سمجھاؤں جو فی الواقع اور فی الحقیقت اس آیت سے نکلتا ہے۔ اس مقصد کے تقاضے سے قدرتی طور پر میں نے اس میں فہم قرآن کے ان وسائل و ذرائع کو اصل اہمیت دی ہے جو خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کی زبان، قرآن کا نظم اور قرآن کے نظائر و شواہد، دوسرے وسائل جو قرآن سے باہر کے ہیں۔ مثلاً حدیث، تاریخ، سابق آسمانی صحیفے اور تفسیر کی کتابیں ـــ اگرچہ اپنے امکان کے حد تک میں نے ان سے بھی فائدہ اٹھایا ہے لیکن ان کو داخلی وسائل کے تابع رکھ کر ان سے استفادہ کیا ہے۔ جو باتیں قرآن کے 'الفاظ'، قرآن

کے نظم اور قرآن کی خود اپنی شہادتوں اور نظائر سے واضح ہوگئی ہے وہ میں نے لے لی ہے۔ اگر کوئی چیز اس کے خلاف میرے سامنے آئی ہے تو میں نے اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کے اعتبار سے اس کو جانچا ہے۔ اگر دینی و علمی پہلو سے وہ کوئی اہمیت رکھنے والی بات ہوئی ہے تو میں نے اس پر تنقید کر کے اس کو سمجھنے اور اس کے صحیح پہلو کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر بات کچھ یوں ہی سی ہوئی ہے تو اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بے ضرورت اس پر طبع آزمائی نہیں کی ہے۔

۲۔ فہمِ قرآن کے داخلی وسائل

اب اختصار کے ساتھ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مذکورہ دونوں قسم کے وسائل سے میں نے اس کتاب میں کس کس طرح فائدہ اٹھایا ہے۔ پہلے داخلی وسائل سے متعلق کچھ باتیں عرض کرتا ہوں۔

قرآن کی زبان:

قرآن کی زبان عربی ہے اور عربی بھی وہ عربی جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزے کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ جن و بشر میں سے کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ اس کے مثل کلام پیش کر سکے۔ شعرائے سبعہ معلقہ میں لبید آخری شاعر ہیں۔ ان کے ایک شعر پر سوقِ عکاظ میں تمام شعرائے وقت نے ان کو سجدہ کیا اور عرب کی روایت کے مطابق اعزاز کے طور پر ان کا قصیدہ خانہ کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔ یہ لبید بعد میں مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ جو شاعر تمام عرب شعرا کا مسجود، وقت کا ملک الشعرا اور عرب کی فصاحت و بلاغت کا مظہرِ کامل ہو، اس کے یوں ترک شعر پر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اب آپ شعر نہیں کہتے؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ اَبَعْدَ الْقُرْآن ؟ کیا قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد بھی اس کے لیے کوئی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔

قرآن کے اعجازِ بلاغت کے آگے سرافگندگی و سپر اندازی کا یہ اظہار و اعتراف اس عظیم شاعر کی طرف سے ہے جو اپنے زمانے میں، جیسا کہ گزرا، عرب کی تمام فصاحت و بلاغت کا نشان و علم تھا۔ جب وہ اس طرح قرآن کے آگے سربسجود ہو گیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عرب کی تمام فصاحت و بلاغت نے قرآن کی فصاحت و بلاغت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اس کے بعد کسی اور کے لیے قرآن کے آگے نگاہیں اونچی کرنے کا کیا امکان باقی رہا؟

اس درجے و مرتبے کے کلام کے زور و اثر اور اس کی خوبیوں اور لطافتوں کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو یہ کام، ظاہر ہے کہ وہ اس کے ترجموں، اس کی تفسیر اور اس کے لغتوں کے ذریعے سے نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے لیے اس کو اس زبان کا ذوق پیدا کرنا پڑے گا، جس میں وہ کلام ہے۔ کسی زبان کا ذوق پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے فطری رجحانِ طبیعت اور لطافتِ ذوق کے ساتھ ساتھ اس زبان کی مشق و ممارست ناگزیر ہے۔ برسوں کی محنت و مزاولت کے بعد کہیں آدمی میں کسی زبان کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور اگر زبان

اپنی مادری زبان نہ ہو تو یہ مشکل دو چند اور سہ چند ہو جاتی ہے۔

عربی زبان بالخصوص قرآن کی زبان کے معاملے میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ اس وقت وہ زبان کہیں بھی رائج نہیں ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ عرب اور عجم دونوں ہی میں اس وقت جو عربی پڑھی پڑھائی اور لکھی بولی جاتی ہے وہ اپنے اسلوب و انداز، اپنے لب ولہجہ اور اپنے الفاظ و محاورات میں اس زبان سے بہت مختلف ہے جس میں قرآن ہے۔ ہمارے اپنے عربی مدرسوں میں جو عربی پڑھی پڑھائی جاتی ہے وہ قلیوبی، نفحۃ الیمن یا زیادہ سے زیادہ حریری و متنبی کے قسم کی عربی ہے۔ عرب، شام اور مصر میں جو عربی رائج و مقبول ہے اس کا اندازہ ان ممالک کے رسائل و اخبارات سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ زبان عربی ضرور ہے، لیکن قرآن کی زبان سے یہ اتنی مختلف ہے کہ اس کا ذوق نہ صرف یہ کہ قرآن کی زبان کا کوئی ذوق نہیں پیدا کرتا بلکہ قرآن سے بیگانہ کرتا ہے۔

قرآن مجید جس زبان میں اترا ہے وہ نہ تو حریری و متنبی کی زبان ہے، نہ مصر و شام کے اخبارات و رسائل کی، بلکہ وہ اس ٹکسالی زبان میں ہے جو امرء القیس، عمرو بن کلثوم، زہیر اور لبید جیسے شعراء اور قس بن ساعدہ جیسے بلند پایہ خطیبوں کے ہاں ملتی ہے۔ اس وجہ سے جو شخص قرآن کی زبان کے ایجاز و اعجاز کا اندازہ کرنا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دورِ جاہلیت کے شعراء و اُدبا کے کلام کے محاسن و معایب کے سمجھنے کا ذوق پیدا کرے۔ اس کے بغیر کوئی شخص نہ تو یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ قرآن عربی زبان کے محاسن کا کیسا کامل نمونہ ہے اور نہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کے اندر وہ کیا سحر ہے جس نے تمام فصیحوں اور بلیغوں کو ہمیشہ کے لیے عاجز و درماندہ کر دیا۔

اگرچہ اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے شاعروں اور خطیبوں کے کلام کا بڑا حصہ دست بُردِ زمانہ کی نذر ہو گیا لیکن پھر بھی اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اصل مقصد کے لیے کفایت کرتا ہے۔ پچھلے پچاس سال میں بہت سے ایسے دواوین شائع ہو چکے ہیں جو پہلے ناپید تھے۔ شعرا کے کلام کے ایسے مجموعے بھی اب دستیاب ہیں جن میں کلامِ عرب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اگرچہ ان کے اندر منحول کلام بھی شامل ہے لیکن عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے ان کے خالص اور منحول میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ خطبائے جاہلیت کے جواہر ریزوں کے لیے پہلے جاحظ، مبرد اور ابن حدید وغیرہ کی کتابوں کی خوشہ چینی کرنی پڑتی تھی اب یہ خطبات الگ کر کے شائع کر دیے گئے ہیں۔ غرض طالب اور قدر دان کے لیے تربیتِ ذوق کا کافی سامان موجود ہے، ضرورت ہمت اور شوق کی ہے۔

اس تمام درازنفسی کو اس مفہوم میں نہ لیجیے کہ میں اس امر کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ میرے اندر یہ ذوق موجود ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ قرآن کی زبان کی نوعیت کیا ہے اور اس کے ادبی محاسن کو جانچنے اور تولنے کے لیے کسوٹی اور معیار کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں جو کچھ کر سکا ہوں وہ صرف اس قدر ہے کہ میں نے اس تفسیر کے لیے قلم اٹھانے سے پہلے ادبِ جاہلی کے اس تمام ذخیرے کو اچھی طرح پڑھ لیا ہے جو مجھے دستیاب ہو سکا ہے اور جو قرآن کی کسی ادبی، نحوی اور معنوی مشکل کے حل کرنے میں کسی پہلو سے مددگار ہو سکتا ہے۔ میں بے تکلف یہ بات بھی اس موقع پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ جو کچھ بھی میں نے کیا ہے اس میں زیادہ دخل مجھے نہیں بلکہ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔

انھوں نے اس طرح کی ساری چیزیں پڑھ کر قرآن کی تفسیر میں کام آنے والی ہر چیز کو نشان زد کر دیا تھا۔ میرا کارنامہ صرف اس قدر ہے کہ میں نے ان چیزوں کو اچھی طرح ہضم کر لیا ہے اور قرآن کی مشکلات حل کرنے، اس کے اسالیب و محاورات کو جانچنے اور اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کو پرکھنے میں ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔

صرف زبان و اسلوب ہی کے معاملے میں نہیں بلکہ اہل عرب کے معروف و منکر، ان کی معاشرتی زندگی کی خصوصیات، ان کی سوسائٹی میں خیر و شر کے معیارات، ان کے سماجی، تمدّنی اور سیاسی نظریات، روزمرہ کی زندگی میں ان کی دلچسپیاں اور مشاغل، ان کے مذہبی رسوم و معتقدات، غرض اس طرح کی ساری چیزوں کے سمجھنے میں جو مدد ان کے لٹریچر سے ملتی ہے، وہ کسی دوسری چیز سے نہیں ملتی۔ ان چیزوں سے صحیح واقفیت اس شخص کے لیے نہایت ضروری ہے جو قرآن کے اشارات و تلمیحات اور اس کی تعریضات و کنایات کو اچھی طرح سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہو۔ قرآن نے اس طرح کی ساری ہی چیزوں سے تعرض کر کے ان کے اندر جو خیر تھا اس کو اجاگر کیا ہے، جو شر تھا اس کو مٹایا ہے، اس وجہ سے اثنائے کلام میں ایسے اشارے اور کنائے بار بار آتے ہیں جن کی پوری وضاحت اس وقت تک مشکل ہے جب تک اسلام کی اصلاحات کے ساتھ ساتھ آدمی جاہلیت کی بدعات سے بھی واقف نہ ہو۔ مسئلے کو واضح کرنے کے لیے بعض مثالیں پیش کرنا مناسب ہوتا لیکن تفسیر میں جگہ جگہ اس کی مثالیں آئیں گی، اس وجہ سے یہاں صرف اشارے پر اکتفا کرتا ہوں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ عرب جاہلیت کے متعلق ہماری تاریخ کی کتابوں میں جو مواد ملتا ہے وہ زیادہ تر سطحی اور سرسری معلومات پر مبنی ہے۔ اس سے ان چیزوں کے باب میں کچھ زیادہ رہنمائی نہیں ملتی جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ عام طور پر ہمارے مورخوں نے اہلِ عرب کی جو تصویر کھینچی ہے وہ کسی انسانی معاشرے کی نہیں بلکہ ڈھوروں ڈنگروں کے کسی گلے کی ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ یہ اس قوم کی تصویر ہے جو کبھی ملت ابراہیم اور دین اسماعیل کی وارث رہی ہے۔ ایسا انھوں نے اس خواہش کے تحت کیا ہے کہ اس کے بغیر ان کے نزدیک اسلام کا اعجاز نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے خیال میں اسلام کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے ڈھوروں ڈنگروں کا ایک گلہ لیا اور تمام عالم پر اس کا پلہ بھاری کر دیا۔ اس بات کا ایک پہلو اگرچہ صحیح ہے لیکن اس میں ایک دوسرا پہلو نظر انداز ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر عرب فی الواقع ایسے ہی ڈھور ڈنگر ہوتے تو وہ قرآن جیسی کتاب کے حامل کیسے بن سکتے! میرے سامنے چونکہ ابتدا ہی سے یہ سوال رہا ہے اس وجہ سے مجھے تاریخ کی کتابوں سے قطع نظر کر کے عرب جاہلیت کے لٹریچر میں ان کی تصویر کا حُسن و قبح دونوں دیکھنے کی کوشش کرنی پڑی اور اس کوشش سے میری معلومات میں جو اضافہ ہوا میں نے اس تفسیر میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ میں نے زبان کے مسئلے کو محدود مفہوم میں نہیں بلکہ نہایت وسیع مفہوم میں لیا ہے۔ اصل شے جو قرآن کے سمجھنے میں کارآمد ہے وہ اس زبان و ادب کا اعلیٰ مذاق ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ جس میں یہ مذاق نہ ہو وہ محض لغت کی ورق گردانی سے قرآن کے محاسن کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لوگ

مجھ سے اکثر سوال کرتے رہتے ہیں کہ قرآن کی مشکلات حل کرنے میں کس لغت پر وہ اعتماد کریں؛ اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ یہ گمان رکھتے ہیں کہ اگر ان کو کوئی حسب منشا لغت مل گیا تو قرآن کی مشکلات کے لیے ان کو کلید ہاتھ آجائے گی حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ زبان کا مذاق رکھنے والے کے لیے تو لغت بے شک ایک کارآمد چیز ہے لیکن جس میں یہ مذاق پیدا نہیں ہوا ہے، اس کے لیے لغت ایک بے سود شے ہے۔ میں نے جس لغت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے وہ لسان العرب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب لسان، استعمالات اور شواہد و نظائر کے ذریعہ سے اکثر لفظ کے مختلف پہلو واضح کر دیتے ہیں۔ یہ چیز بہت مفید ہے۔ میرے نزدیک لسان کی اہمیت اسی پہلو سے ہے اور اسی مقصد کے لیے اس کی مراجعت کرنی چاہیئے۔ بعض اوقات قرآن کے کسی لفظ کے تحت اہل تاویل کے اقوال جو وہ نقل کر دیتے ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن عام لوگ اسی کو بڑی تحقیق سمجھتے ہیں۔ امام راغب کی مفردات کو بعض لوگ بڑا درجہ دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے تو فی الواقع اس کا بڑا درجہ ہے کہ وہ خالص قرآن کا لغت ہے لیکن حل مشکلات کے سلسلے میں جب کبھی میں نے اس کی مراجعت کی تو مجھے اس سے مایوسی ہی ہوئی۔

نظم :

نظم کلام کسی کلام کا ایسا جزو لاینفک ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے اور جو فی الواقع معجزہ ہے بھی، ایک بہت بڑے گروہ کے نزدیک نظم سے بالکل خالی کتاب ہے۔ ان کے نزدیک نہ ایک سورہ کا دوسری سورہ سے کوئی ربط و تعلق ہے، نہ ایک سورہ کی مختلف آیات ہی میں باہم کوئی مناسبت و موافقت ہے۔ بس مختلف آیات، مختلف سورتوں میں بغیر کسی مناسبت کے جمع کر دی گئی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فضول خیال ایک ایسی عظیم کتاب کے متعلق لوگوں کے اندر کس طرح جاگزیں ہو گیا ہے جس کے متعلق دوست دشمن دونوں ہی کو اعتراف ہے کہ اس نے دنیا میں ہل چل پیدا کر دی، اذہان و قلوب بدل ڈالے، فکر و عمل کی نئی بنیادیں استوار کیں اور انسانیت کو ایک نیا جلوہ دیا۔

اگر فی الواقع قرآن میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے تو پھر تو بہترین ترتیب نزولی ہوتی۔ جس ترتیب سے آیتیں نازل ہوئی تھیں اسی ترتیب کے ساتھ مصحف میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ مصحف کی ترتیب نزولی نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص ہدایات کے تحت خاص خاص آیات کے لیے خاص خاص مواقع معین کیے گئے ہیں۔ دوسری مناسب ترتیب مقداری ہو سکتی تھی یعنی آیتیں برابر برابر کی مقدار میں مختلف سورتوں میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہ صورت بھی نہیں ہے بلکہ سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی اور کتنی ہی چھوٹی سورتیں ہیں جو اپنی سے بڑی سورتوں پر مقدم ہیں۔ یہ سورتوں کی حد بندی بھی اس صورت میں کچھ غیر ضروری سی ہو کر رہ جاتی ہے اس لیے کہ حفاظ کی سہولت کے لیے تو یہ پاروں کی حد بندی کافی تھی لیکن ہر صاحب علم کو معلوم ہے کہ سورتوں کی حد بندی اور ان کی ترتیب تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی ہے درآنحالیکہ پاروں

کی تقسیم بہت بعد کی چیز ہے۔

اس خیال کی انھی کمزوریوں کی وجہ سے شروع ہی سے ہمارے ہاں علما کا ایک ایسا گروہ بھی رہا ہے جو قرآن میں نظم کا بڑی شدت سے قائل رہا ہے اور اس گروہ کے بعض اکابر نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ اتقان میں لکھتے ہیں۔

"علامہ ابوجعفر بن زبیر، شیخ ابوحیان نے نظم قرآن پر ایک خاص کتاب لکھی اور اس کا نام "البرھان فی مناسبۃ ترتیب سور القرآن" رکھا، اور ہمارے ہم عصروں میں سے شیخ برہان الدین بقاعی کی تفسیر "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" بھی اسی اصول پر لکھی گئی ہے۔"

علامہ سیوطیؒ نے خود اپنی ایک کتاب کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے نظم قرآن کے علاوہ قرآن کے معجزہ ہونے کے پہلو بھی واضح کیے ہیں۔ اسی سلسلے میں نظم قرآن کی اہمیت کا اعتراف وہ ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"ترتیب اور نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے لیکن اس کے مشکل ہونے کے سبب سے مفسرین نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ امام فخرالدین کو اس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام رہا ہے۔ ان کا قول یہ ہے کہ حکمت قرآن کا اصلی خزانہ اس کے نظم و ترتیب ہی میں چھپا ہوا ہے۔"

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں آیت وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا الآیہ (حٰم السجدہ) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں اتری ہے جو ازراہِ شرارت یہ کہتے تھے کہ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتاب الٰہی پر سخت ظلم ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی آیتوں میں باہمدگر کوئی ربط و تعلق ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کہنا قرآن حکیم پر بہت بڑا اعتراض کرنا ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کو معجز ماننا تو الگ رہا اس کو ایک مرتب کتاب کہنا بھی مشکل ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایک مربوط کلام ہے (اس کے بعد تقریباً اٹھارہ سطروں میں سورہ کی اجمالی تفسیر اور اس کا نظم بیان کر کے فرماتے ہیں کہ) ہر منصف جو حق پسند ہے تسلیم کرے گا کہ اگر سورہ کی تفسیر اس طرح کی جائے جس طرح ہم نے کی ہے تو پوری سورت ایک ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی اور اس کی تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کریں گی۔"

اسی سلسلہ کی ایک نہایت اہم شخصیت علامہ مخدوم مہائمیؒ بھی ہیں۔ ان کی تفسیر تبصیر الرحمان وتیسیر المنانؒ تفسیر مہائمی کے نام سے نہایت مشہور ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق آیات کا نظم بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی مسلک کے علم بردار ایک عالم علامہ ولی الدین ملویؒ ہیں، نظم قرآن سے متعلق ان کا ارشاد یہ ہے۔

"جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول چونکہ حالات کے تقاضوں کے تحت تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا ہے اس وجہ سے اس میں نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے، ان کو دھوکا ہوا ہے۔ قرآن مجید کا نزول بلاشبہ حسب حالات جستہ

جستہ ہؤا ہے لیکن اس کی ترتیب میں نہایت گہری حکمت ملحوظ ہے "۔

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہے کہ نظم قرآن سے متعلق ایک گروہ میں اگر غلط خیال موجود رہا ہے تو شروع ہی سے ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جس کا نظریہ بالکل صحیح ہے اور اس نے اپنے نظریے کے مطابق کتاب الٰہی کی خدمت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جو لوگ نظم کے منکر ہوئے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں منکر ہوئے ہیں کہ ان کے پاس انکارِ نظم کی کوئی دلیل موجود تھی یا وہ بے نظمی ہی کو کلام کا کوئی ہنر سمجھتے تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہیں قرآن مجید میں جگہ جگہ بے نظمی محسوس ہوئی اور وہ اس کا کوئی حل نہ پا سکے تو جو کمزور سے کمزور آڑ بھی انھیں ملی اسی میں انھوں نے پناہ لے لی۔

اگرچہ ان کے لیے صحیح روش تو یہی تھی کہ یہ قرآن کو متہم کرنے کے بجائے سارا الزام اپنی کوتاہیٔ ہمت پر لیتے لیکن انصاف کیجیے تو دو باتیں ان کے حق میں بھی جاتی ہیں جن کے سبب سے ان کو معذور قرار دینا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ نظم قرآن کی تلاش ہے ہی ایسا کام کہ ہر شخص اس کو کسی کے لیے اپنی زندگی وقف نہیں کر سکتا۔ دوسری یہ کہ جن لوگوں نے قرآن میں نظم کا دعویٰ کیا، ان کی خدمات کے اعتراف کے باوجود، یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں پیش کر سکے جو اس راہ میں قسمت آزمائی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھاتی۔ اوپر جن بزرگ مصنفوں کے اقوال و ارشادات نقل ہوئے ہیں ان میں سے تین بزرگوں کی کتابوں سے استفادے کا موقع مجھے نصیب ہؤا ہے۔ میں بلا کسی ارادۂ تحقیر کے عرض کرتا ہوں کہ ان میں سے کسی کی کتاب سے بھی مجھے کسی مشکل کے حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔ مہائمیؒ اور رازیؒ کی تفسیریں عرصے تک میرے مطالعے میں رہی ہیں۔ بلکہ رازیؒ کی تفسیر تو اب بھی پیشِ نظر رہتی ہے۔ یہ حضرات جس قسم کا نظم بیان کرتے ہیں اس کے متعلق یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ اس قسم کا نظم ہر دو غیر متعلق چیزوں میں جوڑا جا سکتا ہے۔

اصل ضرورت اس چیز کی تھی کہ لوگوں کے سامنے کوئی ایسی چیز آتی جو قرآن کے نظم کو اس طرح واضح کر دیتی کہ ہر صاف ذہن قاری کو وہ اپنے دل کی آواز معلوم ہونے لگتی، لیکن اس طرح کی کوئی چیز نہ صرف یہ کہ لوگوں کے سامنے آئی نہیں بلکہ جو چیزیں آئیں وہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مایوس کن ثابت ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ لوگوں نے نظم کی تلاش کو "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا مصداق سمجھ لیا۔

اس راہ میں سب سے پہلی کامیاب کوشش کی سعادت میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ کو حاصل ہوئی۔ مولانا نے بے شک اس کے حق میں نہایت مؤثر و دل نشین دلائل بھی دیے اور متعدد سورتوں کی تفسیر بھی انھوں نے لکھی جس کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہر سورہ نہایت حسین نظم کا نہایت دل آویز پیکر ہے۔ نظم کے دلائل پر مولانا کا ایک رسالہ "دلائل النظام" کے نام سے موسوم ہے۔ وہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے لیکن مولانا کی تفسیر کے کچھ اجزا اور تفسیر کا مقدمہ عربی اور اردو دونوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جو ذہین اور منصف مزاج آدمی بھی ان کا مطالعہ کرے گا وہ دو باتوں کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک تو اس بات کا کہ قرآن مجید کے اندر نظم کا انکار قرآن پر بہت بڑا ظلم ہے، دوسری اس بات کا کہ قرآن کے معارف و حِکَم کا اصل خزانہ درحقیقت اس کے نظم ہی کے اندر پوشیدہ ہے۔

اگر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی مہلت دی ہوتی کہ وہ اپنے اصولوں کے مطابق اپنی تفسیر مکمل کر پاتے تو یہ چیز ہر مخالف کے اوپر حجت قائم کر دیتی لیکن یہ ہماری محرومی ہے کہ ان کی تفسیر کا بہت تھوڑا حصہ لکھا جا سکا۔ خاص طور پر بڑی سورتوں میں سے تو کسی ایک سورہ کی تفسیر بھی وہ مکمل نہ کر سکے۔ یہ چیز بعض لوگوں کے ذہن میں کھٹک پیدا کرتی ہے کہ ممکن ہے مولانا کو چھوٹی سورتوں کے نظم بیان کرنے میں جو کامیابی ہوئی ہے، وہ کامیابی ان کو بڑی سورتوں کے نظم کھولنے میں نہ ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض بڑی سورتوں، مثلاً بقرہ اور آلِ عمران میں بظاہر نظم کی جو مشکلات نظر آتی ہیں، چھوٹی سورتوں میں اس طرح کی مشکلات نہیں ہیں۔ خاص طور پر بقرہ تو سمجھیے کہ بہت کٹھن مشکلات کا مجموعہ ہے۔ میں نے اسی خیال سے جب تفسیر پر کام شروع کیا تو اس کا آغاز فاتحہ سے کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور توفیق بخشی سے میں بقرہ اور آلِ عمران کی مشکلات حل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ چیز لوگوں کا تردد دور کرنے میں بڑی موثر ثابت ہوگی۔ مجھے اس کوشش میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ تو اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے ہی کر سکیں گے میں جو کچھ عرض کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے کسی مقام میں بھی بات بنانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر میرا ذہن و ضمیر پوری طرح مطمئن ہے۔ امکان ہے تو دو باتوں کا، جن سے میں اپنے آپ کو بری قرار نہیں دے سکتا۔ ایک اس کا کہ کہیں میری عقل نے ٹھوکر کھائی ہو اور میں بات کو سمجھ نہ سکا ہوں، دوسرے اس کا کہ کسی مسئلے کو کھولنے میں میرے قلم نے میری پوری مدد نہ کی ہو جس کے سبب سے بات ادھوری رہ گئی ہو۔

دو سوال اور ان کے جواب:

بعض لوگ جو نظم کی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ عموماً اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے دو سوال اٹھاتے ہیں۔ ایک یہ کہ نظم اگر ہے بھی تو اس کی حیثیت نکات اور لطائف کی ہے، اس کے اوپر قرآن کے سمجھنے اور نہ سمجھنے کا انحصار نہیں ہے، پھر اس پر اس شد و مد سے زور دینے کی کیا ضرورت ہے؟ دوسرا یہ کہ اگر قرآن میں نظم ہے تو آخر وہ اس قدر مخفی قسم کا کیوں ہے کہ صرف خال خال لوگ ہی اس کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو سکے اور وہ بھی برسوں کی جان کاہی اور دماغ سوزی کے بعد؟ یہاں مختصر طور پر ہم ان دونوں سوالوں کے جواب بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں۔

نظم کی قدر و قیمت:

نظم کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ محض علمی لطائف کے قسم کی ایک چیز ہے جس کی قرآن کے اصل مقصد کے نقطۂ نظر سے کوئی خاص قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک تو اس کی اصل قدر و قیمت یہی ہے کہ قرآن کے علوم اور اس کی حکمت تک رسائی اگر ہو سکتی ہے تو اسی کے واسطے سے ہو سکتی ہے۔ جو شخص نظم کی رہنمائی کے بغیر قرآن کو پڑھے گا وہ زیادہ سے زیادہ جو حاصل کر سکے گا وہ کچھ منفرد احکام اور منفرد قسم کی ہدایات ہیں۔

اگرچہ ایک اعلیٰ کتاب کے منفرد احکام اور اس کی مفرد ہدایات کی بھی بڑی قدر و قیمت ہے لیکن آسمان و زمین کا فرق ہے اس بات میں کہ آپ طب کی کسی کتاب المفردات سے چند جڑی بوٹیوں کے کچھ اثرات و خواص معلوم کر لیں اور اس بات میں کہ ایک حاذق طبیب ان اجزا سے کوئی کیمیا اثر نسخہ ترتیب دے دے۔ تاج محل کی تعمیر میں جو سالا استعمال ہُوا ہے وہ الگ الگ دنیا کی بہت سی عمارتوں میں استعمال ہُوا ہوگا لیکن اس کے باوجود تاج محل دنیا میں ایک ہی ہے۔ میں بلا تشبیہ یہ بات عرض کرتا ہوں کہ قرآن حکیم بھی جن الفاظ اور فقروں سے ترکیب پایا ہے وہ بہر حال عربی لغت اور عربی زبان ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں لیکن قرآن کی لاہوتی ترتیب نے ان کو وہ جمال و کمال بخش دیا ہے کہ اس زمین کی کوئی چیز بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جس طرح خاندانوں کے شجرے ہوتے ہیں اسی طرح نیکیوں اور بدیوں کے بھی شجرے ہیں۔ بعض اوقات ایک نیکی کو ہم معمولی نیکی سمجھتے ہیں حالانکہ اس نیکی کا تعلق نیکیوں کے اس خاندان سے ہوتا ہے جس سے تمام بڑی نیکیوں کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات ایک برائی کو ہم معمولی برائی سمجھتے ہیں لیکن وہ برائیوں کے اس کنبے سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہے جو تمام مہلک بیماریوں کو جنم دینے والا کنبہ ہے۔ جو شخص دین کی حکمت سمجھنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خیر و شر کے ان تمام مراحل و مراتب سے اچھی طرح واقف ہو ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ دِق کا پتہ دینے والی بیماری کو نزلے کا پیش خیمہ سمجھ بیٹھے اور نزلے کی آمد آمد کو دق کا مقدمۃ الجیش قرار دے دے۔ قرآن کی یہ حکمت اجزائے کلام سے نہیں بلکہ تمام تر نظم کلام سے واضح ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص ایک سورہ کی الگ الگ آیتوں سے تو واقف ہو لیکن سورہ کے اندر ان آیتوں کے باہمی حکیمانہ نظم سے واقف نہ ہو تو اس حکمت سے وہ کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح قرآن نے مختلف سورتوں میں مختلف اصولی باتوں پر آفاقی و انفسی یا تاریخی دلائل بیان کیے ہیں۔ یہ دلائل نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ جس شخص پر یہ ترتیب واضح ہو وہ جب اس سورہ کی تدبر کے ساتھ تلاوت کرتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ زیر بحث موضوع پر اس نے ایک نہایت جامع، مدلل اور شرح صدر بخشنے والا خطبہ پڑھا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اس ترتیب سے بے خبر ہو وہ اجزا سے اگرچہ واقف ہوتا ہے لیکن اس حکمت سے وہ بالکل ہی محروم رہتا ہے جو اس سورہ میں بیان ہوئی ہوتی ہے۔

یہ تو اس مسئلے کا علمی و نظری پہلو ہُوا۔ اس کا سیاسی و اجتماعی پہلو بھی نہایت اہم ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اس ملتِ مسلمہ کی شیرازہ بندی قرآن مجید کی حبل اللہ المتین ہی کے ذریعے سے ہوئی ہے اور تمام مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ سب مل کر اس رسی کو مضبوطی سے پکڑیں اور متفرق نہ ہوں۔ اس ہدایت کا یہ فطری تقاضا ہے کہ ہمارے درمیان جتنے بھی اختلاف پیدا ہوں ہم ان کے فیصلے کے لیے رجوع قرآن کی طرف کریں۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ خود قرآن کے بارے میں ہماری رائیں متفق نہیں ہیں۔ ایک ایک آیت کی تاویل میں نہ جانے کتنے اقوال ہیں اور ان اقوال میں سے اکثر ایک دوسرے سے متناقض ہیں لیکن کوئی چیز ہمارے پاس ایسی نہیں ہے جو یہ فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کون سا قول حق ہے۔ کسی کلام کی تاویل میں اختلاف واقع ہو تو اس اختلاف کو رفع کرنے

کے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش چیز اس کا سیاق و سباق اور نظام ہی ہو سکتا ہے لیکن قرآن کے معاملے میں یہ مصیبت ہے کہ لوگ اس کے اندر کسی نظام کے قائل ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاں جو اختلاف بھی پیدا ہوا اس نے اپنا مستقل علم گاڑ دیا۔ ہماری فقہ کے بہت سے اختلافات صرف بات کو اس کے سیاق اور نظم میں نہ دیکھنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر سیاق و نظم کو ملحوظ رکھا جائے تو اکثر مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔

فقہی اختلافات سے زیادہ سنگین معاملہ گمراہ فرقوں کی ضلالتوں کا ہے۔ ہمارے اندر جتنے بھی گمراہ فرقے پیدا ہوئے ہیں ان میں سے اکثر نے قرآنی آیات ہی کا سہارا لیا ہے۔ ایک آیت کو اس کے سیاق و سباق سے کاٹا اور پھر جو جی میں آیا اس کے اندر معنی پہنا دیے۔ ظاہر ہے کہ ایک کلام کو اس کے نظم اور سیاق و سباق سے الگ کر کے اس کے اندر آپ معنی پہنانے چاہیں تو بہت سے معنی پہنا سکتے ہیں جن میں سے بعض ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کا تصور اس قول کا کہنے والا کبھی نہیں کر سکتا۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں یہاں بہت سی ایسی آیتوں کا حوالہ دے سکتا ہوں جو تحریروں اور تقریروں میں نہایت غلط بلکہ گمراہ کن معنوں میں استعمال ہو رہی ہیں لیکن کسی کو بھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ذرا تکلیف کر کے یہ دیکھ لے کہ آیت کس موقع و محل کی ہے اور اس کا سیاق و سباق کیا ہے قرآن کے معاملے میں جیسا کہ میں نے عرض کیا اُن کے نزدیک نظم اور موقع و محل کا کوئی سوال ہی سرے سے نہیں ہے۔

میں نے اس تفسیر میں چونکہ نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یوں کہنا چاہیئے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ صحیح بات اس طرح منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ آدمی اگر بالکل اندھا بہرا متعصب نہ ہو تو اپنی جان تو قربان کر سکتا ہے لیکن اس سے انحراف برداشت نہیں کر سکتا۔

نظم کا اشکال:

اب آیئے اس سوال پر غور کیجیے کہ جب قرآن کے سمجھنے کے لیے نظم کی یہ اہمیت ہے تو آخر اس کو اتنا مخفی کیوں کر دیا گیا ہے کہ امام رازیؒ جیسے ذہین آدمی کی کوششیں بھی اس کو کھولنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکیں۔ اس سوال کے جواب کے کئی پہلو ہیں۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن کا یہ اشکال جو ہے یہ درحقیقت قرآن کا اشکال نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا اپنا اشکال ہے۔ قرآن نے اوّل اوّل جن لوگوں کو مخاطب کیا ان کو اس کے نظم کے بارے میں کوئی اشکال پیش نہیں آیا۔ زبان ان کی تھی، گرد و پیش ان کا تھا۔ حالات و مسائل اور اعتراضات و سوالات ان کے تھے۔ جو پارٹیاں قرآن کی مخاطب تھیں وہ سب سامنے موجود تھیں اور وہ جس قسم کے نظریات و عقائد رکھتی تھیں وہ سب معلوم و معروف تھے۔ اس وجہ سے قرآن مجید

کے لطیف سے لطیف اشارات اور مخفی سے مخفی کنایات بھی سمجھ لینے میں انھیں کوئی زحمت پیش نہیں آتی تھی جہاں آیات اتریں، بے تکلف ان کے ذہن ہر اشارے و کنایے کے محمل و مصداق تک پہنچ گئے اور انھوں نے کلام کے پورے مالہٗ و ماعلیہ کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ کم از کم ان لوگوں کے لیے تو اس کے سمجھ لینے میں کسی زحمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا جو سارے حالات سے خود متعلق بھی تھے اور ذہین بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا حال مذکورہ تمام اعتبارات سے ان سے بالکل مختلف ہے۔ نہ زبان ہماری ہے نہ حالات و مسائل ہمارے ہیں، زمانے میں بھی صدیوں اور قرنوں کا فرق ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کے سمجھنے میں ہمیں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ بالکل فطری ہیں۔ بقدرِ ضرورت عملی و اخلاقی تعلیمات و ہدایات کو سمجھ لینے کی بات تو اور ہے لیکن اگر کوئی شخص ربط و نظام کی باریکیوں اور کلام کے منطقی تسلسل اور اس کے اسرار و حقائق کو سمجھنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے نہ صرف زبان کی اجنبیت کو دور کرنا پڑے گا بلکہ ذہنی و فکری صعود کے ذریعے سے اس بُعدِ زمانی پر بھی غالب آنا پڑے گا جو اس کے اور قرآن کے زمانۂ نزول کے درمیان حائل ہے اور یہ چیز ظاہر ہے کہ ایک عظیم فکری و علمی جہاد کے بعد ہی ممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کے اجزا اور اس کی ترکیب میں بڑا فرق ہوتا ہے، اجزا کا علم بہت آسان ہوتا ہے لیکن ترکیب کے علم کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ نظم کا علم درحقیقت ترکیب کا علم ہے۔ یہ صرف یہی نہیں بتاتا کہ فلاں آیت سے فلاں آیت کا کیا جوڑ ہے بلکہ اس کا اصلی مقصد دین و اخلاق کے اجزا کے باہمی ربط کو واضح کرنا ہے ظاہر ہے کہ یہ مقصد ایک نہایت اعلیٰ علمی مقصد ہے۔ یہی چیز ہے جس کو حکمت کہتے ہیں۔ حکمت بہر حال ایک مخفی خزانہ ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص صرف یہ جاننا چاہے کہ قرآن نے عملی زندگی کے لیے کیا احکام دیے ہیں تو اس کے لیے اسے کسی بڑی کاوش کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص دین کی حکمت معلوم کرنا چاہے تو اسے بہر حال قرآن کے اندر معتکف ہونا اور اس کے لیے ساری زندگی کو قربان کرنا پڑے گا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ عربی زبان کی (بالخصوص اس زبان کی جس میں قرآن ہے) کچھ خصوصیات ہیں جو صرف اسی کے ساتھ خاص ہیں۔ بلیغ عربی زبان میں تعبیرِ مدعا کے لیے الفاظ کا سہارا اسی حد تک لیا جاتا ہے جس حد تک ناگزیر ہے اگر کوئی شخص اس حد سے آگے بڑھ جائے تو یہ کلام کا عیب ہے جس کو قائل کے عجز کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ عرب کے لوگ نہایت ذہین تھے اس وجہ سے وہ کلام کے اندر سے ان تمام اجزا کو حذف کر دیتے تھے جن کو ایک ذہین سامع خود سمجھ لیتا ہے یا اسے سمجھ لینا چاہیے۔ زمانۂ نزولِ قرآن کے ادب اور قرآن کے مطالعے سے اس حذف و ایجاز کے بہت سے اصول سامنے آتے ہیں جو ایک نئی ترتیب کے ساتھ میرے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی ایک کتاب —— کتاب الاسالیب —— میں جمع کر دیے ہیں۔ یہ میرے لیے ان تمام اصولوں کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف ایک بات محض بطورِ مثال عرض کرتا ہوں جس سے اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا جس کی طرف میں یہاں اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے اور اہلِ عرب کے درمیان ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ہم ایک بات کے بعد جب دوسری بات اس کی دلیل یا اس کی مثال یا اس کے نتیجہ یا اس کی تکمیل یا اس پر استدراک یا کسی اور پہلو سے کہیں گے تو اس رابطہ کو لازماً ظاہر کریں گے جو دونوں

کے تعلق کی نوعیت کو واضح کردے۔ اس مدعا کے لیے ہماری زبان میں بہت سے الفاظ اور اسلوب ہیں جن کا سہارا لیے بغیر ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ اہلِ عرب کا طریقہ اس معاملے میں ہمارے طریقہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اس طرح کے مواقع میں زیادہ اعتماد سامع کی ذہانت پر کرتے ہیں اور رابطہ کو حذف کر دیتے ہیں کہ سامع کا ذہن خود اس خلا کو بھرلے گا۔ اہل عرب اس حذف و ایجاز کو کلام کا حسن اور اس کی بلاغت قرار دیتے لیکن یہی چیز ہمارے لیے نظم کی مشکلات پیدا کردیتی ہے۔ ہم کلام کی مخفی کڑیوں سے بے خبر ہونے کی وجہ سے ہر بات کو الگ الگ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں تمام علم اوّلین و آخرین ہے۔ اسے رہتی دنیا تک باقی رہنا اور خلق کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس کے عجائب کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ یہ جس طرح آج سے کم و بیش چودہ سو سال پہلے دنیا کی رہنمائی کے لیے تمام صفات اور صلاحیتوں سے بھرپور تھی اسی طرح آج بھی ہے اور اسی طرح قیامت تک رہے گی۔ قومیں کے بعد قومیں اٹھیں گی اور ان میں سے جو اس کی طرف رجوع کریں گی وہ سب اپنے اپنے ظرف کے بقدر اس میں سے حصّہ پائیں گی، لیکن سب کے حصّہ پانے کے بعد بھی اس کے ذخیرۂ علم و حکمت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ سمندر سے ایک سوئی کی نوک پانی کی جتنی مقدار اٹھا سکتی ہے قیامت تک سب مل کر بھی اس سے زیادہ اس کے ذخیرۂ علم کو کم نہیں کر سکتے۔ یہ سارا خزانۂ علم اس کتاب کے اتارنے والے نے اس کے الفاظ اور اس کے نظام کے اندر ودیعت کر دیا ہے اس وجہ سے اس کی نوعیت کسی سپاٹ کتاب کی نہیں ہے کہ آپ اس کو دو چار مرتبہ پڑھ لیں اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو اخذ کر لیں بلکہ اس کی حیثیت ایک معدن کی سی ہے جس کے اندر جتنی ہی گہری کھدائی کی جائے اتنے ہی اس سے خزانے پر خزانے نکلتے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو صرف ایک دو بار پڑھ لینے کی ہدایت نہیں ہوئی بلکہ بار بار مختلف شکلوں اور مختلف مقداروں میں تلاوت کرتے رہنے اور اس پر برابر تدبر کرتے رہنے کی ہدایت ہوئی۔

قرآن کا نظام بحیثیت مجموعی:

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق ہر سورہ کے اندرونی نظم سے ہے۔ یعنی ہر سورہ ایک مستقل وحدت ہے، اس کا ایک علیحدہ عنوان و موضوع (عمود) ہے اور اس سورہ کے تمام اجزائے کلام اس عنوان و موضوع سے نہایت گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اب ایک قدم آگے بڑھ کر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن میں بحیثیت مجموعی بھی ایک مخصوص نظام ہے جس کا ایک پہلو تو بالکل ظاہر ہے جو ہر شخص کو نظر آسکتا ہے لیکن ایک پہلو مخفی ہے جو غور و تدبر سے سامنے آتا ہے۔ میں ان دونوں پہلوؤں پر بالاجمال روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ پہلے اس کے ظاہری پہلو پر نظر ڈالیے۔

قرآن کے مجموعی نظام کا ظاہری پہلو:

اگر آپ سورتوں کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالیں، جس ترتیب سے وہ مصحف میں ہیں تو ایک چیز آپ کو بالکل صاف نظر آئے گی کہ قرآن میں مکی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زائد مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے۔ ہر گروپ میں پہلے مکی سورتیں ہیں۔ ان کے بعد مدنی سورتیں ہیں۔

پہلا گروپ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے، مائدہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس گروپ میں فاتحہ مکی ہے باقی چار مدنی ہیں۔

دوسرا گروپ انعام اور اعراف دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور انفال و توبہ دو مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرے گروپ میں پہلے ۱۴ سورتیں یونس تا مومنون کی ہیں۔ آخر میں سورہ نور ہے جو مدنی ہے۔ اس گروپ کی دو سورتوں رعد اور حج کو بعض لوگوں نے مدنیات میں شمار کیا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس مسئلے پر ہم مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

چوتھا گروپ فرقان سے شروع ہوتا ہے، احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۸ سورتیں مکی ہیں۔ آخر میں ایک احزاب مدنی ہے۔

پانچواں گروپ سبا سے شروع ہوتا ہے، حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۱۳ سورتیں مکی ہیں اور آخری تین مدنی ہیں۔

چھٹا گروپ ق سے شروع ہو کر تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں پہلے سات مکی ہیں اس کے بعد دس مدنی، اس گروپ میں بعض لوگوں نے سورۂ رحمان کو مدنی قرار دیا ہے لیکن ہم سورہ کی تفسیر میں واضح کریں گے کہ یہ خیال بے بنیاد ہے۔

ساتواں گروپ ملک سے شروع ہو کر الناس پر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس میں بھی مکیات اور مدنیات کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح دوسرے گروپوں میں ہے لیکن اس کی سورہ دہر اور آخری بعض سورتوں کے بارے میں چونکہ اختلافات ہیں اس وجہ سے ان پر بھی ہم ان سورتوں کی تفسیر ہی میں بحث کریں گے۔

سورتوں کی یہ ترتیب، ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ یہ وہ ترتیب ہے جس ترتیب پر قرآن لوح محفوظ میں ہے۔ یہی ترتیب ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل امین، جیسا کہ حدیثوں سے ثابت ہے، ہر رمضان میں قرآن مجید کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ اسی ترتیب کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم بھی رمضان میں قرآن مجید سنتے سناتے تھے۔ اور اسی ترتیب کے مطابق سیدنا عثمان غنیؓ نے مصحف کی نقلیں تمام ممالکِ اسلامیہ میں بھجوائیں۔ اس وجہ سے یہ ترتیب حکمت سے خالی نہیں ہو سکتی۔

قرآن کے مجموعی نظام کا مخفی پہلو:

مذکورہ ساتوں گروپوں کی تلاوت اگر بار بار غور و تدبر کے ساتھ کی جائے تو اس ترتیب کی بہت سی حکمتیں واضح ہوتی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

(۱) جس طرح ہر سورہ کا ایک خاص عمود ہوتا ہے جس سے سورہ کے تمام اجزائے کلام وابستہ ہوتے ہیں اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہے اور اس گروپ کی تمام سورتیں اسی جامع عمود کے کسی خاص پہلو کی حامل ہیں، مطالب اگرچہ ہر گروپ میں مشترک سے ہیں لیکن اس اشتراک کے ساتھ جامع عمود کی چھاپ ہر گروپ پر نمایاں ہے۔ الگ الگ ہر گروپ کے موضوع پر بحث کے لیے موزوں جگہ یہاں نہیں ہے بلکہ تفسیر میں، ہر گروپ کی تمہید میں ہے۔ یہاں مثال کے طور پر اتنی بات ذہن میں رکھیے کہ کسی گروپ میں قانون و شریعت کا رنگ غالب ہے کہیں میں ملت ابراہیمؑ کی تاریخ اور اس کے اصول و فروع کا۔ کسی میں کشمکش حق و باطل اور اس کے بارے میں سنن الٰہیہ کے بیان کا حصہ نمایاں ہے، کسی میں نبوت و رسالت اور اس کے خصائص و امتیازات کا، کسی میں توحید اور اس کے لوازم و مقتضیات ابھرے ہوئے نظر آئیں گے کسی میں بعث، حشر و نشر اور ان کے متعلقات۔ آخری گروپ منذرات کا ہے جو بیشتر ان مکی سورتوں پر مشتمل ہے جو جھنجھوڑنے اور جگانے والی ہیں اور جنھوں نے پورے عرب میں ہلچل برپا کر دی۔

(۲) ہر گروپ میں جو مدنی سورتیں شامل ہیں وہ اپنے گروپ کے مجموعی مزاج سے بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہیں۔ ان کو اپنے گروپ کی مکی سورتوں سے وہی مناسبت ہے جو مناسبت کسی درخت کی جڑ اور اس کی شاخوں میں ہوتی ہے۔

(۳) ہر سورہ زوج زوج ہے۔ یعنی ہر سورہ اپنا ایک جوڑا اور مثنیٰ بھی رکھتی ہے اور ان دونوں میں اسی طرح کی مناسبت ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک میں جو خلا ہوتا ہے دوسری اس خلا کو بھرتی ہے۔ ایک میں جو پہلو مخفی ہے، دوسری اس کو اجاگر کرتی ہے اور اس طرح دونوں مل کر چاند اور سورج کی شکل میں نمایاں ہوتی ہیں۔ بڑی سورتوں میں اس کو بقرہ اور آل عمران کی مثال سے اور چھوٹی سورتوں میں معوذتین کی مثال سے سمجھیے۔ قرآن میں یہ نظام بالکل کائنات کے نظام کے مشابہ ہے۔ اس کائنات میں بھی ہر چیز جوڑا جوڑا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں بالعموم سورتوں کی تلاوت میں اس نسبت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ سورۂ قیامہ اور دہر، سورۂ صف اور سورۂ جمعہ، اعلیٰ اور غاشیہ آپ نمازوں میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔

(۴) صرف سورہ فاتحہ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورہ درحقیقت پورے قرآن کے لیے بمنزلہ دیباچہ ہے۔ اس سورہ کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ اس نے اپنے اندر پورے قرآن کے بنیادی حقائق جمع کر لیے ہیں۔ یہ اپنے گروپ کے لیے بھی دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے اور پورے قرآن کے لیے بھی۔ اس کے مختلف ناموں میں سے ایک نام کافیہ بھی ہے۔ اس سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ خود مکتفی سورت ہے، یہ اپنے ساتھ کسی دوسری

سورت کے ملنے کی محتاج نہیں ہے۔

(۵) بعض سورتیں ایسی بھی ہیں جن کی حیثیت ضمنی سورہ کی ہے۔ یعنی وہ کسی سورہ کے مستقل مثنی کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں بلکہ اپنی ماسبق کے کسی ایک اہم پہلو کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ اس کی ایک مثال سورۂ حجرات ہے جو اپنی سابق سورہ کی ایک آیت کی توضیح کی حیثیت رکھتی ہے۔ تفسیر میں اس کی وضاحت آئے گی۔

(۶) ہر گروپ پر الگ الگ تدبر کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ہر ایک کے اندر اسلامی دعوت کے تمام ادوار ابتدا سے لے کر انتہا تک نمایاں ہوتے ہیں۔ البتہ نمایاں ہونے کا پہلو ہر ایک کے اندر مختلف ہے، نیز ایجاز اور تفصیل کے اعتبار سے انداز الگ الگ ہیں۔

(۷) یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ اس ترتیب میں قانون و شریعت کے گروپ کو تمام دوسرے گروپوں پر مقدم کر دیا گیا ہے اور منذرات کے گروپ کو آخر میں کر دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انذار سے مقصود درحقیقت لوگوں کو غلط راہ سے موڑ کر صحیح راہ پر لگانا ہے اور صحیح راہ شریعت کی راہ ہے اس وجہ سے جو چیز غایت و مقصود کی حیثیت رکھتی ہے اس پر سب سے پہلے نگاہ پڑنی چاہیے۔ امت کو بحیثیت امتِ مسلمہ جو دولت عطا ہوئی ہے وہ درحقیقت شریعت ہی ہے جو اہل کتاب سے اس امت کو منتقل ہوئی اس وجہ سے پہلے گروپ میں اہل کتاب کی معزولی بھی بیان ہوئی اور شریعت اسلامی کی تفصیل بھی۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے پہلے گروپ اور اس کے آخری گروپ میں وہی نسبت ہے جو نسبت ایک عمارت اور اس کی بنیاد میں ہوتی ہے جہاں تک تعمیر کا تعلق ہے تعمیر سے پہلے بنیاد ہوتی ہے لیکن عمارت بن چکنے کے بعد سامنے جو چیز آتی ہے وہ عمارت ہوتی ہے بنیاد نیچے ہو جاتی ہے۔

جب میرے سامنے قرآن عظیم کے یہ ساتوں گروپ آتے ہیں اور ساتھ ہی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ میرا ذہن وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (۸۷۔ حجر) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن اس آیت سے متعلق چونکہ بہت سی باتیں بحث طلب ہیں اس وجہ سے اس پر مفصل گفتگو اپنے مقام ہی پر موزوں رہے گی۔

تفسیر قرآن بالقرآن:

تیسری چیز جو اس تفسیر میں میں نے بطورِ اصول کے پیشِ نظر رکھی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن کی مدد سے کی جائے۔ قرآن نے خود اپنی تعریف کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا کے الفاظ سے کی ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا — اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، کتاب باہم دگر مشابہ

مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ (۲۳۔ زمر) — جوڑے جوڑے۔

اسی طرح یہ بات بھی قرآن نے بار بار واضح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کی باتیں اور اپنی آیات مختلف

شکلوں اور گوناگوں پیرایوں سے پیش فرمائی ہیں۔ اس کے لیے تصریف " کا لفظ استعمال ہُوا ہے جس کے معنی گردش دینے کے ہیں۔ اگر آپ قرآن کی تلاوت کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک مضمون مختلف سورتوں میں بار بار سامنے آتا ہے۔ ایک مبتدی یہ دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ہی مضمون کی تکرار ہے لیکن قرآن پر تدبر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن تکرار محض سے بالکل پاک ہے۔ اس میں ایک بات جو بار بار آتی ہے تو بعینہٖ ایک ہی پیش و عقب اور ایک ہی قسم کے لواحق و تضمنات کے ساتھ نہیں آتی بلکہ ہر جگہ اس کے اطراف و جوانب اور اس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مقام کی مناسبت سے اس میں مناسبِ حال تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ ایک مقام میں ایک پہلو مخفی ہوتا ہے دوسرے مقام میں وہ واضح ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ اس کا اصل رُخ غیر معیّن ہوتا ہے، دوسرے سیاق و سباق میں وہ رخ بالکل معین ہو جاتا ہے بلکہ میرا ذاتی تجربہ اور مدتوں کا تجربہ تو یہ ہے کہ ایک ہی لفظ ایک آیت میں بالکل مبہم نظر آتا ہے دوسری آیت میں وہ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ایک بات کی دلیل سمجھ میں نہیں آتی لیکن دوسری جگہ وہ بالکل آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے۔

قرآن کا یہ اسلوب ظاہر ہے کہ اسی مقصد کے لیے ہے کہ اس کی ہر بات طالب کے ذہن نشین ہو جائے چنانچہ میں بطور تحدیثِ نعمت کے یہ عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر قرآن کی مشکلات جتنی خود قرآن سے واضح ہوئی ہیں دوسری کسی بھی چیز سے واضح نہیں ہوئی ہیں۔ میر انیسؔ نے کہا ہے کہ ع

اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ممکن ہے خود ان کے اپنے کلام کے بارے میں محض شاعرانہ مبالغہ آرائی ہو لیکن قرآن کے باب میں یہ بات بالکل حق ہے۔ ایک ایک بات اتنے گوناگون و بوقلموں اسلوبوں سے سامنے آتی ہے کہ اگر آدمی ذہنِ سلیم رکھتا ہو تو اس کو پکڑ ہی لیتا ہے۔

اس تفسیر کو پڑھنے والے انشاء اللہ محسوس کریں گے کہ میں نے نہ صرف آیات کے نظم اور ان کی تاویل کے تعین میں اصلی اعتماد قرآن ہی کے شواہد و نظائر پر کیا ہے بلکہ الفاظ و اسالیب کی مشکلات میں بھی بیشتر قرآن ہی سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں لغت یا نحو کی کتابوں کے حوالے نہیں دے سکتا تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ معانی و حقائق کی طرح قرآن اپنی ادبی و نحوی مشکلات کے حل کے لیے بھی سب سے زیادہ مستند مرجع و ماخذ ہے۔ اس حقیقت کو ہمارے پچھلے علما نے بھی تسلیم کیا ہے۔

۳- فہمِ قرآن کے خارجی وسائل

فہمِ قرآن کے خارجی وسائل میں سے جن جن چیزوں سے، جس نوعیت سے، میں نے اس تفسیر میں فائدہ اٹھایا ہے اب مختصر طور پر ان کا تذکرہ کروں گا۔

سنّتِ متواترہ و مشہورہ :

جہاں تک قرآن مجید کی اصطلاحات کا تعلق ہے، مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، عمرہ، قربانی، مسجد حرام، صفا مروہ، سعی، طواف وغیرہ، ان کی تفسیر میں نے سوفی صدی سنّت متواترہ کی روشنی میں کی ہے اس لیے کہ قرآن مجید اور شریعت کی اصطلاحات کا مفہوم بیان کرنے کا حق صرف صاحبِ وحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہے۔ آپ جس طرح اس کتاب کے لانے والے تھے اسی طرح اس کے معلم اور مبیّن بھی تھے اور یہ تعلیم و تبیین آپ کے فریضۂ رسالت ہی کا ایک حصّہ تھی۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم ہو کہ فلاں اصطلاح کا یہ مطلب خود آنحضرت صلعم نے بتایا ہے۔ سو جہاں تک معروف دینی اصطلاحات کا تعلق ہے یہ سوال کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اس قسم کی ساری اصطلاحات کا حقیقی مفہوم بالکل عملی شکل میں سنّت متواترہ کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور یہ سنّتِ متواترہ بعینہٖ انھی قطعی ذرائع سے ثابت ہے جن سے قرآن مجید ثابت ہے۔ اُمّت کے جس تواتر نے قرآن کریم کو ہم تک منتقل کیا ہے اسی تواتر نے دین کی تمام اصطلاحات کا عملی مفہوم بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر فرق ہے تو یہ فرق ہے کہ ایک چیز قولی تواتر سے منتقل ہوئی ہے، دوسری چیز عملی تواتر سے۔ اس وجہ سے اگر قرآن مجید کو ماننا ہم پر واجب ہے تو ان ساری اصطلاحات کی اس عملی صورت کو ماننا بھی واجب ہے جو سلف سے خلف تک بالتواتر منتقل ہوئی ہے۔ ان کی صورت میں اگر کوئی جزوی قسم کا اختلاف ہے تو اس اختلاف کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ پانچ وقت کی نمازیں سب جانتے اور مانتے ہیں اور اسی قطعیت کے ساتھ جانتے اور مانتے ہیں جس قطعیت کے ساتھ قرآن کو جانتے اور مانتے ہیں، رہا بعض جزوی امور میں کوئی فرق تو یہ فرق کوئی اہمیت رکھنے والی شے نہیں ہے۔ اس طرح کے معاملات میں دلائل کی روشنی میں جس پہلو پر بھی جس کا اطمینان ہو اس کو اختیار کر سکتا ہے۔

منکرین حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور عمرہ و قربانی کا مفہوم بھی اپنے جی سے بیان کرتے ہیں اور امّت کے تواتر نے ان کی جو شکل ہم تک منتقل کی ہے اس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق ترمیم و تغیر کرنا چاہتے ہیں، صریحاً خود قرآن مجید کے انکار کے مترادف ہے اس لیے کہ جس تواتر نے ہم تک قرآن کو منتقل کیا ہے اسی تواتر نے ان اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر وہ ان کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کو ماننے کے لیے بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔ اصطلاحات کے معاملے میں تنہا لغت پر اعتماد بھی ایک بالکل غلط چیز ہے۔ صوم و صلوٰۃ کا لغت میں جو مفہوم بھی ہو لیکن دین میں ان کا وہی مفہوم معتبر ہوگا جو شارع نے واضح فرمایا ہے۔

ان دینی اصطلاحات کے بارے میں مولانا فراہیؒ اپنے مقدمۂ تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"اسی طرح تمام اصطلاحات شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور ان سے جو اعمال متعلق ہیں تواتر و توارث کے ساتھ سلف سے لے کر خلف تک سب محفوظ رہے۔ اس میں جو

معمولی جزوی اختلافات ہیں وہ بالکل ناقابلِ لحاظ ہیں۔ شیر کے معنی سب کو معلوم ہیں اگرچہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں صورتوں میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ اسی طرح جو نماز مطلوب ہے، وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں، ہر چند کہ اس کی صورت و ہیئت میں بعض جزوی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی چیزوں میں زیادہ کھوج کرید کرتے ہیں وہ اس دینِ قیم کے مزاج سے بالکل ہی ناآشنا ہیں جس کی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے .... پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے، جن کی پوری حد و تصویر قرآن میں نہ بیان ہوئی ہو تو صحیح راہ یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور اخبارِ آحاد پر زیادہ اصرار نہ کرو ورنہ خود بھی شک میں پڑ جاؤ گے اور دوسروں کے اعمال کو بھی غلط ٹھہراؤ گے اور تمہارے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے۔"

تمام دینی اصطلاحات کے بارے میں اسی مسلک کو میں صحیح سمجھتا ہوں اور اسی کو میں نے اختیار کیا ہے۔ البتہ ان کے اسرار و مصالح میں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس باب میں رہنمائی قرآن اور صحیح احادیث سے حاصل کی ہے۔

احادیث و آثارِ صحابہ:

تفسیر کے ظنی ماخذوں میں سے سب سے اشرف اور سب سے زیادہ پاکیزہ چیز ذخیرۂ احادیث و آثار ہے۔ اگر ان کی صحت کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوتا تو تفسیر میں ان کی وہی اہمیت ہوتی جو اہمیت سنت متواترہ کی بیان ہوئی۔ لیکن ان کی صحت پر اس طرح کا اطمینان چونکہ نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے ان سے اسی حد تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جس حد تک یہ ان قطعی اصولوں سے موافق ہوں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ جو لوگ احادیث و آثار کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ ان کو خود قرآن پر بھی حاکم بنا دیتے ہیں وہ نہ تو قرآن کا درجہ پہچانتے ہیں نہ حدیث کا۔ برعکس اس کے جو لوگ احادیث و آثار کو سرے سے حجت ہی نہیں مانتے وہ اپنے آپ کو اس روشنی ہی سے محروم کر لیتے ہیں جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ قیمتی روشنی ہے۔ میں احادیث کو تمام تر قرآن ہی سے ماخوذ و مستنبط سمجھتا ہوں اس وجہ سے میں نے صرف انہی احادیث تک استفادے کو محدود نہیں رکھا ہے جو قرآن کی کسی آیت کے تعلق کی صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں بلکہ پورے ذخیرہ احادیث سے اپنے امکان کی حد تک فائدہ اٹھایا ہے۔ خاص طور پر حکمتِ قرآن کے مسائل میں جو مدد مجھے احادیث سے ملی ہے وہ کسی بھی دوسری چیز سے نہیں ملی۔ اگر کوئی حدیث مجھے ایسی ملی ہے جو قرآن سے متصادم نظر آئی ہے تو میں نے اس پر ایک عرصے تک توقف کیا ہے اور اسی صورت میں اس کو چھوڑا ہے جب مجھ پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ اس حدیث کو ماننے سے یا تو قرآن کی مخالفت لازم آتی ہے یا اس کی زد دین کے کسی اصول پر پڑتی ہے۔ جہاں تک صحیح احادیث کا تعلق ہے اس کی نوبت بہت کم آئی ہے کہ ان کی موافقت قرآن سے ہو ہی نہ سکے لیکن اگر کہیں ایسی صورت پیش آئی ہے تو وہاں میں نے بہرحال قرآن مجید کو ترجیح دی ہے اور اپنے وجوہ ترجیح تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔

شانِ نزول:

شانِ نزول سے متعلق میرا جو مسلک ہے اور جس کی میں نے اس کتاب میں پیروی کی ہے وہ میں اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔ مولانا اپنی تفسیر کے مقدمہ میں شانِ نزول سے متعلق لکھتے ہیں۔

"شانِ نزول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت اور کیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام برسرِ موقع حاوی ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا چند خاص امور کو مدنظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو۔ اور وہ امر یا امور جو کسی سورہ میں مدنظر ہوتے ہیں اس سورہ کے مرکزی مضمون کے تحت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر شانِ نزول معلوم کرنی ہو تو اس کو خود سورہ سے معلوم کرو۔ ..... جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کر سکتا ہے جس کے لیے نسخہ لکھا گیا ہے اسی طرح تم ہر سورہ سے اس کی شانِ نزول معلوم کر سکتے ہو۔ اگر کلام میں کوئی موضوع پیش نظر ہے تو اس کلام اور اس موضوع میں وہی مناسبت ہوگی جو مناسبت لباس اور جسم میں بلکہ جلد اور بدن میں ہوتی ہے۔ ... ... اور یہ جو روایتوں میں آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں واقعات کے بارے میں نازل ہوئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سورہ کے نزول کے وقت یہ احوال و مسائل درپیش تھے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں۔

"زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارے میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہٖ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے۔ اس سے مقصود نقلِ واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسبابِ نزول میں ایک قابلِ لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ آیت اسی زمانے میں نازل ہوگی ہو جس زمانے میں واقعہ پیش آیا۔"

زرکشیؒ کے اس بیان سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر امام رازیؒ نے سورہ انعام کی تفسیر میں وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا الآیہ کے تحت کیا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

"مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی ہے۔ اگر صورتِ معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارے میں یہ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا سببِ نزول فلاں واقعہ ہے"

پس ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے واضح ہوا، صورتِ معاملہ یہ ہے کہ جس وقت جو سورہ بھی نازل کی گئی ہے اس غرض سے نازل کی گئی ہے کہ جو معاملات محتاجِ توضیح و تشریح ہیں ان کی توضیح و تشریح کر دی جائے اور کلام ایسا ہو کہ اس کے نظم میں کسی قسم کا التباس و ابہام نہ ہو۔ جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات و

متقضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے کہ بسا اوقات وہ ایک خاص معاملے کا ذکر اگرچہ نظر انداز کر جاتا ہے لیکن اس کا کلام اس طرح کے تمام معاملات و احوال پر حاوی ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذکر تو کسی خاص معاملے یا کسی خاص شخص کا کرتا ہے لیکن کلام ایک عالم گیر بارش کی طرح بالکل عام و ہمہ گیر ہوتا ہے، اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے...

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی پیروی میں سر رشتۂ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ دینا ورنہ تمھاری مثال صحرا کے اس مسافر کی مانند ہو جائے گی جو اندھیرے میں کسی چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شانِ نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و آثار کے ذخیرے میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی موافقت کریں نہ کہ اس کے سارے نظم کو درہم برہم کر کے رکھ دیں۔"

میں نے شان نزول کے معاملے میں ٹھیک اسی طریقے کی پیروی کی ہے۔ واقعات کو صرف انھی آیات کی تفسیر میں اہمیت دی ہے جن میں کسی واقعہ کی تصریح یا تلمیح ہے اور ان کو بھی ان تمام غیر ضروری تفصیلات سے الگ کر کے لیا ہے جن کی تائید قرآن کے الفاظ یا اشارات سے نہیں ہوتی۔

کتبِ تفسیر:

تفسیر کی کتابوں میں سے تین تفسیریں بالعموم میرے پیشِ نظر رہی ہیں۔ تفسیر ابنِ جریرؒ، تفسیر رازیؒ، تفسیر زمخشریؒ۔ اقوال سلف کا مجموعہ تفسیر ابنِ جریر ہے، متکلمین کی قیل و قال اور عقلی موشگافیاں تفسیر کبیر میں موجود ہیں، نحو و اعراب کے مسائل کشاف میں مل جاتے ہیں۔ یوں تو یہ تفسیریں میرے فکر و مطالعہ کی زندگی کے آغاز ہی سے میرے پیش نظر رہی ہیں لیکن لکھتے وقت خاص طور پر میں نے ان پر ایک نظر ضرور ڈال لی ہے۔ ان کے علاوہ جو تفسیر کی کتابیں ہیں ان کی طرف میں نے صرف اسی صورت میں رجوع کیا ہے جب کوئی ایسی اہم بات پیش آئی ہے جس کے لیے ہر اس گوشے کو ٹٹولنا پڑا ہے جہاں سے کسی رہنمائی کی امید ہوئی ہے۔ ان کتابوں سے میرے استفادے کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میں نے کوئی بات مجرد ان کے اعتماد پر لکھ دی ہو بلکہ صرف وہی بات ان کی لی ہے جو ان اصولوں پر پوری اتری ہے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ ہمارا طریقہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ ہے کہ ہم ہر سورہ اور ہر آیت پر اس کے الفاظ، اس کے سیاق و سباق، اس کے نظم اور قرآن میں اس کے شواہد و نظائر کی روشنی میں غور کرتے ہیں۔ اس طرح جو باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں مزید اطمینان کے لیے ان کو تفسیروں میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ جس نتیجے تک ہم پہنچتے ہیں اس کی تائید اگر تفسیروں سے بھی ہو جاتی ہے تو اس سے مزید اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر تفسیروں سے اس کی تائید نہیں ہوتی تو اس پر غور و فکر جاری رکھتے ہیں تا آنکہ یا تو اپنی غلطی دلائل کے ساتھ واضح ہو جائے یا تفسیروں میں جو بات ہے اس کے ضعف کے وجوہ و دلائل سامنے آجائیں۔ ہمارے نزدیک تفسیروں سے فائدہ اٹھانے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں تفسیروں کے حوالے بہت زیادہ نہیں ملیں گے۔ صرف انھی مقامات میں ان کے حوالے میں نے دیے ہیں جہاں مسئلے کی اہمیت اس کی داعی ہوئی ہے یا قاری کے اطمینان کے نقطۂ نظر سے حوالے کی ضرورت و اہمیت

محسوس ہوئی ہے۔ اہم مقامات میں سے جہاں میں اپنی تائید میں کوئی حوالہ نہیں دے سکا ہوں وہاں اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں اتنے دلائل جمع کر دیئے ہیں جو انشاء اللہ اطمینان پیدا کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔

قدیم آسمانی صحیفے:

قرآن مجید میں جگہ جگہ قدیم آسمانی صحیفوں، تورات، زبور، انجیل کے حوالے ہیں۔ بہت سے مقامات پر انبیائے بنی اسرائیل کی سرگزشتیں ہیں۔ بعض جگہ یہود اور نصاریٰ کی تحریفات کی تردید اور ان کی پیش کردہ تاریخ پر تنقید ہے۔ اس طرح کے مواقع میں میں نے ان روایات پر اعتماد نہیں کیا ہے جو ہماری تفسیر کی کتابوں میں منقول ہیں۔ یہ روایات زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اس وجہ سے نہ تو یہ اہل کتاب پر حجت ہو سکتی ہیں اور نہ ان سے خود اپنے ہی دل کے اندر اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر میں نے بحث و تنقید کی بنیاد اصل ماخذوں یعنی تورات و انجیل پر رکھی ہے۔ جس حد تک قرآن اور قدیم صحیفوں میں موافقت ہے وہ موافقت میں نے دکھا دی ہے اور جہاں فرق ہے وہاں قرآن کے بیان کی حجت و قوت واضح کر دی ہے۔ تفسیر کی پہلی جلد میں، بقرہ اور آل عمران دونوں کی تفسیر میں، ایسے بہت سے معرکے ملیں گے جن کو پڑھ کر قارئین یہ اندازہ کر سکیں گے کہ فی الواقع قرآن کا اصل زور اسی وقت واضح ہوتا ہے جب کسی معاملے میں اس کے بیان کو تورات و انجیل کے مقابل میں رکھ کے جانچا جائے۔

ان مقابل بحثوں کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اسی طرح تورات زبور اور انجیل بھی اللہ ہی کے اتارے ہوئے صحیفے ہیں۔ اگر ان کے بدقسمت حاملوں نے ان صحیفوں میں تحریفیں نہ کر دی ہوتیں تو یہ بھی اسی طرح ہمارے لیے رحمت و برکت تھے جس طرح قرآن ہے۔ لیکن ان تحریفات کے باوجود آج بھی ان کے اندر حکمت کے خزانے ہیں۔ اگر آدمی ان کو پڑھے تو یہ حقیقت آفتاب کی طرح سامنے آتی ہے کہ ان صحیفوں کا سرچشمہ بھی بلاشبہ وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ میں ان کو بار بار پڑھنے کے بعد اس رائے کا اظہار کرتا ہوں کہ قرآن کی حکمت کے سمجھنے میں جو مدد ان صحیفوں سے ملتی ہے وہ مدد مشکل ہی سے کسی دوسری چیز سے ملتی ہے۔ خاص طور پر زبور، امثال اور انجیلوں کو پڑھیے تو ان کے اندر ایمان کو وہ غذا ملتی ہے جو قرآن و حدیث کے سوا اور کہیں بھی نہیں ملتی۔ حیرت ہوتی ہے کہ جن قوموں کے پاس یہ صحیفے موجود تھے وہ قرآن اور پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے کیوں محروم رہیں۔

تاریخِ عرب:

قرآن میں عرب کی پچھلی قوموں مثلاً عاد، ثمود، مدین اور قوم لوط وغیرہ کی تباہی کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ان کے معتقدات، ان کے انبیا کی دعوت اور اس دعوت پر ان کے ردعمل کی طرف اشارات ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی عرب میں آمد، ان کی قربانی، ان کی دعوت، ان کے ہاتھوں تعمیر بیت اللہ اور

ان کی برکت سے عرب کے اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، معاشی حالات کی تبدیلی کا مختلف اسلوبوں سے بیان ہے بعد میں قریش نے دینِ ابراہیمؑ کو جس طرح مسخ کیا اور بیت اللہ کو جو مرکزِ توحید تھا، جس طرح ایک بت خانہ بنایا اور اس کے نتیجے میں جو رسوم اور جو بدعتیں ظہور میں آئیں ان کے جگہ جگہ حوالے ہیں۔ ان ساری باتوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ اس دور کی پوری تاریخ پر آدمی کی نظر ہو۔ لیکن بدقسمتی سے اس دور کی کوئی مستند تاریخ موجود نہیں حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی تاریخ کا بھی وہ حصہ جو عرب میں ان کی آمد اور تعمیر بیت اللہ و قربانی وغیرہ سے متعلق تھا وہ، جیسا کہ تفسیر سورہ بقرہ میں معلوم ہوگا، یہود نے بالکل بدل ڈالا۔ مختلف کتابوں سے جو جستہ جستہ معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اگرچہ مفید ہیں لیکن کافی نہیں۔ عرب کے شعرا اور خطبا کے کلام میں ظاہر ہے کہ اس طرح کی باتوں کی طرف صرف اشارات مل سکتے ہیں جو اگرچہ نہایت کارآمد ہیں تاہم ان کی حیثیت اشارات کی ہے۔ میں نے جہاں جہاں سے کچھ معلومات حاصل ہونے کی توقع پائی ہے وہاں پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس کوشش سے مجھے بعض قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں جن سے میں نے قرآن کے بعض اشارات کھولنے میں مدد لی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں مجھے اصلی اعتماد قرآن مجید ہی پر کرنا پڑا ہے۔ میں نے تاریخ کی روایات میں سے انھی باتوں کو لیا ہے جن کی تائید مجھے خود قرآن سے بھی حاصل ہو گئی ہے اور یہ جو کچھ بھی ہوا ہے سب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد سے ہوا ہے۔

۴۔ قرآن کے طالبوں کے لیے چند ہدایات

یہاں تک میں نے فہم قرآن کے جن خارجی و داخلی شرائط کا ذکر کیا ہے یہ سب باتیں علمی و فنی نوعیت کی ہیں۔ میں نے خود ان کو ملحوظ رکھا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ انھیں ملحوظ رکھے بغیر کوئی شخص قرآن سے صحیح استفادہ نہیں کر سکتا لیکن ان کی حیثیت بہرحال وسائل کار اور اسلحہ کی ہے۔ جس طرح اسلحہ جنگ کے لیے ضروری ہیں اسی طرح یہ وسائل فہم قرآن کے لیے ناگزیر ہیں۔ مگر معلوم ہے کہ جنگ کے لیے صرف ہتھیار ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ اس کی فتح و شکست میں اصلی عامل کی حیثیت دل کو حاصل ہے۔ اگر آدمی کے سینے میں مضبوط اور بہادر دل نہ ہو تو اس کو ہزار اسلحہ سے لیس کر دیجیے لیکن وہ کامیاب لڑائی نہیں لڑ سکتا۔

برمخنث سلاحِ جنگ چہ سود!

اسی طرح فہم قرآن کے کام میں ان شرائط کی نگہداشت ہرچند ضروری ہے لیکن ان شرائط کی نگہداشت سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آدمی اپنے دل کے رُخ کو صحیح رکھے۔ اگر دل کا رخ صحیح نہ ہو تو ہر چیز بالکل بے سود ہو کے رہ جاتی ہے۔ اب میں چند باتیں دل کے رُخ کو صحیح رکھنے کے لیے عرض کرتا ہوں۔

نیّت کی پاکیزگی:

اس کے لیے سب سے پہلی چیز نیت کی پاکیزگی ہے۔ نیت کی پاکیزگی سے میرا مطلب یہ ہے کہ آدمی قرآن مجید کو صرف طلب ہدایت کے لیے پڑھے، کسی اور غرض کو سامنے رکھ کے نہ پڑھے۔ اگر طلبِ ہدایت کے سوا آدمی کے سامنے کوئی اور غرض ہوگی تو وہ نہ صرف قرآن کے فیض ہی سے محروم رہے گا بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ قرآن سے جتنا دور وہ اب تک رہا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ دور ہٹ جائے۔ اگر آدمی قرآن پر اس لیے خامہ فرسائی کرے کہ لوگ اسے مفسرِ قرآن سمجھنے لگیں اور وہ کوئی تفسیر لکھ کر جلد سے جلد شہرت اور نفع حاصل کر سکے تو ممکن ہے اس کی یہ غرض حاصل ہو جائے لیکن قرآن کے علم سے وہ محروم ہی رہے گا۔ اسی طرح اگر آدمی کے کچھ اپنے نظریات ہوں اور وہ قرآن کی طرف اس لیے رجوع کرے کہ اس کے ان نظریات کے لیے قرآن سے کچھ دلائل ہاتھ آجائیں تو ممکن ہے وہ قرآن سے کچھ الٹی سیدھی دلیلیں گھڑنے میں کامیاب ہو جائے لیکن ساتھ ہی وہ اپنی اس حرکت کے سبب سے اپنے اوپر قرآن کا دروازہ بالکل بند کر لے گا۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا صحیفہ بنا کر اتارا ہے اور ہر آدمی کے اندر طلبِ ہدایت کا داعیہ ودیعت فرمایا ہے۔ اگر اس داعیے کے تحت آدمی قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ بقدرِ کوشش اور بقدرِ توفیقِ الٰہی اس سے فیض پاتا ہے۔ اور اگر اس داعیہ کے سوا کسی اور داعیہ کی تحریک سے، کسی حقیر مقصد کے لیے وہ قرآن کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو لِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی کے اصول کے مطابق وہ وہی چیز پاتا ہے جس کا وہ طالب ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (اللہ اس کے ذریعہ سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے) اور اس کے بعد اس ہدایت و ضلالت کا ضابطہ بھی بیان فرما دیا ہے کہ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (اس کے ذریعے سے نہیں گمراہ کرتا مگر انھیں لوگوں کو جو نافرمان ہوتے ہیں) یعنی جو لوگ فطرت کی سیدھی راہ سے ہٹ کر چلتے ہیں اور ہدایت سے بھی ضلالت ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو وہی چیز دیتا ہے جس کے وہ بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص کعبہ جا کر بھی بتوں ہی کی پرستش کرنا چاہتا ہے تو وہ ہرگز اس بات کا سزاوار نہیں ہے کہ وہ توحید کی لذت سے آشنا ہو۔ اگر کوئی شخص پھولوں کے اندر سے بھی کانٹے ہی جمع کرنا چاہتا ہے تو وہ ہرگز اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کو پھولوں کی خوشبو نصیب ہو۔ جو شخص اپنے فسادِ طبیعت کے سبب سے علاج کو بھی بیماری بنا لیتا ہے وہ اسی لائق ہے کہ شفا حاصل ہونے کے بجائے اس کی بیماری ہی میں اضافہ ہو۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے ان لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (بقرہ-۱۶)

یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اختیار کیا تو ان کی یہ تجارت ان کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور وہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔

قرآن کو ایک برتر کلام مانا جائے:

دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک اعلیٰ اور برتر کلام مان کر اس پر غور کرنے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر دل میں قرآن مجید کی عظمت و اہمیت نہ ہو تو آدمی اس کے سمجھنے اور اس کے حقائق و معارف دریافت کرنے پر وہ محنت صرف نہیں کر سکتا جو اس کے خزائن حکمت سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اگر کسی رقبہ و زمین کے متعلق یہ علم ہو کہ وہاں سے سونا نکلتا رہا ہے اور کسی زمانہ میں اس سے کافی سونا نکل چکا ہے تو توقع یہی کی جاتی ہے کہ اگر کھدائی کی جائے تو یہاں سے سونا ہی نکلے گا اور پھر اس کی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کا سر و سامان کیا جاتا ہے اور اس پر اسی اعتبار سے محنت کی جاتی ہے۔ لیکن ایک معدن کو اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ گھورا ہے یا یہ کہ اگر یہاں محنت صرف کی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہاں سے کوئلہ یا چونا فراہم ہو سکے گا تو اس پر یا تو کوئی سرے سے اپنی محنت ضائع کرنا پسند ہی نہیں کرے گا اور اگر کرے گا تو صرف اس حد تک جس حد تک اس کو اس سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہوگی۔

بظاہر یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوگی کہ ایک کتاب کے متعلق اس کے سمجھنے سے پہلے ہی یہ حسن ظن قائم کر لیا جائے کہ وہ نہایت ہی عظیم اور برتر کتاب ہے لیکن غور کیجیے تو قرآن کے متعلق یہ پیشگی حسن ظن کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ قرآن مجید اپنے پیچھے ایک عظیم تاریخ رکھتا ہے۔ کوئی شخص اس کتاب پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتا کہ جتنا بڑا انقلاب دنیا میں اس کتاب نے برپا کیا ہے اتنا بڑا انقلاب کسی کتاب نے بھی نہیں برپا کیا۔ اس نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انسانی زندگی کے ہر گوشے کو نہایت گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ اس نے لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل ڈالے، افکار و نظریات بدل ڈالے، تہذیب و تمدن بدل ڈالے، آئین و قانون بدل ڈالے، مذاہب و ادیان بدل ڈالے۔ اتنی ہمہ گیر و عالمگیر تبدیلیاں لانے والی کتاب کسی شخص کے نزدیک اچھی بھی ہو سکتی ہے، بری بھی لیکن کسی کے نزدیک بھی غیر اہم نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان جو زندگی کے مسائل پر غور کرتا ہے، ان کو بے پروائی کے ساتھ نظر انداز کرنے کا عادی نہیں ہے، وہ اس کتاب کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ اس کتاب کے اندر وہ کیا چیز چھپی ہوئی ہے جس کے ذریعے سے اس نے اس دنیا کی کایا پلٹ دی؛ وہ یہ ضرور سمجھنا چاہے گا کہ آخر اس میں وہ کیا جادو پوشیدہ ہے کہ عربوں کی قوم، جس کو اونٹ چرانے کے سوا اور کسی بات کا بھی سلیقہ نہ تھا، اس کو پڑھ کر دفعتاً شتربانی کے درجے سے ترقی کر کے جہاں بانی کے مرتبے پر پہنچ گئی؛ وہ یہ ضرور معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ آخر اس کے اندر وہ کیا حکمت کا خزانہ بند ہے کہ جو قوم زیادہ سے زیادہ امرأ القیس اور زہیر کے درجے کے آدمی مشکل سے پیدا کرتی تھی اس کے اندر ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ کے مرتبے کے لوگ پیدا ہونے لگے؟

پھر یہ بات بھی ہے کہ دنیا کی آبادی کا ایک عظیم حصہ اس کو صرف ایک کتاب ہی نہیں مانتا بلکہ آسمانی اور خدائی کتاب اور لوح محفوظ سے اترا ہوا کلام مانتا ہے۔ اس کو ایک ایسا معجز کلام مانتا ہے جس کی نظیر نہ انسان پیش کر سکتے، نہ جنات۔ ایک ایسا کلام جس کے ماضی و حاضر کے متعلق یہ احساسات اور یہ شہادتیں موجود ہوں بہر حال ایک

اہمیت رکھنے والا کلام ہے اور آدمی اس کو سمجھنے کا صحیح حق اسی صورت میں ادا کر سکتا ہے جب وہ اس کی اسی عظمت و اہمیت کو سامنے رکھ کر اس پر غور کرے۔ اگر یہ اہمیت اس کے سامنے نہ ہو تو ممکن ہے کہ آدمی کا ذہن اس کو اس اہتمام کا مستحق نہ سمجھے جس کا وہ فی الواقع مستحق ہے۔

یہ تنبیہ میں نے اس لیے ضروری بھی ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے اندر قرآن مجید کے متعلق ایسی غلط فہمیاں موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں ہے کہ اس کو اس اعتنا و اہتمام کا مستحق سمجھا جائے جو اس سے حقیقی استفادے کے لیے ضروری ہے۔ یہ غلط فہمیاں قرآن کے ماننے والوں اور اس کے منکروں، دونوں کے اندر موجود ہیں۔

جو اس کے منکر ہیں وہ اس بات کا تو ایک حد تک اعتراف کرتے ہیں کہ ایک خاص دور میں اس کتاب کے ذریعے سے کچھ اصلاحات واقع ہوئیں۔ لیکن ان کے خیال میں اب وہ زمانہ گزر چکا۔ عرب کے بدووں کے لیے جن کے مسائل سیدھے سادے تھے، یہ کتاب مفید ہو سکتی تھی، لیکن موجودہ زمانے کے اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کے لیے یہ کتاب کافی نہیں۔

جو اس کے ماننے والے ہیں ان میں سے بہت سے لوگ اسے محض حرام و حلال کے بتانے کا ایک فقہی ضابطہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ فقہ کے احکام علیحدہ مرتب ہو جانے کے بعد ان کی نگاہوں میں اگر اس کی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہے تو صرف تبرک کے نقطۂ نظر سے باقی رہ گئی ہے۔ بہت سے لوگ اس کو بس متبرک کلمات اور دعاؤں کا مجموعہ سمجھتے ہیں جن کا ورد تو ضروری ہے لیکن وہ اس کو غور و فکر کا محل نہیں سمجھتے۔ بہت سے لوگ اس کو نزع کی سختیوں کو دور کرنے یا ایصال ثواب کی کتاب سمجھتے ہیں اور جب بھی وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اسی قسم کی غرض کے لیے متوجہ ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کو دفع آفات و بلیات کا تعویذ سمجھتے ہیں اور ان کی ساری دلچسپی اس کے ساتھ بس اسی پہلو سے ہوتی ہے ——— اس طرح کی غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے مسلمان نا ممکن ہے کہ قرآن حکیم سے وہ فائدہ اٹھا سکیں جس کے لیے فی الحقیقت وہ نازل ہوا ہے۔ ان لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ان کو ایک توپ دی گئی کہ وہ اس کے ذریعے سے شیطان کے قلعے مسمار کریں لیکن وہ اس کو مچھر مارنے کی مشین سمجھ بیٹھے۔

قرآن کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم :

قرآن حکیم سے صحیح استفادے کے لیے تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر، قرآن مجید کے تقاضوں کے مطابق، اپنے ظاہر و باطن کو بدلنے کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ ایک شخص جب قرآن مجید کو گہری نگاہ سے پڑھتا ہے تو وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کے تقاضے اور مطالبے اس کی اپنی خواہشوں اور چاہتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے تصورات و نظریات بھی قرآن سے بیشتر الگ ہیں اور اس کے معاملات و تعلقات بھی قرآن کے مقرر کردہ حدود سے ہٹے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے باطن کو بھی قرآن سے دور پاتا ہے اور اپنے ظاہر کو بھی اس سے بالکل منحرف دیکھتا ہے۔ اس فرق و اختلاف کو محسوس کر کے ایک

صاحب عزم اور حق طلب آدمی تو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ خواہ کچھ ہو میں اپنے آپ کو تا حدِ امکان قرآن کے مطالبات کے مطابق بنانے کی کوشش کروں گا۔ وہ ہر قسم کی قربانیاں کر کے، ہر طرح کے مصائب جھیل کر، ہر نوع کی ناگواریاں برداشت کر کے اپنے آپ کو قرآن کے مطابق بنا لینے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی نیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق پاتا ہے۔ لیکن جو شخص صاحبِ عزم نہیں ہوتا ہے وہ اس خلیج کو پاٹنے کی ہمت نہیں کرتا جو وہ اپنے اور قرآن کے درمیان حائل پاتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میں اپنے عقائد و تصورات کو قرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کروں تو مجھے ذہنی اور فکری اعتبار سے نیا جنم لینا پڑے گا۔ اسے یہ نظر آتا ہے کہ اگر میں اپنے اعمال و اخلاق کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کروں تو میرا اپنا ماحول میرے لیے بالکل اجنبی بن کے رہ جائے گا۔ اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے آپ کو ان مقاصد کی تکمیل میں سرگرم کروں جن کا مطالبہ مجھ سے قرآن کر رہا ہے تو میں جن فوائد اور جن لذات سے متمتع ہو رہا ہوں ان سے متمتع ہونا تو الگ رہا، عجب نہیں کہ جیل اور پھانسی کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں اپنے وسائل معاش کو قرآن کے ضابطۂ حرام و حلال کی کسوٹی پر پرکھوں تو آج جو عیش مجھے حاصل ہے اس سے محروم ہو کر شاید اپنی نانِ شبینہ کے لیے بھی فکر مند ہونا پڑے۔ ان خطروں کے مقابل ڈٹ جانا اور ان سے مقابلے کے لیے کمرِ ہمت باندھ لینا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ صرف مردانِ کار ہی ان گھاٹیوں کو پار کر سکتے ہیں۔ کمزور ارادے اور پست حوصلے کے لوگ یہیں سے اپنے رخ بدل لیتے ہیں۔ بعض، جو اپنی کمزوریوں پر زیادہ پردہ ڈالنے کے خواہشمند نہیں ہوتے، وہ تو یہ کہتے ہوئے اپنی خواہشوں کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کا راستہ ہے تو بالکل صحیح لیکن اس پر ہمارے لیے چلنا نہایت مشکل ہے اس لیے ہم اسی راستے پر چلتے رہیں گے جس پر چلتے آئے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنی کمزوریوں کو عزیمت اور اپنے نفاق کو ایمان کے روپ میں پیش کرنے کا شوق رکھتے ہیں، وہ اپنا یہ شوق مختلف تدبیروں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اضطرار و مجبوری کے بہانوں سے اپنے لیے ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال بناتے ہیں۔ بعض جھوٹی اور باطل تاویلات کے ذریعے سے باطل پر حق کا ملمع چڑھاتے ہیں۔ بعض وقت کے مصالح اور حکمت عملی کے تقاضوں کی آڑ تلاش کرتے ہیں۔ بعض کتابِ الٰہی میں اس قسم کی تحریفیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس قسم کی تحریفوں کے مرتکب یہود اور نصاریٰ ہوئے ہیں۔ بعض کفر و ایمان کے بیچ سے ایک راہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، قرآن کے جس حصے کو اپنی خواہشوں کے مطابق پاتے ہیں اس کو تو لے لیتے ہیں اور جس حصے کو اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں پاتے اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہ ساری راہیں شیطان کی نکالی ہوئی ہیں۔ ان میں سے جس راہ کو بھی آدمی اختیار کرے گا وہ اس کو سیدھا ہلاکت کے گڑھے کی طرف لے جائے گی۔ کامیابی اور فلاح کی راہ صرف یہ ہے کہ آدمی قرآن کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی ہمت کرے اور اس کے لیے ہر قربانی پر آمادہ ہو جائے۔ کچھ عرصے تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اس ارادے کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر آدمی اس آزمائش میں اپنے آپ کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس کے لیے کامرانی کی راہیں کھلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو خدا

اس کے لیے دوسرا دروازہ کھول دیتا ہے۔ اگر ایک ماحول سے وہ پھینکا جاتا ہے تو دوسرا ماحول اس کے خیر مقدم کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ اگر ایک زمین اس کو پناہ دینے سے انکار کر دیتی ہے تو دوسری سرزمین اس کے لیے اپنی آغوش کھول دیتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (عنکبوت - ۶۹)

اور جو ہماری راہ میں جد و جہد کریں گے ہم ضرور ان پر اپنی راہیں کھولیں گے اور اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔

تدبّر:

قرآن حکیم سے استفادے کے لیے چوتھی شرط تدبّر ہے۔ اس شرط کا ذکر خود قرآن مجید نے بار بار کیا ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰي قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں) صحابہ رضی اللہ عنہم جو قرآن کے مخاطب اول تھے وہ قرآن کو برابر تدبّر کے ساتھ پڑھتے تھے اور جو لوگ جتنا ہی تدبّر کرتے تھے وہ اتنے ہی قرآن کے فہم میں ممتاز تھے۔ بعض صحابہؓ نے خود اپنے بارے میں یہ شہادت دی ہے کہ انھوں نے سورۂ بقرہ پر پورے آٹھ سال صرف کیے۔ صحابہؓ نے قرآن مجید کے مطالعے کے لیے حلقے بھی قائم کیے تھے جن میں اہل ذوق حضرات اکٹھے ہو کر اجتماعی مطالعہ کرتے تھے تاکہ ایک دوسرے کے فکر و تدبّر سے استفادہ کر سکیں۔ اس طرح کے قرآنی حلقوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص دلچسپی تھی اور روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ فکر کے ان حلقوں کو ذکر کے حلقوں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ بعد میں خلفائے راشدین، خصوصاً حضرت عمرؓ، اس قسم کے حلقوں اور قرآن مجید کے ماہرین سے نہایت گہری دلچسپی لیتے رہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی حوصلہ افزائی جن جن طریقوں سے حضرت عمرؓ نے فرمائی ہے اس کو بیان کروں تو ایک مستقل داستان بن جائے[1]

محض تبرک کے طور پر الفاظ کی تلاوت کر لینا اور معانی کی طرف دھیان نہ کرنا حضرات صحابہؓ کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ طریقہ تو اس وقت سے رائج ہوا ہے جب لوگوں نے قرآن مجید کو ایک صحیفۂ ہدایت کے بجائے محض حصول برکت کی ایک کتاب سمجھنا شروع کر دیا۔ جب زندگی کے مسائل سے قرآن عظیم کا تعلق صرف اس قدر رہ گیا کہ دم نزع اس کے ذریعے سے جان کنی کی سختیوں کو آسان کیا جائے اور مرنے کے بعد اس کے ذریعے سے میت کو ایصال ثواب کیا جائے۔ جب زندگی کے نشیب و فراز میں رہنما ہونے کے بجائے اس کا مصرف صرف یہ رہ گیا کہ ہم جس ضلالت کا بھی ارتکاب کریں اس کا افتتاح اس کے ذریعے سے کریں تاکہ وہ برکت دے کر اس ضلالت کو ہدایت بنا دیا کرے۔ جب لوگوں نے اس کو ایک

---

[1] جن لوگوں کو ان باتوں کے حوالے مطلوب ہوں وہ میری کتاب "مبادی تدبر قرآن" پڑھیں۔ اس کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ پر بھی میرا ایک مضمون ملاحظہ ہو میثاق جلد نمبر ۲، عدد ۱، ۲۔ مضمون بعنوان "عہد صحابہؓ کے سب سے کم سن مفسر قرآنؓ" ہے جس میں میں نے دکھایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن کے تدبّر کے سلسلے میں کس کس طرح ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

تعویذ کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تاکہ جب وہ اپنے دنیوی مقاصد کی تکمیل کے لیے نکلا کریں تو قرآن ان کی حفاظت کرے کہ اس راہ میں ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔

دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس نے قرآن حکیم سے زیادہ اس بات پر زور دیا ہو کہ اس کا حقیقی فائدہ صرف اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جب اس کو پورے غور و تدبر کے ساتھ پڑھا جائے لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ یہی ایک کتاب ہے جو ہمیشہ آنکھ بند کر کے پڑھی جاتی ہے۔ معمولی سے معمولی کتاب بھی پڑھنے کے لیے لوگ کھولتے ہیں تو اس کے لیے سب سے پہلے اپنے دماغ کو حاضر کرتے ہیں لیکن قرآن کے ساتھ لوگوں کی یہ انوکھی روش ہے کہ جب اس کو پڑھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بالعموم سب سے پہلے اپنے دماغ پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دعا:

قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے کے لیے پانچویں شرط یہ ہے کہ اس کی مشکلات میں آدمی بددل اور مایوس ہونے یا قرآن مجید سے بدگمان یا اس پر معترض ہونے کے بجائے اپنی الجھن کو اپنے رب کے سامنے پیش کرے اور اسی سے مدد اور رہنمائی کا طلبگار ہو۔ قرآن میں تدبر کرنے والا کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے "قول ثقیل" کے نیچے دب گیا ہے جس کو اٹھانا اس کے لیے ناممکن ہو رہا ہے۔ اسی طرح وہ کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی ایسی مشکل آگئی ہے جس کی کوئی ایسی تاویل ممکن ہی نہیں ہے جس پر دل کو اطمینان ہو سکے۔ اس طرح کی عملی اور فکری مشکلوں اور الجھنوں سے نکلنے کا صحیح اور آزمودہ راستہ یہ ہے کہ آدمی اپنی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے مدد اور رہنمائی کے لیے دعا بھی کرتا رہے۔ شب کے پچھلے پہر میں ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھنا بھی اس مقصد کے لیے خاص چیز ہے۔ جہاں تک حکمت کا تعلق ہے اس کے دروازے تو آخر شب کی خلوتوں کے بغیر کھلتے ہی نہیں۔ مندرجہ ذیل دعا بھی اکثر پڑھتے رہنا چاہیے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ، ابْنُ عَبْدِكَ، ابْنُ اَمَتِكَ نَاصِيَتِىْ بِيَدِكَ، مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُكَ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ، سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِىْ وَنُوْرَ صَدْرِىْ وَجِلَاءَ حُزْنِىْ وَذِهَابَ هَمِّىْ وَغَمِّىْ۔

اے اللہ میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے۔ مجھ پر تیرا حکم جاری ہے۔ میرے بارے میں تیرا فیصلہ حق ہے۔ میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطے سے جو تیرا ہے جس سے تو نے اپنے کو پکارا ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یہ درخواست کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا مداوا اور میرے فکر و پریشانی کا علاج بنا دے۔

۵ - چند حرف خاص اس تفسیر سے متعلق

آخر میں چند باتیں خاص اس کتاب سے متعلق بھی عرض کرنی ہیں۔

میں بلا کسی شائبہ فخر کے محض بیان واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب میری چالیس سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ اس کتاب کی تیاریوں میں بسر کیا ہے اور اب اپنے بڑھاپے کی ناتوانیوں کا دور اسی کی تحریر و تسوید میں بسر کر رہا ہوں۔ اس طویل مدت میں میں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اور بہت سے تلخ و شیریں گھونٹ حلق سے اتارے ہیں لیکن اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ کسی دور اور کسی حال میں بھی میرا ذہنی و قلبی تعلق اس کتاب سے منقطع نہیں ہوا۔ میں نے اس ساری مدت میں جو کچھ پڑھا ہے اسی کو محور بنا کر پڑھا ہے جو کچھ سوچا ہے اسی کو سامنے رکھ کر سوچا ہے اور جو کچھ لکھا ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی سے متعلق لکھا ہے۔ میں نے قرآن حکیم کی ایک ایک سورہ پر ڈیرے ڈالے ہیں، ایک ایک آیت پر فکری مراقبہ کیا ہے اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک ادبی یا نحوی اشکال کے حل کے لیے ہر اس پتھر کے اٹھانے کی کوشش کی ہے جس کے نیچے مجھے کسی سراغ کے ملنے کی توقع ہوئی ہے اور یہ راز بھی میں برملا ظاہر کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی اس کام میں کوئی تکان یا افسردگی محسوس نہیں کی بلکہ ہمیشہ نہایت گہری لذت اور نہایت عمیق راحت کا احساس کیا ہے۔

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

میری چالیس سال کی محنتوں کے نتائج کے ساتھ ساتھ اس میں میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ۳۰-۳۵ سال کی کوششوں کے ثمرات بھی ہیں۔ مجھے بڑا فخر ہوتا اگر میں یہ دعویٰ کر سکتا کہ اس کتاب میں جو کچھ بھی ہے سب استاذ مرحوم ہی کا افادہ ہے اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ لیکن میں یہ دعوے کرتے میں صرف اس لیے احتیاط کرتا ہوں کہ مبادا میری کوئی غلطی ان کی طرف منسوب ہو جائے۔ مولاناؒ سے میرے استفادے کی شکل یہ نہیں رہی ہے کہ ہر آیت سے متعلق یقین کے ساتھ ان کی رائے میرے علم میں آگئی ہو، بلکہ میں نے ان سے قرآن حکیم پر غور کرنے کے اصول سیکھے ہیں اور ان کی رہنمائی میں پورے پانچ سال ان اصولوں کا تجربہ کرنے میں بسر کیے ہیں۔ پھر انھی اصولوں کو سامنے رکھ کر آج تک کام کرتا رہا ہوں۔ اس اعتبار سے اگرچہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ یہ سب کچھ استاذؒ ہی کا فیض ہے لیکن اس میں چونکہ بلاواسطہ افادے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ افادے کا بھی بہت بڑا حصہ ہے اس وجہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اس کا جو حصہ مستحکم اور مدلل نظر آئے اس کو استاذ مرحوم کا صدقہ سمجھیے اور جو بات کمزور یا غلط نظر آئے اس کو میری کم علمی پر محمول فرمائیے۔

اختصار کے خیال سے میں نے اس کتاب میں ہر آیت کے تحت صرف اسی حد تک بحث کی ہے جس حد تک اس کا اصل مدعا واضح کرنے کے لیے مناسب خیال کی ہے۔ آیت سے متعلق دوسرے ضمنی مباحث میں پڑنے سے بالارادہ احتراز کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد ایک ذہین قاری اس کے متعلقات کو خود اخذ کر سکتا ہے۔ جب تک ایک کلام کا موقع و محل متعین نہیں ہوتا اس وقت تک اس میں بڑے اختلاف کی گنجائش ہوتی

ہے، ہر ٹکڑے کے دسیوں بیسیوں مفہوم نکل سکتے ہیں۔ اس کے سبب سے اجتہاد و استنباط کا کام نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے لیکن موقع و محل کے معین ہو جانے کے بعد راہ نہایت مختصر ہو جاتی ہے۔ ہر آیت اپنے ابتدائی مفہوم کے ساتھ ساتھ اپنے لوازم بعیدہ کی طرف خود انگلی اٹھا کر اشارہ کرتی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن بیدار ہو اور یہ شرط ایک ایسی شرط ہے جو ہر علمی کتاب سے استفادے کے لیے ناگزیر ہے، چہ جائیکہ ایک تفسیر کی کتاب۔

اس کتاب میں دوسری تفسیروں کے حوالے زیادہ نہیں ملیں گے اس کی وجہ، جیسا کہ اوپر اصولی مباحث کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں، یہ ہے کہ اس کی بنیاد مروجہ طریقۂ تفسیر کی طرح تفسیر کی کتابوں پر نہیں ہے بلکہ براہ راست فہم قرآن کے اصلی وسائل و ذرائع پر ہے تاہم خاص خاص اہم مباحث میں ان تفسیروں اور ان ارباب تاویل کے حوالے بھی میں نے دیے ہیں جن کی تائید مجھے حاصل ہو سکی ہے۔ ان مواقع کے سوا بھی اگر میں چاہتا تو مجھے اپنی تائید میں حوالے مل جاتے لیکن میں نے اس کی زیادہ کوشش اس وجہ سے نہیں کی کہ میں چاہتا ہوں کہ ہر بات کو لوگ اس کے اساسی دلائل کی کسوٹی پر کس کر قبول کریں یا رد کریں۔

کتاب کو ثقالت سے بچانے کے لیے کلامِ عرب کے حوالے بھی میں نے زیادہ نہیں دیے ہیں۔ صرف بقدرِ کفایت ہی دیے ہیں۔ یہ کتاب اردو میں ہے اور اس کے پڑھنے والوں کی غالب تعداد ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہو گی جو عربی سے ناواقف ہوں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے شعر عرب کے حوالے نامانوس بھی ہوں گے اور غیر مفید بھی۔ اس کمی کی تلافی میں نے قرآن مجید کے نظائر و شواہد سے اچھی طرح کر دی ہے اور یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے سب سے زیادہ قابلِ اطمینان تفسیر ہے۔ تاہم یہ بات نہیں ہے کہ کلامِ عرب کو میں نے بالکل ہی نظر انداز کیا ہو، اہم ادبی اور نحوی اشکالات کے مواقع میں اس سے بھی میں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اس کے حوالے بھی نقل کیے ہیں۔

میں اپنے رب کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اس کتاب میں کسی ایک آیت کی بھی ایسی تفسیر نہیں کی ہے جس میں مجھے کوئی تردّد ہو۔ جہاں ذرا بھی کوئی تردّد ہوا ہے میں نے بے تکلف اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی عرض کرتا ہوں کہ کسی ایک مقام میں بھی میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے کہ کسی آیت کو اس کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اپنے کسی نظریے یا کسی خیال کی تائید کے لیے استعمال کروں۔ قرآن سے باہر کی کسی چیز سے بھی کبھی میری کوئی خاص قلبی و ذہنی وابستگی نہیں ہوئی۔ اگر ہوئی ہے تو قرآن ہی کے لیے اور قرآن ہی کے تحت ہوئی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے والے محسوس کریں گے کہ جہاں کہیں مجھے اپنے استاذؒ سے بھی اختلاف ہوا ہے میں نے بے جھجک اس کا بھی اظہار کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب عزیز کی ایک نہایت ہی حقیر خدمت کی حیثیت سے اسے اس کے قدر دانوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس وقت میرے دل میں جو جذبات ہیں ان کی تعبیر سے میرا قلم قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ناچیز خدمت کو قبول فرمائے، لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے، اللہ کے بندوں اور بندیوں کو اس سے نفع پہنچے اور آخرت میں یہ میری نجات کا ذریعہ بنے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

تدبرِ قرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے

۱۔ اس آیت کی تاریخی حیثیت

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مضمون بہت قدیم زمانہ سے اہل مذاہب میں نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ فصیح وبلیغ الفاظ تو ممکن ہے پہلی مرتبہ قرآن مجید ہی میں نازل ہوئے ہوں، لیکن جہاں تک اس کے مضمون کا تعلق ہے یہ کسی کام کے آغاز وافتتاح کے لئے اس قدر موزونیت ومناسبت رکھتا ہے کہ دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس کی تعلیم انسان کو بالکل شروع ہی میں دی ہوگی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق خود قرآن مجید میں یہ نقل ہے کہ انہوں نے اپنے باایمان متعلقین اور اپنے ساتھیوں کو جب کشتی میں سوار کرایا تو اس وقت اسی سے ملتے جلتے الفاظ کہے:

قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ھود - ۴۱)	اور اس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا، بے شک میرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو جو نامہ لکھا، اس کا آغاز بھی انہی مبارک کلمات سے کیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ	یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز بسم اللہ

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ (نمل۔ ۳۰) الرحمٰن الرحیم سے ہوا ہے۔

۲۔ یہ آیت دعا ہے

یہ کلام خبر یہ نہیں ہے بلکہ سورۂ فاتحہ کی طرح، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، یہ دعا ہے۔ ایک سلیم الفطرت آدمی کے دل کی یہ ایک فطری صدا ہے جو ہر قابلِ ذکر کام کرتے وقت اس کی زبان سے نکلنی چاہیئے۔ اسی فطری صدا کو وحیِ الٰہی نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے اور ایسا خوبصورت جامہ پہنایا ہے کہ اس سے زیادہ خوبصورت جامہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی کام کرنے سے پہلے جب یہ دعا ارادہ اور شعور کے ساتھ زبان سے نکلتی ہے تو اوّل تو پہلے ہی قدم پر انسان کو متنبہ کر دیتی ہے کہ جو کام وہ کرنے جا رہا ہے وہ کام بہر حال خدا کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کی پسند کے مطابق اور اس کے احکام کے تحت ہونا چاہیئے۔ ثانیاً وہ اس دعا کی برکت سے خدا کی دو عظیم صفتوں ــــ رحمٰن اور رحیم ــــ کا سہارا حاصل کر لیتا ہے۔ یہ دونوں صفتیں اس بات کی ضمانت ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں اُس کو برکت عطا فرمائے، اس کے اختیار کرنے میں اگر اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو اس کے وبال سے اس کو محفوظ رکھے۔ اس کو نباہنے اور تکمیل تک پہنچانے کی اس کو قوت و ہمت دے، شیطان کی چالوں اور فریبوں سے اس کو امان میں رکھے اور دنیا میں بھی اس کام کو اس کے لئے نافع اور بابرکت بنائے اور آخرت میں بھی یہ اس کے لئے رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنے ــــ جو کام اس دعا کے بغیر کیا جاتا ہے وہ ان تمام برکتوں سے خالی ہوتا ہے اس وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کام بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے۔

بسم اللہ کی یہ برکتیں تو ہر کام کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں لیکن خاص قرآن کی تلاوت کا آغاز اس دعا سے کرنے میں کچھ اور پہلو بھی ہیں جو پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔

ایک یہ کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے قرآن مجید کی تلاوت کا آغاز کر کے بندہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل ابتدائی وحی نازل کرتے وقت ہی دیا تھا۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (۱۔ سورۂ علق) (اپنے خداوند کے نام سے پڑھ، جس نے پیدا کیا)

دوسرا یہ کہ یہ مبارک کلمہ اس حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اس کو نطق اور گویائی کی نعمت عطا فرمائی جس کی بدولت وہ قرآن کی نعمت کا مستحق بن سکا۔ اس حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمان اشارہ کر رہی ہے جس کا اس آیت میں حوالہ ہے۔ ایک دوسری جگہ یہ بات تصریح کے ساتھ کہی گئی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کیا، اس کو نطق کی قابلیت عطا فرمائی اور اس کو قرآن کی تعلیم دی۔ فرمایا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۲ خدائے رحمان نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو پیدا

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵-۴- رحمٰن) کیا اور اس کو گویائی کی تعلیم دی۔

تیسرا یہ کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید سے متعلق ایک خاص پیشین گوئی کی تصدیق کر رہی ہے جس کی سند پچھلے آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ خلقِ خدا کو جو تعلیم دیں گے وہ اللہ کا نام لے کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچویں کتاب باب ۱۸- (۱۸- ۱۹) میں یہ الفاظ وارد ہیں۔

"میں ان کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا"۔

چوتھا یہ کہ جس طرح قرآن مجید خدا کی صفت رحمانیت کا مظہر ہے اسی طرح اس کی صفت رحمانیت ہی ہے جو قرآن کے فتح باب کی کلید ہے، اسی سے اس کے بند دروازے کھلیں گے، اسی سے اس کی مشکلیں آسان ہوں گی، اسی منبعِ فیض سے قاری پر معانی و حقائق کا فیضان ہوگا اور اسی کے سہارے وہ کجی و گمراہی اور نفس اور شیطان کی آفتوں سے محفوظ رہے گا۔

۳- آیت کے اسمائے حسنیٰ

اس آیت میں اللہ تعالےٰ کے ناموں میں سے تین ناموں کا ذکر آیا ہے۔ اللہ، رحمان۔ رحیم۔ مختصراً ان کے مفہوم بھی سمجھ لینے چاہئیں۔

اللہ:

اللہ کا نام لفظ الٰہ پر الف لام تعریف داخل کر کے بنا ہے۔ یہ نام ابتدا سے صرف اس خدائے برتر کے لئے خاص رہا ہے جو آسمان و زمین اور تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے عرب جاہلیت میں بھی اس کا یہی مفہوم تھا۔ اہلِ عرب مشرک ہونے کے باوجود اپنے دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی خدا کے برابر قرار نہیں دیتے تھے ان کو اس بات کا اقرار تھا کہ آسمان و زمین اور تمام مخلوقات کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اسی نے سورج اور چاند بنائے ہیں، اسی نے ان کو مسخر کیا ہے اور وہی پانی برسانے والا اور روزی دینے والا ہے۔ دوسرے دیوتاؤں کی پرستش وہ محض اس غلط گمان کی بنا پر کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالےٰ کے مقرب ہیں اور اس کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے یہ خیالات نہایت تفصیل کے ساتھ نقل ہوئے ہیں۔ ہم اختصار کے خیال سے یہاں صرف دو تین آیتیں نقل کرتے ہیں۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (۳۹: زمر) ہم نہیں پوجتے ان کو مگر اس لئے کہ یہ اللہ سے ہم کو قریب کر دیں۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۶۱-۶۳ - عنکبوت)

اگر تم ان سے پوچھو کس نے بنایا آسمانوں اور زمین کو اور مسخر کیا سورج اور چاند کو؟ کہیں گے، اللہ نے۔ پھر کہاں ان کی عقل الٹ جاتی ہے! اللہ ہی روزی میں وسعت دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور تنگ کر دیتا ہے اس کے لئے۔ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ اور اگر ان سے پوچھو کس نے اتارا بادل سے پانی، پھر زندہ کی اس سے زمین اس کے خشک ہونے کے بعد؟ کہیں گے، اللہ نے۔

اسی طرح تمام قوتوں اور قابلیتوں، تمام زندگی اور موت اور کائنات کے تمام انتظام و انصرام کا حقیقی منبع اور مرکز بھی وہ اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

(۳۱- یونس)

ان سے پوچھو تم کو کون روزی دیتا ہے آسمان اور زمین سے یا کون اختیار رکھتا ہے تمہارے سمع و بصر پر اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور کون سارے معاملہ کا انتظام کرتا ہے؟ جواب دیں گے، اللہ، پھر پوچھو تو اس اللہ سے ڈرتے نہیں؟

رحمان اور رحیم:

اسم رحمان، غضبان اور سکران کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور اسم رحیم، علیم اور کریم کے وزن پر صفت کا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رحیم کے مقابل میں رحمان میں زیادہ مبالغہ ہے اس وجہ سے رحمان کے بعد رحیم کا لفظ ان کے خیال میں ایک زائد لفظ ہے جس کی چنداں ضرورت تو نہیں تھی لیکن یہ تاکید مزید کے طور پر آگیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے استعمالات کے لحاظ سے فعلان کا وزن جوش و خروش اور ہیجان پر دلیل ہوتا ہے اور فعیل کا وزن دوام و استمرار اور پائیداری و استواری پر۔ اس وجہ سے ان دونوں صفتوں میں سے کوئی صفت بھی برائے بیت نہیں ہے بلکہ ان میں سے ایک خدا کی رحمت کے جوش و خروش کو ظاہر کر رہی ہے، دوسری اس کے دوام و تسلسل کو۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی رحمت اس خلق پر ہے بھی اسی نوعیت سے۔ اس میں جوش ہی جوش نہیں ہے، بلکہ پائیداری اور استقلال بھی ہے۔ اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ اپنی رحمانیت کے جوش میں دنیا پیدا تو کر ڈالی ہو لیکن پیدا کر کے پھر اس کی خبر گیری اور نگہداشت سے غافل ہو گیا ہو بلکہ اس کو پیدا

کرنے کے بعد وہ اپنی پوری شانِ رحیمیت کے ساتھ اس کی پرورش اور نگہداشت بھی فرما رہا ہے۔ بندہ جب بھی اسے پکارتا ہے وہ اس کی پکار سنتا ہے اور اس کی دعاؤں اور التجاؤں کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ پھر اس کی رحمتیں اسی چند روزہ زندگی ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں گے ان پر اس کی رحمت ایک ایسی ابدی اور لازوال زندگی میں بھی ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری حقیقت اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک یہ دونوں لفظ مل کر اس کو ظاہر نہ کریں۔

۴۔ قرآن میں اس آیت کی جگہ

اس آیت سے متعلق ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ قرآن مجید میں اس کی اصل جگہ کہاں ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ یوں تو یہ ہر سورۃ کے شروع میں (سورۂ توبہ کے سوا) ایک مستقل آیت کی حیثیت سے لکھی ہوئی ہے لیکن کسی سورہ میں بھی (سوائے سورہ نمل) بظاہر اس کے ایک جزو کی حیثیت سے یہ شامل نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ کسی خاص سورہ کا حصہ بھی ہے یا ہر سورہ کے اوپر یہ صرف بطور ایک متبرک آغاز اور ایک علامتِ امتیاز کے ثبت ہے۔ مدینہ، بصرہ اور شام کے قراء اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ قرآن کی سورتوں میں سے کسی سورہ کی بھی (بشمول سورۂ فاتحہ) آیت نہیں ہے بلکہ ہر سورہ کے شروع میں اس کو محض تبرک اور ایک علامتِ فصل کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اس سے ایک سورہ دوسری سورہ سے ممتاز بھی ہوتی ہے اور قاری جب اس سے کسی سورہ کا افتتاح کرتا ہے تو اس سے برکت بھی حاصل کرتا ہے۔ یہی مذہب امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

اس کے برعکس مکہ اور کوفہ کے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ کی بھی ایک آیت ہے اور دوسری سورتوں کی بھی ایک آیت ہے۔ یہ مذہب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ اس کو سورۂ فاتحہ کی ایک آیت اور دوسری سورتوں کے لئے بمنزلہ فاتحہ مانتے ہیں۔ مجھے قوی مذہب قرائے مدینہ کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب تمام تر وحی الٰہی کی رہنمائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی ہے اور بسم اللہ کی کتابت بھی اسی ترتیب کا ایک حصہ ہے۔ اس ترتیب میں جہاں تک بسم اللہ کے لکھے جانے کی نوعیت کا تعلق ہے سورۂ فاتحہ اور غیر سورۂ فاتحہ میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر سورہ کے آغاز میں اس کو ایک ہی طرح درج کیا گیا ہے۔ اس کی حیثیت سورہ سے الگ ایک مستقل آیت کی نظر آتی ہے۔

تدبّرِ قرآن

۱

الفاتحة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا مضمون

اس سورہ میں پہلے اس جذبۂ شکر کی تعبیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی پروردگاری، اس کی بے پایاں رحمت اور اس کائنات کے نظام میں اس کے قانونِ عدل کے مشاہدات سے ایک سلیم الفطرت انسان پر طاری ہوتا ہے یا طاری ہونا چاہیئے۔ پھر اس جذبۂ شکر سے خدا ہی کی بندگی اور اسی سے استعانت کا جو جذبہ ابھرتا ہے یا ابھرنا چاہیئے اس کو تعبیر کیا گیا ہے، پھر اس جذبہ کی تحریک سے جو مزید طلب و جستجو ہدایت و رہنمائی کے لئے پیدا ہوتی ہے یا پیدا ہونی چاہیئے وہ ظاہر کی گئی ہے۔

ب۔ سورہ کا اسلوب

اس سورہ کا اسلوب دعائیہ ہے۔ لیکن اندازِ کلام مخاطب کو سکھانے کا نہیں ہے کہ وہ یوں دعا کرے بلکہ اصل دعا ہماری زبان پر طاری کر دی گئی ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ اگر ہماری فطرت سلیم ہے تو ہماری زبان سے ہمارے دل کا ترانۂ حمد یوں نکلنا چاہیئے۔ چونکہ یہ تعبیر اسی خدا کی بخشی ہوئی ہے جو ہماری فطرت کا بنانے والا ہے اس وجہ سے اس سے زیادہ سچی تعبیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر سلیم الفطرت انسان اس کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھتا ہے۔ صرف وہی لوگ اس سے کوئی بیگانگی محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہو۔

سُورَةُ الفَاتِحَةِ (۱)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ۙ مٰلِكِ
يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ؕ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ؕ اِهْدِنَا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬
غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ ع

شروع خدائے رحمان و رحیم کے نام سے

شکر کا سزاوارِ حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب، رحمان اور رحیم، جزا و سزا کے دن کا مالک۔ ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش، ان لوگوں کے رستے کی جن پر تُو نے اپنا فضل فرمایا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حمد کا مفہوم

حمد: حمد کا ترجمہ عام طور پر قرآن مجید کے مترجموں نے تعریف کیا ہے۔ لیکن میں نے اس کا ترجمہ شکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی یہ لفظ اس ترکیب کے ساتھ استعمال ہوا ہے اُسی مفہوم کو ادا

کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے جس مفہوم کو ہم شکر کے لفظ سے ادا کرتے ہیں مثلاً وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۔ ۴۳ ۔ اعراف (انھوں نے کہا شکر کا سزاوار ہے اللہ جس نے ہمیں اس کی ہدایت بخشی) وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۰ ۔ یونس (اور ان کی آخری صدا یہ ہوگی کہ شکر ہے اللہ کے لئے جو عالم کا رب ہے) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۳۹ ۔ ابراہیم (شکر ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ عطا فرمائے)۔

استعمالات کے لحاظ سے اگرچہ حمد کا لفظ شکر کے مقابل میں زیادہ وسیع ہے، شکر کا لفظ کسی کی صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو برعکس اس کے حمد ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لئے عام ہے، خواہ ان کا کوئی فیض خود حمد کہنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو، تاہم شکر کا مفہوم اس لفظ کا جزو غالب ہے۔ اس وجہ سے اس کے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لیے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ شکر کا لفظ بھی ملانا ہوگا یا پھر [illegible] کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا تاکہ یہ سورہ جس احساس شکر اور جس جذبۂ سپاس کی تعبیر ہے اس کا پورا پورا اظہار ہو سکے۔ یہ اظہار صرف تعریف کے لفظ سے اچھی طرح نہیں ہوتا۔ آدمی تعریف کسی بھی اچھی چیز کی کر سکتا ہے اگرچہ اس کی اپنی ذات سے اس کا کوئی دُور کا بھی واسطہ نہ ہو، لیکن یہ سورہ ہماری فطرت کے جس جوش کا مظہر ہے وہ جوش اُبھرا ہی ہے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و رحمانیت کے ان مشاہدات سے جن کا تعلق براہ راست ہماری ذات سے ہے۔ اگر یہ اچھی طرح واضح نہ ہو سکے تو اس سورہ کی جو اصل روح ہے وہ واضح نہ ہو سکے گی۔ شکر کے لفظ سے سورہ کا یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

اللہ: اس کی وضاحت آیت بسم اللہ کے تحت ہو چکی ہے۔

رب کا مفہوم

رَبّ: رب کے معنی پرورش کرنے والے اور مالک و آقا کے آتے ہیں۔ یہ دوسرا مفہوم اگرچہ پہلے مفہوم ہی سے اس کے ایک لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوا ہے کیونکہ جو ذات پرورش کرنے والی ہے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک اور آقا بنے۔ لیکن یہ مفہوم اس لفظ پر ایسا غالب ہو چکا ہے کہ اس سے الگ ہو کر محض پرورش کرنے والے کے لیے اس کا استعمال باقی نہیں رہا۔

قرآن مجید کے مخاطبِ اوّل کائنات کا خالق تو جیسا کہ آیت بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے، تنہا اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن رب انھوں نے اور بھی بنا رکھے تھے جن کی نسبت ان کا گمان تھا کہ خدا نے کائنات کے انتظام میں ان کو اپنا شریک بنا رکھا ہے، اس وجہ سے یہ عبادت و اطاعت کے حقدار ہیں۔ یہاں اللہ کے بعد اس کی پہلی ہی صفت رب العالمین بیان ہوئی جس سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ جو اللہ کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا مالک بھی ہے کیونکہ وہی سب کی پرورش کرنے والا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: اللہ تعالیٰ کے ان دونوں ناموں کی وضاحت آیت بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ: دین کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لفظ 'دین'

۱۔ مذہب و شریعت کے معنی کے لیے مثلاً أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ ۸۳۔ آل عمران (کیا خدا کے اتارے ہوئے کے مطا…
مذہب کے سوا وہ کسی اور مذہب کے طالب ہیں)۔

۲۔ قانونِ ملکی کے لیے مثلاً مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ ۷۶۔ یوسف (اس کو بادشاہ کے قانون کی رُو سے یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کو روک سکے)۔

۳۔ اطاعت کے معنی کے لیے مثلاً وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۵۲۔ نحل (اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے)

۴۔ جزا کے معنی کے لیے مثلاً إِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ وَإِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۶۔ ذاریات (جس چیز کی تمہیں دھمکی سنائی جا رہی ہے وہ سچ ہے اور جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی)۔

جزا سے مراد اس کے دونوں پہلو ہیں۔ نیک اعمال کا صلہ بھی اور بُرے کاموں کی سزا بھی۔ اس وجہ سے ہم نے ترجمہ میں جزا کے ساتھ سزا کا لفظ بھی بڑھا دیا ہے۔

جزا و سزا کے دن کا تنہا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس روز سارا زور اور سارا اختیار اسی کو حاصل ہوگا۔ اس کے آگے سب عاجز و سرفگندہ ہوں گے کسی کی مجال نہ ہوگی کہ اس کی اجازت کے بغیر زبان کھول سکے۔ سارے معاملات کا فیصلہ تنہا وہی کرے گا جس کو چاہے گا سزا دے گا، جس کو چاہے گا انعام دے گا۔ جیسا کہ فرمایا ہے اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۵۶۔ حج (اس دن سارا اختیار اللہ ہی کو ہو گا، وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا) لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۱۶۔ غافر (آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟ صرف خدائے واحد و قہار کی)

اس آیت کے تین لفظوں میں جو بات پوشیدہ ہے وہ اگر پھیلا دی جائے تو پوری بات یوں ہوگی کہ ایک دن جزا اور سزا کا آنے والا ہے۔ اس دن سارا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہوگا اور اس کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوگی۔ لیکن کلام کے دعائیہ اسلوب میں یہ بات اس طرح لپیٹ دی گئی ہے کہ دعا کرنے والا ایک ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت سے ان سب باتوں کا اعتراف کرجاتا ہے۔ گویا خدا کی ربوبیت و رحمت اور اس کے عدل و انصاف کے ان آثار و دلائل کے بعد جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں، ایک ہٹ دھرم کے سوا کون ہے جو اس حقیقت کے کسی جزو کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر سکے؟

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ: عبادت کے اصلی معنی عربی لغت میں انتہائی خضوع اور انتہائی عاجزی و فروتنی کے اظہار کے ہیں۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ اس خضوع و خشوع کی تعبیر کے لیے خاص ہو گیا ہے جو بندہ اپنے خالق و مالک کے لیے ظاہر کرتا ہے۔ پھر اطاعت کا مفہوم بھی اس لفظ کے لوازم میں داخل ہو گیا ہے کیونکہ یہ بات بالبداہت غلط معلوم ہوتی ہے کہ انسان جس ذات کو اپنے انتہائی خضوع و خشوع کا واحد مستحق سمجھے زندگی کے معاملات میں اس کی اطاعت کو لازم نہ جانے۔ چنانچہ عبادت کی اس حقیقت کو قرآن مجید نے بعض جگہ کھول بھی دیا

عبادت کا مفہوم

ہے ۔ مثلاً:۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ ۝ (۲۔ زمر)

ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ تو اللہ ہی کی بندگی کرو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔

عبادت کے ساتھ اطاعت کا یہ تعلق اس قدر گہرا ہے کہ بعض جگہ یہ لفظ صاف صاف اطاعت کے مفہوم ہی کے لیے استعمال ہو گیا ہے مثلاً:

أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (۶۰۔ یٰس)

کہ شیطان کی عبادت نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا جو حق بندوں پر ہے اس آیت میں وہ بھی بیان ہو گیا ہے اور بندے کا جو حق خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب کیا ہے وہ بھی اس میں بیان ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حق بندے پر یہ ہے کہ بندہ تنہا اسی کی بندگی کرے اور اسی سے التجا کرے۔ بندے کا حق اس نے اپنے اوپر یہ بتایا ہے کہ وہ اس پر رحمت نازل کرتا ہے اور اس کی مدد فرماتا ہے۔ آیت کے پہلے ٹکڑے میں بندہ اس حق کا اقرار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا اس کے اوپر ہے اور اس کے دوسرے ٹکڑے میں اس حق کے لئے درخواست پیش کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر بندے کا بتایا ہے لیکن پیش کرنے کا انداز نہایت مؤدبانہ ہے۔ بندہ اپنے کسی حق کی طرف کوئی اشارہ کرنے کے بجائے صرف اپنی احتیاج اپنے اعتماد اور اپنی تمنا کا اظہار کر دیتا ہے کیونکہ بندے کے شایان شان یہی ہے کہ وہ اپنے رب سے التجا اور درخواست کرے نہ کہ اس پر اپنا کوئی حق جتائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ وہ بغیر کسی استحقاق کے بندے کو سب کچھ بخشتا ہے اور پھر اس فضل و کرم کو بندہ کا حق قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سورہ سے متعلق جو مشہور حدیث قدسی ہے اس میں خاص اس ٹکڑے سے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں کہ جب بندہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کے الفاظ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ٹکڑا میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ دیا جو اس نے مانگا۔

"ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں" کے الفاظ عام ہیں، اس وجہ سے یہ طلب مدد خاص عبادت کے معاملہ میں بھی ہو سکتی ہے اور زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی۔ عبادت میں بندہ خدا کی مدد کا محتاج توفیق و رہنمائی اور ثبات و استقامت کے لیے ہوتا ہے کیونکہ عبادت بالخصوص جب کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں خدا کی اطاعت پر بھی مشتمل ہو ایک بڑی ہی آزمائش کی چیز ہے۔ اس میں ایسے سخت مقامات بھی آتے ہیں جہاں بڑے بڑوں کے پائے ثبات بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔

اس جملہ میں مفعول کی تقدیم نے حصر کا مضمون بھی پیدا کر دیا ہے۔ یعنی عبادت بھی صرف خدا ہی کی اور استعانت بھی تنہا اسی سے۔ اس حصر نے شرک کے تمام علائق کا یک قلم خاتمہ کر دیا کیونکہ اس اعتراف کے بعد بندہ کے پاس کسی غیر اللہ کو نہ کچھ دینے کو رہا اور نہ اس سے کچھ مانگنے کی گنجائش باقی رہی۔ اس کے بعد دوسروں سے بندے کے

تعلق کی صرف وہی نوعیت جائز رہ گئی ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے ہی قائم کردی ہو۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ : اِهْدِنَا کا مطلب صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا رستہ دکھا دے بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی ہے کہ اس راستہ کی صحت پر ہمارے دل مطمئن کردے، اس پر چلنے کا ہمارے اندر ذوق و شوق پیدا کردے، اس کی مشکلیں ہمارے لیے آسان کردے اور اس پر چلا دینے کے بعد دوسری پگڈنڈیوں پر بھٹکنے سے ہمیں محفوظ رکھ، یہ سارا مضمون یہاں صلہ کو حذف کردینے سے پیدا ہوتا ہے۔

"الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" پر الف لام عہد کا ہے۔ اس سے مراد وہ سیدھا رستہ ہے جو بندوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کھولا ہے، جو دین اور دنیا دونوں کی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے، جس پر چلنے کی دعوت نبیوں اور رسولوں نے دی ہے، جس پر ہمیشہ خدا کے نیک بندے چلے ہیں، جو قریب تر اور سہل تر ہے، جس کے اِدھر اُدھر سے گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں نے بہت سی کج پیچ کی راہیں نکال لی ہیں، لیکن وہ بجائے خود قائم ہے اور خدا تک پہنچنے والے ہمیشہ اسی پر چل کر خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسی سیدھے رستہ کو حضورؐ نے ایک مرتبہ اس طرح سمجھایا کہ زمین پر ایک سیدھا خط کھینچا، پھر اس کے داہنے بائیں آڑے ترچھے خطوط کھینچ دیئے، پھر فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا رستہ ہے اور یہ آڑے ترچھے خطوط پگڈنڈیاں ہیں اور ان میں سے ہر پگڈنڈی کی طرف کوئی نہ کوئی شیطان بلا رہا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ الآیۃ: آدمی جس چیز سے جتنا ہی گہرا لگاؤ رکھتا ہے اس کو اسی قدر وضاحت کے ساتھ خود بھی سمجھنا چاہتا ہے اور دوسرے کو بھی سمجھانا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے صرف اتنے ہی پر بس نہیں کیا کہ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش بلکہ اس کی پوری وضاحت بھی کردی ہے اور یہ وضاحت مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے ہے۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ رستہ ان لوگوں کا ہو جن پر تیرا انعام ہوا ہے اور منفی پہلو یہ ہے کہ جو نہ تو مغضوب ہوئے ہیں اور نہ گمراہ۔ اس وضاحت کے بعد مدعا اس طرح آئینہ ہو کر سامنے آگیا ہے کہ کسی اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اس ساری وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے نہیں تھی کہ (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو دعا کا مدعا سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش آنے کا امکان تھا، بلکہ صرف یہ ہے کہ طالب اپنے مطلوب حقیقی کی طلب کے ساتھ ساتھ ان لوگوں سے اپنی بیزاری کا اظہار بھی کررہا ہے جنھوں نے اس محبوب و مطلوب سے منہ موڑا یا اس سے بھٹک گئے نیز اپنے لیے استقامت و استواری کا بھی طلب گار ہے کہ اس راستہ کو پا جانے کے بعد اس پر قائم رہنا نصیب ہو، ان لوگوں کا حشر نہ ہو جن کو یہ رستہ ملنے کو تو ملا لیکن وہ اس کو پالینے کے بعد یا تو دیدہ و دانستہ اس سے منحرف ہوجانے کے سبب سے خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے، یا اپنی بدعت پسندیوں کی وجہ سے اس کو پا کر اس سے محروم ہوگئے۔

اس آیت میں تین گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک منعم علیہم۔ دوسرا مغضوب علیہم۔ تیسرا ضالین۔ مختصراً ان تینوں گروہوں کی خصوصیات بھی معلوم کرلینی چاہئیں۔

منعم علیہم کون ہیں؟

"اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ" میں نعمت سے مقصود دراصل ہدایت و شریعت کی نعمت ہے جس سے انسان دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا رستہ معلوم کرتا ہے۔ فعل انعام یہاں اپنے کامل اور حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد درحقیقت وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے شریعت کی نعمت عطا فرمائی اور انھوں نے دل و جان سے اس کو قبول کیا، اس نعمت کے دیئے جانے پر وہ اللہ تعالیٰ کے شکرگزار رہے، اس کی خود بھی قدر کی اور دوسروں کو بھی اس کی قدر کرنے پر ابھارا، اس کے تحفظ کے لیے انھوں نے اپنی قوتیں اور قابلیتیں بھی صرف کیں، مال بھی قربان کئے اور اگر ضرورت پیش آئی تو اس کی راہ میں جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ کہی گئی ہے اس وجہ سے واضح نہیں ہوتا کہ یہ اشارہ کس گروہ کی طرف ہے لیکن ایک دوسری آیت میں اس انعام یافتہ گروہ کی وضاحت ہو گئی ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ	پس یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے
مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ	اپنا انعام فرمایا انبیاء، صدیقین، شہداء اور
وَالصّٰلِحِیْنَ ۶۹- نساء	صالحین کے ساتھ۔

"مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ" میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح براہ راست نہیں ہے جس طرح انعام کے ذکر میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو سوءِ ادب سے احتراز ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انعام ہمیشہ اور ہر حال میں بندہ پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، برعکس اس کے خدا کے غضب کا مستحق بندہ اپنے اعمال کے سبب سے خود بنتا ہے۔

مغضوب علیہم سے مراد

مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کی نعمت نازل فرمائی لیکن انھوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے نہ صرف یہ کہ اس کو قبول نہیں کیا، بلکہ اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور جن لوگوں نے اس کو ان کے سامنے پیش کیا ان کی بیخ کنی اور قتل کے درپے ہوئے جس کی پاداش میں ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور وہ ہلاک کر دیے گئے۔

دوسرے وہ لوگ جنھوں نے قبول تو کیا لیکن دل کی آمادگی کے ساتھ نہیں قبول کیا بلکہ مارے باندھے قبول کیا، پھر بہت جلد شہواتِ نفس میں پڑ کر انھوں نے اس کے کچھ حصہ کو ضائع کر دیا، کچھ حصہ میں کتربیونت کر کے اس کو اپنی خواہشات کے مطابق بنا لیا اور جن لوگوں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی یا ان کو صحیح راستہ پر لانا چاہا انھوں نے ان میں سے بعض کو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔ پچھلی امتوں میں اس کی سب سے واضح مثال یہود ہیں، چنانچہ ان کے معتوب و مغضوب ہونے کا ذکر قرآن میں تصریح کے ساتھ ہوا بھی ہے۔ مثلاً

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَیْهِ وَجَعَلَ	جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اس کا غضب ہوا۔
مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِیْرَ (۶۰- مائدہ)	اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور خنزیر بنائے۔
وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ	اور ان کے اوپر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ
وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۶۱- بقرہ)	خدا کا غضب لے کر پلٹے۔

ضالین کی حقیقت

ضَآلِّیْن سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین میں غلو کیا، جنھوں نے اپنے پیغمبر کا رتبہ اتنا بڑھایا کہ اس کو خدا بنا کر رکھ دیا، جو صرف انہی عبادتوں اور طاعتوں پر قانع نہیں ہوئے جو اللہ اور اللہ کے رسول نے مقرر کی تھیں بلکہ اپنے جی سے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا، جنھوں نے اپنے اگلوں کی ایجاد کی ہوئی بدعتوں اور گمراہیوں کی آنکھ بند کر کے پیروی کی اور اس طرح صراطِ مستقیم سے ہٹ کر گمراہی کی پگڈنڈیوں پر نکل گئے۔ پچھلی امتوں میں سے اس کی نہایت واضح مثال نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے انہی وجوہ کی بنا پر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ان کو گمراہ اور گمراہ کرنے والے قرار دیا ہے، مثلاً

يَآ أَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا أَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (۷۷ - مائدہ ۵)

کہہ دو اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں (بدعتوں) کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے گمراہ چلے آ رہے ہیں اور جنھوں نے بہتوں کو خدا کے رستہ سے بھٹکایا اور جو خود بھی اس کے رستہ سے بھٹکے۔

۲- سورہ کا استدلالی پہلو

توحید، آخرت کے دلائل

یہ سورہ چونکہ دعا کے اسلوب میں ہے اس وجہ سے اس میں استدلال کا پہلو واضح نہیں ہے لیکن اس میں جن باتوں کا بندے کی طرف سے اقرار اور پھر جس بات کی درخواست ہے ان میں سے ہر چیز نہایت مضبوط عقلی اور فطری دلائل پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک دعا تو ہماری زبان سے کہلا دی گئی ہو، جس کے اندر ہماری طرف سے نہایت اہم اعترافات بھی موجود ہوں لیکن نہ تو ان اعترافات ہی کے لئے کوئی عقلی بنیاد ہو اور نہ اس درخواست ہی کے لیے ـــ

اس دعا کے اندر استدلال کے جو پہلو ہیں یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان کو واضح کرتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے اس امر کا اقرار ہے کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس اقرار کی بنیاد خدا کی پروردگاری، اس کی رحمانیت، اس کی رحیمیت اور اس کے عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ پر ہے جو ہمارے اندر بھی موجود ہیں اور جو اس کائنات کے بھی ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی کا بچہ ہو یا کسی حقیر سے حقیر حیوان کا، ابھی وہ دنیا میں قدم بھی نہیں رکھتا ہے کہ اس کی پرورش کا سامان پہلے سے بالکل تیار موجود ہوتا ہے۔ اس سامانِ پرورش کی تیاری کا عالم یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس کائنات کے تمام چھوٹے بڑے عناصر رات دن اسی کی فراہمی از اسی کے اہتمام میں سرگرم ہیں۔ سورج بھی اسی کے لیے سرگرم ہے، چاند بھی اسی کے لیے مصروفِ کار ہے، ابر بھی اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے اور ہوا بھی ہر آن اسی کے لیے گردش میں ہے۔

پھر پرورش اور تربیت کا یہ اہتمام ہماری زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ میں نہیں پایا جا رہا ہے، بلکہ غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ یہ زندگی کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ ہمارے ظاہر کی بھی پرورش ہو رہی ہے، ہمارا باطن بھی زیر تربیت

ہے، ہمارا جسم بھی پل رہا ہے، ہماری عقل کو بھی غذا مل رہی ہے، ہماری جسمانی قوتیں اور قابلیتیں بھی پروان چڑھ رہی ہیں اور ہماری روحانی صلاحیتوں کو بھی بالیدگی حاصل ہو رہی ہے۔ غرض ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو نظر انداز ہو رہا ہو۔

اس تمام اہتمام و انتظام سے پرورش کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے؟ کیا وہ اپنی سلطنت کے قیام و بقا کے لیے ہمارا محتاج ہے کہ وہ اس فیاضی کے ساتھ ہمارے اوپر خرچ کرے؟ کیا جس طرح بھیڑوں کے کسی گلّے کا مالک یہ چاہتا ہے کہ اس کی بھیڑیں فربہ رہیں تاکہ وہ ان سے زیادہ سے نفع کما سکے اسی طرح کی کوئی غرض اس جہان کے رب کے سامنے بھی ہے جس کے لیے وہ ہمیں کھلا پلا اور ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے؟

انسان جب ان سوالوں پر غور کرتا ہے تو اسے صاف نظر آتا ہے کہ اس طرح کی کسی غرض کا کوئی ادنیٰ شائبہ یہاں دور دور تک فرض بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جس ذات کی قدرت و حکمت کا ادنیٰ کرشمہ یہ آسمان و زمین ہیں وہ بھلا ہم جیسے حقیر بھنگوں کی محتاج کیا ہو سکتی ہے؟ اچھا، اگر یہ نہیں ہے تو کیا اس کائنات کے خالق و مالک پر ہمارا کوئی حق ہے، جو پہلے سے قائم ہے اور جس کے سبب سے وہ مجبور ہے کہ ہمارے لیے یہ کچھ اہتمام وہ کرے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی چیز بھی فرض نہیں کی جا سکتی۔ جن کو وجود کی نعمت ملی ہی محض اس کے لطف و کرم کی بدولت ہو وہ بھلا اس پر اپنا کوئی حق قائم کرنے کے قابل کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے اور صاف ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو اس کی اس تمام پروردگاری کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے۔ یہ اس کی رحمانیت کا جوش ہے کہ اس نے ہم کو وجود بخشا اور یہ اس کی رحیمیت کا فیض ہے کہ وہ برابر ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے۔

انسان جب خدا کی پروردگاری کے اس اہتمام کو دیکھتا ہے تو یہیں سے اس پر علم و معرفت کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے۔ یہ دروازہ ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کا دروازہ ہے جس دن تنہا وہی پورے اختیار کے ساتھ انصاف کی کرسی پر بیٹھے گا، اور نافرمانوں کو ان کی نافرمانیوں کی انصاف کے ساتھ سزا دے گا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا فضل و رحمت کے ساتھ صلہ دے گا۔

خدا کی پروردگاری اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی نشانیاں ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کو کس طرح لازم کرتی ہیں؟ اس سوال کا جواب تھوڑی سی وضاحت کا طالب ہے۔

خدا کی پروردگاری سے روزِ جزا پر استدلال قرآن مجید نے جگہ جگہ اس طرح کیا ہے کہ جس خدا نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اور آسمان کا شامیانہ تانا، جس نے تمہارے لیے سورج اور چاند چمکائے، جس نے ابر و ہوا جیسی چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگایا، جس نے تمہارے تمام ظاہری اور باطنی، روحانی اور مادی مطالبات کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا، کیا اس خدا کے متعلق تم یہ گمان کرتے ہو کہ بس اس نے تمہیں یوں ہی پیدا کر دیا ہے اور پیدا کر کے بس یوں ہی چھوڑ دے گا، یہ تمام کارخانہ محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی غایت و مقصد نہیں ہے؟ تم ایک شترِ بے مہار

کی طرح اس سرسبز و شاداب چراگاہ میں بس چرنے کے لیے چھوڑ دیئے گئے ہو، نہ تم پر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ تم سے کوئی پرسش ہوگی؟ اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے تو نہایت غلط سمجھ رکھا ہے۔ پرورش کا یہ سارا اہتمام پُکار پُکار کر شہادت دے رہا ہے کہ یہ اہتمام کسی اہم غایت و مقصد کے لیے ہے اور یہ ان لوگوں پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عائد کرتا ہے جو بغیر کسی استحقاق کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک دن ان ذمہ داریوں کی بابت ایک ایک شخص سے پرسش ہوگی اور وہی دن فیصلہ کا ہوگا۔ جنھوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہوں گی وہ سُرخ رُو اور فائز المرام ہوں گے اور جنھوں نے ان کو نظر انداز کیا ہوگا وہ ذلیل اور نامراد ہوں گے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے لیکن اختصار کے خیال سے صرف ایک مثال نقل کرتے ہیں:۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ
اَوْتَادًا ۝ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝ وَّجَعَلْنَا
نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝
وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ
سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا
وَّهَّاجًا ۝ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً
ثَجَّاجًا ۝ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝
وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ
كَانَ مِيْقَاتًا ۝ (نبا۔ ۶-۱۷)

کیا ہم نے زمین کو تمہارے لیے گہوارہ نہیں بنایا اور اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں ٹھونکیں؟ اور ہم نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا۔ اور تمہاری نیند کو دافع کلفت بنایا۔ رات کو تمہارے لیے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصول معاش کا وقت ٹھہرایا اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بلند کیے اور روشن چراغ بنایا اور ہم نے بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی برسایا تاکہ اس سے ہم غلے اور نباتات اگائیں اور گھنے باغ پیدا کریں۔ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔

"بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے" یعنی اوپر جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ جس نے یہ کچھ اہتمام انسان کے لیے کیا ہے وہ انسانوں کو یوں ہی شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ اس کی نیکی یا بدی کے فیصلہ کے لیے فیصلہ کا ایک دن بھی لائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ نے اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ قرار دیا ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اچھوں اور بُروں کے درمیان انصاف کرے۔ نیکو کاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے، اور بدکاروں کو ان کی برائیوں کی سزا دے۔ ایک رحمان اور رحیم ہستی کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ظالم اور مظلوم، نیکو کار اور بد، باغی اور وفادار دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے۔ ان کے درمیان ان کے اعمال کی بنا پر کوئی فرق نہ کرے۔ نہ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دے نہ مظلوم کی مظلومیت کا ظالم سے انتقام لے۔ اگر زندگی کا یہ کارخانہ اسی طرح ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد جزا و سزا اور انعام و انتقام کا کوئی دن آتا نہیں ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ العیاذ باللہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں متقی اور مجرم دونوں برابر ہیں بلکہ مجرم نسبتاً اچھے ہیں جن کو جرم کرنے اور فساد برپا کرنے کے لیے اس نے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ یہ چیز بداہتہً غلط اور اس کے رحمان و رحیم ہونے کے بالکل منافی ہے چنانچہ اس نے نہایت واضح الفاظ

میں اس کی تردید فرمائی۔ مثلاً:

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝ مَا لَکُمۡ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ۝ (۳۶-قلم)	کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

اور اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ بتایا ہے کہ ایک دن وہ سب کو جمع کرکے انصاف کرے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے:

کَتَبَ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ؕ لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ؕ (۱۲-انعام)	اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے وہ قیامت تک جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، تم کو ضرور جمع کرکے رہے گا۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ قیامت دراصل خدا کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے اس وجہ سے وہ فیصلہ کا ایک دن ضرور لائے گا جس میں وہ سب کو اکٹھا کرکے ان کے درمیان انصاف فرمائے گا۔ اور یہ بھی عین اس کی اس رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ اس دن کسی کی مجال نہ ہوگی کہ اس کے فیصلوں میں کوئی مداخلت کر سکے اور اپنی سفارشوں سے حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکے بلکہ ہر ایک کے لیے بالکل بے لاگ اور پورا پورا انصاف ہوگا۔

اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہوا کہ عدل اور رحمت میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ عدل عین رحمت ہی کا تقاضا ہے۔

جذبۂ شکر دین کی بنیاد ہے

ربوبیت، رحمت اور عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے شکر کا جو بے پایاں جذبہ پیدا ہوتا ہے، یہی جذبہ ہے جو بندہ کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرے اور اپنی ہر مشکل میں اسی سے مدد مانگے۔ غور کیجیے تو صاف واضح ہوگا کہ جس طرح یہ جذبہ رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کے مشاہدہ کا ایک فطری نتیجہ ہے اسی طرح اس جذبہ سے سرشار ہو کر بندہ کا خدا کی طرف اس کی عبادت کے لیے بڑھنا بھی اس جذبہ کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔ انسان کا ہر جذبہ اپنا ایک قدرتی ردِّ عمل رکھتا ہے۔ اس جذبہ کا، جو اپنے منعم حقیقی کی شکر گزاری کے لیے انسان کے اندر ابھرتا ہے، قدرتی ردِّ عمل یہ ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے اور اسی سے مدد مانگے۔ جو ذات اس فیاضی اور اس اہتمام کے ساتھ پرورش کر رہی ہے، جس کی یہ پروردگاری نہ اس کی طرف سے کسی غرض پر مبنی ہے اور نہ ہماری طرف سے کسی استحقاق پر بلکہ تمام تر اس کی رحمانیت اور رحیمیت کا فیضانِ عام ہے، پھر جس کی ربوبیت اور رحمانیت صرف اسی حیاتِ چند روزہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس زندگی کے بعد بھی اپنے نیک بندوں کے لیے اس نے ابدی زندگی کی سرمدی محفوظ کر رکھی ہیں، اس کے سوا کون ہے جو انسان کی حقیقی شکر گزاری کا مستحق ہو سکے۔ اور اگر وہی ہمارے حقیقی شکر کا سزاوار ہے تو پھر اس کے سوا کون ہے جو اس بات کا حق دار ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں اور اس سے مدد مانگیں؟

اس طرح شکر کا جذبہ گویا دھکیل کر بندے کو اس کے منعم حقیقی کے دروازے پر ڈال دیتا ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے اور اسی سے طالبِ مدد ہو۔ اس حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ درحقیقت شکر کے جذبہ سے بندہ کے اندر خدا کی عبادت کا داعیہ ابھرتا ہے اور پھر اسی جذبہ اور اسی کے قدرتی ردِّ عمل سے دین کی داغ بیل پڑتی ہے۔

اس کائنات میں اور خود اپنے وجود کے اندر خدا کی ربوبیّت اور اس کی رحمت کے بے شمار آثار دیکھ کر انسان کے اندر اپنے مُنعمِ حقیقی کے لیے شکر کا جذبہ اور اس جذبہ کی تحریک سے انسان کے اندر اس کی عبادت کرنے کا ولولہ پیدا ہونا ایک ایسی بات ہے جو ہر پہلو سے بالکل ایک فطری اور بدیہی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس حقیقت کا انکار کر سکے۔

جذبۂ خوف کو دین کی بنیاد قرار دینے کی لغویت

لیکن مذہب دشمنی کے اندھے جوش میں فلسفۂ جدید کے مدعیوں نے دین کے آغاز سے متعلق اس سے بالکل مختلف نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سب سے قدیم اور ابتدائی جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ان ہولناک اور خوفناک حوادث کے مشاہدہ سے پیدا ہوا جو اس دنیا میں طوفانوں، زلزلوں اور وباؤں کی صورت میں آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ اس خوف کے جذبہ نے انسان کو اُن اَن دیکھی طاقتوں کی پرستش پر مجبور کیا جن کو اس نے ان حوادث کا پیدا کرنے والا خیال کیا۔ اور اس طرح انسان نے شرک سے دین کا آغاز کیا۔

ہم اس غلط نظریہ کی تردید اپنی ایک دوسری کتاب[1] میں پوری تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم صرف اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ مذہب کے آغاز سے متعلق قرآن کی یہ تقریر زیادہ دل نشین اور عقل و فطرت کے مطابق ہے یا فلسفۂ جدید کا یہ نظریہ زیادہ قرینِ عقل و فطرت ہے؟ اس دنیا کے عام واقعات زلزلے، طوفان اور سیلاب ہی ہیں یا اس میں بہاریں بھی آتی ہیں، چاندنی بھی پھیلتی ہے، بارشیں بھی ہوتی ہیں، تارے بھی چھٹکتے ہیں، پھول بھی کھلتے ہیں اور فصلیں بھی پکتی ہیں۔ ہمارے عام مشاہدے میں زیادہ تر ربوبیت کی یہ برکتیں اور رحمت کی یہ شانیں آتی رہتی ہیں یا صرف زلزلوں اور طوفانوں کی ہولناکیاں ہی آتی ہیں؟ اس کائنات اور خود اپنی فطرت کے عجائب پر نگاہ ڈالنے کے بعد انسان پر ان دیکھی طاقتوں کا ہول طاری ہوتا ہے یا ایک رحمان و رحیم اور منعم و دیّان خدا کے احسانات کے احساس سے دل کا ریشہ ریشہ لبریز ہو جاتا ہے؟ جو شخص بھی ان سوالوں پر ضد اور ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر غور کرے گا اور بے کم و کاست اپنے سچے تاثر کا اظہار کرے گا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی عقل اور انسانی فطرت کے بہاؤ کا اصلی رخ وہی ہے جس کا پتہ قرآن مجید دے رہا ہے، نہ کہ وہ جس کی طرف فلسفۂ جدید لیے جا رہا ہے۔

یہ نظریہ بھی بدیہی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے کہ خوف کا جذبہ تمام دوسرے جذبات سے مقدم ہے۔ خوف کا تجزیہ کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ خوف نام ہے اس چیز کا کہ آپ کو کسی ایسی چیز کے چھن جانے یا اس سے محروم ہو جانے کا اندیشہ یا خطرہ پیدا ہو گیا ہے جو آپ کو حاصل بھی ہے اور جو عزیز بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور لازمی چیز ہے اور جب نعمت کا شعور پایا گیا تو ایک مُنعم کا شعور بھی لازمی ہوا اور پھر اس کی شکرگزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔ انسان کے مشاہدۂ کائنات اور مشاہدۂ انفس کی فطری راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نعمتوں اور رحمتوں کے مشاہدہ سے اس پر ایک مُنعمِ حقیقی کی شکرگزاری کا جذبہ اور احساس طاری ہوا اور پھر اس جذبہ

[1] ملاحظہ ہو ہماری کتاب "حقیقتِ شرک و توحید" حصہ دوم

کی تحریک سے وہ اس کی بندگی کی طرف مائل ہوا۔ رہا یہ سوال کہ اس صحیح شاہراہ پر ایک مرتبہ پڑ جانے کے بعد وہ دوسری غلط راہوں کی طرف کس طرح مڑ گیا تو اس کا سبب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کی فطرت میں کوئی خرابی موجود تھی جو اس گمراہی کا سبب بنی، بلکہ اس میں یا تو اختیار و ارادہ کے سوءِ استعمال کو دخل ہے یا عقل کی کج روی اور ہوا پرستی کو۔ اس مسئلہ پر بھی مفصل بحث ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں[1]۔

اقرارِ بندگی اور اظہارِ اعتماد و توکل کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا ہمارے سامنے آتی ہے اور اسی دعا پر جو اس تمام تمہید کے بعد اصلی حرفِ مدعا کی حیثیت رکھتی ہے، یہ سورہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مغضوبوں اور گمراہوں کی روش سے اظہارِ بیزاری کا جو مضمون ہے وہ منفی پہلو سے اس دعا کی توضیحِ مزید ہے۔

۳۔ رسالت کی ضرورت پر ایک دلیل

اوپر کی ساری تمہید کا اقرار و اعتراف کی شکل میں نمایاں ہونا اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا دعا کی شکل میں سامنے آنا ایک خاص حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کا تعلق ہے، جہاں تک ان نشانیوں کے مشاہدہ سے شکر کے جذبہ کے ابھرنے کا تعلق ہے اور پھر اس جذبۂ شکر کی تحریک سے جہاں تک اسی منعمِ حقیقی کی بندگی اور اسی سے طلبِ اعانت کے ارادہ کا تعلق ہے یہ باتیں ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ ان کو ہر انسان محسوس کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے دل پر پردہ نہ پڑا ہوا ہو۔ اگر انسان اپنی عقل اور اپنی فطرت کو ان کی اپنی روش پر کام کرنے دے، غیر فطری اڑنگے ان کی راہ میں نہ ڈالے تو وہ ان باتوں میں سے کسی بات کے اقرار و اعتراف میں بھی بخل نہیں کرے گا، یہاں تک کہ ایک روزِ جزا کی آمد میں بھی اس کو شبہ نہیں ہوگا۔ البتہ اگر وہ رکے گا تو اس مقام پر آکر رکے گا کہ جس خدا کی وہ بندگی کرنا چاہتا ہے اور اپنی ہر مشکل میں جس کی مدد پر اس نے بھروسہ کیا ہے اس تک پہنچنے کا، اس کی عبادت کرنے کا، اس کی پسند اور ناپسند معلوم کرنے کا اور زندگی کی ہر مشکل میں اس سے مدد مانگنے کا صحیح طریقہ اور سیدھا رستہ کیا ہے؟ اسی صحیح رستہ کو معلوم کرنے کے لیے بندہ اللہ تعالیٰ سے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا کرتا ہے۔

اس بات کو صریح دعا کے اسلوب میں کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہاں انسان کی اپنی عقل اور سمجھ بالکل عاجز ہے۔ صرف خدا ہی ہے جو بتا سکتا ہے کہ صراطِ مستقیم کیا ہے اور وہی ہے جو اس صراطِ مستقیم کو اختیار کر لینے کے بعد اس پر جمے رہنے کی توفیق بخش سکتا ہے۔ یہیں سے انسانی فطرت کے اندر وہ خلا نمایاں ہوتا ہے جس کے سبب سے وہ نبوت اور رسالت کا محتاج ہوتا ہے۔ انسان اگر کج فہمی سے کام نہ لے تو آفاق اور انفس کی نشانیوں سے وہ یہ تو معلوم کر سکتا ہے کہ ایک خدا ہے، وہ پرورش کرنے والا اور مہربان ہے اور وہ جزا اور سزا دینے والا بھی ہے، لیکن یہ معلوم کرنا اس کے بس میں نہیں ہے کہ اس خدا کی بندگی اور اطاعت کا طریقہ کیا ہے۔ یہی طریقہ بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو ہماری کتاب 'حقیقتِ شرک و توحید'۔

۴۔ سورہ پر دعا کے پہلو سے ایک نظر

دعا کے پہلو سے اس سورہ کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے تنہا یہی بات کافی ہے کہ یہ سورہ ہماری سب سے بڑی عبادت ۔ نماز ۔ کی خاص سورہ ہے ۔ صحیحین کی مشہور روایت ہے کہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب اس شخص کی نماز نہیں ہے جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔

سورہ کی تاثیر

پھر اپنی تاثیر کے لحاظ سے اس کا جو درجہ ہے اس کا اندازہ اس حدیث قُدسی سے ہوتا ہے جو مسلم میں موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ جب پورے شعور اور اخلاص کے ساتھ نماز میں اس سُورہ کی تلاوت کرتا ہے تو اس کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے ساتھ ہی خدا کے ہاں شرفِ قبولیت پاتا ہے ۔ حدیث ملاحظہ ہو:۔

عن ابی ھریرۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللہ تعالیٰ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین فنصفھا لی ونصفھا لعبدی ولعبدی ماسأل اذا قال العبد الحمد للہ رب العلمین قال اللہ حمدنی عبدی واذا قال الرحمن الرحیم قال اللہ اثنی علی عبدی واذا قال ملٰک یوم الدین قال مجدنی عبدی واذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین قال ھذا بینی وبین عبدی ولعبدی ماسأل فاذا قال اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین قال ھذا لعبدی ولعبدی ماسأل۔	ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا نصف حصہ میرے لیے ہے اور نصف میرے بندہ کے لیے ہے اور میرے بندہ کو وہ بخشا گیا جو اس نے مانگا جب بندہ الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میرا شکریہ ادا کیا اور جب وہ الرحمٰن الرحیم کہتا ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف بیان کی ہے اور جب وہ مالکِ یوم الدین کہتا ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بڑائی بیان کی اور جب بندہ ایاک نعبد و ایاک نستعین کہتا ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے مانگا ۔ پھر جب بندہ اہدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہتا ہے تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ بخشا جو اس نے مانگا۔

اس حدیث میں اس سورہ کا جو حقیقت افروز اور معنی خیز تجزیہ ہے وہ بجائے خود اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی

بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے اس پہلو پر ہم غور کرنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے اس کے لفظ لفظ کے اندر یہ تاثیر بھر دی ہے کہ بندے کی زبان سے لفظ ابھی نکلا نہیں کہ بارگاہِ رب العزت سے اس کی سندِ قبولیت اس کو عطا ہو گئی۔ دعائیں اور بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہیں لیکن شاید ہی کسی دعا کے متعلق اس تفصیل سے بتایا گیا ہو کہ اس کے ایک ایک لفظ کا خود اس ذات پر کیا اثر پڑتا ہے جس سے یہ دعا کی جاتی ہے اور کن لفظوں میں وہ اس کو قبول فرماتا ہے۔

دعا کی خوبیاں

اس دعا کی اس غیر معمولی اہمیت اور عظمت کے سبب سے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی بعض خوبیاں ہم یہاں واضح کریں، اگرچہ توقع نہیں کہ اس کی خوبیوں اور بلاغتوں کا عشرِ عشیر بھی ہم بیان کرنے پر قادر ہو سکیں۔

اس دعا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جس چیز کے لیے دعا کی گئی ہے اس سے اعلیٰ اور اس سے برتر کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں بندہ خدا سے خود اسی تک پہنچنے اور اسی کو پانے کے سیدھے رستہ کی ہدایت مانگتا ہے۔ یہ دعا اول تو ہر شائبۂ نفس سے پاک ہے۔ ثانیاً یہ عین اس مقصد کے لیے دعا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ ثالثاً یہ ایک ایسے معاملہ میں خدا سے رہنمائی کی دعا ہے جس میں انسان کی اپنی عقل، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے، بالکل عاجز و درماندہ ہے۔ صرف خدا ہی کی رہنمائی سے وہ اسے پا بھی سکتا ہے اور اسی کی توفیق سے اسے پا کر اس پر قائم بھی رہ سکتا ہے۔ ان وجوہ سے جب بندہ یہ چیز اپنے رب سے مانگتا ہے تو ایک ایسی چیز مانگتا ہے جو فی الحقیقت مانگنے کی بھی ہے اور تنہا اسی سے مانگنے کی ہے۔

دوسری چیز اس دعا کی تمہید ہے جو ہر پہلو سے ایک ایسی تمہید ہے جس سے بہتر تمہید کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کریم کے دروازے سے سائل کو سب کچھ مل سکتا ہے بشرطیکہ مانگنے کا طریقہ صحیح ہو۔ اس تمہید کے بعض پہلوؤں پر نگاہ ڈالیے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا آغاز اعترافِ شکر سے ہوا ہے۔ شکر کا حقیقی سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ٹھہرایا گیا ہے اور یہ شکر ہی وہ چیز ہے جس سے بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مستحق قرار پاتا ہے اور جتنا ہی اس میں ترقی کرتا جاتا ہے اسی حساب سے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے چنانچہ فرمایا ہے:

نِّعۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِىۡ مَنۡ شَكَرَ (۳۵ - قمر)	یہ ہماری طرف سے فضل ہوا اور ایسا ہی ہم بدلہ دیتے ہیں ان لوگوں کو جو ہمارے شکر گزار رہتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ (۷ - ابراھیم)	اگر تم میرے شکر گزار رہو گے تو میں تمہارے لیے اپنی نعمتوں میں اضافہ کرتا رہوں گا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جن صفتوں کے توسّل سے یہ دعا کی گئی ہے وہ دوسری تمام صفات کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔ اس وجہ سے اس دعا میں گویا اللہ تعالیٰ کے سارے ہی اسمائے حسنیٰ کا سہارا حاصل کر لیا گیا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں کامل سپردگی اور کامل حوالگی کا اظہار ہے۔ بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے دروازے پر ڈال دیتا ہے۔ اس دروازے کے سوا اس کے لیے اور کوئی دروازہ نہیں۔ بس ایک ہی ہے جس کی وہ بندگی کرتا ہے اور ایک ہی ہے جس سے وہ مدد کی درخواست کرتا ہے۔ جب اس طرح ساری دنیا سے کٹ کر بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دے گا تو آخر اس کی دعا کا ایک ایک حرف کیوں نہ شرفِ قبولیت پائے گا۔

اس دعا کے خاتمہ پر بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی اس کی قبولیت کے لیے ایک بہترین سفارش فراہم کرتا ہے۔ یہاں جس صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دعا کی گئی ہے، اوّل تو اس کے لیے جو اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے وہی اس مطلوب کے لیے بندے کے ذوق و شوق کا پورا پورا اظہار کر رہا ہے کیونکہ اِهْدِنَا کا مفہوم، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا رستہ بتا دے۔ بلکہ یہ بات بھی اس اسلوب میں چھپی ہوئی ہے کہ اس رستہ کے لیے ہماری آنکھیں کھول دے، اس پر چلنے کا ہمیں شوق اور ولولہ عطا فرما، ہمارے دلوں میں اس کی محبت جاگزیں کر دے اور اسی پر ہمیں چلنے کی توفیق دے اور اسی پر مرنے کی سعادت نصیب کر۔ ثانیاً اس کی مزید وضاحت ایسے الفاظ سے کی گئی ہے جن سے ان لوگوں کے ساتھ بندے کی محبت کا اظہار ہوتا ہے جو اسی رستے پر جیے اور مرے ہیں اور ان لوگوں سے انتہائی بیزاری کا اظہار ہے جنھوں نے شرارت یا حماقت کے سبب سے اس سے انحراف اختیار کیا ہے۔

اس دعا کی بے شمار بلاغتوں میں سے یہ چند ہیں جن کی طرف اجمالی طور پر ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اس سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ دعا نماز کی مخصوص دعا کیوں قرار دی گئی۔ اور کیوں یہ بات ہے کہ زبان سے نکلتے ہی اس کا لفظ لفظ شرفِ قبولیت حاصل کرتا ہے۔ ایک طرف دعا کے ان الفاظ کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف نماز کی مخصوص ہیئت اور اس کے مخصوص آداب کو ملحوظ رکھیے پھر تصور کیجیے کہ کتنی بہترین دعا ہے اور اس کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کتنا بہترین طریقہ ہمیں سکھایا ہے۔

۵۔ سورہ پر دیباچۂ قرآن ہونے کی حیثیت سے ایک نظر

قرآنی مطالب کے تین بنیادی عنوان

اس سورہ کو قرآن مجید کی ترتیب میں بھی دیباچۂ قرآن کی جگہ دی گئی ہے اور حدیثوں میں بھی اس کے جو مختلف نام آئے ہیں ان سے بھی اس کی یہی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً اس کو فاتحۃ الکتاب کہا گیا ہے جس کے صاف معنی دیباچۂ قرآن کے ہیں۔ اسی طرح اس کے لیے ام الکتاب یعنی مغزِ قرآن کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، جو پہلے لفظ سے بھی زیادہ اس کی اہمیت کو واضح کرنے والا ہے۔ کافیہ اور مُرقِیَہ بھی اس کے نام ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورہ اپنے اندر تمام قرآنی مطالب کو سمیٹے ہوئے ہے۔ مختصراً ہم سورہ کے اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک تین وجوہ سے اس سورہ کو دیباچۂ قرآن ہونے کا مرتبہ حاصل ہوا ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس سورہ میں دین اور شریعت کے نقطۂ آغاز کا پتہ دیا گیا ہے۔ یہ سورہ ہمیں بتاتی ہے کہ خدا پرستی کا اولین محرک کیا ہے۔ یہ محرک کن عوامل کا نتیجہ ہے۔ اس تحریک سے انسان خدا پرستی کی راہ میں پہلا قدم

کیا اٹھاتا ہے اور اس قدم کے بعد اس کے اندر اصل طلب و جستجو کس چیز کے لیے پیدا ہوتی ہے۔

ہر شخص یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ جس سورہ میں مذکورہ سوالوں کا جواب دیا گیا ہو وہی سورہ اپنے مضمون کے لحاظ سے دیباچۂ قرآن کی جگہ پانے کے لیے موزوں ترین سورہ ہے۔

اب آئیے ان اشارات کی روشنی میں، جو اوپر گزر چکے ہیں، یہ دیکھیے کہ یہ سورہ ان سوالوں کا کیا جواب دیتی ہے۔

یہ سورہ بتاتی ہے کہ آفاق اور انفس کے اندر خدا کی ربوبیت، اس کی رحمانیت اور رحیمیت اور اس کے عدل کی جو نشانیاں موجود ہیں وہ انسان کے اندر خدا کے شکر کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ یہ جذبہ ایک زوردار محرک بن کر انسان کو خدا کی عبادت اور اسی سے استعانت کے لیے اُکساتا ہے۔ اس کے بعد انسان میں اس سیدھے رستہ کی طلب و جستجو پیدا ہوتی ہے جو اس کو خدا تک پہنچائے۔ انسان کی اس طلب و جستجو کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ نے نبوت اور رسالت کا نظام قائم فرمایا اور اپنی ہدایت و شریعت نازل فرمائی۔ مذہب کی راہ میں انسان کا فطری ارتقا اسی طرح ہوا ہے اور اس سورہ میں یہ حقیقت چونکہ نہایت اجمال اور نہایت خوبی کے ساتھ واضح ہوئی ہے اس وجہ سے اس کو دیباچۂ قرآن کی جگہ ملی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن میں جو مطالب بیان ہوتے ہیں اگر ان کو سمیٹا جائے تو وہ تین عنوانوں کے تحت جمع کیے جا سکتے ہیں۔ توحید، قیامت، رسالت۔ یہ سورہ ان تینوں عنوانوں پر بنیادی رہنمائی دیتی ہے۔ اس وجہ سے اس نے گویا قرآن کے سارے علوم کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اس کی ابتدائی دو آیتوں میں خدا ہی کا تمام عالم کا مالک اور آقا ہونا اور تمام حمد و شکر کا سزاوار ہونا بیان ہوا ہے۔ اس کی تیسری آیت میں ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کی طرف بھی اشارہ ہے اور ساتھ ہی اس میں توحید کا مضمون بھی شامل ہے کہ اس دن اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کا بھی کوئی زور اور اختیار نہیں چلے گا۔ اس کی چوتھی آیت میں بندہ اپنے آپ کو بالکل اپنے رب کے حوالے کر دیتا ہے اور یہی توحید کی اصلی حقیقت ہے۔ پانچویں آیت میں اصل دعا ہے اور اس دعا ہی سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی سیدھی راہ معلوم کرنے کے لیے نبوت و رسالت کے سلسلہ اور اس کی نازل کردہ ہدایت و شریعت کا محتاج ہے۔ نیز اسی لپیٹ میں یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ خدائی شریعت پانے کے بعد کسی قوم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور اس کی قدر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالےٰ کیا معاملہ کرتا ہے۔ غرض اس سورہ کے اندر دین کے تمام بنیادی عناصر جمع ہیں۔ اگر ان کی تفصیل کر دی جائے تو دین کا پورا نظام کھڑا ہو جائے۔ گویا ان چند آیتوں کے اندر پورا قرآنِ عظیم بند ہے اور اس چھوٹے سے نگینہ کے اندر معانی و حقائق کا وہ پورا شہرستان دکھا دیا گیا ہے جو قرآن کے تیس پاروں کے اندر پھیلا ہوا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے باطن کی یہی پیاس، جو اس سورہ سے ظاہر ہو رہی ہے، درحقیقت نزولِ قرآن کا سبب بنی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس امت سے پہلے یہود اور نصاریٰ کو صراطِ مستقیم دکھائی تاکہ وہ خود بھی اس پر چلیں اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی دعوت دیں لیکن وہ اس راہ پر نہ خود قائم رہے اور نہ دوسروں کے لیے

انھوں نے اس کے نشانات باقی رہنے دیئے۔ اس راہِ حق کو گم کر کے انھوں نے دنیا کو جاہلیت کے اندھیرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ سورہ اسی اندھیرے سے نکلنے کی دعا ہے اور ایک ایسی دعا ہے جو فطرتِ انسانی کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔ یہی دعا ہے جس کی برکت سے دنیا کو قرآن کی روشنی ملی اور جاہلیت کی تاریکی سے نکلنا نصیب ہوا۔ اور یہی دعا ہے جو قرآن کے فہم و تدبر اور اس سے زندگی کے مسائل میں رہنمائی حاصل کرنے کے معاملہ میں بھی ہمارے قدم کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھ سکتی ہے۔ اس پہلو سے بھی یہ سورہ دیباچۂ قرآن بننے کے لیے نہایت موزوں تھی۔

۔ سورہ کا تعلق بعد کی سورہ سے

پورے قرآن سے اس سورہ کا جو تعلق ہے وہ اوپر کی بحث سے اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔ اب ہم اس کا تعلق بعد کی سورہ (سورۂ بقرہ) سے واضح کرنا چاہتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کے آخری حصہ اور سورۂ بقرہ کی پہلی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سورتوں میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایک دعا اور اس کے جواب یا ایک دعا اور اس کے اثر اور اس کی قبولیت میں ہوتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ (ہمیں سیدھے رستہ کی ہدایت دے، ان لوگوں کے رستہ کی جن پر تو نے انعام کیا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ) اس کے معاً بعد سورۂ بقرہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔ الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ (الٓمّٓ۔ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ خدا ترسوں کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے) گویا سورۂ فاتحہ میں جس آسمانی ہدایت و رہنمائی کے لیے دعا کی گئی تھی، سورہ بقرہ میں وہ ہدایت سامنے آگئی۔ ایک صاحبِ ذوق جب دعا کے فوراً بعد اس کے اس اثر اور نتیجہ کو سامنے موجود دیکھتا ہے تو اس کی روح خدا کے شکر کے جذبہ سے سرشار ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیے، وہ یہ کہ سورۂ فاتحہ میں مُنعَم علیہم گروہ کے رستہ کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ مغضوب اور گمراہ گروہوں کے طریقوں سے بچائے جانے کی بھی دعا ہے۔ دعا کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر جب آدمی سورۂ بقرہ کی تلاوت کرتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس سورہ میں ملتِ ابراہیمی کی تجدید کے ساتھ ساتھ یہود کے ان تمام جرائم کی فہرست بھی بیان ہوئی ہے جو انہوں نے خدا، اس کے نبیوں اور رسولوں اور اس کی شریعت کے خلاف کیے ہیں اور جن کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ٹھہرے کہ ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور وہ قوموں کی امامت کے منصب سے معزول کیے جائیں۔ گویا سورۂ فاتحہ میں جس انعام یافتہ اور اس کے بالمقابل جس مغضوب گروہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ تھا سورۂ بقرہ میں ان دونوں گروہوں سے متعلق پوری تفصیل سامنے آگئی اور واضح ہو گیا کہ کن کی پیروی کرنی ہے اور کن کے طریقوں سے بچنا ہے۔

بالکل یہی صورت سورہ آل عمران کی ہے جو سورۂ بقرہ کے بعد ہے۔ بقرہ میں جس طرح یہود کی شرارتوں کی

تفصیل ہے اسی طرح آل عمران میں نصاریٰ کی بدعتوں اور ان کی گمراہیوں کی تردید کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس میں اس اسلام کی صحیح تصویر بھی پیش کی گئی ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیائے کرام بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام نے دی ہے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد ترتیب قرآن میں انہی دو بڑی سورتوں کا جگہ پانا اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ بعد کی دونوں سورتیں سورۂ فاتحہ کی دعا کی مقبولیت اور اس کے آخری حصہ کے اجمالات کی شرح ہیں۔

تدبرِ قرآن

۲

البقرۃ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود

سورہ کا مرکزی مضمون دعوت ایمان ہے

اس سورہ کا مرکزی مضمون دعوتِ ایمان ہے۔ ایمان کی طرف اشارہ تو، جیساکہ ہم نے بیان کیا، سورۂ فاتحہ میں بھی ہو چکا ہے لیکن وہ اجمالی ایمان ہے جو جذبۂ شکر کی تحریک اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و رحمت کی نشانیوں کے مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سورہ میں اس اجمال نے تفصیل کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اس میں نہایت واضح طور پر قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ گویا سورۂ فاتحہ میں ایمان باللہ کا ذکر ہے اور سورۂ بقرہ میں ایمان بالرسالت کا۔

ایمان بالرسالت کی اہمیت

ایمان کی اصلی حقیقت ایمان بالرّسالت ہی سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اگر ایمان بالرّسالت موجود نہ ہو تو مجرد ایمان باللہ ہماری زندگی کو اللہ کے رنگ میں نہیں رنگ سکتا۔ زندگی پر اللہ کا رنگ اسی وقت چڑھتا ہے جب ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ایمان بالرسالت بھی پایا جائے۔

ایمان بالرسالت پیدا ایمان باللہ ہی سے ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پہلی چیز اس دوسری چیز ہی کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔ ایمان باللہ سے بندہ کے اندر خدا کی ہدایت کے لیے ایک پیاس اور ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ یہی پیاس اور تڑپ ہے جس کا اظہار سورۂ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا سے ہو رہا ہے۔ اسی دعا کے جواب میں یہ سورۂ بقرہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دے رہی ہے۔ گویا بندے کو بتایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی کے حق کو تسلیم کر چکنے کے بعد اس کے راستہ کی تلاش ہے تو اس کتاب پر اور اس رسول پر ایمان لاؤ جس پر یہ کتاب اتری۔

اس حقیقت کی روشنی میں اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سورۂ فاتحہ اگرچہ بظاہر ایک نہایت چھوٹی سی سورہ ہے، لیکن فی الحقیقت وہ ایک نہایت ہی عظیم الشان سورہ ہے۔ کیونکہ اس کے تنے سے پہلی ہی شاخ جو پھوٹی ہے وہی اتنی بڑی ہے کہ ہماری ساری زندگی پر حاوی ہو گئی ہے۔ اس سے ہماری اس بات کی تصدیق ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے کہ پورا قرآن درحقیقت اسی سورۂ فاتحہ کے تخم سے پیدا ہوا ہے اور یہ اسی شجرہ طیبہ کے برگ و بار ہیں جو قرآن کے پورے تیس پاروں میں پھیلے

ہوتے ہیں۔

ب۔ سورہ میں خطاب

اس سورہ میں اصل خطاب یہود سے ہے

اس سورہ میں اصل خطاب تو یہود سے ہے لیکن ضمناً اس میں جگہ جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، مسلمانوں کو، اور بنی اسمٰعیل کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔

یہود کو مخاطب کر کے ان کے ان تمام مزعومات و توہمات کی تردید کی گئی ہے جن کے سبب سے وہ اپنے آپ کو پیدائشی حقدارِ امامت و سیادت سمجھے بیٹھے تھے اور کسی ایسے نبی پر ایمان لانا اپنی توہین سمجھتے تھے جو ان کے خاندان سے باہر امی عربوں میں پیدا ہوا ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے جگہ جگہ آپ کو صبر و استقامت کی نصیحت کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت جو دعا کی تھی آپ اس دعا کے مظہر ہیں۔ مخالفین کی تمام حاسدانہ سرگرمیوں کے علی الرغم آپ کی دعوت کامیاب ہو کے رہے گی اور اللہ تعالیٰ آپ کے دین کو غالب کرے گا۔

مسلمانوں سے خطاب کر کے یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلق پر اپنے دین کی حجت تمام کرنے کے لیے ان کو ایک مستقل امت کی حیثیت سے مامور کیا ہے اور اپنی آخری شریعت کا ان کو امین بنایا ہے، انہیں چاہیئے کہ وہ اس امانت کی قدر کریں اور اس کے حامل بنیں تاکہ وہ خلق کے رہنما اور اپنے بعد والوں کے لیے نمونہ اور مثال بن سکیں۔

اسی ضمن میں ان کو جگہ جگہ یہود کی ان حاسدانہ سرگرمیوں سے بھی آگاہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرنے، ان کو ورغلانے اور ان کو آخری بعثت کی نعمتوں سے محروم کرنے کے لیے ان کی طرف سے ظاہر ہو رہی تھیں۔

بنی اسماعیل کو مخاطب کر کے ان کے سامنے اصل دینِ ابراہیمی ان تمام بدعتوں اور خرابیوں سے پاک کر کے پیش کیا گیا ہے جو مشرکین اور یہود نے اس میں پیدا کر دی تھیں اور ساتھ ہی ان پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنا آخری نبی تمہارے اندر سے اٹھایا، اور تمہیں ایک امت مسلمہ بنانا چاہا، تم اس احسان کی قدر کرو اور یہودیوں کی حاسدانہ چالوں کے چکر میں نہ پھنسو، ورنہ تم پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا تفصیلی تجزیہ تو اس وقت سامنے آئے گا جب ہم آیات کے مناسب حصّوں کو الگ

الگ سے کران کی تفسیر کریں گے لیکن یہاں بھی ہم اس کے مطالب کا ایک سرسری جائزہ پیش کیے دیتے ہیں۔ اس سے سورہ کے عمود کے ساتھ اس کے ہر حصہ کا تعلق بھی سمجھنے میں مدد ملے گی اور سورہ پر بحیثیت مجموعی ایک اجمالی نظر بھی پڑ جائے گی۔

ہمارے نزدیک مضامین کی تقسیم کے لحاظ سے یہ سورہ ایک تمہید، چار ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

[۱-۳۹] یہ حصہ تمہیدی ہے۔ اس میں پہلے تو یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس کتاب پر کون لوگ ایمان لائیں گے، کون لوگ ایمان نہیں لائیں گے پھر ایمان نہ لانے والوں کی رکاوٹیں اور ان کی ذہنی الجھنیں بیان ہوتی ہیں جن میں وہ قرآن کے نزول کے بعد مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی ضمن میں بنی اسمٰعیل کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ان پر اللہ کی اس کتاب نے حجت تمام کر دی ہے، اب ان کی شامت ہی ہے جو یہودی فتنہ پردازوں کے چکموں میں آکر وہ اپنے آپ کو اس نعمت عظمیٰ سے محروم کر بیٹھیں۔

یہ تمہیدی حصہ آدم کی خلافت اور شیطان کی حاسدانہ مخالفت کی سرگزشت پر ختم ہوتا ہے۔ آدم اور شیطان کی یہ سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں اس تمام مخالفت اور موافقت کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور قرآن کی دعوت سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ فرشتوں کا آدم کی خلافت پر اعتراض کرنا اور اپنے اعتراض کا جواب پا جانے کے بعد مطمئن ہو جانا مثال ہے ان لوگوں کی مخالفت کی جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے بعض پہلو نہ سمجھنے کے سبب سے شروع شروع میں آپ کی رسالت کے بارہ میں متردد یا اس کے مخالف رہے لیکن چونکہ یہ لوگ نیک دل اور حق پسند تھے، حاسد اور ہٹ دھرم نہ تھے، اس وجہ سے جونہی ان پر اصل حقیقت واضح ہو گئی وہ آپ کے حامی اور مددگار بن گئے۔

اس کے برخلاف شیطان کی مخالفت مثال ہے ان لوگوں کی مخالفت کی جو غرور نسب، غرور جاہ یا حسد کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے۔ مثلاً یہود اور سرداران قریش۔ اس طرح کی مخالفت کرنے والوں کی مخالفت اصل حقیقت کے واضح ہونے سے دور نہیں ہوتی بلکہ اور زیادہ بڑھ جایا کرتی ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی صداقت جتنی ہی زیادہ واضح ہوتی گئی اتنی ہی ان لوگوں کی عداوت بھی بڑھتی گئی۔

اس تصویر میں یہود اور ان کے ہم نواؤں پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ آدمؑ کی خلافت کے خلاف جس نوعیت کا غم و غصہ اور حسد ابلیس کو تھا اسی نوعیت کا غم و غصہ اور حسد اللہ کے آخری رسولؐ کے خلاف تم کو ہے۔ اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ جس طرح ابلیس کے غم و غصہ کے علی الرغم آدمؑ کی خلافت

قائم ہو کے رہی۔ اسی طرح تمہاری دشمنی اور تمہارے حسد کے علی الرغم نبی امی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت قائم ہو کے رہے گی۔

یہود کو دعوت

[۳۹-۱۲۱] اس حصہ میں بنی اسرائیل کو تصریح کے ساتھ مخاطب کر کے پہلے ان کو اس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس نبی امی پر ایمان لائیں جس کی بعثت کی پیشین گوئیاں خود ان کے اپنے صحیفوں میں بھی موجود ہیں۔ پھر ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جس دعوتِ حق کی تائید و حمایت میں سبقت کرنے کے لیے ان سے تورات میں عہد لیا جا چکا ہے، دنیا پرستی اور حسد میں مبتلا ہو کر اس کی مخالفت کے لیے سبقت نہ کریں۔ نیز اس ذلیل مقصد کے لیے حق اور باطل کو باہم گڈمڈ کرنے کا جو کاروبار انہوں نے جاری کر رکھا ہے اس سے باز آئیں۔ اور اس جہادِ نفس میں صبر اور نماز سے مدد حاصل کریں۔ (۴۰-۴۶)

اس کے بعد یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا کے ہاں عزت و تقرب کا ذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے نہ کہ کسی خاص خاندان یا کسی خاص گروہ سے وابستہ ہونا۔ یہود اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کو جو عزت و عظمت حاصل ہوئی ہے وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اس غلط فہمی کے سبب سے ان کا سارا اعتماد ایمان اور عمل صالح کے بجائے محض اپنی خاندانی اور گروہی نسبت پر رہ گیا تھا۔ اور یہ غرہ ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے میں بہت بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہاں ان پر واضح کیا گیا ہے کہ تمام فضل و کرم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، جو فضل بھی تم پر ہوا ہے اسی کی طرف سے ہوا ہے اور جو فضل بھی ہوگا اسی کی طرف سے ہوگا۔ اس نے تم پر فضل بھی بڑے بڑے کیے ہیں اور تمہاری ناشکریوں پر تم کو سزائیں بھی بار بار دی ہیں۔ اس وجہ سے خاندان اور نسب کی نسبتوں کے بجائے اللہ کی طرف رجوع کرو اور اوہام میں مبتلا ہو کر حقائق سے منہ نہ موڑو۔ (۴۷-۶۳)

یہود کو تنبیہ

اس کے بعد یہود کی عہد شکنیوں کی پوری تاریخ بیان ہوئی ہے کہ انہوں نے کس کس طرح خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمان اور خدا کے دیے ہوئے احکام توڑے ہیں اور عہد شکنی اور غداری کے لیے کیسی مجرمانہ ذہنیت شروع ہی سے ان کے اندر پرورش پاتی رہی ہے۔ نیز ان کے وہ اوہام اور وہ مشاغل بھی بیان ہوئے ہیں جن میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے ان کی نگاہوں میں خدا اور اس کی شریعت اور اس کی کتاب کی کوئی قدر سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔

یہ ساری تفصیل یہود پر یہ واضح کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ وہ کتاب الٰہی کے حامل ہونے کے مدعی ہیں لیکن فی الحقیقت انہوں نے اس کتاب کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے تمام عہد و پیمان انہوں نے توڑ ڈالے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے منصب امامت سے معزول کرے اور یہ امانت ان کے حوالہ کرے جو اس کے اہل ہوں۔ (۶۴-۱۲۱)

حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت

[۱۲۲-۱۶۲] اس باب میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کا وہ حصہ بیان ہوا ہے جو خانہ کعبہ کی تعمیر نیز ایک امت

مسلمہ کے قیام اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی دعا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں پہلے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کا دین اسلام تھا، نہ کہ یہودیت و نصرانیت۔ اسی اسلام کی دعوت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک امتِ وَسط پیدا کی ہے۔ اس امتِ وسط کا قبلہ دعائے ابراہیمی کے بموجب مسجد حرام ہے نہ کہ بیت المقدس۔ بیت المقدس کی طرف اس کا نماز پڑھنا محض ایک عارضی معاملہ تھا چنانچہ اس کا قبلہ بدل دیا گیا۔

اس کے بعد ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ یہ قبلہ چونکہ ابھی مشرکین کے قبضہ میں ہے، اس وجہ سے اس کو حاصل کرنے کے لیے اہلِ ایمان کو جان اور مال کی قربانیاں بھی دینی پڑیں گی۔ اور اس جہاد میں کامیابی اللہ تعالیٰ کی مدد سے حاصل ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ مدد صبر اور نماز کے ذریعے سے حاصل ہوگی۔

اس ساری سرگزشت کے سنانے سے مقصود چونکہ یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس پیغمبر اور جس امت کے لیے دعا کی تھی وہ یہی ہیں، انہی کی دعوت اصل ملتِ ابراہیمی کی دعوت اور انہی کا قبلہ اصل قبلۂ ابراہیمی ہے۔ اس وجہ سے اس میں خانہ کعبہ اور مَروہ وغیرہ سے متعلق یہود کی وہ تمام تحریفات بھی بے نقاب کی گئی ہیں جو انھوں نے اپنے صحیفوں میں اس خیال سے کی تھیں کہ خانہ کعبہ اور مروہ کی قربان گاہ کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعلق کی ہر شہادت ریکارڈ سے حذف کردیں۔

احکام و قوانین

[۱۶۳ - ۲۴۲] یہ احکام و قوانین کا باب ہے۔ ملتِ مسلمہ کو جو شریعت عطا ہوئی ہے اس باب میں اس شریعت کے بنیادی قوانین بیان ہوئے ہیں۔ یہود یا مشرکین نے ان احکام میں جو تحریفات کردی تھیں یا جو بدعتیں شامل کردی تھیں اس باب میں ان بدعتوں اور تحریفات سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ان احکام کے بیان کرنے میں فقہی ترتیب ملحوظ نہیں ہے بلکہ وقت کے حالات اور تعلیم و تربیت کے مصالح نے جس ترتیب کا تقاضا کیا ہے وہ ترتیب ملحوظ ہے۔ بالاجمال یہ احکام یہ ہیں: توحید (۱۶۳ - ۱۷۶) نماز اور زکوٰۃ (۱۷۷) قصاص اور دیت (۱۷۸، ۱۷۹) وصیت (۱۸۰ - ۱۸۲) روزہ (۱۸۳ - ۱۸۷) حرام خوری اور رشوت کی ممانعت (۱۸۸) حج اور اس تعلق سے جہاد اور انفاق کے احکام کیونکہ اس وقت تک خانہ کعبہ پر مشرکین کا قبضہ تھا (۱۸۹ - ۲۱۸) شراب اور جوئے کی ممانعت، یتامیٰ کی اصلاحِ حال کے خیال سے ان کے معاملات کو اپنے معاملات کے ساتھ ملا لینے کی اجازت، مشرکات کے ساتھ نکاح کی ممانعت[۱] (۲۱۹ - ۲۲۱) نکاح، طلاق، ایلاء، خلع، رضاعت، نان نفقہ زوجہ متوفی عنہا، مہر اور ازدواجی زندگی سے متعلق دوسرے مسائل (۲۲۲ - ۲۴۲)

جہاد

[۲۴۳ - ۲۸۳] اس باب میں مرکز ملتِ ابراہیمی — خانہ کعبہ — کو کفار کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا گیا ہے۔ اس جہاد ہی کے مقصد سے انفاق کا جذبہ بھڑکایا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنے قبلہ کو فلسطینیوں سے آزاد کرانے کے لیے جو جنگ لڑی اور جو مختلف پہلوؤں سے ہمارے غزوہ بدر سے مشابہ

---

[۱] یہ تینوں مسائل جیسا کہ ہم آگے چل کر ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے واضح کریں گے۔ انفاق کے حکم کے تعلق سے پیدا ہوئے ہیں۔

تھی، اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ پھر ایک جملہ معترضہ کے بعد انفاق پر مزید زور دیا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں مثالوں سے واضح فرمایا گیا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جن کو خدا تاریکی سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور کس طرح کے لوگوں کو تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد انفاق کی برکات، اس کے شرائط اس کی خصوصیات اور اس کے بعض اہم مصارف کی طرف اشارات ہیں اور ساتھ ہی جو چیز اس کی بالکل ضد ہے یعنی سود، اس کی حرمت بیان کی گئی ہے اور قرض کے لین دین میں جو احتیاط اسلامی نقطۂ نظر سے ضروری ہے، اس کے متعلق بعض احکام دیے گئے ہیں۔

خاتمہ [۲۸۴ - ۲۸۶] اس حصہ کی حیثیت سورہ کے خاتمہ کی ہے۔ اس میں پہلے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ آسمانُ زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔ وہ تمام کھلے اور ڈھکے کا حساب لے گا اور پھر جس کو چاہے گا بخشے گا، اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اس کے بعد یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ یہ کتاب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری گئی ہے کوئی اس کو مانے یا نہ مانے لیکن اللہ تعالےٰ کے رسولؐ اور اہلِ ایمان نے اس کو مان لیا ہے۔ اس کے بعد اہل ایمان کی دعا پر یہ سورہ ختم ہوتی ہے۔ اس دعا کے لفظ لفظ سے کتابِ الٰہی کے بارہ میں اس عظیم ذمہ داری کا احساس نمایاں ہو رہا ہے جس کو یہود اور نصاریٰ سنبھال نہ سکے اور جو اب اس امت پر ڈالی جا رہی ہے۔

سُورَةُ الْبَقَرَةِ (٢)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ٢٨٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

آیات ١-٥ الٓمّٓ ۝١ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٢
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝٣ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝٤ اُولٰٓئِكَ
عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٥

ترجمہ آیات ١-٥ یہ الف، لام، میم ہے۔ یہ کتابِ الٰہی ہے۔ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔
ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ ان لوگوں کے لیے جو غیب میں رہتے ایمان لاتے
ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور ان کے
لیے جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور آخرت پر
یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔
١-٥

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حروف مقطعات سورتوں کے نام ہیں

الٓمّٓ: یہ ایک مستقل جملہ ہے۔ عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق یہاں مبتدا محذوف ہے۔ اس کو ظاہر کردیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ ھٰذا الٓمّٓ (یہ الف، لام، میم ہے) ہم نے ترجمہ میں اس حذف کو کھول دیا ہے۔

یہ اور اس طرح کے جتنے حروف بھی مختلف سورتوں کے شروع میں آتے ہیں چونکہ الگ الگ کرکے پڑھے جاتے ہیں اس وجہ سے ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔

یہ جس سورہ میں بھی آتے ہیں بالکل شروع میں اس طرح آتے ہیں جس طرح کتابوں، فصلوں اور ابواب کے شروع میں ان کے نام آیا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ ذٰلِکَ اور تِلْکَ کے ذریعہ سے ان کی طرف اشارہ کرکے ان کے نام ہونے کو اور زیادہ واضح کردیا ہے۔ حدیثوں سے بھی ان کا نام ہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

جو سورتیں ان ناموں سے موسوم ہیں اگرچہ ان میں سے سب اپنے انہی ناموں سے مشہور نہیں ہوئیں، بلکہ بعض دوسرے ناموں سے مشہور ہوئیں لیکن ان میں سے کچھ اپنے انہی ناموں سے مشہور بھی ہیں۔ مثلاً طٰہٰ، یٰسٓ، قٓ اور نٓ وغیرہ۔

'مقطعات' کے معانی

ان ناموں کے معانی کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا بڑا مشکل ہے اس وجہ سے ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ قرآن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ایک بالکل واضح کتاب ہے، اس میں کوئی چیز بھی چیستاں یا معمے کی قسم کی نہیں ہے، پھر اس نے سورتوں کے نام ایسے کیوں رکھ دیے جن کے معنی کسی کو بھی نہیں معلوم؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک ان حروف کا تعلق ہے یہ اہل عرب کے لیے کوئی بیگانہ چیز نہیں تھے بلکہ وہ ان کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس واقفیت کے بعد قرآن کی سورتوں کا ان حروف سے موسوم ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے قرآن کے ایک واضح کتاب ہونے پر کوئی حرف آتا ہو۔ البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح حروف سے نام بنا لینا عربوں کے مذاق کے مطابق تھا بھی یا نہیں تو اس چیز کے مذاق عرب کے مطابق ہونے کی سب سے بڑی شہادت تو یہی ہے کہ قرآن نے نام رکھنے کے اس طریقہ کو اختیار کیا۔ اگر نام رکھنے کا یہ طریقہ کوئی ایسا طریقہ ہوتا جس سے اہل عرب بالکل ہی نامانوس ہوتے تو وہ اس پر ضرور ناک بھوں چڑھاتے اور ان حروف کی آڑ لے کر کہتے کہ جس کتاب کی سورتوں کے نام تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتے اس کے ایک کتاب مبین ہونے کے دعوے کو کون تسلیم کرسکتا ہے۔

قرآن پر اہل عرب نے بہت سے اعتراضات کئے اور ان کے یہ سارے اعتراض قرآن نے نقل بھی کیے ہیں لیکن ان کے اس طرح کے کسی اعتراض کا کوئی ذکر نہیں لیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان ناموں میں ان کے لیے

کوئی اجنبیت نہیں تھی۔

علاوہ بریں جن لوگوں کی نظر اہل عرب کی روایات اور ان کے لٹریچر پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اہل عرب نہ صرف یہ کہ اس طرح کے ناموں سے نامانوس نہیں تھے بلکہ وہ خود اشخاص، چیزوں، گھوڑوں، جھنڈوں، تلواروں حتیٰ کہ قصائد اور خطبات تک کے نام اسی سے ملتے جلتے رکھتے تھے۔ یہ نام مفرد حروف پر بھی ہوتے تھے اور مرکب بھی ہوتے تھے۔ ان میں یہ اہتمام بھی ضروری نہیں تھا کہ اسم اور مسمّٰی میں کوئی معنوی مناسبت پہلے سے موجود ہو بلکہ یہ نام ہی بتاتا تھا کہ یہ نام اس مسمّٰی کے لیے وضع ہوا ہے۔

اور یہ ایک بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ایک شے کے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ یہ نام ہے تو پھر اس کے معنی کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ نام سے اصل مقصود مسمّٰی کا اس نام کے ساتھ خاص ہو جانا ہے نہ کہ اس کے معنی۔ کم از کم فہم قرآن کے نقطۂ نظر سے ان ناموں کے معانی کی تحقیق کی تو کوئی خاص اہمیت ہے نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ چونکہ یہ نام اللہ تعالےٰ کے رکھے ہوئے ہیں اس وجہ سے آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ضرور یہ کسی نہ کسی مناسبت کی بنا پر رکھے گئے ہوں گے۔ یہ خیال فطری طور پر طبیعت میں ایک جستجو پیدا کر دیتا ہے۔ اسی جستجو کی بنا پر ہمارے بہت سے پچھلے علماء نے ان ناموں پر غور کیا اور ان کے معنی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی جستجو سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا لیکن ہمارے نزدیک ان کا یہ کام بجائے خود غلط نہیں تھا اور اگر ہم بھی ان پر غور کریں گے تو ہمارا یہ کام بھی غلط نہیں ہو گا۔ اگر اس کوشش سے کوئی حقیقت واضح ہوئی تو اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہو گا اور اگر کوئی بات نہ مل سکی تو اس کو ہم اپنے علم کی کوتاہی اور قرآن کے اتھاہ ہونے پر محمول کریں گے۔ یہ رائے بہرحال نہیں قائم کریں گے کہ یہ نام ہی بے معنی ہیں۔

اپنے علم کی کمی اور قرآن کے اتھاہ ہونے کا یہ احساس بجائے خود ایک بہت بڑا علم ہے۔ اس احساس سے علم و معرفت کی بہت سی بند راہیں کھلتی ہیں۔ اگر قرآن کا پہلا ہی حرف اس عظیم انکشاف کے لیے کلید بن جائے تو یہ بھی قرآن کے بہت سے معجزوں میں سے ایک معجزہ ہو گا۔ یہ اسی کتاب کا کمال ہے کہ اس کے جس حرف کا راز کسی پر نہ کھل سکا اس کی پیدا کردہ کاوش ہزاروں سربستہ اسرار سے پردہ اٹھانے کے لیے دلیلِ راہ بنی۔

حروف مقطعات کے متعلق امام فراہیؒ کا نقطۂ نظر

ان حروف پر ہمارے پچھلے علماء نے جو رائیں ظاہر کی ہیں ہمارے نزدیک وہ تو کسی مضبوط بنیاد پر مبنی نہیں ہیں اس وجہ سے ان کا ذکر کرنا کچھ مفید نہیں ہو گا۔ البتہ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اجمالاً میں یہاں پیش کرتا ہوں۔ اس سے اصل مسئلہ اگرچہ حل نہیں ہوتا لیکن اس کے حل کے لیے ایک راہ کھلتی ضرور نظر آتی ہے۔ کیا عجب کہ مولانا نے جو سراغ دیا ہے دوسرے اس کی رہنمائی سے کچھ مفید نشاناتِ راہ اور معلوم کر لیں اور اس طرح درجہ بدرجہ تحقیق کے قدم کچھ اور آگے بڑھ جائیں۔

جو لوگ عربی رسم الخط کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف عبرانی سے لیے گئے ہیں اور عبرانی کے یہ حروف ان حروف سے ماخوذ ہیں جو عرب قدیم میں رائج تھے۔ عرب قدیم کے ان حروف

کے متعلق استاذ امامؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ انگریزی اور ہندی کے حروف کی طرح صرف آواز ہی نہیں بتاتے تھے بلکہ یہ چینی زبان کے حروف کی طرح معانی اور اشیاء پر بھی دلیل ہوتے تھے اور جن معانی یا اشیاء پر وہ دلیل ہوتے تھے عموماً انہی کی صورت و ہیئت پر لکھے بھی جاتے تھے۔ مولاناؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہی حروف ہیں جو قدیم مصریوں نے اخذ کیے اور اپنے تصورات کے مطابق ان میں ترمیم و اصلاح کر کے ان کو اس خط تمثالی کی شکل دی جس کے آثار اہرام مصر کے کتبات میں موجود ہیں۔

ان حروف کے معانی کا علم اب اگرچہ مٹ چکا ہے تاہم بعض حروف کے معنی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں بھی ان کی قدیم شکل کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ مثلاً الف کے متعلق معلوم ہے کہ وہ گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت ہی پر لکھا جاتا تھا۔ "ب" کو عبرانی میں بیت کہتے بھی ہیں اور اس کے معنی بھی "بیت" (گھر) کے ہیں۔ "ج" کا عبرانی تلفظ جیمل ہے جس کے معنی جمل (اونٹ) کے ہیں۔ "ط" سانپ کے معنی میں آتا تھا اور لکھا بھی کچھ سانپ ہی کی شکل پر جاتا تھا۔ "م" پانی کی لہر پر دلیل ہوتا تھا اور اس کی شکل بھی لہر سے ملتی جلتی بنائی جاتی تھی۔

مولانا اپنے نظریہ کی تائید میں سورہ "ن" کو پیش کرتے ہیں۔ حرف "نون" اب بھی اپنے قدیم معنی ہی میں بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی مچھلی کے ہیں اور جو سورہ اس نام سے موسوم ہوئی ہے اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر صاحب الحوت (مچھلی والے) کے نام سے آیا ہے۔ مولانا اس نام کو پیش کر کے فرماتے ہیں کہ اس سے ذہن قدرتی طور پر اس طرف جاتا ہے کہ اس سورہ کا نام نونؔ (ن) اسی وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں صاحب الحوت (یونس علیہ السلام) کا واقعہ بیان ہوا ہے جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا۔ پھر کیا عجب ہے کہ بعض دوسری سورتوں کے شروع میں جو حروف آئے ہیں وہ بھی اپنے قدیم معانی اور سورتوں کے مضامین کے درمیان کسی مناسبت ہی کی بنا پر آئے ہوں۔

قرآن مجید کی بعض اور سورتوں کے ناموں سے بھی مولانا کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حرف "ط" کے معنی، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، سانپ کے تھے اور اس کے لکھنے کی ہیئت بھی سانپ کی ہیئت سے ملتی جلتی ہوتی تھی۔ اب قرآن میں سورہ طٰہٰ کو دیکھیے جو "ط" سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں ایک مختصر تمہید کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی لٹھیا کے سانپ بن جانے کا قصہ بیان ہوتا ہے۔ اسی طرح طسم، طس وغیرہ بھی "ط" سے شروع ہوتی ہیں اور ان میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لٹھیا کے سانپ کی شکل اختیار کر لینے کا معجزہ مذکور ہے۔

"الف" کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ گائے کے سر کی ہیئت پر لکھا بھی جاتا تھا اور گائے کے معنی بتاتا بھی تھا۔ اس کے دوسرے معنی اللہ واحد کے ہوتے تھے۔ اب قرآن مجید میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سورۂ بقرہ میں، جس کا نام الف سے شروع ہوتا ہے، گائے کے ذبح کا قصہ بیان ہوا ہے۔ دوسری سورتیں جن کے نام الف سے شروع

ہوتے ہیں توحید کے مضمون میں مشترک نظر آتی ہیں، یہ مضمون ان میں خاص اہتمام کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان ناموں کا یہ پہلو بھی خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ جن سورتوں کے نام ملتے جلتے سے ہیں ان کے مضامین بھی ملتے جلتے ہیں بلکہ بعض سورتوں میں تو اسلوبِ بیان تک ملتا جلتا ہے۔

میں نے مولانا کا یہ نظریہ، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، محض اس خیال سے پیش کیا ہے کہ اس سے حروف مقطعات پر غور کرنے کے لیے ایک علمی راہ کھلتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی حیثیت ابھی تک ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جب تک تمام حروف کے معانی کی تحقیق ہو کر ہر پہلو سے ان ناموں اور ان سے موسوم سورتوں کی مناسبت واضح نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر ایک نظریہ سے زیادہ اعتماد کر لینا صحیح نہیں ہوگا۔ یہ محض علومِ قرآن کے قدر دانوں کے لیے ایک اشارہ ہے، جو لوگ مزید تحقیق و جستجو کی ہمت رکھتے ہیں وہ اس راہ میں قسمت آزمائی کریں، شاید اللہ تعالےٰ اس راہ سے یہ مشکل آسان کر دے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (٢)

ذٰلِكَ :- اہلِ نحو کہتے ہیں کہ "ذٰلِكَ" اشارہ بعید کے لیے آتا ہے اور "هٰذَا" اشارہ قریب کے لیے۔ اس سے عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر کسی فاصلہ کی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو تو 'ذٰلِكَ' لائیں گے اور اگر قریب کی کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو تو 'هٰذَا' استعمال کریں گے۔ لیکن اہل نحو کا مطلب قرب اور بعید سے یہ نہیں ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز مخاطب کے علم میں ہے یا جس کا ذکر گفتگو میں ہو چکا ہے اگر اس کی طرف اشارہ کرنا ہو تو وہاں 'ذٰلِكَ' استعمال کریں گے اور اگر کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو جس کا ذکر آگے آ رہا ہو تو وہاں 'هٰذَا'[1] لائیں گے۔ اہلِ زبان ان دونوں اشارات کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر کبھی ان کو اس عام ضابطہ کے خلاف استعمال کرتے ہیں تو بلاغت کے کسی نکتہ کو ملحوظ رکھ کر کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی سابق الذکر چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے 'هٰذَا' استعمال کر دیں تو اس سے مقصود اس شے کو نگاہوں کے سامنے حاضر کر دینا ہوگا۔ اسی طرح اگر کہیں 'هٰذَا' کی جگہ 'ذٰلِكَ' استعمال ہوتا ہے تو اس سے عموماً مقصود اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی شان اس سے ارفع ہے کہ اس کو سامنے لا کھڑا کیا جائے۔

اشارہ قریب و بعید کی حقیقت

یہاں ذٰلِكَ کا اشارہ سورہ کے اس نام کی طرف ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ الٓمّٓ قرآن عظیم کا ایک حصہ ہے۔ قرآن میں اس قسم کے اشارات کی نظیریں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً حٰمٓ

---

[1] ان اشارات میں مذکر و مؤنث کا فرق بلاغت کے بعض تقاضوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہاں ہم تحقیق الفاظ میں ایک خاص حد سے آگے نہیں جانا چاہتے اس وجہ سے ان چیزوں سے زیادہ تعرض نہیں کریں گے جو دوسرے اہلِ تحقیق کی کتابوں میں بھی آسانی سے مل سکیں گی۔ بس اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ کبھی اشارہ میں معہود ذہنی کتاب یا قرآن ہوتا ہے کبھی سورہ۔ اس وجہ سے اشارہ کہیں ذٰلِكَ آتا ہے اور کہیں تِلْكَ۔

عٓسٓقٓ ۔ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (شوریٰ ۱-۳)

(یہ حٰم، عسق ہے۔ اسی طرح خدائے عزیز و حکیم تمہاری طرف وحی کرتا ہے اور اسی طرح اس نے ان لوگوں کی طرف وحی کی جو تم سے پہلے گزرے) طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ (النمل) (یہ طس ہے۔ یہ قرآن اور ایک کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔

لفظ کتاب کے معانی — الکتٰب: قرآن مجید میں کتاب کا لفظ پانچ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ نوشتۂ تقدیر، مثلاً لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۶۸۔ انفال) اگر نوشتۂ الٰہی نہ گزر چکا ہوتا تو جس چیز میں تم مبتلا ہوئے اس کے باعث تمہیں ایک دردناک عذاب آپکڑتا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا وہ رجسٹر جس میں ہر چیز ریکارڈ ہے۔ مثلاً وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۴، ق) (اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے محفوظ رکھنے والی)

۳۔ خط اور پیغام، مثلاً اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ط (۲۹۔ نمل) (میرے پاس ایک گرامی نامہ بھجوایا گیا ہے)

۴۔ احکام و قوانین۔ مثلاً وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲۔ جمعہ) (اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام۔ اپنے اسی معنی کے لحاظ سے یہ لفظ کتابِ الٰہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد کتابِ الٰہی کا کوئی خاص حصہ بھی ہوا کرتا ہے اور اس کا مجموعہ بھی۔

مجموعہ کے مفہوم کے لیے نظیر اعراف کی یہ آیت ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۱۷۰۔ اعراف) (اور جو کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں)

دوسرے معنی کے لیے نظیر سورۂ آل عمران کی یہ آیت ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ (۲۳۔ آل عمران) (ذرا دیکھو تو ان کو جنھیں کتابِ الٰہی کا ایک حصہ ملا، ان کو دعوت دی جا رہی ہے اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے)

جس طرح کوئی لفظ اپنے مختلف معانی میں سے کسی ایک اعلیٰ اور برتر معنی کے لیے خاص ہو جایا کرتا ہے، اسی طرح یہ کتاب کا لفظ بھی خاص طور پر کتابِ الٰہی کے لیے بولا جانے لگا۔ چنانچہ یہ استعمال قدیم زمانہ سے معروف ہے۔ یہود انبیاء کے صحیفوں میں سے ہر صحیفہ کو سِفر کہتے تھے جس کے معنی کتاب کے ہیں۔ عیسائی مترجموں نے ان کتابوں کو بائبل کا نام دیا اس کے معنی بھی یونانی میں کتاب ہی کے ہیں۔ اسی طرح ان صحیفوں کے لیے (Scriptures) کا لفظ استعمال ہوا جس کے معنی لاطینی میں کتاب کے ہیں۔ الغرض کتاب کا لفظ کتاب اللہ کے لیے کوئی نیا استعمال نہیں ہے۔ یہ استعمال جیسا کہ واضح ہوا، بہت قدیم ہے۔ قرآن نے بھی اس معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا اور اپنے استعمالات سے اس کے اس معنی کو اس قدر واضح کر دیا کہ اس کے مخاطب اس استعمال کو بے تکلف سمجھنے لگ گئے۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ کا صحیح مفہوم — لَا رَيْبَ فِيْهِ: ریب کے معنی شک کے ہیں۔ "اس میں کوئی شک نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کتاب

الٰہی ہونے یا ایک کتاب منزل ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ جملہ پہلے جملہ کی خبر نہیں بلکہ اس کی تاکید ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ کے معنی ہیں، یہ کتابِ الٰہی ہے۔ اس کے بعد یہ تاکید اسی حقیقت کو مزید قوت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے کہ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اگر اس کے معنی یہ نہ لیے جائیں تو پھر اس ٹکڑے کے لئے یہاں کوئی موزوں موقع ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ قرآن مجید کے نظائر سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً اسی سورہ میں چند ہی آیات کے بعد فرمایا ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (۲۳ - بقرہ) (اور اگر تم اس کی طرف سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی ایک سورہ) الٓمّٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱ - السجدہ) (الٓمّٓ، کتاب کی تنزیل، جس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، عالم کے خداوند کی طرف سے ہے)۔ حٰمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۱-۲ مومن) (حٰمٓ، کتاب کا اتارنا خدائے عزیز وعلیم کی طرف سے ہے)

عام طور پر لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں شک کیا جا سکے۔ اگرچہ بجائے خود یہ ایک حقیقت ہے، قرآن میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہو لیکن ہمارے نزدیک اس جملہ کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔

اوّلاً تو قرآن کے نظائر جو ہم نے پیش کیے ہیں اس مطلب کے خلاف ہیں۔ ثانیاً شک وشبہ کتاب کی صفات میں سے نہیں ہے بلکہ آدمی کے ذہن کی صفات میں سے ہے۔ ایک ٹیڑھے ذہن کا آدمی سیدھی سے سیدھی بات میں سے بھی کوئی نہ کوئی ٹیڑھ نکال ہی لیتا ہے اس وجہ سے اس بات کے کہنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ ثالثاً شک وشبہ کا سوال درحقیقت پیدا کسی دعوے سے متعلق ہوتا ہے، یہاں دعویٰ یہ ہے کہ یہ کتاب الٰہی ہے، اس وجہ سے اگر شک کی نفی کی ضرورت ہے تو اس دعویٰ سے متعلق ہے نہ کہ کتاب سے متعلق۔ رابعاً کتاب سے متعلق شک کی نفی سے کتاب کی شان میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا کیونکہ اس طرح کے شک کی نفی ریاضی یا اقلیدس کی کسی کتاب کے بارہ میں بھی کی جا سکتی ہے۔ خامساً قرآن کے ابتدائی مخاطبین کی اصلی الجھن یہ نہیں تھی کہ قرآن کی کچھ باتیں ان کو مشکوک ومشتبہ معلوم ہوتی تھیں بلکہ ان کی اصلی الجھن یہ تھی کہ اس کتاب کو اللہ کی اتاری ہوئی بتایا جاتا تھا اور وہ اس کو اللہ کی اتاری ہوئی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سادساً اگر کتاب سے متعلق شک کی نفی کر بھی دی جائے تو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کے خدا کی طرف سے ہونے کا مسئلہ پھر بھی مشکوک ہی رہا۔ ہاں اس کا خدا کی طرف سے ہونا غیر مشکوک ہو جائے تو پھر اس کا ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہونا آپ سے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔

ھُدًی کی تحقیق

ھُدًی: ھُدًی کا لفظ عربی زبان میں بھی اور قرآن مجید میں بھی کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معانی کے نظائر خود قرآن میں موجود ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- قلبی نور و بصیرت۔ مثلاً وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۱۷- محمد) (اور جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اللہ ان کی قلبی بصیرت میں اضافہ فرماتا ہے)

۲- دلیل و حجت اور نشانِ راہ۔ مثلاً أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (۱۰- طٰہٰ) (یا مجھے آگ کے پاس پہنچ کر کوئی نشانِ راہ مل جائے)۔ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ (۸- حج) (بغیر کسی علم، بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی روشن کتاب کے)

۳- سیدھا اور صاف راستہ۔ مثلاً إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ (۶۷- حج) (بے شک تم ایک سیدھے راستے پر ہو) یہیں سے یہ لفظ طریقہ اور شریعت کے معنی میں استعمال ہوا۔ اس معنی کی مثالیں بھی قرآن میں موجود ہیں مثلاً فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (۹۰- انعام) (پس ان کے طریقہ کی پیروی کر) إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ (۷۳- آل عمران) (اور شریعت تو بس اللہ کی شریعت ہے)

۴- فعلِ ہدایت۔ مثلاً، لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ (۲۷۲- بقرہ) (تمہارے ذمہ ان کو ہدایت دینا نہیں ہے بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے)

قرآن مجید ظاہر ہے کہ ان چاروں معنوں کے اعتبار سے ھدی ہے۔

متقی کا مفہوم

لِّلْمُتَّقِينَ: حرف لام یہاں انتفاع کے مفہوم میں ہے، یعنی اس کتاب سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جو متقی ہیں۔ جس طرح سورج چمکتا تو سب کے لیے ہے لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو آنکھیں رکھتے بھی ہیں اور جو ان آنکھوں کو دیکھنے کے لیے کھولتے بھی ہیں۔ اسی طرح یہ کتاب اتری تو سب ہی کی ہدایت کے لیے ہے لیکن چونکہ اس سے فائدہ فی الحقیقت وہی لوگ اٹھائیں گے جن کے اندر خدا کا خوف ہوگا اس وجہ سے فرمایا کہ یہ متقین کے لیے ہدایت ہے۔

متقی کا لفظ اتقاء سے ہے۔ اتقاء کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہم مثالوں سے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

۱- جس چیز سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اس سے بچنا۔ مثلاً فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا (۱۷- مزمل) (اگر تم نے کفر کیا تو اس دن سے کیسے بچ سکو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا)

۲- کسی آفت کے ظہور سے اندیشہ ناک رہنا۔ مثلاً، وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (۲۵- انفال) (اور اس آفت سے چوکنے رہو جو خاص طور پر انہی پر نہیں آئے گی جنہوں نے تم میں سے ظلم کا ارتکاب کیا ہوگا)

۳- اس ربِ قدوس سے برابر لرزتے اور کانپتے رہنا جو اپنے شکر گزار اور وفادار بندوں پر رحم فرماتا ہے، جو کفر و معصیت کو ناپسند کرتا ہے اور جو ہر ظاہر و پوشیدہ سے باخبر ہے۔ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (۷۳- زمر) (اور جو لوگ اپنے پروردگار سے برابر ڈرتے رہے ان کو گروہ در گروہ جنت کی طرف

ے جایا جائے گا۔

۴۔ اس کا چوتھا مفہوم مذکورہ تینوں مفہوموں کا جامع ہے۔ یعنی گناہ سے اس کے بُرے نتائج اور خدا کے غضب کے ڈر سے بچتے رہنا۔ جب یہ لفظ مفعول کے بغیر استعمال ہوتا ہے تو عموماً یہی معنی مراد ہوتے ہیں اور اسی چیز کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ (۱۷۹۔ آل عمران)
(اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے)

اس تشریح کی روشنی میں متقی وہ شخص ہوگا جس کے دل میں خدا کی عظمت اور اس کے غضب کا خوف سمایا ہوا ہو اور جس کو گناہوں کے نتائج کا پورا پورا احساس ہو۔

تقویٰ میں عمل کی نسبت کیفیت اور حال کا پہلو اور فعل کے بالمقابل ترک کا پہلو اگرچہ زیادہ نمایاں ہے اور اس پہلو سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں نفی اثبات پر غالب ہے لیکن چونکہ یہ دل کی تندرستی کی دلیل ہے اور دل تندرست ہو تو سب کچھ تندرست ہے اس وجہ سے اس سے علم اور عمل دونوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (۳)

ایمان کے معنی

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ : ایمان، امن سے ہے۔ ایمان کے اصل معنی امن دینے کے ہیں۔ اگر اس کا صلہ لام کے ساتھ آئے تو اس کے معنی تصدیق کرنے اور ب کے ساتھ آئے تو یقین اور اعتماد کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

اس لفظ کی حقیقی روح یقین، اعتماد اور اعتقاد ہے۔ جو یقین، خشیت، توکل اور اعتقاد کی خصوصیات کے ساتھ پایا جائے اس کو ایمان کہتے ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر کے اس کے فیصلوں پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہو جائے وہ مومن ہے۔

یہ لفظ جب اپنے مفعول کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس سے خاص اسی چیز پر ایمان لانا مراد ہوتا ہے جس کا اس کے مفعول کی حیثیت سے ذکر ہوتا ہے لیکن اگر مفعول کے بغیر آئے تو اس کے تحت وہ ساری ہی چیزیں آسکتی ہیں جن پر ایمان لانے کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے یا جن پر قرینہ دلیل بن سکتا ہے۔

لفظ 'غیب' کی تحقیق

'غیب' کا لفظ قرآن مجید میں مندرجہ ذیل معنوں میں آیا ہے۔

وہ جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو۔ اس کا مدِمقابل لفظ شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے بھی باخبر ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں اور ان چیزوں سے بھی باخبر ہے جو ہمارے سامنے ہیں۔

وہ چیز جس کے جاننے کا آدمی کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن میں نقل ہے وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ (۱۸۸۔ اعراف) (اگر مجھے غیب کا پتہ ہوتا تو میں خیر میں بہت سا اضافہ کر لیتا)

وہ جگہ جو آدمی کے سامنے نہ ہو یا وہ سمت جو متعین نہ ہو رہی ہو۔ ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ

اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْا اَمْرَهُمْ (۱۰۲- یوسف) (یہ غیب کے واقعات میں سے ہے جس کو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں اور جب وہ اپنے فیصلہ پر متفق ہوئے تو تم ان کے پاس موجود نہ تھے)

راز کے معنی میں بھی اس لفظ کا استعمال عام ہے مثلاً نیک بیبیوں کی تعریف میں آتا ہے۔ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (وہ راز کی حفاظت کرنے والیاں ہیں)

بالغیب میں 'ب' ظرفیت کی ہے

"بِالْغَيْبِ" کی ب کے بارہ میں بھی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس کو ظرف کے معنی میں لیا جائے یعنی وہ غیب میں ہوتے ہوئے ایمان لاتے ہیں۔ اس معنی کی متعدد مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ (۴۹- انبیاء) (جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں ہوتے ہوئے اور قیامت سے ڈرنے والے ہیں) اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۱۸- فاطر) (تم انہی کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں ہوتے ہوئے اپنے رب سے ڈریں اور نماز قائم کریں)

اس صورت میں يُؤْمِنُوْنَ عام رہے گا اور وہ تمام چیزیں اس کے تحت آسکیں گی جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے لیے وہ اس بات کے منتظر نہیں ہیں کہ تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں، بلکہ وہ مشاہدہ کے بغیر محض عقل و فطرت کی شہادت اور پیغمبر کی دعوت کی بنا پر ان تمام چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سلف میں سے ربیع بن انس نے یہی تاویل اختیار کی ہے اور ہم نے بھی ترجمہ میں اسی کو ترجیح دی ہے۔

دوسری رائے یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو صلہ کی 'ب' مانا جائے اور بِالْغَيْبِ کو يُؤْمِنُوْنَ کا مفعول قرار دیا جائے۔ یہ رائے اگرچہ اکثریت کی رائے ہے، اور زبان کے اعتبار سے اس میں کوئی نقص بھی نہیں ہے لیکن مندرجہ ذیل وجوہ سے ہمیں یہ رائے کچھ زیادہ قوی نہیں معلوم ہوتی۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس صورت میں ایمان صرف غیب کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جاتا ہے۔ غیب کے سوا بقیہ ساری چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے، ایمان کے دائرہ سے باہر ہی رہ جاتی ہیں۔ برعکس اس کے پہلی صورت میں وہ تمام چیزیں ایمان کے دائرہ میں آجاتی ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے اور جن کی قرآن نے دوسرے مواقع پر تفصیل بیان کر دی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ غیب کا اطلاق چاہے ان تمام چیزوں پر ہوتا ہو جن پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن نبی اور کتاب پر تو اس کا اطلاق بہر حال نہیں ہوتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ دونوں چیزیں جن پر اللہ تعالیٰ کے بعد ایمان لانا سب سے زیادہ ضروری ہے یہاں ایمان سے کیوں خارج کر دی گئیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ غیب کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی نہیں بولا گیا ہے۔ غیب اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے نہیں ہے۔ اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ بھی ایمان کے اجزاء میں

شامل نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ بھی ایمان کے اجزا میں شامل نہیں ہے تو ایمان بالغیب کے تحت صرف آخرت اور فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ٹھہرتا ہے یا زیادہ سے زیادہ مستقبل کے حوادث پر۔ آخر ایمان کے دائرہ کو اس قدر محدود کر دینے کی کیا وجہ ہے؟

چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ دوسری تاویل لینے والے حضرات کہتے ہیں کہ غیب سے مراد احوالِ آخرت ہیں۔ اگر احوالِ آخرت ہی مراد ہیں تو آخرت کا ذکر تو آگے اسی سلسلہ میں مستقل طور پر آ ہی رہا ہے۔ فرمایا ہے۔ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں) آخر ایک ہی سلسلہ میں ایک ہی بات کو اس طرح دُہرانے کی کیا ضرورت تھی؟

پانچویں وجہ یہ ہے کہ پہلی تاویل سے ایک بہت بڑی حقیقت سامنے آتی ہے جس سے یہ دوسری تاویل بالکل خالی ہے۔ وہ یہ کہ ایمان یا خشیت وہی معتبر ہے جو بصیرت اور تقویٰ سے پیدا ہو۔ جو ایمان یا خشیت گناہوں کے نتائج سامنے آجانے کے بعد پیدا ہو خدا کے ہاں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کا عذاب دیکھ کر ایمان لائے ان کے بارہ میں اس کا ارشاد یہ ہے۔ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ اٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (تو کیا پھر جب عذاب آ نازل ہی ہوگا تب ہی اس کو مانو گے، اس وقت ہم کہیں گے اب! حالانکہ اس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے) (۵۱-یونس)

ظرفیت کے مفہوم کے خلاف ایک بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ جہاں جہاں بھی، قرآن میں لفظ ایمان کے ساتھ "ب" آئی ہے کہیں بھی ظرفیت کے مفہوم میں نہیں آئی ہے۔ لیکن یہ بات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ اس کے جواب میں بالکل اسی کے برابر کی بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ بالغیب کا لفظ قرآن میں جہاں جہاں بھی آیا ہے ظرف ہی کے طور پر آیا ہے، کہیں بھی مفعول کے طور پر نہیں آیا ہے۔ اس وجہ سے جہاں تک قرآن کے نظائر کا تعلق ہے وہ ظرفیت کے مفہوم کے حق میں زیادہ نمایاں ہیں۔

'اقامت صلوٰۃ' کا مفہوم

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ: اقامت کے معنی کسی چیز کو کھڑے کرنے یا اس طرح سیدھے کرنے کے ہیں کہ اس میں کوئی ٹیڑھ باقی نہ رہ جائے۔ فرمایا ہے وہ نماز قائم کرتے ہیں، یہ نہیں کہا ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں۔ قرآن نے نماز کے لیے قائم کرنے کا لفظ استعمال کر کے ایک ہی ساتھ کئی حقیقتوں کی طرف توجہ دلا دی ہے۔

پہلی چیز جس کی طرف یہ لفظ متوجہ کرتا ہے وہ نماز میں اخلاص ہے یعنی نماز صرف اللہ ہی کے لیے پڑھی جائے کسی اور کو اس میں شریک نہ کیا جائے۔ اس کے اندر سیدھے کرنے کا جو مفہوم ہے اس کا تقاضا اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ ہی کے لیے نہ پڑھی جائے۔ دوسرے مقام پر یہ حقیقت واضح لفظوں میں بھی بیان کر دی ہے۔ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۲۹- اعراف) (اور اسی کی طرف اپنے رُخ کرو ہر مسجد کے پاس اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے)

یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ نماز میں رُخ قبلہ کی طرف ہونا چاہیئے کیونکہ وہی توحید اور اخلاص کا مرکز ہے۔
دوسری چیز جس کی طرف یہ لفظ اشارہ کرتا ہے وہ نماز کے اصل مقصود پر دل کو پوری طرح جمانا ہے۔ نماز کا اصل مقصود ذکرِ الٰہی میں خشوع و خضوع ہے، اگر آدمی اس چیز سے غافل ہو کر نماز پڑھے تو یہ نماز کو قائم کرنا نہیں ہوا بلکہ محض چھدا اتارنا ہوا اس حقیقت کی طرف بھی قرآن نے بعض مقامات میں توجہ دلائی ہے۔ مثلاً وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ (۴۔ طٰہٰ) (اور نماز کو میرے ذکر کے لیے قائم کرو) دوسری جگہ فرمایا ہے۔ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ ھُمۡ فِیۡ صَلَاتِھِمۡ خٰشِعُوۡنَ (۱-۲۔ مومنون) (ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازیں خضوع و خشوع سے ادا کرتے ہیں)
تیسری چیز یہ ہے کہ نماز بغیر کسی کمی بیشی کے اس طریقہ کے مطابق ادا کی جائے جس طریقہ پر اللہ تعالیٰ نے اس کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے، فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡکُرُوا اللّٰهَ کَمَا عَلَّمَکُمۡ (۲۳۹۔ بقرہ) (پس جب تم امن میں ہو جاؤ تو اس طریقہ پر اللہ کو یاد کرو جو طریقہ اس نے تم کو سکھایا ہے)
نماز کی صفوں کا ٹھیک کرنا اور ارکانِ نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا بھی اس میں شامل ہے، اسی وجہ سے حدیث میں آیا ہے کہ تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصّلوٰۃ (صفوں کو برابر کرنا بھی اقامت صلوٰۃ کا ایک جزو ہے)
چوتھی چیز اوقاتِ نماز کی پوری پوری پابندی ہے، فرمایا ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ (۷۸۔ اسراء) (اور نماز قائم کرو سورج کے زوال کے وقت سے لے کر رات کے تاریک ہونے تک اور صبح کے وقت کا قرآن پڑھنا)
اسی چیز کو دوسرے مقامات میں "نمازوں کی نگرانی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ (۲۳۸۔ بقرہ)
پانچویں چیز نماز پر قائم رہنا ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔ ھُمۡ عَلٰی صَلَاتِھِمۡ دَآئِمُوۡنَ (۲۳۔ معارج) (وہ اپنی نمازوں پر برابر قائم رہتے ہیں)
چھٹی چیز جمعہ و جماعت کا قیام و اہتمام ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جب امت یا امام کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تب تو واضح طور پر جمعہ و جماعت کا قیام و اہتمام ہی مدِّنظر ہوتا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو۔ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَھَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ (اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے) (۴۱۔ حج) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا جس میں انہوں نے اپنی ذرّیت کا مشن بتایا ہے، ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے۔ رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (۳۷۔ ابراھیم) (اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم گھر کے پاس لبسایا ہے، اے ہمارے رب، تاکہ یہ نماز قائم کریں)

لفظ صلوٰۃ کی حقیقت

"صلوٰۃ" کا لفظ اصل لغت میں کسی شے کی طرف متوجہ ہونے کے لیے آیا ہے۔ پھر یہیں سے یہ لفظ رکوع کے معنی میں اور پھر تعظیم و تضرع اور دعا کے معنوں میں استعمال ہوا۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ عبادت کے معنی میں بہت قدیم ہے۔ کلدانی میں دعا اور تضرع کے معنی ہیں اور عبرانی میں رکوع اور نماز کے معنی میں یہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ایک اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے جس کی وضاحت قرآن نے بھی کر دی ہے اور سنت نے بھی اس کی پوری وضاحت کی ہے۔ علاوہ ازیں امت کے قولی و عملی تواتر نے اس کی شکل و ہیئت اور اس کے اوقات بالکل محفوظ رکھے ہیں۔ اگر اس کے کسی جزو میں کوئی اختلاف ہے تو وہ محض فروعی قسم کا ہے جس سے اصل حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۴)

ایمان اور ایقان کے درمیان فرق

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ: آخرت سے مراد دارِ آخرت یا حیاتِ آخرت ہے۔ آخرت کے لیے یہاں ایمان کے بجائے ایقان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایمان اور ایقان کے درمیان تھوڑا سا فرق ہے جس کو سمجھ لینا چاہیے۔ ایمان کے معنی تصدیق کرنے اور مان لینے کے ہیں۔ اس کا ضد کفر و انکار اور تکذیب ہے۔ ایقان کے معنی یقین کرنے کے ہیں۔ اس کا ضد گمان اور شک ہے۔ جس طرح کسی شے پر یقین رکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی اس پر ایمان بھی رکھتا ہو اسی طرح کسی چیز پر ایمان رکھنے کے لیے اس پر یقین کرنا شرط نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آدمی کا ایمان محض گمان غالب پر مبنی ہو اور وہ آہستہ آہستہ گمان کی منزل سے نکل کر یقین کی منزل تک پہنچے اور اس طرح اس کے ایمان کی تکمیل ہو جائے۔ یہاں ایقان کا ذکر ایمان اور ایمان کے چند معروف عملی مظاہر کے بعد ہوا ہے جس سے اس بات کا اشارہ نکلتا ہے کہ جو لوگ مذکورہ اوصاف کے حامل ہیں درحقیقت وہی لوگ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵)

ھُدیٰ کا مفہوم

عَلٰى هُدًى: ھدیٰ کے مختلف معانی اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں مذکورہ معانی میں سے نور و بصیرت کے معنی بھی لیے جا سکتے ہیں اور صراط مستقیم کے معنی بھی لیے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں معنوں میں سے جو معنی بھی لے لیا جائے آیت کی تاویل ٹھیک بن جاتی ہے اور لغت اور استعمالاتِ قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

الْمُفْلِحُوْنَ: اس لفظ کی اصلی روح انشراح اور انکشاف ہے اور اس سے مراد وہ فائز المرامی اور کامیابی ہوتی ہے جو اگرچہ حاصل تو ہو ایک صبر آزما اور جاں گسل جد و جہد کے بعد لیکن جب حاصل ہو تو محنت کرنے والے نہال ہو جائیں اور ان کی توقعات کے سارے پیمانے اس کے ناپنے سے قاصر رہ جائیں۔

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو نشانیاں دکھائیں فرعون کو پورا یقین تھا کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں لیکن اس یقین کے باوجود وہ ان پر ایمان نہیں لایا۔

۲- مجموعۂ آیات ۱-۵ کے مطالب پر ایک سرسری نظر

مذکورہ بالا آیات کے اندر جو باتیں، جس ترتیب کے ساتھ کہی گئی ہیں، پہلے ہم اجمال کے ساتھ ان کو سامنے رکھیں گے اس کے بعد ان کے عمیق اور گہرے پہلوؤں پر غور کریں گے اور جو سوالات یہاں پیدا ہوتے ہیں ان کے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

یہاں سورہ کا نام ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے وہ دعویٰ سامنے رکھ دیا گیا ہے جس کو اس سورہ کا عمود یا مرکزی مضمون ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ اس سورہ کا مرکزی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔ چناں چہ یہاں سب سے پہلے جو بات کہی گئی ہے وہ یہی ہے کہ یہ کتابِ الٰہی ہے۔ پھر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جہاں تک اس کتاب کے کتابِ الٰہی ہونے کا تعلق ہے۔ یہ چیز کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ یہ کتاب خود اپنے کتابِ الٰہی ہونے پر ایک حجت قاطع ہے لیکن اس پر ایمان لانا ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح کے لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور کس طرح کے لوگ اس سے محروم رہیں گے۔ ایمان لانے کے لیے بنیادی چیز قلب کی صلاحیت کو قرار دیا گیا ہے، جس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی ہے کہ جن لوگوں کے دل صلاحیت سے خالی ہیں وہ اس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ یہ صلاحیت تقویٰ، خشیت اور خدا ترسی سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد اس تقویٰ سے علم و عمل کی جو برکتیں پیدا ہوتی ہیں ان کا ذکر فرمایا ہے۔

اس تقویٰ کا پہلا ثمرہ ایمان بالغیب بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس کے دل میں صلاحیت ہو اس کی عقل دوربین اور دوررس ہو جاتی ہے۔ وہ حیوانات کی طرح صرف محسوسات و مادیات ہی میں گرفتار نہیں رہتا بلکہ وہ ان حقیقتوں کو بھی مانتا ہے جو اگرچہ آنکھوں سے دیکھی نہ جا سکتی ہوں، لیکن عقل سلیم ان کی شہادت دے رہی ہو۔ وہ ان حقیقتوں کو اسی طرح مانتا ہے جس طرح آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی حقیقتیں مانی جاتی ہیں، بلکہ جو یقین اس کو ان نادیدہ حقیقتوں پر ہوتا ہے، بسا اوقات وہ یقین اس کو ان چیزوں پر بھی نہیں ہوتا جو اس نے آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی ہوتی ہیں۔

اس کے بعد بعض وہ اعمال و عقائد بیان ہوئے ہیں جو اس ایمان بالغیب سے لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

ایمان محض کسی تصور کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی اصل حقیقت وہ تصدیق ہے جو دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوتی ہے اور جو آدمی کے ارادہ کو حرکت میں لاتی ہے۔ یہ ارادہ آدمی کو بہت سے کاموں کے کرنے اور بہت سی چیزوں کے چھوڑنے کے لیے اُٹھا کھڑا کرتا ہے۔ یہاں کرنے کے کاموں میں سے دو ہی کاموں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک نماز قائم کرنے کا، دوسرے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں کام دوسری

تمام نیکیوں کی جڑ اور تمام بھلائیوں کی بنیاد ہیں چناں چہ آگے ہم وضاحت کے ساتھ بتائیں گے کہ درحقیقت یہی دو بنیادی نیکیاں ہیں جن پر پورا دین قائم ہے۔

انفاق کے ذکر کے ساتھ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ (اس میں سے جو ہم نے ان کو بخشی ہیں) کے الفاظ فرما کر کئی باتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

ایک تو یہ کہ خدا کی راہ میں اسی کا بخشا ہوا مال خرچ کرنا درحقیقت بندہ کی طرف سے اس مال کے عطیۂ الٰہی ہونے کا اعتراف ہے۔

دوسرے اس سے خرچ کرنے کی ایک مؤثر دلیل سامنے آ گئی۔ وہ یہ کہ خدا کے بخشے ہوئے مال کا کچھ حصہ اس لیے اس کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے کہ اس کی شکر گزاری کا حق ادا ہو سکے۔

تیسرے اس وضاحت نے انفاق کے مشکل کام کو یک گونہ سہل بھی بنا دیا کیونکہ جو کچھ اس نے دیا ہے اس سارے کے لیے اس کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اس میں سے صرف ایک قلیل حصہ ہی ہے جو اس کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں زکوٰۃ کے بجائے انفاق کا لفظ ہے جو اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ یہ لفظ صدقات و خیرات کی ساری ہی قسموں پر حاوی ہے۔

اس کے بعد ان متقین کے ایک خاص وصف کو خاص طور پر نمایاں کر کے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ ہر قسم کے گروہی تعصبات سے پاک اور جمود و تقلید کی تمام بندشوں سے بالکل آزاد ہیں۔ وہ خدا کی اتاری ہوئی کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں میں کوئی تفریق اور امتیاز نہیں کرتے۔ وہ اس سارے پر ایمان لاتے ہیں جو خدا کی طرف سے اترا ہے، خواہ وہ ان کی اپنی قوم کے کسی رسول پر اترا ہے یا کسی دوسری قوم کے رسول پر، ان کو اگر بحث ہوتی ہے تو صرف اس چیز سے ہوتی ہے کہ بات خدا کی اتاری ہوئی ہو، یہ نہ ہو کہ کسی غیر خدا کی بات خدا کی طرف منسوب کر دی گئی ہو یا کوئی بات باہر سے لا کر خدا کی بات میں ملا دی گئی ہو۔

اس کے بعد فرمایا کہ حقیقت میں آخرت پر ایمان اور یقین رکھنے والے لوگ یہی ہیں۔

جہاں تک آخرت پر ایمان کا تعلق ہے وہ ایمان بالغیب میں شامل تھا، اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں خاص طور پر اس کو الگ ذکر کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایمان بالآخرت کے مدعی تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں، جو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو خدا کی اتاری ہوئی ہر کتاب پر ایمان لاتے ہیں، درحقیقت وہی لوگ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہی لوگ، جن کے اوصاف بیان ہوئے ہیں، اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور انھی کے لیے مزید ہدایتوں کے دروازے کھلیں گے، نیز یہی اس دنیا میں ہدایت پر ہیں اور انھی کے لیے آخرت میں فوز و فلاح ہے۔

۳۔ بعض اشارات وکنایات

قرآن نے یہ بتانے کے بعد کہ یہ کتاب خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے، ان لوگوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے، جو اس لفظ کے اُس زمانہ میں مصداق بن سکتے تھے۔ یہ اشارہ اس طرح کیا ہے کہ ان کی کچھ نمایاں خصوصیات بیان کر دی ہیں۔ ان خصوصیات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ان مسلمانوں کی خصوصیات ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ اس سے یہ اشارہ نکلا کہ ان لوگوں کے اندر تقویٰ اور خشیت کی صفت پہلے سے موجود تھی اس وجہ سے ان کو قرآن سے نفع پہنچا۔ ان کے اندر امی عربوں میں سے جو لوگ شامل ہوئے تھے، یہ وہ لوگ تھے جن کے اندر زمانہ کے عام فساد کے باوجود بہت سی خوبیاں موجود تھیں اور ان کو فطرت کی ہدایت کی جو روشنی ملی تھی اس کو انھوں نے اپنے اندر محفوظ رکھا تھا اسی طرح ان کے اندر اہل کتاب میں سے جو لوگ شامل ہوئے تھے، وہ بھی اپنی اپنی شریعتوں پر اپنے علم کی حد تک نیک نیتی سے عمل کرنے والے تھے اس وجہ سے یہ لوگ مستحق ٹھہرے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی آخری اور کامل ہدایت سے بہرہ ور کرے۔

یہود کی اخلاقی و روحانی بیماریاں

اس تصویر میں مسلمانوں کے جو خط و خال نمایاں کیے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے ایک طرف اگر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمان کے اصلی اوصاف کیا ہیں یا کیا ہونے چاہئیں تو دوسری طرف یہی تصویر ان لوگوں کو بھی سامنے لا کھڑا کرتی ہے جو اس کتاب پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ساتھ ہی نہایت خوبی کے ساتھ، اشارات وکنایات کے پردے میں، ان کے ایمان نہ لانے کے اسباب کی طرف بھی اشارے کر دیتی ہے۔ اشارات وکنایات کے اس پردے کو اٹھایے تو اس کے نیچے سے یہود برآمد ہوتے ہیں جن سے اس سورہ میں، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، اصلی بحث ہے۔ اپنی جن اخلاقی و روحانی بیماریوں کے سبب سے یہود، قرآن کی نعمت سے محروم ہوئے ان کو بے نقاب کرنے کے لیے قرآن نے یہ بلیغ انداز اختیار کیا کہ مسلمانوں کی ان عملی و اعتقادی خصوصیات کو خاص طور پر نمایاں کیا جن کے بالکل ضد خصوصیات یہود نے اپنے اندر جمع کر رکھی تھیں۔ اور جو قبولِ حق میں ان کے لیے ایسی رکاوٹ بن گئی تھیں کہ ان پر قابو پانا ان کے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔

ہم قرآن کے ان لطیف اشارات کی یہاں تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں لا رہے تھے ان کے ایمان نہ لانے کے اسباب کیا تھے۔

قرآن پر ایمان نہ لانے کے

سب سے پہلے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کے الفاظ پر غور کیجیے۔ یہ بات کہ یہ کتاب متقین ہی کے لیے ہدایت ہے یہود کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کے ایک اہم فیصلہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود سے توبہ کرائی اور ان کو تطہیر و تزکیہ کی بعض سخت آزمائشوں

سے گزارا تو اس وقت ان کے لیے انھوں نے یہ دعا بھی فرمائی کہ آئندہ یہ خدا کے غضب سے محفوظ رہیں اور اس کی رحمت سے کبھی محروم نہ ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول تو فرمائی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آئندہ اس کی جو رحمت، آخری شریعت کی شکل میں، نازل ہونے والی ہے اس سے بنو میں سے صرف وہی لوگ بہرہ یاب ہو سکیں گے جو خدا سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوں گی ان پر ایمان لائیں گے۔ سورۂ اعراف میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ دعوت کا یہ واقعہ بیان ہوا ہے مندرجہ ذیل آیت بھی آتی ہے۔ اس آیت پر اس کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھ کر غور کیجیے۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا	اور میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے، پس میں اس کو لکھ
لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ	رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ پر قائم رہیں گے،
الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ	زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیتوں
الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ - الآیہ (۱۵۶-۱۵۷ - اعراف)	پر ایمان لائیں گے یعنی جو رسول نبی امی کی پیروی کریں گے۔

یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ قرآن اور اسلام کی نعمت حضرت موسیٰ کی قوم میں سے صرف انھی لوگوں کو ملنے والی تھی جو تقویٰ پر قائم رہنے والے، زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے اور اللہ کی آیتوں پر ایمان لانے والے تھے۔ پھر آیت کے آخر میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ تھے جو نبی اُمّی کی پیروی کریں۔

بعینہٖ اسی شرط کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے الفاظ یہاں یاد دلا رہے ہیں۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ اس شرط پر پورے اترے وہ ایمان لائے اور اسی سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں لائے وہ تقویٰ اور خشیت کی اس صفت سے عاری تھے جو اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے۔

ٹھیک اسی طرح کی بات اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی فرمائی تھی۔ ان کو مختلف امتحانوں میں جانچنے کے بعد جب قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمانے کا وعدہ فرمایا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ منصب میری ذریّت کو بھی حاصل رہے گا یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (۱۲۴ - بقرہ) (میرا یہ عہد تمھاری ذریّت میں سے ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے) ظالم سے مراد ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہیں جو توحید و اخلاص سے عاری اور تقویٰ و خشیت سے خالی ہوں، خواہ ان کا تعلق حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہو یا حضرت اسحاقؑ کی نسل سے۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرما دی تھی کہ جس پیغمبر یا جس پیغمبر کی امّت کو دنیا کی امامت ملنے والی ہے ظالم لوگ نہ اس پیغمبر پر ایمان لائیں گے اور نہ اس عزت میں حصہ دار ہوں گے جو اس کو اور اس کی امّت کو ملنے والی ہے۔

یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ کے الفاظ یہود کی اس محسوسات پرستی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس میں وہ ابتدا سے مبتلا رہے ہیں۔ اپنی اسی بیماری کے سبب سے یہود عین اپنے نبی کی موجودگی میں ایک بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ مصر کے دورِ غلامی میں وہ جس ذہنی و روحانی پستی میں مبتلا ہو گئے تھے اس سے آخر وقت تک ان کو نکلنا نصیب نہ ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہزاروں معجزات دیکھنے کے بعد بھی ان کا اصرار یہی رہا کہ وہ ایک مرتبہ خود اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ لیں تب وہ اس بات کو مانیں گے کہ فی الواقع وہ حضرت موسیٰؑ سے کلام بھی کرتا ہے۔ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً (ہم تمہاری بات اس وقت تک باور نہیں کریں گے جب تک ہم خود بھی خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں) (۵۵۔ بقرہ) اسی طرح کی بات مشرکینِ مکہ بھی کہتے تھے۔ ان کا اعتراض بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تھا کہ اگر اللہ آپ سے کلام کرتا ہے تو آخر ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا؟ قرآن نے یہ کہہ کر کہ اس کتاب پر وہی لوگ ایمان لائیں گے جو غیب میں رہتے ایمان لائیں، گویا دوسرے الفاظ میں یہ اعلان کر دیا کہ جو لوگ خدا کو چھو کر اور ٹٹول کر اور تمام حقائق کا سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے ایمان لانا چاہتے ہیں ان کے لیے قرآن میں کوئی حصہ نہیں ہے، قرآن کا فیض صرف ان معقول لوگوں کو پہنچے گا جو حواس ظاہری سے زیادہ عقل پر بھروسہ کرتے ہیں۔

ایمان لانے والوں کی یہ تعریف کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، یہودؔ[1] اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی اس حالت پر تعریض ہے جس کا ذکر قرآن نے دوسری جگہ ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّبَعُوا الشَّہَوٰتِ فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا (۵۹۔ مریم) (پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور شہوتوں کے پیچھے پڑ گئے تو جلد وہ اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے)

اہلِ ایمان کے انفاق کے ذکر میں یہود اور ان کے جتھہ کے دوسرے ساتھیوں کی اس بخالت اور اس زر پرستی پر تعریض ہے جو ہمیشہ سے ضرب المثل رہی ہے۔ قرآن کے زمانۂ نزول میں ان کے عوام تو درکنار ان کے علما اور صوفیا کا جو حال تھا اس کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ کَثِیۡرًا	اے ایمان والو، بہت سے فقیہ اور صوفی لوگوں
مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَ الرُّہۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ	کے مال باطل طریقوں سے ہڑپ کرتے ہیں اور
اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَ یَصُدُّوۡنَ	اللہ کے رستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور جو لوگ سونے
عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ	اور چاندی کے ڈھیر اکٹھے کر رہے ہیں اور ان کو

---

[1] سورہ بقرہ کی آیت ۸۳ میں نہایت واضح الفاظ میں یہود کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان سے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دیتے رہنے کا جو عہد لیا گیا تھا وہ عہد انھوں نے توڑ ڈالا۔

وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۴ - توبہ)

اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر رہے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ الاٰیۃ میں یہود کے اس گروہی تعصب پر تعریض ہے جو ان کے لیے قرآن پر ایمان لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہود کو جب دعوت دی جاتی کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی آخری کتاب۔ قرآن، پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے کہ جو کتاب ہم پر اتری ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس اس پر ایمان رکھنا ہمارے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد ہم کسی اور کتاب اور قرآن کے قائل نہیں ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (۹۱- بقرہ)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو اللہ نے اتاری ہے تو کہتے ہیں ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے اس کا وہ انکار کرتے ہیں۔

اہلِ ایمان کی یہ تعریف کہ "آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں" آخرت کے بارے میں یہود کی اس بے یقینی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کی شہادت ان کی عملی زندگی کے ہر گوشے سے مل رہی تھی۔ یوں تو وہ آخرت پر نہ صرف ایمان کے مدعی تھے بلکہ ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ آخرت کی ساری کامیابیاں تنہا انھی کا حصّہ ہیں۔ لیکن دوسری طرف زندگی اور اسبابِ زندگی کی محبت میں اس قدر غرق تھے کہ ان مشرکین کو بھی مات کر گئے تھے جو آخرت کا تصور یا تو سرے سے رکھتے ہی نہیں تھے یا رکھتے تھے تو نہایت مبہم اور دھندلا۔ مشرکین ہی کی طرح انھوں نے بھی غلط قسم کی شفاعت کا تصور قائم کر لیا تھا اور اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ دوزخ میں اوّل تو وہ ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔ ظاہر ہے کہ آخرت پر اس طرح کا ایمان ایک بالکل بے معنی ایمان ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے اس ایمان کی قلعی اس طرح کھولی ہے:۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ○ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (۹۴-۹۶ - بقرہ)

کہہ دو کہ اگر آخرت کی کامیابی دوسروں کے مقابل میں خاص کر تمہارا ہی حصّہ ہے تو موت کی آرزو کرو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو۔ اور وہ اپنی کرتوتوں کے سبب سے ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے، ان سے بھی زیادہ جو مشرک ہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ متقین کے ذکر کے بعد ان متقین کی جو تصویر قرآن نے پیش کی ہے اس سے

ایک طرف تو وقت کے اہلِ ایمان سامنے آگئے اور یہ معلوم ہوگیا کہ یہ لوگ تھے جن کے اندر تقویٰ اور خشیت کی فطری صلاحیتیں موجود تھیں اس وجہ سے ان کو قرآن پر ایمان لانے کی توفیق نصیب ہوئی۔ دوسری طرف اسی تصویر نے یہود اور ان کے حلیفوں کو سامنے لاکھڑا کیا ہے کہ یہ لوگ ہیں جو خدا کے خوف اور اس خوف کی تمام برکتوں سے خالی ہیں، اس وجہ سے یہ قرآن کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے۔

ان چند الفاظ کے اندر اتنی لمبی تفصیل کو چھپا دینا اور یہود کا نام لیے بغیر ان کو اس طرح بے نقاب کر دینا قرآنی بلاغت کا اعجاز ہے۔

۴۔ چند سوالات اور ان کے جوابات

ان آیات پر جو شخص بھی تدبر کی نگاہ ڈالے گا اس کے ذہن میں چند سوالات ضرور پیدا ہوں گے۔

ایک یہ کہ یہاں قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کا دعویٰ محض ایک دعوے کی شکل میں رکھ دیا گیا ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے۔ حالانکہ جب یہی بات اس سورہ کا عمود ہے تو اس کو صرف ایک دعوے کی شکل میں رکھ دینا کافی نہیں تھا، بلکہ نہایت مضبوط دلائل سے اس کو ثابت کرنا تھا۔

دوسرا یہ کہ اس کتاب کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ یہ متقیوں اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔ اگر یہ کتاب متقیوں ہی کے لیے ہدایت ہے تو پھر اس کے اترنے کا فائدہ کیا ہوا؟ ضرورت تو تھی کہ اس کی برکت سے جو بدکار تھے وہ پرہیزگار اور جو گنہگار تھے وہ نیکوکار بنتے لیکن جب بیماروں کو شفا دینے کے بجائے یہ تندرستوں ہی کو تندرست بنانے آئی ہے تو اس کا نازل ہونا تو تحصیل حاصل ہی رہا۔

تیسرا یہ کہ متقین کی پہلی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ ایمان بالغیب کے متعلق عام خیال تو یہ ہے کہ یہ محض عامیانہ تقلید یا وہمی پن یا خوش عقیدگی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوتے کہ قرآن اپنی تاثیر کا جوہر صرف انھی پر دکھا سکتا ہے جو وہمی اور خوش عقیدہ قسم کے لوگ ہوں، سوچنے سمجھنے اور غور و فکر سے کام لینے والوں پر اس کا بیان یا استدلال کارگر نہیں ہو سکتا۔

چوتھا یہ کہ یہاں متقین کی چند صفات بھی گنائی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں، وہ نماز قائم کرتے ہیں، وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، وہ خدا کی اتاری ہوئی ہر کتاب پر ایمان لاتے ہیں، وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ یہ سارے کام کر رہے ہیں تو اس کے بعد وہ کون سی ہدایت ہے جس کے یہ محتاج رہ جاتے ہیں اور جو یہ کتاب فراہم کرتی ہے؟ کیا ہدایت ان چیزوں سے بالاتر کسی چیز کا نام ہے جس کا ان سارے کاموں کے کرنے کے بعد بھی آدمی محتاج ہی رہ جاتا ہے؟

پانچواں سوال یہ ہے کہ یہاں ایمان کے بعد عملی نیکیوں میں سے صرف دو ہی کا ذکر کیا گیا ہے، ایک نماز کا، دوسری انفاق کا۔ آخر ان کی اہمیت کا وہ کیا خاص پہلو ہے جس کی وجہ سے ان کا ذکر کیا گیا ہے اور دوسری

کسی نیکی کا ذکر نہیں کیا گیا؟

سوالات تو بعض اور بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا جواب تھوڑے سے غور و فکر سے ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے اس وجہ سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ البتہ مذکورہ سوالات خاصی اہمیت رکھتے ہیں اس وجہ سے ہم ترتیب کے ساتھ ان کے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے مخالفین اگر قرآن کا انکار کر رہے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ قرآن کا کتاب اللہ ہونا ان پر واضح نہیں تھا، کم از کم سورۂ بقرہ کے زمانہ نزول یعنی اوائل ہجرت میں تو اس کتاب کا کتابِ الٰہی ہونا اہل کتاب اور مشرکین سب پہ واضح ہو چکا تھا۔ قبولِ حق میں جو چیز مانع تھی وہ یہ نہیں تھی کہ حق اچھی طرح واضح نہیں تھا بلکہ یہ تھی کہ قبولِ حق کے لیے طبیعتوں میں جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان کے اندر موجود نہیں تھی۔ ایسی صورت میں ثابت کرنے کی بات یہ نہیں تھی کہ یہ کتابِ الٰہی ہے اور اس کے کتابِ الٰہی ہونے کی یہ یہ دلیلیں ہیں بلکہ کہنے کی بات یہی تھی کہ یہ کتابِ الٰہی ہے، اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے طبیعتوں میں صلاحیت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ قرآن نے یہی کیا ہے۔ یہاں ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کہہ کر اس نے اس شرط کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے۔ یہ شرط ہے تقویٰ اور خدا ترسی۔ گویا قرآن یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہا ہے کہ نہ قرآن کا کتابِ الٰہی ہونا محتاجِ ثبوت ہے اور نہ تمہارا فرستادۂ الٰہی ہونا۔ یہ بالکل واضح حقیقتیں ہیں لیکن ان حقیقتوں کی وضاحت ان لوگوں کو کیا نفع پہنچا سکتی ہے جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں، جن کی آنکھوں پر محسوسات کی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں، جو فطرت کی بنیادی نیکیوں کو بھی ختم کر چکے ہیں اور جن کو تعصب نے بالکل اندھا بہرا بنا دیا ہے۔

علاوہ بریں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس سورہ میں اصلی خطاب، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہود سے ہے۔ یہود آخری کتاب اور آخری رسول سے ناآشنا نہیں تھے۔ توریت کی کتاب تثنیہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ان کے بھائیوں کے اندر سے ان کے لیے ایک نبی بھیجے گا، اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالے گا، اس کے ذریعہ سے شریعت کو کامل کرے گا، اس کے واسطہ سے ان کے دشمنوں سے انتقام لے گا، جو اس کی بات نہ سنیں گے وہ ان کو سزا دے گا، وہ خدا کے نام سے کلام کرے گا، اس کی پیشین گوئیاں سچی ہوں گی اور وہ اس وقت تک دنیا میں رہے گا جب تک اللہ کا کلمہ بلند نہ ہو جائے۔

یہود ان ساری باتوں سے اچھی طرح باخبر بھی تھے اور ان میں سے ایک ایک بات کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کی زندگی کے حالات نے ثبوت بھی فراہم کر دیا تھا۔ بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد تو وہ تمام آثار بالکل سامنے آ چکے تھے، جن کو دیکھ لینے کے بعد یہود کو یقین ہو

چکا تھا کہ تورات کی اس پیشین گوئی کے مصداق درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ پھر یہود اس پیشین گوئی ہی کی بنا پر ایک نبی اور کتاب کے منتظر بھی تھے۔ ایسے حالات کے اندر ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا دعویٰ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ گویا انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ وہی موعود کتاب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، جس کے تم منتظر رہے ہو اور جو ان تمام باتوں کی تصدیق کر رہی ہے جو اس کے بارے میں تمھیں پہلے بتائی جا چکی ہیں۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں اس دعوے پر دلیل کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہود اپنے تعصب، اپنی ضد اور اپنے حسد سے باز آئیں اور اس کتاب کو جس کے لیے وہ مدت ہائے دراز سے چشم براہ تھے ہاتھوں ہاتھ لیں اور اس کی برکتوں اور رحمتوں کا تجربہ کریں۔

دوسرے سوال کا جواب اگرچہ پہلے سوال کے جواب کے ذیل میں ایک حد تک آ چکا ہے لیکن ہم اس کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں تاکہ اس کے وہ پہلو بھی سامنے آ جائیں جو نہیں آ سکے ہیں۔

انسان پر کسی چیز کے اثر انداز ہونے کے لیے تنہا یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ چیز بجائے خود مؤثر ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ سورج لاکھ چمکے لیکن ایک شخص اندھا ہو تو سورج کے چمکنے سے اس کو کیا فایدہ پہنچ سکتا ہے۔ چمن میں بلبل ہزار چہکے لیکن اگر ایک شخص بہرا ہے تو وہ اس کے چہکنے سے کیا لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قرآن کا نور ہونا، بصیرت ہونا، سرچشمہ ہدایت ہونا مسلّم، لیکن اگر ایک شخص نے اپنی وہ صلاحیت ہی ضائع کر دی ہے جو اس نور اور اس سرچشمۂ ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے تو آخر قرآن کیا کرے گا۔ قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (اس میں خدا سے ڈرنے والوں کے لیے درس عبرت ہے) (۲۶، نازعات) اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (بے شک اس کے اندر یاد دہانی ہے اس کے لیے جس کے پاس بیدار دل ہو یا وہ پوری طرح متوجہ ہو کر بات سنے (۳۷، ق)

یہ انسان کی اسی فطری صلاحیت کی طرف اشارہ ہے جو قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے۔ اسی چیز کو یہاں تقویٰ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

تقویٰ کے مختلف درجے

اس تقویٰ کے کئی درجے ہیں۔ ایک تو وہ تقویٰ ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، جس کی طرف قرآن نے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے۔ یہ تقویٰ نیکی کی ہر بات اور بھلائی کی ہر دعوت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک شرط ضروری ہے جس نے اپنے اندر سے یہ تقویٰ ضائع کر دیا گویا وہ اس معقولیت ہی سے خالی ہو بیٹھا جو اس کو نیکی اور بھلائی کی طرف راغب کر سکتی تھی۔ یہ تقویٰ جس طرح انسانیت اور شرافت کے سارے ہی کاموں پر آمادہ کرنے کے لیے ضروری ہے اسی طرح قرآن کی دعوت کی طرف مائل کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ قرآن چیز ہی ایسی ہے کہ اس کی طرف بے فکرے اور اوباش قسم

کے لوگ متوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔ وہی لوگ متوجہ ہو سکتے تھے جن کے اندر نیکی اور شرافت کا جوہر موجود ہو چنانچہ تاریخ کی شہادت بھی یہی ہے کہ قرآن کی دعوت نے عربوں میں سے ان لوگوں کو اپیل کیا جو سنجیدہ اور معقول تھے اور اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جذب کیا جو متقی اور خدا ترس تھے۔

دوسرا تقویٰ وہ ہے جو قرآن کی پیروی کے نتیجہ اور ثمرہ کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بھی کئی درجے ہیں۔ لیکن یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں تو اس تقویٰ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک شرط ضروری ہے۔ لیکن اس کے بعد اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ سے لے کر وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ تک ان متقین کی جو صفتیں بیان ہوئی ہیں وہ اس تقویٰ کا نتیجہ ہیں جو قرآن کی پیروی سے پیدا ہوا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایمان بالغیب ضعیف الاعتقادی یا وہمی پن کا ثبوت نہیں فراہم کر رہا ہے بلکہ انسان کے عقلی اور روحانی ہستی ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا ہے اور قرآن نے اسی پہلو سے اس چیز کا یہاں ذکر کیا بھی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی تمام تگ و دو بس محسوسات ہی تک محدود ہوتی ہے، اس سے آگے کے لیے نہ ان کے اندر کوئی رغبت ہی ہوتی ہے اور نہ وہ اس سے آگے جانے کی کوئی کوشش ہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی عقل کو بھی، جو بلند پروازی کی فطری صلاحیتیں رکھتی ہے، اور جس کا اصلی میدان محسوسات نہیں بلکہ ماورائے محسوسات ہے، انھی محسوسات کے اندر قید کر چھوڑتے ہیں کہ اس کو جتنا زور لگانا ہو انھی کے اندر لگائے، اس سے باہر نکلنے کو وہ بالکل بادپیمائی اور ہرزہ سرائی خیال کرتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے نزدیک حقیقی قدر و قیمت محسوسات و مادیات کی نہیں بلکہ عقل اور اس کے ادراکات کی ہے، وہ عقل ہی کو انسانیت کا خاصہ اور اس کا جوہر سمجھتے ہیں، اسی چیز کو وہ انسان اور حیوان کے درمیان فرق کرنے والی مانتے ہیں اور ان کے دل کی حقیقی خوشی محسوسات کی فانی لذتوں میں نہیں بلکہ عقل کی ان روحانی فتوحات ہی میں ہوتی ہے۔ قرآن نے اسی گروہ کی طرف یہاں يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہی گروہ ہے جو اس کی بلندیوں کا ساتھ دے سکتا ہے۔ پہلے گروہ کو تو اس نے چوپایوں سے تشبیہ دی ہے بلکہ ان کو چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے۔ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (کیا تم گمان کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں، یہ تو بالکل چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے) (۴۴۔ فرقان) یعنی جب وہ اپنی عقل جیسی اعلیٰ چیز کو بھی محسوسات ہی کی چاکری میں لگائے ہوئے ہیں تو نہ ان کا سننا سننا ہے اور نہ ان کا سمجھنا سمجھنا۔ یہ تو وہ بے وقوف لوگ ہیں جو ایک تیغ جوہر دار سے وہ کام لے رہے ہیں جو گھاس کاٹنے کی درانتی سے لیا جاتا ہے۔

پس غیب میں رہتے ہوئے ایمان لانے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ محض محسوسات کے غلام اور مادیات کے

پرستار نہیں ہیں بلکہ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتے ہیں اور جو باتیں عقل سے ثابت ہیں یا فطرت جن کی شہادت دیتی ہے ان کو وہ تسلیم کرتے ہیں اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی جن محسوس اور مادی راحتوں اور لذتوں کو قربان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ان کو بے دریغ قربان کر دیتے ہیں۔

چوتھے سوال کا جواب اگرچہ دوسرے سوال کے جواب کے ضمن میں ایک حد تک آگیا ہے لیکن ہم اس کو بھی مزید واضح کیے دیتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ملحوظ رکھنے کی ہے کہ متقین کے بعد متقین کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان کی حیثیت توضیحی صفات کی ہے۔ یعنی اس لفظ کے جو مصداق اس زمانہ میں قرآن کے سامنے تھے قرآن نے بطورِ مثال ان کی طرف انگلی اٹھا دی ہے کہ یہ لوگ ہیں جن کے اندر تقوٰی موجود تھا، چناں چہ دیکھ لو، انھوں نے مجھ سے فائدہ اٹھایا۔ ان صفات کو آپ اس معنی میں نہ لیں کہ یہ سب قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ابتدائی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ ان کی حیثیت قرآن کی پیروی کے ثمرات و برکات کی ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو قرآن نے ھُدًی کہا ہے، جس کی وضاحت ہم تفصیل سے اس کے مقام میں کر چکے ہیں، وہ بہرحال ظاہری اعمال و عقائد سے ایک بالاتر حقیقت ہے۔ اعمال و عقائد یا تو اس ہُدٰی کے ثمرات و برکات ہیں یا اس کے حصول کے اسباب و ذرائع، وہ بعینہٖ ہُدٰی نہیں ہیں۔ اعمال و عقائد میں آدمی کا اہتمام و انہماک جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی اس کے لیے ھُدٰی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۱۷۔ محمد) (جو ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں، خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے)

اسلام میں بنیادی نیکیاں

آخری سوال کے جواب میں گزارش ہے کہ قرآن کے تدبر سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں بنیادی نیکیوں کی حیثیت نماز اور زکوٰۃ کو حاصل ہے۔ دوسری نیکیاں انھی دو بڑی نیکیوں کے تحت ہیں، بلکہ انھی سے پیدا ہوتی ہیں۔ چناں چہ قرآن کے بے شمار مقامات میں ان دونوں کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ ان کا ذکر آگیا تو گویا سب کا ذکر آگیا۔ مثلاً فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (۱۱۔ توبہ) (پس اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمھارے دینی بھائی بن گئے) حضرت اسماعیلؑ کی تعریف میں فرمایا ہے، وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (۵۵۔ مریم) (اور وہ اپنے کنبے کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا) حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبانی منقول ہے، وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (اور اس نے مجھے نماز اور روزہ کی ہدایت کی جب تک جیوں) (۳۱۔ مریم)

مذکورہ بالا آیات میں اگرچہ ذکر نماز اور زکوٰۃ ہی کا ہے لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف یہی دو چیزیں مراد نہیں ہیں بلکہ دوسری نیکیاں بھی مراد ہیں لیکن ان ساری نیکیوں کی جڑ چونکہ یہی دونوں چیزیں

ہیں تو جب جڑ کا ذکر آگیا تو شاخوں کا ذکر خود بخود ہو گیا۔

ان دونوں چیزوں کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فی الواقع دین میں ان کی حیثیت ہونی بھی یہی چاہیئے۔ ایک آدمی کے اللہ تعالیٰ کا ٹھیک بندہ بن جانے کے لیے آخر کس چیز کی ضرورت ہے؟ اسی چیز کی کہ ایک طرف وہ اپنے رب سے ٹھیک ٹھیک جڑ جائے اور دوسری طرف خلق سے اس کا تعلق صحیح بنیاد پر قائم ہو جائے، نماز انسان کو خدا سے صحیح طور پر جوڑ دیتی ہے اور انفاق سے خلق کے ساتھ اس کا تعلق بالکل صحیح بنیاد پر استوار ہو جاتا ہے۔ ایک شخص اگر اپنے رب کے حقوق ادا کرتا ہے اور خلق کے حقوق پہچانتا ہے تو وہ تمام نیکیوں کی کلید پا گیا۔ انھی دو کی مدد سے وہ دوسری ساری نیکیوں کے دروازے بھی کھول لے گا اور سب کا اختیار کر لینا اس کے لیے سہل ہو جائے گا۔ اسی سے ملتی جلتی بات حضرت مسیح نے بھی فرمائی ہے۔ انجیل متی ۲۲ = ۳۵-۴۰ میں ہے۔

"اور ان میں سے ایک عالم شرع نے آزمانے کے لیے اس سے پوچھا اے استاد توریت میں کون سا حکم بڑا ہے؟ اس نے اس سے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انھی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیا کے صحیفوں کا مدار ہے۔"

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس ارشاد سے صاف واضح ہے کہ انھی دونوں نیکیوں پر تمام دین و شریعت کا مدار ہے اور ان کا بنیادی نیکیاں ہونا صرف قرآن ہی سے واضح نہیں ہوتا بلکہ تورات، انجیل اور تمام انبیاء کے صحیفوں میں ان کی یہی حیثیت ہے۔

۵- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۶-۷

یہ ان لوگوں کی خصوصیات بیان ہوئی ہیں جو قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے تھے۔ آگے ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو اس نعمت سے محروم رہنے والے ہیں۔ فرمایا۔

آیات ۶-۷

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ
لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ
وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ
عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٧﴾

ترجمۂ آیات ۶-۷

جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے

نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ ۶-۷

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۶)

کفر کی حقیقت

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا: کفر کے معنی اصل لغت میں ڈھانکنے اور چھپانے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ شکر کے ضد کی حیثیت سے بھی استعمال ہوا ہے اور ایمان کے ضد کی حیثیت سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کے معنی ناشکری اور کفرانِ نعمت کے ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں انکار کے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ لفظ کی اصل روح ان دونوں معنوں کے اندر موجود ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ مطلق بھی استعمال ہوا ہے اور اپنے مفعول کے ساتھ بھی۔ جہاں مفعول کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو متعین طور پر اس مفعول ہی کا کفر وانکار مراد ہے۔ لیکن جہاں کسی مفعول کے بغیر مطلق صورت میں استعمال ہوا ہے وہاں بالعموم تو ان تمام چیزوں کے انکار کے معنی میں استعمال ہوا ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن کہیں کہیں ناشکری اور کفرانِ نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جس کا پتہ قرینہ اور موقع ومحل سے چلتا ہے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا سے کون مراد ہیں؟

موقع کلام کا تقاضا یہ ہے کہ الَّذِينَ كَفَرُوا سے یہاں انکار کرنے والوں کا کوئی مخصوص گروہ مراد ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کی چند خاص صفات بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے لیے ڈرانا اور نہ ڈرانا دونوں برابر ہے، یہ کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، یہ کہ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حال تمام کفار کا نہیں تھا، ان میں بہتیرے ایسے بھی تھے جو ابتدا میں منکر ومخالف رہے لیکن بعد میں اسلام لائے۔ اس وجہ سے یہ امر تو بدیہی ہے کہ یہاں کوئی مخصوص گروہ مراد ہے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گروہ کن لوگوں کا ہے؟

ہمارے نزدیک اس سے مراد قریش، اہل کتاب اور منافقین کے وہ لیڈر اور سردار ہیں جن پر قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پوری طرح واضح ہو چکی تھی لیکن اس وضاحت کے باوجود وہ محض ضد، ہٹ دھرمی، انانیت اور حسد وتکبر کے سبب سے مخالفت کر رہے تھے۔ اس تخصیص کے بعض وجوہ یہ ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس سے اوپر والے ٹکڑے میں اس گروہ کا بیان ہوا ہے جو قرآن پر ایمان

لانے والا تھا۔ وہاں ہم نے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس سے اہل کتاب اور بنی اسماعیل کے وہ تمام سلیم الفطرت اور خدا ترس لوگ مراد ہیں جن کے ضمیر زندہ، جن کی صلاحیتیں محفوظ اور جن کے دل بیدار تھے۔ انھی کے مقابل میں مذکورہ آیات میں اس گروہ کا بیان ہو رہا ہے جو ایمان لانے والا نہیں ہے۔ یہ تقابل خود دلیل ہے کہ اس سے مراد قریش اور اہل کتاب میں سے وہ لوگ ہوں جن کو دنیا پرستی اور حسد و انانیت نے بالکل اندھا بہرا کر دیا تھا، جن کی فطرت مسخ ہو چکی تھی اور جو قبولِ حق کی تمام صلاحیتوں سے یک قلم محروم ہو چکے تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن نے اس گروہ کی جو خصوصیات، اس کا نام لیے بغیر بیان کی ہیں بعینہٖ وہی خصوصیات دوسرے مقامات میں یا تو نام کی صراحت کے ساتھ بیان کی ہیں یا ایسے واضح قرائن کے ساتھ بیان کی ہیں جن سے گروہ کا تعین آپ سے آپ ہو جاتا ہے۔ ان مقامات کو سامنے رکھ کر اگر اس آیت کے اجمال کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے تو آدمی اسی نتیجہ تک پہنچتا ہے جس نتیجہ تک ہم پہنچے ہیں۔ یعنی اس سے مشرکین، یہود اور منافقین کے وہ سردار اور لیڈر مراد لیے جائیں جن پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ قرآن کی دعوت حق ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ یہاں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۱۰۶-۱۰۸ نحل)

جس نے کفر کیا اللہ کا ایمان کے بعد، بجز ان کے جو مجبور کیے گئے اور جن کے دل ایمان پر جمے رہے، پر جن کے سینے کفر کے لیے کھل گئے تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اللہ کافر قوم کو راہ یاب نہیں کرتا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر، کانوں پر اور جن کی آنکھوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور یہی لوگ ہیں جو بے خبر ہیں۔

اس آیت میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو لوگ ایمان لا چکنے یا حق کے واضح ہو جانے کے بعد محض دنیا پرستی کی وجہ سے کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان پر اللہ کا غضب ہوتا ہے، ان کے لیے عذاب عظیم ہے، ان کے لیے خدا ایمان کی راہ نہیں کھولا کرتا، ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے حقیقی مصداق اگر ہو سکتے تھے تو سرداران قریش، علمائے یہود اور منافقین ہی ہو سکتے تھے

یا پھر وہ لوگ جو انھی کی روش اختیار کریں۔

دوسری جگہ تمام انبیا کے مخالفین و معاندین کے بارہ میں فرمایا ہے:

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰۱ - اعراف)

یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتیں ہم تم کو سناتے ہیں۔ ان کے پاس ان کے انبیا کھلی کھلی نشانیاں کر آئے لیکن وہ ایمان لانے والے نہ بنے، بوجہ اس کے کہ وہ جھٹلاتے رہے پہلے سے۔ اسی طرح اللہ مہر کر دیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔

خاص طور پر یہود کے بارہ میں فرمایا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۵۵ - نساء)

پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو توڑا، اللہ کی آیات کا انکار کیا، نبیوں کو ناحق قتل کیا اور کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر مہر کر دی ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم۔

اسی طرح منافقین کے بارہ میں یہ الفاظ وارد ہیں:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۳ - منافقون)

یہ اس وجہ سے کہ وہ ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی سو وہ نہیں سمجھتے۔

قرآن کی ان تصریحات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ زیر بحث آیت میں اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا کا اشارہ ایک خاص گروہ کی طرف ہے۔ لیکن یہ گروہ نہ تو مخصوص طور پر مشرکین کا ہے نہ محدود مفہوم میں اہل کتاب کا بلکہ یہ مشرکین اور اہل کتاب دونوں گروہوں کے ان افراد پر مشتمل ہے جو حق کو اچھی طرح پہچان چکنے کے بعد اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

سلف سے اس آیت کی تاویل میں جو اقوال منقول ہیں ان سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس سے اہل کتاب کے وہ ہٹ دھرم لوگ مراد ہیں جو ان تمام پیشین گوئیوں کو جھٹلا چکے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ان کے صحیفوں میں موجود تھیں اور اس طرح انھوں نے اس عہد کو توڑ دیا تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے آخری نبی سے متعلق لیا تھا۔ ربیع بن انس کے نزدیک اس سے ان مختلف پارٹیوں کے لیڈر مراد ہیں جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھیں۔ یہ دونوں قول ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں بس فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ ربیع بن انس کی تاویل نسبتہً جامع اور

وسیع ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے اس وجہ سے ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

ءَاَنذَرْتَهُمْ: انذار کے معنی ڈرانے، ہوشیار کرنے اور خبردار کرنے کے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ ایک طرف تو نہایت ٹھوس انفسی و آفاقی دلائل پر مبنی ہوتی ہے۔ دوسری طرف اس میں انذار و تبشیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ تبشیر کا مفہوم اس فوز و فلاح اور اس کامیابی و کامرانی کی بشارت دینا ہے جو نبی کی دعوت قبول کر لینے اور اس کی بتائی ہوئی صراط مستقیم اختیار کر لینے سے دنیا اور آخرت دونوں میں حاصل ہوتی ہے۔ انذار کا مفہوم ان خطرات و مہالک سے آگاہ کرنا ہے جن سے نبی کی تکذیب کرنے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انبیا علیہم السلام عام حالات میں یہ دونوں ہی فرض انجام دیتے ہیں۔ لیکن جہاں ضدی اور ہٹ دھرم لوگ مقابل میں آن کھڑے ہوتے ہیں جن کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں بلکہ محض حسد اور عناد کی بنا پر ہوتی ہے، وہاں قدرتی طور پر نبی کی دعوت میں انذار کا پہلو غالب ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت حالات اسی کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں آپ کے کام کو صرف انذار ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ آیت زیر بحث کا تعلق، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، ان مخالفین و معاندین سے ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں کر رہے تھے بلکہ یہ جانتے ہوئے کر رہے تھے کہ آپ نبی برحق ہیں اور قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

انذار ہو یا تبشیر دونوں کی حقیقت ان قدرتی نتائج سے آگاہ کرنا ہے جو ایمان یا کفر کے اندر مضمر ہیں۔ جس طرح ایک طبیب اپنے زیرِ علاج مریض کو دوا اور پرہیز کے فوائد اور بدپرہیزی اور مرض سے غفلت کے نتائج سے آگاہ کرتا ہے اسی طرح پیغمبر بھی اپنی قوم کو اپنی دعوت کے ماننے اور نہ ماننے کے فوائد اور نتائج سے آگاہ کرتا ہے۔

'انذار' کی حقیقت

بعض لوگ انذار کی اس حقیقت سے بے خبر ہونے کے سبب سے مذہب کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ یہ موہوم خطرات کے ڈراوے سنا سنا کر لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، انسان کی عقل سے اپیل نہیں کرتا۔ یہ معترض عموماً دو باتوں سے بے خبر ہیں، ایک تو یہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ قرآن کی دعوت صرف انذار و تبشیر ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اندر نہایت مضبوط انفسی و عقلی دلائل بھی رکھتی ہے، انذار و تبشیر اس کی دعوت کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسری چیز جس سے یہ بے خبر ہیں وہ ایمانی و اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت ہے۔ یہ لوگ اس بات سے تو واقف ہیں کہ سنکھیا کھا لینے سے آدمی مر جایا کرتا ہے لیکن یہ حقیقت ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کفر، نفاق اور جھوٹ سے بھی انسان ہلاک ہو جایا کرتا ہے۔ پیغمبر کو چونکہ اخلاقی اقدار کے ثمرات و نتائج کا اچھی طرح علم ہوتا ہے اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان سے آگاہ کرتا ہے اور اسی انداز بیان میں آگاہ کرتا ہے جو انداز بیان اس کے علم و یقین کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ اسی چیز کو قرآن مجید انذار کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۗ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۷)

ختم کا مفہوم

خَتَمَ اللّٰهُ: خَتْمٌ کے معنی عربی زبان میں موم یا مٹی یا کسی اسی طرح کی چیز پر ٹھپہ لگانے کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ خط پر مہر لگانے اور کسی چیز کے منہ کو اس طرح بند کر دینے کے لیے استعمال ہونے لگا جس کے بعد نہ اس میں کوئی چیز داخل ہو سکے اور نہ کوئی چیز اس سے نکل سکے۔

قرآن مجید میں بعض جگہ جب اللہ تعالیٰ کسی فعل کو اپنی طرف منسوب فرماتا ہے تو اس سے مقصود نفس اس فعل کو اپنی طرف منسوب کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس قانون یا اس سنت کو اپنی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے جس قانون اور سنت کے تحت وہ فعل ظہور میں آتا ہے۔ چونکہ یہ قانون خود اللہ تعالیٰ ہی کا مقرر کردہ ہوتا ہے اس وجہ سے وہ فعل جو اس قانون کے تحت ظہور میں آتا ہے بعض اوقات قانون کے بنانے والے کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ تعبیر مطلب کا یہ اسلوب کم و بیش ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ عربی زبان اور قرآن مجید میں بھی اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ اسی اسلوب کے مطابق یہاں دلوں پر مہر لگانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے لیکن مقصود اس سے اس سنت اللہ کی اپنی طرف نسبت ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے لیے جاری کر رکھی ہے اور جس کے تحت دلوں پر مہر کرنے کا یہ فعل واقع ہوتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ سنت اللہ کیا ہے تو اس کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

سمع کے واحد لانے کی وجہ

عَلٰى سَمْعِهِمْ: ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہاں سمع کا لفظ واحد کیوں استعمال ہوا جب کہ قلوب و ابصار کے الفاظ جمع استعمال ہوئے ہیں۔ کلام کی ہم آہنگی کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بھی جمع یعنی اَسْمَاع استعمال ہوتا۔ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ اس چیز کا تعلق اہل زبان کے طریق استعمال سے ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کم و بیش ۲۰ - ۲۲ مقامات میں استعمال ہوا ہے اور اکثر جگہ قلوب، افئدہ اور ابصار کے ساتھ استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ واحد ہی کی شکل میں استعمال ہوا ہے، کہیں بھی جمع کی شکل میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید زبان کے لحاظ سے بھی ایک معیاری چیز ہے اس وجہ سے ماننا پڑے گا کہ فصحائے عرب اس سیاق میں اس لفظ کو اسی طرح استعمال کرتے رہے ہیں۔

۷۔ ختم قلوب کی حقیقت اور اس کے بارے میں قانون الٰہی

یہاں جس ختم قلوب کا ذکر ہے اس کے بارے میں دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔

ایک یہ کہ اس ختم سے مراد ختم ظاہری نہیں ہے بلکہ ختم معنوی مراد ہے۔ جہاں تک ظاہری چیزوں کے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا تعلق ہے یہ لوگ ان کو دیکھتے، سنتے اور سمجھتے تھے لیکن اس مشرب کے لوگ اپنی سمجھ بوجھ کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں دنیا کے ظواہر و محسوسات ہی تک محدود رکھتے ہیں، ان ظواہر و محسوسات کے پس پردہ جو حقائق ہیں ان کی طرف نہ تو یہ خود متوجہ ہوتے ہیں اور نہ کسی دوسرے توجہ دلانے والے کی بات پر

کان ہی دھرتے ہیں۔ دنیا اور زخارفِ دنیا میں ان کا انہماک اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کسی اور چیز کی طرف توجہ کرنے کی ان کے اندر گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ اپنی ذہانت و فطانت اسی ایک مقصد پر صرف کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کا طول و عرض ناپنے میں تو ان کی عقل بڑی تیز ہو جاتی ہے لیکن روحانی اقدار و حقائق کے معاملہ میں وہ بالکل ہی کند ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال ان کے مذاق کو بھی اس قدر بگاڑ دیتی ہے کہ صرف وہی باتیں ان کو اچھی لگتی ہیں جن سے ان کے اس بگڑے ہوئے مذاق کو غذا ملے۔ جن باتوں سے اس کی حوصلہ شکنی ہو، خواہ وہ کتنی ہی معقول ہوں، ان سے ان کی طبیعت کو وحشت ہوتی ہے۔ اسی صورتِ حال کو یہاں ختمِ قلوب کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

دوسری یہ کہ اس ختمِ قلوب سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ان کی ماؤں کے پیٹوں ہی سے ان کے دلوں پر ٹھپے لگا کر پیدا کیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بداعمالیوں سے اپنے آپ کو اس قدر بگاڑ لیا ہے کہ ان کے دل پیغمبر کی بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے اس نے ہر انسان کو اچھی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس کو نیکی و بدی کا امتیاز بخشا ہے اور ساتھ ہی نیکی کو پسند کرنے اور بدی سے نفرت کرنے کا مذاق بھی اس کے اندر ودیعت کیا ہے۔ ان فطری صلاحیتوں سے آراستہ کرنے کے بعد اس نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے کہ چاہے وہ نیکی کا راستہ اختیار کرے چاہے بدی کا۔ آگے چل کر یہی اختیاری نیکی یا بدی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں کے بنانے یا بگاڑنے میں اصلی دخل رکھتی ہے۔ اگر انسان نیکی اور بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس سے اس کی فطری صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو نیکی کی راہ میں ترقی کی توفیق ملتی ہے اور اگر وہ خواہشاتِ نفس کے پیچھے لگ کے بدی کے راستے پر چل پڑتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ اس کا دل برائی کا رنگ پکڑنا شروع کرتا ہے یہاں تک کہ یہ رنگ اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے اندر نیکی کی کوئی رمق باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت آدمی کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور اس کا مذاقِ طبیعت اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ اس کی ساری دلچسپی صرف بدی ہی کے کاموں سے باقی رہ جاتی ہے، نیکی کے کام کرنا تو الگ رہا نیکی کی باتیں سننے سے بھی اس کو وحشت ہوتی ہے۔

چناں چہ قرآن مجید میں یہ بات بار بار بیان ہوئی ہے کہ آدمی کے دل پر یہ مہر اس کے گناہوں کی پاداش میں لگتی ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ	کیا ان لوگوں کو جو اگلوں کے بعد اس زمین کے
مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ	وارث ہوئے اس بات سے کوئی سبق حاصل نہیں
بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	ہوتا کہ اگر ہم چاہتے تو ان کے گناہوں کی پاداش
فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ (۱۰۰۔ اعراف)	میں ان پر بھی آفت لاتے اور ان کے دلوں پر مہر کر

دیتے پس وہ سننے سمجھنے سے رہ جاتے۔

اس آیت میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ دلوں پر مہر گناہوں کی سزا کے طور پر لگتی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ۝ (۱۰۱-۱۰۲، اعراف)

اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن یہ لوگ ایمان لانے والے نہ بنے کیوں کہ یہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے، اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے۔ ہم نے ان میں سے اکثر کے اندر عہد کی پابندی نہیں پائی (بلکہ) ہم نے ان میں سے اکثر کو بدعہد اور نافرمان پایا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کے احکام کی خلاف ورزی میں یہ پہلے سے مشاق تھے۔ اس وجہ سے جب ان کے رسول بھی ان کے پاس اللہ کی آیات اور اس کی نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے ان کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ جو لوگ حق کی تکذیب میں اس طرح دیدہ دلیر اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے جس سے ان کی عقل بالکل ہی ماری جاتی ہے۔

اس سے زیادہ وضاحت و تصریح کے ساتھ یہود کے بارے میں فرمایا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (۱۵۵- نساء)

پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے عہد کو توڑا، اللہ کی آیات کا انکار کیا، انبیاء کو ناحق قتل کیا اور کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر ان کے کفر کے سبب سے مہر کر دی ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم۔

مذکورہ بالا آیات سے ایک تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی ماں کے پیٹ سے اس کے دل پر مہر کر کے نہیں بھیجتا بلکہ یہ مہر جس کے دل پر بھی لگتی ہے اس کے گناہوں کے قدرتی نتیجہ کے طور پر لگتی ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ ہر درجہ کا گناہ وہ چیز نہیں ہے جس کے نتیجہ میں کسی کے دل پر مہر لگ جایا کرے، بلکہ کوئی فرد یا کوئی گروہ جب حق کو حق سمجھتے ہوئے، اپنے دل کی گواہی کے بالکل خلاف محض ضد، نفسانیت اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور اس مخالفت پر جم جاتا ہے تب اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور وہ صحیح طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت

سے محروم ہو جایا کرتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ دل کا اس طرح مہر بند ہو جانا اور سمع و بصر کی صلاحیتوں سے اس طرح محروم ہو جانا اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے جو اس کی نعمتوں کی ناشکری کی پاداش میں کسی فرد یا گروہ پر اس دنیا میں نازل ہوتا ہے اور اسی عذاب کا فطری نتیجہ وہ عذاب عظیم ہے جس میں اس طرح کے لوگ اس زندگی کے بعد والی زندگی میں مبتلا ہوں گے۔ چنانچہ زیر بحث آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے) وہ درحقیقت اسی ختم قلوب کے اس قدرتی نتیجہ کا بیان ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔

ختم قلوب کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اس کی وہی حقیقت احادیث سے بھی واضح ہوتی ہے۔ ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک حدیث پر یہاں اکتفا کرتے ہیں۔

ان المومن اذا اذنب كانت نكتة سوداء في قلبه فان تاب ونزع واستغفر صقل قلبه وان زادت حتى تعلو قلبه فذلك الران الذي قال الله تعالىٰ كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون۔

(ابن کثیر بحوالہ ترمذی)

مومن جب کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے سبب سے اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے، اس گناہ سے باز آ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو اس کے دل کا وہ دھبہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کے گناہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان کی سیاہی اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے تو یہی وہ رین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون (ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی چھا گئی ہے)

سلف صالحین کے نزدیک بھی ختم قلوب کی یہی حقیقت ہے۔ ابن کثیر نے اعمش کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اعمش کہتے ہیں کہ مجاہد نے ایک مرتبہ ہمیں سمجھایا کہ سلف (صحابہؓ) دل کو اس ہتھیلی کے مانند سمجھتے تھے۔ جب آدمی کسی گناہ میں آلودہ ہوتا ہے تو (انھوں نے اپنی انگلی سکیڑتے ہوئے سمجھایا) دل اس طرح سکڑ جاتا ہے۔ پھر جب مزید گناہ کرتا ہے تو (دوسری انگلی کو سکیڑتے ہوئے بتایا) دل اس طرح بھنچ جاتا ہے اسی طرح تیسری انگلی کو سکیڑا۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے تمام انگلیوں کو سکیڑ لیا۔ پھر فرمایا کہ جب دل گناہوں کے غلبہ سے اس طرح بھنچ جاتا ہے تو اس پر مہر کر دی جاتی ہے۔ مجاہد نے بتایا کہ سلف (صحابہؓ) اسی چیز کو وہ رین قرار دیتے تھے جس کا ذکر كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ الآیہ میں آیا ہے۔

جبر اور اختیار

ختم قلوب کی اصل حقیقت واضح ہو جانے کے بعد ہمیں جبر و اختیار کی اس بحث میں پڑنے کی ضرورت

باقی نہیں رہی جو اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان برپا ہے اور جس میں یہ حضرات بے ضرورت اس آیت کو بھی گھسیٹ لے گئے ہیں۔ قرآن مجید نہ تو اس جبر ہی کے حق میں ہے جس کے مدعی اشاعرہ ہیں اور نہ اس اختیار ہی کے حق میں ہے جس کے علم بردار معتزلہ ہیں بلکہ حق ان دونوں کے درمیان ہے لیکن یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیلات کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ہم صرف چند اصولی باتیں یہاں بیان کیے دیتے ہیں جو ان لوگوں کے لیے ان شاء اللہ کفایت کریں گی جو اس مسئلہ پر ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر صرف علمی ذہن کے ساتھ غور کریں گے۔ یہ اصولی باتیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ مبداء فطرت سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اچھی فطرت پر پیدا کیا ہے، اس کو نیکی و بدی کا امتیاز بخشا ہے اور ان میں سے جس کو بھی وہ اختیار کرنا چاہے اس کو اختیار کرنے کی اس کو آزادی دی ہے۔ اس کے بعد اس کا نیک یا بد بننا اس کے اپنے رویّہ اور توفیقِ الٰہی پر منحصر ہے۔ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق بخشتا ہے اور اگر وہ بدی کی راہ پر جانا چاہتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ، اگر چاہتا ہے، بدی کی راہ پر جانے کے لیے بھی چھوڑ دیتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ جن چیزوں پر انسان کا مواخذہ کرے گا یا جن پر اس کو اجر دے گا ان کے لیے اس نے انسان کو اختیار و ارادہ کی آزادی بھی بخشی ہے۔ جو لوگ اس اختیار و ارادہ کے حامل نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو مواخذہ سے بھی بری رکھا ہے۔ یہ اختیار و ارادہ انسان کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے اور اس کا استعمال بھی انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی کے تحت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور حکمت کے تحت انسان کے جس ارادہ کو چاہے پورا نہ ہونے دے البتہ اگر وہ اپنی کسی حکمت کے تحت اس کے کسی نیکی کے ارادہ کو پورا نہیں ہونے دیتا تو اس نیکی کے اجر سے اس کو محروم نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر اس کی کسی بدی کی اسکیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کے اخروی خمیازہ سے بھی لازماً اس کو بری قرار دے دے۔

۳۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی مطلق مشیت کا بیان ہوا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کی مشیت کو اس کے سوا کوئی دوسرا روک یا بدل نہیں سکتا۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی مشیت سرے سے کسی عدل و حکمت کی پابند ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل اور حکیم ہے، اس کا کوئی کام بھی عدل اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا اس وجہ سے جہاں کہیں بھی اس نے اپنی مشیّت کو بیان فرمایا ہے اس کو اس قانونِ عدل و حکمت ہی کے تحت سمجھنا چاہیے جس کے تحت اس نے اس دنیا کے نظم کو چلانا پسند فرمایا ہے۔ یہ خیال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ اپنی جو سنت اس نے خود جاری کی ہے اور جس قانونِ عدل کو اس نے خود پسند فرمایا ہے اپنی مشیّت کے زور سے خود ہی اس کو توڑ دے گا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ

نہیں ہیں کہ اس پر ہدایت و ضلالت کے لیے اس نے عدل و حکمت کا کوئی ضابطہ سرے سے مقرر ہی نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہدایت و ضلالت اس سنت کے مطابق واقع ہوتی ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور کوئی دوسرا اس سنت کے توڑنے یا بدلنے پر قادر نہیں ہے۔

۴۔ قرآن مجید میں بعض افعال اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمائے ہیں لیکن ان سے اصل مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان افعال کی نسبت نہیں ہے بلکہ ان ضابطوں اور ان قوانین کی نسبت ہے جن کے تحت وہ افعال واقع ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ ضابطے اور قاعدے خود اللہ تعالیٰ ہی کے ٹھہرائے ہوئے ہیں اس وجہ سے کہیں کہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے تحت واقع ہونے والے افعال کو بھی اپنی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم (جب وہ کج ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل کج کر دیئے) یا فرمایا ہے ونقلب افئدتھم وابصارھم (اور ہم ان کے دل اور ان کی آنکھیں الٹ دیتے ہیں) اس طرح کے مواقع پر عموماً قرآن مجید میں وہ اصول بھی بیان کر دیا جاتا ہے جس کے تحت وہ فعل واقع ہوتا ہے۔ مثلاً اس طرح کی کوئی بات کہہ دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں گمراہ کرتا مگر فاسقوں کو۔ ان اشارات کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ قاری اصل حقیقت کی طرف متوجہ ہو جائے اور ظاہر الفاظ سے کسی مغالطہ میں نہ پڑ جائے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا ازلی و ابدی اور محیط کل علم، اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سنتوں میں سے کسی سنت کی نفی نہیں کرتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کے متعلق ازل سے یہ جانتا ہے کہ وہ ہدایت کی راہ اختیار کرے گا یا ضلالت کی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ ہدایت یا ضلالت کو اسی سنت اللہ کے مطابق اختیار کرے گا جو ہدایت و ضلالت کے لیے اس نے مقرر کر رکھی ہے۔

ان اصولی باتوں کو جو شخص پیش نظر رکھے گا وہ انشاء اللہ ان بہت سی الجھنوں سے آپ سے آپ نکل جائے گا جو جبر و اختیار کے معاملہ میں قرآن مجید کی پیدا کردہ نہیں بلکہ متکلمین کی موشگافیوں کی پیدا کردہ ہیں۔

۸۔ مجموعہ آیات ۶-۷ کا اصلی مدعا

ان آیات کا اصل مدعا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف یہ خبر دینا نہیں ہے کہ فلاں گروہ کے لوگ، خواہ تم ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، ایمان لانے والے نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں آیتیں (۶-۷) چند نہایت اہم حقائق سے پردہ اٹھا رہی ہیں۔ ہم ان میں سے بعض باتوں کی طرف یہاں اشارہ کریں گے تاکہ ان آیات کی اصل تعلیم واضح ہو سکے۔

۱۔ پہلی چیز جو ان آیات کے اندر سب سے زیادہ واضح ہے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی اور آپ کے مخالفین کے لیے سرزنش اور دھمکی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہ لوگ اپنے کفر پر جو جمے ہوئے ہیں تو اس وجہ سے جمے ہوئے ہیں کہ آپ کے انذار و تبلیغ میں

کوئی کسر ہے یا آپؐ جو کلام سنا رہے ہیں وہ کسی پہلو سے غیر موثر ہے۔ نہ آپؐ کے انذار و تبلیغ میں کوئی کسر ہے نہ اس کلام میں کوئی نقص یا خلا ہے بلکہ ساری خرابی خود ان لوگوں کے اپنے دلوں کے اندر ہے۔ اللہ کے دین کی صداقتوں کو جھٹلاتے جھٹلاتے اب یہ قانونِ الٰہی کی زد میں آچکے ہیں جس کے سبب سے ان کے دلوں کے اندر سے اثر پذیری کی، ان کے کانوں کے اندر سے حق نیوشی کی اور ان کی آنکھوں کے اندر سے عبرت نگاہی کی ساری صلاحیتیں سلب ہو چکی ہیں۔ اب آپ ان کی صلاح و فلاح کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں۔ اب ان کے لیے اگر کوئی چیز باقی رہ گئی ہے تو وہ اللہ کا عذاب ہے جس سے وہ لازماً دوچار ہوں گے۔

۲۔ دوسری حقیقت جو واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایمان و ہدایت کے داخل ہونے کا رستہ اس کا دل، اس کی عقل، اس کے کان اور اس کی آنکھیں ہیں۔ اگر آدمی ان کو کھلا رکھے، آفاق اور انفس کے اندر ہر وقت جو مشاہدے ہو رہے ہیں ان پر بصیرت کی نگاہ ڈالے۔ خدا کے کلام اور داعیانِ حق کی باتوں کو سراپا گوش ہو کر سنے اور پھر ان ساری چیزوں پر تدبّر و تفکر کرے اور راستبازی و دیانتداری کے ساتھ جن حقائق تک پہنچے ان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے اور ان کو حرزِ جاں بنائے تب اس کو ہدایت ملتی ہے۔ اگر وہ یہ راہ نہ اختیار کرے اور قدرت کی بخشی ہوئی ان صلاحیتوں سے نہ کام لے تو وہ لاکھ سر مارے لیکن اس کے لیے ایمان و ہدایت کی راہ نہیں کھل سکتی۔

۳۔ تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کی روحانی و عقلی ترقی اور اس کے کمال کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمع، بصر اور فواد کی جو عظیم صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں ان کو ان کے صحیح مقصد کے لیے استعمال کرے۔ اگر آدمی ان کو استعمال نہ کرے یا استعمال تو کرے لیکن اس اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال نہ کرے جس کے لیے یہ فی الحقیقت عطا ہوئی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو وبال بنا دیتا ہے۔ ان کے وبال ہونے کی صورت ان کے استعمال نہ کرنے کی حالت میں تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی سب کچھ رکھنے کے باوجود فکر و عمل کے ہر میدان میں عاجز و درماندہ رہتا ہے اور غلط استعمال کرنے کی صورت میں یہ وبال اس طرح بنتی ہیں کہ یہ آدمی کو زندگی بھر ہر وادی اور ہر صحرا میں ہرزہ گردی کراتی ہیں یہاں تک کہ اس خلائے لامتناہی میں بھی اس کو چکر کرا لاتی ہیں اگر نہیں پہنچنے دیتیں تو اسی دروازے پر جو نجات اور فلاح کا اصلی دروازہ ہے۔

۹۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۸-۱۶

اب آگے انھی ایمان نہ لانے والوں کے ایک اور گروہ کا بیان ہو رہا ہے جس کی خصوصیات اور جس کا ذہنی پس منظر مذکورہ بالا گروہ سے کچھ مختلف ہے، اس وجہ سے وہ مستقلاً ذکر کیے جانے کا مستحق ہے فرمایا:۔

آیات ۸-۱۶

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ
بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا
فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ
الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ ۭ
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاۗءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳ وَاِذَا لَقُوا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ
قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۴ اَللّٰهُ
يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۵
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ
تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۶

ترجمہ آیات ۸-۱۶

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالاں کہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس کا احساس نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ تھا تو اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا، اور ان کے لیے دردناک

عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پیدا کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں لیکن یہ محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں، کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟ آگاہ رہو کہ بے وقوف یہی لوگ ہیں لیکن یہ جانتے نہیں۔ اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کی مجلسوں میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ ہیں، ہم تو ان لوگوں سے محض مذاق کرتے ہیں۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دیئے جا رہا ہے، یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت ان کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔ ۸ - ۱۶

۱۰- الفاظ کی تحقیق

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۸) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۹)

'الناس' سے مراد

مِنَ النَّاسِ: الناس کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس عام سے ایک خاص گروہ مراد ہے اور وہ گروہ ہے یہود کا۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ صرف یہود ہی ہو سکتے تھے جن کے اندر کی کوئی جماعت وہ روپ دھار سکتی تھی جس کی طرف قرآن نے ان آیات میں اشارہ کیا ہے۔ آگے مستقل عنوان سے اس اجمال کی وضاحت آئے گی۔

'خدع' اور 'مخادعت' کا مفہوم

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ: مخادعت کے معنی ہیں دھوکا دینے کی کوشش کرنا عام اس سے کہ وہ دھوکا کامیاب ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ یہاں مخادعت کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے اور خدع کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے، جہاں لفظ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے وہاں تو مخادعت استعمال ہوا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی خواہش تو کوئی شخص اپنی حماقت کے سبب سے کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کو دھوکا دے نہیں سکتا۔

برعکس اس کے خود ان کے لیے خدع کا لفظ استعمال ہوا ہے کیوں کہ جو شخص خدا کو دھوکا دینے کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنی اس کوشش میں تو ناکام رہتا ہے لیکن خود اپنے آپ کو وہ ضرور دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ: شعور کا لفظ کسی محسوس چیز کے ادراک کے لیے آیا کرتا ہے۔ یہاں اس لفظ کا استعمال اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اگرچہ خدا کو دھوکہ دینے کی کوشش میں خود دھوکا کھا جانا ایک محسوس ہونے والی چیز ہے لیکن یہ بر خود غلط لوگ ہوشیاری و چالاکی کے زعم کے باوجود اتنے غبی ہیں کہ اس حقیقت کا احساس نہیں کر رہے ہیں کیونکہ ابھی اس کا نتیجہ ان کے سامنے نہیں آیا ہے۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ (۱۰)

مرض کا مفہوم

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: مرض کا لفظ قرآن میں عموماً دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک کینہ اور حسد کے معنی ہیں۔ دوسرے نفاق کے معنی میں۔ جن مقامات میں یہ لفظ نفاق کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو یہ واضح طور پر کینہ اور حسد کے معنی میں ہے لیکن جن مقامات میں یہ تنہا استعمال ہوا ہے وہاں یا تو دونوں معانی اس کے اندر جمع ہیں یا قرینہ اس کے دونوں معانی میں سے کسی ایک معنی کو متعین کرتا ہے۔ یہاں واضح قرینہ اس بات کے لیے موجود ہے کہ اس سے مراد حسد ہے کیوں کہ یہاں جس گروہ کا بیان ہے آگے چل کر واضح ہوگا کہ یہ یہود ہی کے اندر کا ایک گروہ ہے اور یہود کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں سے جو حسد تھا وہ معلوم و مشہور ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس کا ذکر فرمایا ہے۔

زیادتی مرض کا پہلو

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا: یہاں حسد کے بڑھانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے جو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے تو یہ درحقیقت اس سنت کو اس نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جس کے تحت یہ فعل انجام پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے سینہ کو ایمان و اسلام کی جلوہ گاہ بنانے کے بجائے اس کو بغض و حسد ہی کی پرورش گاہ بنائے رکھنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے اسی طرح کے حالات و واقعات ظاہر ہونے ہیں جو اس کی اسی لس بھری فصل کی آبیاری کرتے ہیں۔ یہود کو مسلمانوں پر حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی نعمت کیوں دے دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اور اس کی برکتوں کی روز افزوں ترقی نے ان کے اس حسد کے اسباب میں اور زیادہ اضافہ کیا اور یہ اضافہ برابر ہوتا ہی رہا یہاں تک کہ اس چیز نے ان کو بالکل تباہ کر کے چھوڑا۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (۱۱) اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ (۱۲)

فساد فی الارض کی حقیقت

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ: افساد فی الارض قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم اس نظام حق کو بگاڑنا یا اس کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام و قوانین کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے اور جس کی دعوت انبیائے کرام علیہم السلام لے کر آتے ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ جس

طرح اس کائنات کا نظامِ تکوینی اس وجہ سے قائم ہے کہ اس کے اندر ایک ہی رب قدیر و قہار کا ارادہ کارفرما ہے، اگر اس کے اندر کسی اور کا زور و اختیار بھی چلتا ہوتا تو یہ آن کے آن میں درہم برہم ہو کے رہ جاتا اسی طرح اس کے نظامِ تشریعی کے اندر اگر کسی اور کی عبادت و اطاعت کے جواز یا دخل کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے اس کا مزاج بالکل ہی بگڑ کے رہ جاتا ہے اور یہ بگاڑ سارے نظامِ تمدن کو خراب کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ کوشش قرآن کے نزدیک فساد فی الارض کے حکم میں داخل ہے جو اس بگاڑ کا دروازہ کھولے اگرچہ یہ کوشش بظاہر اصلاح کے نیک ارادہ ہی کے ساتھ کیوں نہ کی جائے

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۤءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاۤءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۱۳)

كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ: یہاں الناس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۱۴)

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ: خلوا کے بعد الیٰ کا صلہ تقاضا کرتا ہے کہ یہاں کوئی فعل ایسا محذوف مانا جائے جو اس صلہ سے مناسبت رکھنے والا ہو۔ ہم نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

لفظ 'شیطان' کی تحقیق

شیطان کا لفظ شاط یشیط سے فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی جلد باز، تند خو مشتعل مزاج اور شریر و سرکش کے آتے ہیں۔ ان خصوصیات کے حامل جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ یہاں یہ لفظ یہود کے ان لیڈروں کے لیے استعمال ہوا ہے، جو فساد فی الارض کے اس سارے کھیل کی رہنمائی کر رہے تھے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۵)

اللہ کا مذاق

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ: مد کے معنی ڈھیل دینے اور کسی کی رسی دراز کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ان کی رسی دراز کرتا جا رہا ہے تاکہ جب ان کو پکڑے تو ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اپنے جس مذاق کا ذکر فرمایا ہے یمدھم فی طغیانھم کے الفاظ اسی کی وضاحت کر رہے ہیں۔ یہ لوگ خوش تھے کہ مسلمانوں کو بے وقوف بنانے اور اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حالانکہ صحیح راہ بتانے والے کو اپنے خیال کے مطابق جو شخص دھوکا دے کر ایک غلط راہ اختیار کرتا ہے وہ راہ بتانے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ وہ خود اپنے آپ ہی کو

آوارہ گردی کی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ اب یہ محض اس کی خود فریبی اور حماقت ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے راہ بتانے والے کو دھوکا دیا ہے۔ دھوکا تو درحقیقت اس نے خود کھایا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (۱۶)

'اشتراء' کا مفہوم

اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ ، اشتراء کے معنی خریدنے کے ہیں۔ آدمی جس چیز کو کوئی قیمت ادا کرکے خریدتا ہے اس کو اس شے کے مقابل میں، جس کو وہ قیمت قرار دیتا ہے ترجیح دیتا ہے۔ یہیں سے اس لفظ کے اندر ترجیح دینے کا مفہوم پیدا ہوگیا اور اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

۱۱۔ یہ اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے؟

یہود کا ایک خاص گروہ

اوپر دو گروہوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک ان لوگوں کا جو ایمان لائے، دوسرے ان لوگوں کا جو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے بعد یہ ایک تیسرے گروہ کا بیان ہے جو تعلق تو رکھتا ہے ایمان نہ لانے والے گروہ سے لیکن اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان سے کچھ مختلف مزاج رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ گروہ کن لوگوں کا ہے؟ لوگوں نے عام طور پر یہ سمجھا ہے کہ یہ منافقین کا گروہ ہے لیکن یہاں شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ منافقین کے لفظ سے جو گروہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ ظاہرا ہر پہلو سے اپنے آپ کو مسلمانوں کے اندر شامل رکھنے کی کوشش کرتا تھا، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اس کو جو عداوت تھی وہ چھپی ہوئی تھی جو صرف خاص خاص مواقع ہی پر ظاہر ہوتی تھی لیکن اس گروہ کی جو خصوصیات قرآن نے بیان فرمائی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ تو باطناً مسلمانوں کے ساتھ تھے اور نہ زبانی ہی ان کے ساتھ اتفاق کے اظہار کے لیے آمادہ تھے۔ مثلاً یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کا اظہار زبان سے بھی کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ علاوہ ازیں یہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ان سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ اگر ایمان کے مدعی ہو تو مسلمانوں کی طرح ایمان لاؤ تو کھلم کھلا مسلمانوں کو بے وقوف ٹھہراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو عام معنی میں منافقین کے زمرہ سے سمجھنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ منافقین کے زمرہ سے تعلق نہیں رکھتے تو پھر یہ کون لوگ ہیں اور کس زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی یہود ہی کے اندر کا ایک گروہ تھا لیکن اسلام کی مخالفت میں اس کا کردار اس گروہ کے کردار سے کچھ مختلف نوعیت کا تھا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اوپر جس گروہ کا ذکر ہوا ہے وہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات بھی سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا،

بلکہ اندھا بہرا ہو کر آپ کی مخالفت پر اُتر آیا تھا، لیکن یہ گروہ اسلام کی مخالفت مصلحت اندیشی کے رکھ رکھاؤ اور مصالحت پسندی کے روپ میں کرنا چاہتا تھا۔

مندرجہ بالا آیات پر اچھی طرح غور کرنے سے اس گروہ کا جو ذہنی پس منظر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک اسلام دشمنی کے جذبہ کا تعلق ہے یہ گروہ پچھلے گروہ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ یہود میں دوسروں کے بالمقابل اپنی برتری کا جو احساس تھا وہ بھی ان لوگوں کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا، بنی اسماعیل پر، ان کے اندر آخری نبی کی بعثت کی پیشین گوئی کے سبب سے، یہود کو جو حسد تھا، اس حسد میں بھی یہ مبتلا تھے بلکہ اس پیشین گوئی کے عملاً ظہور، اسلام کی روز افزوں ترقی اور عربوں کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی مقبولیت نے ان کے اس حسد میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ ان ساری باتوں میں یہ لوگ اپنے ہم قوموں کے شریک تھے۔ لیکن یہ اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے مجرد انکار اور ضد کی اس پالیسی کو صحیح نہیں سمجھتے تھے جو یہود کے اس گروہ نے اختیار کی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بلکہ یہ لوگ یہودیت اور اسلام کے درمیان ایک قسم کے سمجھوتے کے خواہش مند تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ اسلام بھی اپنی جگہ پر رہے اور ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے خود ان کو جو مرتبہ اور امتیاز حاصل ہے وہ بھی باقی رہے۔ اس کی جو شکل ان کے ذہن میں تھی وہ ان آیات کی روشنی میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ مسلمانوں سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ مسلمان اپنی طرح ان کو بھی مومن اور خدا پرست سمجھیں کیونکہ جہاں تک اللہ اور آخرت پر ایمان کا تعلق ہے ان کا دعویٰ تھا کہ ان دونوں چیزوں پر یہ بھی ایمان رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ مسلمان اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیغمبر اور ان کی پیش کی ہوئی کتاب کو آسمانی کتاب کی حیثیت سے ماننا چاہتے ہیں تو مانیں لیکن ان سے اُن کے ماننے کے لیے اصرار نہ کریں، اگر انھوں نے دوسروں کی نجات بھی ان کے ماننے پر منحصر کر دی اور جس نے نہ مانا اس کو اللہ اور اس کے رسول کا مکذّب قرار دے دیا تو اس سے ان کے نزدیک اس ملک کے مختلف مذہبوں اور ان کے پیرووں کے درمیان ایک سخت قسم کی منافرت اور کشمکش کی حالت پیدا ہو جائے گی اور مذہبی رواداری کی وہ فضا جو اس ملک کے اندر اب تک قائم رہی ہے ختم ہو کے رہ جائے گی۔ اپنے اسی خیال کی بنا پر یہ لوگ اپنے آپ کو اصلاح کرنے والا بھی سمجھتے تھے۔ یعنی ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ہم اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو نہیں مان رہے ہیں تو یہ کسی افساد کی کوشش نہیں ہے بلکہ یہ عین اصلاح کی کوشش ہے کیوں کہ اس طرح ہم اس انتشار کو روک رہے ہیں جو اس نئی نبوت اور اس نئی دعوت سے پیدا ہو رہا ہے۔

۱۲- مجموعۂ آیات ۸-۱۶ پر تدبّر

اس گروہ کو اچھی طرح مشخّص کر لینے اور اس کے ذہنی پس منظر کو وضاحت کے ساتھ سمجھ لینے کے بعد

ان آیات پر دوبارہ تدبر کی نگاہ ڈالیے تو ایک ایک لفظ کی خوبیاں اور ایک ایک فقرہ کی بلاغتیں اور باریکیاں اچھی طرح سمجھ میں آئیں گی۔ نیز یہ واضح ہوگا کہ اسلام کے یہ چالاک دشمن کیا کہتے اور کیا چاہتے تھے اور قرآن نے ان کی ہر بات پر کتنی سخت اور کیسی برمحل گرفت کی ہے۔

سب سے پہلے ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے دعوے کو لیجیے۔ اس دعوے سے ان کا مقصود محض اپنے آپ کو قرآن کی گرفت سے بچانا تھا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے اوپر قرآن میں جو اتنی لے دے ہو رہی ہے یہ بالکل غلط اور ناجائز ہے۔ ہم بھی اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، دینداری اور خدا پرستی تنہا مسلمانوں ہی کا اجارہ نہیں ہے۔ اس دھونس سے وہ اپنے خلاف مسلمانوں کی زبانیں بند کرنا چاہتے تھے۔ حالاں کہ یہ حقیقت ان سے مخفی نہیں تھی کہ قرآن ان سے جس ایمان و اسلام کا مطالبہ کر رہا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جس کے یہ مدعی ہیں۔ قرآن کا مطالبہ ان سے جس ایمان و اسلام کے لیے تھا وہ صرف اس شکل میں پورا ہو سکتا تھا جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خود قرآن پر اس طرح ایمان لاتے جس طرح مسلمان ایمان لائے تھے۔ چوں کہ یہ لوگ اس بات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے بات بنانے اور دھونس جمانے کی کوشش کر رہے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کی اس کوشش کو مخادعت یعنی دھوکہ بازی سے تعبیر فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ ان کی یہ دھوکا بازی صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ہے کیوں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے منشا کو سمجھتے ہوئے اس سے گریز کی راہ تلاش کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کے ساتھ چال بازی کرتا ہے خواہ وہ اپنے اس فعل کے اس مکروہ پہلو کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔

پھر یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ وہ کوشش تو کر رہے ہیں اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص چال بازی کر کے اپنے کسی ناصح مشفق کے مشورہ کو ٹھکراتا ہے وہ اس ناصح مشفق کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ وہ اپنے آپ ہی کو کسی کھڈ میں گراتا ہے۔ فرض کیجیے ایک حاذق اور خیر خواہ طبیب کسی مریض کے لیے ایک نسخہ لکھتا ہے۔ مریض اس نسخہ کو تو استعمال نہیں کرتا، البتہ طبیب کو مختلف حیلوں حوالوں سے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس سے بہتر نسخہ استعمال کر رہا ہے اور وہ تمام تندرستوں سے زیادہ تندرست ہے۔ ہو سکتا ہے کہ طبیب اس کی جھوٹی قسموں اور اس کی ہیر پھیر کی باتوں سے خاموش ہو جائے لیکن اس دھوکا بازی کا خمیازہ کس کے سامنے آئے گا، طبیب کے سامنے یا مریض کے سامنے؟ ظاہر ہے کہ مریض ہی کے سامنے۔ اب یہ محض اس کی اپنی بے عقلی ہو گی اگر وہ اس امر واقعی کا احساس نہ کرے۔

اس کے بعد قرآن نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ ایک حقیقت کا جرأت کے ساتھ استقبال کرنے کے بجائے انھوں نے جھوٹ اور فریب کی یہ روش جو اختیار کی ہے اس کا سبب ان کا وہ حسد ہے جو بنی اسمٰعیل

کے خلاف وہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کے اندر اپنا آخری نبیؑ مبعوث فرمایا، اس پر اپنی کتاب اتاری، اس نبی کی دعوت پھیلنے لگی اور اس بات کے آثار صاف نظر آنے لگے کہ اب دنیا کی دینی رہنمائی کی باگ بنی اسرائیل کے ہاتھوں سے نکل کر بنی اسماعیل کے ہاتھوں میں جا رہی ہے تو یہ غصہ اور حسد سے کھولنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انعام ان پر کیوں فرمایا، اس کے حق دار تو ہم تھے اور جتنا ہی بنی اسمٰعیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات بڑھتے گئے اتنا ہی ان کے حسد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

ان لوگوں کے اندر حق پسندی اور اخلاقی جرأت ہوتی تو یہ خود اس حق کا ساتھ دے کر اللہ تعالیٰ کے اس انعام میں حصہ دار بن سکتے تھے لیکن یہ لوگ نہ تو دینی پیشوائی کے موروثی پندار سے دستبردار ہونے کے لیے تیار تھے، نہ اپنے حسد کے سبب سے اس بات کے لیے تیار ہوئے کہ بنی اسمٰعیل کے اندر پیدا ہونے والے نبیؑ پر ایمان لائیں اور نہ ہی جرأت رکھتے تھے کہ خم ٹھونک کر میدان میں آئیں اور اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکیں۔ جب ان باتوں میں سے کسی بات کی بھی ہمت وہ نہ کر سکے تو واحد راہ جو ان کے لیے باقی رہ گئی تھی وہ یہی تھی کہ جھوٹ اور فریب کے دامن میں پناہ لیں۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو خبردار کیا کہ یہ انھوں نے بہت ہی غلط پناہ گاہ تلاش کی ہے، اگر اس پناہ گاہ کے اندر انھوں نے چھپنے کی کوشش کی تو دنیا میں حسد کی آگ میں جلتے رہیں گے اور آخرت میں ان کا انجام دردناک عذاب ہے۔

دوسری چیز جو خاص طور پر توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی جو مخالفت کر رہے تھے قرآن نے اس کو زمین میں فساد برپا کرنے سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ درحقیقت کسی فعل کو اس کے آخری نتائج سے تعبیر کرنے کا ایک معروف اسلوب ہے جو قرآن میں بہت سے مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ اس اسلوب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے سامنے اس کے کسی فعل کا آخری نتیجہ آ جاتا ہے۔ یہ چیز کسی فعل سے باز رکھنے میں بھی مددگار ہوتی ہے اگر فعل بُرا ہو، اور اس پر ابھارنے میں بھی مددگار ہوتی ہے، اگر فعل اچھا ہو۔ بات جو ان لوگوں سے کہنی تھی وہ تو یہی تھی کہ دینِ حق کی دعوت میں روک نہ بنیں لیکن محض اتنی بات کہنے سے ان کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح واضح نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی اس روش سے اس دنیا کی تباہی و بربادی میں کس درجہ کا حصہ لے رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس روش کا وہ انجام ان کے سامنے رکھ دیا گیا ہے جو سامنے آ سکتا ہے اگر خدانخواستہ وہ اپنی اس مہم میں کامیاب ہو جائیں۔

رہا اس زمین کا صلاح و فساد تو اس کا انحصار، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، صرف اس چیز پر ہے کہ اس کے اندر کس کا حکم اور کس کا قانون چلتا ہے۔ اس کے حقیقی خالق و مالک کا، یا کسی اور کا۔ اگر اس کے خالق و مالک کا حکم چلتا ہے تو اس سے اس زمین پر امن و عدل کا صحیح نظام قائم ہو گا اور اس کی وہ تمام برکتیں ظہور میں آئیں گی جو اس کے اندر ودیعت ہیں۔ اور اگر صورت اس کے برعکس ہو تو اس کے ہر گوشہ میں فساد رونما ہو گا اگرچہ اس فساد کو تہذیب و تمدن کے کتنے ہی خوش نما ناموں سے موسوم کر دیا جائے۔

انبیاء علیہم السلام چونکہ اس زمین میں خدا کا قانون جاری کرنا چاہتے ہیں اس وجہ سے ان کی جدوجہد اس زمین کی اصلاح کی حقیقی جدوجہد ہوتی ہے اور اس کی مخالفت کی راہ میں ہر قدم فساد کا قدم ہے خواہ وہ بظاہر کتنے ہی نیک ارادہ کے ساتھ اٹھایا جائے۔ اسلام کے یہ مخالفین اپنی اس مخالفت کے لیے وجہ جواز یہ پیش کرتے تھے کہ ایک نئی نبوت کے ظہور اور خاص کر اس کے اس دعوے کے سبب سے کہ کہ خدا کا حقیقی دین وہی ہے جس کو اس نے پیش کیا ہے، اس ملک میں سخت انتشار پیدا ہو رہا ہے اس وجہ سے یہ جو اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں یا اس سے لوگوں کو روک رہے ہیں تو اس ملک میں فساد نہیں مچا رہے ہیں بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ فساد تو ان کے خیال میں وہ لوگ برپا کر رہے تھے جنھوں نے یہ نئی دعوت بلند کی تھی یا اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ قرآن مجید نے اس کا جواب یہ دیا کہ فساد برپا کرنے والے تو درحقیقت یہی لوگ ہیں لیکن ان کو اپنے فساد کا احساس نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی خود غرضی اور تنگ نظری کے سبب سے اس حقیقت کو سمجھ نہیں رہے ہیں کہ اس دنیا کی اصلاح اس طرح نہیں ہو سکتی کہ حق اور باطل، کفر اور اسلام دونوں کو ملا کر رکھا جائے، بلکہ اس کی اصلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی ہے اس کی پیروی کی جائے۔ ان لوگوں کا پہلا جرم تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم گم کی اور اب جب کہ اللہ تعالیٰ اس کو از سر نو دنیا کے لیے کھول رہا ہے تو ان مفسدین کی کوشش یہ ہے کہ لوگ اس صراط مستقیم کو اختیار کرنے کے بجائے اپنی اپنی پسند کردہ پگڈنڈیوں ہی پر بھٹکتے رہیں اور اس حماقت کو یہ لوگ اصلاح سمجھتے ہیں حالاں کہ یہ عین افساد ہے۔

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے اس دعوائے ایمان اور اس مظاہرۂ رواداری کے پس پردہ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تحقیر کا جو خبث چھپا ہوا تھا قرآن نے نہایت خوبی کے ساتھ اس سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے تاکہ ان کی دھوکا بازی کے سبب سے اگر کسی مسلمان کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہو کہ یہ لوگ دوسروں کے مقابل میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے کچھ فراخ دل ہیں تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ یہ پردہ قرآن نے اس طرح اٹھایا ہے کہ ان کا یہ راز فاش کر دیا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں پر تو اپنے مومن ہونے کی دھونس جماتے ہیں تاکہ مسلمان ان کو اپنے سے کچھ مختلف نہ سمجھیں لیکن دوسری طرف ان کے خبثِ باطن کا یہ حال ہے کہ اگر ان سے کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ اگر آپ لوگ ایمان کے مدعی ہیں تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح قرآن پر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کیوں نہیں لاتے تو یہ بات سنتے ہی ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کیا ہم ان ناسمجھ اور احمق لوگوں کی طرح ہر ایرے غیرے کو نبی مان لیں اور اس کے پیچھے لگ جائیں؟

قرآن مجید نے ان کی اس بات کا جواب یہ دیا کہ بے وقوف اور احمق تو درحقیقت یہی لوگ ہیں

لیکن چوں کہ ابھی ان کی اس بے وقوفی کا انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے اس وجہ سے موقع ہے کہ یہ کچھ دنوں یہ دانش فروشی اور کرلیں۔

قرآن مجید نے ان لوگوں کا یہ راز بھی یہاں کھول دیا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے پاس جب آتے ہیں تو ان پر یہ اثر جمانے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا ان کے اور مسلمانوں کے درمیان سرے سے کوئی تفاوت ہے ہی نہیں لیکن جب یہ اپنی مجلسوں میں جاتے ہیں اور اپنے لیڈروں سے ملتے ہیں تو وہاں مسلمانوں کے سامنے اپنی کہی ہوئی باتوں کی صفائی پیش کرتے ہیں اور ان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم تو بدستور آپ کے ساتھ ہیں، مسلمانوں سے جو باتیں ہم کہتے ہیں وہ تو محض ان کو بے وقوف بنانے کے لیے بطور مذاق کہتے ہیں۔

قرآن مجید نے ان کی اس بات کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ تو سمجھ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مذاق کر رہے ہیں حالانکہ مذاق ان کے ساتھ قدرت کر رہی ہے جو ان کی اس سرکشی کے باوجود ان کو ڈھیل پر ڈھیل دیے جا رہی ہے۔ وہ اپنی چالوں میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہوئے آگے بڑھے جا رہے ہیں اور یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ان کا یہ آگے بڑھنا اس ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لیے آگے بڑھنا ہے جو اس طرح کے لوگوں کے لیے خدا کی طرف سے مقدر ہے لیکن انھیں نظر نہیں آ رہا ہے۔

اس سلسلہ کی آخری بات جو فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ عقل و دانش کے اس ادعا کے باوجود انھوں نے سودا بہت غلط کیا۔ انھوں نے ہدایت کے بدلہ میں ضلالت خریدی اور اس کو بڑا نفع بخش مال سمجھا لیکن یہ مال ان کے لیے نہ آخرت میں نفع بخشنے والا ہے نہ دنیا میں۔ آخرت میں تو اس کی قدر و قیمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن دنیا کے بازار میں اگر اس کی مانگ تھی تو نبی آخر الزمان کی بعثت سے وہ بھی ختم ہو گئی۔ اور اب یہ لوگ خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق ہیں۔ ان کی یہی ضلالت پسندی ان کے اسلام سے محرومی کا سبب بھی بنی ہے۔

۱۳۔ ایک شبہ کا ازالہ

ان آیات میں قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مخالفوں کے لیے جو لفظ استعمال ہوئے ہیں وہ بظاہر سخت معلوم ہوتے ہیں، ممکن ہے ان کی وجہ سے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ اندازِ کلام اس حکمتِ دعوت کے منافی ہے جس کی نصیحت خود قرآن نے فرمائی ہے۔ قرآن مجید نے خود یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے رستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور اہل کتاب کے بارے میں تو خاص طور پر اس کی یہ ہدایت ہے کہ ان سے صرف خوب صورت طریقہ ہی سے دین کے معاملہ میں بحث و گفتگو کی جائے۔ پھر یہاں قرآن نے انھی اہل کتاب کے ایک گروہ کے بارے میں سفہاء، مفسدین اور ان کے اکابر اور لیڈروں کے لیے شیاطین تک کے الفاظ کیوں استعمال فرمائے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ دعوت کے دور میں استعمال نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہ اس وقت استعمال ہوئے ہیں جب انھوں نے اپنی مسلسل ہٹ دھرمیوں اور شرارتوں اور اسلام کے خلاف اپنی پیہم ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اور یہ کسی طرح بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس مرحلہ میں آکر ان لوگوں کے لیے یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور مقصود ان کے استعمال سے صرف غصہ اور نفرت کا اظہار نہیں ہے بلکہ بیان واقعہ اور اظہار حقیقت ہے تاکہ دوسرے لوگ جو اپنے دین و ایمان کی سلامتی چاہتے ہیں ان لوگوں کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ آسمانی ہدایت کے ان قدیم وارثوں کا انحطاط کس درجہ تک پہنچ چکا ہے اور جن کو خدا نے اپنی زمین کی اصلاح کے کام پر مامور کیا تھا اب وہ اس میں کیا کیا فساد مچا رہے ہیں۔

یہ سورہ بقرہ، جس میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں، بنی اسرائیل کے لیے صرف دعوت کی سورہ نہیں بلکہ ان کے لیے ملامت کی سورہ بھی ہے۔ اس میں ان کے ان جرائم کی فہرست پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے جو انھوں نے خدا کی شریعت اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے خلاف کیے ہیں اور جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بات کا مستحق قرار دیا ہے کہ وہ قوموں کی امامت کے منصب سے ہٹائے جائیں اور ان کی جگہ ایک دوسری امت اس منصب پر سرفراز کی جائے۔ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اچھی طرح اتمام حجت کر چکنے کے بعد فرمایا ہے اور اس کے وجوہ اور دلائل آگے اس سورہ میں بیان ہوں گے۔ اس وجہ سے یہ بات عین اس سورہ کے مزاج کے مطابق ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کے حقیقی چہرے سے نقاب اٹھا دی جائے تاکہ جن لوگوں پر ان کے مذہبی تقدس کا ایک رعب تھا اور جس سے یہ لوگ اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کرنے میں فائدہ اٹھا رہے تھے وہ ختم ہو جائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی یہود کے علما اور لیڈروں کے لیے جو سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ بھی اس طرح کے اتمام حجت کے بعد استعمال فرمائے ہیں۔ حضرت مسیح کے یہ الفاظ انجیلوں میں موجود ہیں۔ اگر قرآن کے الفاظ سے ان کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قرآن کے الفاظ بہت ہی نرم ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو ان کے لیے "سانپ کے بچوں" اور "سفیدی پھری ہوئی قبروں" تک کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

۱۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۷-۲۰

اس کے بعد قرآن نے مذکورہ دونوں مخالفِ اسلام گروہوں کی ایک ایک تمثیل بیان کی ہے۔ پہلی تمثیل مقدم الذکر مختوم القلوب گروہ کی ہے جو اپنی فطرت کو اس قدر مسخ کر چکا ہے اور اسلام کی مخالفت میں اس قدر آگے جا چکا ہے کہ اب اس کے لیے اسلام قبول کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا ہے۔

دوسری تمثیل اس موخر الذکر گروہ کی ہے جو اسلام کی علانیہ مخالفت کے بجائے اس کے خلاف چالیں

چل رہا ہے اور ایک نہایت واضح حقیقت کا، جس کا حق ہونا خود اس پر بھی واضح ہے، نہایت اوچھی تدبیروں سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔

پہلے ان دونوں تمثیلوں کو، قرآن کے حکیمانہ الفاظ میں ملاحظہ فرما لیجیے، اس کے بعد ہم اپنے الفاظ میں ان کی وضاحت کریں گے۔ فرمایا:

آیات ١٧-٢٠
مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ
مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ
لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾
أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ ۚ
يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ
الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ
أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ ۖ وَإِذَا أَظْلَمَ
عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ
أَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾ ع

ترجمۂ آیات ١٧-٢٠ ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے لوگوں کے لیے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایسی تاریکی میں چھوڑ دیا جس میں ان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔ ١٧-١٨

یا ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو، اس میں تاریکی ہو، کڑک ہو اور چمک ہو۔ یہ کڑکے کی وجہ سے موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونسے لے رہے ہوں۔ حالانکہ اللہ کافروں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کو

خیرہ کیے دے رہی ہو، جب جب چمک جاتی ہو یہ چل پڑتے ہوں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہو رک جاتے ہوں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھوں کو سلب کر لیتا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۹-۲۰

۱۵- الفاظ کی تحقیق

('صیب' کا مفہوم) صَیِّب کا لفظ سخت بارش کے لیے بھی آتا ہے اور زور کے ساتھ برسنے والے بادل کے لیے بھی۔ ہم نے اپنے ترجمہ میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تمثیل میں، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، اس لفظ سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے اور قرآن کو خود قرآن میں بارش سے جگہ جگہ تشبیہ دی گئی ہے۔

('سماء' کا مفہوم) سَمَاء کا لفظ عام طور پر تو اس سقفِ نیلگوں کے لیے بولا جاتا ہے جس کو ہم آسمان کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ابر کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس فضائے بسیط و عریض کے لیے بھی جو ہمارے سروں پر ہے۔

بارش اگرچہ آسمان ہی سے ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ سماء کا اضافہ بظاہر کچھ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس اضافہ سے ایک تو بارش کی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے اور اس تصویر کی کسی تمثیل میں بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ دوسرے اس سے قرآن مجید کے آسمانی ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہو رہا ہے کیوں کہ مراد اس بارش سے قرآن ہی ہے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا۔

('صواعق' مفہوم) صواعق، صاعقہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور اس بجلی کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔

۱۶- دونوں تمثیلوں کی وضاحت

(تنبیہ۔ ایک۔ حقیقت) ان دونوں تمثیلوں کی وضاحت سے پہلے نفس تمثیل سے متعلق ایک اصولی حقیقت کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

وہ یہ کہ تمثیل اگرچہ تشبیہ ہی کی نوعیت کی ایک چیز ہے لیکن تشبیہ اور تمثیل میں بڑا فرق ہے۔ ایک عام تشبیہ میں اصلی نگاہ مشبہ اور مشبہ بہ پر ہوتی ہے اور وہاں دونوں کے اجزا کو الگ الگ ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کے دیکھا جاتا ہے کہ ان میں باہم دگر کتنی مشابہت و مطابقت پائی جاتی ہے اور پھر اسی مطابقت و مشابہت کے لحاظ سے اس تشبیہ کا حسن و قبح متعین ہوتا ہے لیکن تمثیل میں اجزا کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں صورت واقعہ کو صورت واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اگر ایک

صورتِ حال اور دوسری صورتِ حال میں پوری پوری مطابقت موجود ہے اور تمثیل صورتِ حال کی پوری تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کر رہی ہے تو وہ تمثیل مکمل ہے، اگرچہ تشبیہ کے وہ تمام ضوابط اس پر منطبق نہ ہو رہے ہوں جو ایک تشبیہ کے مکمل ہونے کے لیے اہلِ فن نے ضروری قرار دیے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب پہلی تمثیل کو لیجیے۔

پہلی تمثیل اور اس کا مصداق

یہ تمثیل ایک ایسے شخص کی تمثیل ہے جس نے اندھیری رات میں لوگوں کو روشنی دکھانے کے لیے آگ جلائی۔ اس نے یہ کام بڑی محنت اور بڑے اہتمام کے ساتھ کیا یہاں تک کہ اس کا تمام گرد و پیش منور ہو گیا۔ لیکن جن لوگوں کے لیے اس نے یہ محنت برداشت کی انھوں نے اس روشنی کی کوئی قدر نہیں کی۔ ان کی اس ناقدری کی سزا اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دی کہ ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو ایک ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر چھوڑ دیا جہاں ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ پھر اس اندھیرے کے اوپر مزید غضب یہ ہے کہ یہ لوگ بہرے گونگے اور اندھے بھی ہیں اور یہ تمام اوصاف ان کے اندر بیک وقت موجود ہیں[1] اس وجہ سے نہ تو یہ کسی پکارنے والے کی پکار سن سکتے ہیں، نہ اس کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ کسی نشان یا علامت یا اشارہ سے کوئی رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ جس راہ پر وہ چل پڑے ہیں اس سے مڑ کر کسی اور راہ کو اختیار کر سکیں۔

غور کیجیے تو یہ تمثیل ٹھیک یہود کے اس گروہ پر منطبق ہو رہی ہے جس کا ذکر پہلے ہوا ہے اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگ چکی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں اس وجہ سے اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

تمثیل میں آگ جلانے والے شخص سے اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کے لیے ہدایت کی شمع جلائی اور اس شمع نے پوری قوم کے لیے اجالا بھی کر دیا لیکن زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ بنی اسرائیل کی اکثریت اس روشنی سے بیزار ہو گئی جس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر لعنت کر دی اور وہ ہدایت کی باتیں سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔

بنی اسرائیل کی اس محرومی و بدبختی کی تفصیلات توریت و انجیل میں بھی بیان ہوئی ہیں اور قرآن میں بھی اس کا ذکر مختلف مقامات میں آیا ہے۔ یہاں ان کی اسی حالت کو تمثیل کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمثیل ایک قافلہ کی ہے جس کے تمام افراد بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، مزید براں رات اندھیری ہے اور اس اندھیری رات میں یہ قافلہ بھٹک رہا ہے، نہ یہ کسی کی سنتا ہے، نہ کسی کو پکار سکتا ہے نہ کسی کا

---

[1] صم بکم عمی سے متعلق استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ افادہ یہاں قابلِ ذکر ہے کہ اگر صفات کا بیان بغیر حرفِ عطف کے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام صفات موصوف کے اندر بیک وقت موجود ہیں۔

جواب دے سکتا ہے اور نہ کسی نشان یا روشنی سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری تمثیل ایک ایسے قافلہ کی ہے جو رات کی تاریکی میں بارش میں گھر گیا ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے، بارش زوروں کی ہو رہی ہے، بارش کے ساتھ کڑک اور چمک بھی ہے۔ قافلہ والوں کا حال یہ ہے کہ جب کڑکا ہوتا ہے مارے خوف کے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں، جب بجلی کوندتی ہے تو اس کی روشنی میں چند قدم چل لیتے ہیں، جب غائب ہو جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسری تمثیل اور اس کا مصداق

یہ تمثیل یہود کے اس دوسرے گروہ کی تصویر ہے جس کا ذکر وَمِنَ النَّاسِ الآیہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں بارش سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے۔ ظلمات سے اشارہ ان مشکلاتِ راہ کی طرف ہے جن سے قرآن کی دعوت قبول کرنے والوں کو لازماً دوچار ہونا پڑتا تھا۔ رعد و برق سے مراد قرآن کی وہ دھمکیاں اور وعیدیں ہیں جو قرآن اپنے جھٹلانے والوں کو سنا رہا تھا اور جن کی زد خاص طور پر یہود پر پڑ رہی تھی۔ اس گروہ کو چونکہ قرآن کے حق ہونے کا پورا پورا احساس تھا اس وجہ سے یہ دھمکیاں اور وعیدیں ان کو بڑی شاق گزرتی تھیں۔ ان کا صحیح علاج یہ تھا کہ یہ قرآن کی دعوت قبول کر لیتے لیکن انھوں نے اس کے بالکل برعکس اس کا علاج یہ سوچا کہ قرآن کی بات سرے سے سنیں ہی نہیں۔ اس صورتِ حال کو تمثیل اس طرح مصور کر رہی ہے کہ یہ لوگ موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لئے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تدبیر ایک احمقانہ تدبیر ہے۔ اگر بجلی گرا چاہتی ہے تو اس سے بچاؤ کی یہ تدبیر کیا کارگر ہو سکتی ہے کہ آپ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں؛ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص شیر کو دیکھے کہ وہ اس پر حملہ کیا چاہتا ہے لیکن وہ اپنی آنکھیں بند کر لے۔ کسی کے اس طرح آنکھیں بند کر لینے سے یہ تو ہونے سے رہا کہ شیر حملہ کرنے سے باز آ جائے۔ البتہ یہ ہو گا کہ اس کو شیر کا حملہ نظر نہیں آئے گا۔

اسی طرح قرآن مجید کی وعیدوں اور دھمکیوں کا یہ علاج کہ وہ سنی نہ جائیں ایک احمقانہ علاج ہے۔ اس سے ان کی واقعیت میں تو کوئی فرق پیدا نہیں ہو گا البتہ اگر ہو گا تو یہ ہو گا کہ یہ اس وقت واقع ہوں گی جب آدمی ان سے بالکل غافل ہو گا۔ شترمرغ کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ طوفان کا خطرہ محسوس کرتا ہے تو اپنا سر ریت میں چھپا لیا کرتا ہے۔ کسی حقیقت سے فرار کے لیے یہود کے اس گروہ کی یہ پالیسی بھی شترمرغ کی اس پالیسی سے کچھ مختلف نہ تھی۔

'جب بجلی چمکتی ہے تو چند قدم چلتے ہیں، جب غائب ہو جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں': یہ ان کی اس حیرانی و پریشانی کی تصویر ہے جس میں قرآن مجید کے نزول کے بعد وہ مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ قرآن کا مقابلہ کس طرح کریں۔ اس کی چمک اور دمک نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی تھی اور اس کی برقِ خاطف سے ان کے لیے بچنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ وہ حیران و درماندہ تھے کہ کیا کریں۔ اس حیرانی و درماندگی کی حالت میں اگر کوئی بات بنتی نظر آتی تھی تو بنانے کی کوشش کرتے تھے لیکن کسی حقیقت

کا مقابلہ محض سخن سازی سے زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہے اس وجہ سے جب بنائی ہوئی بات بگڑ جاتی تو پھر حیران و درماندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگتے۔ چنانچہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ یہ مسلمانوں کو چکمہ دینے کے لیے یہ کہتے تھے کہ تم خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی ہو تو خدا اور آخرت پر تو ہم بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن جب اس پر یہ گرفت ہو جاتی کہ اگر ایمان کا دعویٰ ہے تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح کیوں ایمان نہیں لاتے تو پھر مجبور ہو کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے اور ان کو گالیاں دینے لگتے۔

۱۷۔ دونوں گروہوں میں فرق

اس تفصیل سے یہ حقیقت تو واضح ہو گئی کہ مذکورہ دونوں تمثیلیں یہود ہی کے دو گروہوں کی ہیں لیکن اس بات کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے کہ ان دونوں گروہوں میں فرق و اختلاف کی نوعیت کیا ہے؟ عام طور پر تو، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک گروہ کٹر منکرین کا ہے اور دوسرا گروہ منافقین کا۔

جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے وہ تو بلاشبہ قرآن اور اسلام کے جامد مخالفین ہی کا ہے لیکن دوسرے گروہ کے متعلق ہم اوپر یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ اس کو عام معنی میں منافقین کا گروہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ منافقین جہاں تک کم از کم ظاہر کا تعلق ہے اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ نہیں رکھتے تھے لیکن ان لوگوں کا جو حال اوپر بیان ہوا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا اظہار نہ تو عملاً کرتے تھے اور نہ قولاً کرنے کے لیے تیار تھے۔ حد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو علانیہ بے وقوف ٹھہراتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کو عام معنی میں منافقین کے زمرہ سے سمجھنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؛

ہمارے نزدیک یہ دونوں گروہ ہیں تو یہود ہی کے اور دونوں اسلام اور قرآن کے مخالف بھی ہیں لیکن دونوں کی مخالفت کے مزاج الگ الگ ہیں۔ پہلے گروہ کی مخالفت کا مزاج جمود اور ہٹ دھرمی ہے، یہ اندھوں اور بہروں کی طرح انکار پر جم گیا ہے، اور اپنی رائے کے خلاف کوئی بات بھی سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دوسرے کی مخالفت کا مزاج حاسدانہ لیکن ساتھ ہی بزعم خود مصلحت اندیشانہ بھی ہے۔ یہ ان تمام خطرات کو بھانپ رہا ہے جو اسلام کے ظہور سے یہودیت اور نصرانیت سب کے لیے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ کسی طرح ان خطرات کا سدباب کرے۔ اس مقصد کے لیے جو تدبیر اس کی سمجھ میں آئی ہے، وہ یہ ہے کہ جس حد تک اپنے آبائی طریقہ پر قائم رہتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کی ہم آہنگی کی جا سکے ان کی ہم آہنگی کی جائے اور ساتھ ہی ان سے بھی یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ بھی اپنی انفرادیت سے دست بردار ہو کر دین داری اور خدا پرستی کا کوئی مقام ان کے لیے بھی تسلیم کریں

پر راضی ہو جائیں لیکن قرآن نے اس بات کو نہایت غیر مبہم الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے کہ دینِ حق اس قسم کی سودا بازی کے لیے نہیں آیا ہے، جس کو ایمان لانا ہو وہ سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح ایمان لائے ورنہ جو راہ اس کو پسند ہے اس کو اختیار کرے اور اس کے نتائج بھگتے۔

اگرچہ پہلے گروہ کی ہٹ دھرمی اور ضد کی طرح اس دوسرے گروہ کی یہ چالبازی بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے لیکن اس گروہ کا یہ احساس کہ قرآن کا مقابلہ ہٹ دھرمی اور ضد سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے ہوشیاری اور مصلحت بینی کی ضرورت ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے گروہ کی طرح قبولیتِ حق کی صلاحیت اس کے اندر بالکل مردہ نہیں ہو چکی ہے بلکہ اس کے اندر اس صلاحیت کی کچھ نہ کچھ رمق ابھی باقی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر اس نے بھی اس صلاحیت سے فائدہ نہ اٹھایا بلکہ حق سے فرار کی انھی تدبیروں میں مشغول رہا جن میں اس وقت مشغول ہے تو سنتِ الٰہی کے مطابق اس کی یہ رہی سہی صلاحیت بھی سلب ہو جائے گی۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن کے یہ الفاظ اشارہ کر رہے ہیں وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں سلب کر لیتا (لیکن وہ ہر ایک کو پوری مہلت دیتا ہے) بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

۱۸۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۲۱-۲۹

ان دونوں تمثیلوں کے بعد ذرا دیر کے لیے یہود سے صرفِ نظر کر کے چند آیتوں میں بنی اسماعیل (عربوں) کو خطاب کیا گیا ہے اور ان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس نعمت کی قدر کریں اور قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ اصل سلسلۂ کلام سے ہٹ کر اس دعوت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ یہود کی اس مخالفت کا اصلی محرک وہ حسد تھا جو وہ بنی اسماعیل سے اس بنا پر پہلے سے رکھتے تھے کہ ان کے صحیفوں میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ آخری نبی امیوں (بنی اسماعیل) کے اندر پیدا ہوں گے۔ اس پیشین گوئی نے قرآن کے نزول اور اسلام کے ظہور سے جب ایک واقعہ کی شکل اختیار کر لی اور یہود پر اس کی صداقت کے آثار ظاہر ہو گئے تو ان کا یہ حسد جو اب تک چھپا ہوا تھا، بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا۔ انھوں نے یہ ٹھان لی کہ جس طرح بھی ممکن ہو گا اس دعوت کو ناکام بنائیں گے اور دینی پیشوائی کی جو عزت ان کو اب تک حاصل رہی ہے اس کو عربوں کی طرف منتقل نہ ہونے دیں گے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر وہ جس طرح اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام سے دور رکھنے کے لیے طرح طرح کے شگوفے چھوڑا کرتے تھے اسی طرح عربوں کے اندر بھی مختلف قسم کی وسوسہ اندازیاں کرتے رہتے تھے تاکہ یہ اس نعمت سے محروم رہ جائیں جو قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل فرمانی چاہی ہے اور جس کے نتیجے میں ان کو تمام عالم کی امامت و سیادت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہود اس قسم کی سازشوں میں ہمیشہ سے استاد رہے ہیں اس وجہ سے سادہ لوح عرب

ان کے چکروں میں آجاتے تھے اور اسلام کے خلاف یہودیوں کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کو بے سمجھے بوجھے خود بھی دہرانا شروع کر دیتے تھے۔ قرآن نے یہاں اصل سلسلہ کلام کو تھوڑی دیر کے لیے روک کر ان کو تنبیہ کیا کہ تم اللہ کی اس کتاب پر جس کی حجت تمہارے اوپر پوری ہو چکی ہے ایمان لاؤ اگر تم نے محض یہود کی وسوسہ اندازیوں کے فریب میں مبتلا ہو کر اس نعمتِ عظمیٰ سے اپنے آپ کو محروم کر لیا تو یاد رکھو کہ اس کی سزا بڑی ہی سخت ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ آیات
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿۲۱﴾ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ۲۱-۲۶
فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ
مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا
فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا
النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ
قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ
وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ

بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۲۶
الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ
مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۲۷ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا
فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۲۸
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۤ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى
السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۲۹ ع ۳ ۹

ترجمۂ آیات ۲۱-۲۹

اے لوگو، بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں، تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔ اس کی بندگی، جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمہاری روزی کے لیے۔ تو تم اللہ کے ہم سر نہ ٹھہراؤ درآں حالے کہ تم جانتے ہو۔ ۲۱-۲۲

اگر تم اس چیز کی جانب سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر، جو تیار ہے کافروں کے لیے اور بشارت دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے اس بات کی کہ ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ جب جب اس کے پھل ان کو کھانے کو ملیں گے تو کہیں گے، یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں عطا ہوا تھا۔ اور ملے گا اس سے ملتا جلتا اور ان کے لیے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۳-۲۵)

اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی تمثیل بیان کرے، خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے

بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے ان کے رب کی جانب سے، رہے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کے بیان کرنے سے اللہ کا کیا منشا ہے، اللہ اس چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر اُنھی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں۔ جو اللہ کے عہد کو اس کے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نامراد ہونے والے ہیں۔ ۲۶-۲۷

تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مُردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا۔ پھر وہ تم کو موت دیتا ہے پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف توجہ کی اور سات آسمان استوار کر دیے اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۲۸-۲۹

۱۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲۱)

'يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ' کا خطاب مشرکین سے ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ سے خطاب اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن یہاں مخاطب، جیسا کہ اوپر گزرا، خاص طور پر مشرکین عرب ہیں۔ اس خطاب کو مشرکین کے ساتھ مخصوص ماننے کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس کے بعد جو بات کہی گئی ہے، جو طرزِ استدلال اختیار کیا گیا ہے اور مخاطب سے جو مطالبہ کیا گیا ہے، ہر چیز اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ یہاں خطاب کا اصلی رُخ مشرکین ہی کی طرف ہے۔ یہود کے ذکر کے بیچ میں یہ خطاب بطور ایک التفات کے آ گیا ہے۔

اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ: لفظ عبادت کی تحقیق سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ سے مقصود مشرکین کو صرف خدا کی بندگی کی دعوت دینا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ خدا کی بندگی کی اس دعوت کو قبول کریں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔ اس کلام کی یہی پوشیدہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے اس کے ساتھ وان كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا کا ربط موزوں ہوا۔ یعنی پیغمبر جس بندگی کی

دعوت دے رہے ہیں اس کو قبول کرو اور اگر تمھیں اس کتاب کے بارے میں شبہ ہے کہ یہ کوئی من گھڑت چیز ہے، خدا کی اتاری ہوئی نہیں ہے، تو تم بھی اس کے مانند کوئی سورہ پیش کر دو۔

نیز اس کے اندر یہ بات بھی چھپی ہوئی ہے کہ تم خدا کی جس بندگی کے مدعی ہو وہ درحقیقت خدا کی بندگی نہیں ہے، خدا کی بندگی کا صحیح طریقہ وہی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے۔

خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ: خَلَقَكُمْ کے ساتھ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ کا اضافہ اس لیے فرمایا ہے کہ مشرکین عرب اس بات کے تو قائل تھے کہ ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اپنے بزرگوں میں سے انھوں نے بعضوں کو خدائی صفات میں شریک قرار دے کر خالق کی صف میں کھڑا کر دیا تھا اور ان کے بت بنا کر ان کی پرستش کرنے لگ گئے تھے۔ یہاں قرآن نے ان کے ساتھ ساتھ ان کے تمام اگلوں کو بھی عام مخلوقاتِ الٰہی میں شامل کر کے اشارۃً اس بات کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ خدا کی بندگی کرنی ہے تو نہ صرف اپنے آپ کو مخلوق و مقہور مان کر خدا کے آگے جھکو بلکہ ان کو بھی خدا ہی کی مخلوق مانو جن کو تم نے اپنی حماقت سے خالق کا درجہ دے رکھا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ: لعلّ مختلف معنوں کے لیے آتا ہے جن میں سے کسی چیز کے ممکن و متوقع نتیجہ کے بیان کے لیے بھی اس کا استعمال مشہور و معروف ہے، ہم نے اس کو اسی معنی میں یہاں لیا ہے اور جس سیاق میں یہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے ہمارے نزدیک اس کے یہی معنی صحیح ہیں۔

تَتَّقُونَ کے یہاں دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم تقویٰ حاصل کرو، دوسرے یہ کہ تم خدا کے غضب اور اس کے عذاب سے بچو۔ یہاں دونوں معنوں کے صحیح ہونے کا امکان ہے لیکن ہم نے دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے۔ اس صورت میں اس کے مفعول کو محذوف ماننا پڑے گا۔ اس محذوف کو قرآن نے اس کے بعد والی آیت میں خود کھول دیا ہے۔ فرمایا ہے۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (٢٤ - بقرہ)

(پس اس آگ سے بچو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر بنیں گے)

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (٢٢)

فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ: انداد ندّ کی جمع ہے جس کے معنی ہم سر، ہم پایہ، مدمقابل، مشابہ اور کفو کے ہیں۔

اہل عرب صفات باری سے متعلق ان تمام بنیادی مقدمات کو تسلیم کرتے تھے جن سے بدیہی طور پر توحید ثابت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ خدا کے شریک بھی مانتے تھے اس وجہ سے یہ فرمایا کہ جب تم خود اس بات کو جانتے ہو کہ خدا ہی نے تمھیں پیدا کیا ہے، اسی نے تمھارے اگلوں کو پیدا کیا ہے، اسی نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا ہے، اسی نے آسمان کا شامیانہ تانا ہے، اسی نے آسمان سے پانی اتارا

ہے اور اسی نے تمہارے رزق کے لیے قسم قسم کے پھل اور میوے پیدا کیے ہیں تو پھر ان کو خدا کا شریک کیوں ٹھہراتے ہو جنھوں نے ان کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کیا ہے؟ یہاں جانتے ہو، کا مفہوم یہ ہے کہ ان ساری باتوں کو مانتے اور ان کا اقرار کرتے ہو۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲۳)

شہید کا مفہوم

اُدْعُوا شُهَدَاءَكُمْ: شہید، قوم کے اس لیڈر، ترجمان اور نمائندہ کو کہتے ہیں، جو اہم مواقع پر اس کی ترجمانی اور نمائندگی کرتا ہے اور اس کا حمایتی بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ حمایتی انسانوں میں سے بھی ہو سکتے تھے اور اہلِ عرب کے اعتقاد کے مطابق جنوں میں سے بھی ہو سکتے تھے۔ عرب جاہلیت میں شاعروں اور خطیبوں کی بڑی عزت و عظمت تھی کیونکہ یہی لوگ تمام اہم مواقع پر قومی وقار کے محافظ بن کر کھڑے ہوتے تھے۔ مشرکین عرب یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن ہوا کرتا ہے جو اس کو شعر الہام کرتا ہے۔ چنانچہ وہ قرآن کے متعلق بھی یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ بھی اسی قسم کے الہام کا کرشمہ ہے۔ ان کے انھی خیالات کی بنا پر ان سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر تم قرآن کو کسی انسان یا جن کی گھڑی ہوئی چیز سمجھتے ہو تو اپنے ان حمایتیوں کی مدد سے اس کے مانند ایک ہی سورہ پیش کرو، اگر یہ تمہارے حمایتی اس نازک موقع پر بھی، جب کہ تمہارے آبائی دین کے ساتھ ساتھ خود ان کی خدائی بھی معرضِ خطر میں ہے، تمہاری مدد کے لیے نہ اٹھیں تو سمجھ لو کہ یہ قرآن خدا کی کلام ہے اور تمہارے یہ سارے دیوی دیوتا بالکل بے حقیقت ہیں۔ قرآن میں دوسرے مواقع پر اس مضمون کی وضاحت بھی موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (۸۸۔ بنی اسرائیل) (کہہ دو اگر تمام جن و انس متفق ہو کر بھی زور لگائیں کہ اس قرآن کی مثال پیش کریں تو اس کی مثال نہ پیش کر سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں) دوسری جگہ اس مضمون کی مزید وضاحت ہوگئی ہے۔ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ٥ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ (۱۳-۱۴۔ ہود) اور اللہ کے سوا جن کو بھی تم بلا سکتے ہو اپنی مدد کے لیے بلا لو اگر تم سچے ہو، پس اگر وہ تمہاری امداد کو نہ پہنچیں تو سمجھ لو کہ یہ چیز اللہ کے علم سے اتری ہے)

إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ: اگر تم سچے ہو کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم قرآن کے بارے میں جو گمان رکھتے ہو اگر اس میں سچے ہو۔ دوسرا یہ کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ خدا کے سوا تمہارے کچھ اور حمایتی اور مددگار بھی ہیں۔ اگر فی الواقع تمہارے کچھ حمایتی اور مددگار موجود ہیں تو ان کو مدد کے لیے بلاؤ، اس سے زیادہ ان کی مدد طلب کرنے اور ان کے تمہاری مدد کے لیے اٹھنے کا اور کون سا موقع اہم ہو سکتا ہے!

میرا اپنا رجحان اس دوسرے مفہوم کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلے مفہوم پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (۲۴)

بتوں کو عذاب دینے کی وجہ

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ، یہ الفاظ اس آگ کے مزاج کو ظاہر کر رہے ہیں جس سے قرآن کے ان جھٹلانے والوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آگ کے مرغوب ایندھن اول تو وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر کفر اور شرک کا مواد موجود ہوگا، انھی کے جسموں سے یہ آگ اپنے اصلی رنگ میں بھڑکے گی اور دوسرے درجہ پر اس کے ایندھن وہ پتھر ہوں گے جو معبود کی حیثیت سے دنیا میں پوجے گئے ہیں یا پوجے جا رہے ہیں کیونکہ اس پرستش کے سبب سے شرک کا وہ آتش گیر مادہ کچھ نہ کچھ ان کے اندر بھی پیدا ہو جاتا ہے جو اس آگ کی محبوب غذا ہے۔

اَلْحِجَارَةُ کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن موقع کلام سے واضح ہے کہ اس سے مراد وہی تراشے ہوئے پتھر ہیں جن کی دیوی دیوتا کی حیثیت سے پرستش ہوتی ہے۔ ان کو دوزخ میں پھینکنے سے مقصود دراصل ان کو عذاب دینا نہیں بلکہ ان کے پرستاروں کے عذاب میں اضافہ کرنا ہوگا۔ اس طرح ان کو دکھایا جائے گا کہ جن کے آگے وہ دنیا میں ڈنڈوت کرتے رہے ہیں اور جن کی ضیافت کے لیے دودھ اور حلوے پیش کرتے رہے ہیں ان کی یہاں کیا گت بن رہی ہے۔

کفر کے شعائر کی توہین سے مقصود درحقیقت کفر کی توہین ہوتی ہے۔ اس ساری حقیقت کی وضاحت قرآن مجید نے ایک دوسرے مقام پر خود فرما دی ہے:

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۖ أَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۖ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۹۸-۹۹ الانبیاء)

تم اور وہ چیزیں جن کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن بنو گے، تم سب کو اس میں جانا ہوگا، اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو جہنم میں نہ پڑتے اور تم سب اس میں ہمیشہ رہو گے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَأُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيْهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۵)

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ: باغ کا سب سے زیادہ دلکش تصور یہ ہے کہ وہ بلندی پر ہو اور اس کے نیچے نہر جاری ہو۔ بلندی اس کے منظر کی دل کشی میں اضافہ کرتی ہے اور سیلاب وغیرہ کی آفتوں سے محفوظ رکھتی ہے اور نیچے بہنے والی نہر اس کی شادابی کی ضمانت دیتی ہے۔ بلندی کے باغ کی تمثیل اسی

سورہ کی آیت ۲۶۵ میں بھی موجود ہے کَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ الآیۃ۔ زیر بحث آیت میں تَحْتِهَا الْاَنْهٰر کے الفاظ سے یہ بات خود بخود واضح ہو رہی ہے کہ یہ باغ بلندی پر ہوں گے۔

قول کی مختلف شکلیں

قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ: قول کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک قول وہ ہوتا ہے جو سنا جاتا ہے۔ ایک قول وہ ہوتا ہے جو سرًا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ (۱۰ رعد) (یکساں ہیں تم میں سے وہ جو قول کو پوشیدہ رکھیں اور وہ جو اس کو ظاہر کریں) مجرد اشارہ کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ مثلاً:

فَقُوْلِیْۤ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ	اشارہ سے بتا دے کہ میں نے خدائے رحمان کے
صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ	لیے روزے کی منت مانی ہے، آج میں کسی انسان
اِنْسِیًّا (۲۶۔ مریم)	سے کلام نہیں کروں گی۔

زبان حال و فعل سے جو اشارہ نکلتا ہے وہ بھی قول کی ایک شکل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جو بات آدمی اپنے دل میں کہتا ہے اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں مثلاً سورۂ مائدہ میں منافقین کا حال بیان ہوا ہے:

یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَةٌ	وہ کہتے ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ کوئی مصیبت نہ ہم پر آ پڑے
فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ	تو بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح لائے یا اپنی طرف سے
مِّنْ عِنْدِهٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا	کوئی اور بات دکھائے اور ان کو اس بات پر نادم
فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ (۵۲۔ مائدہ)	ہونا پڑے جو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔

مذکورہ آیت میں ان منافقین کے دل کے خیال کو قول سے تعبیر فرمایا ہے اور پھر یہ تصریح بھی فرما دی ہے کہ یہ ان کے دل کی چھپی ہوئی بات ہے۔ اسی طرح زیر بحث آیت میں قالوا، سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے دلوں میں خیال کریں گے کہ دنیا میں ہمیں قرآن مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن نعمتوں کے مزے اپنی بشارتوں سے چکھائے تھے وہی نعمتیں ہمارے سامنے اب اپنی حقیقی شکل و صورت میں آ رہی ہیں۔ یہ خیال ایک گہری مسرت، ایک عمیق احساس کامیابی اور ایک پُرجوش جذبۂ شکر و سپاس کے ساتھ ان کے دلوں میں پیدا ہوگا۔ وہ خوش ہوں گے کہ الحمد للہ جن وعدوں پر وہ جیے اور مرے وہ سب سچے ثابت ہوئے اور جس جنت کی نعمتوں کے مزے اب وہ لوٹ رہے ہیں اس کی ایک تمثیلی سیر قرآن کی بدولت انھوں نے دنیا ہی میں کرلی تھی۔

رزق کی دو قسمیں

اس ٹکڑے میں رزق کا لفظ بھی قابل غور ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں بھی اور قرآن میں بھی رزق مادی اور رزقِ روحانی دونوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ صرف کھانے پینے کی چیزوں ہی کو رزق نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اصلی رزق وہ علم و معرفت ہے جو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں حاصل ہوا ہے۔

اسی وجہ سے وحی کو قرآن نے رزق کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔

'مِنْ قَبْلُ' کی دو تاویلیں لوگوں نے کی ہیں ایک یہ کہ اس سے پہلے دنیا میں، دوسری یہ کہ اس سے پہلے اسی جنت میں۔ میرے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں تاویلوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میرے نزدیک، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ اشارہ دنیا کی طرف ہے۔ اس کے وجوہ آگے چل کر واضح ہوں گے۔

'ازواج مطہرۃ' کا مفہوم

اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ: زوج کے معنی جوڑے کے ہیں، عورت کے لیے مرد جوڑا ہے اور مرد کے لیے عورت۔ انسان کے اندر قدرت نے خود ایک خلا چھوڑا ہے جو اس جوڑے کے سوا کسی اور شکل سے پورا نہیں ہوتا اس وجہ سے اس کے بغیر انسان کے لیے کسی نعمت کا تصور بھی کامل نہیں ہوتا چناں چہ جنت میں بھی، جو کمال نعمت کی تعبیر ہے، اس کا ذکر موجود ہے۔ اس کے ساتھ 'مطہرہ' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ نہایت اہتمام کے ساتھ ان کی تربیت ہوئی ہے اور ان کا تزکیہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اہل جنت کی رفاقت کے لیے پوری طرح موزوں ہو سکیں۔ یہ مفہوم لفظ مطہرہ سے نکلتا ہے اس لیے کہ تطہیر کے معنی ہیں خاص اہتمام و توجہ کے ساتھ کسی کے عادات و خصائل اور طبیعت و مزاج کو سنوارنا اور پاکیزہ بنانا۔ سورۂ احزاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو بہت سے ضروری آداب کی تعلیم دینے کے بعد فرمایا ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ	اللہ تو بس یہ چاہتا ہے، اے نبی کے اہل بیت
الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ	کہ تم سے آلائش دنیا کو دور کرے اور تمہیں
تَطْهِيرًا (۳۳-احزاب)	پاک کرے جیسا کہ پاک کرنے کا حق ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ (۲۶)

تمثیل کی اصل قدر و قیمت

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا: ضرب مثل کے معنی ہیں کسی حقیقت کو تمثیل کے پیرایہ میں سمجھانا۔ اعلیٰ حقائق اور روحانی لطائف کو جب تک تمثیل کا جامہ نہ پہنایا جائے اس وقت تک وہ عام عقل کی گرفت میں نہیں آتے اس وجہ سے روحانی حقائق کی تعلیم میں اس صنفِ کلام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چناں چہ انبیا اور حکما کے کلام میں اس کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ تورات اور انجیل پر ایک نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام تمثیلات سے بھرا ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی بے شمار تمثیلات ہیں۔ قرآن میں بھی اس صنفِ کلام کی نہایت اعلیٰ مثالیں موجود ہیں۔

تمثیل میں جو چیز دیکھنے کی ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس میں جو حقیقت پیش کی گئی ہے وہ کتنی خوبی کے ساتھ پیش ہوئی ہے۔ اس چیز سے کچھ زیادہ بحث نہیں ہوتی کہ تمثیل کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ ایک حقیقت کو نگاہوں کے سامنے مصور کر دینے کے لیے جو چیز بھی مفید مقصد ہو سکتی ہے اس سے تمثیل میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے خواہ وہ مکھی ہو یا مچھر یا مکڑی۔ قرآن مجید نے مشرکین کے معبودوں کی بے بسی کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر مکھی بھی ان خداؤں سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس کا بھی کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اسی طرح شرکا اور شفعا پران کو جو اعتماد تھا، اس کی بے حقیقتی کی مثال مکڑی کے جالے سے دی ہے۔ یہود دین کے اصولوں سے بے پروا ہو کر اس کی جزئیات کا جو اہتمام کرتے تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کو مچھر کے چھاننے اور اونٹ کے نگل جانے سے تشبیہ دی ہے۔

یہ ساری تشبیہیں اور تمثیلیں اس اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں کہ ان میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں وہ ان تمثیلوں کے پیرایہ میں نہایت خوبی کے ساتھ ایک عام آدمی کی سمجھ میں بھی آجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے علم اور معرفت کے قدر دان ان تمثیلوں کی بڑی قدر کرتے ہیں اور ان سے بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جو لوگ علم و معرفت کے دشمن اور خواہشاتِ نفس کے غلام ہوتے ہیں وہ ان تمثیلات سے بہت چڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمثیلات ان کے لیے وہ چیزیں بے نقاب کرتی ہیں جن کا بے نقاب ہونا ان کے نفس کی خواہشات کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ اپنا یہ غصہ جب نکالنا چاہتے ہیں تو براہِ راست اس حقیقت پر حملہ کرنا تو ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا جو وہ تمثیل پیش کر رہی ہوتی ہے کیونکہ وہ اس قدر واضح ہوتی ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہنا آفتاب پر خاک ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ البتہ تمثیل کے کسی جزو کی آڑ لے کر وہ اس کے خلاف اپنا غصہ نکالنے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً فرض کیجیے تمثیل میں مکھی یا مچھر کا ذکر آگیا ہے تو خواہ وہ تمثیل کتنی ہی حقیقت افروز ہو لیکن وہ کہیں گے کہ یہ کیا فضول تمثیل ہے، اگر یہ خدا کا کلام ہے تو کیا خدا کو تمثیل کے لیے مکھی اور مچھر ہی ملتے ہیں۔ اس طرح وہ خود اپنے ضمیر کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکنے کی کوشش کریں گے اور دوسروں کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکیں گے۔

فسق کے معنی

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ، فسق کے اصل معنی خروج کے ہیں۔ یہاں سے یہ لفظ معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے لیے استعمال ہوا۔ قرآن مجید میں ابلیس کے متعلق ہے۔ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (۵۰۔ کہف) (وہ جنات میں سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔

معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ منکر چھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور بڑا بھی، اسی طرح نافرمانی معمولی درجہ کی بھی ہو سکتی ہے اور بغاوت کے درجہ کی بھی چنانچہ قرآن میں یہ لفظ عام منکرات سے لے کر کفر و بغاوت تک سب کے لیے استعمال ہوا ہے بلکہ زیادہ تر اس کا

استعمال ان بڑی نافرمانیوں ہی کے لیے ہوا ہے جن کے ساتھ ایمان جمع نہیں ہوتا اس وجہ سے قرآن میں اس لفظ کو اس ہلکے معنی میں ہرگز نہیں لینا چاہیے جس معنی میں اس کو عام طور پر ہمارے فقہاء اور متکلمین نے لیا ہے۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۷)

رشتۂ رحم کی اہمیت

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ: اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، ہمارے نزدیک اس سے مراد رشتۂ رحم اور رشتۂ قرابت کا کاٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان توڑنے کے بعد دوسرا قدم جو ایک نافرمان اٹھاتا ہے وہ حقوق رحم سے بے پروائی یا ان میں بے اعتدالی اور ناانصافی ہے۔ چونکہ تمام صلاح و فلاح اور تمام تمدن و معاشرت کی بنیاد اسلام نے اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اور رشتۂ رحم کے احترام پر رکھی ہے اس وجہ سے جو شخص ان دونوں پابندیوں سے آزاد ہوا اس کا ہر اقدام لازماً فساد فی الارض کا موجب ہوگا۔ چناںچہ یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے اور رشتۂ رحم کے کاٹنے کا لازمی نتیجہ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن میں ان دونوں چیزوں کا ذکر اس طرح ساتھ ساتھ ہوتا ہے گویا یہ لازم و ملزوم ہیں۔ مثلاً فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (۲۲۔ محمد) (پس اغلب ہے کہ اگر تم اعراض کرو تو زمین میں فساد برپا کرو اور اپنے رحمی رشتوں کو کاٹو)

ان دونوں کے اسی لزوم کے سبب سے قتادہ نے یہاں رشتۂ رحم ہی مراد لیا ہے اور ابن جریر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو عام رکھا ہے اور اس سے ہر اس چیز کا کاٹنا مراد لیا ہے جس کو خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ جہاں تک ظاہری الفاظ کا تعلق ہے اس معنی کو بھی غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن سوال صرف ظاہری الفاظ کا نہیں بلکہ قرآن مجید کے طرز بیان کا ہے۔ قرآن نے یہ طرز بیان جہاں جہاں بھی اختیار کیا ہے موقع و محل دلیل ہے کہ رشتۂ رحم ہی کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس طرز بیان میں جو ابہام ہے اس سے رشتۂ رحم کی عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے کہ یہ ایسی واضح بدیہی اور معروف حقیقت ہے کہ بغیر اس کے کہ اس کا نام لیا جائے ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کو خدا نے کاٹنے کا نہیں بلکہ جوڑنے کا حکم دیا ہے اور تمدن اور معاشرے کی صلاح و فلاح کے پہلو سے جس کی اہمیت یہ ہے کہ جس نے اس کو کاٹا اس نے گویا تمدن اور معاشرے کی جڑ ہی پر کلہاڑا رکھ دیا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸)

کفر کا ایک خاص پہلو

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ: کفر کے معنی کی تحقیق آٹھویں فصل میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں اس لفظ کے ایک

خاص پہلو کی طرف توجہ دلاتی ہے وہ یہ کہ یہ لفظ ان لوگوں کو مخاطب کرکے استعمال کیا گیا ہے جو خدا کے منکر نہیں تھے بلکہ صرف اس کے شریک ٹھہراتے تھے۔ البتہ قیامت کے یا تو وہ منکر تھے یا کم از کم یہ کہ اس کو بہت ہی بعید از قیاس اور بعید از عقل چیز سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کو مخاطب کرکے سوال یہ کیا گیا ہے کہ تم اللہ کا کفر کس طرح کرتے ہو؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں اس لفظ کا استعمال وسیع معنوں میں ہوا ہے۔ جس طرح خدا کا صریح انکار کفر ہے۔ اسی طرح اس کا وہ ماننا بھی کفر ہے جو اس کی حقیقی صفات مثلاً وحدانیت، قدرت اور علم وغیرہ کی نفی کے ساتھ ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۝ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۝ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۹)

'استواء'، 'تسویۃ' اور 'سماء' کا مفہوم

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؛ استواء کے معنی سیدھے کھڑے ہونے کے ہیں اور اِلیٰ کے ساتھ اس کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لفظ توجہ کرنے یا اس کے ہم معنی کسی مفہوم پر مشتمل ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ زمین کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بنایا۔ محض تصویرِ حال کے لیے یہ اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں کھڑے ہونے یا متوجہ ہونے کا وہی مفہوم لینا چاہیے جو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے شایانِ شان ہے۔

تسویہ کے معنی کسی شے کو برابر کرنے، ہموار کرنے اور اعتدال و توازن کے ساتھ قائم کردینے کے ہیں۔ اس سقفِ نیلگوں کو جس حد تک ہماری نگاہیں دیکھ سکتی ہیں، خواہ مجرّد حالت میں یا سائنس کے ایجاد کیے ہوئے اسلحہ سے مسلح ہوکر، اس کے اندر کوئی رخنہ نہیں تلاش کرسکتیں۔ اسی چیز کو فرمایا ہے۔

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۝	تم خدائے رحمان کی صنعت کے اندر کوئی کسر نہ
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝	پاسکوگے، اپنی نگاہ دوڑاؤ کیا پاتے ہو کوئی رخنہ؟
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ	پھر بار بار نظر دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر پلٹ
الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (۳-۴ ملک)	آئے گی لیکن کوئی رخنہ نہ پاسکے گی۔

سما کا لفظ سما یسمو سے ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ یہ شامیانہ، جو ہمارے اوپر تنا ہوا نظر آتا ہے، قرآن اس کے عجائب اور اس کی نیرنگیوں کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے اور ان سے جن واضح نتائج کی طرف رہبری ہوتی ہے ان کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کائنات کے مشاہدات سے متعلق قرآن کا مستقل اصول یہ ہے کہ جو چیزیں ہماری عام نگاہوں سے مخفی ہیں یا جو صرف گمان اور قیاس پر مبنی ہیں یا جو صرف خورد بینوں اور دور بینوں کی مدد سے ہی دیکھی جاسکتی ہیں، قرآن ان سے تعرض نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ان میں بہت کچھ نزاع اور اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ قرآن ہمیں صرف انہی حقائق کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے جن میں کسی انصاف پسند کے لیے کسی نزاع اور اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

آسمان کے حقائق کی طرف توجہ دلانے میں بھی قرآن نے یہی روش اختیار کی ہے۔ ان باتوں کی طرف توجہ دلا دی ہے جن کو ثابت کرنے کے لیے صرف توجہ دلا دینا ہی کافی ہے۔ البتہ یہ اشارہ کر دیا ہے کہ یہ آسمان سات ہیں تاکہ انسان اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جائے کہ خدا کی خدائی بس اس نظر آنے والی چھت اور ان چمکنے والے تاروں ہی تک محدود ہے بلکہ اس پر واضح رہے کہ اس کے ولولہ تفتیش و تحقیق کی جولانیوں کے لیے ان تاروں سے آگے اور بھی میدان ہیں۔

۲۰۔ مجموعہ آیات ۲۱ - ۲۹ میں مطالب کی ترتیب

مذکورہ بالا مجموعہ آیات میں جو باتیں جس ترتیب کے ساتھ کہی گئی ہیں پہلے ہم اجمال کے ساتھ ان کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں اس کے بعد ان خاص خاص چیزوں سے بحث کریں گے جو وضاحت اور تفصیل کی محتاج ہیں۔

اس مجموعہ کی ابتدائی آیات میں بنی اسمٰعیل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ انداز کلام اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ یہ خدا کی بندگی کی دعوت ہے اور جو خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے اس کے لیے واحد رستہ یہ ہے کہ وہ بندگی کی اس دعوت کو قبول کرے اس میں ضمناً اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے کہ جس طریقہ پر وہ خدا کی بندگی کر رہے ہیں یہ خدا کی بندگی نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے اس بندگی میں دوسروں کو بھی شریک کر رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کائنات میں اس کے تصرفات اس طرح بیان کیے گئے ہیں جس سے اس کی توحید ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان سے یہ کہا گیا ہے کہ اگر اس دعوت کو قبول کرنے میں تم اس لیے ہچکچا رہے ہو کہ تمہیں اس قرآن کے اللہ کی طرف سے ہونے میں شک ہے، تمہارے خیال میں یہ خود پیش کرنے والے یا ان کے کسی مددگار کی تصنیف ہے تو اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس کی سورتوں کی طرح کی کوئی سورہ تصنیف کر کے پیش کر دو۔ اس سے اس کے منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جائے گا، اس کام میں تم اپنے شاعروں، ادیبوں، خطیبوں، کاہنوں، جنّاتوں اور دیویوں دیوتاؤں میں سے جس کی چاہو مدد بھی حاصل کر سکتے ہو۔

اس کے بعد اس انجام سے ڈرایا گیا ہے جس سے وہ لوگ دوچار ہوں گے جو اس قرآن کا جواب پیش کرنے سے تو قاصر ہیں لیکن اس کے منزل من اللہ ہونے کے دعوے کو جھٹلا رہے ہیں اور ساتھ ہی ان لوگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے جو قرآن کی دعوت قبول کر کے ایمان اور عمل صالح کی روش اختیار کر لیں گے۔

جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں خاص بات جو یہاں کہی گئی ہے اور جو خاص توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ جب جنت کی نعمتیں اہلِ جنت کے سامنے پیش کی جائیں گی تو وہ اس بات پر خوش ہوں گے کہ جو نعمتیں انھیں یہاں مل رہی ہیں وہ ان سے پہلے سے آشنا ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کے منکرین تو قرآن کو آج ایک من گھڑت افسانہ سمجھ رہے ہیں لیکن ایک دن وہ بھی آنے والا ہے جب پردہ اٹھے گا اور قرآن کی ایک ایک بات کی صداقت اس طرح سامنے آئے گی کہ اہل ایمان ہر ملنے والی نعمت پر خوشی سے باغ باغ ہوں گے کہ الحمد للہ قرآن کی بدولت اس جنت اور اس کی نعمتوں کی سیر ہمیں دنیا ہی میں کرا دی گئی تھی۔

اس کے بعد سلسلۂ کلام کے بیچ میں ایک مناسب موقع تنبیہ بطور جملۂ معترضہ کے آگئی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو متنبہ فرمایا ہے کہ یہ جنت اور اس کی نعمتوں کا جو ذکر ہوا ہے یہ بہر حال بہ شکل تمثیل ہے کیوں کہ اس دنیا میں تمھیں جنت اور دوزخ سے متعلق جو بات بھی سمجھائی جا سکتی ہے تمثیل ہی کے ذریعہ سے سمجھائی جا سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمھارا سمجھانا اس قدر مطلوب و محبوب ہے کہ وہ ہر اس تمثیل کو تمھاری تعلیم کا ذریعہ بناتا ہے جس سے حقیقت تمھارے ذہن نشین ہو سکے، عام اس سے کہ یہ تمثیل کسی مکھی کی ہو یا مچھر کی۔ جو لوگ علم اور حقیقت کے جویا ہوتے ہیں وہ ان تمثیلات کی قدر کرتے ہیں اور ان سے ان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جو ضلالت کے طالب ہوتے ہیں وہ ان تمثیلوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے سبب سے گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر اشارۃً چند لفظوں میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ فلاں فلاں صفات کے لوگ ہیں جو ان تمثیلات سے علم و معرفت کے بجائے ضلالت اور گمراہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ تمام صفات یہود پر چسپاں ہوتی ہیں۔ اس طرح گویا بنی اسماعیل کو تنبیہ کیا گیا کہ نہ تو تم خود تمثیلات کے بارے میں اس قسم کی بیہودہ حجت طرازی کا مذاق اپنے اندر پرورش کرنا اور نہ یہود کی شہ سے فتنہ جوئی کی اس بیماری میں مبتلا ہونا ورنہ یاد رکھو کہ پرائے شگون پر تم اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ سے پھر وہ دعوت سامنے آگئی ہے جو اُعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ سے شروع ہوئی تھی اس کے بعد قیامت کی دو دلیلیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک اس پہلو سے کہ جس خدا نے تمھیں عدم سے وجود بخشا وہ تمھیں مرنے کے بعد دوبارہ آخر کیوں نہیں پیدا کر سکتا؟ دوسری ربوبیت کے پہلو سے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ پورا سلسلۂ کلام اوپر سے بھی مربوط ہے اور اس کی ہر کڑی باہم دگر بھی ایک دوسری سے جڑی ہوئی ہے۔ پہلے خدا کی بندگی کی دعوت ہے اور اس کے ساتھ توحید کا بیان ہے کیوں کہ خدا کی بندگی بغیر توحید کے بے معنی ہے۔ اس کے بعد رسالت پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور اس کی دلیل کے طور پر قرآن حکیم کے معجزے کو پیش کیا گیا ہے۔ پھر انکار کی سزا اور ایمان کی جزا بیان ہوئی

ہے پھر برسبیلِ تنبیہ آگاہ کیا گیا ہے کہ جزا اور سزا کا جو بیان بطور تمثیل ہوا ہے یہود کی پیروی میں اس کا مذاق اڑانے کی کوشش میں نہ لگ جانا۔ پھر قیامت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور اس دعوت کے پہلے ہی لفظ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان کے مدعی ہوں لیکن وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن مانتے ہوں وہ درحقیقت خدا کے ماننے والے نہیں بلکہ اس کے منکر ہیں۔

۱۲۔ بعض دلائل کی وضاحت

اس مجموعہ آیات میں اسلام کے تینوں بنیادی عقائد — توحید، رسالت اور معاد کی بعض دلیلیں بیان ہوئی ہیں۔ اب ہم ان کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

توحید کی دلیل

پہلی دلیل توحید کی بیان ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے:

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ	جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو
بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ	چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس
بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا	پھل پیدا کیے تمہاری روزی کے لیے تو تم اللہ
لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۲۔ بقرہ)	کے ہمسر نہ ٹھہراؤ درآں حالے کہ تم جانتے ہو۔

توحید کی یہ دلیل اس توافق اور ہم آہنگی کے پہلو سے ہے جو اس کائنات کے تمام اضداد کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس کائنات میں ایک طرف تو زمین کے مقابل میں آسمان، شب کے مقابلے میں روز، نور کے مقابل میں ظلمت، سردی کے مقابل میں گرمی اور عورت کے مقابل میں مرد کا وجود پایا جاتا ہے جس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ کائنات اضداد اور باہم نبرد آزما قوتوں اور طاقتوں کی ایک رزمگاہ ہے۔ چنانچہ یہی دھوکا بعض قوموں کو ہوا جس کے سبب سے انھوں نے نور اور ظلمت، نیکی اور بدی کے الگ الگ خالق ٹھہرا لیے۔ اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اہلِ عرب بھی زمین کے لیے الگ اور آسمان کے لیے الگ دیوتا مانتے تھے۔ قرآن مجید نے اسی مغالطہ کو یہاں رفع کیا ہے کہ اس کائنات میں جو تضاد نظر آتا ہے وہ محض ظاہری ہے۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ اس کے تمام اضداد میں نہایت گہرے قسم کا توافق ہے۔ زمین تمہارے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی ہے اور آسمان تمہارے اوپر شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے۔ پھر دیکھو آسمان سے پانی برستا ہے اور اس پانی سے زمین میں طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور یہ پھل تمہارے لیے غذا کا کام دیتے ہیں۔ زمین اور آسمان کے درمیان اس طرح کے توافق کے ہوتے ہوئے یہ کس طرح باور کرتے ہو کہ زمین کے اندر کسی اور دیوتا کا ارادہ کارفرما ہے اور آسمان میں کسی اور کی خدائی چل رہی ہے۔ مختلف ارادوں کے تصرفات میں یہ موافقت اور یہ سازگاری کس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ آسمان اور زمین دونوں مل کر ایک گہوارہ بنائیں اور اس گہوارے میں انسان کی اس طرح پرورش کریں جس طرح ماں بچے

کی پرورش کرتی ہے؟ اس اختلاف کا نتیجہ تو یہ ہونا تھا کہ یہ دونوں خود بھی درہم برہم ہو کے رہ جاتے اور ان کے ساتھ وہ بھی پس جاتے جو اس چکی کے دونوں پاٹوں کے بیچ میں آ جاتے۔

یہ دلیل بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ تم خدا کا کوئی ہمسر نہ ٹھہراؤ درآں حالے کہ تم جانتے ہو۔ "تم جانتے ہو" کا مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کو مانتے ہو کہ زمین کا اس صورت پر پیدا ہونا اور آسمان کا اس شکل میں وجود میں آنا خدا ہی کی قدرت سے ہوا ہے، ان میں سے کسی چیز کو بھی خدا کے سوا کسی اور نے نہیں بنایا ہے۔ اس اقرار کے بعد آسمان و زمین کے انتظام میں کسی کو خدا کا شریک ماننا ایک ایسی بے جوڑ بات ہے جس کا بے جوڑ ہونا بالکل واضح ہے۔ قرآن نے یہاں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہنی چاہیئے کہ مشرکین عرب، جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے، خدا کے منکر نہیں تھے۔ وہ خدا کو مانتے تھے البتہ وہ اس کے شریک ٹھہراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے سامنے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ صرف شرک کی تردید کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہاں دلیل اثبات باری کی نہیں دی گئی ہے بلکہ توحید کی دی گئی ہے۔ لیکن اس دلیل کو پیش کرنے کا انداز ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے ایک خالق اور پروردگار کا ثبوت اس سے آپ سے آپ ہو رہا ہے۔

یہاں اس دلیل کی اسی قدر وضاحت پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ آگے مختلف شکلوں اور اسلوبوں میں یہ دلیل آئے گی اور ہر جگہ موقع کے لحاظ سے اس کی وضاحت ہوگی۔ یہ دلیل ہم نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنے رسالہ حقیقت توحید میں بھی بیان کی ہے۔ جو لوگ مزید وضاحت کے طالب ہوں اس رسالہ کو پڑھیں۔

رسالت کی دلیل

دوسری دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات کی دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (۲۳ - بقرہ)

اور اگر تم اس چیز کی طرف سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو پیش کرو اس کے مانند کوئی سورہ اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو پس اگر تم یہ نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر۔ وہ کافروں کے لیے تیار کی ہوئی ہے۔

قرآن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو اس نے اپنے مقرب فرشتے ــ حضرت جبریلؑ ــ کے ذریعہ سے بشکل وحی آپ پر اتاری ہے۔ آپ اس کتاب کو اپنی رسالت کے ثبوت میں پیش فرماتے تھے۔ مشرکین عرب آپ کے اس دعوے کے مخالف تھے اور ان کی اس مخالفت میں یہود بھی ان کے ہم نوا تھے بلکہ درپردہ وہی اس مخالفت کو اصلی ہوا دینے والے تھے۔ یہ

لوگ اس مخالفت میں مختلف قسم کی باتیں کہتے تھے۔ کبھی کہتے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خود اپنی تصنیف ہے جس کو یہ ہمارے اوپر اپنی نبوت کی دھونس جمانے کے لیے خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں، کبھی کہتے کہ کچھ لوگ ان کے شریک سازش ہیں اور وہ اس کتاب کی تیاری میں ان کی مدد کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ جس طرح شاعروں اور کاہنوں پر جنات القا کرتے ہیں اسی طرح ان پر بھی کوئی جن یہ کلام القا کرتا ہے، کبھی دعویٰ کرتے کہ یہ کلام کوئی مافوق کلام نہیں ہے، ہم بھی چاہیں تو اس قسم کا کلام بڑی آسانی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ اس طرح کی باتوں سے وہ اس کے ایک خدائی کلام ہونے کو جھٹلانا چاہتے تھے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے کی تردید ہو سکے اور یہ کتاب آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل نہ بن سکے۔

ان ساری باتوں کے جواب میں یہ فرمایا گیا کہ اگر تمھیں اس طرح کے شکوک وشبہات ہیں تو اس کا فیصلہ بڑی آسانی کے ساتھ یوں ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس کے مانند کوئی سورہ پیش کر دو۔ اگر تم نے اس کے مانند ایک سورہ بھی پیش کر دی تو ثابت ہو جائے گا کہ تمھارے خیالات صحیح ہیں اور قرآن کا دعویٰ غلط ہے۔

پھر آخری اتمامِ حجت کے طور پر قرآن نے اپنی اس تحدی کے ساتھ تین باتیں شامل کر دیں۔

ایک یہ کہ اس کتاب کے مانند کوئی ایک ہی سورہ پیش کر دو۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے ان لوگوں سے یہ بات کہی گئی تھی کہ اس کے مانند کوئی کتاب پیش کرو اور پھر یہ بات کہی گئی کہ اس کے مانند دس سورتیں پیش کرو۔ جب وہ ان دونوں مطالبوں میں سے کوئی بھی پورا کرنے کی ہمت نہ کر سکے تو آخری بات یہ کہہ دی گئی کہ چلو، ایک ہی سورہ اس کے مانند پیش کر کے دکھاؤ۔

دوسری بات یہ کہی گئی کہ اگر تمھارے لیے تنہا اپنے بل بوتے پر یہ کام مشکل ہو تو تمھارے پاس ادیب بھی ہیں، خطیب بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، کاہن بھی ہیں، جنات بھی ہیں، شیطان بھی ہیں اور تمھارے بہت سے دیوی دیوتا بھی ہیں: قرآن کا مقابلہ کرنے کے لیے تم ان سب کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر ان سب کی مدد بھی تمھاری اس مشکل کو آسان نہ کر سکے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس قرآن کو خدا کی کتاب مانو اور اس کو جھٹلانے کی کوشش میں بے فائدہ اپنی قوت ضائع نہ کرو۔

تیسری بات یہ کہی گئی کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ تو تم آج کر سکتے ہو اور نہ کبھی آیندہ کر سکو گے۔ اس وجہ سے اس سعی لاحاصل میں اپنی دنیا اور آخرت برباد کرنے کے بجائے اس عذاب سے بچنے کی فکر کرو جس سے اس کتاب کی تکذیب پر جمے رہنے کی صورت میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا۔

قرآن کے اس چیلنج کے اصلی مخاطب اگرچہ اہلِ عرب تھے، غیر اہلِ عرب کے لیے اس قسم کے چیلنج کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن قرآن کے ہر مخالف اور رسالت محمدی کے ہر منکر کے لیے، خواہ وہ عرب سے تعلق رکھتا ہو یا عجم سے، قرآن کے زمانہ نزول سے لے کر آج تک، یہ چیلنج موجود رہے جس

کا جی چاہے وہ اپنے زور اور اپنی قابلیت کا امتحان کرلے، اسے خود اندازہ ہو جائے گا کہ وہ قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورہ کے مانند بھی کوئی کلام پیش کر سکتا ہے یا نہیں۔

قیامت کی دلیل

تیسری دلیل قیامت کی دی گئی ہے، وہ اس طرح بیان ہوئی ہے:۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا	تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے
فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ	کہ تم مردہ تھے اور اس نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تمہیں
ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ هُوَ الَّذِي خَلَقَ	مارتا ہے، پھر تم کو زندہ کرے گا پھر تم اس کی طرف
لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ	لوٹائے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے تمہارے لیے
اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ	پیدا کیا وہ سب کچھ جو زمین میں ہے۔ پھر اس نے
سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ	آسمان کے بنانے کا قصد کیا اور ہموار کر دیے سات
عَلِيمٌ ۝ (۲۸-۲۹ بقرہ)	آسمان اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

یہاں کفر سے مراد خدا کا انکار نہیں بلکہ جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، قیامت کا انکار ہے۔ کیوں کہ قیامت کا انکار درحقیقت خدا کی تمام اعلیٰ صفات۔ قدرت، ربوبیت، حکمت اور علم۔ کا انکار ہے۔ جو شخص ان صفات کے بغیر خدا کو مانے اس کا خدا کو ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہے۔ اس وضاحت کے بعد اب دیکھیے یہاں قیامت کی کیا دلیل بیان ہوئی ہے۔

پہلے معاد کے ممکن ہونے کی دلیل دی گئی ہے۔ یہ وہی عام عقلی اور فطری دلیل ہے جو قرآن مجید میں مختلف پیرایوں اور اسلوبوں میں بیان ہوئی ہے کہ جب تم یہ مانتے ہو کہ خدا نے تم کو عدم سے وجود بخشا اور یہ بھی دیکھتے ہو کہ وہی خدا ہے جو تم کو زندگی کے بعد موت دیتا ہے تو پھر اس بات کو کیوں ناممکن سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے، جس کے لیے پہلی بار پیدا کرنا ممکن ہوا آخر اس کے لیے دوبارہ پیدا کر دینا کیوں ناممکن ہو جائے گا؟

لیکن کسی چیز کے ممکن ہونے سے یہ لازم نہیں ہو جاتا کہ وہ ضرور واقع بھی ہو کے رہے، قیامت کا واقع ہونا ممکن سہی لیکن آخر اس کی ضرورت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا کہ جس خدا نے تمہاری پرورش کے لیے یہ سارا جہان بنایا اور اپنی پروردگاری کی یہ شانیں دکھائیں، جس کی قدرت اس کائنات کے ہر گوشہ سے نمایاں ہو رہی ہے اور جس کی حکمت کی شہادت ذرہ ذرہ سے مل رہی ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ تم کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دے اور تمہارے نیکوں اور بدوں میں کوئی امتیاز نہ کرے۔ اگر وہ ایسا کرے تو اس کی وہ ربوبیت بے معنی ہو جاتی ہے جس کی شہادت اس زمین کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے، وہ قدرت و حکمت بے مقصد ہو جاتی ہے جس کی گواہی یہ آسمان دے رہا ہے، اور وہ محیط کل علم بے نتیجہ ہو جاتا ہے جس سے اس آسمان و زمین کے خالق کو لازماً متصف ہونا چاہیے اور وہ اس سے متصف ہے بھی۔

قیامت کی یہ دلیل اجمال و تفصیل کے مختلف پیرایوں میں قرآن میں بار بار آئے گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ اگرچہ بنی اسماعیل سے یہ تخاطب ضمنی طور پر محض بر سبیل التفات تھا تاہم ان کے سامنے دعوت کے تینوں اصولی اجزا، توحید، رسالت اور معاد — ان کے بنیادی دلائل کے ساتھ رکھ دیے گئے۔

۲۲۔ قرآن مجید کی عظمت کے دو پہلو

تمام جن و بشر قرآن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں

ان آیات میں قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس کی عظمت کے دو پہلو یہاں بے نقاب کیے ہیں۔ ایک پہلو کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں یعنی یہ کہ تمام جن و بشر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ قرآن کی عظمت کا یہ پہلو اس وقت بھی واضح تھا جب کہ یہ نازل ہو رہا تھا کیوں کہ جو لوگ اس کو کسی جن یا بشر کا کلام سمجھتے تھے، اس کی تردید کی انتہائی خواہش رکھنے کے باوجود اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز رہے۔ اور آج بھی یہ واضح ہے جب کہ اس کے نزول پر پوری چودہ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن اس کے کٹر سے کٹر مخالف بھی کوئی ایسی چیز پیش نہ کر سکے جس سے قرآن کے اس دعوائے یکتائی کی تردید ہو سکے۔

قرآن نے حقائق مجاز کے پیرایہ میں

اس کی عظمت کے ایک دوسرے پہلو کی طرف یہاں یوں اشارہ کیا گیا ہے کہ جس قرآن کو اس کے مخالفین آج ایک من گھڑت چیز سمجھتے اور اس کی تمثیلات کی آڑ لے کر اس کو جھٹلاتے ہیں، ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اس پر ایمان لانے والے جنت میں بیٹھے ہوئے جنت کی ایک ایک نعمت پر خوش ہو کر کہیں گے کہ الحمد للہ ہمیں قرآن نے ان ساری نعمتوں کے مزوں سے پہلے ہی آشنا کر دیا تھا اور آج ہم ان کی اصل حقیقت سے متمتع ہو رہے ہیں۔

اس سے اس بات کا اشارہ نکلتا ہے کہ جو شخص قرآن پر سچا ایمان رکھتا ہے اور اس کی باتوں کی روحانیت کو سمجھتا ہے وہ درحقیقت اسی دنیا میں بیٹھے ہوئے جنت کی نعمتوں کا بھی ایک جلوہ دیکھ لیتا ہے اور دوزخ کے عذاب کا بھی ایک نقشہ اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ پھر اس بات کا بھی اشارہ نکلتا ہے کہ قرآن نے جن نیکیوں کا حکم دیا ہے درحقیقت انھی کی لذتیں ہیں جو اپنی حقیقی شکل و صورت میں جنت میں اہل ایمان کے سامنے آئیں گی۔ اسی طرح جن برائیوں سے قرآن نے روکا ہے انھی کی تلخیاں ہیں جو دوزخ میں اپنی اصلی شکل میں مجرموں کے سامنے ظاہر ہوں گی۔ فرق جو کچھ ہو گا وہ مجاز اور حقیقت کا ہو گا۔ یہاں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ مجاز اور تمثیل کے رنگ میں ہے اس لیے کہ آخرت کے حقائق کے لیے یہاں مجاز ہی کا پیرایہ اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن آخرت میں سارے پردے اٹھ جائیں گے اور باریک سے باریک حقیقت بھی بالکل بے پردہ ہو کر نگاہوں کے سامنے آ جائے گی۔

اہلِ جنت کی یہ بات کہ جب ان کو جنت کی کوئی نعمت ملے گی تو وہ کہیں گے کہ یہ وہی چیز ہے جو ہمیں پہلے یعنی دنیا میں ملی تھی، اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اہل ایمان نیکیوں کی لذت و حلاوت سے بقدرِ استعداد اس دنیا میں بھی محظوظ ہوتے ہیں لیکن یہاں چونکہ محسوسات کے پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی حقیقی لذت بے نقاب نہیں ہو پاتی۔ انبیاء علیہم السلام اور عارفین سے بہت سی ایسی باتیں منقول ہیں جن سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ایمان میں، اسلام میں، روزے میں، نماز میں، انفاق میں، ایثار میں اور نیکی کے دوسرے کاموں میں جو لذتیں اور حلاوتیں پنہاں ہیں ان سے وہ اس دنیا میں بھی لذت یاب ہوتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"۔ اسی طرح حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "اگر لوگ جان جائیں کہ عشا کی نماز میں کیا چیز پوشیدہ ہے تو وہ اس کے لیے پیٹوں کے بل رینگتے ہوئے بھی پہنچیں"۔ اسی سے ملتی جلتی باتیں صحابہ رضی اللہ عنہم اور بہت سے عارفین سے بھی منقول ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ان لذتوں سے اسی دنیا میں آشنا ہو چکے ہوں گے جب یہی لذتیں اپنی حقیقی شکل و صورت میں ان کے سامنے آخرت میں ظاہر ہوں گی تو وہ یہ تو محسوس کریں گے ہی کہ ان کی جھلکیاں وہ اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ اس سے پہلے ان کو ان جھلکیوں سے آشنا کرانے والی اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن جو قرآن یہ کچھ لے کر نازل ہوا ہے، جو دنیا میں آخرت کا آئینہ بن کر اترا ہے، جس کی آیتوں اور سورتوں میں جنت کی یہ بہاریں چھپی ہوئی ہیں، بے بصیرت لوگ اس کی یہ قدر کر رہے ہیں کہ اس کی نہایت حقیقت افروز تمثیلات کو بہانہ بنا کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالاں کہ اگر وہ اس کا ایک جلوہ بھی دیکھ پاتے تو اس کی سیر سے کبھی آسودہ نہ ہوتے۔

۲۳۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۳۰-۳۹

بنی اسماعیل کو مذکورہ بالا دعوت دینے اور ان کو یہود کی چالوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرنے کے بعد آگے کی دس آیتوں (۳۰-۳۹) میں آدمؑ کی خلافت اور شیطان کی طرف سے اس کی مخالفت کی سرگزشت بیان ہوئی ہے۔ یہ سرگزشت اپنے اندر بہت سے حقائق رکھتی ہے جن کی تفصیل تو اپنے اپنے مواقع پر آگے آئے گی لیکن یہاں بطورِ تمہید اس کے اس پہلو کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے جس پہلو سے یہ پچھلے سلسلۂ کلام سے مربوط ہوتی ہے۔

یہ سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس ردِ عمل کی پوری تصویر دکھائی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزولِ قرآن سے یہود پر خصوصاً اور وقت کی بعض دوسری جماعتوں پر عموماً نمایاں ہوا۔ یہود اپنے حسد اور تکبر کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بن گئے اور برابر

اس دشمنی پر جمے رہے۔ اس کے برعکس دوسرے بہت سے لوگ، جو حسد اور تکبر کی بیماری میں مبتلا نہیں تھے، اگرچہ اوّل اوّل حقیقت کے اچھی طرح واضح نہ ہونے کے باعث بعض شبہات میں مبتلا ہوئے لیکن جوں جوں ان کے شبہات دور ہوتے گئے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ قرآن نے یہ دکھایا ہے کہ یہ ردِ عمل بہت کچھ مشابہ ہے اس ردِ عمل سے جو آدمؑ کی خلافت کے فیصلہ سے ابلیس اور فرشتوں پر ہوا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو خلیفہ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس کی خبر فرشتوں کو دی تو اوّل اوّل انھیں بھی اس فیصلہ کے بارے میں بعض شبہات پیش آئے اور انھوں نے اپنے یہ شبہات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش بھی کیے لیکن وہ شبہات محض اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم ان پر واضح نہیں ہوئی تھی۔ جوں ہی پوری اسکیم ان کے سامنے آگئی ان کے سارے شبہات دور ہو گئے اور وہ آدمؑ کی خلافت پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہو گئے۔ برعکس اس کے ابلیس کو آدمؑ کی خلافت پر جو اعتراض تھا وہ حسد اور تکبر کی بنا پر تھا، اس نے خیال کیا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے اور آدمؑ مٹی کا ایک پتلا ہے پھر اس کے مقابلہ میں آدمؑ کو خلافت کا یہ منصب کیوں ملے اور یہ نسلی برتری رکھتے ہوئے وہ آدمؑ کو سجدہ کیوں کرے؟

قرآن نے دکھایا ہے کہ بالکل اسی سرگزشت کا اعادہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت و رسالت کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ جو لوگ حق طلب اور معقولیت پسند ہیں ان کو اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت یا قرآن کے کسی پہلو میں تردد تھا تو وہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد دور ہو گیا ہے یا دور ہو جائے گا لیکن یہود کی ساری مخالفت حسد اور تکبر پر مبنی ہے، وہ نسب کے اعتبار سے بھی اپنے آپ کو بنی اسماعیل کے مقابل میں افضل سمجھتے ہیں اور اپنی قدیم دینی سیادت و پیشوائی کے غرّہ میں مذہبی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو امّی عربوں کے بالمقابل برتر خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان پر یہ بات بڑی شاق گزر رہی ہے کہ وہ ایک امّی نبیؐ کی رسالت کا اقرار کر کے اپنے اوپر امیوں کی سیادت تسلیم کر لیں اور دنیا کی امامت کا جو منصب ان کو اب تک حاصل رہا ہے اس سے دستبردار ہو جائیں۔

اس تصویر میں قرآن نے یہود کا اصلی مقام متعین کر دیا ہے کہ ان کا پارٹ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی مخالفت میں بعینہٖ وہی ہے جو ابلیس کا پارٹ حضرت آدم کی مخالفت میں رہا ہے۔ دونوں کی مخالفت کے اسباب و محرکات بالکل ایک ہی قسم کے ہیں۔ اشارۃً یہ بات بھی ظاہر کر دی ہے کہ دونوں کا انجام بھی ایک ہی ہو گا۔ جس طرح ابلیس کی مخالفت کے علی الرغم آدمؑ کی خلافت قائم ہو کے رہی اسی طرح یہود کی مخالفت کے علی الرغم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت و نبوت بھی قائم ہو کے رہے گی۔

نیز اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ کسی واقعی شبہ کی بنا پر کسی خلش کا پیدا ہو جانا یا کسی اعتراض کا اٹھانا کوئی معیوب بات نہیں ہے، نیک اور معقول لوگوں کے دلوں میں بھی اس طرح کی خلشیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کے سبب سے کسی چیز پر وہ اعتراض بھی کر گزرتے ہیں لیکن ان کے اعتراض کے

پسِ پردہ چونکہ حسد یا تکبر کا کوئی داعیہ چھپا ہوا نہیں ہوتا اس وجہ سے جوں ہی ان کے شبہ کے اسباب دور ہوئے وہ پورے شرحِ صدر کے ساتھ امرِ حق کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ یہ گویا ایک نہایت لطیف اسلوب سے ان لوگوں کے لیے ایک دعوتِ ایمان ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اگرچہ ایمان تو نہیں لائے تھے لیکن ان کا ایمان نہ لانا کسی حسد اور تکبر کی بنا پر نہیں تھا بلکہ صرف اس وجہ سے تھا کہ آپ کے دعوے اور آپ کی دعوت کے بعض پہلو ابھی ان پر اچھی طرح روشن نہیں ہوئے تھے ـــــ اس سلسلۂ کلام کو سامنے رکھتے ہوئے اب آگے کی آیات کی تلاوت کیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ
قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ
نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا
لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ
عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِينَ ﴿۳۱﴾ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ
إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ أَنْبِئْهُمْ
بِأَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ
إِنِّيٓ أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۙ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا
كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۳۳﴾ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوٓا
إِلَّآ إِبْلِيسَ ۖ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ
اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا
وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ﴿۳۵﴾ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ
عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ

بِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾
فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي
هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ
أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٩﴾ ع ۴

ترجمۂ آیات ۳۰-۳۶

اور یاد کرو جب کہ تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، انھوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے اور ہم تو تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہی ہیں؟ اس نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے سکھا دیئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے ناموں سے آگاہ کرو۔ انھوں نے کہا کہ تو پاک ہے، ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ کہا اے آدم! ان کو بتاؤ: ان لوگوں کے نام۔ تو جب اس نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام تو اس نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے تھے۔ ۳۰-۳۴

اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے بن گیا۔ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور

تمھاری بیوی دونوں رہو جنت میں اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔ تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا کہ اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمھارے لیے ایک وقت خاص تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا برتنا ہے۔ پھر آدم نے پا لیے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات تو اس نے اس کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا اترو یہاں سے سب، تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۲-۲۹

۲۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ج وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۳۰)

'اذ' کا محل استعمال

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ: عربی زبان میں جب کلام کا آغاز "اذ" سے ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے پہلے خیال کرو، تصور کرو، یاد کرو یا ان کے ہم معنی کوئی فعل یہاں محذوف ہے۔ عموماً اس کے بعد کسی ایسی ہی سرگزشت یا واقعہ کا حوالہ آتا ہے جو یا تو مخاطب کے علم میں ہو، یا خود متکلم اس کی قطعیت پر اس درجہ مطمئن ہو کہ ایک معلوم و معروف حقیقت کی حیثیت سے اس کا حوالہ دے سکے۔

یہاں اگرچہ آدم، ملائکہ اور ابلیس سے متعلق ایک ایسے ماجرے کا حوالہ دیا گیا ہے جو عالم غیب میں پیش آیا ہے اور جس کا علم خدا کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔ لیکن مخاطب یہاں اوّل تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے لیے زبان وحی کی ہر بات ایک امر واقعی اور ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت رکھتی تھی، ثانیاً اس سرگزشت کا اصلی رخ، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، یہود کی طرف ہے اور یہود تورات کے ذریعہ

سے اس ماجرے سے واقف تھے اگرچہ انھوں نے تحریف کر کے اس کی اصلی شکل بہت کچھ بدل ڈالی تھی۔

مَلٰٓئِكَةِ: مَلَک کی جمع ہے۔ عربی زبان میں اُلوکہ کے معنی پیغام کے آتے ہیں اور مَلَک (جس کی اصل مَلْأَک ہے) کے معنی رسول اور پیغام بر کے ہیں۔ یہ لفظ ان روحانی پیغام بروں کے لیے مخصوص ہے جن کو ہم اپنی زبان میں فرشتہ کہتے ہیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کی دوسری مخلوقات کے درمیان قابلِ اعتماد واسطہ ہیں۔ یہ اپنی روحانیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے بھی غایت درجہ قرب و اتصال رکھتے ہیں اور مخلوق ہونے کے سبب سے مخلوقات سے بھی نسبت اور تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے انوار و ترشحات کے بلاواسطہ قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہے اور یہ ان انوار و ترشحات کو اللہ تعالیٰ کے بندوں تک منتقل کرنے کی قابلیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نبیوں اور رسولوں کے پاس وحی بھی لاتے ہیں اور اس کی مخلوق کے اندر اس کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں۔ قرآن میں ان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ تمام تر ایک ذی عقل، ذی ارادہ اور ذی شعور مخلوق کی نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ صفات ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مجرد قوتیں ہیں جن کو ملٰئکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ مَلٰٓئِكَة کا مفہوم

اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً: خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کے معاملات سرانجام دینے کے لیے اس کی جگہ لے۔ اس وجہ سے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے زمین میں کس کا خلیفہ بنانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا، اپنا یا زمین میں بسنے والی کسی پیشرو مخلوق کا؟ ایک رائے یہ ہے کہ انسان سے پہلے زمین میں جنات آباد تھے، جب انھوں نے اس میں فساد مچایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پراگندہ و منتشر کر دیا اور ان کی خلافت بنی نوع انسان کے سپرد فرمائی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں خود اپنا خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ پہلی رائے اگرچہ بالکل بے بنیاد تو نہیں کہی جا سکتی لیکن قرآن یا تورات یا کسی قابلِ اعتماد حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ انسان سے پہلے زمین میں جنات کی حکمرانی تھی، اس کی تائید میں اگر کوئی چیز پیش کی جا سکتی ہے تو اس کی حیثیت اشارہ و کنایہ سے زیادہ نہیں ہے اور محض کسی اشارہ و کنایہ پر ایک حقیقت کی بنیاد رکھ دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ خلیفة کا مفہوم

دوسری رائے مختلف اعتبارات سے قوی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی فضیلت کے بہت سے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں، فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں، نیز اس کے بارے میں فرمایا کہ جو امانت آسمان اور زمین اٹھانے سے قاصر رہے اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ یہ ساری باتیں اس امر کے حق میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہو، لیکن ان تمام دلائل کے باوجود ایک سوال اس رائے سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ خلیفہ تو اس کو مقرر کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے جو غائب یا غیر حاضر ہوتا ہو، خدا تو نہ کبھی غائب

ہوتا ہے نہ غیر حاضر، آسمان و زمین ہر جگہ اس کی حکومت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ پھر اس کے کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کے کیا معنی؟

یہ سوال ہمارے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین کے انتظام و انصرام کے معاملہ میں کچھ اختیارات دے کر یہ دیکھے گا کہ انسان ان اختیارات کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا خلافت پاکر وہ مطلق العنان بن جاتا ہے اور اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ گویا اصل حکمران کی طرف سے ایک نائب مقرر کیے جانے کی شکل ہوئی اور اس نائب کے تقرر کی ضرورت یہ نہیں تھی کہ اصل حکمران کو غائب یا غیر حاضر ہونا تھا بلکہ اس نائب کو کچھ اختیارات دے کر مقصود اس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان کرنا تھا۔

فساد فی الارض کا مفہوم

قَالُوٓا اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ قرآن مجید کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا مفہوم یہ ہے کہ زمین کا نظم و نسق، اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے مطابق چلانے کے بجائے اس کو من مانے طریقہ پر چلایا جائے، خدا کی شریعت کی نافرمانی کی جائے اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی جائے، زمین کے اصلی حکمران کی مرضی نظر انداز کی جائے اور خود اپنی مرضی چلائی جائے۔ یہ چیز بجائے خود فساد فی الارض اور بغاوت ہے، عام اس سے کہ یہ دھینگا مشتی اور سرکشی کے ساتھ واقع ہو یا کسی فکر و فلسفہ کے تحت پُرامن طریقہ پر۔ اس زمین کا اصلی حکمران اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی حیثیت اس کے اندر اصل حکمران کی نہیں بلکہ اصل حکمران کے نائب کی ہے۔ اس وجہ سے اس زمین کے امن و عدل کا انحصار اس چیز پر ہے کہ اس کے ہر گوشے میں خدا ہی کا قانون چلے۔ اگر اس کے کسی حصہ میں بھی خدا کا قانون باقی نہیں رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس حصے میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور یہ چیز اس پوری زمین کے لیے ایک خطرہ ہے۔

خونریزی فساد فی الارض کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب خدا کا قانون عدل باقی نہیں رہے گا تو لازماً اس کی جگہ انسان کی اپنی خواہشات کی فرمانروائی ہوگی۔ اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی شخص کے بھی جان یا مال یا اس کی آبرو کے لیے کوئی ضمانت باقی نہیں رہے گی۔ کسی خاص خطۂ زمین کے مفسدین بالفرض کوئی ایسا نظام بنا بھی لیں جس میں باہم گر ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دیں تو اس سے وہ اپنے لیے تو ایک تحفظ کی شکل پیدا کر لیں گے لیکن دوسروں کے لیے وہ بدستور خطرہ ہی بنے رہیں گے۔ ان کی مثال ڈاکوؤں کے ایک جتھے کی ہوگی جس کے افراد نے آپس میں تو یہ سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کے جان و مال پر دست درازی نہیں کریں گے لیکن ان کے جتھے سے باہر والوں کے جان و مال کو ان کی چیرہ دستیوں سے بچانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوگی۔ تمام عالم انسانی اور پورے کرۂ ارضی کے تحفظ کی ضمانت صرف خدا کا قانون ہی دے سکتا ہے جو سب کے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے اور سب کو یکساں پابند کرتا اور یکساں آزادی بخشتا ہے۔

فرشتوں نے انسان کے بارے میں اس اندیشہ کا اظہار اس کے خلیفہ ہونے کی بنا پر کیا، اس لیے کہ خلیفہ کے لفظ کے اندر یہ چیز چھپی ہوئی ہے کہ اس کو ایک خاص حد کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیارات تفویض ہوں گے۔ فرشتوں نے محسوس کیا کہ اختیار کو استعمال کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کو پاکر انسان بہک سکتا ہے اور اس بہکنے کا نتیجہ زمین میں بدامنی اور فساد کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

'تسبیح' کی حقیقت

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ: تسبیح کی اصل حقیقت، لغت کے اعتبار سے، کسی کے سامنے عجز و تذلل کے ساتھ بچھ جانا ہے۔ تسبیح قول سے بھی ہوتی ہے اور عمل سے بھی ہوتی ہے۔ عمل سے خدا کی تسبیح کا مفہوم خدا کے احکام کی تعمیل میں ہر وقت سرنگندہ رہنا ہے۔ یہ تسبیح اس کائنات کی وہ چیزیں بھی کرتی ہیں جو غیر ذی روح اور غیر ذی ارادہ ہیں۔ انسان کے جس عمل کو قرآن نے خاص طور پر تسبیح سے تعبیر کیا ہے وہ نماز ہے اس لیے کہ نماز سرفگندگی اور عجز و تذلل کی نہایت مکمل تصویر ہے۔ قولی تسبیح سے مراد خدا کی پاکی بیان کرنا ہے۔ یعنی خدا کو ان باتوں سے منزہ اور بالاتر قرار دینا جو اس کی شانِ الوہیت کے خلاف ہیں۔ اس اعتبار سے تسبیح میں منفی پہلو غالب ہے لیکن جب اس کے ساتھ حمد کی قید بڑھا دی جائے جیسی کہ یہاں ہے، تو اس میں تنزیہ کے ساتھ اثبات کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے، یعنی خدا کو منافی شانِ الوہیت صفات سے پاک قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان صفات سے متصف بھی قرار دینا جن کی بنا پر وہ سزاوار حمد و شکر ہے۔

'نقدس لک' کا مفہوم

نُقَدِّسُ لَكَ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تیری پاکی، تیری برتری اور تیری قدوسیت بیان کرتے ہیں۔ تسبیح میں، تو جیسا کہ بیان ہوا، تنزیہہ کا مفہوم غالب ہے لیکن تقدیس کا مفہوم اللہ تعالیٰ کو پاکیزگی اور قدوسیت کی تمام صفات سے متصف قرار دینا ہے۔ تسبیح کے ساتھ تقدیس کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ جب تک انکار کے ساتھ یہ اقرار نہ ہو اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی تعریف کا حق نہیں ادا ہوتا۔

انسان کے متعلق مذکورہ بالا اندیشہ ظاہر کرنے کے بعد فرشتوں کی طرف سے اپنی اس تسبیح و تقدیس کا حوالہ دینا اس لیے نہیں تھا کہ انسان کے مقابل میں وہ خود اپنے حقدار خلافت ہونے کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اصل مقصود ان کا اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی حکمت و مصلحت معلوم کرنا تھا۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ایک طرف تو اس اندیشہ کو ظاہر کر دیا جو انسان کی خلافت کے اندر ان کو مضمر نظر آیا دوسری طرف اس بات کو بھی ظاہر کر دیا کہ انسان کی تخلیق سے مقصود محض تسبیح و تقدیس تو ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ یہ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں۔

قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ: فرشتوں کے مذکورہ بالا سوال کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اس اسکیم کے سارے پہلوؤں پر تمھاری نظر نہیں ہے۔ اس وجہ سے تمھارے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا ہے۔ جب

پوری اسکیم تمہارے سامنے آجائے گی تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ اس کے اندر اس اندیشہ کے سدِّباب کا اہتمام بھی ہے جو تم نے ظاہر کیا ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (٣١)

آدمؑ کو کن کے نام سکھائے گئے؟

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ، اللہ تعالیٰ نے آدم کو کن کے نام سکھائے؟ اس سوال کے جواب میں تین قول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد تمام چیزوں کے نام ہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے نام ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد آدمؑ کی ذریت کے نام ہیں۔

ان میں سے جہاں تک دوسرے قول کا تعلق ہے اس کی تائید میں قرآن میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی رہا پہلا اور تیسرا قول تو ان میں سے تیسرا قول ہمارے نزدیک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے وجوہ یہ ہیں:۔

اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسماء پر الف لام عہد کا ہے۔ اگر اس کو عہد کا الف لام مانا جائے تو پھر اس سے کچھ خاص ناموں ہی کا مراد لینا صحیح ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے ضمیریں اور اشارے وغیرہ جو استعمال ہوتے ہیں وہ تمام تر وہ ہیں جو عربی زبان میں عام چیزوں کے لیے نہیں بلکہ خاص طور پر عقل وادراک اور شعور وارادہ رکھنے والی چیزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا) اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ) يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (اے آدم ان کو ان کے ناموں سے آگاہ کرو) فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (تو جب ان کو ان کے ناموں سے آگاہ کیا)

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں موقع فرشتوں کو قائل کرنے کا ہے۔ فرشتے حضرت آدمؑ کی ذریت کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ خلافت پا کر زمین میں فساد مچائے گی اور خونریزیاں کرے گی۔ ان کے اس گمان کی تردید اگر ہو سکتی تھی تو اسی طرح ہو سکتی تھی کہ ان کو ذریتِ آدمؑ کا مشاہدہ کرایا جائے اور اولادِ آدمؑ میں جو انبیاء و رسل، جو مجددین و مصلحین اور جو شہداء و صدیقین پیدا ہونے والے تھے ان سے ان کو آگاہ کیا جائے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو سکے کہ اگر اولادِ آدمؑ کے اندر ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے جو اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات کو بے جا طور پر استعمال کریں گے تو ساتھ ہی ان کے اندر ایسے لوگ بھی اٹھیں گے جو خود بھی اس ذمہ داری کا حق ادا کریں گے اور دوسروں کو بھی ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں گے۔

یہ تینوں باتیں بڑی اہمیت رکھنے والی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے الگ الگ ہر ایک کے متعلق کوئی نہ کوئی کمزور قسم کا اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے لیکن یہ تینوں مجموعی طور پر مل کر نہایت مضبوط دلیل اس بات کی بن جاتی

ہیں کہ اسماء سے مراد حضرت آدمؑ کی ذریت کے نام اور خاص کر ان لوگوں کے نام ہیں جو دنیا میں فساد کو مٹانے اور عدل کو قائم کرنے کے لیے آنے والے تھے۔

رہا یہ سوال کہ آدمؑ کی یہ ذریت تھی کہاں کہ ان کا مشاہدہ کرایا گیا اور ان کے نام بتائے گئے تو اس کا جواب خود قرآن مجید سے معلوم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں تصریح موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نسلِ آدمؑ کو ایک مرتبہ نکال کر ان سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ اٰدَمَ مِنْ	اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے تمام بنی آدم یعنی
ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ	ان کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو نکالا اور ان کو خود
أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ	ان کے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟
شَهِدْنَا (۱۷۲ - اعراف)	انھوں نے اقرار کیا کہ ہاں ہم گواہ ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عالمِ غیب میں ایک مرتبہ تمام نسلِ آدمؑ کے ایک اجتماعِ عام میں ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرایا ہے۔ اسی اجتماعِ عام میں آدمؑ کو ان کی ذریت کے نام بھی بتلائے گئے ہوں گے اور اسی موقع پر فرشتوں کے سامنے ان کو پیش کر کے وہ سوال و جواب بھی ہوا ہو گا جس کا یہاں حوالہ ہے۔

أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هٰٓؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ: یعنی اگر تم اس گمان میں سچے ہو کہ اولادِ آدمؑ خلافت پا کر زمین میں فساد برپا کرے گی تو ان لوگوں کے نام بتاؤ کہ یہ کون لوگ ہیں، یہ زمین میں فساد برپا کرنے والے ہیں یا اس میں امن اور عدل قائم کرنے والے ہیں؟ اس میں فرشتوں کو قائل کرنے والا پہلو یہ ہے کہ نسلِ آدمؑ کے رویہ سے متعلق اگر کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے تو اسی شکل میں قائم کی جا سکتی ہے جب بہ حیثیت مجموعی ان کے بارے میں تمھیں واقفیت ہو، لیکن جب اس طرح کی کوئی واقفیت تمھیں نہیں ہے تو پھر اس طرح کی بدگمانی کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (۳۲)

'سُبْحٰنَكَ' کے مواقع استعمال

سُبْحٰنَكَ: قرآن مجید میں یہ کلمہ مختلف مواقع پر استعمال ہوا ہے۔

نامناسب اور خلافِ شان باتوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کے لیے مثلاً سُبْحَانَ اللّٰهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۶۸ - قصص) (اللہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں)

دعا کے موقع کے لیے مثلاً دَعْوٰىهُمْ فِيهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ (۱۰ - یونس) (ان کی دعا اس میں یہ ہو گی کہ تو پاک ہے اے اللہ)

امر کے معنی کے لیے۔ مثلاً فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ (۱۷ - روم) (پس اللہ کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے ہو اور جس وقت تم صبح کرتے ہو)

تعجب کے ساتھ کسی چیز کے انکار کے لیے، مثلاً سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ (۱۶۔ نور) (تو پاک ہے یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے)

یہاں یہ کلمہ اپنے پہلے مفہوم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی فرشتوں کا مطلب یہ تھا کہ تیری شان اس سے ارفع ہے کہ تیرے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہو جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو، ہم نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے وہ محض ہمارے علم کی کمی کا نتیجہ ہے، ہمارے پاس تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں بخشا ہے۔ علم اور حکمت کا اصلی خزانہ تو تیرے ہی پاس ہے۔

قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۳۳)

خدا کے سوا سارے غیب کا علم کسی کو نہیں

اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ الآیۃ: یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کا حوالہ دیا ہے جو اوپر آیۃ ۳۰ میں گزر چکا ہے یعنی اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) پہلے یہ بات اجمال کے ساتھ کہی گئی تھی لیکن جب فرشتوں کو اچھی طرح قائل کر دیا گیا اور وہ قائل ہو بھی گئے تو پھر اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ فرمایا تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس کارخانۂ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ساری حکمتیں اور مصلحتیں صرف اسی کو معلوم ہیں جس نے اس کارخانے کو بنایا ہے اور جو اس کو چلا رہا ہے۔ ان حکمتوں اور مصلحتوں کو فرشتے بھی، جو خدا سے اس قدر قرب رکھتے ہیں، نہ جانتے ہیں اور نہ خدا کے بتلائے بغیر جان سکتے ہیں۔ اس وجہ سے قدرت کا کوئی فعل اگر بے حکمت و بے مصلحت نظر آئے تو اس کی بنا پر قدرت کو نشانۂ اعتراض یا خود اپنے آپ کو شکوک و شبہات کا مریض بنا لینے کے بجائے آدمی کو چاہیئے کہ اس چیز کو اپنے علم کی کمی پر محمول کرے اور فرشتوں کی طرح سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ کا اقرار کرے، کیونکہ خدائے علیم و حکیم کا کوئی فعل بھی حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہے لیکن اس کے سارے کاموں کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھنا نہ فرشتوں کے لیے ممکن ہے، نہ جنوں کے لیے اور نہ انسانوں کے لیے۔

اس کے ساتھ یہ جو فرمایا ہے کہ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپا رہے تھے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے سوال کو بھی سمجھتا تھا اور اس اصل وجہ کو بھی جانتا تھا جس سے یہ سوال پیدا ہوا تھا۔ وہ وجہ یہ تھی کہ تم آدمؑ کی خلافت کی اسکیم کے مضمرات سے بے خبر تھے، تم چاہتے تھے کہ وہ تم پر ظاہر کیے جائیں، اس مقصد کے لیے تم نے اس اسکیم کے بُرے پہلوؤں کی طرف، جو واضح طور پر تمہیں نظر آئے، تم نے بہ شکل سوال اشارہ کیا تاکہ تم پر اس کے وہ پہلو کھولے جائیں جو خیر کے ہیں۔ چنانچہ آدمؑ کی ذریت کا مشاہدہ کرا کے اور ان کے ناموں سے تمہیں آگاہ کر کے تمہاری یہ خواہش پوری کر دی گئی۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر اپنے ایک احسان کے طور پر بیان فرمائی ہے کہ تمہارے سوال کے

ظاہر و باطن دونوں کا جواب تمھیں دے دیا گیا۔ اس میں فرشتوں کے لیے کسی ملامت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۳۴)

سجدہ کا مفہوم

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ: سجدہ کا لفظ عربی زبان میں جھکنے کے معنی میں آتا ہے۔ جھکنے کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ کسی کے آگے تعظیم کے طور پر سر نہیوڑا دینا بھی جھکنا ہے اور پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھ دینا بھی جھکنا ہے۔ پچھلے مذاہب میں تعظیم کی یہ قسم غیر اللہ کے لیے جائز تھی لیکن

سجدۂ تعظیمی

عموماً اس کی حد وہی تھی جو ہمارے ہاں رکوع کی ہے۔ بنی اسرائیل میں اس طرح کے تعظیمی سجدے کا عام رواج تھا اور تورات کے مختلف مقامات سے اس کی جو شکل معیّن ہوتی ہے وہ رکوع سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اسلام نے تعظیم کی اس شکل کو خدائے رب العزت کے لیے خاص کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام خدا کا آخری اور کامل دین ہے، اس نے توحید کی حقیقت کو مکمل طور پر اجاگر کر دینے کے لیے خدا کے لیے تعظیم و تذلل کی شکلیں بھی خاص کر دی ہیں تاکہ اس کے اندر شرک کے داخل ہونے کے لیے کوئی رخنہ باقی نہ رہ جائے۔

فرشتوں کو آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دینے میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے اس لیے کہ اولاً تو یہ سجدہ خدا کے حکم کی تعمیل میں تھا اس لیے گویا خدا ہی کو سجدہ تھا، ثانیاً سجدہ شرک کی علامت، جیسا کہ عرض کیا گیا، اسلام میں قرار دیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے اس کی اہمیت تعظیم کے ایک طریقہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھی۔ اگر یہ کہا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدم کو تعظیم بجا لاؤ، اس سے زیادہ اس کا مفہوم نہیں ہے۔

سجدے کے حکم کی علّت

فرشتوں کو آدم کی تعظیم بجا لانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کی اطاعت اور بندگی کا ایک امتحان تھا۔ کسی کا امتحان اسی چیز میں لیا جاتا ہے جو اس کے نفس پر شاق ہو سکے۔ فرشتوں کی خلقت چونکہ نور سے ہوئی ہے اور وہ خدا کی تسبیح و تقدیس کے لیے پیدا ہوئے ہیں اس وجہ سے آدم خاکی کی تعظیم بجا لانے کے حکم میں ان کے لیے ایک بڑی آزمائش تھی لیکن فرشتے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اصلی عزت و سرفرازی نور یا نار سے پیدا ہونے میں نہیں ہے بلکہ پیدا کرنے والے کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل میں ہے۔ چنانچہ وہ اس امتحان میں پورے اترے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فرشتوں کے اس سجدے سے آدم کی بڑائی کا ایک پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے لیکن یہاں مقصود آدم کی بڑائی کا اظہار نہیں بلکہ فرشتوں کی بندگی و اطاعت کا اظہار ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جو خدا کے مطیع و فرمانبردار ہوتے ہیں وہ نسل و نسب کے غرور میں مبتلا ہو کر ابلیس کی طرح اکڑا نہیں کرتے، بلکہ وہ اس طرح کی ہر چیز کو خدا کا فضل و احسان سمجھتے ہیں اور اس فضل و احسان کا احساس ان کے اندر غرور و تکبر کے بجائے تواضع اور بندگی پیدا کرتا ہے۔

بنی اسرائیل کے لیے ایک سبق

موقع کلام کے لحاظ سے یہ بات ان بنی اسرائیل کے لیے ایک سبق ہے جو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں فرشتوں کی سی روش اختیار کرنے کے بجائے شیطان کی پیروی میں غرورِ نسل ونسب کے فتنے میں مبتلا ہو گئے تھے۔

آدمؑ کو سجدہ کرنے کے حکم کا مقصود

جو لوگ فرشتوں کی طرف سے آدم کی اس تعظیم کو آدم کی علمی فضیلت کا نتیجہ سمجھتے ہیں، میرے نزدیک ان کے اس خیال کے لیے کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔ اپنی ذریت کے اسماء کا علم جس طرح خدا کے بتانے سے آدمؑ کو حاصل ہو گیا اسی طرح آدم کے بتانے سے فرشتوں کو حاصل ہو گیا، پھر اس میں آدمؑ کی ایسی فضیلت کا کیا پہلو ہے جس کی بنا پر فرشتوں کو ان کے سجدہ کا حکم دیا جائے۔ علاوہ ازیں اس بات کا بھی کوئی قوی ثبوت موجود نہیں ہے کہ فرشتوں کو آدم کی اس تعظیم کا حکم اسی وقت دیا گیا جب آدمؑ نے ان کو ناموں سے آگاہ کیا ہے۔ بلاشبہ سجدہ کے حکم کا ذکر یہاں تعلیم اسماء کے ذکر کے بعد ہی آیا ہے۔ لیکن محض اتنی سی بات اس امر کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے کہ پہلی چیز اسی دوسری چیز کا نتیجہ ہے۔ اوّل تو سجدے کے حکم کا بیان لفظ "اذ" سے شروع ہوتا ہے جو اس بات کے لیے ایک قوی قرینہ فراہم کرتا ہے کہ یہ ایک مستقل بات ہو، ضروری نہیں کہ یہ پہلی بات کے بعد ہی پیش آئی ہو۔ ثانیاً قرآن مجید کے دوسرے مواقع سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو آدم کے سجدے کا حکم نہ صرف آدم کی علمی فضیلت کے اظہار سے پہلے بلکہ ان کی پیدائش سے بھی پہلے دیا گیا تھا، مثلاً فرمایا ہے:۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝

(حجر ۲۸-۳۱)

اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں تو جب میں اس کو مکمل کر لوں اور اس میں اپنی روح میں سے روح پھونک لوں تو تم اس کے لیے سجدہ میں گر جانا تو سارے فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں جن سے واضح ہے کہ فرشتوں کو آدم کے سجدے کا حکم آدم کی پیدائش سے پہلے دیا گیا تھا اور ان آیات سے ضمناً یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اصل مقصود اس سجدے سے فرشتوں کی اطاعت اور وفاداری کا امتحان ہی تھا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہاں آدمؑ کے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیے جانے کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے تاکہ اس امتحان میں فرشتوں کے لیے آزمائش کا جو پہلو ہے، وہ ان کے سامنے واضح ہو کر آ جائے۔ ہم اوپر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ امتحان ہمیشہ اس چیز میں ہوا کرتا ہے جو نفس پر شاق ہو، فرشتوں کے لیے یہ بات بڑی ہی آزمائش کی تھی کہ وہ نور کی مخلوق ہونے

کے باوجود آدمِ خاکی کو، جو سڑی ہوئی کیچڑ سے وجود میں آیا ہے سجدہ کریں لیکن وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ عزت و شرف بخشنے والی چیز درحقیقت خدا کی فرمانبرداری ہے نہ کہ نور یا نار سے پیدا ہونا، اس وجہ سے اس امتحان کے سخت ہونے کے باوجود وہ اس میں پورے اترے لیکن ابلیس اپنے غرور کے سبب سے اس امتحان میں ناکام ہوگیا۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ بعض آیات میں سجدے کا ذکر آدم کی پیدائش اور ان کی صورت گری کے بعد آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض آیات میں ترتیب مضمون اس طرح بھی ہے لیکن اس طرح کے مواقع پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقصود انسان پر اپنی نعمتوں کا بیان ہے نہ کہ یہ واضح کرنا کہ فلاں واقعہ فلاں واقعہ کے بعد پیش آیا ہے۔

لفظ ابلیس کی تحقیق

اِلَّآ اِبْلِيْسَ: ابلیس، اَبْلَسَ سے افعیل کے وزن پر ہے۔ ابلس کے معنی غمگین ہونے، انکار کرنے اور مایوس ہونے کے ہیں۔ ابلیس دراصل اس جنی کا لقب ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ قرآن مجید میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہ جنات میں سے تھا۔ سورہ طٰہٰ میں ہے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (اور یاد کرو، جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم کو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے، وہ جنات میں سے تھا، اس نے اپنے رب کے حکم سے انحراف کیا)

قرآن مجید نے مکلّف مخلوقات کی حیثیت سے تین مخلوقات کا ذکر کیا ہے۔ فرشتے، جنات اور بنی آدم۔ شیطان کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے۔ جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ خدا کی نافرمانی کی روش اختیار کر لیتے ہیں وہ لوگ ابلیس کی ذریت اور اس کے اولیاء میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے جنات اور انسان گمراہی پر پیدا نہیں کیے گئے، پیدا تو یہ ہوتے ہیں اسی فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام جنوں اور تمام انسانوں کو پیدا فرمایا ہے لیکن چوں کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اختیار کی نعمت سے نوازا ہے اس وجہ سے ان میں سے جو لوگ اپنے لیے گمراہی کے راستے ہی کو پسند کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اسی راستے پر چلنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی قرآن مجید میں جگہ جگہ تفصیل فرمائی ہے۔ ہم اس کے مختلف پہلوؤں کی مناسب مواقع پر وضاحت کریں گے۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں ایک بات بعض لوگوں کو کھٹکے گی۔ وہ یہ کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو دیا گیا تھا نہ کہ جنات کو تو ابلیس کو جو جنات میں سے تھا سجدہ نہ کرنے پر لعنت کا مستحق کیوں قرار دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جنات اور فرشتوں میں اصلی فرق خصائص اور صفات کے پہلو سے ہے، اپنی خلقت کے لحاظ سے جنات فرشتوں سے زیادہ دوری نہیں رکھتے، فرشتے نور سے پیدا ہوئے اور جنات نار سے۔ اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علی سبیل التغلیب جنات بھی اس حکم سجدہ میں شامل تھے، لیکن ان کے گمراہ فرد ابلیس نے

سجدہ سے انکار کیا۔ یہ رائے ہمارے بعض پچھلے مفسرین نے بھی ظاہر فرمائی ہے اور مجھے یہ رائے قوی معلوم ہوتی ہے۔[1]

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۳۵)

الشجرۃ سے مراد

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ: شجرہ پر الف لام داخل ہے جس سے یہ بات تو واضح ہے کہ جہاں تک آدمؑ اور حوا علیہما السلام کا تعلق ہے، ان کو یہ درخت تعین اور تخصیص کے ساتھ بتا دیا گیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ یہ درخت کس چیز کا تھا؟ تو اس سوال کا جواب نہ تو قرآن مجید ہی نے دیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث ہی میں اس کا جواب موجود ہے اس وجہ سے اس کو معلوم کرنے کی کوشش ایک لاحاصل کوشش ہے۔ ہمارے نزدیک اس بارے میں صحیح مسلک امام ابن جریرؒ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم تعین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ درخت کس چیز کا تھا، کیونکہ اس کے تعین کے لئے کوئی دلیل نہ تو ہمیں قرآن ہی میں ملتی ہے نہ حدیث ہی میں، پھر آخر کوئی شخص کوئی بات کہے تو کس سند پر۔

ہمارے نزدیک اس درخت کو معلوم کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ اصل چیز جو یہاں قرآن مجید بتانی چاہتا ہے وہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح فرشتوں اور جنات کی وفاداری اور اطاعت کا امتحان آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر لیا اسی طرح آدمؑ کی اطاعت و وفاداری کا امتحان ان کے لیے جنت کے درختوں میں سے ایک درخت کو حرام ٹھہرا کر لیا۔ نعمتوں سے بھری ہوئی اس جنت میں صرف ایک درخت ایسا تھا جس سے فائدہ اٹھانے سے حضرت آدمؑ کو روکا گیا تھا۔ لیکن انسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جاتا ہے اسی کا وہ زیادہ حریص بن جایا کرتا ہے۔ چنانچہ ابلیس نے آدمؑ کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ان کو یہ سمجھانا شروع کر دیا کہ زندگیٔ جاوداں اور ملک لازوال کا راز اگر مضمر ہے تو بس اسی درخت کے پھلوں میں ہے جس سے ان کو محروم کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدمؑ شیطان کے اس چکمے میں آ گئے اور اس درخت کا پھل کھا بیٹھے۔ لیکن یہ غلطی کر گزرنے کے بعد شیطان کی طرح اپنی غلطی پر ضد نہیں کی بلکہ اس پر نادم

---

[1] قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

اما الجن ایضاً کانوا مامورین مع الملئکۃ لکنہ استغنی بذکر الملئکۃ عن ذکرھم فانہ اذا علم ان الاکابر مامورون بالتذلل لاحد والتوسل بہ علم ان الاصاغر ایضاً مامورون بہ والضمیر فی فسجدوا راجع الی القبیلتین (یا جن بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کے حکم میں شامل تھے لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد جنات کے ذکر کی ضرورت اس وجہ سے باقی نہیں رہی کہ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ بڑوں کو کسی کی تعظیم و تکریم کا حکم ہوا ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ چھوٹے بھی اس حکم میں شامل ہیں۔ اس صورت میں فسجدوا کی جو ضمیر ہے وہ دونوں گروہوں کی طرف لوٹے گی)

ہونے اور توبہ کی۔

بالکل اسی طرح کی صورتِ حال اس دنیا میں ہمارے سامنے ہے۔ اس زمین کی ہر نعمت ہمارے لیے مباح ہے۔ صرف گنتی کی چند چیزیں ہیں جن سے خدا نے ہمیں روکا ہے لیکن ہم میں سے بہتوں کا حال یہ ہے کہ وہ شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے سبب سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اور دنیا کی ساری ترقی اور کامیابی کا راز بس انھی چند چیزوں کے اندر چھپا ہوا ہے جن سے خدا نے روک دیا ہے اور پھر ستم یہ ہے کہ نافرمانی کر کے اپنے باپ کی طرح نادم ہونے اور توبہ کرنے کے بجائے ابلیس کی طرح اکڑتے اور ضد کرتے ہیں۔

تورات میں اس درخت کو خیر و شر کی معرفت کا درخت کہا گیا ہے۔ یہ بات ہے تو دلچسپ لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ غالباً اہلِ تورات نے یہ بات اول اول بطور ایک تاویل کے اس وجہ سے اختیار کی ہوگی کہ اس درخت کے پھل کھانے کا اثر یہ بیان کیا گیا ہے کہ آدم و حوا دونوں ننگے ہو کے رہ گئے۔ ابتداءً تو یہ بات ایک تاویل کی حیثیت سے سامنے آئی ہوگی لیکن بعد میں دل پسند ہونے کے سبب سے تحریف کے چور دروازے سے اس نے اصل متن کی جگہ حاصل کر لی ہوگی۔ قرآن مجید نے اس بات کا ذکر تو کیا ہے کہ اس درخت کے پھل کھانے کے بعد آدمؑ ننگے ہو گئے لیکن قرآن سے یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ یہ ننگے ہو جانا ان کے اندر دفعۃً عقل و شعور کے بیدار ہو جانے کا نتیجہ تھا بلکہ یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے خدا کی نافرمانی کر کے اپنے اوپر جو ظلم کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جنت کے لباس سے محروم ہو گئے۔

اگر آدمؑ اس درخت کے پھل کھانے سے پہلے اتنے بے شعور تھے کہ ان کو اپنی ستر کا بھی کوئی احساس نہیں تھا تو اس وقت ان کا کسی امتحان میں ڈالا جانا اور وہ بھی ابلیس جیسے زیرک دشمن کے ہاتھوں ایک بالکل خلافِ عقل بات معلوم ہوتی ہے۔ اس امتحان سے پہلے ان کے اندر اتنی سُوجھ بُوجھ کا ہونا ناگزیر تھا کہ وہ شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے مقابل میں اپنے خیر و شر کو سمجھ سکیں۔ اگر وہ اس سُوجھ بُوجھ سے عاری تھے تو ان کا شیطان کے فتنے میں پڑ جانا بالکل واضح تھا اور خدا کے انصاف سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ ان کو شیطان کے مقابل میں لا کھڑا کرتا اور پھر ان کی لغزش پر ان کی گرفت کرتا۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۳۶)

اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ : اِهْبِطُوْا کا یہ خطاب حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے اہلِ تاویل کے نزدیک حضرت آدمؑ، حوا اور ابلیس سے ہے اور ابنِ زید کے نزدیک آدم و حوا اور ان کی ذریت سے۔ ہمارے نزدیک ان میں سے صحیح تاویل حضرت ابنِ عباسؓ کی ہے۔

اِهْبِطُوْا کا خطاب کن سے ہے؟

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں یہ جو فرمایا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے تو یہ دشمنی اپنی فطری بنیاد اگر رکھتی ہے تو آدم اور ابلیس کے اندر ہی رکھتی ہے، آدم و حوا کے اندر نہیں رکھتی۔ آدم و حوا کے درمیان تو فطری

ربط الفت اور مودت کا ہے۔ اسی طرح اولادِ آدم کے اندر بھی فطری ربط و تعلق دراصل اخوت اور محبت کا ہے۔ ان کے اندر دشمنی اور عداوت کا بیج اگر پڑتا ہے تو شیطان کی کوششوں سے پڑتا ہے اور اسی کی فساد انگیزیوں سے یہ پرورش بھی پاتا ہے۔ انسان کی اپنی فطرت کے اندر اس تخم فساد کی پرورش کے لیے کچھ زیادہ صلاحیت نہیں ہے۔ شیطان اور آدم کی اس فطری عداوت کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا بھی ہے۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ (۱۱۷ طٰہٰ)
ہم نے کہا اے آدم یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو کہیں یہ تمہیں جنت سے نکلوا نہ چھوڑے۔

اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (۵۰-کہف)
تو کیا تم ابلیس اور اس کی اولاد کو میرے بالمقابل اپنا دوست بناؤ گے حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔

اولادِ آدم اور شیطان کے درمیان فطری تعلق کی نوعیت

اولادِ آدم میں سے اگر بہت سے لوگ ابلیس اور اس کی ذریت سے دوستی قائم کر لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے درمیان فطری تعلق درحقیقت دوستی ہی کا ہے۔ فطری تعلق تو ان کے درمیان دشمنی کا ہے اور دشمنی ہی کا رہنا چاہیے، جیسا کہ اوپر کی کہف والی آیت سے اشارہ نکلتا ہے، لیکن بہت سے لوگ اپنی نادانی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب سے اپنے دشمنوں ہی کو اپنا دوست سمجھ بیٹھتے ہیں اور ان کے آلۂ کار بن کر خود اپنے آپ کو تباہ کر لیتے ہیں۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں اس بات کی تصریح ہے کہ جس طرح آدم کو جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا تھا اسی طرح ابلیس کو بھی بعینہٖ انھی الفاظ میں یہ حکم دیا گیا تھا۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (خدا نے کہا تو یہاں سے اتر، تجھے کوئی حق نہیں ہے کہ تو یہاں گھمنڈ کرے، سو تو نکل، تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہوگا)

تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض جگہ اس حکم کے ساتھ جمیعًا کا لفظ بطور تاکید آگیا ہے۔ مثلاً سورہ طٰہٰ میں ہے اهبطا منها جميعا، خود اس سورہ میں بھی آگے چل کر ہے قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا۔ اگر یہ خطاب صرف آدم و حوا سے مانا جائے تو پھر جمیعًا کا لفظ کچھ غیر ضروری سا ہو کے رہ جاتا ہے۔ اور اگر اس کو مفید بنانے کے لیے یہ فرض کیا جائے کہ آدم و حوا کے ساتھ یہ حکم ان کی اولاد کے لیے بھی تھا تو یہ ایک تکلف سا ہوگا، کیونکہ ذریت آدم کے متعلق اس مرحلے تک اگر کوئی بات سامنے آئی ہے تو صرف اس حد تک آئی ہے کہ ان سے خدا کی ربوبیت کا اقرار لیا گیا اور آدم اور فرشتوں کو ان کا مشاہدہ کرایا گیا۔ یہ ماننے کے لیے قرآن میں مشکل ہی سے کوئی دلیل مل سکے گی کہ آدم کی ذریت آدم کے ساتھ جنت میں تھی بھی اور وہ اپنے باپ کے گناہ میں جنت سے نکالی بھی گئی۔

رہی یہ بات کہ بعض جگہ قرآن مجید میں مثنٰی کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور یہ ایک واضح دلیل ہے اس بات کی کہ خطاب حضرت آدم اور حوا ہی سے ہے تو ہمارے نزدیک یہ دلیل بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔ بلاشبہ بعض جگہ مثنٰی

کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اِھْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًاۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (۱۲۳- طٰہٰ) (اس سے اترو سب، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔ پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ نہ گمراہ ہوں گے اور نہ محروم)

لیکن یہ مثنیٰ کا صیغہ حضرت آدمؑ اور حوّا کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ سیاق و سباق دلیل ہے کہ یہ آدم اور ابلیس دونوں کو بحیثیت دو فریقوں اور دو پارٹیوں کے خطاب کر رہا ہے۔ اور یہاں ہدایت کی پیروی کے بارے میں جو حکم ہے وہ جس طرح بنی نوع انسان کے لیے موزوں ہے اسی طرح بنی نوع جن کے لیے بھی موزوں ہے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۳۷)

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ: توبہ کے معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ جب اس کا صلہ علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر رحم کا مضمون چھپا ہوا ہے۔

"تَلَقّٰى" کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے یہ الفاظ حضرت آدم علیہ السلام کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں ان الفاظ کا حوالہ بھی ہے۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۲۳- اعراف) (اور ان دونوں نے دعا کی کہ اے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ فرمائے گا تو ہم برباد ہونے والوں میں سے بن جائیں گے)

توبہ کے بارے میں سنت اللہ

توبہ کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کا بے قرار ہونا اور توبہ کے الفاظ کا ان کے دل میں ڈالا جانا اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا پتہ دیتا ہے جو توبہ سے متعلق اس نے پسند فرمائی ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کر گزرتا ہے تو ندامت و شرمندگی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا ایک احساس اس کے اندر خود بخود ابھرتا ہے۔ یہ احساس اس کی فطرت کا ایک تقاضا ہے اور یہ اس وقت تک برابر ابھرتا رہتا ہے جب تک انسان غلطیوں اور گناہوں پر اصرار کر کر کے اپنے اس احساس کو بالکل کچل کے نہ رکھ دے۔ اسی خاص کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر نفس لوّامہ کو ودیعت فرمایا ہے۔ اس سے متعلق دوسری تفصیلات مناسب مواقع پر آئیں گی۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳۸)

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا: یہ الفاظ دو مرتبہ دہرائے گئے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت آدمؑ کی لغزش کے بعد۔ پھر دوبارہ ان کی توبہ کے بعد۔ لغزش کے بعد اس کا ذکر اس لغزش کا نتیجہ بیان کرنے کے لیے ہوا ہے اور توبہ کے بعد اس امتحان کی حکمت بیان کرنے کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اب تمہیں دنیا میں بھیج کر تمہارا امتحان کرنا چاہتا ہے تاکہ تمہارے برے اور بھلے میں امتیاز ہو سکے تو جو اس امتحان میں پورے اتریں گے وہ اس جنت کے وارث ہوں گے اور جو اس امتحان میں فیل ہو جائیں گے وہ اس جنت

سے محروم رہیں گے۔

نبوت کے اجرا کا پہلا وعدہ

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کے لیے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کرنے کا پہلا وعدہ ہے۔ حضرت آدمؑ کی لغزش سے انسانی فطرت اور انسانی عقل کا وہ ضعف ظاہر ہو گیا جو انسان کو وحی الٰہی کی رہنمائی اور انبیا علیہم السلام کی دستگیری کا محتاج ثابت کرتا ہے چناں چہ انسان کی اس کمزوری پر نگاہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے بطور تسکین و تسلی یہ وعدہ فرمایا کہ وہ خود اپنی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے روشنی بھیجے گا تو جو لوگ اس روشنی کی قدر کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔

"نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم" کے الفاظ قرآن مجید میں جنت کی تعبیر کے لیے خاص ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جنت کی تعبیر کے لیے یہ الفاظ بہت جامع ہیں۔ خوف کسی پیش آنے والے خطرے کا ہوا کرتا ہے اور حزن ماضی یا حاضر کے کسی خسارہ کا۔ ایسی جگہ جہاں نہ ماضی کا کوئی غم ہو نہ مستقبل کا کوئی خطرہ، جنت ہی ہو سکتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۳۹)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: یہ آیت اوپر والی آیت کے بالمقابل ہے۔ اوپر والی آیت میں ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ہدایت کی پیروی کریں گے۔ اس آیت میں ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کریں گے۔

لفظ 'آیت' کے مختلف مفہوم

آیات کا لفظ آیت کی جمع ہے۔ آیت کے اصل معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ ان دلائل اور نشانیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو آسمان و زمین اور آفاق و انفس کے ہر گوشے میں موجود ہیں اور جو خدا کی قدرت و حکمت، اس کی توحید اور اس کے قانون جزا و سزا کی گواہی دے رہی ہیں۔

ان معجزات کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو حضرات انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے ظاہر ہوئے ہیں یا جن کے لیے کفار مطالبہ کرتے رہے ہیں۔

قرآن مجید کی ان آیتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جن سے قرآن کی سورتیں مرکب ہیں۔ قرآن مجید کی آیات کے لیے اس لفظ کا استعمال اس حقیقت پر دلیل ہے کہ ان کی حیثیت بے دلیل احکامات کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر آیت ایک دلیل و شہادت اور ایک حجت و برہان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

۲۵۔ مجموعہ آیات ۳۰-۳۹ کی تعلیمات

یہ مجموعہ آیات جن حقائق پر مشتمل ہے ان میں سے بہت سی باتوں کی طرف ہم الفاظ اور جملوں کی تشریح

کرتے ہوئے اشارے کر چکے ہیں۔ یہ اشارے ہمارے نزدیک رہنمائی کے لیے کافی ہیں لیکن اس کے اندر بعض ایسے حقائق بھی ہیں جن سے وہ سوالات حل ہوتے ہیں جن پر اسلامی فکر و فلسفہ اور اسلامی نظام کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس دنیا میں انسان کا اصلی مرتبہ و مقام کیا ہے؟ انسان اس دنیا میں خود مختار و مطلق العنان ہے یا پابند و محکوم؛ مسئول ہے یا غیر مسئول؛ مجبور ہے یا با اختیار؛ اس کو کسی نے اس دنیا میں بھیجا ہے یا وہ خود بخود اس میں در آیا ہے؛ اس کا وجود محض ایک انفرادی وجود ہے یا وہ اپنی کوئی اجتماعی ہستی بھی رکھتا ہے؟ اس کی رہنمائی کے لیے اس کی اپنی ہی عقل و فہم کافی ہے یا اس کے علاوہ وہ کسی اور ما فوق رہنمائی کا بھی محتاج ہے؛ اس کائنات کے دوسرے عناصر کے ساتھ اس کے ربط کی نوعیت کیا ہے؛ یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بدی کی مخلوق ہے یا نیکی کی؛ اس کے اندر جو بدی پائی جاتی ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ غرض اس طرح کے بہت سے بنیادی سوالات ہیں جن کے جواب ان آیات کے اندر موجود ہیں۔ اب ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ان کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

خلافت اور اس کے مقتضیات

ان آیات سے پہلی حقیقت تو یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ اور نائب کی ہے۔ یہ بات قرآن مجید کے الفاظ میں نہایت واضح طور پر کہی گئی ہے۔ اس خلافت و نیابت کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس کے کچھ لازمی تقاضے ہیں جن کے پورے ہوئے بغیر خلافت کا تصور مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نزدیک یہ تقاضے بالاجمال یہ ہیں۔

ایک یہ کہ انسان کو ایک خاص دائرے کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار تفویض ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ذات خود ہر جگہ حاضر و ناظر ہو، جو ہر قسم کے تصرف پر خود پوری پوری قدرت رکھتی ہو، جو کسی کی مدد اور کسی کی اعانت کی محتاج نہ ہو، جس کو ایک پل کے لیے بھی اپنی مملکت کے امور و معاملات سے دستکش یا غیر حاضر ہونے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو، اس کی طرف سے کسی کو اپنا خلیفہ یا نائب بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے خلیفہ کو کچھ اختیارات دے کر یہ امتحان کرنا چاہتی ہے کہ یہ ان اختیارات کو کس طرح استعمال کرتا ہے، ان کو اپنے مُسْتَخْلِف کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا اس کی مرضی سے بے پروا ہو کر اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ جب انسان خلیفہ اور نائب ہے تو یہ عین اس کی خلافت اور نیابت کا اقتضا ہے کہ مستخلف کی طرف سے اس کی آزادی کے حدود معین و معلوم ہوں، اس کو واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہو کہ کن امور میں اس کو مستخلف کے مقرر کردہ حدود کی پابندی کرنی ہے اور کن امور میں اس کو اپنی صوابدید پر عمل کرنے کی آزادی بخشی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی تعبیر اگر کی جائے تو یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ عین خلافت و نیابت کی فطرت کا اقتضا ہے کہ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے شریعت و ہدایت نازل ہو۔

تیسرا یہ کہ جب انسان خدا کا خلیفہ اور نائب ہے تو اس کے مطلق العنان اور غیر مسئول ہونے کا تصور نہ

بنیادی طور پر غلط ہے۔ کوئی صاحب قدرت اور علیم و خبیر مستخلف اپنے خلیفہ کو شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ لازماً اپنے خلیفہ کی ایک ایک بددیانتی اور ایک ایک خیانت پر اس سے مواخذہ بھی کرے گا، اگر اس نے اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دیے ہوں گے تو اس کو اس کی خدمات کا بھرپور صلہ بھی دے گا۔

چوتھا یہ کہ عین منصب خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ منصب صفات کے ساتھ مشروط ہو۔ غیر مشروط نہ ہو یعنی منشائے خلقت کے لحاظ سے تو یہ منصب تمام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے۔ ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے، لیکن یہ اس منصب کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے جائز حقدار وہی ہوں جو خدا کی خلافت کے حق کو وفاداری کے ساتھ ادا کریں۔ جو اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا کے خلیفہ نہیں بلکہ اس کے باغی اور غدار ہیں۔

پانچواں یہ کہ یہ منصب اپنے مزاج کے لحاظ سے صرف ایک انفرادی منصب نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی اور سیاسی منصب بھی ہے۔ تمام انسانوں کو یا کم از کم ان سارے لوگوں کو جو اس منصب کی ذمہ داریوں پر ایمان رکھتے ہیں، انفرادی طور پر بھی اس منصب کے فرائض پورے کرنے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک نظام قائم کرنا ہے کیونکہ اس نظام کے بغیر اس کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔

چھٹا یہ کہ یہ خلافت خیر و فلاح کی ضامن اس وقت تک رہ سکتی ہے جب تک یہ اصل مستخلف کے احکام و ہدایات کے مطابق چلائی جائے۔ اگر اس کے احکام کو پس پشت ڈال کر انسان اس کو اپنی خواہشات کے مطابق چلانے کی کوشش کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس زمین میں خونریزی اور فساد برپا ہو۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ دیا ہے کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا اور ابلیس اس کو سجدہ نہ کرنے ہی کے سبب سے ملعون ہوا تو یہ بات کسی طرح اس کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ جنات یا فرشتوں میں سے کسی کو خدا کا شریک سمجھ کر ان کی پرستش کرے۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کے آگے جس طرح انسان عاجز و بے بس ہے اسی طرح فرشتے اور جنات بھی عاجز و بے بس ہیں۔ ان کے پاس جو علم ہے وہ بھی خود ان کا اپنا ذاتی نہیں بلکہ تمام تر اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو انسان علم میں فرشتوں سے بھی بازی لے جا سکتا ہے اس وجہ سے بندگی اور پرستش کا حقیقی حق دار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ انسان اگر اس حق میں جنوں اور فرشتوں کو بھی شریک کرتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی توہین نہیں کرتا بلکہ خود اپنی بھی توہین کرتا ہے۔

تیسری حقیقت ان آیات سے یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے کوئی مجرم اور فسادی وجود نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نہایت اچھی صلاحیتوں اور نہایت اعلیٰ قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا۔ یہ اگر گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی ازلی و ابدی گنہگار ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اختیار کی اس نعمت کو جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو مشرف فرمایا ہے، غلط استعمال کرنے کے فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس فتنہ میں اس کو شیطان مبتلا کرتا ہے اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے انسان کی وسیع آزادی پر جو چند پابندیاں عائد کر دی ہیں، شیطان انسان کو ورغلاتا ہے کہ یہی پابندیاں ہیں جو اس کے سارے عیش و آرام کو کرکرا کیے ہوئے ہیں، اگر وہ ان کو جرأت کر کے توڑ دے تو بس اس کے لیے رزق و کمال اور عیش و آرام کے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ شیطان کے ان مشوروں کا فائدہ چوں کہ انسان کو نقد نقد نظر آتا ہے اس وجہ سے وہ اس کے چکمے میں آجاتا ہے اور اپنی فطرت کے اعلیٰ تقاضوں کے خلاف گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس گناہ سے اس کو پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے توبہ اور اصلاح کی راہ کھولی ہے۔ چناں چہ حضرت آدمؑ سے جو لغزش صادر ہوئی اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کے بعد وہ معاف کر دی۔ اس کے بعد ان کو اس دنیا میں جو بھیجا تو اس کی وجہ حضرت آدمؑ کا معتوب ہونا نہیں ہے بلکہ محض ان کا امتحان ہے تاکہ وہ شیطان کے مقابل میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت دیں اور اس کے صلہ میں اس جنت کو پھر حاصل کریں جس سے وہ نکالے گئے۔

قرآن کے اس بیان سے عیسائیوں کے اس خیال کی پوری پوری تردید ہو جاتی ہے جو آدم کے ازلی و ابدی گنہگار ہونے سے متعلق ان کے ہاں پایا جاتا ہے اور جس کے حل کے لیے انھوں نے کفارہ کا عقیدہ گھڑا ہے۔

خدا کے کام میں حکمت ہے

چوتھی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ خدا کی ہر بات کے اندر نہایت گہری حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں لیکن ان تمام حکمتوں اور مصلحتوں سے جب تک اللہ تعالیٰ ہی واقف نہ کرے نہ ان سے جنات واقف ہو سکتے ہیں نہ فرشتے اور نہ انسان۔ اللہ تعالیٰ کے کاموں کے بارے میں صحیح روش انسان کے لیے یہ ہے کہ ان کی حکمتیں معلوم کرنے کی کوشش تو برابر کرتا رہے لیکن اگر کسی چیز کی حکمت اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کو ہدف اعتراض و مخالفت نہ بنالے بلکہ یہ حسن ظن رکھے کہ اس کے اندر ضرور کوئی نہ کوئی حکمت ہوگی لیکن اپنے علم کی کمی کے سبب سے وہ اس حکمت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔ یہی روش اختیار کر کے انسان ایمان و اسلام کے جادہ پر استوار رہ سکتا ہے اور یہی روش فرشتوں کی روش ہے۔ رہے وہ لوگ جو اپنے نہایت قلیل اور محدود علم کو خدا کے علم اور اس کی حکمتوں کے ناپنے کا پیمانہ بنا بیٹھے ہیں تو وہ اسی قسم کی خودسری اور انانیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس قسم کی خودسری اور انانیت میں ابلیس مبتلا ہو گیا۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے ایمان و معرفت کے راستے کھلتے نہیں بلکہ جو راستے کھلے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی بند ہو جایا کرتے ہیں۔

آدمؑ اور ابلیس کے گناہ میں فرق

پانچویں حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جو گناہ انسان کے محض ارادہ کی کمزوری سے صادر ہوتا ہے اس کا مزاج اس گناہ سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس کا سرچشمہ حسد اور تکبر ہوتا ہے۔ ضعف ارادہ سے صادر ہو جانے والے گناہ کے بعد توبہ اور اصلاح حال کی توقع بہت غالب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو، اگر وہ بالکل ہی اپنے آپ کو چھوڑ نہیں بیٹھتے ہیں، سنبھالتا ہے اور ان کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ حسد اور تکبر کی بنا پر خدا کی نافرمانی کرتے ہیں ان کی بیماری بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ

اصلاح پذیر ہونے کے بجائے بالعموم اپنے مرشد — ابلیس — ہی کی راہ پر جیتے اور اسی پر مرتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کا گناہ پہلی قسم کا تھا اس وجہ سے ان کو توبہ کی توفیق حاصل ہوئی اور ابلیس کا گناہ دوسری قسم کا، اس وجہ سے وہ توبہ اور اصلاح سے محروم رہا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی۔

نبوت و رسالت کی ضرورت

چھٹی حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو انسان کے بہکانے کی مہلت دے کر انسان کو اس دنیا میں ایک سخت امتحان میں ڈالا ہے اس وجہ سے اس کی رحمت مقتضی ہوئی کہ وہ انسان کی ہدایت اور اصلاح کے معاملہ کو تنہا اس کی عقل و فطرت ہی پر نہ چھوڑے بلکہ اس کی فطرت کو بیدار رکھنے اور اس کی عقل کو کجرویوں اور گمراہیوں سے بچانے کا بھی سامان کرے تاکہ جو ہدایت کی راہ اختیار کرنا چاہیں وہ بھی علیٰ وجہ البصیرۃ اختیار کریں اور جو گمراہی کی راہ پر جانا چاہیں وہ بھی پوری طرح اتمام حجت کے بعد جائیں۔ نبوت و رسالت کے قیام سے اصل مقصود یہی چیز ہے اور اس امتحان گاہ عالم میں انسان کے لیے اصلی سرمایہ تسکین و تسلی درحقیقت یہی انبیا علیہم السلام کی تعلیمات ہیں۔ اگر یہ چیز انسان سے چھن جائے تو پھر انسان ہر فتنہ کا بڑی آسانی سے شکار ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی فطرت کے اندر جو خلا ہیں وہ صرف انبیا علیہم السلام کی تعلیم کی پیروی سے ہی بھر سکتے ہیں۔ اس کے بغیر انسان کے لیے شیطان کے فتنوں سے مامون ہونا ممکن نہیں ہے۔

۲۶- آگے کا مضمون ——— آیات ۴۰-۴۶

شروع سورہ سے لے کر یہاں تک کا پورا سلسلۂ کلام ایک تمہید یا مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تمہید میں خطاب اگرچہ بیشتر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہے، اس میں کہیں براہ راست یہود کو مخاطب کرکے کوئی بات ان سے نہیں کہی گئی ہے لیکن اشارات و کنایات کے پردے میں جو کچھ کہا گیا ہے، ہماری پیش کردہ تفصیلات سے واضح ہے کہ ہے وہ تمام تر یہود ہی سے متعلق۔ اب یہ تمہید ختم ہو گئی۔ آگے یہود کو براہ راست مخاطب کرکے پہلے ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی گئی ہیں جو از روئے تورات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کی دعوت سے متعلق ان پر عائد ہوتی ہیں، پھر تفصیل کے ساتھ ان کے وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو منصب امامت سے معزول کرکے دوسروں کو اپنی ہدایت و شریعت سونپے۔ یہ مضمون تقریباً اس سورہ کے آدھے حصہ پر حاوی ہے اور اس میں دعوت و ملامت کے بعد ان کی معزولی کے وجوہ کی پوری تفصیل نہایت خوبی اور نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کر دی گئی ہے۔ اب ہم اس کے ایک ایک ٹکڑے کو لے کر اس کی تفصیل کریں گے۔ فرمایا۔

آیات ۴۰-۴۶

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا
بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝٤٠ وَاٰمِنُوْا بِمَآ

أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوٓا أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦ ۖ
وَلَا تَشْتَرُوا بِـَٔايٰتِى ثَمَنًا قَلِيلًا ۡ وَإِيَّاىَ فَاتَّقُونِ ﴿٤١﴾ وَلَا تَلْبِسُوا
الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾ وَأَقِيمُوا
الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ ﴿٤٣﴾ أَتَأْمُرُونَ
النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۚ
أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَإِنَّهَا
لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ﴿٤٥﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلٰقُوا
رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ ﴿٤٦﴾ ع ۵

ترجمہ آیات ۴۰-۴۶

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر کی اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا۔ اور مجھی سے ڈرو۔ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمھارے پاس ہے اور تم اس کے سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو اور میری آیات کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو اور میرے غضب سے بچتے ہی رہو اور حق اور باطل کو گڈمڈ نہ کرو حق کو چھپانے کے لیے درآں حالے کہ تم جانتے ہو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ کیا تم لوگوں کو وفاداری کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم سمجھتے نہیں؟ اور مدد چاہو صبر اور نماز سے اور بے شک یہ بھاری چیز ہے مگر ان لوگوں کے لیے جو ڈرنے والے ہیں، جو گمان رکھتے ہیں کہ انھیں اپنے رب سے ملنا ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۴۰-۴۶

٢٧- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡٓ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ وَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ (۴۰)

لفظ 'اسرائیل' کی تحقیق

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ : اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے، یہودی علما اس کے معنی بطل اللہ کے بتاتے ہیں۔ یہ معنی لینے میں غالباً اس روایت کو بڑا دخل ہوگا جو یہود نے تورات میں حضرت یعقوبؑ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کشتی لڑنے کی داخل کر رکھی ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے۔ ان کی تحقیق میں یہ لفظ دو جزوں سے مرکب ہے۔ 'اسر' اور 'ایل'۔ اسر کے معنی ان کی تحقیق میں بندہ کے ہیں اور ایل عبرانی میں اللہ کے معنی کے لیے مشہور ہی ہے۔ اس طرح مولانا کے نزدیک اسرائیل کے معنی عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ کے ہوئے۔

یہود نے اسرائیل کی وجہ تسمیہ معین کرنے میں جس قسم کی ذہانت دکھائی ہے اسی قسم کی ذہانت انھوں نے یعقوبؑ کی وجہ تسمیہ معین کرنے میں بھی دکھائی ہے۔ ان کے نزدیک یعقوبؑ کا نام یعقوب اس لیے ہوا کہ وہ اپنے بھائی عیسو کی ایڑیاں پکڑے ہوئے پیدا ہوئے۔ استاذ امام کے نزدیک اس کی توجیہ بھی یہود کی توجیہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ قرآن مجید کے اشارات کی روشنی میں حضرت یعقوبؑ کے یعقوب نام پانے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسحاقؑ کے بعد ان کے پیدا ہونے کی بشارت بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سنا دی تھی۔

اُذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ : اذکروا، یاد کرو۔ یہ بنی اسرائیل کو دعوت بانداز ملامت ہے یعنی یاد کرلو اس لیے کہ تم بالکل بھول بیٹھے ہو اور جو فضل میں نے تم پر کیے تھے ان کو تم نے اپنے استحقاق ذاتی و خاندانی کا ثمرہ سمجھ لیا۔

'نعمت' کی وضاحت

نعمت سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے جن افضال و عنایات کی طرف اشارہ فرمایا ہے قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی تفصیل بھی فرما دی ہے۔ ہم چند آیتیں یہاں نقل کرتے ہیں، ان سے اس اجمال کی وضاحت ہو جائے گی۔

اسی سورہ کے آگے والے رکوع میں فرمایا ہے :-

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ (۴۷۔ بقرہ)	اے بنی اسرائیل میرے اس انعام کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میں نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔

اس آیت میں اس انعام کا حوالہ دیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سیادت و امامت کی

صورت میں عطا فرمایا تھا۔

پھر سورہ مائدہ میں فرمایا ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ (۷- مائدہ)

اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کے انعام کو اور اس کے اس عہد کو جو اس نے تمہارے ساتھ ٹھہرایا۔

اس آیت میں اس انعام کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ان کو اپنی شریعت دے کر فرمایا۔ یہ شریعت اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان ایک میثاق اور معاہدے کی حیثیت رکھتی تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی شریعت کی پابندی کا عہد لیا اور اس پابندی کے صلہ میں اپنی طرف سے ان کے لیے دنیا و آخرت کی فوز و فلاح کی ضمانت دی۔

پھر اسی مائدہ میں آگے چل کر اس انعام کی مزید وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ۔ (۲۰- مائدہ)

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم کے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے انعام کو یاد رکھو کہ اس نے تمہارے اندر انبیا اٹھائے، تم کو بادشاہ بنائے اور تم کو وہ کچھ بخشا جو تم سے پہلے دنیا میں کسی قوم کو نہیں دیا۔

ان آیات سے اس اجمال کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے جو زیر بحث آیت میں ہے۔ مزید جو چیز اس آیت میں پیش نظر رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اول تو فرمایا کہ میرا انعام اور پھر اس پر مزید اضافہ یہ فرمایا کہ جو میں نے تم پر انعام کیا، یہ تاکید اس لیے ہے کہ بنی اسرائیل کی تمام گمراہیوں کی جڑ، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، یہی چیز تھی کہ ان کو جو بڑائیاں محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوئیں ان کو انھوں نے اپنی اہلیت و استحقاق کا ثمرہ اور اپنے نسل و نسب کا ایک قدرتی حق سمجھ لیا۔ یہاں نِعْمَتِیَ اور اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ کے الفاظ سے ان کی اسی ذہنیت کی اصلاح مقصود ہے اور آگے یہ چیز بالتدریج کھلتی جائے گی۔

عہد سے مراد بنی اسرائیل سے آنحضرت صلعم کے متعلق عہد

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ: عہد سے مراد یوں تو پوری شریعت ہی ہے اس لیے کہ شریعت درحقیقت بندوں اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ معاہدہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہوتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ تمام آسمان و زمین کا خالق و مالک ہے کسی کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ تمام آسمان و زمین کا بادشاہ اس سے کوئی معاہدہ کرے، اس کے باوجود اگر وہ کسی کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی طرف سے اس کو ایک بہت بڑا شرف بخشتا ہے۔ لیکن یہاں اس عام معاہدہ کے ساتھ ساتھ اس خاص عہد کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لیا گیا تھا۔ اس عہد کا ذکر تورات میں بھی ہے اور اس کی طرف قرآن میں بھی اشارات کیے گئے ہیں۔ کتاب استثنا ۱۵-۱۹ میں ہے:

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا ..... میں ان کے لیے انھی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔"

قرآن مجید میں اس عہد کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے رحمت کی جو دعا کی، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا
لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ
هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ
الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ
مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ
يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ
عَلَيْهِمُ الْخَـبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ
وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا
النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۶-۱۵۷ اعراف)

اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔ میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے — یعنی جو پیروی کرتے ہیں رسول نبی امی کی جن کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں۔ وہ ان کو حکم دیتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں منکر سے اور ان کے لیے جائز کرتے ہیں پاکیزہ چیزیں اور حرام کرتے ہیں ان پر ناپاک چیزیں اور دفع کرتے ہیں ان پر سے بوجھ اور پھندوں کو جو ان پر تھے۔ پس جو ان پر ایمان لائے اور جنھوں نے ان کی حمایت کی اور مدد دی اور اس روشنی کی پیروی کی جو ان کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بنی اسرائیل سے جو عہد اللہ تعالیٰ نے لیا تھا اس میں بنی اسرائیل پر کیا ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور اس ذمہ داری کے ادا کرنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے کیا وعدے کیے گئے تھے۔

ہیبت کا مفہوم

وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ: کسی کی عظمت و جلالت کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی کی حالت طاری ہو جاتی ہے اس کے لیے عربی زبان میں رھبت کا لفظ ہے اور یہ بات اِيَّاكَ نَعْبُدُ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم واضح کر چکے ہیں کہ اگر فعل کے مفعول یا اس کے متعلق کو فعل پر مقدم کر دیا جائے تو یہ اس کے اہتمام اور اس پر زور دینے کی ایک شکل ہوتی ہے۔ علاوہ بریں اگر فعل پر فَ آ جائے تو یہ مزید اہتمام کی ایک دلیل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر فعل کے بعد ضمیر بھی آ جائے تو اسی پہلو کی مزید وضاحت ہو گی۔ اس لحاظ سے وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ کے معنی ہوں گے پس صرف مجھی سے ڈرو۔

صرف مجھی سے ڈرو کا مطلب یہاں یہ ہے کہ میرے عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے میں تمہاری دوسری مصلحتوں اور دوسرے اندیشوں پر میری عظمت و جلالت کے تصور کو غالب ہونا چاہیے۔ تم ڈرتے ہو کہ اگر تم نے نبی آخرالزمان کی دعوت قبول کر لی تو تمہاری سیادت و ریاست ختم ہو جائے گی، امیوں کو تم پر فضیلت حاصل ہو جائے گی، تمہارے عوام تمہارے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور جو فوائد تم ان سے اب تک حاصل کرتے رہے ہو ان کے دروازے بند ہو جائیں گے حالاں کہ ڈرنے کی چیزیں یہ نہیں ہیں، ڈرنا تو صرف مجھ سے چاہیئے جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے اور جس نے تم سے عہد لیتے وقت پہاڑ کو تمہارے سروں پر چھتری کی طرح اوڑھا دیا تھا۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ (۴۱)

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کا اصل مفہوم

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ: مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اس چیز کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے پاس ہے۔ یعنی قرآن مجید اس پیشین گوئی کو سچی ثابت کر رہا ہے جو تورات میں آخری نبی کی بعثت اور اس بعثت کی خصوصیات سے متعلق وارد تھی۔ مقصود یہ ہے کہ اگر سمجھ سے کام لو تو قرآن مجید اور یہ پیغمبر تمہارے لیے چڑنے کی چیز نہیں ہیں بلکہ سر اور آنکھوں پر بٹھانے کی چیز ہیں کیوں کہ ان کے ظہور سے سب سے زیادہ تمہارا ہی سر بلند ہوا ہے۔ تمہارے صحیفوں میں ان کی پیشین گوئیاں موجود تھیں اور یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے حقیقی مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں۔ اب اس کتاب اور اس پیغمبر کے ظہور نے ان کا مصداق دنیا کے سامنے پیش کر کے تمہاری کتاب کو سند تصدیق عطا کر دی تو تمہیں تو سب سے پہلے اس پر ایمان لانے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔

اس تصدیق کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جہاں تک تورات یا انجیل کے آسمانی صحیفے ہونے کا تعلق ہے قرآن مجید آشکارا طور پر ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے، ان کے لانے والوں کی نبوت و رسالت کی بھی نہایت غیر مبہم الفاظ میں تصدیق کرتا ہے، ان کی تعلیمات کی بھی اصولی طور پر تصدیق کرتا ہے۔ قرآن اگر تردید کرتا ہے تو صرف ان چیزوں کی تردید کرتا ہے جو غلط طریقوں سے ان صحیفوں میں شامل کر دی گئی ہیں یا تحریف کر کے جن کی اصلی شکل بگاڑ دی گئی ہے۔ اس طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک اصل تورات کا تعلق ہے، قرآن مجید اس کی سچائی کا گواہ بن کر نازل ہوا ہے، وہ اس کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان چیزوں سے اس کو بری قرار دیتا ہے جو اس کو جھٹلانے والی ہیں۔

زبان کا ایک نکتہ

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ: اَفْعَل کا مضاف الیہ اگر نکرہ مفرد ہو تو وہ تمیز کے مفہوم میں ہوا کرتا ہے لیکن اگر اس کی اضافت معرفہ کی طرف ہو تو اس شکل میں مضاف الیہ جمع ہوگا۔ مثلاً قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ (۸۱۔ زخرف) (کہہ دو، اگر خدا کے کوئی اولاد ہو تو میں سب سے پہلا عبادت کرنے والا ہوں)۔

اَوَّلَ کَافِرٍ اور اَوَّلَ الْکَافِرِیْنَ دونوں کے مواقع استعمال ہیں۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ایک لطیف فرق بتاتے ہیں۔ جب اَوَّلَ کَافِرٍ کا استعمال ہوگا تو اس میں اس سے بحث نہیں ہوگی کہ اس کے علاوہ کوئی اور کافر پایا جاتا ہے یا نہیں اور دوسری شکل میں مفہوم یہ ہوگا کہ یہ کفر کرنے والوں میں سب سے پہلا شخص ہے۔

'کفر' کا لفظ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں حق کے انکار کے معنی میں بھی آتا ہے اور کفرانِ نعمت کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ یہاں یہ لفظ دونوں ہی مفہوموں پر حاوی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ قرآن پر ایمان لانے کا ان سے عہد لیا جا چکا تھا اس وجہ سے اس کا حق ہونا ان پر اچھی طرح واضح تھا، اس بنا پر یہ ایک عظیم حق کا انکار ہوا۔ پھر قرآن مجید ان کے لیے ایک بہت بڑی نعمت بن کر نازل ہوا تھا، اس پر ایمان لانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے ابدی نعمتوں کے وعدے تھے، اس وجہ سے اس سے اعراض درحقیقت ایک بہت بڑا کفرانِ نعمت بھی تھا۔

'سب سے پہلے اس کے کفر کرنے والے نہ بنو' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب دوسرے کفر کر لیں تو تمہارے لیے کفر کرنا جائز ہو جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ قرآن تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا نازل ہوا ہے اور اس پر ایمان لانے کا تم سے اس کے نزول سے پہلے ہی عہد لیا جا چکا ہے اس وجہ سے اس کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کی سب سے پہلے تم ہی سے توقع کی جا سکتی تھی لیکن یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ دوسرے تو اس سے ناآشنا ہونے کے باوجود اس پر ایمان لانے کے لیے سبقت کریں اور تم اس سے پہلے سے آشنا ہو کر اس کی مخالفت کی راہ میں سبقت کرو۔

نہی کے ساتھ قید کا فائدہ

اس طرح کے مواقع پر نہی کے ساتھ جو قید لگی ہوتی ہے استاذ امامؒ کے نزدیک اس کا مقصود محض صورتِ واقعہ کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، نہی کا اصل تعلق تو فعل سے ہوتا ہے، قید اس کے ساتھ محض اس لیے بڑھا دی جاتی ہے تاکہ وہ صورتِ حال سامنے آ جائے جو اس کے ارتکاب میں مضمر ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:-

لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۱۳۰۔ آل عمران) سود نہ کھاؤ دگنا چوگنا کرتے ہوئے۔

اس آیت میں مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر سود در سود کی شکل پیدا نہ ہو تو سود مباح ہے بلکہ مقصود اس صورتِ حال کے پیش کرنے سے اصل فعل کی نفرت انگیز شکل کو سامنے کر دینا ہے

اسی طرح زیر بحث ٹکڑے کے بعد فرمایا، وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (اور میری آیتوں کو حقیر پونجی کے عوض نہ بیچو) تو اس کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ اگر اچھے دام مل جائیں تو بیچ سکتے ہو، بلکہ نہی کا تعلق یہاں بھی اصل فعل سے ہے، یعنی روکا جس چیز سے گیا ہے وہ دین فروشی ہے، لیکن ثَمَنًا قَلِيْلًا کی قید نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ دین فروشی کا یہ کاروبار نہایت ذلیل طریقہ سے ہو رہا ہے کیوں کہ اللہ

کی آیات کے بدلے میں اگر تمام دنیا بھی حاصل ہو جائے تو وہ بہرحال ایک متاعِ حقیر ہی ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ

ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ قرآن کے انکار میں یہود سے پہلے تو قریش نے سبقت کی تو قرآن نے سبقت کا الزام یہود پر کیوں عائد کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات یہاں یہود سے بہ حیثیت قوم کے کہی جا رہی ہے اور مقابل میں یہاں امی عرب بہ حیثیت قوم کے ہیں، عام اس سے کہ وہ عدنانی ہیں یا قحطانی۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ قریش نے قرآن کا انکار کرنے میں سبقت کی لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انصار نے اس کے قبول کرنے میں سبقت کی۔ پھر قریش کے انکار کی نوعیت بھی بہرحال یہ نہیں تھی کہ سارا قریش اس کے انکار ہی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہو، ان میں قرآن کے انکار کرنے والے بھی تھے اور قرآن پر جان نثار کرنے والے بھی تھے، لیکن بنی اسرائیل کا حال اس سے بالکل مختلف تھا، یہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور مخالفت کے لیے من حیث القوم اٹھ کھڑے ہوئے اور آخر دم تک اس مخالفت پر اڑے رہے، درآنحالیکہ دینِ الٰہی کے وارث اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں کے امین ہونے کے سبب سے امی عربوں کے مقابل میں ان کو اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ کا درجہ حاصل کرنا تھا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا: میری آیات کو حقیر قیمت کے عوض نہ بیچو، یعنی اپنے دنیوی مفادات و مصالح پر تورات اور اس کے احکام و ہدایات کو قربان نہ کرو۔ یہ ایک جامع اسلوب بیان ہے جس میں یہود کی ان تمام عہد شکنیوں کی طرف اشارہ ہو گیا ہے جن کے وہ مرتکب ہوئے تھے اور جن کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آ رہی ہے۔ یہود سے اللہ تعالیٰ نے جو عہد لیا تھا اس میں تین چیزیں خاص طور پر بہت نمایاں تھیں، ایک یہ کہ وہ تورات کی شریعت پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں گے، دوسری یہ کہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے جو ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتا ہوا نازل ہوگا جو تورات میں موجود ہیں، تیسری یہ کہ ان کو جو کتاب عطا ہوئی ہے خلق کے سامنے اس کی شہادت دیں گے، اس کے کسی جزو کو چھپائیں گے نہیں۔

یہاں جب فرمایا کہ میری آیتوں کو حقیر معاوضے کے عوض نہ بیچو تو دوسرے الفاظ میں گویا یہ فرمایا کہ اپنے دنیوی مفادات کی خاطر ان تمام عہود کو خاک میں نہ ملاؤ جو تم خدا سے کر چکے ہو۔

نقضِ عہد کی تعبیر کے لیے ایک اسلوب

نقضِ عہد کے مفہوم کو تعبیر کرنے کے لیے قرآن مجید نے یہ اسلوب دوسرے مقامات میں بھی استعمال کیا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

إِنَّآ أَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ	ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی
نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا	ہے، اسی کے مطابق یہود کے معاملات کے فیصلے
لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ	کرتے رہے وہ انبیا جنھوں نے خدا کی فرمانبرداری
الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ	کی اور ربّانیون اور علما نے بھی اسی کے مطابق فیصلے
اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا	کیے کیونکہ وہ کتابِ الٰہی کے امین بنائے گئے

تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۴۴۔ مائدہ ۵)

تھے اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے تو تم لوگوں سے نہ ڈرو، صرف مجھی سے ڈرو۔ اور میری آیات کو حقیر قیمت کے عوض نہ بیچو۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کیا تو وہی لوگ کافر ہیں۔

اس آیت میں لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا کے موقع و محل کو دیکھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے دنیوی مفادات کی خاطر اللہ کے عہد کو، جو اس نے تورات میں تم سے لیا ہے، نہ توڑو۔ یہ مفادات تمھاری نگاہوں میں کتنی ہی اہمیت رکھنے والے ہوں لیکن خدا کے عہد و پیمان اور اس کے احکام و آیات کے بالمقابل بالکل ہی ہیچ ہیں۔

اس ٹکڑے کے مخاطب یہود کے عوام بھی ہیں اور خواص بھی۔ عوام اس وجہ سے کہ وہ اگرچہ بظاہر تورات کو مانتے تھے لیکن ان کی ساری دینداری محض رسمی و رواجی تھی، اصل شریعت انھوں نے اپنی خواہشات نفس پر قربان کر دی تھی۔ خواص اس وجہ سے کہ ان کے صحیفوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید سے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں انھوں نے ان پر یا تو تاویل کے پردے ڈال دیئے تھے یا ان پر تحریف کی قینچی چلا دی تھی اور محرک اس تاویل و تحریف کی دو چیزیں تھیں۔ ایک بنی اسماعیل کے خلاف حسد کا جذبہ، دوسری اس بات کا خوف کہ اگر اصل حقیقت ظاہر کر دی تو عوام بگڑ کھڑے ہوں گے اور جو عزت و سرداری اس وقت ان کو حاصل ہے وہ خطرے میں پڑ جائے گی۔

رہبت، تقویٰ اور خشوع ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں

وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ، اتقا اور تقویٰ کی تحقیق ہم هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں۔ اوپر والی آیت میں وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ فرمایا تھا۔ یہاں وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ فرمایا۔ پھر آگے کی ایک آیت میں خشوع کا لفظ آ رہا ہے رہبت، تقویٰ، خشوع سب ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ کسی کے عظمت و جلال کے تصور سے دل پر جو لرزش اور کپکپی طاری ہوتی ہے وہ رہبت ہے۔ اس لرزش و کپکپی سے صاحب عظمت و جلال کے لیے دل میں جو عجز و فروتنی اور پستی و نیاز مندی کی حالت پیدا ہوتی ہے اور طبیعت میں بے نیازی کی جگہ فقر کا اور گھمنڈ کی جگہ اخبات کا جو احساس ابھرتا ہے وہ خشوع ہے۔ اسی طرح اس صاحب عظمت و جلال کے قہر و غضب سے بچنے، اس کے مقرر کردہ حدود کی مخالفت سے احتراز اور اس کے احکام و آیات کی خلاف ورزی سے اجتناب و احتیاط کی جو بے چینی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اور جو خلوت و جلوت ہر جگہ آدمی کو بیدار اور چوکنا رکھتی ہے وہ تقویٰ ہے۔

• مجھ ہی سے بچو' کا ٹکڑا بیک وقت دو حقیقتوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو یہ کہ مجھے کوئی بہت نرم چیز سمجھ کر میری گرفت اور میرے غضب سے بے پروا نہ ہو جاؤ۔ جو میری نعمت کی ناقدری کرتے ہیں، میرے عہد کو پامال کرتے ہیں، میری آیات کو مال بیع و شرا سمجھتے ہیں۔ جب میرا غضب ان پر نازل ہوتا ہے تو وہ ان کی کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے

اور اس وقت کوئی نہیں ہوتا ہے جو ان کو میرے غضب سے چھڑانے کے لیے کھڑا ہو سکے۔

دوسری حقیقت جو مفعول کی تقدیم سے یہاں پیدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم ڈرتے ہو کہ اگر تم نے اصل حقیقت ظاہر کر دی تو تمہارے عوام بگڑ کھڑے ہوں گے، تمہاری سرداری و پیشوائی خطرے میں پڑ جائے گی، تمہارے مقابل میں بنی اسماعیل کا سر اونچا ہو جائے گا اور تمہارے دوسرے دنیوی مفادات کو نقصان پہنچ جائے گا حالانکہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ڈرنے اور بچنے کی نہیں ہے، اصل ڈرنے کی چیز اگر کوئی ہے تو صرف میرا غضب ہے کیوں کہ اس سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ البتہ میں اگر چاہوں تو اپنے غضب سے ڈرنے والوں کو ہر خطرہ سے بچا سکتا ہوں۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۴۲)

لبسِ حق بالباطل کا مفہوم

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ: لبس الثوب کے معنی ہیں اس نے کپڑا پہن لیا۔ لبس الامر علیہ کے معنی ہیں اس نے معاملہ کو گڈمڈ کر دیا۔ لَبَسَهُمْ کے معنی ہوں گے، ان کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیا یا باہمدگر ٹکرا دیا۔ قرآن مجید میں ہے اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا (یا تمھیں گروہ در گروہ کر کے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا دے)

لبس الشیٔ بالشیٔ کے معنی ہوتے ہیں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ خلط ملط اور گڈمڈ کر دیا۔ آیت زیر بحث میں حق پر باطل کو ڈھانک دینے کا مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے۔ لبس کے اصل معنی میں یہ دونوں مفہوم مضمر ہیں اور یہاں یہ دونوں ہی بنتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب دوسری جگہ بھی استعمال ہوا ہے مثلاً فرمایا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو
بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ	شرک سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے امن ہے اور
مُّهْتَدُوْنَ (۸۲۔ انعام)	وہ راہ یاب ہونے والے ہیں۔

آیت زیر بحث میں اشارہ ہے یہود کی اس بات کی طرف کہ انھوں نے تورات میں اپنی رائیں اور بدعتیں داخل کر کے اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے حق اور اپنے داخل کیے ہوئے باطل کو ایک ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ قرآن مجید نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ	پس بلا کی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے
بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا	کتاب تصنیف کرتے ہیں، پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا	اللہ کے پاس سے آئی ہے تاکہ اس کے ذریعے سے
قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا	حاصل کریں حقیر قیمت، پس ان کی تباہی ہے اس چیز
كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ	کے سبب جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لیے
مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (۷۹۔ بقرہ)	ہلاکی ہے اس چیز کے باعث جو وہ کما رہے ہیں۔

یہود نے حق پر پردہ ڈالنے کے لیے تورات میں ہر قسم کے تصرفات کر ڈالے تھے۔ بعض چیزیں انھوں نے

اس میں اپنی طرف سے داخل کردی تھیں، بعض چیزیں اس میں سے نکال دی تھیں اور بعض چیزوں میں انھوں نے تبدیلیاں کردی تھیں اور ان تمام تصرفات سے مقصود ان کا ان حقائق پر پردہ ڈالنا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی، ان کی قربان گاہ اور ان کے قبلہ وغیرہ سے متعلق تورات میں بیان ہوئے تھے اور جو آخری نبیؐ کی بعثت کی نشان دہی کرنے والے تھے۔ یہود کو چونکہ یہ بات دل سے ناپسند تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نشانی تورات سے ظاہر ہو اس وجہ سے انھوں نے ان تمام باتوں کو چھپانے کی کوشش کی[۱]

وَتَکْتُمُوا کا اعراب

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ، اس ٹکڑے میں کوئی خاص لغوی اشکال نہیں ہے البتہ وَتَكْتُمُوا کے اعراب کے بارے میں اہل تاویل نے اختلاف کیا ہے۔ بعض لوگ یہاں اَنْ کو پوشیدہ مانتے ہیں اس وجہ سے تَكْتُمُوْا کو نصب کی حالت میں قرار دیتے ہیں، بعض اس کو سابق پر عطف قرار دے کر اس کو جزم کی حالت میں مانتے ہیں۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ عطف کی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہاں حرف "لا" کا اعادہ نہ کرنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کو ظاہر کر رہی ہیں، پہلی بات کے بعد یہ دوسری بات صرف ایک وضاحت اور ایک بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہود نے حق اور باطل کو گڈمڈ کرنے کی جو کوشش کی اس سے اصل مقصود ان کا حق کو چھپانا ہی تھا۔ تورات میں ان کو جس چیز سے روکا گیا تھا وہ تو یہی حق کو چھپانا تھا لیکن اس حق کو چھپانے کی جو شکل ظاہر میں انھوں نے اختیار کی تھی وہ حق اور باطل دونوں کو گڈمڈ کرنے کی تھی اس وجہ سے قرآن نے ان کو پہلے حق و باطل کو گڈمڈ کرنے سے روکا، پھر اس کتمانِ حق سے روکا جو درحقیقت حق و باطل کے التباس کی اس تمام کوشش کا اصل مقصود و مدعا تھا۔

استاذ امامؒ اسی اصول پر وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ اور لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْا أَمَانَاتِكُمْ والی آیات کی بھی تاویل کرتے ہیں۔ تفصیل ان کی اپنے مقام پر آئے گی۔

لفظ حق کی پوری تحقیق اسی سورہ میں آگے آرہی ہے۔ یہاں موقع کلام سے واضح ہے کہ حق سے مراد وہ حقائق ہیں جو تورات میں واضح کر دیے گئے تھے اور جو اب قرآن نے اپنی تائید و تصدیق سے واضح سے واضح تر کر دیے ہیں۔ ان حقائق کا زیادہ تر تعلق نبی آخر الزمان کی نشانیوں سے تھا، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہود ان نشانیوں پر پردہ ڈالنے سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے۔

---

[۱] اس قسم کی بعض باتوں کی طرف اشارہ آگے اس سورہ میں آئے گا۔ جو لوگ زیادہ تفصیل کے طالب ہوں، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے رسالہ ذبیح کا مطالعہ کریں۔

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۴۳)

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ: اقامت صلوٰۃ کی پوری تحقیق شروع میں بیان ہو چکی ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

لفظ زکوٰۃ کی تحقیق

زکوٰۃ: زکوٰۃ کا لفظ زکا۔ یزکوا سے ہے جس کے معنی پاک ہونے کے ہیں۔ عربی میں نفس زکیہ اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہوں سے پاک صاف ہو۔ دوسرا مفہوم اس مادے کے اندر بڑھنے اور نشو و نما پانے کا ہے۔ زکا الزرع کے معنی ہوں گے، کھیتی بڑھی اور اپجی۔ زکوٰۃ کے اندر پاکیزگی اور نشو و نما دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے کہ زکوٰۃ نفس اور مال دونوں کو پاکیزگی بھی بخشتی ہے اور اس سے مال میں برکت اور بڑھوتری بھی ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی بعض آیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

مثلاً فرمایا ہے:۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (۱۰۴- توبہ)	ان کے مالوں کا صدقہ قبول کر لو، ان کو اس کے ذریعہ سے تم پاک کرو گے اور ان کا تزکیہ کرو گے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

وَمَا اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۹- روم)	اور جو تم دیتے ہو سود تاکہ لوگوں کے مالوں میں بڑھوتری ہو تو یہ چیز اللہ کے ہاں نہیں بڑھتی اور جو تم دیتے ہو زکوٰۃ، اللہ کی رضا جوئی کے لیے، تو یہی لوگ اپنے دیے ہوئے کو اللہ کے ہاں بڑھانے والے ہیں۔

زکوٰۃ کا لفظ ابتدا میں تو انفاق فی سبیل اللہ کی تمام قسموں کے لیے استعمال ہوتا رہا اور اس کا مفہوم وہی تھا جو لفظ صدقہ کا ہے لیکن بعد میں قرآن و حدیث کے استعمالات نے اس کو انفاق کی ان متعین مقداروں کے لیے خاص کر دیا جو اللہ اور رسول نے ہر مال میں غربا و فقرا کے لیے واجب کر دی ہیں۔

رکوع کا مفہوم

رکوع: کے معنی آگے کی طرف جھک پڑنے، تواضع ظاہر کرنے اور فقر و غربت سے پست ہو جانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں اس سے مراد نماز ہوتی ہے اس لیے کہ یہ نماز کے اہم ترین ارکان میں سے ہے۔ اس کے ساتھ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (رکوع کرنے والوں کے ساتھ) کی قید، نماز باجماعت کی اہمیت اور اس کی تاکید کو ظاہر کرتی ہے۔ اگرچہ نماز باجماعت کا مفہوم اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے الفاظ کے اندر بھی موجود ہے لیکن مخاطب کے خاص حالات کی وجہ سے اس مضمون کو واضح الفاظ میں الگ بھی بیان کر دیا ہے۔

نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کے اس حکم کے مخاطب، جیسا کہ سیاق کلام سے واضح ہے، یہود ہیں۔ اور اشارہ ان کے عوام و خواص سب کی طرف ہے جس عہد الٰہی کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس کے بنیادی احکام یہی تھے اور یہود نے ان کو بالکل ترک کر رکھا تھا۔ قرآن مجید

نے یہاں یہود کو ان احکام کے از سر نو زندہ کرنے کی طرف توجہ دلائی اور اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ انھوں نے عہد الٰہی کے ان بنیادی احکام کو بالکل ختم کر رکھا ہے لیکن صرف اشارہ کیا، اس بات کو صراحت کے ساتھ نہیں کہا تاکہ وہ بحث و تردید کے لیے نہ الجھ پڑیں۔

یہود کے متعلق یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ انھوں نے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام تقریباً ختم کر دیئے تھے۔

نماز اور زکوٰۃ کے معاملہ میں یہود کا رویہ

جہاں تک نماز کا تعلق ہے اس کا حکم تو ان کے صحیفوں میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے یہاں تک کہ ان کے ایک فرقے کا تو یہ خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس چیز کا حکم دیا ہی نہیں تھا، یہ محض بعد والوں کی بدعت ہے۔

زکوٰۃ کا اگرچہ انھوں نے انکار تو نہیں کیا لیکن ان کے علما اور کاہنوں نے اس کا مصرف فقرا اور مساکین کے بجائے اپنے آپ کو قرار دے لیا۔ چنانچہ کتاب احبار جس میں کاہنوں کے حقوق و فرائض اور نذرا ور قربانیوں وغیرہ کا بیان ہے، فقرا اور مساکین کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ پیداوار کے عشر، پہلوٹھی کے ہدیے اور ہر قسم کی نذریں اس میں کاہنوں کے لیے مخصوص کر دی گئی ہیں اور اس طرح زکوٰۃ کے اصلی حق دار فقرا اور غربا کے بجائے علما اور کاہن بن کے رہ گئے۔ قرآن مجید نے نماز اور زکوٰۃ دونوں معاملوں میں شریعت الٰہی کا حکم بھی واضح کیا اور یہود کی زیادتیوں پر نہایت واضح الفاظ میں ان کو ملامت بھی کی۔

نماز کے متعلق قرآن مجید نے یہ واضح کیا کہ سب سے پہلی چیز جو یہود پر فرض کی گئی وہ نماز ہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو توحید کی تعلیم کے بعد سب سے پہلا حکم نماز ہی کا دیا گیا۔ چناں چہ ارشاد ہے۔

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ	بے شک میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود مگر
وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (۱۴- طٰہٰ)	میں ہو میری ہی بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ اَنْ	اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کی
تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا	طرف وحی کی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر
وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَکُمْ قِبْلَۃً وَّاَقِیْمُوا	مقرر کر لو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز
الصَّلٰوۃَ ط (۸۷- یونس)	قائم کرو۔

ان آیات سے صاف واضح ہے کہ یہود کی جماعتی شیرازہ بندی سب سے پہلے نماز با جماعت کے ذریعہ ہی سے ہوئی تھی لیکن اس کی اہمیت بعد میں انھوں نے بالکل ختم کر دی۔

وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ کے الفاظ کی روشنی میں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک اس حقیقت کی طرف کہ یہاں یہود کو رکوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیوں کہ انھوں نے رکوع کو

بالکل ترک کر دیا تھا۔[1]

دوسرے نماز با جماعت کے اہتمام کی طرف، وہ اس طرح کہ لیڈروں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ نمازوں میں غربا اور عوام کے ساتھ شریک ہوں اور ان کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوں، کیوں کہ پہلی چیز جو نماز کو ڈھانے والی ہے وہ یہی ترک جماعت ہے۔ امرا عوام کے ساتھ مسجدوں کی حاضری کو کسر شان سمجھنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز کی عزت کم ہو جاتی ہے اور مسجدوں کی حاضری صرف غربا کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے۔ نماز با جماعت کی اسی اہمیت کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو بھی جماعت کے اہتمام کی تاکید فرمائی۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۴۳۔ آل عمران)
اے مریم اپنے رب کی فرمانبردار رہ اور سجدہ اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۴۴)

'برّ' کا مفہوم

بِرّ: 'بِرّ' کا لفظ عربی زبان میں ایفائے عہد، وفاداری اور ادائے حقوق کے معنی میں آتا ہے۔ حقوق میں ہر قسم کے حقوق شامل ہیں۔ بنیادی اور حقیقی بھی۔ مثلاً خدا کی فرمانبرداری، والدین کی اطاعت اور خلق کے ساتھ ہمدردی۔ پھر آگے چل کر اس میں وہ حقوق بھی شامل ہو جاتے ہیں جو قول و قرار اور معاہدات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لفظ احسان اور نیکی کی تمام قسموں پر بھی حاوی ہے اور عدل کا بھی ہم معنی ہے۔ اپنے استعمالات کے لحاظ سے یہ لفظ اثم (حق تلفی)، عقوق (والدین کی نافرمانی)، غدر (بے وفائی) اور ظلم کا ضد ہے۔ بَرّ اور بَارّ اس سے صفت کے صیغے استعمال ہیں مثلاً کہیں گے بَرَّ بِوَالِدِهٖ وہ اپنے باپ کا فرمانبردار ہے۔ برّ بالقسم کے معنی ہیں اس نے اپنی قسم پوری کی۔ قرآن مجید میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں وارد ہے وَكَانَ تَقِيًّا، وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا (۱۴۔ مریم) (وہ پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا) دوسری جگہ فرمایا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ (۹۲۔ آل عمران) (تم خدا کی فرمانبرداری کا حقیقی درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو) اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ہے اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ (۲۸۔ طور) (بے شک وہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والا اور مہربان ہے) نیز فرمایا ہے وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۲۔ مائدہ) (اور تعاون کرو ایفائے حقوق اور تقویٰ کے کاموں میں اور نہ تعاون کرو

---

[1] استاذ امام رحمۃ اللہ کے نزدیک یہود اپنے اوپر سال میں صرف ایک مرتبہ سجدہ کرنا واجب سمجھتے تھے اور اس کے لیے بھی ان کے علما نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ اگر کوئی شخص کھڑے کھڑے کسی دیوار یا کھمبے پر اپنی پیشانی رکھ دے تو ادائے فرض کے لیے یہ بھی کافی ہے۔ معلوم نہیں مولانا نے اس بیان کا ماخذ کیا ہے لیکن تورات میں یہود کو بار بار جو گردن کش کہا گیا ہے اس کی وضاحت ان کے اس طرز عمل کی روشنی میں بہ خوبی ہو جاتی ہے۔

حق تلفی اور تعدی کے کاموں میں) اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ بِر کا لفظ ایک پہلو سے نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں پر مشتمل ہے لیکن اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے یہ حقوق اور فرائض کے ایفا کے لیے آتا ہے۔

اس آیت کے مخاطب یہود کے علماء اور اکابر ہیں۔ آخر کا ٹکڑا وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ (اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو) ہمارے اس خیال کی نہایت واضح طور پر تائید کر رہا ہے۔ ان علما اور اکابر کو مخاطب کر کے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ تم عوام کو تو بڑے زوروں سے حقوق اور فرائض ادا کرنے کی تلقین کرتے ہو لیکن یہ تلقین کرتے وقت اپنے آپ کو بالکل بھول جاتے ہو۔ لوگوں کو تو نصیحت کرتے ہو کہ اپنے مال تمہارے حوالہ کریں لیکن خود تمہارے اوپر خدا کے اور غریبوں کے جو حقوق ہیں ان کا خیال تمہیں کبھی نہیں آتا، بلکہ تم لوگوں کا دبا ہوا مال ہڑپ کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ تم نے دوسروں پر تو اپنی اطاعت پوری سطوت کے ساتھ واجب کر رکھی ہے، یہاں تک کہ تم ان کے رب بن بیٹھے ہو لیکن خود خدا کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری سے بالکل آزاد ہو، نماز اور زکوٰۃ کو ضائع کر کے تم نے پورے دین کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ علمائے یہود کی اس حالت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی نہایت بلیغ الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:۔

"اس نے کہا اے شرع کے عالمو، تم پر بھی افسوس کہ تم ایسے بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے:" (لوقا باب ۱۱ - ۴۶)

غور کیجیے، انجیل کے ان الفاظ اور قرآن مجید کے مذکورہ بالا الفاظ میں کتنی مطابقت ہے!

وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ (اور حال یہ ہے کہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو) یعنی تم دین و شریعت کے عالم ہو اور جانتے ہو کہ از روئے عقل و نقل تم پر شریعت کی ذمہ داریاں دوسروں کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔

وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَ (۴۵)

لفظ صبر کی تحقیق

لفظ صلٰوۃ کی تحقیق بقرہ کی آیت ۳ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم صرف لفظ صبر کی تحقیق پر کفایت کریں گے۔

لفظ صبر کے اصل معنی روکنے کے ہیں یعنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر اپنے موقف پر جمائے رکھنا۔ قرآن مجید میں اسی حقیقت نے کچھ زیادہ پاکیزہ صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی قرآن میں عموماً اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ بندہ پوری طمانیت قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عہد پر ڈٹا رہے اور اس کے وعدوں پر یقین رکھے اور اس راہ میں اس کو جن مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑے ان کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہ دے۔

صبر کا مفہوم لوگ عام طور پر عجز و مسکنت سمجھتے ہیں لیکن لغتِ عرب اور استعمالاتِ قرآن میں اس کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ استاذ امامؒ اپنی تفسیر سورۂ والعصر میں کلام عرب کی روشنی میں اس عام خیال کی تردید مندرجہ ذیل

الفاظ میں فرماتے ہیں:

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عربوں کے نزدیک صبر عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے بلکہ یہ عزم اور قوت کی بنیاد ہے۔ کلام عرب میں اس کا استعمال بہت ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اسی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ حاتم طائی کہتا ہے:۔

وغمرة موت ليس فيه هوادة   يكون صدور المشرفي جسورها

اور موت و ہلاکت کے کتنے ہولناک دریا ہیں جن پر تلواروں کے پل ہیں۔

صبرنا له في نهكها ومصابها   بأسيافنا حتى يبوخ سعيرها

ہم نے ان کے تمام آفات و شدائد کے مقابل اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھائی۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔

اصبغ کا شعر ہے۔

يا ابن الجحاجحة المدارة   والصابرين على المكاره

اے شریف سرداروں اور شدائد پر صبر کرنے والوں کی اولاد۔

زہیر بن ابی سلمیٰ۔ نے کہا ہے۔

تود الجياد واصهار الملوك وصبر   في مواطن لو كانوا بها سئموا

اصیل گھوڑوں کی سواری، بادشاہوں کی دامادی اور ایسے مورچوں میں ثابت قدمی جہاں دوسرے ہمت ہار بیٹھیں۔

صبر کے اصلی معنی قرآن مجید نے خود بھی واضح کر دیے ہیں۔ چناں چہ فرمایا ہے:۔

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ   اور ثابت قدمی دکھانے والے سختی میں، تکلیف میں
وَحِينَ الْبَأْسِ (۱۷۷۔ بقرہ)   اور لڑائی کے وقت۔

اس آیت میں صبر کے تین موقعے ذکر کیے ہیں، غربت، بیماری اور جنگ، غور کیجیے تو تمام مصائب و شدائد کے سرچشمے یہی تین ہیں۔[1]

اوپر عہد الٰہی کو از سر نو استوار کرنے کے لیے بنی اسرائیل کو جن باتوں کا حکم دیا ہے یا جن سے روکا ہے ان کا اختیار کرنا یا ان سے بچنا نفس کے لیے نہایت شاق ہے اس وجہ سے وہ نسخہ بھی بتا دیا ہے جو اس مشکل کام کو آسان بنا سکتا ہے۔ یہ نسخہ صبر اور نماز کے دو جزوں پر مشتمل ہے۔ ان دو چیزوں کے اختیار کرنے سے نفس کے لیے یہ چڑھائی آسان ہو جاتی ہے۔ صبر کا تعلق اخلاق و کردار سے ہے اور نماز کا تعلق عبادات سے ہے۔ انسان کے اندر اگر مشکلات و موانع کے علی الرغم حق پر ڈٹے رہنے کی خصلت موجود نہ ہو تو وہ دنیا میں

---

[1] تفسیر سورہ والعصر مولانا فراہیؒ فصل ۲

کوئی اعلیٰ کام تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا، لیکن مشکلات و موانع کے علی الرغم کسی صحیح موقف پر ڈٹے رہنے کی خصلت انسان کے اندر آسانی سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ ریاضت سے پیدا ہوتی ہے جس کا طریقہ نماز ہے۔ آدمی اگر ایک صحیح راہ پر چلنے کا عزم کرلے اور اس پر چل کھڑا ہو اور ساتھ ہی برابر اپنے رب کو یاد رکھے اور اس سے مدد مانگتا رہے (جس کی بہترین شکل نماز ہے) تو اس کے عزم کی قوت ہزار گنی بڑھ جاتی ہے، کوئی مشکل سے مشکل حالت بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا ہونے نہیں دیتی، اگر حالات کی نزاکت سے آدمی کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا وہ تعلق جو نماز کے واسطہ سے قائم ہوتا ہے، اس کو گرنے سے بچا لیتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہاں صبر کا جو حکم دیا ہے وہ اس لیے دیا ہے کہ اس وصف کو پیدا کیے بغیر کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے عہد پر قائم نہیں رہ سکتی اور نماز کا حکم اس لیے دیا ہے کہ یہی چیز صبر کے پیدا کرنے، اس کو ترقی دینے اور اس کو درجۂ کمال تک پہنچانے کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ آگے ان آیات پر تدبر کے سلسلہ میں چونکہ اس مسئلہ پر ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے اس وجہ سے یہاں صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اگرچہ اس کو ہم نے اختیار نہیں کیا ہے لیکن ہے وہ نہایت لطیف۔ آگے ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ: اس ٹکڑے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وَإِنَّهَا میں ھَا کا مرجع کیا ہے؟ مجاہد کے نزدیک اس کا مرجع صلوٰۃ ہے۔ اسی قول کو امام ابن جریر نے ترجیح دی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ نماز نفس پر بہت بھاری ہے۔ صرف وہی لوگ اس بارگراں کو اٹھا سکتے ہیں جن کے اندر خدا کا خوف ہو اور جن کے دل آخرت کی بازپرس کے ڈر سے ہر وقت خدا کے آگے جھکے رہتے ہوں۔ وَإِنَّهَا میں ضمیر کا مرجع

دوسرا قول یہ ہے کہ اس کا مرجع وہ ہدایت و نصیحت ہے جو پچھلے جملہ میں مذکور ہوئی ہے۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ پہلے قول کے حق میں ہیں اور اس کی تائید میں انھوں نے چند دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں صبر کو نظر انداز کر کے صرف نماز کے بھاری اور مشکل ہونے کے ذکر کرنے کی تین وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ صبر کا شاق اور گراں ہونا بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی مثال میں وہ آیت وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ[1] پیش کرتے ہیں کہ اس میں یہ فرمایا کہ اللہ صابروں کے ساتھ ہے، یہ نہیں فرمایا کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز میں اللہ تعالیٰ کی معیت کا حاصل ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح صبر کا مشقت طلب ہونا چونکہ واضح تھا اس وجہ سے اس کا ذکر نہیں کیا، صرف نماز کا ذکر کیا۔

---

[1] مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ سے، بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ (۱۵۳۔ بقرہ)

دوسری وجہ یہ ہے کہ صبر نماز کے لازمی شرائط میں سے ہے۔ صرف وہی لوگ نماز پر قائم رہ سکتے ہیں جن کے اندر صبر کی خصلت موجود ہے۔ نماز کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جب یہ بات کہہ دی گئی کہ نماز ایک بھاری اور مشکل چیز ہے تو گویا اس کے بھاری اور مشکل ہونے کے پہلو کی طرف خود بخود اشارہ ہوگیا، کہ یہ اس وجہ سے بھاری اور مشکل ہے کہ اس کے لیے صبر درکار ہے۔ اس اشارہ نے صبر کے تصریح کے ساتھ ذکر کرنے کی ضرورت سے مستغنی کر دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ صبر کا ایک سخت چیز ہونا چونکہ واضح ہے اس وجہ سے اس کی سختی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا حکم دینا مخاطب کی طبیعت پر گراں گزرتا اس وجہ سے اس کی سختی کا حوالہ نہیں دیا، صرف نماز کی سختی کا حوالہ دیا جو بظاہر ایک آسان چیز ہے۔

یہ نکتے اگرچہ نہایت لطیف ہیں اور ان سے زیر بحث آیت کے بعض نہایت اہم گوشے روشنی میں آتے ہیں لیکن میرا اپنا رجحان دوسرے قول کی طرف ہے۔ یعنی "ھا" کا مرجع میرے نزدیک صبر و صلوٰۃ سے استعانت کی وہ تلقین ہے جو اوپر والے ٹکڑے میں وارد ہوئی ہے۔ عربی زبان اور قرآن مجید میں اس اسلوب بیان کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ہم قرآن مجید سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرمایا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۔ (۸۰۔ قصص)

اور جن لوگوں کو علم عطا ہوا تھا انھوں نے کہا، تمہارا برا ہو، اللہ کا اجر ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے لیکن ایمان اور عمل صالح کا مرتبہ نہیں عطا ہوتا مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہوں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ه وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ه (۳۴-۳۵۔ حم سجدہ)

اور بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہوسکتیں، تم ان کی برائی کو بھلائی سے دفع کرو تو تم دیکھو گے کہ جس کے درمیان اور تمہارے درمیان شدید عداوت ہے، وہ تمہارا سرگرم حامی بن گیا ہے اور یہ حکمت نہیں عطا ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کریں اور یہ دانش نہیں ملتی مگر نصیبہ وروں کو۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ ای وما یلقی ھٰذہ الوصیۃ الا الذین صبروا وما یلقاھا ای یوتاھا ویلھمھا الا ذوحظ عظیم (یعنی یہ ہدایت نہیں عطا ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہوں وما یلقٰھا کے معنی ہیں کہ یہ ہدایت نہیں ملتی یا نہیں الہام ہوتی مگر ان کو جو بڑے

نصیب والے ہوں)

اس قول کو اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں "ھا" کی ضمیر کا تعلق صرف نماز سے نہیں رہ جاتا بلکہ صبر اور نماز دونوں سے ہو جاتا ہے۔ یہ بات عربی زبان کے قواعد کے بھی مطابق ہے اور اصل حقیقت کے بھی، کیوں کہ نفس پر شاق درحقیقت یہ دونوں ہی چیزیں ہیں۔ صبر کے مشکل ہونے میں تو کسی کو کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ نماز بھی مداومت اور پابندی کی شرط کے ساتھ اتنی سخت چیز بن جاتی ہے کہ اہل توفیق ہی ہیں جو اس کو نباہ سکتے ہیں۔

لَكَبِيرَةٌ۔ کبیرۃ کے معنی یہاں بھاری، ثقیل اور شاق کے ہیں۔ قرآن مجید میں دوسرے مواقع پر یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ (۱۴۳۔ بقرہ) (بے شک بھاری چیز ہے مگر ان کے لیے جن کو خدا ہدایت دے دے) وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ (۳۵۔ انعام) (اور اگر ان کا اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے)

خشوع کا مفہوم

إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ، خشوع کی اصل حقیقت پستی اور فروتنی اور عجز و تذلل ہے۔ آواز پست ہو تو یہ لفظ اس کے لیے بھی بولا جائے گا، نگاہ جھکی ہوئی ہو تو اس کے لیے بھی بولا جائے گا۔ اونٹ کا کوہان لاغری کے سبب سے بیٹھ جائے تو اس کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہو گا۔

اوپر عہد الٰہی پر استوار رہنے کے لیے صبر اور نماز سے استعانت کی جو نصیحت کی گئی ہے اس کے متعلق یہ فرمایا گیا کہ یہ راہ سہل انھی کے لیے ہے جن میں خشوع ہو، جو خدا سے ڈرنے والے ہوں، جو غرور و سرکشی کی بیماری سے پاک ہوں اور جن کے دل خدا کے حضور جواب دہی کے تصور سے ہر وقت اندیشہ ناک رہتے ہوں۔ وہ لوگ اس راہ پر نہیں چل سکتے جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہوں، جو قومی اور نسلی غرور کے گھمنڈ میں مبتلا ہوں اور جو خدا اور آخرت سے زیادہ اپنی امارت و سیادت کی ساکھ جمائے رکھنے کی فکروں میں مبتلا ہوں۔

یہ خشوع صبر اور نماز دونوں کی بنیاد ہے۔ صبر سے یہاں مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ہر طرح کے مصائب و شدائد اور ہر قسم کے ایذا و استخفاف کے باوجود خدا کے عہد پر جمے رہنا ہے اور یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل پر خدا کی ایسی ہیبت و عظمت طاری ہو کہ اس کے مقابل میں ہر مصیبت و ذلت اس کو اَہون معلوم ہوتی ہو۔

اسی طرح نماز کے متعلق ہر صاحب علم پر یہ حقیقت واضح ہے کہ اس کی بنیاد ہی خشوع و خضوع پر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے۔ مثلاً:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ (۱-۲۔ مومنون)

ان مومنون نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں۔

دوسرے مقام میں ہے:

وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا | وہ ہمیں پکارتے ہیں امید وبیم کے ساتھ اور وہ ہم
خَاشِعِينَ (۹۰-انبیاء) | عاجزی کرنے والے ہیں۔

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (۴۶)

لفظ ظن کی تحقیق

آدمی کسی چیز کے متعلق اس کے دیکھے بغیر جو رائے قائم کرتا ہے اس کو ظن کہتے ہیں۔ اس طرح کی رائے پر بالعموم چونکہ یقین نہیں ہوا کرتا اس وجہ سے ظن کا لفظ کچھ شک کے ہم معنی سا بن گیا ہے۔ چناں چہ عربی زبان اور قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں بہت استعمال ہوا ہے۔ طرفہ کا مشہور شعر ہے۔

واعلم علماً ليس بالظن انه | اذا ذل مولى المرء فهو ذليل

(میں ایک بات جانتا ہوں جو محض گمان نہیں ہے کہ جب آدمی کا چچازاد بھائی ذلیل ہو جائے تو وہ خود بھی ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے)

اسی طرح قرآن مجید میں ہے اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (۳۲-جاثیہ) (ہم محض ایک گمان کر رہے ہیں اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں)

لیکن ایک بن دیکھی چیز کے متعلق جو رائے قائم کی جاتی ہے ضروری نہیں کہ وہ مشکوک ہی ہو۔ بسا اوقات یہ رائے یقین پر مبنی ہوتی ہے لیکن ظن کا لفظ اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ ظن کا یہ استعمال اس کے عام معنی کے لحاظ سے ہوتا ہے، اس میں شک کا مفہوم مضمر نہیں ہوتا۔ اوس بن حجر کا ایک شعر ہے:

الالمعی الذی یظن بك الظن | کان قد رای وقد سمعا

(وہ ذہین کہ اگر تمھارے بارے میں کوئی گمان بھی کرے تو معلوم ہوتا ہے دیکھ کر اور سن کر کرتا ہے)

درید بن صمہ کہتا ہے:۔

فقلت لهم ظنوا بالفی مدجج | سراتهم فی الفارسی المسرد

(میں نے ان سے کہا کہ دو ہزار سلاح پوش سواروں کا یقین کرو جن کے سردار باریک کڑیوں کی زرہیں پہنے ہوں گے)

یہ خاشعین کی مزید تعریف ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے اور اپنے رب سے ملنے کا گمان رکھتے ہیں، آخرت سے بے پروا اور بے فکر نہیں ہیں۔

خاشعین کی تعریف میں یہ بات ان کے باطن پر روشنی ڈالتی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے اوپر عجز و مسکنت اور پستی و فروتنی کی جو حالت طاری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں آخرت کا خوف اور خدا کے سامنے حاضری کا ڈر سمایا ہوا ہے۔

خاشعین کی اس باطنی حالت کی تعبیر کے لیے ظن کے لفظ کے استعمال میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ یہ لفظ اندیشہ اور گمان غالب سے لے کر یقین اور قطعیت تک کی حالت کی تعبیر کے لیے کافی ہے اور آخرت کا معاملہ ایک ایسا اہم معاملہ ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی کو جب اس کے بارہ میں یقین حاصل ہو جائے تب ہی اس کے لیے تیاری کرے، بلکہ اس کا اندیشہ اور گمان بھی اس بات کے لیے کافی ہے کہ آدمی اس

کے لیے تیار رہے سو ایک عظیم بند جس کے ٹوٹ جانے سے پورے شہر کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہو ہماری توجہ کا طالب صرف اسی وقت نہیں ہوتا جب کہ پانی اس کی دیواروں میں دراڑیں پیدا کر دے بلکہ اس کے ٹوٹنے کے ہولناک اندیشہ کے پیش نظر اس وقت بھی اس کی حفاظت کا اہتمام ہوتا ہے جب کہ وہ بظاہر بالکل محفوظ ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے سے خطرے کے معاملہ میں جب انسان کی پیش بینی کا یہ حال ہے تو آخر مرنے کے بعد کی زندگی اور آخرت کے معاملہ میں، جس کا تعلق ایک ابدی زندگی سے ہے، وہ اتنا بے حس اور بلید کیوں ہو جائے کہ اس کے تمام آثار و علامات سے آنکھیں بند کیے ہوئے رہے اور اس وقت تک اس کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہ سمجھے جب تک اس کو اس کا پورا پورا یقین نہ ہو جائے۔

وَاَنَّهُمۡ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ: "اور یہ کہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں" کے الفاظ بیک وقت توحید اور تفویض کی دو حقیقتوں کو ظاہر کر رہے ہیں۔

توحید کا پہلو یہ ہے کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آخرت میں سارے معاملات صرف اللّٰہ وحدہٗ لاشریک کے سامنے پیش ہوں گے، وہی جزا اور سزا دے گا، اور وہ جو کچھ دے گا پورے عدل و انصاف کے ساتھ دے گا، کسی دوسرے کی مجال نہ ہو گی کہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے یا اس کے غضب سے بچا سکے۔ یہ مضمون اِلَيۡهِ کی تقدیم سے پیدا ہوتا ہے اور اس توحید کا حوالہ یہاں اس لیے ضروری ہوا کہ اگر عقیدۂ شرک کا کوئی شائبہ دل میں موجود رہے تو خدا کی ملاقات کا عقیدہ بالکل بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ مشرک یہ سمجھتا ہے کہ اوّل تو خدا اپنے شرکا کے لحاظ میں اس کے اوپر ہاتھ ہی نہیں ڈالے گا اور اگر ڈالے گا تو اس کے شرکا اس کو اپنی سعی و سفارش سے بچا لیں گے۔

تفویض کا پہلو یہ ہے کہ اللّٰہ کے عہد بندگی پر قائم رہنے والوں کو جو مشکلیں اور اذیتیں پیش آتی ہیں وہ ہر چیز کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے ہیں اس لیے کہ انھیں یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ جس کی راہ میں یہ سب کچھ جھیل رہے ہیں، ہر قدم پر اسی کی طرف بڑھ رہے ہیں، پھر جب آگے وہ ہے جس کی طلب ہے تو پیچھے کے اس سارے شور و غوغا کی کیا پروا۔

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

۲۸۔ مجموعۂ آیات ۴۰۔۴۶ میں مطالب کی ترتیب

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت کے بعد اب ہم مختصر طور پر یہ بتائیں گے کہ مذکورہ بالا مجموعۂ آیات میں مطالب کی ترتیب کیا ہے تاکہ کلام کا نظم بھی واضح ہو جائے اور ہر بات کی دلیل بھی سامنے آ جائے۔

اس مجموعۂ آیات میں پہلے بنی اسرائیل کو تین چیزوں کی یاد دہانی کی گئی ہے۔

ایک اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو انعامات فرمائے ہیں ان کو وہ یاد رکھیں۔ ان کو بھول نہ جائیں۔ یہ انعامات اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان پر ہوئے ہیں، ان کے ذاتی یا خاندانی استحقاق کا نتیجہ نہیں ہیں جن پر وہ آبائی وراثت کی حیثیت سے قابض رہیں۔

دوسری اس بات کی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا ہے اس کو وہ پورا کریں۔ وہ اس عہد کو پورا کریں گے تو اللہ تعالیٰ وہ عہد پورا کرے گا جو اس نے ان سے کیا ہے۔

تیسری اس بات کی کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ڈریں، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہ ڈریں۔

قرآن پر ایمان لانے کی دعوت تین پہلوؤں سے

ان تینوں باتوں کی یاد دہانی کرنے کے بعد ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور یہ دعوت درحقیقت انھی تینوں چیزوں پر مبنی ہے جن کی اوپر یاد دہانی کی گئی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:۔

انعام کے پہلو سے ان کے لیے قرآن پر ایمان لانا اس لیے ضروری قرار دیا کہ ان کو جو ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا ہوئی تھیں قرآن کے ذریعہ سے انہی نعمتوں کی تکمیل ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی شکل میں ان پر آخری فضل فرمایا۔ اور اس فضل کا اس کے ظہور سے پہلے ہی اس نے وعدہ بھی فرمایا تھا تاکہ بنی اسرائیل اس سے بے خبر اور ناآشنا نہ رہیں بلکہ اس سے آشنا اور اس کے منتظر رہیں تاکہ جب یہ نعمت نازل ہو تو خود بھی اس کو بڑھ کر قبول کریں اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں، چنانچہ جب یہ موعود نعمت نازل ہوئی تو ان کو دعوت دی گئی کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کریں۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو یہ سب سے بڑا کفرانِ نعمت ہوگا جس کے وہ مرتکب ہوں گے اور اس کے بعد وہ اپنے لیے امید کا آخری دروازہ بھی بند کرلیں گے۔

عہد کے پہلو سے اس دعوت کو قبول کرنا اس لیے ضروری ٹھہرا کہ اس کتاب اور اس نبی پر ایمان لانے کا بنی اسرائیل سے تورات میں عہد لیا جا چکا تھا۔ اب اس کتاب اور اس پیغمبر پر ایمان نہ لانے کے معنی یہ تھے کہ انھوں نے محض محبتِ دنیا میں پھنس کر اس عہد کو توڑ دیا جو وہ اپنے رب کے ساتھ باندھ چکے تھے۔

خشیتِ الٰہی کے پہلو سے اس دعوت پر ایمان لانا اس لیے ضروری ٹھہرایا کہ ان واضح تصریحات اور ان قطعی عہود کے باوجود جو تورات میں موجود ہیں بنی اسرائیل کی طرف سے اس دعوت کی تکذیب اور مخالفت کی راہ میں پیش قدمی ایک ایسی جسارت تھی جو خدا کے غضب کو دعوت دینے والی تھی۔ قرآن نے ان کو تنبیہ کیا کہ ان موہوم اندیشوں کے لیے جو اس دعوت کے قبول کر لینے کی صورت میں نظر آتے ہیں خدا کے اس حتمی عذاب سے بے پروا نہیں ہو جانا چاہیے جو اس دعوت کی تکذیب کی صورت میں لازماً نازل ہو کر رہے گا۔

اس عام یاد دہانی اور دعوت کے بعد خاص طور پر ان کے علماء اور لیڈروں کو مخاطب کر کے یہ تنبیہ فرمائی کہ جانتے بوجھتے اور کتاب و شریعت کا علم رکھتے ہوئے اپنی قوم کو گمراہ کرنے کے لیے حق اور باطل کو گڈمڈ کرنے اور حق کو چھپانے کا وہ کاروبار انھیں نہیں کرنا چاہیے جس میں وہ اس وقت پوری سرگرمی کے ساتھ مصروف ہیں۔ انھیں کتاب و شریعت کا جو علم ملا ہے اس کا اصلی حق یہ ہے کہ وہ اس کی روشنی میں اپنے عوام کی صراطِ مستقیم کی

طرف رہنمائی کریں نہ کہ اس منصب سے غلط فائدہ اٹھا کر ان کو اندھا بنانے کے لیے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکیں۔

عوام اور خواص دونوں طبقات کے اس بگاڑ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بالترتیب مذکورہ دونوں خرابیوں کا علاج بھی بتایا۔

پہلے اس عام خرابی کو لیا ہے جو کفرانِ نعمت، نقضِ عہدِ الٰہی اور خدا سے بے خوفی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ان تینوں بیماریوں کے علاج کے لیے بنی اسرائیل کو تین باتوں کا حکم دیا۔ نماز، زکوٰۃ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کا۔

نماز کا حکم اس لیے دیا کہ وہ ذکر و شکر کا مجموعہ اور ان تمام عہود کا سرنامہ ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوئے ہیں، اس کے اہتمام سے ان تمام چیزوں کی زندگی کی راہ کھل جاتی ہے جن پر شریعتِ الٰہی قائم ہے۔ نماز کی اس حقیقت کی طرف ہم اس سورہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے اشارات کر چکے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

زکوٰۃ کا حکم اس لیے دیا کہ یہی اس مرضِ بخالت اور اس محبتِ دنیا کا علاج ہے جس کے سبب سے یہود اللہ تعالیٰ کا پیمان توڑنے اور خدا کی شریعت کو دنیا کی متاعِ قلیل کے عوض فروخت کرنے پر آمادہ ہوئے۔ یہود پر اس مرض کا جس قدر غلبہ تھا اس کا اندازہ قرآن مجید کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَإِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا أُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ۝

(۷۵-۷۷ آل عمران)

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے پاس ایک دینار کی بھی امانت رکھو تو وہ اس کو ادا کرنے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر نہ سوار ہو جاؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں کے معاملہ میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے، وہ جانتے بوجھتے اللہ پر یہ افترا باندھتے ہیں۔ اللہ کا معاملہ تو یوں ہے کہ جو اس کے عہد کو پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے تو اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے حقیر قیمت لے رہے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اللہ ان سے قیامت کے روز بات نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کا حکم[1] اس لیے دیا کہ عام نمازیوں کے ساتھ نمازوں کی حاضری ان کے کبر و نخوت کو توڑے، ان کے اندر خاکساری اور تواضع پیدا کرے اور یہ خاکساری و تواضع ان کے لیے آخری بعثت پر ایمان لانے کی راہ کھولے جس پر ایمان لانے میں ان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہ غرور تھا کہ وہ اسرائیل کے برتر گھرانے سے ہو کر امیوں کے اندر سے اٹھنے والے ایک رسول پر کس طرح ایمان لائیں۔

یہود کے عام بگاڑ کا علاج بتانے کے بعد ان کے علما کی طرف توجہ فرمائی اور ان کا مرض یہ بتایا کہ وہ عوام کو تو نیکی اور دینداری کی تلقین کرتے ہیں لیکن اس تلقین کے وقت وہ خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ حالاں کہ نیکی اور دینداری کی ان باتوں کے جتنے مخاطب عوام ہیں اس سے زیادہ ان کے مخاطب یہ خود ہیں، اس لیے کہ کتابِ الٰہی کے اسرار و رموز سمجھنے اور جاننے والے یہی ہیں۔ اگر یہ اپنے آپ کو بھی اسی طرح خدا ترس اور خدا کے حقوق و فرائض کو پہچاننے والا بنالیں جس طرح یہ عوام کو بنانا چاہتے ہیں تو چشم زدن میں لوگوں کے لیے قبولِ اسلام کی راہ کی ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں اس لیے کہ یہ ساری رکاوٹیں انھی کی پیدا کی ہوئی ہیں، کسی اور کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان نصیحت کرنے والوں کے خود اپنے کان بالکل بہرے واقع ہوئے ہیں۔

ان تنبیہات و ہدایات کے بعد وہ طریقہ بتایا ہے جس کو اختیار کر کے بنی اسرائیل اس آخری بعثت پر ایمان لانے کے مشکل کام کو اپنے لیے آسان بنا سکتے تھے۔ وہ طریقہ صبر اور نماز کا طریقہ ہے۔ فرمایا کہ اگر اپنی خواہشات و بدعات کو چھوڑ کر اور اپنی جمی جمائی سیادت و امارت سے دستکش ہو کر قرآن پر ایمان لانا مشکل معلوم ہوتا ہے تو اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ یہ دونوں سہارے اس چڑھائی کو آسان بنائیں گے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے کی فصلوں میں آئے گی۔

۲۹- دین میں نماز کی اہمیّت

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نماز کا ذکر یکے بعد دیگرے دو مرتبہ آیا ہے۔ پہلے فرمایا وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ) (۴۳) پھر ایک ہی آیت کے بعد فرمایا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ

---

[1] کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ وارکعوا مع الراکعین میں یہود کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اللہ کے جو بندے آج اللہ کی بندگی کی دعوت لے کر اٹھے ہیں اور اجتماعی شکل میں اس کی عبادت کر رہے ہیں اس عبادت کے خلاف مہم چلانے کے بجائے تم بھی اس عبادت میں شریک ہو جاؤ۔ اگر اس کا یہ مطلب لے لیا جائے تو یہ ٹکڑا گویا دوسرے الفاظ میں اسی دعوت کا اعادہ ہے جو اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کے الفاظ سے بنی اسرائیل کو دی گئی ہے۔

(اور مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ سے اور یہ چیزیں بھاری ہیں مگر ان لوگوں پر جو خدا سے ڈرنے والے ہیں ۴۵)

نماز کا ذکر دو مختلف پہلوؤں سے

ظاہر ہے کہ ان دونوں مواقع پر نماز کا ذکر دو مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے۔ پہلے موقع پر اس کا ذکر اس پہلو سے ہوا ہے کہ ایمان باللہ اور اقرار توحید کے بعد یہی اس عہد و میثاق کی پہلی دفعہ کی حیثیت رکھتی ہے جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ اور دوسرے موقع پر اس پہلو سے ہوا ہے کہ یہی چیز درحقیقت تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ، سب کی کلید، سب کی مددگار، اور سب کے حصول کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ گویا یوں سمجھیے کہ شریعت کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے اور پھر شریعت کا قیام و بقا بھی اسی پر منحصر ہے پہلے مرحلہ میں اس کا لازمہ زکوٰۃ ہے۔ دوسرے مرحلہ میں اس کا ساتھی صبر ہے۔ دین جب عقیدہ سے نکل کر عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کا اوّلین قدم یہی ہوتا ہے اور پھر دین کی اقامت اور عہدِ الٰہی کی تجدید کے لیے جو جدّوجہد عمل میں آتی ہے اس میں بھی اوّلین اہمیت اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی اس اہمیت کے سبب سے ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دونوں پہلوؤں پر بالاجمال گفتگو کریں۔ اس فصل میں اس پر پہلے نقطۂ نظر سے گفتگو کریں گے، اس کے بعد مستقل عنوان سے اس کے دوسرے پہلو کی وضاحت کریں گے۔

احکامِ شریعت کی بنا نماز اور زکوٰۃ پر ہے

ساتویں فصل میں ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ تمام احکام شریعت کی بنیاد درحقیقت نماز اور زکوٰۃ پر ہے۔ نماز ان تمام احکام کا سرچشمہ ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور زکوٰۃ ان تمام احکام کا منبع ہے جو حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ یہاں موقع کے اقتضا سے ہم چند ایسی آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان جو عہد و پیمان ہوا ہے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اس میں جس چیز کو حاصل ہے وہ نماز ہے۔ بنی اسرائیل کے میثاق کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ	اور یاد کرو جب کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا
وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا	اور اٹھائے ان میں سے بارہ نقیب اور اللہ نے کہا کہ
وَقَالَ اللّٰهُ إِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ	میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرتے رہوگے
وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ	اور زکوٰۃ دیتے رہوگے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے
وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ	اور ان کی مدد کروگے اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہوگے
قَرْضًا حَسَنًا لَّأُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ	اگر تم یہ سب کچھ کرتے رہوگے تو میں تمہارے گناہ
سَيِّاٰتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	تمہارے اوپر سے جھاڑ دوں گا اور تم کو ایسے باغوں
مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ	میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری
ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ	ہوں گی، لیکن جس نے اس عہد کے بعد تم میں سے
السَّبِيْلِ (۱۲- مائدہ ۵)	کفر کیا تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

یہ قرآن مجید نے اس عہد کا حوالہ دیا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ اس میں دیکھیے کہ پہلی چیز جس کا

ذکر آیا ہے وہ نماز کا قائم رکھنا ہے۔

اسی طرح جہاں بنی اسرائیل کے دورِ زوال و انحطاط کا ذکر کیا ہے وہاں سب سے پہلے ان کے اندر سے جس چیز کے غائب ہونے کا ذکر کیا ہے وہ نماز ہی ہے اور اسی کے غائب ہونے کا نتیجہ یہ بیان کیا ہے کہ وہ شہوات و خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ فرمایا۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا	پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئے جنھوں نے
الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ	نماز ضائع کر دی اور شہوات کے پیچھے پڑ گئے تو یہ
يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۹- مریم)	عنقریب ایک بڑی گمراہی سے دوچار ہوں گے۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عہدِ الٰہی پر قائم رہنے کے لیے پہلی چیز جو مطلوب ہے وہ نماز کا قائم رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ	جو کتابِ الٰہی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہیں اور
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ	جنھوں نے نماز قائم کی (تو وہی لوگ مصلح ہیں) اور ہم
الْمُصْلِحِيْنَ (۱۷۰- اعراف)	مصلحین کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کتاب اللہ یا بالفاظ دیگر عہدِ الٰہی پر قائم رہنا صرف ان لوگوں کے لیے ممکن ہے جو نماز کو قائم کرنے والے ہوں اور دوسری بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں اور لوگوں کو اس پر مضبوطی کے ساتھ جمائے رکھنے کے لیے نماز قائم کریں درحقیقت وہی لوگ ہیں جو اس زمین کی اصلاح کرنے والے ہیں اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی سعیِ اصلاح کا اجر پائیں گے۔

۳۰۔ صبر اور نماز اقامتِ دین کی جدّ و جہد میں وسیلۂ ظفر ہیں

نماز کی یہ اہمیت میثاقِ الٰہی کے پہلو سے بیان ہوئی ہے جس میں اس کے تابع کی حیثیت زکوٰۃ کو حاصل ہوئی ہے۔ اب ہم مختصر طور پر اقامتِ دین کی جدوجہد کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیں گے جس میں اس کے پہلو بہ پہلو صبر کا ذکر آتا ہے اور جس کی طرف وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کی زیرِ بحث آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد میں کامیابی کا انحصار صبر اور نماز پر

قرآن حکیم میں تدبر کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں کامیابی کا انحصار اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں پر رکھا ہے۔ ایک صبر پر اور دوسرے نماز پر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے اندر اقامتِ دین کی جو جدوجہد شروع کی اس میں اپنی قوم کو انہی دو چیزوں سے مدد حاصل کرنے کی تلقین کی۔ فرمایا۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا (۱۲۸۔ اعراف)

اور موسیٰؑ نے اپنی قوم کو نصیحت کی کہ اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔

اس آیت میں اگرچہ نماز کی بجائے اللہ کا لفظ آیا ہے لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا واحد ذریعہ نماز ہی ہے۔ چنانچہ دوسری آیات میں اس چیز کی تصریح کر دی گئی ہے۔

اسی طرح مسلمانوں نے جب اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد شروع کی اور اس راہ کی آزمائشوں سے انھیں سابقہ پیش آیا تو انھیں بھی صبر اور نماز ہی سے مدد حاصل کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (۱۵۳۔۱۵۷۔ بقرہ)

اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد چاہو، بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمھیں احساس نہیں ہوتا۔ اور ہم تمھیں آزمائیں گے کسی قدر خطرہ، بھوک اور مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے اور خوش خبری دو ان ثابت قدموں کو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کسی آزمائش سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ راہ یاب و بامراد ہونے والے ہیں۔

ٹھیک یہی تلقین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار مکی زندگی کے اس دور میں کی گئی ہے جب آپ نے اسلام کی دعوت بلند کی اور آپ کو ہر طرف سے مخالفوں اور معاندوں نے گھیر لیا۔ چنانچہ مکی سورتوں میں کفار و مشرکین کی مخالفت کے ذکر کے بعد بالعموم آپ کو ثابت قدم رہنے اور ساتھ ہی نماز پڑھنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس کی مثالیں اکثر سورتوں میں مل سکتی ہیں۔ ہم بخیالِ اختصار صرف چند آیتوں کا حوالہ دیتے ہیں۔

فرمایا۔

فَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (۱۳۰۔ طٰہٰ)

پس جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے۔

فَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ

پس صبر کرو ان باتوں پر جو یہ کہتے ہیں اور اپنے

بِحَمْدِ رَبِّكَ (۳۹-ق) رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا اور ثابت قدم رہو اپنے رب کے فیصلہ تک۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ بے شک تم ہماری نگاہوں میں ہو اور اپنے رب کی حمد

تَقُومُ ﴿۴۸ - طور﴾ کے ساتھ اس کی تسبیح کرو جس وقت تم اٹھتے ہو۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ صبر اور نماز یہ دو ہتھیار ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حق و باطل کی کشمکش میں باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے دیے ہیں اور اگر ان دونوں کی فطرت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ دونوں باہم دگر ایک دوسرے کو غذا اور قوت بہم پہنچاتے ہیں۔ صبر سے نماز کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور نماز سے صبر کو غذا اور قوت ملتی ہے۔ نماز جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے، بڑی صبر طلب چیز ہے۔ جب تک کسی شخص میں صبر کی پختہ صفت موجود نہ ہو اس وقت تک وہ نماز کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتا[1] اس پہلو سے صبر نماز کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اسی طرح صبر جس کی اصل حقیقت زندگی کے مراحل میں موقفِ حق پر ڈٹے رہنا ہے، کسی مضبوط سہارے کے بغیر انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ مضبوط سہارا اگر کوئی ہو سکتا ہے تو خدا ہی کا سہارا ہو سکتا ہے جو سب سے بہتر طریقہ پر نماز کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ (ثابت قدم رہو اور تمہارا ثابت قدم رہنا ممکن نہیں ہے مگر اللہ ہی کے سہارے سے) (۱۲۷، نحل)

مشکلات و مصائب کے مقابل میں اپنے موقف پر جمے رہنا، حوصلہ کو پست نہ ہونے دینا، ایک نہایت اعلیٰ وصف ہے جس کے بغیر نہ کسی فرد کی زندگی سنورتی ہے اور نہ کسی قوم کی زندگی بنتی ہے اس وجہ سے قومیں اپنے افراد کے اندر اس چیز کو پیدا کرنے کے لیے مختلف قسم کی تدبیریں اختیار کرتی ہیں۔ اس زمانے میں سب سے بہتر نسخہ اس کی تربیت کے لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ افراد کے اندر شہرت و ناموری کے جذبہ کو ابھارا جائے یا قومی عزت و ناموس وطن کی رگ حمیت کو چھیڑا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک قسم کی گرمی دلوں کے اندر ان چیزوں سے بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن ان کا پیدا کیا ہوا نشہ شراب کے نشہ کی طرح عارضی اور ناعاقبت اندیشانہ ہوتا ہے۔ برعکس اس کے مذہب انسان کے عزم و حوصلہ کی تربیت اس طرح کرتا ہے کہ ایک طرف اس کی زندگی کے ہر مرحلے

---

[1] استاذ امامؒ کا خیال تو یہ ہے کہ اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ میں اصل مقصود نماز پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانے کی تاکید ہے۔ اس کے ساتھ صبر کا ذکر جو آیا ہے وہ محض اس لیے کہ اس کی حیثیت نماز کے لیے شرط اور ذریعہ کی ہے کیوں کہ نماز پر استقلال کے ساتھ جمے رہنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ نماز کی مثال مولانا کے نزدیک ایک عظیم پل کی ہے جس کی تعمیر صرف ایک محکم بنیاد ہی پر ممکن ہے۔ مولاناؒ کا استدلال وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر جم جاؤ ۱۳۲ - طٰہٰ) اور اس مضمون کی بعض دوسری آیات سے ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر ذرا اس سے مختلف ہے۔

یہ ایک موقف حق معیّن کر دیتا ہے اور اس پر ڈٹ جانے کی تاکید کرتا ہے دوسری طرف اس کو نماز کے واسطے سے آسمان و زمین کی سب سے بڑی طاقت سے جوڑ کر اس کو زندگی کا یہ ملکوتی نصب العین دے دیتا ہے کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (کہہ دو، میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ ۱۶۲- انعام) غور کیجیے کہ حق پر استوار رہنے اور باطل سے نبرد آزما ہونے کے لیے جو روح اس تربیت سے پیدا ہو سکتی ہے، وہ تمغے اور انعامات کی لالچ اور حب قومی و وطنی کے کھوکھلے نعروں سے پیدا ہو سکتی ہے؟

یہاں ایک لطیف نکتہ اور بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ جہاں جہاں نماز کا ذکر اقامت دین کی جدوجہد کے وسیلہ یا ہتھیار کی حیثیت سے ہوا ہے وہاں اوّل تو اس کے ساتھ صبر کا ذکر ضرور ہوا ہے ثانیاً صبر کا ذکر ہر جگہ نماز پر مقدم ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق کو قائم کرنے اور باطل کو شکست دینے کی جدوجہد میں مقدم شے جو مطلوب ہے وہ مردانہ اقدام اور راہ حق میں عزیمت و استقامت ہے۔ آدمی اگر اپنے اس جوہر کو نمایاں کرے اور ساتھ ہی نماز کا اہتمام کرے تو اس کے اس جوہر کو جلا ملتی ہے اور راہ حق کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کا سینہ کھلتا اور اس کا دل ایمان و یقین سے لبریز ہوتا ہے، لیکن آدمی اگر اپنے ارادے اور عزم کو کوئی حرکت نہ دے، صرف کسی حجرے میں بیٹھا ہوا اللہ ہو کا ورد کرتا ہے تو یہ نماز زیر بحث مقصد کے لیے بالکل غیر مفید ہے۔

۳۱- مجموعۂ آیات ۴۰-۴۶ کی ایک خاص تعلیم اصلاح ملت کے نقطۂ نظر سے

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات سے جو تمام تعلیمات و ہدایات نکلتی ہیں بقدر ضرورت ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔ اب ہم ایک خاص حقیقت کی طرف توجہ دلائیں گے جو انہی آیات سے نکلتی ہے اور اصلاح امت کے نقطۂ نظر سے جس کی بڑی اہمیت ہے۔

اوپر کی فصلوں میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ نماز کو میثاق خداوندی کے اندر ایمان کے بعد اولین اہمیت حاصل ہے اور یہ بات بھی بیان ہو چکی ہے کہ میثاق خداوندی کی تجدید کی جدوجہد میں بھی نماز ہی درحقیقت روح اور وسیلۂ ظفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں اعراف کی آیت ۱۷۰ اَلَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ کی روشنی میں ہم یہ بات بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ کتاب اللہ کو جو اصل میثاق ہے، پوری مضبوطی سے تھاما جائے، اس پر خود قائم ہو کر دوسروں کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور کسی حال میں بھی یہ حبل اللہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ دی جائے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے اولین عہد کی حیثیت سے بھی اور وسیلۂ ظفر اور ذریعہ کامیابی ہونے کے پہلو سے بھی نماز کے قائم کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ قرآن کے نزدیک یہی اصلاح کا راستہ ہے اور جو لوگ یہ راستہ اختیار کریں وہی لوگ ملت کے حقیقی مصلح ہیں جن کا اجر اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرے گا۔

قرآن حکیم کا یہ بیان تجدید دین و اصلاح ملت کی تمام تحریکات اور تمام دعوتوں کے جانچنے کے لیے ایک کسوٹی فراہم کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہ دعوت یا تحریک اصلاح ملت کی صحیح دعوت یا تحریک ہے جس کے مبداء و معاد، جس کی ابتدا اور انتہا، جس کے عقیدہ اور عمل، جس کے نصب العین اور پروگرام دونوں میں نماز اور اقامتِ نماز کو وہی اولیت و اہمیت حاصل ہو جو اللہ کے عہد اور اس کی اقامت کی جدوجہد میں فی الواقع از روئے قرآن اس کو حاصل ہے۔ جس دعوت یا تحریک میں نماز کو یہ اولیت و اہمیت حاصل نہ ہو وہ تجدید دین اور اصلاحِ ملت کے نقطہ نظر سے ایک بے برکت بلکہ لاحاصل کام ہے، کیوں کہ وہ اس ریڑھ کی ہڈی سے بھی محروم ہے جس پر تجدیدِ دین کی دعوت کا قالب کھڑا ہوتا ہے اور اس روح سے بھی محروم ہے جس سے اس قالب کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔

۳۴۔ آگے کا مضمون —— آیات ۴۷-۶۲

آگے یہود کو از سرِ نو مخاطب کر کے پہلے تو ایک مختصر تمہید میں ان کو اس بات کی یاددہانی کی گئی ہے کہ فضیلت و بزرگی تمہیں جو کچھ بھی حاصل ہوئی ہے محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوئی ہے۔ اس میں نہ تو تمہارے استحقاق کو کوئی دخل ہے، نہ تمہارے خاندانی شرف کو۔ اس وجہ سے اس قسم کے کسی وہم یا گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اس دعوتِ حق سے منہ نہ موڑو جو تمہارے سامنے پیش کی گئی ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ ایک دن آنے والا ہے جس میں تمہیں اپنے اعمال کی خود ہی جواب دہی کرنی ہے انہمارے فرائض سے متعلق نہ تو دوسروں سے سوال ہوگا اور نہ دوسرے تمہاری طرف سے کوئی جواب دہی کریں گے۔

یہود کے سامنے تین حقیقتوں کی وضاحت

اس کے بعد بنی اسرائیل کی ابتدائی تاریخ کے چند اہم واقعات کے حوالے دے کر ان کے سامنے تین حقیقتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جتنے بھی انعامات کیے ہیں سب تمہاری ناشکریوں کے باوجود محض اپنے فضل و کرم سے کیے ہیں۔ تمہاری پوری تاریخ شاہد ہے کہ تم نے اپنی ناسپاسی اور ناشکری کے سبب سے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے لیکن اس نے تمہارے اس کفرانِ نعمت کے باوجود تم کو اپنے احسانات سے نوازا ہے۔ اس وجہ سے تمھیں اپنے تقدس و تقرب کا بہت زیادہ غرور نہیں ہونا چاہیئے۔

دوسری یہ کہ تم کو جو نعمت بھی خدا نے بخشی ذمہ داریوں اور فرائض کے ساتھ بخشی، خاندانی ورثہ کے طور پر نہیں بخشی، چنانچہ تمھاری تاریخ گواہ ہے کہ جب جب تم نے کسی نعمت کا حق ادا کرنے اور اس سے پیدا ہونے والی ذمہ داریاں پوری کرنے میں کوتاہی کی ہے تم پر مار بھی بڑی ہی سخت پڑی ہے۔

تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کو بھی کوئی شرف یا تقرب اس کے ذاتی یا خاندانی استحقاق یا کسی گروہ کے ساتھ نسبت رکھنے کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور عمل صالح کی بنا

پر حاصل ہوتا ہے۔

یہ سارا مضمون آیت ۴۷ سے شروع ہو کر آیت ۶۲ پر ختم ہوتا ہے اور مقصود اس ساری تفصیل سے بنی اسرائیل کی ان بیماریوں کو دور کرنا ہے جن کے سبب سے قرآن کی دعوت ان کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بن گئی تھی۔

اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ فرمایا:

آیات ۴۷ - ۶۲ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ
فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ
نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ
وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ
سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ
ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿٤٩﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ
وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٠﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى
اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾
ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا
مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿٥٣﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى
لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى
بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٥٤﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ
نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ
تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٦﴾

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ
نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ؑ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى ٦ ع ١٣ ٦
لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا
عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا
مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ
يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ
لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا
وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ
خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ
الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ؑ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ ٧ ع ٢ ٧
الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

ترجمہ آیات ۴۷ - ۶۲

اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا والوں پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ کام نہ آئے گی، نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوگی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔ ۴۷ - ۴۸

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم کو آل فرعون کے قبضہ سے چھڑایا۔ وہ تمھیں بُرے عذاب چکھاتے تھے۔ تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑی ہی آزمائش تھی۔ ۴۹

اور یاد کرو جب کہ ہم نے دریا کو پھاڑ کر تمھیں پار کرایا، پس تمھیں نجات دی اور آل فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے رہے۔ ۵۰

اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظلم کرنے والے ہو۔ پھر ہم نے تم سے درگزر کیا اس کے بعد تاکہ تم شکر گزار بنو۔ ۵۱ - ۵۲

اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور فرقان تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ ۵۳

اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو اور اپنے مجرموں کو اپنے ہاتھوں قتل کرو، یہ تمھارے لیے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے تو اس

نے تمھاری توبہ قبول فرمائی، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۵۴

اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا کہ اے موسیٰؑ، ہم تمھارا یقین کرنے والے نہیں ہیں، جب تک ہم خدا کو کھلم کھلا دیکھ نہ لیں تو تم کو کڑک نے آدبوچا اور تم دیکھتے رہ گئے۔ پھر ہم نے تمھاری موت کے بعد تمھیں اٹھایا تاکہ تم شکرگزار بنو۔ اور تم پر بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارے، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔ اور انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ ۵۵، ۵۷

اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا، داخل ہو جاؤ اس بستی میں، پس کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو فراغت کے ساتھ اور داخل ہو دروازے میں سر جھکائے ہوئے اور دعا کرو کہ اے رب! ہمارے گناہ بخش دے، ہم تمھارے گناہ بخش دیں گے اور اچھی طرح حکم بجا لانے والوں پر ہم مزید فضل کریں گے تو جنھوں نے ظلم کیا انھوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی دوسری بات سے پس ہم نے ان لوگوں پر جنھوں نے ظلم کیا ان کی نافرمانی کے سبب سے آسمان سے عذاب اتارا۔ ۵۸-۵۹

اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا اپنی لٹھیا پتھر پر مارو تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ متعین کر لیا۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور نہ بڑھو زمین میں فساد مچانے والے بن کر۔ ۶۰

اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا اے موسیٰ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے تو اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کرو کہ وہ ہمارے لیے ان چیزوں میں سے نکالے جو زمین اگاتی ہے اپنی سبزیوں، ککڑیوں، لہسن، مسور اور پیاز میں سے۔ کہا، کیا تم اعلیٰ کو ادنیٰ سے بدلنا چاہتے ہو، کسی شہر میں اترو تو وہ چیز تمھیں ملے گی جو تم نے طلب کی ہے اور ان پر ذلت اور پست ہمتی

تھوپ دی گئی اور وہ خدا کا غضب لے کر لوٹے۔ یہ اس سبب سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جانے والے تھے۔ ۶۱

بے شک جو ایمان لائے، جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی۔ ان میں سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اور جس نے عمل صالح کیا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور ان کے لیے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۶۲

۳۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (۴۷)

بنی اسرائیل کی فضیلت کی نوعیت

لفظ نعمت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ یہاں اس پر وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ کو عطف کیا ہے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر اس اجمال کی وضاحت کر رہا ہے جو نعمت کے لفظ کے اندر موجود ہے۔ اس فضیلت سے مراد قوموں کی ہدایت و رہنمائی کا وہ منصب ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک خاص دور میں منتخب فرمایا۔ جو فضیلت کسی منصب کی ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، وہ ایک مشروط فضیلت ہوتی ہے۔ اگر صاحبِ منصب قوم اس ذمہ داری کو ادا کرتی ہے تو یہ فضیلت اس کو حاصل رہتی ہے اور اگر اس کو چھوڑ بیٹھتی ہے تو صرف اس فضیلت ہی سے محروم نہیں ہو جاتی جو اسے بخشی گئی تھی بلکہ کفرانِ نعمت کی پاداش میں اس کو مزید براں ذلت بھی نصیب ہوتی ہے۔ یہاں بنی اسرائیل کو یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ جس فضیلت پر تمھیں ناز ہے وہ فضیلت خدا ہی کی عطا کردہ تھی، اگر اس کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو خدا کے عہد پر قائم رہو اور اس کا حق ادا کرو۔ خدا کے عہد سے نکل کر تم اس فضیلت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔

قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بنی اسرائیل کے منتخب کیے جانے کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:۔ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۳۲۔ دخان (اور ہم نے ان کو دنیا والوں کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا، دیکھ بھال کر) یہاں عَلٰى عِلْمٍ کے الفاظ سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ انتخاب کسی اندھے کا انتخاب نہیں تھا کہ جس پر ہاتھ پڑ گیا اس کو اس نے منتخب کر دیا۔ بلکہ یہ کام ایک صاحب علم و بصیرت نے کیا ہے جو اپنے علم و بصیرت سے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کب یہ اس منصب کے اہل ہیں اور کب نہیں ہیں۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۴۸)

جَزٰى عَنْهُ کے معنی ہیں، اس کی طرف سے ادا کر دیا، یا اس کی طرف سے کافی ہوگیا۔ لَا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا کے معنی ہوں گے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہ آسکے گا جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہوگی کوئی دوسرا اس کی طرف سے وہ ادا نہ کر سکے گا۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے مثلاً وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى[1] (اور کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا سکے گی) وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِىْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا[2] (اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی باپ اپنی اولاد کے کام نہ آسکے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کے کچھ کام آسکے گا) اس دن ہر ایک پر نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (۳۷-عبس)

'شفاعت' کا مفہوم

شفاعت، شفع سے ہے۔ شَفَعَ الشیءَ کے معنی ہیں، اس کے ساتھ اسی طرح کی چیز کو ملا کر اس کو جوڑا کر دیا۔ شفع لفلان یا شفع فیہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کی بات یا درخواست کے ساتھ کوئی شخص اپنی تائید یا سفارش ملا کر اس کو مؤید کر دے۔

عدل کے معنی انصاف کے ہیں۔ فرمایا اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ[3] (یہ کہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو) پھر یہیں سے یہ لفظ مساوی اور برابر کے معنی میں استعمال ہوا۔ فرمایا اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا[4] (یا اس کے برابر روزے) نیز فدیہ کے معنی میں استعمال ہوا کیوں کہ فدیہ جس کا فدیہ ہوتا ہے اس کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ، لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ، وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ میں عربی زبان کا وہ اسلوب ملحوظ ہے جس میں بظاہر تو ایک شے کے لازم کی نفی ہوتی ہے لیکن مقصود درحقیقت ملزوم کی نفی ہوتی ہے۔ امراء القیس نے اپنے ایک شعر میں ایک صحرائی راستہ کی تعریف کی ہے کہ لایھتدی بنارہ (اس کی برجیوں سے رستہ معلوم نہیں کیا جاتا) ظاہر ہے کہ اس طرز تعبیر سے اس کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اس صحرا میں رہنمائی کے لیے برجیاں اور منارے سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ اسی اسلوب پر یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دن نہ کوئی ان کے لیے شفاعت کرنے والا ہوگا، نہ کوئی شفاعت قبول ہوگی، نہ کسی کے پاس دینے کے لیے معاوضہ ہوگا، نہ کسی سے معاوضہ لیا جائے گا، نہ کسی کے حامی اور مددگار ہوں گے، نہ کسی کی حمایت و مدد کی جا سکے گی۔ یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان ہوئی ہے فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ[5] (پس ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہیں دے گی) اور پھر دوزخیوں کی زبان سے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ[6] (نہ ہمارے کوئی سفارش کرنے والے ہیں اور نہ سرگرم دوست)

---

[1] ۱۶۴-انعام [2] لقمان [3] ۵۸-نساء [4] ۹۵-مائدہ [5] ۴۸-مدثر [6] ۱۰۰-شعراء

بنی اسرائیل کو حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوب علیہم السلام جیسے انبیاء کی اولاد میں سے ہونے کا جو گھمنڈ تھا اور جس کی بنا پر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کی نجات کے لیے ان بزرگوں کی نسبت اور سفارش ہی کافی ہوگی، یہ آیت ان کے اس واہمہ کی جڑ کاٹ رہی ہے اور ان کو اس بات کی یاد دہانی کر رہی ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی اصل چیز عہدِ الٰہی کی پابندی اور ایمان و عمل صالح ہے۔ اس سے بے پروا ہو کر محض آرزوؤں کے ہوائی قلعہ پر اعتماد نہ کرو۔

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ (۴۹)

آل کا مفہوم

آلِ فرعون، یعنی قومِ فرعون[1]۔ آل سے مراد صرف کسی شخص کی اولاد نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ لفظ آل و اولاد، قوم و قبیلہ اور اتباع و انصار سب پر حاوی ہے۔

نابغہ ذبیانی کا شعر ہے:

من آل میة رائح او مغتدی　　عجلان ذا زاد وغیر مزود

میہ کے قبیلہ کے لوگوں میں کوئی صبح روانہ ہوا کوئی شام، کوئی زادِ راہ کے ساتھ، کوئی بغیر زادِ راہ کے۔

سورہ مومن ۴۵ میں ہے، وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ (اور آلِ فرعون کو بُرے عذاب نے گھیر لیا) سورۂ اعراف میں ہے۔ وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ ۔ ۱۳۰ (اور ہم نے آلِ فرعون کو قحط اور پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا)

ان آیات میں جس عذاب کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ فرعون اور اس کی ساری قوم ہی پر آیا، نہ کہ صرف اس کی اولاد پر، اس کی اولاد کا تو کہیں ذکر بھی نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے وہ اس کا بے اولاد ہونا ثابت کرتے ہیں۔ تورات میں یہ ذکر ضرور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں دریا سے جس نے نکلوایا تھا وہ فرعون کی لڑکی تھی لیکن قرآن نے اس غلطی کی بھی تصحیح کر دی ہے کہ یہ اس کی لڑکی نہیں بلکہ اس کی بیوی تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ[2] (اور فرعون کی بیوی نے کہا، یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اس کو قتل نہ کرو۔ ممکن ہے ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں اور وہ اس بات کے انجام کا احساس نہیں رکھتے تھے)

سوم کے معنی

'سَوْم' کے معنی کسی پر کوئی بوجھ یا بار ڈالنے کے ہیں، کہیں گے سامہ ظلما و سامہ خسفا اس کو ظلم کا یا ذلت کا مزہ چکھایا۔ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ (وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور

---

[1] لفظ آل کی یہ تحقیق مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن سے ماخوذ ہے۔ [2] ۹ قصص

تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے) یہ اس عذاب ظلم و ذلت کی تفصیل ہے جس میں فرعونیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔ اگرچہ مصر میں بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے تھے اور بے شمار قسم کی ذلتوں سے انہیں سابقہ تھا جن کی تفصیل ان کی تاریخ میں موجود ہے لیکن یہاں ذکر صرف دو ہی باتوں کا بطور نمونہ فرمایا ہے، ان نمونوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل وہاں کس شکنجہ میں تھے۔

بلاغت کا ایک نکتہ

بیٹوں کے قتل کے اسباب اور اس کی نوعیت کی تفصیل تو کسی موزوں مقام پر آئے گی یہاں البتہ بلاغت کا ایک نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ وہ یہ کہ لڑکوں کے ذبح کا ذکر جو کیا ہے تو (ابناء) بیٹوں کے لفظ سے کیا ہے تاکہ شفقت پدری کا جذبہ ابھرے اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کا ذکر کیا ہے تو ان کے لیے (نساءکم) تمھاری عورتوں کا لفظ استعمال کیا ہے اس لیے کہ غیرت کو حرکت میں لانے کے لیے یہ تعبیر زیادہ موثر تھی۔

وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ (اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی) اس آزمائش کے کٹھن ہونے کی طرف یہاں اشارہ اس لیے فرمایا کہ اس نجات کی اہمیت کا انھیں کچھ اندازہ ہو سکے جو انھیں حاصل ہوئی کہ کیسا عظیم ابتلا تھا جس سے ان کے رب نے ان کو چھڑایا، اگر وہ نہ چھڑاتا تو کوئی دوسری طاقت اس عذاب سے ان کو نہیں چھڑا سکتی تھی۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۵۰)

فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم نے تمھیں ساتھ لے کر دریا کو پھاڑتے ہوئے عبور کیا۔ مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح کوئی کسی کو گود میں اٹھا کر دریا پار کرا دے اسی طرح ہم نے تمھیں پار کرایا۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ، یعنی اپنی نجات کے بعد فرعون اور اس کے غرق ہونے کا ماجرا تم نے ساحل پر کھڑے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

واقعات کو پیش کرنے کی ایک مخصوص نوعیت

یہاں تاریخ بنی اسرائیل کے جن واقعات کی طرف اشارات کیے جا رہے ہیں ان کے متعلق دو باتیں ملحوظ رہنی چاہئیں۔

ایک یہ کہ یہ تمام واقعات بنی اسرائیل کی تاریخ کے نہایت اہم اور مشہور واقعات ہیں جن سے ان کا بچہ بچہ واقف تھا اس وجہ سے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں تھی، صرف اشارات کافی تھے۔

دوسری یہ کہ زمانہ نزول قرآن کے بنی اسرائیل ان واقعات کو اپنی تاریخ کے واقعات کی حیثیت سے نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان پر فخر کرتے تھے اس بنا پر قرآن نے ان واقعات کو ان کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے گویا یہ انھیں کے ساتھ پیش آئے ہیں، یہ بلیغ اسلوب بیان اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے نہایت موثر اور مفید ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۵۱) ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۵۲)

یہ اس وعدے کی طرف اشارہ ہے جو مصر سے نکلنے اور دریا پار کر چکنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام

سے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام و ہدایات دینے کے لیے فرمایا اور اس مقصد کے لیے ان کو طور پر بلایا۔ یہ چالیس دن کی مدت اس قلبی و روحانی تیاری کے لیے تھی جو کتاب الٰہی کے بارِ عظیم کے متحمل ہونے کے لیے ضروری تھی۔ ابتداً یہ وعدہ تیس دنوں کا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ ان کی اس جلدی کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تربیت مقتضی ہوئی کہ یہ مدت ۳۰ دنوں سے بڑھا کر چالیس دن کر دی جائے مذکورہ آیت میں یہ پوری مدت جمع کر دی گئی ہے سورہ اعراف میں اس کی تفصیل اس طرح ہے۔ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو پورا کیا دس راتیں بڑھا کر۔ اس طرح اس کے رب کی مقررہ مدت چالیس راتوں میں پوری ہوئی)

گوسالہ پرستی کا واقعہ

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ، یعنی موسیٰ کے پہاڑ پر چلے جانے کے بعد تم وہاں کا ایک بچھڑا بنا کر اس کی پرستش میں لگ گئے۔ کتاب خروج باب ۳۲ میں اس واقعہ کی تفصیلات موجود ہیں لیکن یہود نے اپنی عادت کے مطابق اس میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی ملوث کر دیا ہے جس کی قرآن نے دوسرے مقام پر تردید فرمائی ہے:۔

> اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے کیوں کہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا۔ . . . تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جا کیوں کہ تیرے لوگ جن کو تو ملک مصر سے نکال لایا بگڑ گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جس کا میں نے حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ گردن کش قوم ہے اس لیے تو مجھے چھوڑ دے کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں ان کو بھسم کر دوں (باب ۳۲ - آیات ۱ - ۷)

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ، یعنی اس گوسالہ پرستی کا ارتکاب کر کے تم نے خود اپنی جانوں پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ چنانچہ دو ہی آیتوں کے بعد قرآن نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ (اے میری قوم کے لوگو، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا) ظلم کی اصل حقیقت حق تلفی کرنا ہے۔ شرک کا ارتکاب کر کے انسان اپنے نفس کی سخت تحقیر کرتا ہے کیونکہ وہ خدا کا خلیفہ اور تمام مخلوقات سے اشرف ہونے کے باوجود اپنے ہی جیسی یا اپنے سے بھی کسی گھٹیا مخلوق کو اپنا خدا بنا بیٹھتا ہے۔ اپنے نفس کی اس سے بڑی حق تلفی اور کیا ہو سکتی ہے؟

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۵۳)

فرقان کا مفہوم

فرقان کے معنی ہیں حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز یہاں واؤ بیان اور تفسیر کے لیے ہے۔

یعنی کتاب (تورات) ہی کو فرقان کے لفظ سے تعبیر کرکے اس کے ایک اور پہلو کو واضح کردیا ہے۔ قرآن مجید میں قرآن اور تورات دونوں کے لیے فرقان کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ ۴۸۔ انبیاء (اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان دی) اسی طرح قرآن مجید کے متعلق ہے۔ تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ ۱۔ الفرقان (بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا)

ان کتابوں کو فرقان کے لفظ سے تعبیر کرنے میں کئی پہلو مدنظر ہیں۔ ایک یہ کہ یہ تمام احکام و ہدایات کی تفصیل پیش کرتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ حق و باطل اور حرام و حلال کے درمیان امتیاز کرتی ہیں۔ تیسرا یہ کہ اپنے مدعا و مقصد میں بالکل واضح ہیں۔ چوتھا یہ کہ ان سے انسان کو وہ حکمت حاصل ہوتی ہے جو زندگی کے تمام نشیب و فراز میں خیر و شر کی شناخت کے لیے روشنی بخشتی ہے۔

قرآن نے معرکۂ بدر کو بھی فرقان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اس لیے کہ اس نے بھی حق و باطل کو اچھی طرح آشکارا کردیا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ بِاتِّخَاذِکُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ عِنْدَ بَارِئِکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۵۴)

لفظ برءٌ کا مفہوم

برءٌ کا مفہوم لفظ خلق کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک ہی جگہ اللہ تعالیٰ کی تین صفتیں بیان ہوئی ہیں (ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ) خلق کا مفہوم ہے کسی چیز کا خاکہ ~~سوسے~~ تیار کرنا، برء کا مفہوم ہے اس کو ٹھیک ٹھاک کرنا، تصویر کے معنی ہیں اس کو مکمل کرنا۔ اس اعتبار سے اگرچہ خالق اور باری دونوں لفظوں کے لغوی مفہوم میں ایک باریک سا فرق ہے لیکن عام استعمال میں دونوں ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں۔

'فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ' کا مطلب

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ، پس اپنے آپ کو قتل کرو کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اپنی تلواریں خود اپنی گردنوں پر چلادو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں سے جو لوگ اس فتنہ شرک و گوسالہ پرستی سے الگ رہے ہیں اپنے اپنے قبیلہ کے ان لوگوں کی گردنیں اپنے ہاتھوں سے ماریں جنھوں نے قوم کے لیے اس فتنۂ ارتداد کی راہ کھولی ہے۔ یہ حکم دینے میں چند عظیم مصلحتیں تھیں۔

ایک یہ کہ اس طرح اس توبہ نے ایک اجتماعی توبہ کی شکل اختیار کرلی۔ گویا بنی اسرائیل کے اجتماعی ضمیر نے ان لوگوں کو اپنے اندر سے کاٹ پھینکا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد توحید کی اہانت کی تھی۔

دوسری یہ کہ اس سے توحید کی حقیقی عظمت اور شرک کی حقیقی کراہت پورے طور پر واضح ہوگئی۔ گویا شرک ایک ایسی برائی ہے کہ اگر آدمی کا بایاں ہاتھ اس کا ارتکاب کرے تو اس کے داہنے ہاتھ کا فرض ہے کہ اپنے بائیں ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دے۔ اس معاملہ میں نہ کسی مداہنت اور رواداری کو دخیل ہونے دے

اور نہ کسی قرابت اور رشتہ داری کا لحاظ کرے۔

تیسری یہ کہ ہر قبیلہ و خاندان کے اخیار اگر اپنے اپنے قبیلوں کے اشرار پر تلوار اٹھائیں گے تو اس سے خاندانی اور قبائلی عصبیت نہیں ابھرے گی بلکہ بغیر کسی فتنہ کے اندیشہ کے بنی اسرائیل کی تطہیر ہو جائے گی۔

تورات کے مطالعہ سے بھی تقریب قریب یہی بات نکلتی ہے۔ چنانچہ کتاب خروج میں ہے۔

"جب موسیٰؑ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہو گئے کیوں کہ ہارون نے ان کو بے لگام چھوڑ کر ان کو ان کے دشمنوں کے درمیان ذلیل کر دیا[1] تو موسیٰؑ نے لشکر گاہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو خداوند کی طرف ہے (یعنی عہدِ توحید پر قائم ہے) وہ میرے پاس آ جائے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہو گئے اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر، پھاٹک پھاٹک گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔ اور بنی لاوی نے موسیٰؑ کے کہنے کے موافق عمل کیا چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تین ہزار مرد کھیت آئے اور موسیٰؑ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو (یعنی عہدِ توحید کی تجدید کرو) بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔" (باب ۳۲۔ آیات ۲۵۔۳۰)

اگرچہ توریت کے اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مرتدوں کے قتل کے کام پر صرف بنی لاوی کو مامور کیا تھا لیکن خود مذکورہ اقتباس کا آخری حصہ شہادت دے رہا ہے کہ معاملہ کی اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی ہر قبیلہ کے موحدین اس کام پر مامور کیے گئے کہ وہ اپنے اپنے قبیلہ کے مرتدوں کی گردنیں ماردیں تاکہ یہ اہل ایمان کے مزید ایمان کی ایک شہادت ہو اور لوگ سبق حاصل کریں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس معاملہ میں باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو بھی معاف کرنے والا نہیں ہے۔

تاریخ اسلام میں، یاد ہوگا، اسی قسم کا مشورہ حضرت عمرؓ نے بدر کے قیدیوں کے متعلق دیا تھا۔

اس حکم سے ایک بات تو یہ نکلتی ہے کہ توبہ کی قبولیت کے لیے اصل گناہ سے پوری پوری بیزاری ضروری ہے۔ دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ جو برائی معاشرہ کے ذمہ داروں کی غفلت سے معاشرہ میں پھیل جائے اس کا کفارہ سب کو ادا کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ جرم معاف نہیں ہوتا۔ تیسری بات یہ نکلتی ہے کہ ارتداد کی سزا حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں بھی قتل ہی تھی۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ: یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ یعنی تمھیں تو بظاہر یہ ایک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑا قومی نقصان معلوم ہوگا کہ قوم کے اتنے بڑے حصہ کو قومی جسم سے کاٹ کر پھینک دیا جائے لیکن تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک اس حصہ کے کاٹ پھینکے جانے

---

[1] یہود نے حضرت ہارونؑ کو بدنام کرنے کے لیے تورات میں اس قسم کے جو اضافے کیے ہیں ان کی تردید ہم مناسب موقع پر کریں گے۔

ہی میں تمھارے لیے دین و دنیا کی خیر و برکت ہے۔ اگر خاندانی جذبات اور قومی محبت کے جوش میں تم نے اس فاسد حصّہ کو اپنے وجودِ قومی کے ساتھ چپٹائے رکھنے ہی کو بہتر سمجھا تو یاد رکھو کہ اس کا فساد تمھارے سارے وجودِ قومی کو فاسد کر کے چھوڑ دے گا۔ اصول و عقائد سے بنی ہوئی ایک جماعت کے ساتھ اگر ان اصولوں کے مخالف بھی محض نسلی تعلق کی بنا پر چپکے رہیں تو وہ پوری جماعت تباہ ہو کے رہتی ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۵۵)

بنی اسرائیل کی شک پرستانہ ذہنیت

ہم تمھارا یقین اس وقت تک نہیں کرنے کے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ بنی اسرائیل شک کے ایسے مریض تھے کہ انھیں کسی طرح یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ موسیٰ سے کلام بھی کرتا ہے اس وجہ سے جب موسیٰ علیہ السلام ان سے کہتے کہ خداوند تمھیں یہ یہ حکم دیتا ہے تو وہ کہتے کہ جب خدا تم سے کلام کرتا ہے تو وہ ہم سے بھی کلام کرے اور ہم بھی اس کو آنکھوں سے دیکھیں، اس کے بغیر ہم تمھاری بات کی صحت کس طرح تسلیم کر لیں؟

جہاں تک اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کا تعلق ہے، یہ خواہش کوئی قابلِ ملامت خواہش نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ خواہش کی تھی لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ یہ خواہش شرحِ صدر اور اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لیے ہو اور اس بات میں کہ اس کو انکار اور تکذیب کا بہانہ بنایا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ خواہش اسی طرح کی تھی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے تاکہ آخرت کے باب میں انھیں پورا پورا شرحِ صدر حاصل ہو جائے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملامت نہیں فرمائی بلکہ صرف یہ فرمایا کہ تم ان ناسوتی آنکھوں سے میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے، صرف میری صفات ہی کو دیکھ سکتے ہو۔ قرآن مجید میں اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(۱۴۳- اعراف)

اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا کہ اے خداوند تو مجھے اپنے آپ کو دکھا، میں تجھے دیکھوں گا، فرمایا تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہ سکے تو تم مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے رب نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی تو اس کو پاش پاش کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو بولے اے رب تو پاک ہے، میں نے توبہ کی اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔

برعکس اس کے بنی اسرائیل کے لوگوں کا یہ مطالبہ محض ان کی بے یقینی اور شک پرستانہ ذہنیت کا ایک مظاہرہ تھا اور یہ مظاہرہ وہ اللہ تعالیٰ کی نہایت کھلی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود قدم قدم پر کرتے رہتے تھے اس وجہ سے ان پر عتاب ہوا۔

ایک شبہے کا ازالہ

یہ عتاب یہاں فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے اور سورۂ اعراف ۱۵۴ میں فَلَمَّآ اَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ کے الفاظ سے لفظ صاعقہ کی تحقیق ہم سترھویں فصل میں بیان کر چکے ہیں۔ اس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور اس بجلی کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔ رجفہ کے معنی زلزلہ کے ہیں۔ ایک ہی واقعہ سے متعلق قرآن نے دو مقامات میں جو بظاہر دو الگ الگ لفظ استعمال کیے ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ ایک ہی حادثہ کے دو مختلف اثرات ہیں جو بیک وقت ظاہر ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مشاہدہ کرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی جب پہاڑ پر ڈالی تو جس طرح پہاڑ پاش پاش ہو گیا اسی طرح بنی اسرائیل کے مطالبہ پر جب اس کی تجلی ظاہر ہوئی ہے تو وہ صاعقہ کی شکل میں نمودار ہوئی جس نے سارے پہاڑ میں زلزلہ ڈال دیا اور یہ لوگ بھسم ہو کر گر پڑے۔

ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ (۵۶)

موت کا مفہوم

اس صاعقہ اور زلزلہ سے ان ستر سرداروں پر جو اس موقع پر حضرت موسیٰ کے ساتھ طور پر گئے تھے[۱] جو حالت طاری ہوئی، قرآن مجید نے اس کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس موت سے موت بھی مراد ہو سکتی ہے اور بطریق استعارہ بے ہوشی بھی۔ عربی زبان میں موت کا لفظ استعارہ کے طور پر نیند اور بے ہوشی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے[۲]۔ چنانچہ سو کر اٹھنے کے بعد کی جو مشہور دعا احادیث میں نقل ہوئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں، الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور (اس اللہ کے لیے شکر ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا اور اسی کی طرف لوٹنا ہے) اسی طرح بعث کا لفظ بھی اصحابِ کہف کے واقعہ میں ان کو نیند سے بیدار کرنے کے

---

[۱] قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اس موقع کی بات ہے جب گوسالہ پرستی کے حادثہ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ستر منتخب آدمیوں کو لے کر طور پر اس مقصد سے گئے ہیں کہ اپنی قوم کے لیے معافی مانگیں اور اس کام میں اپنی قوم کے ان لیڈروں کو بھی شریک کریں۔

[۲] لسان العرب میں ہے، مات الرجل وھمد وھوّم اذا نام .... الموت السکون وکل ما سکن فقد مات .... وفی حدیث دعاء الانتباہ: الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور سمی النوم موتا لانہ یزول معہ العقل والحرکۃ تمثیلاً وتشبیھا لا تحقیقا وقیل الموت فی کلام العرب یطلق علی السکون یقال ماتت الریح ای سکنت ومنھا المنام لقولہ تعالیٰ والتی لم تمت فی منامھا وقد قیل المنام الموت الخفیف والموت النوم الثقیل .... والموتۃ جنس من الجنون والصرع یعتری الانسان فاذا افاق عاد الیہ عقلہ کالنائم والسکران۔ والموتۃ الغشی۔

لیے استعمال ہوا ہے۔

اگرچہ بنی اسرائیل اپنی سرکشی کے سبب سے سزاوار تو اسی بات کے تھے کہ ان کو دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے ان کو مزید مہلت بخشی اور ان کے پیغمبر نے بھی اس موقع پر ان کے لیے بڑی دل سوزی کے ساتھ دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ سورہ اعراف میں اس کا حوالہ اس طرح آیا ہے۔

وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ۚ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلُ وَإِيَّايَ ۖ أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ۖ إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَن تَشَاءُ وَتَهْدِي مَن تَشَاءُ ۖ أَنتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۖ وَأَنتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ (۱۵۵۔ اعراف)

اور موسیٰ نے ہمارے مقررہ وقت پر حاضری کے لیے اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب کیے تو جب ان کو زلزلے نے آ پکڑا تو موسیٰ نے دعا کی کہ اے رب اگر تو چاہتا تو ان کو اور مجھ کو پہلے ہی ہلاک کر چھوڑتا، کیا تو اس جرم میں ہم سب کو ہلاک کر دے گا جو ہم میں سے بے وقوفوں نے کیا ہے۔ یہ تو بس تیری آزمائش تھی، اس کے ذریعے سے تو جس کو چاہے گمراہ کرے اور جس کو چاہے ہدایت دے، تو ہمارا مددگار ہے۔ تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین بخشنے والا ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۵۷)

یہ ان انعامات کا بیان ہے جو بنی اسرائیل پر صحرائے سینا میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دھوپ اور فاقے کی مصیبت سے بچانے کے لیے کیے۔

مَنّ کی تحقیق

مَنّ کے اصل معنی فضل و احسان کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ خاص غذا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے صحرائے سینا میں خاص اپنے فضل سے مہیا فرمائی، جس کے لیے نہ انھیں ہل چلانے پڑے، نہ تخم ریزی اور آب پاشی کی زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ تورات میں اس کی تفصیل اس طرح بیان ہوئی ہے۔

"اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا اور صبح کو خیمہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب اوس جو پڑی ہوئی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اس کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے مَن؟ کیوں کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰ نے ان سے کہا یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تم کو دی ہے ...... اور وہ ہر صبح کو اپنے اپنے کھانے کی مقدار کے مطابق جمع کر لیتے تھے اور دھوپ تیز ہوتے ہی وہ پگھل جاتا تھا۔" خروج باب ۱۶۔ ۱۳۔ ۲۱

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شبنم کی طرح ایک چیز زمین پر ٹپکتی تھی اور پالے کے دانوں کی طرح وہ جم جاتی

تھی۔ آفتاب کی تمازت بڑھنے سے پہلے پہلے اس کا جمع کر لینا ممکن ہوتا تھا۔ تمازت بڑھنے کے بعد یہ دانے پگھل جاتے تھے۔ چونکہ یہ نعمت، جیسا کہ عرض کیا گیا، بغیر کوئی زحمت و مشقت اٹھائے حاصل ہوئی تھی اور ایک ایسے بے آب و گیاہ صحرا میں حاصل ہوتی تھی جہاں فراہمی غذا کے اسباب و وسائل مفقود تھے اس وجہ سے اس کا نام مَن قرار پایا (یہ واضح رہے کہ عربی اور عبرانی دونوں قریب الماخذ زبانیں ہیں)

مَنّ کے وجہ تسمیہ سے متعلق یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے لیکن تورات کا مذکورہ بالا اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب اس عجیب وطریب چیز کو دیکھا تو ان کے اندر یہ سوال پیدا ہوا کہ مَنْ ھُوَ یہ کیا ہے؟ ان کے اسی سوال سے اس کا نام مَنّ پڑ گیا۔ ہمارے نزدیک یہ وجہ تسمیہ محض یہود کی بدمذاقی کی ایک ایجاد ہے۔ نہ لفظ اس کی تائید کرتا ہے، نہ عقل سلیم اس کو قبول کرتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس چیز کو جو روٹی سے تعبیر فرمایا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سچ مچ یہ روٹی کی قسم کی کوئی چیز تھی، بلکہ روٹی یہاں غذا کے مفہوم میں ہے۔ غذا کے مفہوم کی تعبیر کے لیے یہ لفظ قدیم صحیفوں میں بہت استعمال ہوا ہے۔ ہماری زبان میں بھی یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

'سَلْوٰی' کی تحقیق

سَلْوٰی:۔ مَن کی طرح لفظ سلویٰ بھی عربی میں اہل کتاب کے واسطہ سے آیا ہے اور اہل عرب نے اس کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ ان پرندوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے بھیجے۔ یہ بٹیروں سے ملتے جلتے تھے، اور بٹیروں ہی کی طرح ان کا شکار نہایت آسان تھا۔ خروج میں ان کی تفصیل اس طرح آئی ہے:۔

> "پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت ملک مصر سے نکلنے کے بعد دوسرے مہینے کی پندرھویں تاریخ کو سین کے بیابان میں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی اور اس بیابان میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت موسیٰ اور ہارون پر بڑبڑانے لگی، اور بنی اسرائیل کہنے لگے کاش کہ ہم خداوند کے ہاتھ سے ملک مصر میں جب ہی مار دیے جاتے جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے کیونکہ تم تو ہم کو اس بیابان میں اسی لیے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مارو۔ . . . . اور خداوند نے موسیٰ سے کہا، میں نے بنی اسرائیل کا بڑبڑانا سن لیا ہے۔ سو تو ان سے کہہ دے کہ شام کو تم گوشت کھاؤ گے اور صبح کو تم روٹی سے سیر ہو گے اور تم جان لو گے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا (خروج باب ۱۶: ۱-۱۳)

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ: (کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں) اس طرح کے مواقع پر عام طور پر ہمارے مفسرین قلنا کا لفظ محذوف مانتے ہیں، یعنی ہم نے یہ چیزیں ان کو بخشیں اور کہا کہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے مواقع پر 'کہا' کا لفظ محذوف کر دینے میں ایک خاص بلاغت ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت اپنی صورت و ہیئت یا بالفاظ دیگر اپنی زبانِ حال سے

بھی یہ دعوت دیتی ہے کہ اس نعمتِ الٰہی سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے پروردگار کے شکرگزار رہو۔ یہ اشارات قرآن مجید میں کہیں کہیں کھول دیئے گئے ہیں اور بعض جگہ (جیسا کہ یہاں ہے) مخفی چھوڑ دیئے گئے ہیں جن کے اندر اس کائنات کی پھیلی ہوئی نعمتوں کی اشارات سمجھنے والی عقل ہوتی ہے وہ ان اشارات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

یہاں کلام کا سیاق و سباق اس امر کو واضح کر رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں کا حق نہیں پہچانا۔ وہ ان نعمتوں کو پاکر شکرگزار رہنے کے بجائے ان کی ناقدری اور خدا کی نافرمانی کرتے رہے۔ یہ بات چوں کہ سیاق کلام سے واضح ہے اس وجہ سے لفظوں میں ظاہر نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی جگہ پر یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ اس فقرہ سے بنی اسرائیل کا ان نعمتوں سے متعلق رویہ بھی واضح ہوگیا اور یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جو لوگ خدا کی کسی نعمت کی ناقدری کرتے ہیں وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔ یہ آخری بات اوپر کی باتوں کی طرح یہود کو براہِ راست مخاطب کر کے کہنے کے بجائے ان سے منہ پھیر کر غائب کے صیغہ سے کہی گئی ہے جس سے ان کی طرف سے متکلم کی بیزاری کا اظہار ہو رہا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۸)

'قریہ' سے مراد

قریہ کے معنی اصل لغت میں جمع ہونے کی جگہ کے ہیں۔ عربی میں کہیں گے قری الماء فی الحوض (اس نے حوض میں پانی جمع کر دیا) یہیں سے یہ لفظ بستی کے معنی میں استعمال ہوا اس لیے کہ وہ لوگوں کے مجتمع ہونے کی جگہ ہوتی ہے۔ اس لفظ کے استعمالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف چھوٹے دیہات ہی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ بڑے بڑے شہروں اور مرکزی آبادیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس قریہ سے یہاں مراد سرزمین فلسطین ہی کا کوئی شہر ہو سکتا ہے اس لیے کہ آگے فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا کے الفاظ سے اس کی جو تعریف وارد ہے وہ اسی سرزمین کے کسی شہر پر منطبق ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد اریحا یا یریحو ہو۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابنِ زید کی یہی رائے ہے۔ فلسطین کے علاقہ کا یہی شہر بنی اسرائیل کے قبضہ میں سب سے پہلے آیا ہے۔

'سجدہ' کا مفہوم

اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا، سجدہ کے اصل معنی سر جھکانے کے ہیں۔ اس سر جھکانے کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں۔ اس کی کامل شکل زمین پر پیشانی رکھ دینے کی ہے جو ہم نماز میں اختیار کرتے ہیں۔ عمرو بن کلثوم نے اپنے مشہور فخریہ شعر میں اس کا یہی کامل مفہوم لیا ہے۔

اذا بلغ الفطام لنا صبی تخرلہ الجبابر ساجدینا

(جب ہماری قوم کا کوئی بچہ دودھ چھوڑنے کی مدت کو پہنچ جاتا ہے تو بڑے بڑے جبار اس کے آگے سجدوں میں گرتے ہیں)

یہاں آیت میں اس سے مراد صرف سر جھکانا ہے۔ موقع کلام اس پر دلیل ہے۔

'الباب' سے مراد الباب سے مراد بعض لوگوں نے بستی کا دروازہ لیا ہے، بعض لوگوں نے خیمۂ عبادت کا دروازہ، میں اس دوسرے قول کو ترجیح دیتا ہوں۔ مفتوح شہر کے دروازوں میں متواضعانہ داخل ہونے کی نصیحت بھی اگرچہ ایک قیمتی نصیحت ہے لیکن یہ نصیحت ایک ایسی قوم کے لیے موزوں ہو سکتی ہے جو بہادر اور زور آور ہو۔ بنی اسرائیل کا حال تو یہ تھا کہ جب دشتِ فاران میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو فلسطین پر فوج کشی کا حکم دیا ہے تو ان کے دل بیٹھ گئے اور انھوں نے صاف صاف جواب دے دیا کہ اس ملک میں جبار اور زور آور لوگ ہیں، ہم ان سے مقابلہ کے لیے تیار نہیں ہیں، تم اور تمھارا خدا دونوں جا کر لڑو، جب ان جباروں سے علاقہ خالی ہو جائے گا تو ہم داخل ہو جائیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ نصیحت کچھ غیر ضروری ہی سی معلوم ہوتی ہے کہ شہر کے دروازے میں فاتحانہ تمکنت کے ساتھ نہ داخل ہوں بلکہ عاجزانہ اور سرنگندہ ہو کر داخل ہوں۔ اس وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ یہاں دروازہ سے مراد خیمۂ عبادت کا دروازہ ہے اور مقصود یہ بتانا ہے کہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں داخل ہوں، اس کی زرخیزی اور شادابی سے پوری آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اور خیمۂ عبادت میں عاجزانہ حاضر ہو کر خدا کا شکر ادا کرتے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں، لیکن جس طرح انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری اور ہر ہدایت کی خلاف ورزی کی اسی طرح اس نعمت اور اس ہدایت کی بھی ناقدری کی۔

'حطۃ' کی تحقیق قُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ، حِطّة کا لفظ ایک جملہ کے قائم مقام ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے۔ یَقُوۡلُوۡنَ طَاعَۃٌ (۸۰۔ نساء) اس وجہ سے یہاں مبتدا کو محذوف ماننا پڑے گا۔ زمخشری نے اس کی پوری وضاحت یوں کی ہے کہ مسئلتنا حطۃ (ہماری درخواست حطہ ہے) حِطّۃ حَطّ سے ہے جس کے معنی جھاڑ دینے کے ہیں۔ یہاں مراد اس سے گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبرانی دونوں کے قریب الماخذ ہونے کے سبب سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ مادہ جھاڑ دینے اور بخش دینے ہی کے مفہوم میں عبرانی میں بھی استعمال ہوا ہے اور یہ ان کے ہاں استغفار اور توبہ کے کلمات میں سے تھا، وہیں سے یہ عربی میں منتقل ہوا۔

'احسان' کا مفہوم محسنین، عربی میں احسن الی فلان کے معنی ہوں گے فلاں کے ساتھ احسان کیا، اور احسن الشیٔ کے معنی ہوں گے اس چیز کو بہت خوبی کے ساتھ کیا۔ اس وجہ سے محسن کا لفظ عربی میں احسان کرنے والے کے لیے بھی آتا ہے اور کسی عمل کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دینے والے کے لیے بھی۔ موقع کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اردو میں اس کے لیے کوئی خوب صورت لفظ سمجھ میں نہیں آیا اس وجہ سے ترجمہ میں صرف مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَیۡرَ الَّذِیۡ قِیۡلَ لَہُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ

ؔ ملاحظہ ہو تفسیر علامہ ابی السعود

بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۵۹)

دعا کی تبدیلی کی نوعیت

یعنی دعا کے لیے جو لفظ ان کو تلقین کیا گیا تھا اس کو انھوں نے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل لیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں مراد الفاظ کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ رویہ کی تبدیلی ہے۔ پُرانوں میں سے ابومسلم اصفہانی کا یہی خیال ہے لیکن قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ بَدَّلَ کا لفظ جب اپنے دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے (جیسا کہ یہاں ہے، اگرچہ ایک محذوف ہے) تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھ دی۔ پھر جب واضح الفاظ میں یہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ ظالموں نے اس قول کو جو ان سے کہا گیا تھا ایک دوسرے قول سے بدل دیا جو ان سے نہیں کہا گیا تو اس سے صرف رویّہ اور عمل کی تبدیلی مراد لینا الفاظ قرآن سے صریح انحراف ہے۔

ہمارے نزدیک یہاں صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ قرآن کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ بنی اسرائیل کے کچھ بدبختوں نے 'حِطَّةٌ' کے لفظ کو اس سے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل لیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ انھوں نے کس لفظ سے اس کو بدلا تھا تو قرآن میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ اہل تاویل سے مختلف اقوال منقول ہیں جن میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی جزم کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ جس طرح نصاریٰ نے اپنی سورہ فاتحہ کے فقروں کے مفہوم میں تبدیلی کر دی اسی طرح کی تبدیلی بنی اسرائیل نے اپنی اس دعا کے مفہوم میں کر دی۔ نصاریٰ کی فاتحہ مندرجہ لوقا باب ۱۱۔۳ میں یہ الفاظ جو آتے ہیں "ہماری روز کی روٹی ہمیں دیا کر" ظاہر ہے کہ اصل دعا کے مفہوم سے بالکل ہٹے ہوئے ہیں۔ اصل دعا تو یوں ہوگی کہ ہمیں وہ روحِ ہدایت بخش جو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے[1]۔ لیکن چونکہ عبرانی میں روٹی کے لیے جو لفظ ہے وہ روحانی غذا اور مادی روٹی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے ہدایت کی تعبیر کے لیے یہی مشترک لفظ استعمال ہوا ہوگا۔ بعد میں ترجموں میں آ کر ہدایت کی روح غائب ہوگئی، صرف روٹی رہ گئی۔ اسی طرح کی کوئی تبدیلی بنی اسرائیل نے بھی دعا کے الفاظ میں کر دی جس سے دعا کی اصل روح بالکل بدل گئی۔

رِجز اور 'رجس' کا مفہوم

فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ: رِجز اور رِجس، دونوں ایک ہی لفظ کی دو شکلیں ہیں۔ ان کا اصل مفہوم اضطراب اور ارتعاش ہے۔ یہیں سے یہ گندگی اور نجاست کے لیے استعمال ہوئے کیونکہ گندگی اور نجاست کو دیکھ کر طبیعت میں ایک قسم کا اضطراب اور سنسنی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ عذاب کے لیے استعمال ہوئے کیونکہ عذاب بھی دلوں میں ایک اضطراب اور کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ مِنَ السَّمَآءِ (آسمان سے) کا اضافہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس حادثہ کی نوعیت عام حوادث سے بالکل مختلف نوعیت

[1] ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فاتحہ

کی تھی۔ اس میں قدرت کی غضبناکی کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ تورات کے بعض مقامات میں اس مخصوص نوعیت کی یوں وضاحت کی گئی ہے:۔

اگر یہ آدمی ویسے ہی موت سے مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے یا ان پر ویسے ہی حادثے گزریں جو سب پر گزرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھلائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور ان کو اس کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ ان لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔ (گنتی باب ۱۶: ۲۹ - ۳۰)

قرآن نے مذکورہ عذاب کی اس مخصوص نوعیت کو مِنَ السَّمَآءِ کے لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ جس طرح ہم کسی ہولناک آفت کو قہر آسمانی سے تعبیر کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ یہ عذاب کیا تھا تو خاص اس قریہ سے متعلق جس کا یہاں ذکر ہے، اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے، البتہ تورات کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس سفر کے دوران میں متعدد بار بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی شدید نافرمانیاں کیں اور ان نافرمانیوں کی پاداش میں وہ مختلف وباؤں کے شکار ہوئے۔ مثلاً جس زمانہ میں بنی اسرائیل شطیم میں (جو ارض فلسطین کے بالکل پاس کا ایک شہر تھا) تھے تو ان لوگوں نے موآبی عورتوں کے ساتھ بدکاریاں کیں، ان کی دعوت پر یہ لوگ ان کی مشرکانہ قربانیوں میں شریک ہونے لگے اور اس طرح بالواسطہ ان کے دیوتا بعل فغور کی پرستش شروع کر دی جس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت وبا بھیجی جس میں ان کے چوبیس ہزار نفوس ہلاک ہوئے۔

کتاب گنتی کے باب ۳۳ میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے موآب کے میدانوں میں بنی اسرائیل کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ جب تم یردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہونا تو تم یہاں کے سب مشرکوں کو نکال دینا، ان کے شبیہ دار پتھروں اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے اونچے مقامات کو مسمار کر دینا اگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو یاد رکھو کہ جیسا میں نے تم کو ان کے ساتھ کرنے کے لیے کہا ہے ویسا ہی میں تمہارے ساتھ کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے اپنی عادت کے مطابق پیغمبر کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی جس کی پاداش میں ان پر اُسی قسم کی کوئی وبا آئی جس قسم کی وبا ان پر شطیم میں آئی تھی۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۶۰)

پانی کے لیے موسیٰ کی دعا

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کے لیے یہ دعا دشت صین میں کی ہے۔ کتاب گنتی باب ۲۰ میں ہے:

"اور پہلے مہینہ میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت دشت سین میں آگئی اور وہ لوگ قادس میں رہنے لگے .... اور جماعت کے لوگوں کے لیے وہاں پانی نہ ملا۔ سو وہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے خلاف اکٹھے ہوئے اور لوگ موسیٰؑ سے

جھگڑنے اور یہ کہنے لگے کاش ہم بھی اس وقت مر جاتے جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرے۔ تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی یہاں مریں اور تم نے کیوں ہم کو مصر سے نکال کر اس بری جگہ پہنچایا ہے۔ یہ تو بونے کی اور انجیروں کی اور تاکوں اور اناروں کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہاں تو پینے کے لیے پانی تک میسّر نہیں اور موسیٰؑ اور ہارونؑ جماعت کے پاس سے جا کر خیمۂ اجتماع کے دروازے پر اوندھے منہ گرے۔ تب خداوند کا جلال ان کے اوپر ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ اس لاٹھی کو لے اور تو اور تیرا بھائی ہارونؑ تم دونوں جماعت کو اکٹھا کرو اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس چٹان سے کہو کہ وہ اپنا پانی دے اور تو ان کے لیے چٹان ہی سے پانی نکالنا۔ یوں جماعت کو اور ان کے چوپایوں کو پلانا۔ چنانچہ موسیٰؑ نے خداوند کے حضور سے اسی کے حکم کے مطابق وہ لاٹھی لی اور موسیٰؑ اور ہارونؑ نے جماعت کو اس چٹان کے سامنے اکٹھا کیا اور اس نے ان سے کہا سنو اے باغیو! کیا ہم تمھارے لیے اس چٹان سے پانی نکالیں۔ تب موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس چٹان پر دو بار لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہ نکلا اور جماعت نے اور ان کے چوپایوں نے پیا (گنتی باب ۲۰: ۱-۱۲)

ہر قبیلے کے لیے الگ الگ گھاٹ

قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ: قَدۡ عَلِمَ یعنی جان لیا، متعین کر لیا۔ چوں کہ پہاڑی سے بارہ چشمے پھوٹے تھے اور بنی اسرائیل کے خاندان بھی بارہ ہی تھے اس وجہ سے ہر خاندان نے اپنے اپنے گھاٹ الگ الگ متعین کر لیے اور اس چیز کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا کہ پانی کے لینے پر کوئی جھگڑا برپا ہو۔ اگر اس بہتات کے ساتھ پانی کا انتظام نہ ہوا ہوتا تو اس صحرا میں ان لوگوں کے اندر روز پانی پینے پلانے ہی پر تلواریں کھنچی رہتیں۔ اس وجہ سے یہ واقعہ صرف ایک عظیم معجزہ ہی نہیں بلکہ ایک عظیم احسان بھی تھا۔

نعمت کا حق

كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا ..... الآیۃ: جس طرح مَن و سلویٰ کی نعمت کے ذکر کے بعد آیت ۵۷ میں فرمایا، كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ (ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے بخشی ہیں کھاؤ) اسی طرح اس پانی کے انتظام کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا، كُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ (کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور زمین میں فساد مچاتے ہوئے نہ پھیلو) یہ اس عظیم نعمت کا حق بیان ہوا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت جو ہمیں حاصل ہوتی ہے زبانِ حال سے ہمیں اس حق کی یاد دہانی بھی کرتی ہے جو اس سے بہرہ مند ہونے کے سبب سے ہم پر عائد ہوتا ہے یہ اس حق کی تعبیر ہے اور انسان کی فطرت اگر کفرانِ نعمت کی سیاہی سے مسخ نہ ہو چکی ہو تو وہ اس حق سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہی کی صدا ہے جو وحی الٰہی اس کے کانوں کو سنا رہی ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنے کا ہے کہ مَن و سلویٰ کے ذکر کے بعد صرف كُلُوۡا (کھاؤ) کا لفظ وارد ہوا ہے اس لیے کہ اس وقت تک بہتات کے ساتھ صرف غذا کا اہتمام فرمایا تھا۔ جب اسی بہتات اور فراوانی کے ساتھ پانی کا بھی انتظام فرما دیا تو كُلُوۡا کے ساتھ وَاشۡرَبُوۡا (اور پیو) کا بھی اضافہ کر دیا۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَکُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ ٭ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ (۶۱)

'بقل' کا مفہوم

بقل کا لفظ سبزیوں اور ترکاریوں کے تمام اقسام کے لیے عام ہے۔

'قثاء' کا مفہوم

قثاء کے معنی ککڑی اور کھیرے کے ہیں۔

'فوم' اور 'ثوم' کا مفہوم

فوم اور ثوم ایک ہی چیز ہے۔ اس کے معنی لہسن کے ہیں۔ اہل عرب ث کو کبھی کبھی ف سے بدل دیا کرتے ہیں مثلاً عاثور کو عافور اور اثافی کو اثاثی کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں لقوم کا لفظ بھی یہیں سے چلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لہسن کے لیے یہ لفظ اس قدر مشہور ہے کہ اس سے روٹی یا گندم یا غلہ وغیرہ مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید کی تاویل ہمیشہ الفاظ کے مشہور معانی کے لحاظ سے کرنی چاہیئے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے جس مطالبہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا ذکر تورات کی کتاب گنتی کے باب ۱۱ میں اس طرح ہے۔

"اور جو ملی جلی بھیڑ ان لوگوں میں تھی وہ طرح طرح کی حرص کرنے لگی اور بنی اسرائیل بھی پھر رونے اور کہنے لگے کہ ہم کو کون گوشت کھانے کو دے گا۔ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مصر میں مفت کھاتے تھے اور ہائے وہ کھیرے اور خربوزے اور وہ گندنے اور پیاز اور لہسن لیکن اب تو ہماری جان خشک ہو گئی۔ یہاں کوئی چیز میسر نہیں اور من کے سوا ہم کو اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔" (۴-۷)

بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی کی ایک مثال

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ، 'ادنیٰ' دناوت سے ہے، یعنی کیا تم ایک اعلیٰ غذا کو ایک ادنیٰ اور گھٹیا غذا سے بدلنا چاہتے ہو۔ یہ من و سلویٰ کی غذا تمہارے لیے تمہارے پروردگار نے مہیا فرمائی ہے اور تمہیں اس صحرا میں اس حالت میں مل رہی ہے کہ تم فرعونیوں کی غلامی اور شرک و کفر کی اطاعت کی ذلت سے بالکل آزاد ہو، روکھی پھیکی غذا جو آزادی کے ساتھ نصیب ہو، یہی ہے غلامی اور ذلت کے حلوے سے ہزار درجہ بڑھ کر ہے لیکن یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم چٹخاروں کے لیے رسیا ہو کہ ان کے پیچھے تمہاری نگاہوں میں اس آزادی کی بھی، جس میں خدا کے سوا تمہارے اوپر کسی کی حکومت باقی نہیں رہی ہے، کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کے اس رویہ میں ان مسلمان قوموں کے لیے ایک بہت بڑا درس عبرت ہے جنھوں نے تمدن کے لوازم و تنوعات کے پیچھے اپنی آزادی کی نعمت خطرے میں ڈال دی اور اس بات پر دھیان نہیں کیا کہ اس طرح جو لذائذ دنیا انھوں نے حاصل کیے ہیں ان کے ساتھ ذلت کے کتنے گھناؤنے مفاسد چپکے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید

کہ اس مقام سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسان کا ضمیر زندہ ہو تو وہ کھانے کی لذت دسترخوان کے تنوعات کے اندر نہیں ڈھونڈھتا بلکہ ضمیر اور ارادہ کی آزادی کے اندر ڈھونڈھتا ہے۔ یہ چیز اگر اس کو حاصل ہو تو خشک روٹی بھی اس کے لیے جملہ الوانِ نعمت فراہم کر دیتی ہے۔

'مصر' سے مراد

اِهْبِطُوْا مِصْرًا: 'ہبط' کے اصل معنی گرنے کے ہیں اور استعمال میں یہ کسی مسافر کے کسی منزل میں اترنے کے لیے بھی آتا ہے مثلاً کہیں گے ھبطنا الوادی (ہم وادی میں داخل ہوئے) یہیں سے اھبطوا مصرًا کا محاورہ رائج ہوا اور ھبوط کا لفظ نزول کے مرادف کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس استعمال کی وجہ غالباً یہ ہوئی ہوگی کہ مسافر جب کسی مقام پر قیام کا ارادہ کرتا ہے تو وہاں وہ اپنے مرکب سے اترتا ہے۔

اس خاص موقع پر اس لفظ میں یہ موزونیت بھی ہے کہ بنی اسرائیل نے جن چیزوں کا مطالبہ کیا تھا وہ کسی ہموار نشیبی اور زرخیز علاقہ ہی میں مل سکتی تھیں۔

مصرًا سے مراد کوئی شہر ہے۔ اس سے ملک مصر مراد نہیں ہو سکتا۔ مصر، ملک مصر کے لیے قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے لیکن ہر جگہ غیر منصرف آیا ہے۔ صرف اس آیت میں یہ منصرف کی صورت میں آیا ہے۔ اس وجہ سے لازمًا یہ شہر کے عام مفہوم میں آیا ہے۔ البتہ شہر کے لیے خاص طور پر یہاں مصر کے لفظ کے استعمال میں بلاغت کا یہ پہلو ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کے ذریعہ سے ان کو وہ ذلتیں اور مصیبتیں یاد دلائی گئی ہوں جن میں وہ مصر میں مبتلا رہ چکے تھے اور مقصود اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگر تم ان چٹخاروں کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے تو ان کے لیے تمہیں کسی مصر ہی کے شکنجہ میں اپنی گردن دینی پڑے گی۔ اس لیے کہ جو قوم کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے اپنے اندر صبر و استقامت نہیں پیدا کر سکتی وہ اپنے آپ کو ذلت سے نہیں بچا سکتی۔

'مسکنت' کا مفہوم

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ: مسکنت کے معنی عجز، بے بسی، پست ہمتی اور بدحالی کے ہیں۔ اُن کے اوپر ذلت اور پست ہمتی ماردی گئی، کی تعبیر اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ جس طرح دیوار پر گیلی مٹی تھوپ دی جاتی ہے اسی طرح ان کی مسلسل ناشکریوں اور آیاتِ الٰہی کی ناقدریوں کے سبب سے ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے نہایت ہی نرم چارہ بن کر رہ گئے، حالات و خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اندر کوئی عزم و حوصلہ باقی نہ رہا۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو مواقع اس لیے فراہم کیے کہ وہ ان سے سرخروئی اور فائز المرامی حاصل کریں اپنی پست ہمتی اور نالائقی کے سبب سے وہ وہاں سے خدا کی لعنت اور پھٹکار لے کر لوٹے۔

یہود کی ذلت کا سبب

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ ...... ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ: یہ ان کے اوپر ذلت اور مسکنت کے تھوپے جانے کی علت بیان ہوئی ہے کہ ان کے کسی ایک ہی گناہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کی پوری تاریخ سرمستیوں اور نافرمانیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ اپنی سرکشی اور تعدی کی فطرت کے سبب سے برابر اللہ کی آیتوں کا انکار اور اس کے نبیوں

کو قتل کرتے رہے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا یہ زعم کہ یہ خدا کے بڑے چہیتے اور محبوب ہیں اور کوئی ان کو ان کے اس مقام سے کھسکا نہیں سکتا ایک بالکل بے بنیاد گھمنڈ ہے، یہ تو اپنی کرتوتوں کے سبب سے خدا کی درگاہ سے راندے ہوئے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام میں سے جن جن کا یہود کے ہاتھوں قتل ہونا خود یہود کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ان میں سب سے پہلا نام تو حضرت زکریا علیہ السلام کا ہے جن کو شاہ یہوداہ یوآس کے حکم سے عین ہیکل میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت یحییٰ علیہ السلام کا نام ملتا ہے جن کو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے حکم سے قتل کیا گیا اور ان کا سر بادشاہ نے ایک تھال میں رکھ کر اپنی معشوقہ کو نذر کیا۔

پھر سیدنا مسیح علیہ السلام کا نام آتا ہے جن کو یہود نے اپنے زعم کے مطابق سولی پر لٹکوایا، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؑ کو ان کے شر سے بچا لیا۔

یہاں انبیاء علیہم السلام کے قتل کے ذکر کے ساتھ بغیر الحق (ناحق) کی قید بھی لگی ہوئی ہے۔ اس سے مقصود ان کے اس جرم کی سنگینی کو واضح کرنا ہے۔ اس لیے کہ قتل نفس بجائے خود انسانی معاشرے کا سب سے بڑا جرم ہے۔ یہ جرم مزید سنگین ہو جاتا ہے اگر اس کا ارتکاب انبیاء و مصلحین کے خلاف کیا جائے پھر اس کی سنگینی میں مزید اضافہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب بغیر کسی وجہ جواز کے کیا جائے۔ یہاں قرآن نے یہود کے اس جرم میں تمام سنگینیاں جمع کر دی ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۶۲)

لفظ 'یہود' کی تحقیق

ھاد، یھود، ھوداً کے معنی رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے، وَاكْتُبْ لَنَا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ ۵۶ اعراف (اور ہمارے لیے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی لکھ دے۔ ہم نے تیری طرف رجوع کیا) پھر ہَادَ اور تَهَوَّدَ یہودی ہونے کے معنی میں استعمال ہوتے اور یہ استعمال عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق ہے، جس طرح تَنَصَّرَ نصرانی ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اس لفظ کی اصل حقیقت یہی ہے لیکن بعض مخالفین اسلام نے یہ اعتراض اٹھایا ہے کہ قرآن نے یہ لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہود کا لفظ ہود کے مادہ سے نہیں ہے بلکہ یہ یہوذا کی طرف نسبت ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے تھے۔ اس اعتراض کے سبب سے اس لفظ کی تحقیق ضروری ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں اس لفظ کی جو تحقیق بیان کی ہے ہم اس کے ضروری حصہ کا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں۔ مولانا اس لفظ کے اشتقاق پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہم یہاں اس لفظ کے اشتقاق پر گفتگو کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کے خلاف یہ اعتراض اٹھایا ہے انھوں نے نہ تو قرآن مجید ہی کو سمجھا ہے اور نہ خود اپنے صحیفوں ہی کو سمجھا ہے۔ قرآن مجید نے یہ لفظ جو استعمال کیا ہے تو اپنی طرف سے ایجاد کر کے نہیں کیا ہے بلکہ عربی زبان کے ایک عام استعمال کردہ لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اہل عرب ہاد یہود کا فعل یہودی ہونے کے معنی میں استعمال کرتے آئے ہیں اور قرآن مجید نے ھُدْنَا کا لفظ جو استعمال کیا ہے تو لفظ یہود کا اشتقاق بیان کرنے کے لیے نہیں کیا ہے بلکہ یہ لفظ اپنے اصل معنی یعنی توبہ کرنے اور رجوع کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خاص اس لفظ کے استعمال میں بلاغت کا ایک نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ یہ یہود کو ایک ایسی حقیقت کی طرف متوجہ کر رہا ہے جس کو وہ بالکل فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔"

"اس اعتراض سے انھوں نے خود اپنے صحیفوں سے جس بے خبری کا ثبوت دیا ہے اس کی حقیقت اس تفصیل سے واضح ہو گی جو ہم آگے پیش کر رہے ہیں:

"یہوذا حضرت یعقوب علیہ السلام کے ان بارہ بیٹوں میں سے چوتھے بیٹے تھے جن سے بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں کا ظہور ہوا ہے۔ یشوع کے زمانہ میں مفتوحہ علاقہ انھی لوگوں کے درمیان تقسیم ہوا اور اس تقسیم میں ارشلیم سے لے کر اس کے جنوب کا تمام علاقہ بنی یہوذا کے حصّہ میں آیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اسی خاندان سے تھے۔ ان کے زمانہ میں تمام سلطنتِ بنی اسرائیل ان کے قبضہ میں آئی جس سے اس خاندان کی عظمت و شوکت کو چار چاند لگ گئے۔ ان کے بعد ان کے وارث اُن کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے جنھوں نے اپنے دارالسلطنت میں ہیکل کی تعمیر کی۔ اس سے بنی یہوذا کی عظمت میں مزید اضافہ ہوا۔"

"حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کے اندر اختلافات پیدا ہوئے اور یہ پوری قوم دو حصّوں میں بٹ گئی۔ ایک حصّہ یہوذا کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا بنی اسرائیل کے۔ بقیہ خاندانوں کے نام اس کے بعد بالکل غیر معروف ہو کر رہ گئے۔ بعد کی تاریخ میں یہوذا اور اسرائیل دو ہی نام آتے ہیں۔ پھر جب یہ لوگ کلدانیوں کی اسیری میں مبتلا ہوئے ہیں تو تمام بنی اسرائیل کے لیے یہود کا لفظ ایک مشترک نام کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یہوذا اور یہود میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔"

"لفظ یہوذا کے اشتقاق میں یہود کو بڑا اشتباہ پیش آیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ لفظ یہو اور ذا سے مرکب ہے۔ یہو کے معنی اللہ کے اور ذا کے معنی ہذا کے ہیں۔ چوں کہ اس طرح یہو کے ساتھ ترکیب پائے ہوئے نام ان کے ہاں موجود ہیں اس وجہ سے ان کو یہ غلط فہمی پیش آئی اور یہوذا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کتاب پیدائش میں جو عبارت موجود ہے اس کو یہ لوگ نہ سمجھ سکے۔ سفر تکوین کی عبارت

یہ ہے۔

اور وہ (لیہ زوجہ یعقوب علیہ السلام) پھر حاملہ ہوئی اور اس کے بیٹا ہوا۔ تب اس نے کہا کہ میں اب خداوند کی ستائش کروں گی۔ اس لیے اس کا نام یہوذا رکھا۔ (پیدائش باب ۲۹ آیت ۳۵)

اس سے یہود نے یہ سمجھا کہ یہ لفظ اس واقعہ اور یہود کے لفظ کی طرف اشارہ کررہا ہے حالانکہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی حمد کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ الفاظ اس تاویل کے محتمل ہیں، اور مندرجہ ذیل امور اس کی تائید میں ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کے ناموں کے معانی کی طرف جس طرح ان کی ولادت کے ذکر کے سلسلہ میں اشارہ ہوا ہے اسی طرح اس موقع پر بھی اشارہ ہوا ہے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے لیے برکت کی دعا فرمائی ہے۔ مثلاً ولادت کے بیان کے سلسلہ میں کتاب پیدائش باب ۳۰ آیت ۱۹۔۲۰ میں ہے

اور لیاہ پھر حاملہ ہوئی اور یعقوب سے اس کے چھٹا بیٹا ہوا۔ تب لیاہ نے کہا کہ خدا نے مجھے اچھا مہر بخشا۔ اب میرا شوہر میرے ساتھ رہے گا کیونکہ میرے اس سے چھ بیٹے ہو چکے ہیں سو اس نے اس کا نام زبلون رکھا۔

پھر اسی کتاب میں دعائے برکت کے سلسلہ میں یہ الفاظ وارد ہیں۔

زبلون سمندر کے کنارے بسے گا ۴۹ / ۱۳

غور کرکے دیکھو، ان دونوں مواقع پر سکونت کے معنی کی طرف اشارہ موجود ہے۔

اسی طرح یہوذا کے متعلق اس کتاب میں جو دعا مذکور ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

اے یہوداہ! تیرے بھائی تیری مدح کریں گے۔

تیرا ہاتھ تیرے دشمنوں کی گردن پر ہوگا۔

تیرے باپ کی اولاد تیرے آگے سرنگوں ہوگی۔

اس سے واضح ہوا کہ یہوداہ کے تسمیہ میں درحقیقت حمد و طاعت کا مفہوم ملحوظ ہے۔ اور لفظ یہوذا یہو اور ذا سے مرکب نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہی لفظ ہے اور اس کا مادہ ہود ہے۔

دوسرا یہ کہ کلدانیوں کی اسیری کے بعد سے ان کے لیے مشترک طور پر جو نام استعمال ہوا ہے وہ یہود اور یہودی کا ہے۔ اس کے ثبوت عزرا، نحمیا، استیر، اشعیا، ارمیا، دانیال اور انجیل سب میں موجود ہیں یہاں تک کہ یہی نام زبان زدعوام و خواص ہوگیا۔ اگر اصل نام یہوذا ہوتا، جیسا کہ ان لوگوں کا دعویٰ ہے تو پھر اس کی طرف نسبت یہوذی (ذال کے ساتھ) ہونی چاہئے تھی نہ کہ دال کے ساتھ۔

تیسرا یہ کہ لفظ یہو کے ساتھ کسی ایسے ہی لفظ کو ملایا جاسکتا ہے جس کا ملایا جانا اس کے ساتھ موزوں ہو۔ لفظ ذا کوئی ایسا موزوں لفظ نہیں ہے جو کسی مخلوق کا نام رکھنے کے لیے اس کے ساتھ ملایا جائے کیوں کہ اس کے ملانے سے جو معنی بنتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی مخلوق کے لیے اس لفظ کا استعمال

ایک نہایت ہی مکروہ سی بات ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قرآن مجید نے یہاں اپنے عام قاعدے کے مطابق یہود کو ان کی ایک غلطی پر متنبہ کیا اور یہ واضح کیا ہے کہ لفظ یہود اجس کی طرف وہ اپنے کو منسوب کرتے ہیں اس کی اصل مادہ ہود سے ہے اور اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان کے نام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔[1]

لفظ نصاریٰ کی تحقیق

نصاریٰ، لفظ نصاریٰ کی تحقیق استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں مندرجہ ذیل بیان فرمائی ہے:۔

نصاریٰ نصران کی جمع ہے جس طرح ندامیٰ ندمان کی جمع ہے۔ شروع شروع میں نصاریٰ کا یہی نام تھا اور ان کے متقدمین اس نام کو پسند کرتے تھے لیکن متاخرین نے اپنے متقدمین کے برخلاف اس کو اپنی تحقیر سمجھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نصاریٰ بعد کے دور میں دو فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک فرقہ نے خلیفہ برحق شمعون (پطرس) کی پیروی کی، اس نے اپنے آپ کو نصاریٰ سے موسوم کیا۔ اس گروہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے۔ یہی گروہ ہے جس کی قرآن نے مختلف مقامات میں تعریف فرمائی ہے۔ مثلاً وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۸۲۔ مائدہ (اور تم اہلِ ایمان کی دوستی میں ان لوگوں کو زیادہ قریب پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو نصاریٰ کہا) اس آیت میں اس بات کی تصریح ہے کہ قرآن کا ممدوح گروہ وہی ہے جس نے اپنے آپ کو نصاریٰ سے موسوم کیا۔

ان کے دوسرے فرقہ نے مبتدع بولوس (پال) کی پیروی کی، موجودہ عیسائی اسی فرقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک نصاریٰ کا لفظ ایک تحقیر کا لفظ ہے۔ ان کے خیال میں یہ ایک گاؤں کی طرف نسبت ہے جو ایک نہایت حقیر سا گاؤں تھا۔ چنانچہ یوحنا باب ۴۵ میں ہے:۔

فلپس نے نتن ایل سے مل کر اس سے کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے وہ ہم کو مل گیا، وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔ نتن ایل نے اس سے کہا، کیا ناصرہ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے؟ یہ بات اس گروہ کے تکبر کی ایک دلیل ہے۔ اگر حضرت عیلیؑ کا مولد ناصرہ ہی ہے تو اس کی طرف منسوب ہونے میں حقارت کا کون سا پہلو ہے۔ جب کہ ان لوگوں کا دعویٰ بھی ہے کہ ناصرہ حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش ہے اور یہ کہ وہ ناصری کے لقب سے پکارے جائیں گے۔ چنانچہ متی باب ۲۰۴۲ میں ہے:۔

---

[1] اس تمام تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن میں تحقیق لفظ 'هَادُوْا'

اور نامرو نام ایک شہر میں جابسا تاکہ جو نبیوں کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا"۔ بعض مخالفین قرآن نے اس لفظ کو بھی قرآن پر اعتراض کا بہانہ بنایا ہے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ چوں کہ قرآن کو اس وجہ تسمیہ کا پتہ نہیں تھا اس وجہ سے اس نے نصاریٰ کو نصرت سے ماخوذ سمجھا ہے اور سورہ صف کی اس آیت میں اسی پہلو سے ان کا ذکر کیا ہے وَاِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ اَنْصَارِيٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (اور یاد کرو جب کہ عیسیٰ بن مریمؑ نے حواریوں سے کہا کہ خدا کی راہ میں میرا مددگار کون بنتا ہے، حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں) ہمارے نزدیک ان معترضین کا یہ اعتراض آیت کے مفہوم سے بالکل ناواقفیت پر مبنی ہے۔ یہاں قرآن مجید نے نصاریٰ کی وجہ تسمیہ نہیں بیان کی ہے بلکہ ایک امر واقعی بیان فرمایا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات اس آیت سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایک لطیف تلمیح اس بات کی طرف ہے کہ جو لوگ نصاریٰ کے نام سے موسوم ہیں انھیں حق کا مددگار ہونا چاہیے کیوں کہ اس کا اشارہ خود ان کے نام کے اندر موجود ہے۔ اس قسم کی لطیف تلمیحات انبیاء علیہم السلام کے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ چناں چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شمعون سے جن کا لقب صفا تھا فرمایا کہ "اور میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے اور میں اس پتھر پر اپنی کلیسا بناؤں گا" (متی ۱۶: ۱۸)[1]

لفظ صابئین کی تحقیق

صَابِئِيْنَ: صابئین کے متعلق اہل تاویل کے متعدد اقوال منقول ہیں۔ مجاہد اور حسن کے نزدیک یہ لوگ کسی خاص دین کے پیرو نہیں تھے بلکہ یہودیت اور مجوسیت کے بین بین تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک ان کا ذبیحہ حرام ہے۔ ابن زید کا قول ہے کہ یہ ایک مخصوص دین کے پیرو تھے اور جزیرہ موصل میں آباد تھے، ان کا عقیدہ توحید تھا لیکن نہ تو یہ کسی نبی اور کسی کتاب کے پیرو تھے اور نہ ان کے ہاں شرعی اعمال کا کوئی مخصوص نظام تھا۔ قتادہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ملائکہ کی پرستش کرتے، قبلہ کی طرف نماز پڑھتے اور زبور کی تلاوت کرتے تھے۔ ابوالعالیہ اور سفیان کے نزدیک یہ لوگ اہل کتاب ہی سے ایک فرقہ تھے۔

مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اقوال بظاہر متضاد نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان میں تضاد نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اول اول یہ لوگ دینِ حق پر تھے لیکن بعد میں یہ لوگ دینِ حق سے منحرف ہو کر ملائکہ اور ستاروں کی پرستش میں مبتلا ہو گئے۔ یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے جس طرح حضرت اسماعیلؑ کی اولاد پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر تھی لیکن بعد میں شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئی۔ قرآن مجید کی زیر بحث آیت سے مولاناؒ کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ قرآن نے اس گروہ کا جس انداز سے ذکر فرمایا ہے اس سے یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ یہ لوگ ابتداءً دینِ حق پر تھے۔ بعد میں بدعتوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہوتے۔ مولاناؒ کا قیاس

---

[1] اس تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن میں لفظ نصاریٰ کی تحقیق۔

یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر نماز کی عبادت معلوم ہوتا ہے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ اسی اشتراک کے سبب سے مشرکین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو صابئین کہتے تھے۔

ان کی وجہ تسمیہ سے متعلق مولاناؒ کا خیال یہ ہے کہ چوں کہ صباء کے معنی طلوع ہونے کے آتے ہیں اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنی ستارہ شناسی اور معرفت نجوم میں مہارت کے سبب سے اس نام سے مرسوم ہوئے ہوں۔

چوں کہ اس مذہب کے پیرؤوں کا وجود اب کہیں باقی نہیں رہا ہے اور نہ ان کی کوئی مستند تاریخ ہی موجود ہے اس وجہ سے ان کے متعلق اعتماد سے کوئی بات کہنا مشکل ہے لیکن قرآن مجید کے زمانہ نزول میں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرقہ کی حیثیت سے ان لوگوں کا وجود بالکل معروف تھا۔

۳۴۔ کیا اہل کتاب کے لیے رسول اللہ (صلعم) پر ایمان لانا ضروری نہیں؟

اس مجموعہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو تعلیمیں دی ہیں الفاظ اور جملوں کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان کی طرف بقدر ضرورت اشارہ کرتے آئے ہیں۔ اب ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ مجموعہ کی آخری آیت اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا الایہ ۶۲ پر ہم یہاں کچھ گفتگو کریں گے اس لیے کہ اس زمانہ کے بعض متکلمین اور منکرین سنت اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جو اہل کتاب اپنے اپنے صحیفوں کی تعلیمات پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کر رہے ہیں، قرآن مجید ان کی نجات کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ٹھہراتا۔ ان کے خیال میں ایسے اہل کتاب کی نجات کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے صحیفوں اور نبیوں کی تعلیم پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کریں۔ ان لوگوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں جن چیزوں سے استدلال کیا ہے ان میں بقرہ کی یہ آیت بھی شامل ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہم اس آیت کا سیاق و سباق اچھی طرح واضح کر دیں تاکہ جو لوگ قصداً غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

اس آیت کو اس خیال کی تائید میں پیش کرنے کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں ان کے خیال میں مسلمان، یہود، نصاریٰ اور صابئین تمام قابل ذکر مذہبی گروہوں کا نام لے کر تصریح کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ ان میں سے جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا اور عمل صالح کرتا ہے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے، اس کو نہ تو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ کوئی غم۔ ظاہر ہے کہ اگر اس آیت کا یہی مفہوم لیا جائے تو مذکورہ فرقوں کے لوگوں کے لیے نجات حاصل کرنے کے واسطے نہ تو رسول اللہ پر ایمان لانے کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ اللہ اور آخرت کے سوا ان دوسرے اجزائے ایمان پر ایمان لانے کی ضرورت باقی رہتی ہے جن پر ایمان لانا قرآن اور حدیث میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔

لیکن اس آیت کا یہ مفہوم صرف اس صورت میں لیا جا سکتا ہے جب سیاق و سباق اس بات پر دلیل

ہو کہ یہ آیت اجزائے ایمان کی تفصیل کے لیے نازل ہوئی ہے۔ آیت کے موقع و محل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سوال، جیسا کہ ہم اوپر بھی اشارہ کر چکے ہیں، یہ نہیں ہے کہ نجات کے لیے کن کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور کن چیزوں پر ضروری نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں کسی کو کوئی درجہ یا مرتبہ کسی مخصوص خاندان یا فرقہ یا گروہ سے نسبت رکھنے کی بنا پر حاصل ہوتا ہے یا ایمان اور عمل صالح کی بنا پر؟ اس سوال کا جواب قرآن مجید نے یہ دیا ہے کہ یہ چیز صرف ایمان اور عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتی ہے، یہ کسی خاص خاندان یا کسی گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اور مقصود اس سے یہود کے سامنے اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ انبیاء کے خاندان سے نسبت رکھنے کے سبب سے اپنے آپ کو وہ ایک نجات یافتہ گروہ جو سمجھنے لگے ہیں تو یہ سر تا سر ان کی غلط فہمی ہے۔ خدا سے نسبت حاصل کرنے کے لیے اصلی چیز اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح ہے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے مندرجہ ذیل حقائق بھی پیش نظر رکھیے۔

ایک یہ کہ یہ آیت اس سورہ میں وارد ہے جس کا عمود ہی، جیسا کہ ہم شروع میں تفصیل کے ساتھ واضح کر چکے ہیں[1]، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور یہ دعوت خاص طور پر یہود ہی کے سامنے پیش بھی اس سورہ میں کی گئی ہے۔ چنانچہ تلمیحات اور اشارات سے قطع نظر خاص یہ سلسلہ کلام جس کے خاتمہ پر زیر بحث آیت وارد ہے اس طرح شروع ہوتا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ
اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ
بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ وَاٰمِنُوْا
بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ
وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ وَلَا
تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ
فَاتَّقُوْنِ (۴۰-۴۱ بقرہ)

اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھی سے ڈرو اور ایمان لاؤ اس چیز پر جو میں نے اتاری ہے تصدیق کرتی ہوئی اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو اور میری آیتوں کو حقیر قیمت پر نہ بیچو اور مجھی سے تقویٰ اختیار کرو۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو صریح الفاظ میں مخاطب کر کے قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور اس کے انکار کو صریح الفاظ میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ غور کیجیے کہ قرآن پر ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر کس طرح ممکن ہے۔ اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ جب اس آیت میں قرآن اور رسول اللہ پر ایمان نہ لانے کو کفر قرار دیا گیا ہے تو اسی سلسلہ کلام میں چند ہی آیتوں کے بعد اس مضمون کی آیت کس طرح آسکتی ہے کہ اہل کتاب کے لیے قرآن پر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو فصل ۱

بغیر بھی ان کی نجات ہو سکتی ہے۔ یہ تو نہایت بھونڈے قسم کا تضاد ہوگا جو کسی عام کتاب میں بھی سخت معیوب ہے، چہ جائیکہ قرآن حکیم میں۔

دوسری یہ کہ یہی آیت تھوڑے سے تغیر الفاظ کے ساتھ سورۂ مائدہ میں وارد ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَ	بے شک جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور
الصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَ	صابی اور نصاریٰ، جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور
الْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	یوم آخرت پر اور اس نے عمل صالح کیا تو نہ ان پر کوئی
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۶۹ - مائدہ)	خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وہاں ٹھیک اس کے اوپر کی آیت یہ ہے:۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ	کہہ دو، اے اہل کتاب تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے
حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ	جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہ کرو اور اس
وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ	چیز کو قائم نہ کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی
وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ	جانب سے اتاری گئی ہے اور ان میں سے بہتوں
إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا	کے اندر وہ چیز جو تیری طرف تیرے رب کی جانب سے
فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ	اتاری گئی ہے سرکشی اور کفر کو بڑھاتی ہے تو تم اس
الْكَافِرِينَ (۶۸ - مائدہ)	کافر قوم کے حال پر غم نہ کرو۔

یہاں ظاہر ہے کہ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ سے مراد قرآن مجید ہے جس کے تورات اور انجیل کے ساتھ قائم کرنے کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے اور جس کو قائم کیے بغیر ان کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ سرے سے خدا کے نزدیک ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے چہ جائیکہ وہ اپنے آپ کو خدا کی محبوب اور چہیتی قوم سمجھیں۔ یہاں تورات و انجیل کو قائم کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ قرآن پر اور پیغمبر آخرالزماںؐ پر ایمان لاؤ کیوں کہ ان پر ایمان لانے ہی سے وہ عہد پورا ہوگا جو ان صحیفوں میں پیغمبر آخرالزماںؐ کے بارے میں تم سے لیا گیا تھا۔

اس مضمون کی مزید وضاحت اس کی اوپر کی آیتوں سے بھی ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوا ہے:۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَ	اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو
اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ	ہم ان سے جھاڑ دیتے ان کے گناہ اور ان کو نعمت
وَلَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝ وَلَوْ	کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات اور انجیل
أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ	کو قائم کرتے اور اس چیز کو قائم کرتے جو ان کے رب
وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا	کی جانب سے ان کی طرف اتاری گئی تو وہ اوپر اور

مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ
مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ
سَاءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ه يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ
بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَ
اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَ
اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۶۵-۶۷۔ مائدہ)

نیچے ہر طرف سے خدا کا فضل پاتے۔ ان میں سے ایک
جماعت میانہ رو ہے لیکن ان میں زیادہ ایسے ہیں جن کے
عمل نہایت بُرے ہیں۔ اے رسول جو چیز تم پر تمہارے
رب کی جانب سے اُتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا
دو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو گویا خدا کا پیغام نہیں پہنچایا
اور اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، اللہ کافروں
کو راہ یاب نہیں کرتا۔

اس آیت میں بھی تورات وانجیل کے قائم کرنے سے مراد درحقیقت قرآن (مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ) پر ایمان لانا اور اس کو قائم کرنا ہے کیوں کہ اس پر ایمان لانے ہی سے اس عہد کی تکمیل ہوتی تھی جو ان سے آخری پیغمبرؐ کے بارے میں تورات اور انجیل میں لیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس میں یہود و نصاریٰ کو یہ اطمینان بھی دلایا گیا ہے کہ انھیں اس بات کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اگر وہ قرآن پر ایمان لائے تو ان تمام دنیوی فوائد و منافع سے وہ محروم ہو جائیں گے جن سے اس وقت وہ متمتع ہو رہے ہیں۔ اگر وہ اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کرنے کے لیے اپنے موجودہ مفادات سے دستکش ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنی رحمتوں اور برکتوں کے دوسرے بہت سے دروازے کھول دے گا۔

تیسری یہ کہ قرآن مجید میں اس بات کی تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد سے اہل کتاب میں سے خدا کی رحمت میں سے وہی اہل کتاب حصہ پائیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے لیے رحمت کی دعا کی ہے تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ رحمت ان لوگوں کے لیے خاص ہوگی جو تقویٰ اختیار کریں گے۔ زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے جن کو پیغمبر آخر الزمان کی بعثت نصیب ہوگی وہ ان پر بھی ایمان لائیں گے۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً
وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ قَالَ عَذَابِيْٓ
اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ
كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ
يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا
يُؤْمِنُوْنَ ه اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ
النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا

اور ہمارے لیے اس دنیا میں اور آخرت میں بھلائی
لکھ دے، ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ فرمایا، میں اپنا
عذاب جس پر چاہتا ہوں نازل کرتا ہوں اور میری رحمت
ہر چیز کو عام ہے۔ سو میں اس کو لکھ رکھوں گا۔ ان لوگوں کے
لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکاۃ دیتے رہیں گے
اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ یعنی جو اس رسول
نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جس کو لکھا ہوا پاتے ہیں

عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ
بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ
الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ
عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ
فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ
وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ
مَعَهُ أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

(۱۵۵-۱۵۶- اعراف)

اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، جو ان کو حکم دیتا ہے نیکی کا اور روکتا ہے برائی سے اور حلال ٹھہراتا ہے ان کے لیے پاکیزہ چیزیں اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزیں اور ان سے دور کرتا ہے وہ بوجھ اور پھندے جو ان پر تھے۔ پس جو اس پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی تائید اور مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

چوتھی یہ کہ قرآن مجید میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کے لیے ہوئی ہے اور آپ نے تمام خلق کو عموماً اور اہل کتاب کو خصوصاً اپنی نبوت پر ایمان لانے کی نہایت غیر مبہم الفاظ میں دعوت بھی دی ہے چنانچہ اہل کتاب کو خاص طور پر مخاطب کر کے آپ نے ان لفظوں میں دعوت دی ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ
جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ
فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ
الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

(۱۵۷- اعراف)

کہہ دو، اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ اس اللہ کا جس کے لیے ہی ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو ایمان لاتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ یاب ہو۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نجات کے لیے جس طرح دوسروں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اہل کتاب کے لیے بھی ضروری ہے بلکہ قرآن کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے لیے دوسروں کے بالمقابل زیادہ ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے صحیفوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں اور علامتیں موجود تھیں اور ان سے ان کے نبیوں کے واسطے سے عہد لیا جا چکا تھا کہ جب آخری نبی کی بعثت ہو گی تو وہ اس پر ایمان لائیں گے اور سب سے آگے بڑھ کر اس کی مدد کریں گے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے ان کو مخاطب کر کے یہ کہا ہے کہ تمہارا فرض منصبی اس دعوت کو قبول کرنے میں سبقت کرنا ہے، تم اس کی تکذیب میں سبقت کرنے والے نہ بنو۔

یہاں یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ اس معاملہ میں قرآن مجید نے اچھے اہل کتاب اور برے اہل کتاب میں

کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ جہاں تک نجات کا تعلق ہے دونوں ہی قسم کے اہل کتاب کی نجات کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر اہل کتاب کے صالح لوگوں کی قرآن نے جگہ جگہ تعریف کی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی یہ نیکی ان کی نجات کے لیے کافی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا رویہ ان کی حق پسندی کے سبب سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اچھا تھا اور اس قسم کے سارے لوگ آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ دوسرے آسمانی مذاہب اور آسمانی صحیفوں کے بارے میں قرآن مجید کا یہ موقف ضرور ہے کہ وہ ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے لیکن اس تصدیق کے بھی یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ان کو محفوظ مانتا ہے اور اگر ان کے پیرو نیک نیتی کے ساتھ ان کی پیروی کرتے رہیں تو یہ چیزان کی نجات کے لیے کافی ہو جائے گی بلکہ وہ ان کے آسمانی ہونے کی تصدیق کے ساتھ بالکل غیر مبہم الفاظ میں یہ بات بھی کہتا ہے کہ ان صحیفوں میں بہت سی تحریفیں ہو چکی ہیں جن کے سبب سے یہ قابلِ اعتماد نہیں رہے۔ اب خدا کے دین کا محفوظ صحیفہ صرف قرآن ہے۔ اس کے سوا صراط مستقیم پانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد دنیا کے لیے صراط مستقیم پانے اور نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا جائے اور آپ کی پیروی کی جائے۔ اس کے سوا نجات حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ اس کلیہ میں اگر کسی استثنا کی گنجائش نکلتی ہے تو صرف ان لوگوں کے لیے نکلتی ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سرے سے پہنچی ہی نہ ہو لیکن اس معاملہ کا فیصلہ ہم اور آپ نہیں کر سکتے بلکہ وہ عالم الغیب ہی کر سکتا ہے جو سب کے حالات اور ہر ایک کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کون لوگ مستحق ہیں جنھوں نے حق کو ڈھونڈھنے کے لیے اپنی ذمہ داریاں ادا کیں لیکن دعوت نہ پہنچنے کے سبب سے وہ حق کو پانے سے محروم رہے۔ امید ہے کہ ایسے لوگوں کے عذر کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور ان سے ان کے علم ہی کے حد تک مواخذہ فرمائے۔

۳۵۔ مسلمانوں کے لیے ایک خاص تنبیہہ

آیت زیر بحث میں مسلمانوں کے لیے ایک خاص تنبیہہ بھی ہے جس کی طرف یہاں توجہ دلا دینا ضروری ہے۔ اس آیت میں اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سے مراد مسلمان بحیثیت ایک گروہ اور جماعت کے ہیں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ خواہ مسلمان ہوں یا یہود یا نصاریٰ یا صابی، کوئی ہو اللہ کے ہاں بہ حیثیت ایک گروہ کے سب برابر ہیں، ان میں سے کسی کو بھی خدا کے ہاں کوئی شرف اور عزت حاصل نہیں ہے مگر ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ سے۔ صرف ایمان اور عمل صالح ہی ہے جو خدا کے ہاں تقرب اور عزت کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ اس فہرست میں سر فہرست مسلمانوں کو رکھا ہے جس سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ اگر بہ حیثیت ایک گروہ کے خدا کے ہاں کسی عزت کی توقع کر سکتے تھے تو مسلمان کر سکتے تھے جن کو خدا نے دنیا کی اصلاح کے لیے آخری ملت اور

خیرامت کی حیثیت سے مبعوث فرمایا ہے لیکن ایمان اور عمل صالح سے الگ ہو کر ان کے لیے بھی خدا کے ہاں کوئی مقام نہیں ہے۔ پھر آخر میں صابئین کا ذکر کیا ہے جن کی حیثیت ایک غیر معروف فرقہ کی تھی۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خواہ کوئی گروہ کتنا ہی گمنام اور بے حیثیت ہو لیکن اگر اس کے پاس ایمان اور عمل صالح کی دولت موجود ہو تو اس کو اللہ کے ہاں اونچا سے اونچا مقام حاصل کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

جس طرح یہود نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نسبت رکھنے کے سبب سے اپنے آپ کو خدا کی ایک محبوب قوم سمجھ رکھا تھا اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ایمان اور عمل صالح کی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو گئے تھے اور سمجھنے لگے تھے کہ دوزخ کی آگ صرف دوسروں ہی کے لیے ہے، ان کے لیے نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو صرف عارضی طور پر، اسی طرح مسلمان بھی امتِ مرحومہ میں ہونے کا یہ مطلب سمجھنے لگے ہیں کہ ان کے لیے تو بہرحال خدا کے ہاں معافی ہے خواہ ان کے اعمال کچھ بھی ہوں۔ یہ آیت اس قسم کے تمام توہمات کی جڑ کاٹتی ہے اور مسلمانوں کو تنبیہ کرتی ہے کہ خدا کے ہاں ایمان اور عمل صالح کی کسوٹی پر سب سے پہلے جو پرکھے جائیں گے ان میں مسلمان سرفہرست ہیں۔

۳۶۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۶۳-۸۲

آگے بنی اسرائیل کو ان تمام عہد شکنیوں کی یاد دہانی کی جا رہی ہے جن کے وہ ابتدا سے خدا کی شریعت کے معاملہ میں مرتکب ہوتے رہے ہیں اور مقصود اس سے اس امر کو واضح کرنا ہے کہ کیوں وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو امامت کے منصب سے معزول کرے اور ان کی جگہ ایک دوسری امت کو اٹھائے جو اس کی شریعت کو از سر نو تازہ صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرے اور اس کو قائم کرے۔ یہ سلسلہ آگے دور تک جاتا ہے جس کے بیچ بیچ میں نئی برپا ہونے والی امت یعنی مسلمانوں سے مناسبِ موقع خطابات بھی ہیں لیکن یہ خطاب ضمنی ہیں۔ اصل خطاب یہود ہی سے ہے اور مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہود کی فرد قرارداد جرم کو پوری تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دینا ہے۔

آیات ۶۳-۸۲

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ
بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ
مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ
فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا

نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَاِذْ
قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا
اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ
صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ
لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾
قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ
مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا
وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧١﴾ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ ع ٨ ١٠ ٨
وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ
كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٣﴾
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ
قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا
لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ
اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٤﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا
لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ

بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا أَتُحَدِّثُوْنَهُمْ
بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٦﴾
أَوَلَا يَعْلَمُوْنَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٧﴾ وَ
مِنْهُمْ أُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا
يَظُنُّوْنَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيْهِمْ ثُمَّ النصف
يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ
لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿٧٩﴾ وَقَالُوْا
لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ أَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٠﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّأَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ
فَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿٨٢﴾ ع
ع ٩ ١١ ٩

ترجمہ آیات ٦٣ - ٨٢

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے تمہارا عہد لیا اور اٹھایا تمہارے اوپر طور کو۔ پکڑو اس
چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم
خدا کے غضب سے محفوظ رہو۔ پھر تم نے اس سب کے بعد اعراض کیا، تو اگر تم پر اللہ کی عنایت
اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم نامرادوں میں سے ہو چکے ہوتے۔ اور ان لوگوں کا علم تو تمہیں

سے ہوا جنھوں نے سبت کے معاملے میں حدودِ الٰہی کی بے حرمتی کی تو ہم نے ان کو دھتکارا کہ جاؤ، ذلیل بندر بن جاؤ۔ تو ہم نے اس کو نمونہ عبرت بنا دیا ان لوگوں کے لیے جو اس کے آگے اور پیچھے تھے اور اس کو خدا ترسوں کے لیے نصیحت بنایا۔ ۶۳-۶۶

اور یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو تو وہ بولے کہ کیا تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو۔ اس نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے بنوں۔ انھوں نے کہا اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ واضح کرے کہ گائے کیسی ہو؟ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو، نہ بچھیا، بیچ کی راس ہو۔ تو کرو جو تمھیں حکم دیا جا رہا ہے۔ بولے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ واضح کرے کہ اس کا رنگ کیا ہو؟ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ سنہری ہو، شوخ رنگ، دیکھنے والوں کے لیے دل پسند۔ بولے اپنے رب سے دعا کرو کہ اچھی طرح واضح کردے کہ وہ کیسی ہو، اس لیے کہ گایوں کے امتیاز میں گھپلا ہو رہا ہے۔ اور ان شاء اللہ اب ہم پتہ لگا لیں گے۔ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے بگیری، زمین کو جوتنے والی اور کھیتوں کو سیراب کرنے والی نہ ہو۔ بالکل یکرنگ ہو، اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ بولے، اب تم واضح بات لائے۔ پھر انھوں نے ذبح کی اور وہ ذبح کرتے نظر نہ آتے تھے۔ ۶۷-۷۱

اور یاد کرو جب کہ تم نے ایک نفس کو قتل کر دیا، پھر اس کے بارے میں ایک دوسرے پر الزام بازی کی، حالانکہ اللہ وہ سب کچھ ظاہر کرنے والا ہے جو تم چھپاتے رہے ہو۔ تو ہم نے کہا اس کو اس کے ایک جزو سے مارو۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ پھر اس سب کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے، پس وہ پتھر کے مانند

ہو گئے یا ان سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں، بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی جاری ہو جاتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خوفِ خدا سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۷۲-۷۴

کیا تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمھاری بات مان لیں گے اور حال یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا رہا ہے اور اس کو سمجھ چکنے کے بعد اس کی تحریف کرتا رہا ہے اور وہ جانتے ہیں اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، کیا تم ان کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ تمھارے رب کے پاس تم سے حجت کریں۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟ کیا انھیں نہیں معلوم ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۵-۷۷

اور ان میں اَن پڑھ ہیں جو کتابِ الٰہی کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعۂ خیال کرتے ہیں حالانکہ وہ صرف اٹکل کے تیر تکّے چلاتے ہیں۔ پس ہلاکی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شریعت تصنیف کرتے ہیں پھر دعوٰی کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑی سی قیمت حاصل کریں۔ پس ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو وہ کماتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ان کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر صرف گنتی کے چند دن۔ پوچھو کیا تم نے اللہ کے پاس اس کے لیے کوئی عہد کرا لیا ہے کہ اللہ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک ایسی تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے

میں تمھیں کچھ علم نہیں۔ البتہ جس نے کمائی کوئی بدی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کیے تو وہی لوگ جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۸۰-۸۲

۳۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۶۳)

میثاق کا مفہوم

مُوثق اور میثاق کے معنی عہد و پیمان کے ہیں۔ اس لفظ کی روح وثوق اور استحکام ہے اس وجہ سے یہ خاص طور پر اس عہد و پیمان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی اہم معاملہ کے لیے پورے شعور اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ باندھا گیا ہو اور جس کی وفاداری کا تاکید کے ساتھ اظہار و اقرار کیا گیا ہو۔ یہاں اس سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے تورات کی پابندی کا لیا گیا۔ شریعتِ الٰہی خدا اور بندوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو میثاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورۂ اعراف میں اس میثاق کا حوالہ اس طرح آیا ہے:

أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِم مِّيثَاقُ الْكِتَابِ أَن لَّا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ۗ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ۝ وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱۶۹-۱۷۱ اعراف)

کیا ان سے کتاب کے باب میں میثاق نہیں لیا گیا کہ اللہ کی طرف نہیں منسوب کریں گے مگر حق بات اور انھوں نے اس کو اچھی طرح پڑھا جو اس میں ہے اور دار آخرت کی کامیابی ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کریں، تو کیا تم سمجھتے نہیں! اور جو لوگ کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیں گے اور نماز قائم کریں گے (وہی لوگ مصلح ہیں)، ہم مصلحوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ اور یاد کرو جب کہ ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو اس طرح اٹھا لیا گویا وہ سائبان ہے اور انھوں نے گمان کیا کہ وہ ان پر گر کر رہے گا۔ لو اس کو جو ہم نے تم کو دیا ہے مضبوطی کے ساتھ اور جو کچھ اس میں ہے اس کو برابر یاد رکھو تاکہ تم خدا کے غضب سے محفوظ رہو۔

پہاڑ کو سر پر لٹکانے کا مفہوم

یہ معاہدہ قرآن مجید اور تورات دونوں میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل کے سرداروں سے دامن کوہ میں لیا گیا اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک سخت زلزلہ نے پہاڑ کو ہلا دیا۔ اگر زلزلہ کے وقت آدمی کسی اونچی دیوار کے زیرِ سایہ یا پہاڑ کے دامن میں بیٹھا ہو تو ایسا معلوم ہوگا کہ پہاڑ یا دیوار سائبان کی طرح سر پر لٹک رہے ہیں اور اوپر گرا چاہتے ہیں۔ اس حالت کو قرآن نے طور کو ان کے سروں پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔

قدرت اور جلال کا مظاہرہ

یہ پہاڑ ان کے سروں پر لٹکا دینا بنی اسرائیل کو معاہدہ پر مجبور کرنے کے لیے نہیں تھا کہ اگر وہ یہ معاہدہ نہیں کرتے ہیں تو اس پہاڑ سے وہ کچل کر رکھ دیئے جائیں گے۔ معاہدہ کو قبول کرنا یا نہ کرنا ایک امر اختیاری ہے۔ دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے زبردستی اور جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے یہ جو کچھ ہوا وہ محض اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے جلال کا ایک مظاہرہ تھا تاکہ بنی اسرائیل اس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ شریکِ معاہدہ ہو رہے ہیں وہ کوئی کمزور اور بے اختیار ہستی نہیں ہے بلکہ اس کی قدرت بے پناہ ہے معاہدہ کی پابندی کی شکل میں جس طرح دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے انعامات کی کوئی حد نہیں ہے اسی طرح اس کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کے غضب کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ طور جیسے عظیم پہاڑ کو ان کے سروں پر لٹکا سکتا اور اس سے ان کو کچل کے رکھ دے سکتا ہے۔

اصل میثاق

خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: یعنی اس تورات کو جو تمہارے لیے اللہ کا ایک عظیم عطیہ ہے، پوری مضبوطی اور پوری عزیمت کے ساتھ لو اور زندگی کے تمام مراحل میں پورے استقلال اور پوری پامردی کے ساتھ اس کے احکام اور اس کی ہدایات کو نباہو۔ اس کے احکام نرم بھی ہیں اور سخت بھی، نیز اس کی ذمہ داری یُسر میں بھی ہے اور عُسر میں بھی، اس وجہ سے کمزور ہاتھوں اور ڈھیلے ارادوں کے ساتھ اس کا حق ادا نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے قوت اور عزیمت مطلوب ہے۔

وَاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ: جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو، سے مراد احکام وہدایات بھی ہیں اور خاص طور پر وہ تنبیہات اور تہدیدات بھی جو اس میثاق کی خلاف ورزی کے نتائج سے متعلق بنی اسرائیل کو سنا دی گئی تھیں۔ تورات میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان کو آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ اس عہد پر قائم رہیں گے تو وہ زمین اور آسمان دونوں طرف سے خدا کا فضل پائیں گے اور اگر انھوں نے اس کی ناقدری کی تو دنیا اور آخرت دونوں میں اس کی سزا بھی بڑی ہی سخت ہوگی۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو، اس لیے کہ کتاب الٰہی کا اصل مقصد ہی راہ تقویٰ کی نشان دہی ہوتا ہے لیکن ہم نے موقع کلام اور سیاق وسباق کی روشنی میں اس سے خدا کے قہر وغضب سے بچنا مراد لیا ہے۔ ہمارا ذہن اس طرف اس وجہ سے گیا ہے کہ اس سے پہلے ان کو خاص طور پر، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان تنبیہات وتہدیدات کو یاد رکھنے کی نصیحت کی گئی ہے جو تورات میں میثاقِ الٰہی کی

خلاف ورزی کے نتائج سے متعلق ان کو سنائی گئی تھیں اور ان کے سنانے سے مقصود یہی تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں خدا کے قہر و غضب سے محفوظ رہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ (۶۴)

اسلاف کے اعمال کی نسبت اخلاف کی طرف

پھر تم اس سب کے بعد پھر گئے۔ یہ خطاب ظاہر ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن کے بنی اسرائیل سے ہے درآنحالیکہ یہ فعل اعراض ان کے پہلوں سے صادر ہوا تھا اور یہ لوگ اس راہ میں موجود نہیں بلکہ اپنے اگلوں کے مقلد تھے۔ یہ طرزِ خطاب اس حقیقت کی طرف نہایت بلیغ اشارہ کر رہا ہے کہ اگر اخلاف گمراہی یا ہدایت کے معاملہ میں ٹھیک ٹھیک اپنے اسلاف کے نقشِ قدم ہی پر چل رہے ہوں تو ان کی تاریخ اور ان کے اسلاف کی تاریخ گویا ایک ہی ہے۔ اسلاف کے افعال بے تکلف اخلاف کی طرف بھی منسوب ہوں گے اور اخلاف کی گمراہیوں کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہو گی جب سے ان کے اسلاف نے اس برائی کی اپنے معاشرے میں طرح ڈالی۔

مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ کا ترجمہ ہم نے اس سب کے بعد کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان اور قرآن میں اس اسلوب کے استعمالات سے واضح ہوتا ہے کہ ذَٰلِكَ جب اس طرح استعمال ہوتا ہے تو اوپر بیان کی ہوئی پوری سرگزشت کی طرف ایک جامع اشارہ کر دیتا ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ تورات کی پابندی کا میثاق باندھ چکنے، خدا کا جلال دیکھ لینے اور تمام تنبیہات و تہدیدات سے اچھی طرح واقف ہو چکنے کے بعد تمہارے اسلاف نے اس عہد سے منہ موڑا اور تم نے اس معاملہ میں ٹھیک ٹھیک انھی کی روش کی تقلید کی۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ الآیۃ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے اعمال و افعال تو شروع ہی سے ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں دھتکار دیتا لیکن یہ محض اس کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے تمھیں آج تک مہلت دی۔ اس کے اس فضل و رحمت کا حق یہ ہے کہ اس کے شکر گزار بنو اور اپنی اس روش کو درست کرو لیکن تم الٹے اپنی اس روش پر فخر کر رہے ہو۔ اور اس فخر میں مبتلا ہو کر اس آخری موقع کو بھی ضائع کرنا چاہتے ہو جس کے بعد تمہارے لیے اصلاحِ حال کا کوئی موقع بھی باقی نہیں رہے گا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (۶۵)

یہود کے نقضِ عہد کی ایک مثال

یہ اس نقضِ عہد کی ایک مثال ہے جس کا اجمالی ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت (ہفتہ) کا دن عبادت کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس دن ان کو کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو شریعت الٰہی کی ان پابندیوں سے آزاد کرنے کے لیے بہت سے شرعی حیلے ایجاد کر لیے۔ یہاں تک کہ سیر و شکار وغیرہ کی بھی بہت سی راہیں کھول لیں۔ اس آیت میں ان کی اسی قسم کی حرکتوں کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ یہ باتیں ان کے درمیان شہرت رکھتی تھیں اس وجہ سے قرآن نے اس کی طرف ایک معلوم و معروف حقیقت کی طرح اشارہ کر دیا ہے۔

فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ، لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس جرم کی پاداش میں

ان لوگوں پر لعنت فرمائی جن لوگوں نے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں سبت کی حرمت برباد کی۔

یہود کے مسخ کی نوعیت

اہل تاویل کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس لعنت کے نتیجہ میں ان کا ظاہر بھی بندروں کے مشابہ ہو گیا تھا یا یہ مسخ، صرف عقلی اور روحانی مسخ تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اختلاف کچھ زیادہ اہمیت رکھنے والا اختلاف نہیں ہے۔ انسان اور بندر کے درمیان شکل وصورت کا فرق بہت زیادہ نہیں ہے۔ اصلی فرق جو ہے وہ عقل اور ارادہ کا ہے۔ انسان کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی کوئی خواہش پوری کرتے وقت پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اس خواہش کو پورا کرنا جائز بھی ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو اس کے لیے کیا شرعی اور اخلاقی حدود وقیود ہیں؟ برعکس اس کے بندر کی کسی خواہش اور اس کے فعل کے درمیان اخلاقی حدود وقیود کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ جس چیز کو اس کا نفس چاہ بیٹھتا ہے اس کو وہ فوراً کر گزرتا ہے۔ اگر یہی حالت اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں کسی انسان کی یا کسی انسانی گروہ کی ہو جائے تو اس کے درمیان اور بندر کے درمیان کوئی معنوی فرق نہیں رہ جاتا ہے۔ صرف ایک ظاہری فرق تھوڑا سا رہ جاتا ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک عقل اور اخلاقی زوال اپنی آخری حد کو نہیں پہنچ جاتا۔ جب یہ زوال آخری حد کو پہنچ جاتا ہے تو یہ تھوڑا سا ظاہری فرق بھی بالآخر مٹ ہی کے رہتا ہے۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۶۶)

'نکال' کا مفہوم

نَکَال کے معنی نمونہ عبرت کے ہیں۔ یہاں اشارہ اس بستی کی طرف ہے جس بستی کے لوگوں نے سبت کی حرمت برباد کرنے کے لیے وہ ناروا جسارتیں کی تھیں جن کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ کیا گیا۔ بستیوں اور مقامات کے لیے قرآن مجید میں اس طرح ایک سے زیادہ مقامات میں ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس لعنت کے نتیجہ میں یہ بستی اپنے آگے پیچھے اور گرد و پیش کی بستیوں کے لیے نمونہ عبرت بنا دی گئی جس کو دیکھ کر عقل اور خوفِ خدا رکھنے والے نصیحت حاصل کر سکتے تھے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بستی سمندر کے کنارے تھی۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس بستی کے لوگ تجارت اور تمدن میں بہت ترقی کر چکے تھے لیکن اس لعنت کی پاداش میں ان کے اوپر ایسا زوال آیا کہ ان کا ظاہر اور باطن سب کچھ مسخ ہو کر رہ گیا اور وہ گرد و پیش کی بستیوں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک داستانِ عبرت بن کر رہ گئے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (۶۷)

یہود کے نقضِ عہد کی دوسری مثال

یہ یہود کے نقضِ عہد کی دوسری مثال بیان ہو رہی ہے اور اس مثال کو بیان کرنے کے لیے قرآن نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک ہی بات کو دو حصوں میں اس نے تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ذہنیت شروع ہی سے شریعت الٰہی کے قبول کرنے کے معاملہ میں کیسی حیلہ جویانہ

اور فرار پسندانہ رہی ہے اور اس کے دوسرے حصے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہزار حیلہ وحجت کے بعد جب وہ کسی بات کو قبول بھی کر لیتے رہے ہیں تو اس کی تعمیل بھی صحیح طریقہ پر نہیں کرتے تھے بلکہ اس حکم سے گریز کی راہیں تلاش کرتے تھے۔

اس چیز کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے بنی اسرائیل کی تاریخ سے قسامہ کے ایک واقعہ کو منتخب کیا ہے۔ قرآن مجید کے اشارات سے واقعہ کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی شخص قتل ہوگیا، جس کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگتا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اپنی شریعت کے قانون کے مطابق اس علاقہ کے لوگوں کو جہاں قتل ہوا تھا، یہ حکم دیا کہ وہ ایک گائے کی قربانی کر کے اس پر قسمیں کھائیں۔ ان لوگوں نے اوّل تو اس حکم کو ماننے ہی میں لیت ولعل کیے گائے کیسی ہو، اس کا رنگ کیسا ہو، عمر کتنی ہو وغیرہ وغیرہ لیکن بہ ہزار دقت کسی طرح گائے ذبح کی بھی تو معلوم ہوتا ہے کہ قسم جھوٹی کھائی۔

یہ بات کہ شریعت موسوی میں قسامہ کا طریقہ موجود تھا، کتاب استثنا کی مندرجہ ذیل آیتوں سے ثابت ہے۔

"اگر اس ملک میں جسے خداوند تیرا خدا تجھ کو قبضہ کرنے کو دیتا ہے کسی مقتول کی لاش میدان میں پڑی ہوئی ملے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے تو تیرے بزرگ اور قاضی نکل کر اس مقتول کے گرداگرد کے شہروں کے فاصلہ کو ناپیں اور جو شہر اس مقتول کے سب سے نزدیک ہو اس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے کبھی کوئی کام نہ لیا گیا ہو اور نہ وہ جوئے میں جوتی گئی ہو اور اس شہر کے بزرگ اس بچھیا کو بہتے پانی کی وادی میں جس میں نہ ہل چلا ہو اور نہ کچھ بویا گیا ہو لے جائیں اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن توڑ دیں۔ تب بنی لاوی جو کاہن ہیں نزدیک آئیں کیوں کہ خداوند تیرے خدا نے ان کو چن لیا ہے کہ خداوند کی خدمت کریں اور اس کے نام سے برکت دیا کریں اور ان ہی کے کہنے کے مطابق ہر جھگڑے اور مار پیٹ کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا کرے۔ پھر اس شہر کے سب بزرگ جو اس مقتول کے سب سے نزدیک رہنے والے ہوں اس بچھیا کے اوپر جس کی گردن اس وادی میں توڑی گئی، اپنے اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ ہمارے ہاتھ سے یہ خون نہیں ہوا اور نہ یہ ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے۔ (استثنا باب ۲۱۔ ۱۔ ۸)

اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا: بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس حکم کو ایک مذاق تصوّر کیا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ قاتل کا سراغ لگانے کے لیے یہ تدبیر بھی کوئی کارگر تدبیر ہو سکتی ہے حالانکہ جہاں سراغ لگنے کی ساری راہیں بند ہوں وہاں اگر کوئی آخری تدبیر ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ مقامِ قتل کے آس پاس کے سربرآوردہ لوگوں کو جمع کر کے ان سے قسمیں لی جائیں اور قسم کو زیادہ سے زیادہ احترام اور تقدیس کا رنگ دینے کے لیے یہ قسم قربان کیے ہوئے جانور پر لی جائے۔ معاہدات اور قسموں کے معاملہ میں زمانہ قدیم سے یہ رواج رہا ہے کہ یہ عموماً معابد کے سامنے انجام دیے جاتے تھے تاکہ فریقین جھوٹ اور منافقت سے احتراز کریں۔ بعض حالتوں میں یہ طریقہ بھی اختیار کیا جاتا تھا کہ قربانی کے جانور کا خون قسم کھانے والوں پر چھڑک کر ان سے قسم لی جاتی۔ ممکن ہے

بنی اسرائیل کے ہاں بھی قسامہ کی صورت میں یہ شکل اختیار کی جاتی رہی ہو اگرچہ اوپر کے حوالے میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب امعان فی اقسام القرآن میں اس قسم کی بعض صورتوں کا ذکر کیا ہے

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ جہل کا لفظ علم کے مقابل میں بھی آتا ہے اور حلم (دانش) کے مقابل میں بھی۔ یہاں یہ حلم کے مقابل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ اللہ کے دین کے معاملہ میں کوئی ہنسی مسخری کی بات کروں، یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ خدا کا حکم ہے اور اسی میں تمہارے لیے خیر و برکت ہے۔ یہ بات میں نے اپنی طرف سے نہیں گھڑی ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ (۶۸)

یہود کی ایک مزاجی خصوصیت

گائے کی قربانی کے حکم کے بعد یہ سوال جو بنی اسرائیل نے کیا یہ محض ان کے فساد مزاج کا پیدا کردہ تھا، فی الواقع یہ سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر ان کے مزاج میں سلامت روی ہوتی تو وہ متوسط درجہ کی کوئی سی گائے ذبح کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اس ذہنیت سے واقف تھا جو اس سوال کے پس پردہ چھپی ہوئی تھی اس وجہ سے سوال کا وہ جواب تو اس نے دے دیا جو ان کے اشتباہ کے دور کرنے کے لیے کافی تھا، یعنی یہ کہ گائے اپنی عمر کے لحاظ سے اوسط درجہ کی ہو لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی بے چون و چرا تعمیل کرو، اس قسم کے سوال کر کے نہ شریعت سے گریز کی راہیں تلاش کرو اور نہ اپنے لیے دین کی وسعتوں کو تنگ کرو۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاۗءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ (۶۹)

گائے کے رنگوں میں سنہرا اور زرد رنگ سب سے زیادہ دل پسند رنگ ہے۔ عرب شعرا اسی پسندیدگی کے سبب سے محبوبہ کے لیے بھی یہ صفت لاتے ہیں۔ "فاقع" کا لفظ اسی رنگ کی گہرائی اور شوخی کے لیے آتا ہے۔

اوپر کا سوال بھی اگرچہ غیر ضروری تھا لیکن عمر کی ایک حد متعین ہو جانے کے بعد تو گائے سے متعلق کسی سوال کی کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی لیکن اس کے بعد انھوں نے رنگ سے متعلق سوال کر دیا جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اس رنگ کی گائے متعین فرمائی جس رنگ کی گائے سب سے زیادہ خوش رنگ اور پسندیدہ سمجھی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ سوال کے جواب میں سب سے زیادہ پسندیدہ رنگ ہی کی ہدایت ہونی تھی لیکن یہی طرح کے سوالات ہیں جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل نے اپنے آپ کو شریعتِ الٰہی کی وسعتوں اور رخصتوں سے محروم کر کے اس کو اصر و اغلال کا ایک مجموعہ بنا لیا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ (۷۰)

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْـٰٔنَ

جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ (٧١)

رنگ کی وضاحت کے بعد بھی سوال کرنے والوں کی تشفی نہ ہوئی۔ انھوں نے مزید وضاحت چاہی تو ہدایت ہوئی کہ گائے کمیری نہ ہو، اس سے کھیتوں میں ہل چلانے اور پانی دینے کی خدمت نہ لی گئی ہو مزید یہ ہدایت ہوئی کہ بالکل یک رنگ ہو۔ اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔

اس طرح اپنے لیے گوناگون قیدیں اور پابندیاں بڑھوا چکنے کے بعد بولے کہ ہاں اب بات اچھی طرح واضح ہوئی۔

لفظ 'حق' کا مفہوم

حق کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

وہ چیز جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔ قیامت کو اسی معنی کے لحاظ سے حق کہا گیا ہے۔

وہ چیز جو اخلاقی حیثیت سے واجب ہو۔ عدل کو اسی اعتبار سے حق کہا گیا ہے۔

وہ چیز جو جھگڑے اور اختلاف کے درمیان قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہو۔ قرآن مجید کو حق کہنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

غایت اور مقصد کے مفہوم کے لیے بھی یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ آسمان و زمین کی خلقت کو اسی معنی کے لحاظ سے بالحق کہا گیا ہے۔

جو چیز اپنے ظہور کے لحاظ سے بالکل واضح اور بیّن ہو اس کو بھی حق کہتے ہیں۔

آیت زیرِ بحث میں حق کا لفظ اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس آخری سوال کے ساتھ ان کی زبان سے وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ (اور اب ہم انشاء اللہ پتہ لگا لیں گے) کے الفاظ نکلے۔ یہ الفاظ ان کے باطن پر عکس ڈالتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پے در پے سوالات کے بعد خود ان پر بھی اپنے سوالات کی نامعقولیت واضح ہو چکی تھی چنانچہ ان کے اسی احساس کی شاید یہ برکت تھی کہ ان کی زبان سے یہ کلمہ نکلا اور اس کلمہ کی برکت سے انھیں اس حکم کی تعمیل کی توفیق نصیب ہوئی ورنہ جس ذہنیت کا ان کی طرف سے اظہار ہو رہا تھا اس سے تو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ کبھی بھی اس حکم کی تعمیل کریں گے۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (٧٢)

دَرْءٌ کے معنی دفع کرنے اور پھینکنے کے ہیں۔ اسی سے تدارأتم ہے جو ادغام کے قاعدے سے اِدّٰرَءْتُمْ ہو گیا ہے۔ اس کے معنی آپس میں ایک دوسرے پر الزام لگانے کے ہیں۔

ایک جملہ معترضہ

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے جو کچھ تم چھپاتے رہے ہو) یہاں بطور جملہ معترضہ کے ہے۔ اس کے بعد کا ٹکڑا فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا (پس ہم نے کہا کہ اس کو اس کے بعض سے مارو) فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا سے لگتا ہوا ہے۔ اس جملہ معترضہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو قتل کر کے تم دنیا میں ایک دوسرے پر الزام ہاری

کرکے اسکو چھپانے کی کوشش کرسکتے ہو لیکن یاد رکھو کہ کوئی چیز اگر تم نے دنیا میں چھپالی تو وہ ہمیشہ چھپی نہیں رہ جائے گی بلکہ ایک دن اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ ظاہر کرکے رہے گا جو تم چھپاتے ہو۔

یہ وَاِذْ قَتَلْتُمْ سے گائے کے ذبح کے حکم کا اصل مقصد بیان ہو رہا ہے۔ اوپر یہ واضح کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل جو آج خدائی شریعت کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، ان کی ذہنیت اس شریعت کے قبول کرنے کے معاملہ میں کیا رہی ہے۔ وہ کس طرح قدم قدم پر اس کے قبول کرنے کے معاملہ میں طرح طرح کی حجتیں کرتے رہے ہیں۔ اب وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا سے آگے کے حصہ میں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ گائے کے ذبح کا یہ حکم کس مقصد سے دیا گیا تھا اور اس معاملہ میں انھوں نے کیا روش اختیار کی۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۷۳)

"اس کو اس کے بعض سے مارو" عام طور پر اہل تاویل نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ مقتول کو گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا چھوا دو جس سے وہ زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ اگرچہ یہ مطلب لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے، لیکن قسامہ کے تعلق سے کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ قسم لینے کی طرف اشارہ ہو یعنی مقتول پر قربان کی ہوئی گائے کا خون چھڑکو اور آس پاس والوں سے قسم لو۔ واقعہ کی تفصیل کے بجائے اس کی طرف صرف اشارہ اس لیے کافی سمجھا گیا ہو کہ یہاں مقصود واقعہ کو بیان کرنا نہیں بلکہ بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے ایک واقعہ کو صرف جتا دینا تھا۔

یہ مطلب لینے کی صورت میں كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى کا ٹکڑا بنی اسرائیل کی اس بات کا جواب ہوگا جو انھوں نے گائے ذبح کرنے کا حکم سن کر کہی تھی کہ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (کیا تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو) یعنی تمھارے نزدیک تو یہ حکم ایک مذاق ہے لیکن اگر تم اس پر اس کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ عمل کرو اور اس قربانی اور قسم میں ایمان داری برتو تو یہی راستہ ہے قاتلوں کے سراغ لگنے اور ان سے قصاص لینے کا جس میں سب کے لیے زندگی ہے۔

قصاص میں سب کے لیے زندگی ہے

یہ بات کہ قصاص میں سب کے لیے زندگی ہے قرآن مجید میں واضح طور پر مذکور ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۱۷۹۔ بقرہ (اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو) تورات میں بھی ایک کے قتل کو سب کا قتل اور ایک کے قصاص کو سب کی زندگی قرار دیا گیا تھا۔ قرآن مجید میں اس حکم کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔

كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ	ہم نے بنی اسرائیل پر یہ فرض کیا کہ جس نے کسی جان کو
نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا	قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی جان کو قتل کیا ہو یا
قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ	ملک میں بدامنی برپا کی ہو اس نے گویا سب کو قتل کیا اور

اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا (۳۲۔ مائدہ) جس نے اس کو زندہ کیا اس نے گویا سب کو زندہ کیا۔

اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر قانون قصاص کا یہ فلسفہ واضح تھا کہ قصاص نہ لینے میں سب کی موت اور قصاص لینے میں سب کی زندگی ہے۔

وَيُرِيۡكُمۡ اٰيٰتِهٖ کا تعلق اس صورت میں جملہ معترضہ سے ہوگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات کی نشانیاں دکھا رہا ہے کہ جو کچھ تم چھپا رہے ہو اس میں سے کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی رہنے والی نہیں ہے بلکہ ہر چیز ظاہر ہو کے رہے گی۔ یہ اشارہ ان باتوں کی طرف ہوگا جن کو یہود نے چھپانے کی کوشش کی اور جن کو چھپانے کے لیے دین میں طرح طرح کی تحریفیں کیں لیکن اب وہ قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ایک ایک کر کے ظاہر ہو رہی تھیں۔ یہ اس بات کی کھلی ہوئی نشانی تھی کہ خدا سے کسی بات کو چھپانے کی کوشش ایک بے سود کوشش ہے، وہ ایک دن سارے رازوں سے پردہ اٹھا دے گا۔

ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالۡحِجَارَةِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَةً ‌ؕ وَاِنَّ مِنَ الۡحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنۡهُ الۡاَنۡهٰرُ‌ ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ ‌ؕ وَاِنَّ مِنۡهَا لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ‌ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ (۷۴)

دل کب سخت ہوتا ہے؟

"پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے"۔ یہاں ثُمَّ کے استعمال سے یہ بات نکلتی ہے کہ دین کے معاملہ میں تمہاری اس قسم کی کٹھ حجتیوں اور فرار پسندیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ تمہارے دل سخت ہو گئے۔ یہاں اگرچہ تصریح نہیں ہے لیکن سیاق کلام دلیل ہے کہ بنی اسرائیل نے جس طرح گائے کے ذبح کے حکم کی تعمیل میں بہت سی حجتیں پیدا کیں اسی طرح اس کے ذبح کے بعد بھی اس قربانی کا صحیح احترام ملحوظ نہیں رکھا بلکہ جھوٹی قسمیں کھا کر قاتل کو چھپانے کی کوشش کی۔ کسی جرم کے ساتھ جب حیلہ بازی اور کٹھ حجتی اور پھر مزید براں ڈھٹائی اور جسارت بھی شامل ہو جائے تو ایسے مجرموں کے دل خدا کے قانون کے مطابق پتھر کے مانند سخت ہو جایا کرتے ہیں جس کے بعد نیکی اور تقویٰ کی روئیدگی کی صلاحیت ان کے اندر بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔

بگڑا ہوا دل پتھر سے زیادہ سخت ہوتا ہے

فَهِىَ كَالۡحِجَارَةِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَةً (پس وہ پتھر کے مانند ہو گئے یا پتھر سے بھی زیادہ سخت) یہ اسی طرح کا اسلوب کلام ہے جیسا کہ دوسری جگہ وارد ہے اُولٰٓئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ۱۷۹- اعراف (یہ لوگ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ) یہ محض مبالغہ کا ایک اسلوب بیان نہیں ہے بلکہ یکسر تعبیر حقیقت ہے۔ جمادات وغیرہ میں جو سختی ہوتی ہے وہ سختی ان کو ان صلاحیتوں سے محروم نہیں کرتی جو قدرت کی طرف سے ان کے اندر ودیعت ہوتی ہیں۔ برعکس اس کے انسان اگر اپنے آپ کو بگاڑتا ہے تو اس کا بگاڑ آہستہ آہستہ قانونِ الٰہی کے بموجب ان تمام صلاحیتوں سے اس کو محروم کر دیتا ہے جو فطرت کی طرف سے اس کو ودیعت ہوئی ہوتی ہیں۔ پتھر سخت سے سخت تر ہو کر بھی پتھر ہی رہتا ہے۔ اس کی رگوں کے اندر پانی کی سوت جاری کرنے کی صلاحیت اگر قدرت نے رکھی ہوتی ہے تو اس سختی کے باوجود یہ چیز اس کے اندر باقی رہتی ہے۔ برعکس

اس کے انسان کا دل اگر کسی اخلاقی بیماری کے سبب سے سخت ہو جائے تو اس کے دل کی تمام سوتیں بالکل خشک ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بگڑے ہوئے انسان کے بگاڑ کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں کر سکتی اگرچہ وہ کتنی ہی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ جو فرمایا کہ "پتھروں میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل پڑتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خشیت الٰہی سے گر پڑتے ہیں" یہ پتھروں کی انھی فطری صلاحیتوں کی طرف اشارات ہیں جو قدرت نے ان کے اندر ودیعت کر رکھی ہیں اور جو بہر صورت باقی رہتی ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ محض کوئی شاعرانہ اسلوب بیان نہیں ہے جس کا واقعات کی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ یہ تلمیح ہے ان مشاہدات کی طرف جو صحرا کی زندگی میں خود بنی اسرائیل کی نگاہوں کے سامنے گزر چکے تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ایک چٹان سے اکٹھے بارہ چشمے پھوٹتے اور طور کے ایک حصہ کو تجلی الٰہی سے پاش پاش ہوتے دیکھا تھا لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی ان کے اپنے دلوں کی سختی کا یہ حال رہا کہ وہ کسی نشانی کو بھی دیکھ کر نرم نہیں ہوتے تھے۔ پھر اس بات میں شبہ کرنے کی کہاں گنجائش رہی کہ ان کے دلوں کی سختی پتھروں اور چٹانوں کی سختی سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ "اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے رہے ہو" یعنی اپنے شرف و تقدس، اپنی بڑائی اور بزرگی اور اپنی پاکیٔ دامن کی حکایت تو وہ بڑھائے جس کے کارنامے ڈھکے چھپے ہوئے ہوں اور اس کے سامنے بڑھائے جو بے خبر اور بے علم ہو، جو ہر بات سے باخبر ہو اس کے سامنے اس قسم کے ادعا اور غرور سے کیا حاصل!

أَفَتَطْمَعُوْنَ أَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۷۵)

ایک التفات

یہود سے خطاب کے بیچ میں یہ مسلمانوں کی طرف اسی طرح کا التفات ہے جس طرح کا التفات آیات ۶-۷، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور آیات ۲۱-۲۹ میں بنی اسمٰعیل کی طرف گزرا ہے۔ اس التفات کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا کہ وہ بنی اسرائیل کی مخالفت سے نہ بددل ہوں اور نہ اس پر متعجب کہ یہ پڑھے لکھے اور دین و شریعت کے عالم لوگ اس دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کے ذہن ایسے ٹیڑھے واقع ہوئے ہیں کہ ایک بات کو اپنے نبی کی زبان سے سننے اور اس کا مدعا واضح طور پر سمجھ چکنے کے بعد بھی اس میں ٹیڑھ پیدا کرتے رہے اور اس کو اس کے منشا کے بالکل خلاف سمت میں موڑتے رہے ہیں، جیسا کہ گائے کی قربانی کے حکم کے معاملہ میں تم نے سنا، کیا ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگوں یا ان کی تقلید کرنے والوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمھاری سیدھی سے سیدھی بات بھی سیدھے طریقہ سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

دوسرا مسلمانوں کو ان یہود کی بعض پس پردہ حرکات سے آگاہ کرنا، تاکہ جو سادہ لوح مسلمان ان کے فریبکارانہ دعوائے ایمان سے دھوکے میں آکر ان سے حسنِ ظن رکھنے لگے تھے یا ان سے ربط ضبط بڑھانے کے خواہشمند تھے وہ متنبہ ہوجائیں کہ یہ تمام تر فریب کاری ہے، اس میں سچائی کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔

تحریف کا مفہوم اور اس کی شکلیں

یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَہٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْہُ؛ حَرَفَ الشَّیْءَ عن وجھہ کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے صحیح رُخ سے موڑ کر دوسری سمت میں کر دینا۔ اسی سے حَرَّفَ القول یا حَرَّفَ الکلام ہے جس کے معنی بات یا کلام کے بدل دینے کے ہیں۔ اس بدل دینے کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

ایک بات کی دیدہ و دانستہ ایسی تاویل کر دی جائے جو قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہو۔

کسی لفظ کے طرزِ ادا اور قرأت میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جو لفظ کو کچھ سے کچھ بنا دے۔ مثلاً مروہ کو بگاڑ کر مرہ یا مریا وغیرہ کر دیا گیا۔

کسی عبارت یا کلام میں ایسی کمی بیشی کر دی جائے جس سے اس کا اصل مدعا بالکل خبط ہو کر رہ جائے مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے ہجرت کے واقعہ میں یہود نے اس طرح ردوبدل کر دیا کہ خانہ کعبہ سے ان کا کوئی تعلق ثابت نہ ہو سکے۔

کسی ذو معانی لفظ کا وہ ترجمہ کر دیا جائے جو سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہو۔ مثلاً عبرانی کے ابن کا ترجمہ بیٹا کر دیا گیا درآنحالیکہ اس کے معنی بندہ اور غلام کے بھی آتے ہیں۔

ایک بات کا مفہوم بالکل واضح ہو لیکن اس کے متعلق ایسے سوالات اٹھا دیئے جائیں جو اس واضح بات کو مبہم بنا دینے والے یا اس کو بالکل مختلف سمت میں ڈال دینے والے ہوں۔

اہل کتاب تحریف کی ان تمام قسموں کے مرتکب ہوئے اور قرآن نے ان کو ان سب کا مجرم گردانا ہے۔ موقع موقع کے لحاظ سے آگے اس کتاب میں ہر ایک کی تفصیل ضروری دلائل کے ساتھ انشاء اللہ آئے گی۔ یہاں اجمال کے ساتھ صرف اس کی مختلف صورتوں کو اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ تحریف پر تحریف کا اطلاق صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب وہ دیدہ و دانستہ اور سمجھ بوجھ کر کی جائے۔ قرآن مجید نے اس کے ساتھ قید لگائی ہے مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْہُ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ (بعد اس کے کہ انھوں نے اس کو سمجھ لیا اور وہ جانتے تھے کہ وہ تحریف کر رہے ہیں) یہی علم و شعور ہے جو درحقیقت تحریف کو ایک سنگین جرم بناتا ہے اور اس جرم کی سزا میں اس جرم کے مرتکبین اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے نورِ علم سے یک قلم محروم کر دیئے جاتے ہیں۔

یہود کے دعوائے ایمان کی حقیقت

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَھُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ لِیُحَآجُّوْکُمْ بِہٖ عِنْدَ رَبِّکُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۷۶)

اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں؛ یعنی دین و ایمان کے اجارہ دار تنہا مسلمان ہی نہیں ہیں، ہم بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اس قول سے ان کا مطلب جیسا کہ آیات ۸۔۹ کی تفسیر

کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں، محض مسلمانوں کو دھوکا دینا ہوتا تھا۔ وہ اس قول کے ظاہر الفاظ سے مسلمانوں کو فریب دیتے تھے تاکہ مسلمان ان کے اوپر اعتماد کرنے لگیں، خود اپنے ذہن میں وہ اس کا مطلب یہ لیتے تھے کہ وہ اپنے نبیوں اور اپنے صحیفوں پر تو ایمان رکھتے ہی ہیں، ایمان اور کس چیز کو کہتے ہیں۔ قرآن نے یہاں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے اس قسم کے پر فریب جملوں کے دام میں آکر ان سے کچھ اچھی امیدیں نہ لگا بیٹھیں اس لیے کہ ان کی خلوت اور جلوت کی باتوں میں بڑا فرق ہے۔ سامنے تو یہ آمنا کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب یہ اپنی خاص مجلسوں میں ہوتے ہیں تو وہاں آپس میں ایک دوسرے کا بڑی شدت سے محاسبہ کرتے ہیں۔ اگر اظہار رواداری کے جوش میں تمہارے سامنے ان میں سے کسی کی زبان سے غلطی سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جو اسلام کے حق میں ہوتی ہے تو یہ اپنی مجلسوں میں اس پر سختی سے گرفت کرتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں کے سامنے نبی آخر الزمانؐ اور اسلام سے متعلق وہ باتیں کھولتے ہو جو خدا نے اپنے صحیفوں کے ذریعے سے صرف تم پر کھولی ہیں اور اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ تمہارے انھی بیانات کو مسلمان قیامت کے دن تمہارے خلاف شہادت اور حجت کے طور پر پیش کر سکتے ہیں[1]۔

اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ (۷۷) یوں تو یہ جملہ عام ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے لیکن یہاں موقع کلام اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ دھوکا بازی کرتے ہوئے اس بات پر غور نہیں کرتے کہ خدا ان کے اس آمنا کی حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف ہے جس کو وہ ظاہر کرتے ہیں اور ان کی خاص مجلسوں میں آپس میں ایک دوسرے کو مسلمانوں کے سامنے افشائے راز پر جو سرزنشیں اور ملامتیں ہوتی ہیں ان کو بھی وہ خوب جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ احمق لوگ مسلمانوں کے سامنے تو اپنے آپ کو ظاہر داری کے اس لبادہ میں چھپا سکتے ہیں لیکن اس خدا سے انھوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کیا تدبیر سوچی ہے جو ان کی خلوت و جلوت ہر جگہ موجود ہے اور جس پر ظاہر و مخفی سب کچھ روشن ہے!

'اُمّی' سے مراد وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۷۸)

اُمِّيُّوْنَ، امی کی جمع ہے جس کے معنی تحریر و کتابت اور مدرسی تعلیم سے ناواقف کے ہیں۔ اس سے مراد یہاں یہود کے ان پڑھ عوام ہیں۔

ان کے علیحدہ ذکر کرنے سے یہاں یہ بات نکلتی ہے کہ اوپر کی آیتوں میں فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ کے الفاظ سے جس گروہ کا ذکر ہوا ہے اس سے یہود کے پڑھے لکھے اور ہوشیار لوگ مراد ہیں۔ ان کی جو حرکتیں بیان ہوئی ہیں وہ بھی ہوشیاروں اور پڑھے لکھوں ہی کی ہو سکتی ہیں۔ اللّٰہ کے کلام میں تحریف کرنا اور مسلمانوں کو چکمہ دینے کی کوشش کرنا ظاہر ہے کہ عوام کالانعام کا کام نہیں ہو سکتا۔ عیاروں اور چالاکوں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کا ذکر کرنے اور مسلمانوں کو ان کی طرف سے مایوس کرنے کے بعد اب یہ یہود کے عوام کا ذکر فرمایا اور یہ واضح کیا کہ مسلمانوں کو ان سے بھی توقع حق

---

[1] اس موقع پر اسی سورہ کی تفسیر آیات ۴۰ - ۴۶ تدبر قرآن میں پڑھ لینی چاہیئے۔ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ایک ہی مضمون دونوں جگہ بیان ہوا ہے۔

کی توقع نہیں رکھنی چاہیے اس لیے کہ جس طرح پہلا گروہ خرارت اور حیلہ بازی میں مبتلا ہے اسی طرح یہ دوسرا گروہ بھی جھوٹی آرزوؤں اور اوہام میں مبتلا ہے۔

یہود کے اماں کی بیماری

ان کی بیماری یہ بتائی ہے کہ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ (یہ تورات کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعہ سمجھتے ہیں) اَمانیّ اُمنیۃ کی جمع ہے جس کے معنی آرزو، تمنا اور خواہش کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی کتاب کی اصل حقیقت سے تو کچھ واقف نہیں کہ اس میں ان کو کیا تعلیم دی گئی ہے، کیا نہیں دی گئی ہے بس ان کے ذہن میں کچھ تمنائیں اور خواہشات ہیں جو اگرچہ بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں لیکن ان کے علماء کی غلط تعلیم سے ان کے اندر رچی بسی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی کتاب کو اپنی انھیں خواہشات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کی کتاب ان کے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتی بلکہ صرف ان کی ان خواہشات کی سند تصدیق عطا کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ قرآن مجید نے ان کی اس قسم کی بعض آرزوؤں کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (۸۰۔ بقرہ)	اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔
وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (۱۱۱۔ بقرہ)	اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں نہیں جائیں گے مگر یہودی اور نصرانی۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔
قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۹۴۔ بقرہ)	کہہ دو کہ اگر آخرت کی کامیابیاں اللہ کے نزدیک دوسروں کے مقابل میں تمہارے ہی لیے مخصوص ہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (۱۸۔ مائدہ)	اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔

یہ ان کی آرزوؤں میں سے صرف چند بطور مثال ذکر ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے اوہام میں مبتلا اور ایسے لذیذ خواب دیکھ رہے ہوں جن پر ذمہ داری کا (چند رسوم کی ادائیگی کے سوا) کوئی بوجھ بھی نہ ہو اور حقوق جن کے لیے سارے کے سارے خدا کے ہاں محفوظ ہوں، وہ اس قرآن پر ایمان لانے والے کس طرح بن سکتے تھے جو ان کو ان لذیذ خوابوں سے بیدار کر کے زندگی کی حقیقتوں اور اس کی اصلی ذمہ داریوں کے سامنے کھڑا کرنا چاہتا تھا۔

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ تمام آرزوئیں محض ان کے اور ان کے علماء کے ذہن کی پیداوار ہیں، ان کو اصل حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا
فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (۷۹)

من گھڑت فتوے — اس سورہ کے شروع میں لفظ کتاب کی تشریح کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ لفظ قرآن میں دوسرے معانی کے ساتھ شریعت کے احکام و قوانین کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ فتوے اور احکام ہیں جو علمائے یہود بغیر کسی شرعی سند کے محض اپنی دنیوی اغراض اور اپنے عوام کو خوش رکھنے کے لیے جاری کرتے تھے اور دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہی اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔

"اپنے ہاتھوں لکھنے" کا مطلب یہ ہے کہ ان فتووں کے لیے کتابِ الٰہی کے اندر کوئی بنیاد اور سند نہیں ہوتی تھی، محض ان کے طبع زاد اور من گھڑت فتوے ہوتے تھے لیکن وہ ان کو منسوب خدا اور اس کی شریعت کی طرف کرتے تھے۔ اسی طرح کے فتوے تھے جن سے ان کے عوام شریعت کی حقیقی ذمہ داریوں سے بے پروا ہو کر ان اوہام میں مبتلا ہوئے جن کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ ہوا ہے اور اسی راہ سے ان کے دین میں ان چیزوں کی ملاوٹ ہوئی جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

لِيَشْتَرُوا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (تاکہ اس کے عوض حقیر قیمت حاصل کریں) حقیر اس لیے کہ یہ دین فروشی وہ محض اپنے دنیوی اغراض کے لیے کرتے تھے اور دنیا کا بڑے سے بڑا فائدہ بھی اگر دین کو فروخت کر کے حاصل کیا جائے تو بہرحال وہ حقیر ہی ہے۔

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ: (ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے بھی جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور اس چیز کے سبب سے بھی جو وہ اس کے عوض میں کماتے ہیں) یعنی آخرت میں یہ دونوں چیزیں ان کے لیے الگ الگ خرابی اور تباہی کا سبب بنیں گی۔ ان کا یہ اپنے جی سے شریعت تصنیف کرنا بھی سبب تباہی اور اس کے عوض میں دنیوی منافع حاصل کرنا بھی موجب تباہی!

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۸۰)

جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال — "اور وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔" یہ ان جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ یہود اپنے لیے کسی صورت میں ابدی عذاب دوزخ کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے جنت و دوزخ کو اعمال کا نتیجہ اور اعمال پر مبنی سمجھنے کے بجائے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ خدا کی برگزیدہ امت ہیں اس وجہ سے خواہ ان کے اعمال کچھ ہوں، اول تو وہ دوزخ میں بھیجے ہی نہیں جائیں گے اور اگر بھیجے بھی گئے تو معمولی طور پر کچھ سزا بھگت کر جنت کو واپس کر دیے جائیں گے۔ ان کے اس واہمہ نے ان کے عوام اور خواص سب کو شریعت کی ذمہ داریوں سے بالکل بے پروا کر دیا۔ نجات کے معاملہ میں ان کا سارا اعتماد عمل اور عقیدہ کے بجائے اپنی گروہی نسبت پر رہ گیا تھا اور بدقسمتی سے ہم مسلمان بھی کچھ اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: "یا تم اللہ کی طرف وہ بات منسوب کر رہے ہو جو جانتے نہیں۔" "جانتے نہیں" یعنی جس کی سند تمھاری کتاب میں موجود نہیں، بس ایک بات تم نے اپنے جی سے گھڑ کر اپنے خدا کی طرف منسوب

کر دی ہے۔ حالانکہ تم سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ تم خدا کی طرف حق بات کے سوا کوئی بات منسوب نہیں کرو گے۔

اَلَمْ یُؤْخَذْ عَلَیْهِمْ مِّیْثَاقُ الْکِتٰبِ اَنْ لَّا یَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (۱۶۸ - اعراف)

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۸۱)

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۸۲)

یہود کے واہمہ کی تردید

یہ یہود کے اس واہمہ کی تردید ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ یعنی جنت اور دوزخ کا تعلق خاندانی اور گروہی نسبتوں سے نہیں بلکہ تمام تر عمل سے ہے۔ جو شخص کسی برائی کا ارتکاب کرے اور وہ برائی اس کو اپنے گھیرے میں لے لے تو اس کے لیے خلود فی النار ہے خواہ اس کا تعلق کسی گروہ سے ہو۔ برعکس اس کے جو شخص ایمان اور عمل صالح کی روش پر قائم رہے اس کے لیے خلود فی الجنة ہے خواہ اس کا تعلق کسی خاندان سے ہو۔

جس طرح اس سورہ کے پہلے سلسلۂ بیان کے خاتمہ پر اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا الآیة والی آیت وارد ہوئی تھی اسی طرح اس دوسرے سلسلہ بیان کے خاتمہ پر یہ بَلٰی مَنْ کَسَبَ الآیة والی آیت وارد ہوئی ہے۔ ان دونوں آیتوں کا موقع اور مقصد بالکل ایک سا ہے اس وجہ سے ان دونوں کو ایک دوسرے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آگے مناسب مقام پر اس کی مزید شرح آئے گی۔

۳۸- آگے کا مضمون —— آیات ۸۳-۹۶

یہود کے لیے، قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے معاملہ میں جو چیز حجاب بن گئی تھی وہ ان کا یہ گھمنڈ تھا کہ وہ خود کتاب اور شریعت کے حامل ہیں اور ایک ایسے برگزیدہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کو خدا نے دینی و مذہبی پیشوائی اور دنیا و آخرت دونوں میں اپنی محبت و محبوبیت کے لیے خاص کر لیا ہے۔ ایک ایسا برگزیدہ گروہ اول تو اس بات کا محتاج ہی کب ہے کہ وہ کسی اور کتاب و شریعت پر ایمان لائے۔ ثانیاً اس کے سوا کسی اور کو اللہ تعالیٰ کتاب و شریعت دے کس طرح سکتا ہے؟

یہود کے استکبار پر ضرب

قرآن نے یہاں پہلے ان کے اس استکبار پر ضرب لگائی اور فرمایا کہ وہ اپنے آپ کو کتاب و شریعت کا جو حامل سمجھتے ہیں وہ محض ایک خیال باطل ہے، اس لیے کہ ان سے خدائے واحد ہی کی عبادت، والدین، اقربا، اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک، نماز اور زکوٰۃ کی پابندی اور اپنے بھائیوں کی نصرت و حمایت کا جو ابتدائی عہد لیا گیا تھا اس کو انھوں نے توڑ ڈالا اور اس عہد کی تجدید اور یاد دہانی کے لیے جو انبیاء بھیجے گئے ان کی بھی یا تو انھوں نے تکذیب کی یا ان کو قتل کر ڈالا۔ ایسی صورت میں ان کا یہ دعوٰی کہ وہ کتاب و شریعت کے حامل ہیں، کیا وزن رکھتا ہے؟

یہود کی نسبـ

اس کے بعد فرمایا کہ یہ قرآن ان پیشین گوئیوں کے مطابق نازل ہوا ہے جو ان کے صحیفوں میں موجود ہیں اور یہ اس کے منتظر بھی رہے ہیں۔ لیکن اب جب کہ یہ موعود و منتظر چیز ان کے پاس آگئی اور انھوں نے اس کو

پہچان بھی لیا ہے تو محض اس ضد کے سبب سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کے ایک فرد پر کیوں اتارا، ان کے اندر کے کسی فرد پر کیوں نہ اتارا۔

یہود کے دعوائے ایمان کی حقیقت

اس کے بعد ان کے دعوائے ایمان کی مزید قلعی کھولی ہے کہ یہ اپنے جس ایمان پر اس قدر نازاں ہیں کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لا رہے ہیں، اس ایمان کا حال شروع سے یہ رہا ہے کہ انھوں نے عین موسیٰؑ کی موجودگی میں گوسالہ پرستی کی اور بعد کے زمانوں میں یہ اللہ کے نبیوں کی تکذیب بھی کرتے رہے اور ان میں سے بعض کو انھوں نے قتل بھی کر دیا۔

یہود کے خلاف خود ان کے ضمیر کی شہادت

پھر ان کے اس زعم کے خلاف کہ آخرت کی تمام سرفرازیاں صرف انھیں کا حصہ ہیں اس لیے کہ وہی خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں، خود ان کے باطن کی یہ شہادت پیش کی ہے کہ اگر وہ اپنے اس زعم میں سچے ہیں تو زندگی کے اتنے حریص کیوں بنے بیٹھے ہیں۔ پھر تو انھیں زندگی کے بجائے موت کا حریص ہونا چاہیے۔

یہ پوری تقریر جس کا ہر حصہ باہم دگر بالکل مربوط ہے بنی اسرائیل کے سامنے یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے کی گئی ہے کہ قرآن کی مخالفت کے لیے انھوں نے جو پہلو اختیار کیے ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں صرف قومی نخوت، ہٹ دھرمی اور حسد پر مبنی ہیں۔

اس تقریر میں کچھ باتیں تو بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہی گئی ہیں۔ کچھ ان سے منہ پھیر کر کہی گئی ہیں اور بعض باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلائی گئی ہیں۔ تخاطب کے یہ مختلف اسلوب بلاغت کے تقاضوں کے تحت ہیں۔ جو شخص ان آیات کی تلاوت تدبر کے ساتھ کرے گا وہ انشاء اللہ خطاب کی ان تبدیلیوں کی خوبیاں خود سمجھ جائے گا، یہ ذوق سے تعلق رکھنے والی چیزیں بیان کی گرفت میں مشکل سے آتی ہیں۔

ان مطالب کو ذہن کے سامنے رکھتے ہوئے اب ان آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیات ۸۳-۹۶

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَ
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا
لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا
مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٨٣﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ
دِمَاۗءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ
تَشْهَدُوْنَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا
مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ

يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ
بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ
مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى
اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا
هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۧ ﴿۸۶﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ ع
بِالرُّسُلِ ؗ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ
اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا
كَذَّبْتُمْ ؗ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ
بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ
مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ
فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا
اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ

مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٩٢﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ
خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَ
اُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ
اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ
الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٥﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى
حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ معانقة ٢
سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ
بَصِيْرٌ ۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ ع ١٠ / ١١

ترجمہ آیات ٨٢-٩٦

اور یاد کرو جب کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے والدین کے ساتھ احسان کرو گے۔ قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں کو ان کا حق دو گے اور یہ کہ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ پھر تم برگشتہ ہو گئے مگر تم میں سے بہت تھوڑے لوگ۔ اور تم منہ موڑنے والے ہی لوگ ہو۔ ۸۳

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے اقرار لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے۔ پھر تم نے ان باتوں کا اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر تم ہی لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ پہلے ان کے خلاف حق تلفی اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو۔ پھر اگر وہ تمہارے پاس

قیدی ہو کر آتے ہیں تو ان کا فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ سرے سے ان کا نکالنا ہی تمہارے لیے حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصّہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصّے کا انکار کرتے ہو؟ جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں ان کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی تو نہ تو ان کا عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد ہی پہنچے گی۔ ۸۴-۸۶

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی تو کیا جب جب آئے گا کوئی رسول تمہارے پاس وہ باتیں لے کر جو تمہاری خواہشوں کے خلاف ہوں گی تو تم تکبّر کرو گے، سو تم نے ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے تو شاذ و نادر ہی وہ ایمان لائیں گے۔ ۸۷-۸۸

اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے مطابق ان پیشین گوئیوں کے جو ان کے ہاں موجود ہیں اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے، تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانتے پہچانتے ہوئے تھے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس ان منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔ کیا ہی بُری ہے وہ چیز جس سے اُنھوں نے اپنی جانوں کا مبادلہ کیا کہ وہ انکار کر رہے ہیں اس چیز کا جو اللہ نے اتاری ہے محض اس ضد کی بنا پر کہ اللہ نازل کرے اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے۔ پس وہ اللہ کا غضب در غضب لے کر لوٹے اور منکروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۸۹-۹۰

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس چیز پر تو ہم ایمان رکھتے ہی ہیں جو ہم پر اتری ہے اور وہ اس کے علاوہ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ وہی حق ہے اور مطابق ہے ان پیشین گوئیوں کے جو ان کے ہاں موجود ہیں۔ ان سے پوچھو پھر تم خدا کے پیغمبروں کو اس سے پہلے کیوں قتل کرتے رہے ہو اگر تم مومن ہو۔ اور موسیٰ تمھارے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۹۱-۹۲

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا اور تمھارے اوپر طور کو اٹھایا اور حکم دیا کہ جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو اور مانو۔ انھوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ اور ان کے کفر کے سبب سے بچھڑے کی پرستش ان کے دلوں میں رچ بس گئی۔ ان سے کہو کہ اگر تم مومن ہو تو کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کا تمھارا ایمان تم کو حکم دیتا رہا ہے۔ ۹۳

ان سے کہو کہ اگر دار آخرت کی کامیابیاں اللہ کے ہاں دوسروں کے بالمقابل تمھارے ہی لیے مخصوص ہیں تو موت کی آرزو کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ مگر یہ اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے جن کے یہ مرتکب ہوئے ہیں کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ۹۴-۹۵

اور تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے، ان لوگوں سے بھی زیادہ جنھوں نے شرک کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اس کو ہزار سال عمر ملے حالانکہ اگر یہ عمر بھی ان کو ملے تو بھی وہ اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچانے والے نہیں بن سکتے اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ ۹۶

۳۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۸۳)

بنی اسرائیل سے ابتدائی عہد

یہ اس ابتدائی عہد کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل سے شرک سے اجتناب، والدین کے ساتھ حسن سلوک اعزا و اقربا اور یتامیٰ و مساکین کے حقوق کی ادائیگی اور نماز و زکوٰۃ کے قیام سے متعلق لیا گیا۔ اس میں سب سے پہلے لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ کا ذکر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو گے۔ یہ جملہ اگرچہ ہے تو بظاہر خبر کے قالب میں لیکن معنی میں ہے نہی کے۔ اس وجہ سے بعد کے انشائیہ جملوں کا عطف اس کے اوپر موزوں ہوا۔

خدا کے بعد سب سے بڑا حق

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا: اللہ تعالیٰ کے حق کے بیان کے بعد یہ متصلاً والدین کے حق کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر اگر کوئی ہے تو ماں باپ ہی کا ہے اور کسی کا بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ حق صرف احسان یعنی حسن سلوک کا متقاضی ہے عبادت کا نہیں۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عبادت میں والدین کو شریک کرنے کی اجازت نہیں دی جن کا درجہ خدا کے بعد سب سے اونچا ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

وَذِي الْقُرْبٰى: کو احسان کے تحت بھی رکھ سکتے ہیں جس کا ذکر والدین کے لیے ہوا ہے اور اس کے لیے کوئی دوسرا مناسب فعل محذوف بھی مان سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان دونوں ہی شکلوں کے لیے نظیر موجود ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ	اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا کسی کو ساجھی نہ
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَ	ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور
الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ (۳۶- النساء)	قرابت مندوں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ۔

اس آیت میں وَبِذِي الْقُرْبٰى کو اِحْسَانًا کے تحت ہی رکھا ہے لیکن دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ	اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نہ بندگی کرو
اِحْسَانًا ...... وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى	مگر اس کی۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک
حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	کرو ...... اور قرابت مند اور مسکین اور مسافر
(۲۳- بنی اسرائیل)	کو اس کا حق دو۔

احسان اور ادائے حقوق

یہاں والدین کے لیے احسان اور ذی القربیٰ اور مسکین و مسافر کے لیے ایتائے حق کے الگ الگ فعل

استعمال کیے ہیں۔ ان دونوں مواقع کو ملانے سے یہ بات نکلتی ہے کہ احسان درحقیقت نام ادائے حقوق ہی کا ہے۔ اگر حقوق نہ ادا کیے جائیں تو محض خالی خولی باتوں سے احسان کا فرض ادا نہیں ہو سکتا۔

وَالْيَتَامٰى وَالْمَسٰكِيْنَ: حقوق کی ترتیب میں والدین، پھر اقربا اور ان کے بعد فوراً ہی یتامیٰ اور مساکین کا ذکر اس اہمیت کو ظاہر کرتا ہے جو اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام میں یتامیٰ اور مساکین کو حاصل ہے۔ اسلامی نظام میں ہر صاحب استطاعت پر اس کے والدین اور اقربا کے حقوق کے بعد یتیموں اور مسکینوں کے حقوق ہیں جن کو ادا کیے بغیر کوئی شخص اسلام کی عائد کی ہوئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

ان حقوق کے لیے حقوق کا لفظ ہم نے اپنی طرف سے صرف ایک استعارہ کے طور پر نہیں استعمال کیا ہے بلکہ یہ لفظ خود قرآن مجید نے استعمال کیا ہے اور اسلامی نظام میں حقوق ہی کی حیثیت سے ان کی حفاظت بھی کی گئی ہے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کا مفہوم

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (اور لوگوں سے اچھی بات کہو) اس ٹکڑے کا ایک تو وہ عام مفہوم ہے جو اس کے ظاہر الفاظ سے نکلتا ہے۔ اس اعتبار سے نیکی و شرافت اور پند و نصیحت کی ہر وہ بات اس کے تحت داخل ہوگی جس کی تعلیم و تبلیغ کی ہر موقع پر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کو عام رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے اہل تاویل نے اس کو عام ہی رکھا بھی ہے۔ لیکن بعینہ یہ بات اسی سیاق و سباق میں تھوڑے سے الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ، قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں بھی کہی گئی ہے۔ ان تمام آیتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سیاق میں یہاں یہ الفاظ وارد ہیں ان کا ایک خاص مفہوم بھی ہے جس سے قرآن کے ایک طالب علم کو بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔ ہم یہاں تمام ہم معنی آیات جمع کر کے اس خاص مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

سورہ نساء میں یتیموں سے متعلق ان کے اولیاء کی بعض ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۵ - نساء)	اور تم ناسمجھ یتیموں کے حوالہ اپنے وہ مال نہ کرو جس کو اللہ نے تمہارے معاشی قیام و بقا کا وسیلہ بنایا ہے۔ البتہ تم اس مال سے ان کو فراغت کے ساتھ کھلاؤ اور پہناؤ اور معروف طریقہ پر ان کی دلداری کرتے رہو۔

اسی سورہ نساء میں دوسری جگہ فرمایا۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ	اور اگر تقسیم میراث کے وقت قرابت مند، یتیم اور مسکین آموجود ہوں تو اس میں سے ان کو بھی کچھ دو اور معروف طریقہ پر ان سے دلداری کی

تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (۹ ۔ نساء)

بات کرو۔ اگر یہ اپنے پیچھے کمزور اولادیں چھوڑتے تو ان کے بارے میں ڈرتے تو انہیں چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور معقول بات کہیں۔

آگے اسی سورۂ بقرہ میں ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ (۲۶۲-۲۶۳- بقرۃ)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اپنے اس خرچ کے پیچھے اظہارِ احسان اور ایذا رسانی کی بلا نہیں لگا دیتے ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے نہ ان کے لیے خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دستور کے مطابق دلداری کا ایک کلمہ اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری کی بلا لگی ہوئی ہو۔ اللہ بڑا بے نیاز اور حلیم ہے۔

انفاق ہی کے سلسلہ میں سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا۔

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا (۲۸- بنی اسرائیل)

اگر تم کو اپنے رب کے کسی فضل کے انتظار میں جس کے تم متوقع ہو ان سے اعراض ہی کرنا پڑے تو ان سے نہایت نرم بات کہو۔

ان تمام آیات پر غور کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہاں قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کے الفاظ میں وہی بات کہی گئی ہے جو یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے متعلق اوپر کی آیات میں کہیں وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا کے الفاظ میں اور کہیں وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا اور قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ وغیرہ کے الفاظ میں کہی گئی ہے۔

قرآن مجید نے والدین، اقربا، یتامٰی اور مساکین سے متعلق ایک طرف حسنِ سلوک اور ادائے حقوق کی تاکید کی ہے، دوسری طرف اس امر کی ہدایت کی ہے کہ ان کے ساتھ بات شریفانہ انداز میں کی جائے۔ ان کے خلاف دل میں برہمی ہو تو اس کو ضبط کیا جائے اور ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اخلاق کے بغیر کوئی شخص ان کے حقوق و فرائض سے کماحقہٗ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بسا اوقات آدمی ان کی حالت کی کمزوری کی بنا پر ان کی عزتِ نفس ملحوظ رکھنے میں کوتاہی کر جاتا ہے جس سے ان کے مجروح دل اور زیادہ زخمی ہو جاتے ہیں، بعض اوقات آدمی کے دل میں ان کے خلاف کوئی رنجش ہوتی ہے جو ان کو مجبور سا و بے بس پا کر زیادہ کرخت انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ بعض حالات میں خود ان ضرورت مندوں کا رویہ بھی کچھ ناگوار سی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ چیز بھی آدمی کے لیے ترش کلامی کا باعث بن جاتی ہے۔ قرآن نے ان تمام چیزوں سے

روک کر ان سے اچھے انداز میں بات کرنے کی ہدایت کی ہے اور تسلی و تسکین کے ایک کلمہ کو اس خیرات سے بھی بہتر قرار دیا ہے جس کے ساتھ تلخ کلامی، توہین اور دل آزاری شامل ہو۔ اسی بات کو یہاں قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن سیاق کلام اور نظم دلیل ہے کہ مفہوم یہی ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ، (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) یہاں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا ذکر تفصیل کے بعد اجمال کی نوعیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ دونوں چیزیں اوپر کی تمام باتوں کو اپنے اندر سمیٹ لینے والی ہیں۔ اوپر اللہ ہی کی عبادت کرنے، نیز اعزا و اقربا اور مساکین و یتامی کے ساتھ حسن سلوک کی جو ہدایت کی گئی ہے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے ان تمام نیکیوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اجزا کے ذکر کے بعد ان اصولی چیزوں کا بھی ذکر کر دیا، جس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو رہی ہے کہ اگر تم نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے تو تمھارے لیے اوپر بیان کی ہوئی نیکیوں کا انجام دینا آسان رہے گا اور اگر نماز اور زکوٰۃ کو ضائع کر دو گے تو پھر سب کچھ ضائع کر بیٹھو گے۔

نماز اور زکوٰۃ سے تمام نیکیوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے

ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ، (پھر تم نے منہ موڑ لیا مگر تم میں سے تھوڑے لوگ اور تم منہ موڑنے والے ہی لوگ ہو) یہی وہ بات ہے جس کو واضح کرنے کے لیے اوپر کے میثاق کی یاد دہانی کی گئی ہے۔ یعنی یہ عہد جو اتنے اہتمام سے تم نے باندھا تھا، تم نے اس کو توڑ تاڑ کے رکھ دیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ تم میں سے ایسے نکلے جو اس پر استوار رہ سکے۔

قرآن مجید نے یہاں ان کی اس عہد شکنی کو پہلے فعل کی شکل میں بھی بیان کیا ہے اور پھر وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ کہہ کر اس کو ان کی ایک مستقل صفت کی حیثیت سے بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے جو ان سے اتفاقی طور پر صادر ہو گیا ہو بلکہ یہ اعراض و انحراف ان کے قومی مزاج کی ایک خصوصیت بن چکا ہے۔ قرآن مجید نے ان کی جس مزاجی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے۔ انھوں نے بار بار بنی اسرائیل کی نافرمانیوں پر ان کو ملامت کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ تم بڑے ہی سرکش اور گردن کش لوگ ہو۔

یہود کی مزاجی خصوصیت کی طرف ایک اشارہ

یہاں نظم کلام کی اس حقیقت کو ذہن سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ بنی اسرائیل کو اس نقض عہد کی یاد دہانی ان کے اس پندار پر ضرب لگانے کے لیے کی جا رہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کتاب الٰہی کا امین، شریعت خداوندی کا حامل اور اللہ تعالیٰ کی تمام دنیوی اور اخروی نعمتوں کا واحد اجارہ دار سمجھے ہوئے بیٹھے تھے اس وجہ سے نہ تو نئی نبوت و رسالت کی ضرورت کے قائل تھے اور نہ اپنے دائرے سے باہر کی کسی نبوت و رسالت پر ایمان لانے کے لیے تیار تھے۔ ان لوگوں کو اس آیت میں نیز اس کے بعد والی آیتوں میں یہ یاد دہانی کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عہد و میثاق ان سے لیا تھا اور جس پر ان کو اس قدر فخر و ناز ہے اس عہد و میثاق کی انھوں نے کس طرح دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۸۴)

ایک اور عہد کا حوالہ

یہ ایک اور عہد کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا۔ یہ عہد اس بات کے لیے تھا کہ یہ آپس میں نہ تو ایک دوسرے کا خون بہائیں گے اور نہ اپنے بھائیوں کو ان کے گھروں سے جلاوطن کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن انھوں نے جیسا کہ آگے تفصیل آرہی ہے اس عہد کو بھی نہایت بے دردی سے پامال کیا۔

اسلاف کے عہد کی ذمہ داری اخلاف پر

اس عہد کی اہمیت واضح کرنے کے لیے فرمایا ہے ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۔ جس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں اور دونوں سے اس کی اہمیت اور اس کے نقض کی شناعت واضح ہوتی ہے۔ ایک مفہوم تو، جیسا کہ عام مفسرین نے لیا ہے، یہ ہے کہ تم کو اس عہد کا اقرار ہے اور تم آج بھی اس کے گواہ ہو اس لیے کہ اس کا ذکر تورات میں موجود ہے اور اس کا دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ تم نے اس عہد کا اقرار کیا اور تم اس اقرار کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ موجود تھے۔

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے احکام سے ہمیشہ پوری جماعت کے سامنے آگاہ کرتے اور پھر پوری جماعت سے ان احکام کی اطاعت اور پابندی کا اقرار لیتے تاکہ اس جماعتی اقرار سے لوگوں کے اندر اس کی پابندی کا احساس پوری اہمیت حاصل کر لے اور نسلاً بعد نسلٍ ان کے اندر یہ روایت زندہ رہے کہ اس عہد کا اقرار ہم نے فلاں جگہ من حیث الجماعت کیا ہے۔ یہاں قرآن نے اپنے زمانۂ نزول کے بنی اسرائیل کو یاد دلایا ہے کہ تم اپنے جن آباؤ اجداد کی روایات پر فخر کرتے ہو، جب ان کی پوری جماعت کا یہ اقرار تمھاری کتاب میں موجود ہے تو تم اس کی ذمہ داری سے کس طرح انکار کر سکتے ہو۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۸۵)

ایک طرف دین کی مخالفت دوسری طرف دینداری کا مظاہرہ

یعنی جس عہد کو تم نے اس اہتمام کے ساتھ باندھا اب تم ہی لوگ ہو کہ اس کو اس سرگرمی کے ساتھ توڑ رہے ہو۔ اس توڑنے کی شکل یہاں قرآن مجید نے یہ بیان کی ہے کہ تم اپنے بھائیوں کے خلاف ان کے دشمنوں سے ساز باز کرتے ہو اور پھر ان کے مددگار بن کر اپنے بھائیوں کو ان کی بستیوں سے جلاوطن کراتے ہو۔ اس طرح ان کو ذلیل و خوار کرا لینے کے بعد جب وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں قیدی ہو کر تمھارے پاس آتے ہیں تو تم اپنی ملت پروری اور قوم دوستی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ان کو فدیہ دے کر چھڑاتے بھی ہو کہ یہ تورات کا حکم ہے، حالانکہ تورات میں جس طرح یہ فدیہ دے کر چھڑانے کا حکم ہے، اسی طرح یہ ممانعت بھی موجود ہے کہ اپنے بھائیوں کو ان کی بستیوں سے نہ نکالنا۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہودیہ اور اسرائیل کی سلطنتیں الگ الگ قائم ہو جانے کے بعد سے بنی اسرائیل میں اس طرح کے واقعات بہت پیش آئے۔ دونوں سلطنتوں کے درمیان حریفانہ کاوشیں رہتیں اور ایک دوسری سے انتقام لینے کے لیے آسان نسخہ یہی ہوتا کہ مخالف طاقتوں کو ابھار کر ان سے حریف پر چڑھائی کرا دی جائے اور جب وہ قتل و نہب کے بعد دشمنوں کے ہاتھوں میں اسیر ہو کر طالب امداد ہوں تو ان کو چھڑا کر قومی ہمدردی و بہی خواہی کی دھونس بھی عوام پر جمائی جائے۔

اسی طرح کے حالات ان یہودیوں کے بھی تھے جو نزولِ قرآن کے زمانہ میں عرب میں آباد تھے۔ ان کی مختلف شاخوں نے انصار کی مختلف شاخوں کے ساتھ حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ مثلاً بنو قینقاع اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ اوس کے۔ اوس اور خزرج کے درمیان برابر قبائلی جنگیں برپا رہتیں۔ اور ان جنگوں میں یہود بھی اپنے اپنے حلیفوں کے ساتھ شریک ہوتے اور بھائیوں کے قتل اور ان کی جلاوطنی کا سبب بنتے لیکن اس برادرکشی کے ساتھ ساتھ اپنی دینداری کی نمائش کے لیے یہ بھی کرتے کہ جب ان کے دینی بھائی دشمنوں کے ہاتھوں میں قید ہوتے تو ان کو فدیہ دے کر چھڑاتے بھی کہ یہ تورات کا حکم ہے[1]

ایک طرف اللہ کے دین کی یہ مخالفت اور دوسری طرف دینداری کا یہ مظاہرہ صریح منافقت ہے کیونکہ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کتابِ الٰہی کی جو بات اپنی خواہشات کے مطابق ہو وہ تو مانی جائے اور جو بات خواہشات کے خلاف ہو اس کا انکار کر دیا جائے۔ اس طرح کا من مانا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہے جو لوگ شریعت الٰہی کے معاملہ میں یہ رویہ اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں بھی رسوا کرتا ہے اور ایسے لوگ آخرت میں بھی سخت عذاب کے مستحق ہوں گے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (۸۶)

یہاں اشتراء کے معنی خریدنے یا بیچنے کے نہیں بلکہ مجرد ترجیح دینے کے ہیں۔ آدمی جب ایک شے کو قیمت دے کر خریدتا ہے تو اس کو قیمت کے بالمقابل ترجیح دیتا ہے۔ لسان العرب نے آیت أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ سے متعلق ابواسحاق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہاں بیع و شرا مراد نہیں ہے بلکہ محض اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ جس طرح ایک مشتری اپنا مال دے کر اپنی مطلوب و مرغوب چیز لیتا ہے اسی طرح ان کفار نے ضلالت کو اپنی ایک مرغوب و محبوب چیز کی طرح پکڑ لیا ہے۔ اہل عرب ہر اس موقع پر جب ایک چیز چھوڑ کر دوسری چیز اختیار کی جائے، کہیں گے اشْتَرَاهُ اس نے اس چیز کو خریدا یعنی اس کو ترجیح دی۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اس معنی میں ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال ہوا ہے۔

---

[1] ان آیات کی تلاوت کرتے وقت مسلمان حکومتوں اور مسلم جماعتوں کی ان سازشوں پر بھی نگاہ رہے جو وہ ایک دوسرے کے خلاف کرتی رہتی ہیں اور اس معاملہ میں اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرنے میں بھی ان کو کوئی عار نہیں ہوتا۔

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ، دنہ تو ان کا عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد ہی پہنچے گی) یعنی نہ تو ان کے ساتھ اندر سے کوئی رعایت کی جائے گی اور نہ باہر سے ان کو کوئی مدد حاصل ہو سکے گی۔ اللہ کے اس ابدی عذاب میں گرفتار ہو جانے کے بعد ان کے لیے امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (۸۷)

عہد کی یاددہانی کا انتظام

اوپر والے عہد کی برابر یاددہانی کراتے رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو کتاب دینے کے بعد اس کتاب کی تذکیر کے لیے برابر انبیا بھیجے گئے اور خاص کر عیسیٰ بن مریم کو اللہ تعالیٰ نے بَیِّنٰت کے ساتھ بھیجا۔ "بَیِّنٰت" سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے اور جو اس قدر واضح تھے کہ ان کے خدا کی طرف سے ہونے میں کوئی ہٹ دھرم ہی شک کر سکتا تھا لیکن یہود نے ان کھلے کھلے معجزات کو بھی تائید ربانی اور فیضِ روح القدس کا نتیجہ قرار دینے کے بجائے نعوذ باللہ شیطانی تصرف کا نتیجہ قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ معجزے شیطانوں اور بھوتوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ قرآن مجید نے یہود کے اسی الزام کی تردید کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بار بار یہ فرمایا ہے کہ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (ہم نے روح القدس سے اس کی مدد کی) یعنی اس سے جو معجزے صادر ہوتے یہ تائید روح القدس کا نتیجہ ہیں نہ کہ کسی شیطان یا جن کی مدد کا، جیسا کہ یہود سمجھتے ہیں۔

تائیدِ روح القدس کا مفہوم

انجیل میں یہود کے اس الزام کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اور ان کے اس الزام کا جو جواب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیا ہے وہ بھی نقل ہوا ہے۔ ہم یہاں ایک اقتباس متی سے پیش کرتے ہیں جس سے اس خیال کی پوری پوری تائید ہوتی ہے جو ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔ متی باب ۱۲ میں ہے۔

> اس وقت اس کے پاس لوگ ایک اندھے گونگے کو لائے جس میں بدروح تھی اس نے اسے اچھا کر دیا چنانچہ وہ گونگا بولنے اور دیکھنے لگا اور ساری بھیڑ حیران ہو کر کہنے لگی کہ کیا یہ ابنِ داؤد ہے۔ فریسیوں نے سن کر کہا یہ بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد کے بغیر بدروحوں کو نہیں نکالتا۔ اس نے ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا جس بادشاہی میں پھوٹ پڑتی ہے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس شہر یا گھر میں پھوٹ پڑے گی وہ قائم نہ رہے گا اور اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا۔ پھر اس کی بادشاہی کیونکر قائم رہے گی اور اگر میں بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو تمہارے بیٹے کس کی مدد سے نکالتے ہیں۔ پس وہی تمہارے منصف ہوں گے لیکن اگر میں خدا کے روح کی مدد سے بدروحوں کو

نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمہارے پاس آپہنچی۔ یا کیوں کر کوئی آدمی کسی زور آور کے گھر میں گھس کر اس کا اسباب لوٹ سکتا ہے جب تک کہ پہلے اس زور آور کو نہ باندھ لے۔ پھر وہ اس کا گھر لوٹ لے گا۔ جو میرے ساتھ نہیں وہ میرے خلاف ہے۔ جو میرے ساتھ جمع نہیں کرتا وہ بکھیرتا ہے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ آدمیوں کا ہر گناہ اور کفر تو معاف کیا جائے گا مگر جو کفر روح کے حق میں ہے وہ معاف نہ کیا جائے گا۔ اور جو کوئی ابن آدم کے برخلاف کوئی بات کہے گا تو وہ معاف کی جائے گی لیکن جو کوئی روح القدس کے خلاف کوئی بات کہے گا وہ معاف نہ کی جائے گی، نہ اس عالم میں اور نہ آنے والے عالم میں۔ یا تو درخت کو بھی اچھا کہو اور اس کے پھل کو بھی اچھا۔ یا درخت کو بھی برا کہو اور اس کے پھل کو بھی برا، کیونکہ درخت پھل ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ (متی باب ۱۲۔ آیات ۲۲-۲۳)

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر وَاٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ وَاَیَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ کے الفاظ پر غور کیجیے تو آیت کا اصلی زور سمجھ میں آجائے گا کہ اس میں کس بات کا اثبات اور کس بات کی تردید ہے۔ جہاں تک روح القدس کی تائید کا تعلق ہے وہ ہر پیغمبر کو حاصل ہوتی ہے اور پیغمبر سے جو معجزات صادر ہوتے ہیں وہ اسی تائید کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن حضرت عیسٰی علیہ السلام کے باب میں اس بات کا اظہار بار بار اس لیے فرمایا گیا کہ یہود ان پر مذکورہ بالا الزام لگاتے تھے۔ روح القدس سے مراد وہ پاکیزہ روح ہے جو خدا کی طرف سے آتی ہے اور عبرانی میں اس سے مراد جبریل ہیں۔

وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَل لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِکُفۡرِهِمۡ فَقَلِیۡلًا مَّا یُؤۡمِنُوۡنَ (۸۸)

قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ کے دو مفہوم

یہ قول یہود کی طرف سے بطور ایک عذرِ لنگ کے بھی ہو سکتا ہے اور بطور اظہار تکبر کے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ باتیں (جو پیغمبر پیش کرتے ہیں) ہمارے دل میں تو کسی طرح اترتی نہیں۔ اگر یہ خدا کی طرف سے ہیں تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے۔ آخر وہ ہمارے دلوں کو ان باتوں کے لیے کھول کیوں نہیں دیتا۔

دوسری صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے دل و دماغ اس قسم کی لایعنی باتوں کے لیے نہیں بنے ہیں اس وجہ سے یہ کسی طرح بھی ہمارے دلوں میں نہیں دھنستی ہیں، اگر ان میں ذرا بھی معقولیت ہوتی تو معقول باتوں کے قبول کرنے کے معاملہ میں ہم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید کے نظائر و شواہد ان دونوں ہی مفہوموں کی تائید میں موجود ہیں لیکن ہم یہاں دوسرے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اس قول کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ بَلۡ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِکُفۡرِهِمۡ (بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے) اس سے واضح تائید اسی مفہوم کی نکلتی ہے۔ یعنی وہ تو اپنے گھمنڈ اور غرور کے سبب سے یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی باتیں ہی ایسی ہیں جو کسی معقول آدمی کے دل میں نہیں اتر سکتیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ یہ باتیں تو نہایت معقول اور نہایت دل نشین ہیں لیکن ان لوگوں کے کفر اور ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب سے ان کے

دلوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کردی ہے اس وجہ سے اب ان کے اندر ان معقول باتوں کے قبول کرنے کے لیے کوئی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (٨٩)

یہود پر قرآن کا احسان

کتاب سے یہاں مراد قرآن مجید ہے جو ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتا ہوا نازل ہوا تھا جو اس کے بارے میں یہود کے صحیفوں میں وارد تھیں۔ اس پہلو سے قرآن کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا احسان خود یہود پر تھا کہ اس نے ان کے صحیفوں کی بہت سی باتوں کو سچا ثابت کیا۔ اس احسان کا حق تو یہ تھا کہ وہ سب سے آگے بڑھ کر اس کتاب عزیز کو ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے کے بجائے ضد اور حسد کے سبب سے اس کی مخالفت کی راہ میں سبقت کی۔ قرآن مجید کو پچھلے صحیفوں کے مصدق کہنے کی حقیقت اسی سورہ کی آیت ۴۱ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم واضح کرچکے ہیں۔

قرآن اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں چونکہ یہود کے صحیفوں میں موجود تھیں اس وجہ سے ان کو ان پیشین گوئیوں کے ظہور کا بڑی شدت کے ساتھ انتظار تھا۔ ان کو امید تھی کہ جب ا(س) نبی موعود کی بعثت ہوگی تو ان کی بدبختی اور مصیبت کے دن دور ہو جائیں گے اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ان کو ان کے تمام دشمنوں پر فتح دے گا۔ اس فتح کے لیے وہ دعائیں بھی کرتے تھے لیکن یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ جب یہ پیشین گوئی پوری ہوگئی، جس کا انتظار تھا وہ آچکا اور اس کے کارناموں نے یہ ثابت بھی کردیا کہ یہ وہی ہے جس کی علامتیں پچھلے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں اور یہود نے اس کو اچھی طرح پہچان بھی لیا تو محض ضد اور حسد کی وجہ سے اس کا انکار کردیا۔ یہود کے اس رویہ کو حضرت مسیح علیہ السلام نے دس کنواریوں والی تمثیل میں واضح فرمایا ہے جو متی کے باب ۲۵ میں منقول ہے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ
عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (٩٠)

اشتراء کا مفہوم

یہاں اشتراء کے معنی بیچنے اور مبادلہ کرنے کے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون اسی سورہ میں دوسری جگہ اس طرح وارد ہے وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۲-بقرہ) (کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کے عوض میں انھوں نے اپنی جان کو بیچا) عام طور پر اہل لغت اس لفظ کو اضداد میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے اضداد میں سے ہونے کی امام راغب نے بڑی معقول توجیہ کی ہے وہ کہتے ہیں۔ فاما اذا کان بیع سلعة بسلعة صح ان یتصور کل واحد منهما مشتریا وبائعا ومن هذا الوجه صار لفظ البیع والشراء یستعمل کل واحد منهما فی موضع الآخر (لیکن جب شے کا مبادلہ شے سے ہو تو فریقین میں سے ہر ایک

کو مشتری اور ہر ایک کو بائع سمجھنا صحیح ہوگا، اس پہلو سے بیع اور شرا کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں) اس تحقیق کی روشنی میں مذکورہ بالا آیت کا ترجمہ ہوگا (کیا ہی بری ہے وہ چیز جس سے انھوں نے اپنی جانوں کا مبادلہ کیا) یعنی اپنی نجات و فلاح کی فکر سے بے نیاز ہو کر دوسروں کی ضد میں مبتلا ہوئے اور پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھے۔

اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بَغۡیًا اَنۡ یُّنَزِّلَ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ: یہ وضاحت ہے اس چیز کی جس کو ان لوگوں نے اختیار کیا۔ وہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب اور اس کے بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لانے کے بجائے اس کے انکار اور اس کی مخالفت کی راہ اختیار کی اور چونکہ انکار اور مخالفت کی یہ راہ دیدہ و دانستہ اختیار کی گئی اس وجہ سے اس کا سبب اس ضد اور عناد کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ان کو اللہ تعالیٰ پر غصہ تھا کہ اس نے آخری دین اور آخری رسول کی نعمت سے بنی اسماعیل کو کیوں نوازا، خود ان کے اندر سے کسی کو رسول کیوں نہیں بنایا؟ گویا اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کے اجارہ دار یہی ہیں اور انھی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بتائیں کہ وہ کس منصب کے لیے کس کو منتخب کرے اور کس کو منتخب نہ کرے۔

بغی کے معنی یہاں ضد کے ہیں۔ یہ ضد ان کی خدا سے سرکشی اور ان کے استکبار کا نتیجہ تھی عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن اشارہ یہاں خاص طور پر بنی اسماعیل کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اختیار کی وسعت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ عموم کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

فَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ ؕ وَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ: "وہ اللہ کا غضب در غضب لے کر لوٹے" کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ جہاں سے ان کو سب سے بڑی رحمت لے کر لوٹنا تھا وہاں سے وہ اپنی شامتِ اعمال کے باعث خدا کا غضب لے کر لوٹے۔ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت و کامرانی آخری نبی پر ایمان کے ساتھ وابستہ تھی اور یہ اس کے متوقع اور منتظر بھی تھے بلکہ اس کے لیے، جیسا کہ اوپر گزرا، دعائیں بھی کرتے رہے تھے۔ لیکن جب اس نعمت سے متمتع ہونے کا موقع آیا تو ان کی بدبختی نے ان کو ٹھوکر کھلائی اور وہ اس کی مخالفت کی پاداش میں غضبِ الٰہی کے مستحق قرار پائے۔ پھر صرف غضب ہی کے نہیں بلکہ غضب در غضب کے مستحق قرار پائے۔ ایک غضب کے مستحق تو وہ اس عہد کو توڑنے کے سبب سے ٹھہرے جو اللہ تعالیٰ سے انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے باندھا تھا اور دوسرے غضب کے مستحق اس وجہ سے ہوئے کہ جب ان کے لیے پھر خدا کے عہد میں داخل ہونے کا موقع آیا تو انھوں نے ضد اور حسد میں مبتلا ہو کر اس سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ سے مراد ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ یہ ذلیل کرنے والا عذاب ان کو اس لیے دیا جائے گا کہ ان کے جرائم کا اصل محرک استکبار تھا جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَہۡوٰۤی اَنۡفُسُکُمُ

اسْتَكْبَرْتُمْ (کیا جب جب کوئی رسول تمھارے پاس کوئی ایسی بات لے کر آئے گا جو تمھاری خواہشوں کے خلاف ہوئی تو تم استکبار کے ساتھ اس کا انکار کرو گے) ۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۹۱)

یہود کا ایمان نہ قرآن پر نہ تورات پر

یعنی جب ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ بڑے غرور کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہی ہیں جو ہم پر اتری ہے۔ اس کے بعد ان کے قول کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ تورات کے بعد وہ کسی چیز پر ایمان لانے کے قائل نہیں ہیں حالانکہ اب تورات کی اپنی پیشین گوئیوں کے مطابق بھی صحیفہ حق وہی ہے جس کو قبول کرنے کی ان کو دعوت دی جا رہی ہے نہ کہ تورات۔

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، یہ واضح کرنے کے بعد کہ قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد معتبر ایمان وہی ہے جو قرآن پر ہو نہ کہ صرف توراۃ پر، یہ واضح فرمایا کہ ان یہود کا تورات پر ایمان کا دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ اگر یہ فی الواقع تورات پر ایمان رکھنے والے ہوتے تو اللہ کے ان نبیوں کو قتل کرنے کی جسارت کس طرح کرتے جو اسی تورات کی تجدید و تصدیق کے لیے آئے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (۹۲)

یہود کے دعوائے ایمان کی مزید تردید

یہ یہود کے دعوائے ایمان کی مزید تردید ہے اور اس تردید کا خاص پہلو یہ ہے کہ ان کی ابتدائی تاریخ کے واقعۂ گوسالہ پرستی کو یاد دلا کر ان کو سرزنش کی گئی ہے کہ آج تم نے اپنے ایمان اور اپنی دینداری کی حکایت اتنی بڑھا رکھی ہے کہ نہ قرآن کو خاطر میں لانے کے لیے تیار ہو نہ پیغمبر آخر الزمانؐ کو، حالانکہ تمھارے اس ایمان کا حال آج تو در کنار شروع سے یہ رہا ہے کہ عین موسیٰؑ کی موجودگی میں، ان کے کھلے کھلے معجزات کو دیکھتے ہوئے تم نے اپنے رب کو چھوڑ کر ایک بچھڑے کی عبادت شروع کر دی۔

یہود کے اسی قسم کے فخر پر بعض پچھلے انبیاء نے بھی ان کو سرزنش کی ہے اور اسی واقعۂ گوسالہ پرستی کی طرف تعریض کرتے ہوئے یہ الفاظ تک فرمائے ہیں کہ اے اسرائیل (بنی اسرائیل) تو تو وہ ہے کہ تو نے پہلی شب میں بے وفائی کی۔ قرآن کے الفاظ اس کے اپنے مرتبہ کے شایانِ شان ہیں لیکن بات وہی کہی گئی ہے جو سابق انبیاء نے فرمائی تھی۔

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ٹھیک ٹھیک وَاَنْتُمْ مُشْرِكُوْنَ کے معنی میں ہے۔ قرآن میں شرک کو متعدد مقامات میں ظلم کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ظلم کا اصلی مفہوم حق تلفی ہے۔ خدا کے حقوق اور خود اپنے نفس کی جو حق تلفی آدمی شرک کا ارتکاب کر کے کرتا ہے وہ کسی بھی اور دوسرے طریقہ سے نہیں کرتا۔ اس کی وضاحت قرآن مجید نے متعدد

مقامات میں کی ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۹۳)

حال کی تعبیر قول سے

اسی سورہ کی آیت ۶۳ کی تفسیر کرتے ہوئے اس ٹکڑے کے تمام اہم اجزا کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہود کا یہ جواب جو نقل ہوا ہے، قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (انھوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی) یہ صورتِ حال کی تعبیر ہے۔ انھوں نے عہد تو یہی کیا تھا کہ "ہم نے سنا اور ہم اطاعت کریں گے" لیکن عمل ان کا یہی ہوا کہ انھوں نے جو کچھ سنا اس کی نافرمانی کی۔ اس صورتِ حال کو، جو ان کے عمل سے ظاہر ہوئی، قرآن نے ان کے قول کی جگہ رکھ دیا ہے۔ گویا انھوں نے شروع ہی میں اقرارِ اطاعت کا نہیں بلکہ نافرمانی کا کیا تھا۔

منافقین اور یہود آنحضرت صلعم کی مجلس میں جب کبھی آتے تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کی جگہ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ہی کہتے لیکن ادا اس طرح کرتے کہ سننے والا عَصَيْنَا کو اَطَعْنَا سمجھے۔ یہ روش انھوں نے اپنے اسلاف ہی سے سیکھی تھی۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ اَطَعْنَا کہتے اور اس سے عَصَيْنَا مراد لیتے اور یہ عَصَيْنَا کہتے اور یہی مراد بھی لیتے لیکن زبان کو توڑ مروڑ کر مغالطہ یہ دیتے کہ مسلمان ان کے عَصَيْنَا کو اَطَعْنَا سمجھیں۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۹۴)

یہود کی دکھتی ہوئی رگ

اوپر کی آیت ۹۰ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ یہود اس بات سے بہت برافروختہ ہوتے تھے کہ خدا کے کسی فضل و انعام کا حق دار ان کے سوا کسی اور کو بھی سمجھا جائے۔ وہ دنیا میں بھی ہر خدائی نعمت کا حق دار اپنے ہی کو سمجھتے تھے اور آخرت کی نعمتوں کا حق دار بھی تنہا اپنے ہی کو سمجھتے تھے۔ قرآن نے ان کو متنبہ کیا کہ اگر تم فی الواقع آخرت کی تمام کامیابیاں اپنا ہی حصہ سمجھتے ہو، اس میں دوسروں کا کوئی حصہ تسلیم نہیں کرتے تو اس کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ تمھیں لقائے رب کا شوق ہو اور تم اس کے لیے موت کی آرزوئیں کرو۔ لیکن تمھارا حال تو یہ ہے کہ تم زندگی کی محبت میں اہل کتاب ہو کر عرب کے مشرکوں کو بھی مات دے گئے ہو۔

قرآن نے یہود کی یہ ایک بہت دکھتی رگ پکڑی ہے تاکہ خدا کے محبوب و مقرب ہونے کا ان کو جو گھمنڈ تھا اس پر ذرا وہ شرمائیں۔ اگرچہ وہ اپنی عادت کے مطابق بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس بات کے جواب میں کہہ سکتے تھے کہ ہم تو موت کی بڑی آرزو رکھنے والے لوگ ہیں لیکن آدمی سے خود اپنے دل کا حال چھپا ہوا نہیں ہوتا اس وجہ سے یہ حقیقت ان کے لیے بڑی تلخ اور ان کو خود ان کی نگاہوں میں بڑی رسوا کرنے والی تھی۔

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ (۹۵)

بھی اللہ تعالیٰ سے قرب اور آخرت کی اجارہ داری کے ادعا کے باوجود موت کی آرزو یہ کبھی نہیں کریں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اور اس کی شریعت کے ساتھ جو بدعہدیاں اور غداریاں انھوں نے کی ہیں وہ دوسروں کے سامنے ہوں یا نہ ہوں لیکن خود ان سے یہ ڈھکی چھپی نہیں ہیں، اس وجہ سے موت کے تصور سے ان پر لرزہ طاری ہوتا ہے لیکن موت سے یہ کب تک بھاگیں گے اور اس سے بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ بالآخر ایک دن موت سے دوچار ہونا اور اس رب کے سامنے حاضر ہونا ہے جو ان ظالموں کے تمام اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اس حقیقت کو سورہ جمعہ میں اس طرح واضح فرمایا ہے۔ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۸) (کہہ دو وہ موت جس سے تم بھاگ رہے ہو تمھیں پاکے رہے گی، پھر تم غیب اور حاضر کے جاننے والے کے سامنے پیش کیے جاؤ گے اور وہ تمھیں ان ساری باتوں سے آگاہ کرے گا جو تم کر رہے ہو)۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَیٰوةٍ ۚۛ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚۛ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ (۹۶)

یہود مشرکین سے بھی گئے گزرے ہوئے ہیں

یعنی ایک طرف تو خدا کے ساتھ محبت و محبوبیت کے یہ دعوے ہیں، دوسری طرف زندگی کی محبت کا یہ حال ہے کہ ساری دنیا سے زیادہ زندگی کے حریص یہ ہیں۔ یہاں تک کہ اس معاملہ میں یہ عرب کے ان مشرکوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں جن کے ہاں یہ دنیا ہی دنیا ہے، آخرت کا جن کے سامنے سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

قرآن نے ایک سے زیادہ مقامات میں یہود کا موازنہ مشرکین عرب سے کر کے یہ دکھایا ہے کہ یہ عقیدہ اور عمل دونوں ہی اعتبارات سے مشرکین سے بھی گئے گزرے ہوئے ہیں۔ مشرکین کتاب و شریعت سے بے بہرہ ہونے کے سبب سے قدرتی طور پر فکری اور اخلاقی حیثیت سے نہایت پست سطح پر تھے۔ قرآن نے یہ واضح کیا ہے کہ کتاب اور شریعت کے نہایت بلند بانگ دعاوی کے باوجود اخلاقی اعتبار سے یہ یہود مشرکین کو بھی شرماتے ہیں حالانکہ یہ ان کو نہایت حقیر سمجھتے ہیں۔

وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ: اس کا ایک ترجمہ تو وہی ہو سکتا ہے جو ہم نے کیا ہے۔ دوسرا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو اس کی عمر کی درازی اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ معنی کے اعتبار سے دونوں ترجموں میں کوئی فرق نہیں ہے اور زبان کے قواعد کے لحاظ سے بھی میرے نزدیک دونوں صحیح ہیں۔ لیکن اکثر اہل تاویل نے اختیار اسی دوسرے کو کیا ہے۔

وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ: یعنی لمبی سے لمبی عمر بھی کسی کے اعمال کو خدا سے چھپا نہیں سکتی۔ خدا ان ساری چیزوں کو دیکھ رہا ہے جو یہ کر رہے ہیں اور جب دیکھ رہا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کا بدلہ نہ دے۔ یہاں دیکھنے سے مراد وہ چیز ہے جو اس دیکھنے سے لازم آتی ہے۔ کلام کا یہ اسلوب قرآن مجید میں بے شمار مواقع میں استعمال ہوا ہے۔

۴۰- اس مجموعۂ آیات کی بعض تعلیمات

اس مجموعۂ آیات کی تعلیمات کی طرف تو ہم اس کے اجزاء کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کرتے آئے ہیں وہ کافی ہے۔ لیکن بعض چیزیں اس میں ایسی بیان ہوئی ہیں جن کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ ان کی طرف ہم پھر اشارہ کر دیں۔

خدا کی شریعت کا حق اس کے ہر جزو پر عمل کرنے سے ادا ہوتا ہے

۱- اس میں ایک بڑی اہم حقیقت تو یہ واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو شریعت دیتا ہے اس کا حق اس کے ہر جزو پر عمل کرنے سے ادا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے ان اجزا پر عمل کرے جو اس کی خواہشات کے موافق ہیں اور جن کو اپنی خواہشات کے خلاف پائے ان کو نظر انداز کر دے تو یہ چیز قرآن کی اصطلاح میں ایمان ببعض الکتاب اور کفر ببعض الکتاب ہے اور اس طرح کا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ صرف یہ کہ معتبر نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کی سزا قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ "ان کے لیے دنیا کی زندگی میں رسوائی ہے اور آخرت میں یہ سخت ترین عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔"

قبولِ حق کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ

۲- دوسری حقیقت یہ واضح کی گئی ہے کہ قومی تفاخر، گروہی عصبیت اور جماعتی برتری کا زعم قبولِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جو گروہ اس بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کے لیے اس حق کے سوا جس کو وہ خود حق قرار دے کسی اور حق کو قبول کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی چیز اس استکبار کی جڑ ہے جسے قرآن میں ابلیس کی خصوصیت بتایا گیا ہے اور اسی سے وہ حسد پیدا ہوتا ہے جو ہر اس حق سے نفرت اور چڑ پیدا کر دیتا ہے جو اپنی خواہشات کے خلاف ہو۔

زندگی کی حرص محبتِ الٰہی کے منافی ہے

۳- تیسری حقیقت یہ واضح کی گئی ہے کہ جس طرح زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنا یا خودکشی کرنا ایمان اور تعلق باللہ کے منافی ہے اسی طرح زندگی اور درازیِ عمر کا حریص ہونا اور موت سے فرار بھی ایمان اور محبتِ الٰہی کے منافی ہے۔ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ سے محبت کرتے ہیں وہ موت سے بھاگتے نہیں بلکہ وہ اللہ کی راہ میں موت کی تمنا کرتے ہیں۔ نیز ضمناً یہاں یہ حقیقت بھی واضح فرما دی ہے کہ جو چیز انسان کو موت سے ڈراتی ہے وہ درحقیقت گناہ اور خدا سے بغاوت کی زندگی ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی کو گناہوں اور نافرمانیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرے تو موت اس کے لیے ایک محبوب چیز بن جاتی ہے۔

۴۱- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۷-۱۰۳

یہود کی قرآن دشمنی کی مزید تفصیل

آگے یہود کی اس قرآن دشمنی کی مزید تفصیل کرتے ہوئے یہ بیان فرمایا کہ یہود اس دشمنی میں اللہ، اس کے ملائکہ، اس کے انبیاء اور جبریل و میکائیل سب کے دشمن بن گئے ہیں اور اس طرح انھوں نے خدا کو اپنا

دشمن بنا لیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اس قرآن دشمنی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حق کے دلائل ان پر واضح نہیں ہیں، دلائل تو پوری طرح واضح ہیں لیکن یہ نافرمان اور عہد شکن لوگ ہیں، ابتدا ہی سے ان کی روش یہ رہی ہے کہ جب بھی انھوں نے خدا سے کوئی عہد باندھا ہے اس کو انھی کے اندر کی ایک جماعت نے موقع آنے پر توڑ دیا ہے۔ چنانچہ خدا کے آخری رسول کے بارے میں بھی انھوں نے یہی روش اختیار کی، یہ تورات کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق آئے ہیں لیکن یہود نے تورات پر ایمان لانے کے مدعی ہوتے ہوئے محض ضد میں آکر اس طرح کتاب الٰہی کو پیٹھ پیچھے پھینکا ہے گویا اس سے کبھی آشنا ہی نہیں تھے۔ پھر فرمایا کہ ان کی اصل دلچسپی اللہ کی کتاب سے نہیں ہے بلکہ ان سفلی اور شیطانی عملیات سے ہے جو فلسطینیوں اور کلدانیوں وغیرہ سے انہوں نے سیکھی تھیں۔ سحر و شعبدہ اور گنڈے، تعویذ وغیرہ کی قسم کی چیزوں نے ان کو خدا کی کتاب سے بالکل بے پروا کر کے ایک بالکل دوسری ہی ڈگر پر ڈال دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۹۷-۱۰۳

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ
اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾
مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ
فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ
وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ
فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَاۗءَهُمْ
رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا
كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ وَ
مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ
مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ

مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ
بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ
وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ
مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۲ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا
لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۳ ع ۱۲ ۷ ۱۲

ترجمہ آیات ۹۷-۱۰۳

کہہ دو کہ جو جبریل کا مخالف ہوا تو وہ جان لے کہ جبریل نے اس کلام کو تمھارے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے، مطابق ان پیشین گوئیوں کے جو اس کے پہلے سے موجود ہیں اور یہ ہدایت و بشارت ہے اہلِ ایمان کے لیے جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبریل و میکائیل کے دشمن ہوئے تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے۔ ۹۷-۹۸

اور ہم نے تمھارے اوپر نہایت واضح دلیلیں اتاری ہیں۔ ان کا انکار صرف عہد شکن ہی لوگ کر سکتے ہیں۔ کیا ان کی یہی روش قائم رہے گی کہ جب جب کوئی عہد کریں گے تو ان کا ایک گروہ اس کو اٹھا پھینکے گا، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے عاری ہیں۔ ۹۹-۱۰۰

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول ان پیشین گوئیوں کے مطابق آیا جو ان کے پاس موجود ہیں تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینکا گویا اس سے آشنا ہی نہیں اور ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان کے عہدِ حکومت میں شیاطین پڑھتے پڑھاتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں ہی نے کفر کیا۔ یہی لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ ۱۰۱-۱۰۲

اور اس چیز میں پڑ گئے جو بابل میں دونوں فرشتوں۔ ہاروت اور ماروت پر اتاری گئی تھی

حالانکہ یہ کسی کو سکھاتے نہیں تھے جب تک اس کو خبردار نہ کر دیں کہ ہم آزمائش کے لیے ہیں تو تم کفر میں نہ پڑ جانا۔ پس یہ لوگ ان سے وہ علم سیکھتے جس سے میاں اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں۔ حالانکہ یہ اس کے ذریعہ سے خدا کی مشیت کے بغیر کسی کو نقصان پہنچانے والے نہیں بن سکتے تھے اور یہ وہ چیز سیکھتے تھے جو ان کو نقصان پہنچائے۔ حالانکہ ان کو پتہ تھا کہ جس نے اس چیز کو اختیار کیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ کیا ہی بُری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انھوں نے اپنی جانوں کو بیچا۔ اے کاش وہ اس کو سمجھتے! ۱۰۲

اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کا ثواب ان کے لیے کہیں بہتر تھا کاش وہ سمجھتے! ۱۰۳

۴۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ (۹۷)

اس جملہ میں فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ جواب شرط کے محل میں ہے۔ عربی زبان میں جب کبھی شرط کا جواب اس طرح آئے تو اس کے اندر ایک تفصیل پوشیدہ ہوتی ہے جس پر بعد کے جملہ سے روشنی پڑتی ہے۔ یہاں سیاقِ کلام سے جملہ کا مطلب یہ واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ جبریل کے مخالف ہیں ان پر یہ حقیقت واضح رہنی چاہیئے کہ جبریل کی مخالفت درحقیقت اللہ کی مخالفت ہے کیونکہ جبریل نے خدا کا کلام جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا ہے تو اپنے جی سے نہیں اتارا ہے بلکہ خدا ہی کے حکم سے اتارا ہے۔ جبریل کوئی کام بھی من مانے طور پر نہیں کرتے، جو کچھ کرتے ہیں خدا کی مرضی کے مطابق اور اس کے حکم کے تحت کرتے ہیں نَزَّلَهٗ میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۹۱ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے چلا آ رہا ہے اس وجہ سے یہاں اضمار قبل الذکر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ بات اوپر والی بات ہی کا ایک جزو ہے۔

یہود، جبریلؑ سے دشمنی — معلوم ہوتا ہے کہ یہود، قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضد میں جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا مخالف ظاہر کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے یہود کے علماء اور لیڈروں کو جب یہ اندیشہ ہوا ہو کہ قرآن کی دعوت ان کے عوام کو

کہیں متاثر نہ کر دے تو انھوں نے یہ اشتقلہ چھوڑا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ان کے اپنے بیان کے مطابق جبریل فرشتہ آتا ہے اور یہ فرشتہ ہمارا دیرینہ مخالف ہے، ہمارے اوپر فلاں فلاں آفتیں اسی کے ہاتھوں آئیں۔ اس وجہ سے ہم کسی ایسے شخص پر ایمان نہیں لا سکتے جس کی ہمارے مخالف فرشتہ سے ساز باز ہے۔

اگرچہ یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ یہود حماقت کی اس حد کو پہنچ جائیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگ جائیں لیکن انسان جب ضد، حسد اور فرقہ سازی کے جنون میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں رہ جاتی۔ روافض کے ایک فرقہ کا بھی عقیدہ ہے کہ قرآن دراصل اترنا تو تھا حضرت علیؓ پر لیکن جبریل غلطی سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اس کو لے کر چلے گئے۔ اس فرقہ کے لوگ اس گناہ پر (نعوذ باللہ) حضرت جبریل امین پر لعنت بھی کرتے ہیں۔[1]

قرآن نے یہود کی اس حماقت پر جو گرفت کی ہے وہ بڑی برمحل اور بڑی ہی سخت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس غصہ میں جبریل کے مخالف بن بیٹھے ہو کہ انھوں نے یہ وحی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کیوں اتاری، تمھارے کسی آدمی پر کیوں نہ اتاری تو یہ تو سوچو کہ تمھاری یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے! اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ تم اللہ کو بھی اپنا مخالف سمجھتے ہو کیونکہ جبریل بہر حال تمہارے اپنے عقیدہ کے مطابق بھی خدا کے فرشتے ہیں، وہ کوئی کام خدا کے حکم کے بغیر نہیں کر سکتے۔ لازماً یہ کام بھی انھوں نے خدا ہی کے حکم سے کیا ہے۔ پھر تم تنہا جبریل ہی کے نہیں بلکہ خدا کے بھی مخالف ہوئے اور خدا بھی تمھارا مخالف ٹھہرا۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ میں قرآن کی مزید تین صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ پچھلے صحیفوں کا مصدق ہے۔ دوسری یہ کہ وہ راہ حق کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ تیسری یہ کہ جو اس کی رہنمائی قبول کریں وہ ان کو آخرت کی فوز و فلاح کی بشارت سنا رہا ہے۔ یہ تفصیل یہاں اس لیے پیش کی گئی ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ یہود کی یہ مخالفت صرف قرآن ہی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ خود ان کی اپنی کتاب کی بھی مخالفت ہے۔ وہ اس ہدایت کے بھی مخالف ہیں جو پہلے نازل ہوئی اور اس ہدایت کے بھی دشمن ہیں جو اب دنیا کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (۹۸)

بات کہاں سے کہاں پہنچی!

حضرت جبریل کی مخالفت سے جس جس کی مخالفت لازم آتی ہے یہ اس کی تفصیل بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شرارت کی جو سزا ہے اس کا بیان بھی۔ اوّل درجہ میں تو اس سے خود اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی مخالفت

---

[1] حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ "رد روافض" میں روافض کے مختلف فرقوں کے عقائد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "وطائفہ غرابیہ از ایشاں می گویند کہ محمد بہ علیؓ مشابہ تر بود از مشابہت غراب بہ غراب و مگس بامگس و حق تعالیٰ وحی بجانب علی فرستادہ بود، جبریل از کمال مشابہت غلط کردہ وحی بمحمد رسانید ...... وایشاں جبریل را لعن می کنند۔

لازم آتی ہے اس کی وجہ اوپر والی آیت میں بیان ہو چکی ہے کہ جب یہ ایک ایسے کام کی بنا پر جبریل ہی سے خفا ہیں جو جبریل نے خدا کے حکم سے کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خود خدا کے بھی مخالف ہیں۔ پھر اس سے تمام فرشتوں، تمام رسولوں اور جبریل و میکائیل سب کی مخالفت لازم آتی ہے اس لیے کہ خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں میں کامل ہم آہنگی ہے۔ فرشتے اور انبیا سارے کام خدا کی مرضی کے مطابق اور اس کے احکام کے تحت ہی کرتے ہیں اور ایک ہی حزب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہو سکتی۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی مخالف ہوا وہ سب کا مخالف ہوا اور جس نے کسی ایک کی بھی تکذیب کی اس نے سب کی تکذیب کی۔ یہاں یہ اجمالی اشارہ کافی ہے آگے اس کی مزید تفصیل آئے گی۔

یہاں عام فرشتوں کا ذکر کرنے کے بعد جبریل اور میکائیل کا ذکر خاص طور پر ایک تو ان کی اہمیت کے سبب سے ہے جس طرح عام کے بعد خاص کا ذکر ہوتا ہے۔ اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل، جیسا کہ بعض روایات سے واضح ہوتا ہے، میکائیل فرشتہ کو حضرت جبریل کے برعکس اپنا ہمدرد فرشتہ سمجھتے تھے۔ قرآن نے یہاں حضرت جبریل کے ساتھ حضرت میکائیل کو شامل کر کے یہ واضح کیا ہے کہ جبریل کا مخالف جس طرح اللہ اور اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کا مخالف ہے اسی طرح وہ میکائیل کا بھی مخالف ہے اس لیے کہ خدا کے تمام فرشتوں اور تمام رسولوں کی ملت ایک ہے۔ جبریل اور میکائیل دونوں اسی ملت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی رقابت اور چشمک نہیں ہے کہ جبریل سے جن کی لڑائی ہو میکائیل ان سے دوستی گانٹھے رکھیں۔

'فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ' کے ٹکڑے سے بیک وقت دو باتیں ثابت ہوئیں، ایک تو یہ کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں اور اس کے فرشتوں کے مخالف اور دشمن ہیں وہ کافر ہیں اور دوسری یہ کہ اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ قرآن کے ایجاز بیان نے ان دونوں باتوں کو اس طرح سمیٹ دیا ہے کہ بات بھی پوری ہو گئی ہے اور مخاطب کے لیے انکار اور بحث کی کوئی گنجائش بھی پیدا نہیں ہونے پاتی ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ (۹۹)

'آیاتِ بینات' سے مراد

خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ آیات بینات سے مراد آپ کی نبوت و رسالت کی وہ واضح اور قطعی دلیلیں ہیں جو آپ پر نازل ہوئیں، عام اس سے کہ وہ قرآن کے مدلل بیانات کی صورت میں ہیں یا ان کارناموں، علامات و شواہد اور معجزات کی شکل میں جو آپ کے ذریعہ سے ظہور میں آئے۔ فرمایا کہ یہ چیزیں آپ کی نبوت کے ثبوت میں اس قدر واضح ہیں کہ جس کے اندر ذرا بھی معقولیت ہو وہ ان کا انکار نہیں کر سکتا، صرف وہی لوگ ان کا انکار کر سکتے ہیں جو نافرمان اور عہد شکن ہوں۔

'فسق' کا مفہوم

فسق کا اصلی مفہوم خدا کی نافرمانی ہے۔ نافرمانی چھوٹی بھی ہو سکتی ہے، بڑی بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ بڑی سے بڑی نافرمانیوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا یہی مفہوم یہاں بھی ہے، سیاق سباق سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر بات دلائل و شواہد کی ہو تب تو قرآن کی صداقت

واضح ہے لیکن جو لوگ خدا کے ہر عہد و پیمان کو توڑ ڈالنے کا فیصلہ کر چکے ہوں ان کے نزدیک ان دلائل و شواہد کی کیا اہمیت ہے۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰۰)

یہ اسلوبِ کلام اظہارِ تعجب اور اظہارِ حسرت کا ہے۔ اوپر یہود کی عہد شکنیوں کا ذکر کرتے ہوئے بات یہاں تک پہنچی تھی کہ یہی عہد شکنی کی روش انھوں نے اس عہد کے معاملہ میں اختیار کی ہے جو آخری کتاب اور آخری رسول سے متعلق ان سے لیا گیا تھا۔ پھر باندازِ تعجب و اظہارِ حسرت فرمایا کہ کیا ان کی یہی روش ہمیشہ باقی رہے گی کہ جب کبھی یہ خدا سے کوئی عہد باندھیں گے تو وقت آنے پر یہ اس کو توڑ تاڑ کے رکھ دیں گے، صرف تھوڑے سے لوگ اس پر قائم رہ سکیں گے۔ پھر اصل حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دینے کے لیے فرمایا کہ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ یعنی ان کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو سرے سے ایمان ہی سے عاری ہیں، یہ تورات پر ایمان کا دعوے تو کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت ایمان کسی چیز پر بھی نہیں رکھتے۔

وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڎ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِھِمْ كَاَنَّھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۱)

اوپر والی آیت میں یہود کی عہد شکنی کی جس روش کا ذکر ہوا ہے اس آیت میں اسی کی واقعاتی شہادت پیش کر دی گئی ہے کہ دیکھو جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول آیا جو ان پیشین گوئیوں کے بالکل مطابق ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہیں تو ان کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک دیا ہے گویا اس سے کبھی کے آشنا ہی نہیں ہیں۔

رسولؐ سے مراد

"رسولؐ" سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لفظ اگرچہ نکرہ کی صورت میں استعمال ہوا ہے لیکن بعد کی صفات اور سیاق و سباق سے مراد متعین ہو جاتی ہے۔ نیز اس سے رسول کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

"کتاب اللہ" سے مراد تورات بھی ہو سکتی ہے اور قرآن بھی۔ تورات مراد لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان اہل کتاب نے اہل کتاب ہو کر اللہ کی کتاب کو نبی آخر الزمان کے معاملہ میں اس طرح نظر انداز کیا ہے گویا اس کو جانتے ہی نہیں۔ قرآن مجید مراد لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ایک کتاب کو شناخت کرنے کے سب سے زیادہ اگر اہل تھے تو یہ تھے اس لیے کہ یہ ایک آسمانی کتاب کے وارث اور امین ہونے کے مدعی بھی تھے اور اس طرح کی ایک کتاب کے نزول کی ان کو پہلے سے خبر بھی تھی لیکن ضد اور حسد کا برا ہو کہ اہل کتاب ہو کر وہ اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک رہے ہیں گویا اس کو جانتے ہی نہیں۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ

مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۟ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۲)

اللہ کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک کر جس چیز کو انھوں نے سینہ سے لگایا یہ اس کا بیان ہے۔

قرآن مجید میں شیاطین سے متعدد جگہ جنوں اور انسانوں دونوں گروہوں کے مفسدین اور اشرار مراد لیے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہاں بھی دونوں ہی کے اشرار مراد ہیں۔

عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ سے مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی کا زمانہ ہے۔ عربی زبان کے عام قاعدہ کے مطابق یہاں ایک مضاف محذوف ہے۔ یعنی عَلٰى عَهْدِ مُلْكِ سُلَيْمٰنَ۔

کتابِ الٰہی کی جگہ سحر وساحری سے دلچسپی

آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان ظالموں نے کتابِ الٰہی کو تو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور سحر و شعبدہ اور علم نجوم وغیرہ جیسے علوم سفلیہ کو جو سلیمان علیہ السلام کے عہدِ حکومت میں جنوں اور ان کی پیروی کرنے والے انسانوں کے باہمی اشتراک سے رواج پائے، اس کی جگہ اختیار کر لیا۔

سحر وساحری اور اس قسم کے سفلی اور شیطانی علوم کا چرچا کچھ نہ کچھ تو ہر دور میں رہا ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے، ان کے روحانی علوم کے مقابلہ کے شوق میں، شیاطین جن وانس کے ایک طبقہ میں سحر وساحری کے سیکھنے سکھانے کا رواج بہت بڑھ گیا تھا اور ان مفسدین نے اپنے ان علوم کو مرتب ومدوّن بھی کر ڈالا تھا۔ بعد کے زمانوں میں جب یہود دینی واخلاقی انحطاط میں مبتلا ہوئے اور کتاب و شریعت کا ذوق ان کے اندر مردہ ہوا تو قدرتی طور پر اس طرح کی مزخرفات کے سیکھنے سکھانے میں ان کا انہماک بہت بڑھ گیا۱؎ اور جیسا کہ قاعدہ ہے ان چیزوں کو تقدس کا رنگ دینے کے لیے وہ ان کو براہِ راست حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب بھی کرتے رہے ہوں گے اور لوگوں کو ان کا گرویدہ بنانے کے لیے یہ دعویٰ بھی کرتے رہے ہوں گے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام انھیں علوم کے ذریعہ سے وہ کارنامے انجام دیتے رہے ہیں جو ان کی طرف منسوب ہیں۔ آج بھی جو لوگ ان سفلی چیزوں کا ذوق رکھتے ہیں وہ اپنی ان خرافات کی تائید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا حوالہ بہت دیتے ہیں۔ بعض نقش تو خاص ان کے نامِ نامی ہی سے منسوب بھی ہیں۔ اس طرح کی ساری چیزیں معلوم ہوتا ہے یہود ہی کے ذریعہ سے ہمارے ہاں منتقل ہوئی ہیں اور یہ اسی

۱؎ سلاطین باب ۱۷، ۱۶، ۱۷ میں اسرائیل اور یہودا دونوں کا حال اس طرح بیان ہوا ہے "اور انھوں نے خداوند اپنے خدا کے سب احکام ترک کر کے اپنے لیے ڈھالی ہوئی مورتیں یعنی دو بچھڑے بنا لیے اور یسیرت تیار کی اور آسمانی فوج کی پرستش کی اور بعل کو پوجا اور انھوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو آگ میں چلوایا اور فال گیری اور جادوگری سے کام لیا۔"

دفترِ ضلالت کے باقیات سیئات میں سے ہیں جس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہدِ حکومت میں اشرار جن و انس نے مرتب کیا اور جس کو بعد میں یہود نے فروغ دیا۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ: یہ جملہ بطور استدراک یا بطور ایک جملہ معترضہ کے ہے۔ سلسلہ کلام کے بیچ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہود کے لگائے ہوئے الزام سے بَری کرنے کے لیے فرمایا کہ سلیمان کا دامن ان علوم سفلیہ کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہے، اس نے اس کفر کا ارتکاب کبھی نہیں کیا۔ البتہ یہ شیاطین جن و انس ہیں جنھوں نے ان چیزوں کو اختیار کیا اور پھر لوگوں کو ان مزخرفات کی تعلیم دی۔

یہاں اسلوبِ کلام سے متعلق دو باتیں ذہن میں رکھنے کی ہیں۔ ایک تو اس جملہ معترضہ کی بلاغت کہ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ متکلم کو ان علومِ سفلیہ کی نسبت حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف اتنی ناگوار ہے کہ اس کی تردید کے معاملہ میں اس نے اتنا توقف بھی نہیں کیا کہ بات پوری ہولے۔ بلکہ سلسلۂ کلام کو روک کر فوراً اس کی تردید ضروری سمجھی۔ دوسری یہ کہ یہ تردید ایسے اسلوب سے شروع کی ہے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ سحر کا کفر ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ: اوپر والا جملہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بطورِ استدراک یا جملہ معترضہ کے ہے، اس وجہ سے اس جملہ کا عطف لازماً مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو انھوں نے ان علوم سفلیہ کی پیروی کی جو سلیمانؑ کے عہدِ حکومت میں شیاطین کے ذریعہ سے رواج پائے۔ دوسرے اس چیز کی پیروی کی جو بابل کی اسیری کے زمانہ میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اتاری گئی۔

ہاروت و ماروت پر کیا چیز اتاری گئی تھی؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فرشتوں پر کیا چیز اتاری گئی تھی؟ اس سوال کا جواب عام طور پر مفسرین نے یہ دیا ہے کہ یہ جادو کا علم ہے۔ لیکن یہ جواب کئی پہلوؤں سے کھٹکتا ہے۔

ایک تو یہ کہ اس کا عطف، جیسا کہ ہم نے عرض کیا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ پر ہے جس سے مراد خود قرآن کی تشریح کے مطابق جادو ہے۔ اب اگر اس سے بھی مراد جادو ہی ہے تو اس کے علیحدہ ذکر کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ عربی زبان میں جب اس طرح معطوف اور معطوف علیہ آئیں تو عام اصول کے مطابق ان میں ایک حد تک مغایرت ہونی چاہیے۔ بغیر کسی خاص قرینہ کے اہلِ زبان اس عام ضابطہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے یہاں دونوں کے ایک ہی چیز ہونے کا نہ صرف یہ کہ کوئی قرینہ موجود نہیں ہے بلکہ قرائن اس کے خلاف ہیں۔

دوسرا یہ کہ اس کے لیے اُنْزِلَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا واضح مفہوم یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ علم اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا تھا۔ اس لفظ میں عنایت اور افادیت کی جو شان ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے سحر جیسی شیطانی، ناپاک اور سراسر باطل بلکہ کفر یہ چیز کے لیے اس کا استعمال ذوق پر گراں گزرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے

کہ قرآن مجید میں یہ لفظ چوپایوں اور لوہے وغیرہ جیسی چیزوں کے پیدا کیے جانے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے لیکن محض اتنی بات جادو کے لیے اس لفظ کی موزونیت ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ لوہا اور چوپائے وغیرہ تمدنی اور معاشی نقطۂ نظر سے ہمارے لیے نہایت خیر و برکت کی چیزیں ہیں اس وجہ سے ان کے لیے تو اس کا استعمال سمجھ میں آتا ہے لیکن ہمارے علم میں قرآن میں کہیں بھی یہ لفظ کسی ایسی چیز کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے جو جادو کی طرح کفریہ اور شیطانی ہو۔ کفار پر عذابِ الٰہی نازل کرنے کے لیے بھی اس کا استعمال ہوا ہے لیکن کفار پر جو عذاب آتا ہے وہ اہلِ ایمان کے لیے رحمت ہوتا ہے اور اس سے خدا کی زمین کی تطہیر ہوتی ہے۔

ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ خیر ہو یا شر دنیا میں جو چیز بھی پائی جاتی ہے خدا کی مشیت ہی کے تحت پائی جاتی ہے۔ لیکن خدا کی مشیت کے تحت کسی باطل کو مہلت ملنا اور چیز ہے اور سحر جیسے شیطانی علم کا دو فرشتوں پر اتارا جانا بالکل دوسری چیز ہے۔

تیسرا یہ کہ یہ علم، جیسا کہ الفاظِ قرآن سے واضح ہے، دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا۔ اور یہ فرشتے لوگوں کو اس علم کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ فرشتوں کے متعلق یہ بات مسلم ہے کہ شرک و کفر کی ہر آلائش سے ان کے دامن پاک ہیں۔ ان کے مزاج اللہ تعالیٰ نے ایسے بنائے ہیں کہ اس طرح کی کسی گندگی کی ان کو کبھی چھوت بھی نہیں لگتی۔ فرشتے ہمیشہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و عدل کے قیام اور خیر و فلاح کی دعوت و تعلیم کا ذریعہ بنے ہیں اور یہی چیزیں ان کے شایانِ شان ہیں۔ اس وجہ سے جادو کے علم کا ان پر اترنا اور ان کا اس کی اشاعت کرنا اگرچہ کتنی ہی احتیاط کے ساتھ کیوں نہ ہو، عقل سے بعید بات ہے۔ اگر فرشتے اس طرح کے کام کرنے لگ جائیں تو پھر شیاطین کے لیے کیا کام باقی رہ جائے گا۔

چوتھا یہ کہ فرشتوں نے اپنے اس علم کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان سے بھی کچھ ایسا ہی مترشح ہوتا ہے کہ ان کا علم شیاطین کے سحر سے کچھ مختلف خصوصیات رکھتا تھا۔ شیاطین کا علم تو جیسا کہ قرآن مجید نے خود وضاحت کر دی ہے، یکسر کفر تھا لیکن فرشتوں نے اپنے علم کے لیے فتنہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ فتنہ کے معنی امتحان اور آزمائش کے ہیں۔ قرآن میں اس سے عموماً وہ چیزیں مراد لی گئی ہیں جو پیدا تو کی گئی ہیں اصلاً انسان کی نفع و بہبود کے لیے لیکن انسان اپنے استعمال کی غلطی سے یا ان کی حد سے بڑھی ہوئی محبت میں گرفتار ہو کر ان کو اپنے لیے فتنہ بنا لیتا ہے جس کے سبب سے وہ مفید ہونے کے بجائے مضر بلکہ مہلک بن کر رہ جاتی ہیں۔ مثلاً مال اولاد کو قرآن مجید میں فتنہ کہا گیا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں بجائے خود شر نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، اگر انسان ان کے صحیح مقام کو پہچانے تو یہ اس کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں نفع پہنچانے والی بن سکتی ہیں لیکن جب انسان ان کی بے جا محبت میں گرفتار ہو کر ان کے پیچھے خدا اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے تو یہی چیزیں اس کے لیے وبال اور عذاب بن کے رہ جاتی ہیں کیونکہ بعض حالات میں آدمی کو ان کی محبت کفر تک پہنچا کے چھوڑتی ہے۔

یہ سارے پہلو اس بات کے خلاف ہیں کہ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ سے جادو مراد لیا جائے لیکن اگر جادو نہ مراد لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ وہ کون سا علم ہے جس کا فرشتوں پر اترنا موزوں بھی ہو اور جس کے انہماک یا غلط استعمال سے وہ خرابیاں بھی پیدا ہو سکتی ہوں جو یہاں اس علم میں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کا انہماک کتاب اللہ سے برگشتہ کرتا ہو، اس کی نوعیت ایک فتنہ کی ہو جس کے غلط استعمال سے آدمی کفر میں پڑ سکتا ہو، اس کو بد طینت لوگ میاں اور بیوی کے تعلقات کو خراب کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہوں۔

اشیا اور کلمات کے روحانی خواص کا علم

ہمارے نزدیک اس سے مراد اشیا اور کلمات کے روحانی خواص و تاثیرات کا وہ علم ہے جس کا رواج یہود کے صوفیوں اور پیروں میں ہوا اور جس کو انھوں نے گنڈوں، تعویذوں اور مختلف قسم کے عملیات کی شکل میں مختلف اغراض کے لیے استعمال کیا۔ مثلاً بعض امراض یا تکالیف کے ازالہ کے لیے یا نظر بد اور جادو وغیرہ کے برے اثرات دور کرنے کے لیے یا شعبدہ بازوں وغیرہ کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یا محبت اور نفرت کے اثرات ڈالنے کے لیے۔

یہ علم اس اعتبار سے جادو اور نجوم وغیرہ کے علم سے بالکل مختلف تھا کہ اس میں نہ تو شرک کی کوئی ملاوٹ تھی اور نہ اس میں شیطان اور جنات کو کوئی دخل تھا لیکن اپنے اثرات و نتائج کے پیدا کرنے میں یہ جادو ہی کی طرح زود اثر تھا۔ ممکن ہے بنی اسرائیل کو یہ علم بابل کے زمانہ اسیری میں دو فرشتوں کے ذریعہ سے اس لیے دیا گیا ہو کہ اس کے ذریعہ سے بابل کی سحر و ساحری کا مقابلہ کر سکیں اور اپنی قوم کے کم علموں اور سادہ لوحوں کو جادوگروں کے رعب سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس بات کی طرف ہمارا ذہن دو وجہ سے جاتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل میں سحر و ساحری اور نجوم کا بڑا زور تھا[1] دوسری یہ کہ یہ بات سنت اللہ کے موافق معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی جگہ ایک غلط علم کا رعب اور زور ہو جس سے مفسد لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں تو وہاں اللہ تعالیٰ اس کے مقابلہ کے لیے اہل ایمان کو کوئی ایسا علم بھی عطا فرمائے جو جائز اور نافع ہو۔

هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ، قرآن سے واضح ہے کہ خدا کے دو فرشتے تھے اس وجہ سے تفسیر کی کتابوں میں ان کے متعلق جو فضول سا قصہ منقول ہے، وہ ہمارے نزدیک بالکل ناقابلِ التفات ہے۔ وہ ملکوتی صفات ہی کے ساتھ دنیا میں بھیجے گئے تھے اور ملکوتی صفات کے ساتھ ہی یہاں رہے۔ ان کا علم بھی، جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک جائز اور مفید علم تھا لیکن یہود نے اپنے اخلاق کی پستی اور مذاق کی خرابی کی وجہ سے اس کو بری نیت سے سیکھا اور برے مقاصد

---

[1] یسعیاہ نبی بابل سے خطاب کر کے فرماتے ہیں، "تیرے جادو کی کثرت اور تیرے سحر کی افراط کے باوجود یہ مصیبتیں پورے طور سے تجھ پر آ پڑیں گی ...... تجھ پر مصیبت آ پڑے گی جس کا منتر تو نہیں جانتی ...... اب اپنا جادو اور اپنا سحر جس کی تو نے بچپن ہی سے مشق کر رکھی ہے استعمال کر ..... اب افلاک پیما اور منجم اور وہ جو ماہ بماہ آئندہ حالات دریافت کرتے ہیں اٹھیں۔ اور جو کچھ تجھ پر آنے والا ہے اس سے تجھ کو بچائیں۔" (یسعیاہ ۴۷ : ۸ - ۱۳)

ہی میں استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علم بھی ان کے ہاں سحر و ساحری کا ایک ضمیمہ بن کے رہ گیا اور اس کی دلچسپیوں میں وہ ایسا کھوئے گئے کہ کتاب اللہ سے اول تو انھیں کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہ گیا اور اگر رہا بھی تو محض عملیات اور تعویذوں کی حد تک کہ فلاں آیت کے پھونکنے سے یہ فائدہ ہوا کرتا ہے اور فلاں آیت کے تعویذ سے یہ اثر پڑتا ہے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کیا اس طرح کا علم دنیا میں اپنا کوئی وجود بھی رکھتا ہے تو اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اس کا انکار ایک بالکل بدیہی بات کا انکار ہے۔ اگرچہ میں خود اس طرح کے کسی علم کا کبھی عامل نہیں بنا لیکن متعدد بار میرے اپنے تجربہ میں ایسی باتیں آئی ہیں جن کے بعد میرے لیے اس چیز کا انکار ممکن نہیں رہا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اسی علم کے باقیات ہیں جن کو ہمارے صوفیوں اور پیروں کے ایک طبقہ نے اپنایا اور اس سے انھوں نے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچایا بلکہ واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں اس کی مدد سے انھوں نے جوگیوں اور جوتشیوں وغیرہ کے مقابل میں اسلام اور مسلمانوں کی برتری بھی ثابت کی لیکن اخلاقی زوال کے بعد جس طرح یہود کے ہاں یہ علم، علوم سفلیہ کا ایک ضمیمہ اور دوکانداری کا ایک ذریعہ بن کے رہ گیا اسی طرح ہمارے یہاں بھی یہ صرف پیری مریدی کی دکان چلانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔ اور حق سے زیادہ اس میں باطل کے اجزا شامل ہو گئے جس کے سبب سے لوگوں پر اس کے اثرات بھی وہی پڑے جو قرآن نے بیان فرمائے۔

فرشتوں کی طرف سے تعلیم سے پہلے تنبیہ

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ، جس طرح وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ والا ٹکڑا الطور جملۂ معترضہ کے حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت کے لیے وارد ہوا ہے اسی طرح یہ ٹکڑا الطور استدراک ان فرشتوں کی براءت کے لیے وارد ہوا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ اپنے اس علم کا اگر کسی پر انکشاف کرتے تو ساتھ ہی اس کو یہ تنبیہ بھی ضرور کر دیتے کہ دیکھو، ہمارا یہ علم ایک فتنہ ہے تو تم اس کو برے مقاصد میں استعمال کر کے کفر میں نہ پڑ جانا بلکہ اس کو صرف اچھے مقاصد ہی میں استعمال کرنا۔

فتنہ کا مفہوم

فتنہ کے مفہوم کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام دنیوی نعمتیں، بیوی بچے، مال و جاہ، اقتدار اور سلطنت وغیرہ دو دھاری تلوار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان اگر ان سے صحیح کام لے تو یہ اس کے لیے نعمت ہیں اور اگر ان کی وجہ سے فتنہ میں پڑ جائے تو یہ اس کے لیے عذاب بن جایا کرتی ہیں۔ اسی طرح یہ علم بھی مضرت اور منفعت کے دونوں پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کو لوگوں کی خدمت میں استعمال کر کے اس سے ثواب بھی کمایا جا سکتا ہے اور اس کو انتشار اور تفریق کا ذریعہ بنا کر اس سے گمراہی اور ہلاکت کا سامان بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ انسان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کو زیادہ تر غلط ہی استعمال کرتا ہے اس وجہ سے فرشتوں نے ایک خیر خواہ معلم کی طرح اپنے سے ہر ربط پیدا کرنے والے کو پہلے سے آگاہ کر دیا کہ ہمارا علم ایک شمشیر دو دم کی حیثیت رکھتا ہے، کوئی اس کو سیکھ کر اس کو برے مقاصد میں نہ استعمال کرے ورنہ اس طرح

وہ کفر و شرک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

یہاں فرشتوں کے تعلیم دینے کے معاملہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے جس سے بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگوں کو انسانی روپ میں تعلیم دیتے تھے۔ اگر یہ بات ہو تو اس میں کوئی خاص اشکال نہیں ہے۔ متعدد ایسے واقعات کا خود قرآن سے پتہ چلتا ہے جب فرشتے انسانوں کے اندر خود انسانوں کی شکل و صورت میں نمایاں ہوئے ہیں لیکن امکان اس بات کا بھی ہے کہ عملیات کے دلدادہ لوگ کسی خاص قسم کی ریاضت اور چلہ کشی کے ذریعہ سے ان سے روحانی قسم کا ربط پیدا کر کے یہ تعلیم حاصل کرتے رہے ہوں۔ اگر مطلب یہ لیا جائے تو قرآن کے الفاظ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے خلاف جاتی ہو۔

یہود کی پست مذاقی

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ: یعنی فرشتوں کی مذکورہ بالا تنبیہ کے باوجود لوگ خاص طور پر ان سے ان عملیات کی تعلیم حاصل کرتے تھے جن کے ذریعے سے شوہر اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں۔ اس ٹکڑے سے یہود کے فساد اخلاق اور ان کی پست ہمتی اور دنائت پر روشنی پڑتی ہے کہ ان کی سب سے زیادہ رغبت اس عمل سے تھی جس کو کسی میاں بیوی کے رشتۂ محبت کو قطع کرنے کے لیے بطور مقراض استعمال کر سکیں، حالانکہ میاں بیوی کے رشتہ کے استحکام پر پورے نظامِ تمدن کے استحکام کی بنیاد ہے۔ اگر کوئی مذہبی جماعت اپنے علم کو اس بنیاد کے اکھاڑنے میں لگا دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے شیطان کے کرنے کا جو کام تھا اس کو خود سنبھال لیا۔ جو علم اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے اس سے معاشرے کے صرف غنڈوں اور بدمعاشوں ہی کو نفع پہنچ سکتا ہے اور محبت و نفرت پیدا کرنے کے علم کا اس سے زیادہ مہلک استعمال کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ اس سے صحیح کام بھی لیا جا سکتا ہے جس سے لوگوں کو نفع پہنچ سکتا ہے۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ: یہ ٹکڑا بھی بطور استدراک کے ہے یعنی ان عملیات کے شائقین یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں بجائے خود نافع اور ضار ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ اعمال شیطانیہ ہوں یا اعمال روحانیہ، ان سے اگر کسی کو نفع یا ضرر پہنچتا ہے یا پہنچایا جا سکتا ہے تو صرف اللہ کے اذن، اور اس کی مشیت کے تحت۔ یہ چیزیں بذاتِ خود مؤثر نہیں ہیں۔

نفع و ضرر خدا کے اختیار میں ہے

اس استدراک سے اس توحید و اخلاص کو اجاگر کیا گیا ہے جو قرآن کی تمام تعلیمات کی بنیاد ہے۔ ایک موحد کو اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ اللہ کی کتاب کے ہوتے ہوئے اول تو وہ اس طرح کی چیزوں کی رغبت ہی نہ کرے ثانیاً اگر ان میں سے کوئی چیز اس کے علم میں آئے تو اس کو مؤثر بالذات نہ مانے۔ نیز اگر اس طرح کی کسی چیز سے اس کو ضرر کا اندیشہ لاحق ہو تو صرف اللہ واحد ہی کی طرف مدد کے لیے رجوع کرے، ٹونوں، ٹوٹکوں اور عاملوں اور سیانوں کے چکر میں نہ پھنسے۔

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ: یہ ٹکڑا سیکھنے والوں کی اخلاقی اور ذہنی پستی کو ظاہر کر رہا ہے۔ جو علم وہ سیکھتے تھے وہ بجائے خود تو جیسا کہ ظاہر ہوا اپنے اندر نفع و نقصان دونوں کے پہلو رکھتا تھا لیکن سیکھنے والوں

کی ذہنیت وہی ہوتی تھی جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس کے ذریعے سے کسی جوڑے کے درمیان تفریق کرائیں، جن میں الفت ہے ان کے درمیان نفرت کے بیج بوئیں، جن میں وصل ہے ان میں فصل پیدا کریں۔ اپنی اس فسادیت کی وجہ سے انھوں نے اس کے نفع کے پہلو کو بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔

تورات میں علوم سفلیہ کی ممانعت — وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ، یعنی یہود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جو لوگ اس طرح کے فتنوں میں پڑیں گے آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ تورات میں نہایت واضح الفاظ میں انھیں ان چیزوں سے روک دیا گیا تھا۔ استثناء باب ۱۸۔ آیات ۹ تا ۱۲ ملاحظہ ہوں۔

"جب تو اس ملک میں جو خداوند تیرا خدا تجھ کو دیتا ہے پہنچ جائے تو وہاں کی قوموں کی طرح مکروہ کام کرنے نہ سیکھنا۔ تجھ میں ہرگز کوئی ایسا نہ ہو جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو آگ میں چلوائے یا فال گیر یا شگون نکالنے والا یا افسوں گر یا جادوگر یا منتری یا جنات کا آشنا یا رمّال یا ساحر ہو کیونکہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں خدا کے نزدیک مکروہ ہیں اور انھی مکروہات کے سبب سے خداوند تیرا خدا تیرے سامنے سے ان کو نکالنے پر ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان واضح تنبیہات کے باوجود یہود نے ان ساری چیزوں کو اختیار کیا اور ان کا ذوق ان کے اندر اس قدر بڑھ گیا کہ طالوت کو اپنے زمانہ میں پوری قوم کی تطہیر کرنی پڑی۔ چنانچہ سموئیل کے باب ۲۸۔۳ میں ہے۔

"اور ساؤل نے جنّات کے آشناؤں اور افسوں گروں کو ملک سے خارج کر دیا تھا۔"

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۳)

اس آیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے آیت ۱۰۱ کو بھی جو اوپر گزر چکی ہے نگاہ میں رکھیے۔ وہاں فرمایا تھا کہ انھوں نے خدا کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا اور سحر و نجوم اور گنڈے تعویذ وغیرہ کے فتنوں میں پڑے رہ گئے۔ اب یہاں فرمایا کہ اگر وہ اللہ کے آخری رسول اور اس کی آخری کتاب پر ایمان لاتے اور ان فتنوں سے بچتے جن میں وہ مبتلا ہیں تو اس کا اجر بہت بڑا تھا۔ لیکن یہ اپنی رذالت اور پست ہمتی کی وجہ سے علومِ سفلیہ کی دوکانداری ہی کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ انھیں کچھ اندازہ نہیں کہ اللہ کی کتاب پر ایمان اور اس کے بخشے ہوئے علم کا اجر و ثواب خدا کے ہاں کیا ہے۔ کاش وہ اس بات کو سمجھتے۔

۴۳۔ مجموعۂ آیات ۹۷۔۱۰۳ کی چند اہم باتیں

اس مجموعۂ آیات کے اندر بھی چند باتیں ایسی ہیں جو مزید وضاحت کی محتاج ہیں تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔

ایک یہ کہ بسا اوقات ایک گمراہی یا بدعقیدگی بظاہر معمولی نظر آتی ہے لیکن وہ اپنے اندر اتنی گمراہیاں

چھوٹی گمراہی بڑی گمراہیوں کے دروازے کھول دیتی ہے

اور بدعقیدگیاں چھپائے ہوئے ہوتی ہے کہ اس سے آدمی کے سارے دین و ایمان کی جڑیں اکھڑ کے رہ جاتی ہیں۔ یہود قرآن کی مخالفت کے جوش میں حضرت جبریل امین کے بھی مخالف بن گئے اور اس چیز کو انھوں نے ایک معمولی بات سمجھا۔ قرآن نے جب اس کے مضمرات واضح کیے تو معلوم ہوا کہ جبریلؑ کی مخالفت تنہا جبریلؑ ہی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ کی بھی مخالفت ہے، اس کے تمام فرشتوں کی مخالفت ہے اور اس کے تمام رسولوں کی مخالفت ہے۔ پھر ساتھ ہی اس مخالفت کے ایک اور لازمی نتیجہ کو بھی واضح فرمایا جو مذکورہ نتائج سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ ایسے کٹر کافر ہیں کہ اللہ، ملائکہ اور انبیاء سب کے دشمن ہیں۔ اللہ ان کا دوست کس طرح ہو سکتا ہے؛ اس وجہ سے لازماً ایسے کافروں کا اللہ بھی دشمن ہے۔ غور کیجیے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔

اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں

دوسری بات جو مذکورہ بالا اصول ہی پر مبنی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ اور اس کے نبیوں اور رسولوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب سب کی تکذیب اور کسی ایک کی بھی دشمنی سب کی دشمنی ہے۔ اس وجہ سے مسلمانوں کا عقیدہ یہ بتایا گیا ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲۸۵ - بقرہ) (اس کے رسولوں کے درمیان ہم کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے) مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسی اصول پر وہ حدیث بھی مبنی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ من عادی لی ولیا فقد بارزنی بالحرب (جس نے میرے کسی دوست کے ساتھ دشمنی کی تو اس نے خود مجھے اعلانِ جنگ دیا) اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے جاننے اور ماننے والے ہیں وہ درحقیقت اسی ملت اور اسی حزب سے تعلق رکھتے ہیں جس میں انبیاء و رسل اور ملائکہ شامل ہیں۔ جس طرح ان میں سے کسی کی دشمنی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کے خلاف جنگ ہے اسی طرح صلحاء و ابرار میں سے بھی کسی کی دشمنی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

کتاب اللہ سے صحیح ربط کے لیے ضروری شرط

تیسری یہ کہ جس طرح سحر، شعبدہ، نجوم، حاضرات، فال اور کہانت وغیرہ کے قسم کی چیزیں خدا اور اس کی شریعت سے انسان کو برگشتہ کرنے والی ہیں، اسی طرح اشیا اور کلمات کے روحانی خواص یعنی گنڈے تعویذ اور جھاڑ پھونک کا علم بھی انسان کے لیے ایک فتنہ اور کتاب و شریعت سے منحرف کرنے والا ہے۔ کتاب اللہ کے ساتھ مضبوط اور مستحکم ربط پیدا کرنے کے لیے صحیح راہ یہی ہے کہ آدمی نہ صرف سحر و ساحری سے دور رہے، بلکہ اس دوسری قسم کی چیزوں سے بھی حتی الوسع احتراز ہی کرے۔ انسان جب عملیات وغیرہ کے چکر میں پھنس جاتا ہے تو اس فتنہ میں لازماً گرفتار ہو جاتا ہے جس سے ہاروت و ماروت نے متنبہ کیا تھا اور پھر ان تمام مفاسد کا ظہور میں آنا لازمی ہے جو یہود کے ہاتھوں ظہور میں آئے اور جن کے سبب سے وہ کتاب اللہ کی روشنی سے محروم ہو گئے۔

۴۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۰۴-۱۲۱

حریفوں کو گمراہ کرنے کے لیے یہود کی شرارتیں

آگے مسلمانوں کو یہود کی بعض ان شرارتوں سے آگاہ کیا گیا جو وہ اس غرض سے کر رہے تھے کہ بنی اسماعیل کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی سعادت سے محروم کریں۔ اس ضمن میں یہود کے بعض ایسے اعتراضات نقل کرکے ان کے جواب بھی دیے ہیں جو وہ مسلمانوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کرنے کے لیے اٹھاتے تھے اور وہ ہدایات بھی دی ہیں جن پر عمل کرکے مسلمان ان فتنوں کے مقابل میں راہِ حق پر استوار رہ سکتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۰۴ تا ۱۲۱

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقُولُوا۟ رَٰعِنَا وَقُولُوا۟ ٱنظُرْنَا وَٱسْمَعُوا۟ ۗ
وَلِلْكَٰفِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَّا يَوَدُّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِنْ
أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ وَلَا ٱلْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ مِّن
رَّبِّكُمْ ۗ وَٱللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِۦ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ ذُو ٱلْفَضْلِ
ٱلْعَظِيمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا نَنسَخْ مِنْ ءَايَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ أَوْ
مِثْلِهَآ ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰۶﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ
أَنَّ ٱللَّهَ لَهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِن
وَلِىٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۰۷﴾ أَمْ تُرِيدُونَ أَن تَسْـَٔلُوا۟ رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ
مُوسَىٰ مِن قَبْلُ ۗ وَمَن يَتَبَدَّلِ ٱلْكُفْرَ بِٱلْإِيمَٰنِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ
ٱلسَّبِيلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ
إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
لَهُمُ ٱلْحَقُّ ۖ فَٱعْفُوا۟ وَٱصْفَحُوا۟ حَتَّىٰ يَأْتِىَ ٱللَّهُ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ
كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ۚ وَمَا

تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ
هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ
اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ ع ۱۳ ۹ ۱۳
الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ
عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا
فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ
يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ
اَنْ يَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ
فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا
تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ
اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ
لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا
فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا
يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحٰبِ
الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ
مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ
بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا
وقف منزل نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ أُولٰٓئِكَ
ع ۱۴/۱۴ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

ترجمہ آیات ۱۰۴-۱۲۱

اے ایمان والو تم راعنا نہ کہا کرو "انظرنا" کہا کرو اور توجہ سے سنا کرو۔ کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا، اہل کتاب ہوں یا مشرکین، نہیں چاہتے کہ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے کوئی رحمت نازل ہو۔ اور اللہ اپنی رحمت کے لیے خاص کرتا ہے جن کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۱۰۴-۱۰۵

جو کوئی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کراتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار۔ ۱۰۶-۱۰۷

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اس طرح کے سوال کرو جس طرح کے سوال اس سے پہلے موسیٰ سے کیے گئے اور جو لوگ ایمان کو کفر سے بدل لیں گے وہ شاہراہ سے بھٹک گئے ۱۰۸

بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ وہ تمہارے ایمان کے بعد پھر تمہیں کفر کی حالت میں پلٹا دیں، محض اپنے حسد کی وجہ سے، حق کے اچھی طرح واضح ہو جانے کے باوجود تو درگزر کرو اور

نظرانداز کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو نیکی بھی تم اپنے لیے کرو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۰۹-۱۱۰

اور کہتے ہیں کہ جنت میں نہیں داخل ہو سکتے مگر وہ جو یہودی ہیں یا نصرانی۔ یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔ کہو اس بات پر اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ ہاں بلاشبہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور وہ ٹھیک طرح سے عمل کرنے والا ہے تو اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے، نہ ان کو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کی کوئی بنیاد نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہود کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور یہ دونوں کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح کی بات ان لوگوں نے بھی کہی جن کو علم نہیں ہے۔ تو اللہ قیامت کے دن اس معاملہ کا فیصلہ کرے گا جس میں یہ جھگڑ رہے ہیں۔ ۱۱۱-۱۱۳

اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد کو اس بات سے محروم کریں کہ ان میں اس کا ذکر کیا جائے اور ان کی ویرانی کے درپے ہوں۔ ان کے لیے زیبا نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے اور مشرق ہو یا مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں تو جدھر بھی رخ کرو اسی طرف اللہ ہے، اللہ بڑی گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔ ۱۱۴-۱۱۵

اور کہتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے۔ اس کی شان ان باتوں سے ارفع ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کے لیے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔
۱۱۶-۱۱۷

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا۔ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں انھوں نے بھی اِنھی کی طرح کی بات کہی۔ ان سب کے دل ایک ہی جیسے ہو گئے۔ جو لوگ یقین کرنے والے ہیں ان کے لیے ہم نشانیاں اچھی طرح واضح کر چکے ہیں۔ ہم نے تمھیں حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے اور تم سے دوزخ میں جانے والوں کے بارے میں کوئی پرسش نہیں ہوگی۔ ۱۱۸-۱۱۹

نہ یہود تم سے راضی ہونے والے ہیں اور نہ نصاریٰ تاوقتیکہ تم اِنھی کی ملت کے پیرو نہ بن جاؤ۔ ان سے کہو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور اگر تم اس علم حقیقی کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشوں پر چلے تو اللہ کے مقابل میں نہ تمھارا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ ۱۲۰

جن لوگوں کو ہم نے کتاب بخشی اور وہ اس کے پڑھنے کا حق ادا کرتے ہیں وہی لوگ اس (قرآن) پر ایمان لائیں گے اور جو اس کا انکار کریں گے تو وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ ۱۲۱

۴۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۰۴)

'راعنا' کا مفہوم — رَاعِنَا مراعات سے امر کا صیغہ ہے۔ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو تو متکلم کو پھر متوجہ کرنے کے لیے عربی میں رَاعِنَا کا لفظ ہے یعنی ذرا ہمارا لحاظ فرمایئے، پھر ارشاد ہو۔ جس طرح انگریزی میں (I BEG YOUR PORDON) ہے عربی میں اسی موقع و محل کے لیے اُنْظُرْنَا کا لفظ بھی ہے جو نظر سے امر کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی دیکھنے، مہلت دینے، انتظار کرنے اور توقف کرنے کے ہیں۔

آنحضرت صلعم کی مجلس میں یہود کی شرارت — اوپر گزر چکا ہے کہ یہ یہود کی ان شرارتوں اور اعتراضات سے متنبہ کیا جا رہا ہے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے خلاف اس لیے کرتے تھے کہ اپنے دلوں کی بھڑاس نکالیں اور ہو سکے تو اس طرح مسلمانوں

کو اسلام کی نعمت عظمیٰ سے محروم کریں۔ سیاق و سباق پر نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہودی محض منافقانہ اغراض کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں شریک ہوتے اور اپنے شوق استفادہ و ذوق تعلم کے اظہار کے طور پر رَاعِنَا کا لفظ بار بار دہراتے تاکہ حاضرین مجلس پر یہ اثر ڈالیں کہ یہ علم کے بڑے طالب اور قدردان لوگ ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اس لفظ کو صرف اس لیے استعمال کرتے تھے کہ ذرا سا زبان کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے سے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا پہلو پیدا کیا جا سکتا تھا۔ رَاعِنَا کو ذرا نیچے کی طرف دبا کر ادا کیجیے تو بڑی آسانی سے رَاعِيْنَا بن جائے گا جس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہیں۔ یہود کی اس شرارت کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ہے۔ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ (یہود میں وہ لوگ بھی ہیں جو کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں اور اپنی زبانوں کو لچکا کر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا دین پر طنز کرنے کے لیے) اس آیت سے واضح ہے کہ یہ شرارت رَاعِنَا کے تلفظ میں زبان لچکا کر پیدا کی جاتی تھی۔ اسی طرح عَصَيْنَا کو اس طرح ادا کرتے کہ سننے والے کو اَطَعْنَا کا دھوکا ہو اور اِسْمَعْ کہتے ہوئے ذرا زبان دبا کر اس کے ساتھ چپکے سے غَيْرَ مُسْمَعٍ بھی لگا دیتے۔ یعنی ذرا ان کی ناشنیدنی سنو۔ مقصود ان شرارتوں سے جیسا کہ قرآن نے واضح فرمایا، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کرنا اور پھبتی چست کرنا ہوتا۔

الفاظ سے متعلق ایک نفسیاتی حقیقت

چونکہ یہود یہ طنز، جیسا کہ اوپر گزرا، اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے اور آپ کو مسلمانوں کی نگاہوں سے گرانے کے لیے کرتے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس لفظ ہی کو مسلمانوں کے مجلسی الفاظ سے یک قلم خارج کر دیا اور اس کی جگہ زبان کا دوسرا معروف لفظ استعمال کرنے کا حکم دیا جو طنز کے شائبہ سے پاک تھا۔ الفاظ کے متعلق یہ نفسیاتی حقیقت ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگر ان کے اندر کوئی روح فساد موجود ہو یا سوء استعمال سے پیدا کر دی گئی ہو تو پھر سلامتی ان سے دور رہنے ہی میں ہے ورنہ ان کا زہر غیر شعوری طور پر ان کے بولنے والوں اور سننے والوں کے اندر بھی سرایت کر کے رہتا ہے۔ مسلمانوں کو اس چھوت سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے رَاعِنَا کے استعمال کی ممانعت فرما دی۔

پھر اس کا ایک اور فائدہ بھی ہوا وہ یہ کہ "رَاعِنَا" کی ممانعت اور "انظرنا" کی اجازت نے مخلصین اور منافقین کے درمیان ایک نشانِ امتیاز بھی پیدا کر دیا اور صریح ممانعت کے بعد ظاہر ہے کہ مجلس نبوی میں اس لفظ کے استعمال کی جسارت وہی لوگ کر سکتے تھے جن کے دلوں کے اندر حسد اور کینہ توزی کا اتنا بخار بھرا ہوا ہو کہ وہ کسی طرح بھی اس کو دبا سکنے پر قادر نہ ہوں۔

اس آیت میں "اسمعوا" کا لفظ اپنے کامل اور حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی غور سے پیغمبر کی باتیں سنو اور ان کو سمجھو تاکہ تمھیں بار بار پیغمبر کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اس میں ایک لطیف اشارہ

اس بات کی طرف بھی ہے کہ یہ یہود نہ تو سننے کے لیے آتے ہیں اور نہ سمجھنے کے لیے بلکہ صرف اس لیے آتے ہیں کہ کوئی موقع رَاعِنَا کے استعمال کا پیدا کر کے اپنے دل کا بخار نکالیں۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۱۰۵)

معاندین کے باطن پر روشنی

یہ آیت معاندین اسلام کے باطن پر عکس ڈال رہی ہے اور خطاب مسلمانوں سے ہے کہ مسئلہ صرف ایک لفظ کے استعمال اور عدم استعمال کا نہیں ہے بلکہ یہ یہودی اور یہ مشرکین دونوں اس غصہ اور حسد میں جل رہے ہیں کہ تم خدا کی طرف سے اس خیر عظیم کے سزاوار کس طرح قرار پائے۔ ان کے نزدیک تو سارے خیر و شرف کے وارث و مورث یہ تھے نہ کہ تم قلاش اور بے سروسامان مسلمان۔ لیکن جب وہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے علی الرغم تمھاری طرف سب سے بڑے خیر کی وراثت منتقل ہو رہی ہے اور تم اس کے حامل ہوا چاہتے ہو تو انھوں نے اس قسم کی چھچھوری حرکتیں شروع کر دی ہیں کہ اگر ہو سکے تو اس طرح تمھاری نظروں میں اسلام اور پیغمبر آخر الزمان کی وقعت کچھ گھٹائیں تاکہ جس طرح وہ خود اس نعمت سے محروم ہیں تم بھی اس سے محروم ہی رہو۔ تم ان کی ان چالوں سے ہوشیار رہو اور ان کے چکموں میں آ کر ان کی تمنا بر آنے کے سامان نہ کرو۔ پھر فرمایا کہ اللہ نے اپنے فضل و رحمت کا اجارہ دار نہ یہود کو بنایا ہے نہ قریش کے سرداروں کو بلکہ وہ اپنے فضل و رحمت کا خود مالک و مختار ہے۔ وہی اپنی صواب دید اور اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق جس کو چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۰۶)

نسخ کا مفہوم

نسخ کے اصل معنی ہٹانے اور مٹانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ (۵۲۔ الحج) (پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان داخل کر دیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو محکم کرتا ہے) یہاں یہ ایک قانون کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا قانون لانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اِنْسَاء کے معنی فراموش کر دینے کے ہیں۔

یہود کی وسوسہ اندازی کی تردید

یہود مسلمانوں کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالتے تھے کہ جب قرآن حضرت موسیٰؑ کو خدا کا پیغمبر اور تورات کو خدا کی کتاب تسلیم کرتا ہے تو پھر تورات کے احکام کے رد و بدل کے کیا معنی؛ کیا خدا اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کو خود اپنے ہی ہاتھوں بدلتا ہے۔ کیا اب تجربہ کے بعد خدا پر اپنی غلطیاں واضح ہو رہی ہیں اور وہ ان کی اصلاح کر رہا ہے؛

اس قسم کے اعتراضات اٹھا کر یہود مسلمانوں کو قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قرآن نے یہاں ان کا جواب دیا ہے کہ تورات کا جو قانون منسوخ کیا جاتا ہے اس سے

بہتر قانون اس کی جگہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح تورات کے جو احکام یہود نے فراموش کر دیے تھے، ان کی تجدید کی جاتی ہے اور اگر تجدید نہیں کی جاتی بلکہ ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو ان سے ملتے جلتے احکام دیے جاتے ہیں۔ یعنی اس تبدیلی سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک تو خوب سے خوب تر کی طرف بڑھا رہا ہے، دوسرے دین کی جو دولت ضائع کر دی گئی تھی اس کی جگہ دین کے خزانہ کو نئی دولت سے معمور کر رہا ہے۔ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو قابلِ اعتراض قرار دی جا سکے۔

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ: یہ خطاب عام ہے۔ ان لوگوں سے بھی جو یہ وسوسہ اندازی کر رہے تھے اور ان لوگوں سے بھی جو اس وسوسہ اندازی سے متاثر ہو رہے تھے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کو شریعت دے کر اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے مستعفی نہیں ہو بیٹھا تھا کہ اب نہ تو وہ دنیا میں کسی کو شریعت دے گا، نہ اس میں کسی قسم کی ترمیم و تبدیلی کرے گا اور نہ اب وہ اس کی تجدید کرے گا اگرچہ یہ اس کو بالکل ہی برباد کر کے رکھ دیں۔ بلکہ وہ بدستور اپنے تمام اختیارات کا مالک ہے اور اپنی حکمت کے مطابق ان کو ہمیشہ استعمال کرتا رہا ہے اور کرے گا۔

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ (۱۰۷)

تردید کا ایک خاص پہلو

یہاں بھی مخاطب وہی ہیں جو اوپر والی آیت میں مخاطب ہیں۔ البتہ جواب میں اس ذہنیت کو ملحوظ رکھ کر جو مذکورہ بالا سوال کے پس پردہ چھپی ہوئی تھی، تھوڑی سی تفصیل آ گئی ہے۔ یہود نسخ کے سوال کو اٹھا کر سادہ لوح لوگوں کے اندر جو وسوسہ اندازی کر رہے تھے اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات کو تاڑ گئے تھے کہ یہ تورات کے احکام کا منسوخ ہونا اور ان کی جگہ دوسرے احکام کا آنا محض تورات کے بعض احکام ہی کا منسوخ ہونا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر یہود کی منصب امامت سے معزولی اور ان کی جگہ ایک دوسری امت کے نصب و تقرر کا پیام بھی مضمر ہے۔ دراصل اس چیز کا غم و غصہ تھا جو نہیں کھائے جا رہا تھا اور اس کے اظہار کے لیے وہ نسخ کے سوال کو ایک پردہ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ قرآن نے اس پردے کو اٹھا کر ان کو یہ جواب دیا کہ آسمان و زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ جس سے چاہتا ہے اس کو چھینتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے۔ اب اگر تم اس منصب کے لیے نا اہل ثابت ہو چکے ہو جس پر اس نے تم کو سرفراز کیا تھا اور اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہاری جگہ اس منصب پر کسی اور کو سرفراز فرمائے تو تمہارے غم و غصہ کے علی الرغم یہ بات ہو کے رہے گی اور تمہارا کوئی حامی و مددگار خدا کے اس فیصلہ سے تمہیں نہیں بچا سکتا۔

اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَکُمۡ کَمَا سُئِلَ مُوۡسٰی مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَمَنۡ یَّتَبَدَّلِ الۡکُفۡرَ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ (۱۰۸)

لفظ سوال کا مفہوم

لفظ سوال کے اندر کئی مفہوم ہیں۔ مثلاً مانگنا، درخواست کرنا، مطالبہ کرنا، پوچھنا، پرسش کرنا، سوال کرنا۔

سوال، بعض صورتوں میں اعتراض کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کے مفہوم میں اعتراض کرنا بھی داخل ہے۔ بعض حالات میں تحقیق کی نوعیت کا ہوتا ہے، اس صورت میں اس کا صلہ عن کے ساتھ آتا ہے۔ بعض حالات میں سوال استہزاء کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے، اس صورت میں اس کا صلہ 'ب' کے ساتھ آتا ہے مثلاً سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۱-معارج (ایک مذاق اڑانے والے نے مذاق اڑایا ہونے والے عذاب کا) قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ یہ لفظ معترضانہ سوال کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

مسلمانوں کو ایک تنبیہ

یہاں مخاطب مسلمانوں کے اندر کے وہ کمزور لوگ ہیں جو یہود کے القا کیے ہوئے مذکورہ بالا سوال سے متاثر ہو کر اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرتے اور اس طرح اس سوال کے اُٹھانے اور پھیلانے میں مسلمانوں کے اندر یہود کی نمائندگی کرتے۔ قرآن نے سوال کا جواب تو اوپر دے دیا تاکہ یہود کے پروپیگنڈے کا رد ہو جائے لیکن جس طرح اوپر والی آیت میں یہود کو تنبیہ کی اسی طرح مسلمانوں کے اندر ان کی نمائندگی کرنے والوں کو یہاں تنبیہ کی۔ یہ سوالات اپنی ذہنیت اور نوعیت کے اعتبار سے اسی طرح کے سوالات ہیں جس طرح کے سوالات یہود حضرت موسیٰؑ سے کرتے رہے ہیں اور یہ روش ایمان و ہدایت کی روش نہیں ہے بلکہ ایمان کو کفر سے بدلنے کی روش ہے۔ جو لوگ یہ روش اختیار کرتے ہیں وہ یہود ہی کی طرح جادۂ مستقیم سے بھٹک کے رہتے ہیں۔

چونکہ اس سوال کے پس پردہ درحقیقت یہود ہی تھے اس وجہ سے قرآن نے یہ کہہ کے کہ اسی طرح کے سوالات اس سے پہلے موسیٰؑ سے کیے گئے، بڑی بلاغت کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کی وسوسہ اندازیوں سے بے خبر نہیں ہے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۰۹)

مزید تنبیہ ہے کہ یہود کی یہ تمام سرگرمیاں صرف اس غرض سے ہیں کہ تمھیں ایمان سے ہٹا کر پھر کفر کی حالت میں پلٹا دیں۔ یہ نہ سمجھو کہ ان کی یہ تمام بھاگ دوڑ تمھاری خیر خواہی میں ہے یا یہ تمھارے سابق دین کو برحق سمجھتے ہیں اس کی حمایت میں ہے یا اسلام کے باب میں انھیں کوئی غلط فہمی ہے اس وجہ سے ہے بلکہ یہ محض حسد کا دورہ ہے جو ان کے نفس کی تحریک سے ان پر پڑا ہے باوجودیکہ اسلام کا حق ہونا ان پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔

یہ تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ بعض نیک دل یا سادہ لوح مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ یہ اہل کتاب محض ان کی خیر خواہی میں یا ایک دینی خدمت کے طور پر ان کے ایمان کے معاملہ میں اتنے سرگرداں ہیں۔ قرآن نے اس غلط فہمی کو رفع کر دیا کہ یہ سب کچھ محض حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ہے یعنی یہ کسی جذبۂ دینی

کے تحت نہیں ہے بلکہ محض نفس کے ابھارے ہوئے جذبۂ حسد کی کرشمہ سازی ہے۔

یہود کو تہدید

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ: عفو کے ایک معنی تو دل سے معاف کر دینے کے ہیں اور دوسرے معنی کسی کو نظر انداز کر دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۱۵۔ مائدہ (اور تمھارے لیے بیان کرتا ہے بہت سی وہ چیزیں جو تم کتاب کی چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں کو نظر انداز کرتا ہے) صفح کے معنی چشم پوشی کرنے اور نظر انداز کرنے کے ہیں، کسی حماسی کا شعر ہے

صفحنا عن بنی ذھل وقلنا القوم اخوان

ہم نے بنی ذہل کی شرارتوں سے چشم پوشی کی اور خیال کیا کہ یہ لوگ اپنے ہی بھائی ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ ابھی کچھ دنوں ان یہودیوں کی شرارتوں کو نظر انداز کرو۔ یہاں تک کہ اللہ ان کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ یہ پوری آیت یہود کے لیے تہدید و وعید ہے اور اس بِاَمْرِهٖ کے اجمال کے اندر وہ ساری باتیں چھپی ہوئی ہیں جو بعد میں یہود کے ساتھ جنگ کے حکم، ان کی ہزیمت اور قتل و جلاوطنی اور ادائے جزیہ وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۰)

مخالفین کی مخالفتوں کا علاج

یہ مسلمانوں کو معاندین اسلام کی مخالفتوں کا علاج بتایا گیا ہے کہ اگر تم ان فتنوں پر غالب آنا چاہتے ہو تو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اسی سے تمھاری وہ روحانی و اخلاقی تربیت ہوگی جو تمہیں ایک طرف تو مخالفین کی وسوسہ اندازیوں سے بالکل مامون کر دے گی، دوسری طرف تم کو جماعتی حیثیت سے ایک ایسی بنیان مرصوص بنا دے گی کہ کوئی طاقت بھی تمھیں ہلا نہ سکے گی۔ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کو تمام دین کی بنیاد، تمام تربیت و اصلاح کی اساس اور تمام قوت و طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسری ساری چیزوں کو ان کے تابع قرار دیا گیا ہے۔ مکی سورتوں میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کے مقابل میں صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے وہاں نماز کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی بقرہ میں تحویل قبلہ کے حکم کے بعد جب مخالفت کا طوفان اٹھا ہے تو فرمایا گیا کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۱۵۳۔ بقرہ (اے ایمان والو۔ صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد چاہو بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے) اسی طرح جو لوگ مضبوط تربیت کے بغیر جنگ و جہاد کے لیے جلدی مچاتے تھے ان کو نماز و زکوٰۃ کے ذریعہ سے اپنی تربیت کرنے کی ہدایت کی گئی۔ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (ابھی اپنے ہاتھ روکو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) سورہ حج میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم دینے کے بعد ہدایت فرمائی کہ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۔ (پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو مضبوط پکڑو) یہاں بھی نماز اور زکوٰۃ کا حکم اسی پہلو سے ہے۔ اس پر مزید بحث آگے

آئے گی۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۱۱)

هُوْد۔ ھائد کی جمع ہے۔ اس کی تحقیق آیت ۶۲ میں گزر چکی ہے۔

مسلمانوں کو بہکانے کے لیے یہود و نصاریٰ کا مشترکہ پروپیگنڈا

جس طرح نسخ کا اعتراض مسلمانوں کے دلوں میں شک اور تردد پیدا کرنے کے لیے اٹھایا گیا اسی طرح یہ پروپیگنڈا بھی یہود اور نصاریٰ دونوں کی طرف سے کیا گیا کہ نجات حاصل کرنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو یہ ہے کہ آدمی یہودیت اختیار کرے یا نصرانیت، یہ دونوں خدائی دین ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کسی نئے دین کی نہ ضرورت ہے، نہ گنجائش۔

یہود اور نصاریٰ یوں تو آپس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، آئے دن ان کے اندر مذہبی اختلاف کی بنا پر خون خچر ہوتا رہتا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی مخالفت کے لیے دونوں آپس میں بڑے روادار بن گئے تھے۔ دونوں نے مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا تھا اور ہم زبان ہو کر یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ جس کو نجات مطلوب ہو وہ یہودی بنے یا نصرانی۔ یہ نیا دین جو چلا کیا ہے، یہ تو محض ایک فتنہ ہے۔

یہود نے اسلام کی مخالفت میں رواداری کی یہ روش مشرکین تک کے معاملہ میں اختیار کر لی تھی، نصاریٰ تو بہر حال ان کے اپنے ہی بھائی بند تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کی اس حق دشمنی کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۔ ۵۱۔ نساء (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا، وہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں)

اس پروپیگنڈے کو اس چیز سے تقویت پہنچی ہوگی کہ اہل عرب اہل کتاب سے پہلے سے حسن ظن رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی تائید میں یہ بھی کہتے رہے ہوں گے کہ یہودیت اور نصرانیت کے آسمانی دین ہونے سے تو قرآن کو بھی انکار نہیں ہے۔ ان وجوہ سے قرآن نے اس کی بھی تفصیل کے ساتھ تردید کی فرمایا کہ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ، یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔ یعنی یہ محض ان کی من گھڑت باتیں ہیں جو بغیر کسی سند اور دلیل کے انھوں نے محض اپنے جی سے گھڑ رکھی ہیں۔ خدا نے یہودیت اور نصرانیت کسی کے حق میں بھی یہ پروانہ جاری نہیں کیا ہے کہ جو یہودی یا نصرانی بن گیا اس کے لیے جنت ہے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں تو اپنے اس دعوے کی سچائی پر اپنی کتاب سے کوئی دلیل پیش کریں۔ اس طرح کی ان کی بہت سی تمنائیں اور خواہشیں تھیں جو انھوں نے دین اور عقیدہ بنا کر بلا کسی سند کے اپنے دلوں میں پال رکھی تھیں۔ قرآن نے اگرچہ یہاں ذکر ایک ہی کا کیا ہے لیکن جمع کا لفظ استعمال کر کے اشارہ ان سب کی طرف کر دیا ہے۔ ہم اسی

سورہ کی آیات (۸۰-۸۱) کی تفسیر کرتے ہوئے ان "امانی" کی تفصیل پیش کر چکے ہیں۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا
هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۱۲)

نجات کی اصلی راہ

یعنی نجات یافتہ اور مستحق جنت ہونے کے لیے یہودی یا نصرانی ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ آدمی ایک تو مسلم بنے دوسرے یہ کہ محسن بنے۔ اسلام کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کے حوالہ کر دے۔ اس کے نبیوں اور رسولوں میں کوئی تفریق کیے بغیر اپنی پوری زندگی کو اس کی شریعت کے تابع کر دے۔ احسان کا مفہوم یہ ہے کہ شریعت کے احکام کی تعمیل پورے خلوص، پوری دیانت داری اور کامل راستبازی کے ساتھ کرے۔ جو لوگ اس طرح خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت کا حق ادا کریں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے، ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم۔ یہی تمام انبیاء اور تمام آسمانی صحیفوں کی تعلیم ہے اور یہی عقل اور فطرت کا تقاضا ہے۔

یہ پورا مضمون اسی سورہ کی آیات ۸۰-۸۱ میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس کے مختلف پہلوؤں پر وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ
يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۱۳)

یہود و نصاریٰ کی باہمی جنگ و جدال

یعنی اسلام کی مخالفت کے لیے یہود اور نصاریٰ دونوں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کو بڑی فیاضی کے ساتھ نجات یافتہ اور جنتی قرار دے رہے ہیں لیکن اس پلیٹ فارم سے الگ ان کی باہمی تکفیر و تفسیق اور جنگ و جدل کا یہ حال ہے کہ یہود، نصاریٰ کی کوئی جڑ بنیاد تسلیم نہیں کرتے اور نصاریٰ، یہود کے لیے کوئی بنیاد تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ دونوں ایک ہی کتاب کی پیروی کے مدعی ہیں، تورات دونوں میں مشترک ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آج جو ان کے اندر یہ گٹھ جوڑ ہو گیا ہے یہ نہ تو دین کے تحفظ کے لیے ہے نہ کسی اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی ہے بلکہ محض اسلام دشمنی کا جذبہ ہے جس نے ان کو متحد کر دیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (جو علم نہیں رکھتے) سے مراد مشرکین بنی اسماعیل ہیں، اس لیے کہ یہ کتاب و شریعت سے نا آشنا امی تھے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ انھوں نے بھی انھی لوگوں کی سی بات کہی۔ یعنی یہ بھی اپنے سوا سب کو باطل پر سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام کی مخالفت کے لیے آج یہ بھی اس مشترکہ محاذ میں شامل ہیں وہ ایک کتاب کے علم اور عمل کے مدعی ہوتے ہوئے دین کی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور یہ بغیر کسی علم ہی کے پانچوں سواروں میں جا شامل ہوئے ہیں۔ "کَذٰلِكَ" اور "مِثْلَ قَوْلِهِمْ" کے الفاظ بظاہر دونوں ایک ہی مفہوم کے حامل نظر آتے ہیں لیکن غور کرنے سے دونوں سے یہ حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک سے

محرک اور جذبہ کا اشتراک ظاہر ہوتا ہے، دوسرے سے تعبیر کا۔ یعنی یہ بھی نیت اور عمل دونوں میں انہی یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

آخر میں بطور وعید کے فرمایا کہ ان کی اس نزاع کا فیصلہ اب آخرت میں خدا کی عدالت میں ہوگا۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ تم اس نزاع میں صرف تبلیغِ حق کے ذمہ دار ہو۔ اس سے زیادہ تمھارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۱۴)

ایک دوسرے کے معابد کی تخریب

یہ اشارہ ہے ان مدعیانِ جنت کے ان کارناموں کی طرف جو انھوں نے باہمی عناد و عداوت کی بنا پر ایک دوسرے کے معابد کو تباہ و برباد کرنے کے سلسلہ میں انجام دیے۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان بیت المقدس میں بھی ایک دوسرے کو ذکر و عبادت سے روکنے کے لیے نہایت خونریز جنگیں ہو چکی ہیں اور باہر بھی جہاں جہاں اور جب جب ان میں سے کسی کو موقع ملا ہے اس نے مخالف فریق کے عبادت خانے برباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ نصاریٰ نے لوگوں کو حجِ بیت اللہ سے روکنے کی سعی کی لیکن جب اس کوشش میں ان کو ناکامی ہوئی تو ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کر دی اور خانہ کعبہ کو منہدم کر دینے کا ارادہ کر لیا جس کی پاداش میں اس پر اور اس کی فوجوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔

ان واقعات کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ جو لوگ آج اسلام کی مخالفت میں یوں ہم زبان ہو گئے ہیں ان کے باہمی تعصبات کا کیا حال رہا ہے، اور نجات و ہدایت کے ان ٹھیکیداروں کے کارنامے خدا کی مساجد کے معاملہ میں کتنے سیاہ ہیں۔ ساتھ ہی مساجدِ الٰہی کا مرتبہ و مقام واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ دنیا میں سب سے زیادہ ظالم وہ مدعیانِ ہدایت و تقویٰ ہیں جو اللہ کی مسجدوں سے اللہ کا ذکر کرنے والوں کو روکیں اور ان مساجد کی بربادی کے درپے ہوں۔ جو گھر خدا کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا ہے وہ خدا کا گھر ہے کسی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ خدا کے گھر میں اس کی تخریب کی جسارت کے ساتھ داخل ہو۔ اللہ کے گھر میں داخل ہونے کا واحد طریق یہ ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو ڈرتے ہوئے اور لرزتے ہوئے داخل ہو۔ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

مساجدِ الٰہی کے احترام کے اسی اصول کے تحت مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ جنگ کی حالت میں بھی ان کے گرجوں اور معابد کے ہدم یا ان کی توہین کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ مقام ان مسلمانوں کے لیے

خاص طور پر قابلِ غور ہے جو محض گروہی تعصبات کے تحت اپنے سے ذرا مختلف مسلک رکھنے والوں کو اپنی مساجد سے روکتے ہیں اور بعض اوقات دوسرے مسلک رکھنے والوں کی مساجد کی بے حرمتی کرنے کی جسارت بھی کر گزرتے ہیں۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۱۱۵)

وجہ نزاع کی طرف اشارہ

یہ اس وجہ نزاع و اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو یہود و نصاریٰ کے درمیان معابد و مساجد کی توہین و تخریب کا سبب ہوئی۔ یہود و نصاریٰ دونوں کا قبلہ بیت المقدس تھا لیکن نصاریٰ نے خاص طور پر اس کی مشرقی سمت کو اپنے قبلہ کے لیے انتخاب کیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ وہ حصہ جس میں حضرت مریم نے اعتکاف فرمایا تھا اسی سمت میں تھا۔ بیت المقدس کے اس عہد کے نقشہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وہ حصہ جو خواتین کی عبادت کے لیے مخصوص تھا، اسی جانب تھا اور قرآن سے بھی کچھ ایسا ہی اشارہ نکلتا ہے۔ سورۂ مریم میں فرمایا ہے۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۶) (اور کتاب میں مریم کی سرگزشت کو یاد کرو، جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر مشرقی جانب میں معتکف ہو بیٹھی) اس ضد میں یہود نے اس کی مغربی سمت کو اختیار کیا ہوگا اور پھر اندرون بیت المقدس کی یہ تقسیم اس سے باہر نکل کر مستقلاً مشرق و مغرب کی تقسیم بن گئی ہوگی۔ یعنی نصاریٰ نے سمت مشرق کو اپنا قبلہ بنا لیا اور یہود نے مغرب کو۔ پھر اس مشرق و مغرب کے اختلاف نے دونوں کو خوب خوب لڑایا۔ بیت المقدس کے اندر بھی اور اس سے باہر بھی۔ اور اس کے نتیجہ میں دونوں فریق نے ایک دوسرے کے معابد کی پوری بے دردی کے ساتھ بے حرمتی کی۔

قرآن مجید نے یہاں اس سبب اختلاف و نزاع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی لغویت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ مشرق ہو یا مغرب، دونوں سمتیں اللہ ہی کی ہیں۔ ان میں سے جس سمت کو بھی انسان رخ کر کے اگر وہ خدا کی طرف متوجہ ہے تو اس کا رخ خدا ہی کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس چیز کو یہود و نصاریٰ نے سر پھٹول اور ہدم معابد و مساجد کا سبب بنایا تو یہ ان کی جہالت و حماقت ہے۔ سمتوں اور جہتوں میں سے کسی سمت و جہت کو بھی خدا کے ساتھ اختصاص نہیں ہے۔ وہ بیت المقدس کو قبلہ قرار دے کر جدھر بھی رخ کرتے، خدا ہی کی طرف رخ کرتے۔ خدا کی قدرت اور اس کے علم کی وسعت ہر چیز کو محیط ہے۔

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

یہ بحث مزید تفصیل کے ساتھ آگے تحویل قبلہ کی آیات کے تحت آ رہی ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۱۱۶)

'ولد' کا مفہوم

وَلَد کے معنی اولاد کے ہیں۔ یہ لفظ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔

فسادِ عقیدہ

اوپر اسلام کے خلاف محاذ قائم کرنے والوں کے ان کارناموں کا حوالہ دیا تھا جو انھوں نے خدا کی مساجد کی تخریب کے سلسلہ میں انجام دیے ہیں، اب یہ ایک اشارہ ان کے مشرکانہ عقائد کی طرف بھی فرما دیا تاکہ ہدایت اور

نجات کی اجارہ داری کے ان مدعیوں کا یہ پہلو بھی سامنے آجائے کہ عقیدہ کے اعتبار سے یہ کس سطح پر ہیں۔ اس سلسلہ میں فرمایا کہ یہ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ یہود عزیر کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، نصاریٰ مسیح کو اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ان سب کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ سُبْحٰنَهٗ خدا اس طرح کی تمام نسبتوں سے پاک اور ارفع ہے۔ کوئی چیز کسی پہلو سے بھی اس کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں شریک و سہیم نہیں ہے۔ بلکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں اس کی مخلوق و مملوک ہیں۔ کسی کا یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ اس کی بندگی اور اطاعت کے دائرہ سے آزاد ہو بلکہ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۱۱۷)

بدیع کی تحقیق

بَدَعَ کے معنی کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے اور بغیر کسی مادہ و مثال کے ایجاد کرنے کے ہیں۔ اسی سے بدعت کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرنا جس کے لیے کوئی مثال، نظیر اور کوئی ماخذ و مصدر نہ ہو۔ بدیع اسی سے فعیل کا وزن ہے اور معنی میں فاعل کے ہے۔

تنزیہ باری تعالیٰ کی مزید وضاحت

اوپر والی آیت کے مضمون تنزیہ باری کی یہ مزید وضاحت ہے کہ یہ بیٹے بیٹیاں جو خدا کے لیے فرض کیے گئے ہیں اس واہمہ کی بنیاد پر فرض کیے گئے ہیں کہ جس طرح دوسرے اپنے معاملات کے انتظام و انصرام میں معاونین اور شرکا کے محتاج ہوتے ہیں اسی طرح خدا بھی شرکا اور معاونین کا محتاج ہے۔ حالانکہ خدا اس قسم کے شرکا اور معاونین سے بالکل بے نیاز و مستغنی ہے۔ وہ آسمان و زمین کو تنہا اپنی قدرت و حکمت سے وجود میں لایا اور جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو بس فرما دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ ایسی بے نیاز و مستغنی اور ایسی بے ہمہ و باہمہ قادر مطلق ذات کے ساتھ آل و اولاد کا کیا جوڑ!

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۱۱۸) اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔـلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (۱۱۹)

مشرکین کے ابتری مطالبات کا جواب

اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ، سے، جیسا کہ آیت ۱۱۳ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، مشرکین بنی اسماعیل مراد ہیں۔ اوپر اہل کتاب کے اعتراضات اور ان کی وسوسہ اندازیوں کا ذکر فرمایا تھا۔ اب اسی متحدہ محاذ مخالفت کے تیسرے رکن یعنی مشرکین کے بعض مطالبات کا ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے۔

ان کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو خدا نے انھی کو ہمارے اندر سے ہم کلامی کے لیے کیوں منتخب کیا، آخر ہم جو قریش کے سردار اور لیڈر ہیں اور ثروت و اقتدار میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہیں اونچے ہیں، خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا؛ اس مطالبہ کا جواب قرآن نے بعض جگہ دیا ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے کہ کسی انسان کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہ راست کلام کرے، وہ صرف وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ سے بات کرتا ہے؛ پھر وحی اور رسالت سے

متعلق یہ وضاحت فرمادی ہے کہ ہر کس و ناکس اس منصب کا اہل نہیں ہوا کرتا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون اس منصب عظیم کے لیے اہل ہے۔ لیکن یہاں خاص اس مطالبہ کا جواب نہیں دیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا جواب نہ دینے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطالبہ اس قدر گستاخانہ اور احمقانہ ہے کہ اس کا جواب نہ دینا ہی اس کا جواب ہے۔ غور کیجیے کہ قرآن کی اس موقع پر اس خاموشی نے سرداران قریش کے پندار سیادت پر کیسی کاری ضرب لگائی ہوگی۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ نشانی سے ان کی مراد کوئی ایسی نشانی تھی جو ایک محسوس معجزہ کی نوعیت کی ہو جس کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے کہ بے شک اس نشانی کا دکھانے والا خدا کا فرستادہ اور اس کا رسول ہے۔ مثلاً یہ کہ اس رسول کے ساتھ ساتھ کوئی فرشتہ اس کی رسالت کی منادی کرتا پھرے، یا اس کے حکم سے مردے جی اٹھیں، یا اس کے اشارے سے پہاڑ چلنے لگیں یا اس کی خواہش پر صحرا چمن بن جائے یا اور نہیں تو کم از کم اس کے ایما پر اس عذاب ہی کا کوئی نمونہ نمودار ہو جائے جس کی یہ ہر روز دھمکی سنا رہے ہیں۔

اس مطالبہ کے جواب میں پہلی بات تو یہ فرمائی کہ جس طرح کی نشانی کے لیے یہ مطالبہ کر رہے ہیں بالکل اسی طرح کی نشانی کے لیے ان قوموں نے اپنے رسولوں سے مطالبے کیے جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں۔ انھوں نے بھی حق واضح ہو چکنے کے بعد محض رسول کو زچ کرنے کے لیے اس طرح کی نشانی کے لیے مطالبے کیے۔ اور یہ بھی حق کو سمجھ چکنے کے باوجود محض زچ کرنے کی خواہش کے تحت یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا کہ ان کے دل بھی بالکل انھی لوگوں کے دلوں کی مانند ہو گئے ہیں۔ یعنی قساوت، طغیانی اور حق دشمنی کی جو سیاہی ان کے دلوں پر بھی چھا رہی ہے۔ پھر لازماً اس کے نتیجہ میں ان پر بھی خدا کی طرف سے اسی طرح کا کوئی عذاب آئے گا جس طرح کے عذاب ان پر آئے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ جہاں تک تمھاری رسالت اور تمھاری دعوت کے حق ہونے کا تعلق ہے اس کے دلائل آفاق سے، انفس سے، آسمان سے، زمین سے، تاریخ سے، آثار سے، ہر پہلو سے ہم نے کھول کھول کر قرآن میں بیان کر دیے ہیں۔ یہ دلائل اس قدر واضح ہیں کہ ان کے بعد کسی نشانی اور معجزہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن یہ دلائل ان لوگوں کے لیے مفید ہیں جو یقین کرنا چاہیں، جو یقین نہیں کرنا چاہتے ان کو دنیا کی کوئی چیز بھی قائل نہیں کر سکتی، ایسے لوگ تو عذاب دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے، یہاں تک کہ وہ عذاب ان کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْــَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ۔ ہم نے تم کو حق دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ تم اس کے قبول کرنے والوں کو نجات و فلاح کی خوش خبری سنا دو اور اس کی تکذیب کرنے والوں کو اس تکذیب کے انجام بد سے ڈراؤ۔ اس انذار و تبشیر

کا فرض انجام دے چکنے کے بعد تمھاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے مطالبوں کی تعمیل میں ان کی خواہشات کے مطابق نشانیاں اور معجزے دکھانا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ تم سے جو پرسش ہوگی تمھارے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے بارے میں ہوگی، اس بارے میں ہرگز نہیں ہوگی کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ جہنم میں کیوں گئے ایمان کیوں نہیں لائے۔

یہ ساری باتیں جو اوپر عرض کی گئی ہیں مکی سورتوں میں پچھلی قوموں کی سرگزشتوں کے ضمن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوں گی اس وجہ سے ہم یہاں ان کی زیادہ تفصیل نہیں کرتے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۱۲۰)

یہود و نصاریٰ کی اصلی بیماری

مشرکین کے رویہ سے مایوس کر دینے کے بعد یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہود و نصاریٰ کا رویہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ بھی تم سے اس وقت تک راضی ہونے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کی ملت کے پیرو نہ بن جاؤ۔ یعنی یہودیت یا نصرانیت نہ اختیار کر لو۔ اس لیے کہ ان کے سامنے سوال صرف حق کی وضاحت اور دلائل کے ظہور کا نہیں ہے بلکہ اپنے طریقہ پر جمود کا ہے۔ وہ حق سے زیادہ اپنی خواہشات کے پرستار ہیں اور تمھارے لیے خدا کی طرف سے "العلم" یعنی علم وحی کے آجانے کے بعد ان کی خواہشات و بدعات کی پیروی کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس وجہ سے ان کو یہ فیصلہ کن جواب دے دو کہ اصل ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آئے تو اب جب کہ میرے پاس اللہ کی ہدایت آچکی ہے میں اس کو چھوڑ کر کسی اور طریقہ کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں۔ یہاں یہود و نصاریٰ کے اختیار کیے ہوئے طریقوں کو اہواء (خواہشات) کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ہدایت آجانے کے بعد کسی اور طریقہ پر جمے رہ جانا درحقیقت اپنی خواہشات کی پیروی ہے۔

"وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ" میں خطاب اگرچہ بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں جو تنبیہ اور عتاب ہے اس کا رخ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ اس طرز خطاب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ملیں گی۔

اس آیت میں ملت کا جو لفظ آیا ہے اس کے اصل معنی طریقہ کے ہیں لیکن اس سے کسی شخص یا گروہ کا وہ طریقہ زندگی مراد ہوتا ہے جس کی بنیاد مذہب اور روایات مذہب پر ہو۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۲۱)

صالحین اہل کتاب کا ذکر

عام اہل کتاب کے رویہ سے مایوسی کے اظہار کے بعد ان اہل کتاب کا ذکر فرمایا جو اپنی کتاب پر فی الواقع ایمان رکھتے تھے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ یہ لوگ اس ہدایت الٰہی پر ایمان لائیں گے جو تم ان کے سامنے پیش کر رہے ہو۔

یہاں صالحین اہل کتاب مراد لینے کی ہمارے نزدیک کئی وجہیں ہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ ان کے متعلق فرمایا ہے یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (یہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیساکہ اس کی تلاوت کا حق ہے) ہمارے نزدیک یہ ضمیر مفعول سے حال پڑا ہوا ہے اور مقصود اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان کا حال شروع سے یہ رہا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی سچی قدر کی ہے جو ان کو ملی تھی۔ ان لوگوں کے مانند یہ کبھی نہیں رہے ہیں جن کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے، کہ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا۔ چارپاٹے برو کتابے چند۔ پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ تو ہے لیکن کچھ خبر نہیں کہ ان کتابوں میں کیا ہے۔ بلکہ یہ فکر و تدبر کے ساتھ برابر اس کی تلاوت کرتے رہے ہیں اور ان کی یہ تلاوت طلب ہدایت کے لیے تھی نہ کہ محض اپنی من گھڑت آرزوؤں اور خواہشات کے حق میں دلائل ایجاد کرنے کے لیے۔

دوسری یہ کہ ان کے متعلق خبر دی ہے کہ یہ اس ہدایت پر ایمان لائیں گے جو آخری رسول کے ذریعہ سے اللہ نے ان پر اتاری ہے۔

تیسری یہ کہ یہاں ان اہل کتاب کے لیے اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ قرآن کے نظائر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صیغہ اہل کتاب کے لیے بالعموم مدح کے موقع میں استعمال ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (۱۴۶- بقرہ)	اور جن کو ہم نے کتاب بخشی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔
۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ۔ (۱۱۴- انعام)	اور جن کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن تمھارے رب کی طرف سے حق لے کر اترا ہے۔
۳۔ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (۳۶- رعد)	اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ خوش ہوتے ہیں اس چیز سے جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے۔
۴۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۵۲- قصص)	اور جن کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے اس کے پہلے سے وہ اس پر ایمان لائیں گے۔

اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کے مقابل میں اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ کے الفاظ کے اندر اہتمام اور عنایت کا جو پہلو نمایاں ہے وہ ان لوگوں سے مخفی نہیں ہو سکتا جو معروف اور مجہول کے مواقع استعمال اور عربی زبان میں ان دونوں اسلوبوں کی ادبی نزاکتوں سے واقف ہیں۔ مذکورہ اسلوب میں معروف کا صیغہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب حقیقت میں انھی کو دی جنھوں نے اس کی قدر کی، جنھوں نے اس کی قدر نہیں کی

ان کو گویا خدا نے کتاب دی ہی نہیں۔ اسی فرق کے سبب سے اُوْتُوا الْكِتٰبَ کا صیغہ مدح کے مواقع میں بہت کم استعمال ہوا ہے۔ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ، خبر ہے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ کی۔ یعنی جو اہل کتاب اپنی کتاب کا حق صحیح طریقہ پر ادا کرتے رہے ہیں وہی اس ہدی اللہ پر ایمان لائیں گے جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی روحانی نعمتوں میں برکت انھی کو عطا فرماتا ہے جو ان کی قدر کرتے ہیں، جو قدر نہیں کرتے ان کو مزید عطا ہونا تو الگ رہا جو عطا ہوئی ہوتی ہے وہ بھی ان سے سلب کر لی جاتی ہیں۔ آخری شریعت کے بارے میں یہی وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ اس میں تمھاری ذریت کے صرف اچھے ہی لوگ حصہ پائیں گے، جو بُرے ہوں گے وہ اس سے محروم رہیں گے۔ پھر یہی بات اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر واضح فرمائی تھی کہ جو تقویٰ پر قائم رہیں گے وہی آخری نبی پر ایمان لائیں گے۔ اسی حقیقت کو مختلف اسلوبوں سے حضرت مسیح نے واضح فرمایا۔ تفصیل ان چیزوں کی اپنے مقام پر آئے گی۔

۴۶۔ نسخ کی حقیقت اور اس کی ضرورت

اس مجموعۂ آیات کی تمام اہم تعلیمات کی طرف ہم آیات کی وضاحت کے ضمن میں اشارہ کرتے آئے ہیں، غور سے مطالعہ کرنے والوں کے لیے وہ کافی ہے، البتہ نسخ کا مسئلہ جو آیت ۱۰۶ میں بیان ہوا ہے وہ مزید وضاحت کا محتاج ہے۔ ہم اس کے بعض اہم پہلوؤں پر یہاں روشنی ڈالیں گے اور اس سلسلہ میں استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے فکر سے بھی استفادہ کریں گے۔

اوپر نسخ سے متعلق جو آیت گزری ہے، اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ فرمایا ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (جو آیت (حکم) بھی ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کراتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں) سیاق و سباق اور نظمِ کلام کی روشنی میں ہم نے اس آیت کا تعلق صرف ادیانِ سابقہ سے مانا ہے۔ اہل کتاب نے یہ اعتراض جو اٹھایا تھا کہ قرآن جب ہماری کتابوں کو آسمانی تسلیم کرتا ہے تو ان کی تعلیمات کو منسوخ کیوں کرتا ہے، قرآن نے یہ ان کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اب آئیے اس جواب کی نوعیت پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ یہ ہر پہلو سے معقول اور اطمینان بخش ہے یا نہیں۔ آیت پر تدبر کرنے سے جواب کے دو پہلو واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ یہ نسخ خوب سے خوب تر کی طرف عروج اور ترقی کے نقطۂ نظر سے ہے۔ بالفاظ دیگر یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جو اس نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے فرمایا تھا کہ وہ اپنا آخری نبی بھیجے گا جو اللہ کی شریعت کو کامل کرے گا، تمام طیبات کو حلال کرے گا، تمام خبائث کو حرام ٹھہرائے گا اور لوگوں کو ان بہت سی پابندیوں سے آزاد کرے گا، جو اس وقت ان پر ہیں۔

اس حقیقت کو واضح طور پر ذہن نشین کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھیے۔

الف:- یہ کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہوئی اس نقطۂ کمال تک پہنچی ہے جس نقطۂ کمال پر وہ قرآن حکیم میں نظر آتی ہے۔ اس تدریجی ترقی کے لیے جو چیز مقتضی ہوئی ہے وہ انسان کی فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ تدریجی تربیت ہی کے ذریعہ سے اس مقام تک پہنچ سکتا تھا جس مقام پر پہنچ کر وہ خدا کے دینِ کامل کا اہل بن سکا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے سے پہلے تک اس کو جو دین ملا وہ بنیادی طور پر تھا تو اسلام ہی لیکن اپنی ظاہری شکل وصورت یا بالفاظ دیگر اپنی شریعت کے اعتبار سے بہت کچھ انھی سانچوں پر ڈھلا ہوا تھا جو سانچے اس عہد کے ذہنی، عقلی اور اجتماعی و تمدنی تقاضوں سے مناسبت رکھتے تھے۔ تدریجی تربیت کے ذریعہ سے جب اس کی فطرت کے تمام مضمرات واضح ہو گئے اور اس کی عقل بلوغ کو پہنچ گئی، محسوسات و رسوم کی قیدوں اور قومی و قبائلی تنگنایوں سے آزاد ہو کر اس نے سوچنا سمجھنا شروع کیا تب اللہ تعالیٰ نے اس کو اسلام اس شکل وصورت اور اس شریعت کے لباس میں دیا جو ٹھیک ٹھیک اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے، کوئی چیز نہ اس سے کم ہے نہ اس سے زیادہ۔ یہ ترقی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ پچھلی شریعتوں کی بہت سی چیزیں بدلیں اور اسلام میں وہ اپنی ان شکلوں میں نمودار ہوں جو ان کی بالکل معیاری اور فطری شکلیں ہیں۔

ب:- تورات کے بہت سے احکام کی ظاہری شکل بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہ جس وقت نازل ہوئے تھے خام حالت میں تھے، ان کو پختہ ہونے کے لیے کسی اور فصل و موسم کا انتظار تھا۔ اسلام کے ظہور نے ان کے لیے وہ منتظر موسم فراہم کیا اور وہ پختگی کو پہنچے۔ مثلاً شراب ان کے ہاں صرف عبادت خانہ کے ذمہ داروں کے لیے حرام تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ یہ چیز تقویٰ و طہارت کے منافی ہے اور ایک دن آئے گا کہ یہ سب کے لیے حرام ہو کر رہے گی۔ چنانچہ اسلام نے اس کی حرمت کے سلسلہ میں پہلا قدم اس مقام سے اٹھایا کہ نماز کے اوقات میں اس کو حرام ٹھہرایا۔ پھر بتدریج اس کو بالکل حرام کر دیا۔ روایات بلکہ قرآن کے اشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر جو لوگ زیادہ ذہین اور روحِ دین کے ذوق آشنا تھے وہ پہلا ہی حکم سن کر ہوا کا رخ پہچان گئے اور اسی وقت سے وہ شراب سے بالکل تائب ہو گئے۔ اسی طرح کھانے پینے کی دوسری چیزوں کی حلت وحرمت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض چیزیں یا تو بنی اسرائیل کے خاص قومی ذوق کے تحت ان کے لیے حرام ٹھہرائی گئیں، یا ان کے بے جا قسم کے سوالات کی سزا کے طور پر، مثلاً اونٹ یا ذبیحہ کے بعض حصوں کی چربی۔ یہ حرمتیں اپنی ہیئت ہی سے ظاہر کر رہی تھیں کہ یہ عارضی اور وقتی ہیں، ایک دن آئے گا کہ اس قسم کی تمام پابندیاں فطرت انسانی کے منافی ہونے کے سبب سے اٹھ جائیں گی۔ چنانچہ دینِ فطرت نے اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ (اب تمہارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں) کا عام اعلان کر کے اس قسم کی تمام پابندیوں کو منسوخ کر دیا۔ تورات سے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی

ہیں، لیکن مقصود یہاں تفصیل نہیں بلکہ ایک حقیقت کی طرف صرف اشارہ ہے۔

ج۔ تکمیل و ترقی کی اس ضرورت کی طرف حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے نہایت غیر مبہم الفاظ میں اشارہ بھی فرمایا تھا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ :-

"خداوند تیرا خدا تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو اپنے خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ (تثنیہ ۱۸: ۱۵-۲۰)

ان آیات میں جہاں ایک طرف نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا صریح الفاظ میں وعدہ ہے وہیں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ دین کی تکمیل آپ ہی کے ذریعہ سے ہوگی، حورب کے مقام میں بنی اسرائیل نے خود اس امر کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ اب مزید شریعت کا بوجھ اٹھانے کی طاقت اپنے اندر نہیں پا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراف ضعف کی تحسین فرمائی اور وعدہ فرمایا کہ وہ ان کے بھائیوں میں سے حضرت موسیٰؑ کی مانند ایک دوسرا نبی برپا کرے گا اور اس کے ذریعہ سے اپنے دین کی تکمیل فرمائے گا۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اس حقیقت کو ظاہر فرمایا۔ ملاحظہ ہو:-

مگر اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے بلکہ اس لیے کہ میں نے تم سے یہ باتیں کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راستبازی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھوگے۔ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ (یوحنا ۱۶: ۵-۱۴)

ان آیات میں 'مددگار' اور 'سچائی کا روح' یا بعض دوسرے ترجموں میں 'معزی' اور 'وکیل' کے الفاظ جو وارد ہوئے ہیں، ان کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ حضورؐ ہی کے اوپر یہ بات منطبق

ہو سکتی ہے کہ "وہ تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا" اور حضور ہی کی یہ شان ہو سکتی ہے کہ "وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا" بعینہٖ یہی بات قرآن مجید میں ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (وہ یہ اپنے جی سے نہیں کہتا بلکہ یہ وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے) اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ پیشین گوئی فرمائی کہ نبی موعود وہی کچھ کہے گا جو خداوند خدا اس کے منہ میں ڈالے گا اور جو خبر وہ دے گا اس میں وہ سچا ٹھہرے گا۔

تورات اور انجیل کی انہی پیشین گوئیوں کی طرف سورہ اعراف کی مندرجہ ذیل آیتوں میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۵-۱۵۶)

فرمایا کہ رہا میرا عذاب تو میں اس کو نازل کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت تو ہر چیز پر محیط ہے سو میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو مجھ سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ یعنی جو پیروی کریں گے اس رسول اور نبی امی کی جس کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، وہ ان کو حکم دیتا ہے نیکی کا اور روکتا ہے برائی سے اور ان کے لیے جائز کرتا ہے تمام پاکیزہ چیزوں کو اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزوں کو، اور ان سے دور کرتا ہے ان کے بوجھ اور ان پابندیوں کو جو ان پر پہلے سے تھیں، پس جو ایمان لائے اس پر اور جنھوں نے اس کی تائید اور مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

نسخ بغرضِ تجدیدِ دین

۲۔ جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ نسخ تجدید و احیائے دین کے تقاضے کے تحت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جو شریعت ملی تھی اس کے کچھ حصّہ کو، جیسا کہ قرآن مجید میں تصریح ہے، انھوں نے فراموش کر دیا تھا۔ اس فراموش کردہ حصّہ میں سے جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ضروری ٹھہرایا اس دینِ کامل کے ذریعہ سے اس کی تجدید فرمادی تاکہ دین کے خزانہ سے جو دولت پاسبانوں کی غفلت اور نالائقی سے ضائع ہو گئی تھی، وہ از سرِ نو محفوظ ہو جائے اور اگر اس کے کسی حصّہ کو حکمتِ الٰہی نے ضروری نہیں ٹھہرایا بلکہ اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ اس حصّہ کو نظر انداز کر دیا جائے، تو اس کی جگہ اس کے ہم پایہ و ہم مرتبہ دوسرے

احکام عنایت فرمائے۔

یہاں اِنسَاءٌ کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ فراموش کرا دینے کے معنی میں ہے۔ آیت زیرِ بحث میں اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ نسبت اسی طرح کی ہے جس طرح قرآن مجید میں دوسری جگہ فرمایا ہے فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (جب وہ کج ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کج کر دیے) یہ اسلوبِ بیان اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ معاملہ اپنے قانون حکمت کے مطابق کیا اور اس لیے کیا کہ وہ اپنی شریعت کے معاملہ میں اپنی بے پروائی کے سبب سے اسی چیز کے مستحق تھے۔ لیکن چونکہ شریعتِ الٰہی تمام انسانیت کا مشترک سرمایہ ہے، اس وجہ سے جس طرح اس کے وقتی احکام کی اسلام کے دائمی اور اعلیٰ احکام کے ذریعہ سے تکمیل کی گئی، اسی طرح اس کے فراموش کردہ اور ضائع شدہ احکام کی ان کے مماثل احکام کے ذریعہ سے قرآن میں تجدید کی گئی۔

تطہیرِ شریعت

۳۔ نسخ کی یہ ضرورت تکمیلِ دین اور تجدیدِ شریعت کے پہلو سے بیان ہوئی اور یہ ایسی واضح ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے لیے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، لیکن قرآن مجید نے نسخ کے صرف انھی دو پہلوؤں کے بیان پر اکتفا نہیں فرمایا ہے، بلکہ ایک تیسرے پہلو سے بھی اس کی ضرورت بیان فرمائی ہے۔ یہ پہلو دین و شریعت کی تطہیر کا پہلو ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی شریعت کو ان بدعتوں اور ملاوٹوں سے پاک کرنا جو اہلِ بدعت اور خواہش پرستوں نے ان میں ملا دی ہوں۔ اس کا ذکر سورہ حج کی اس آیت میں ہوا ہے جس کا حوالہ ہم اوپر دے آئے ہیں، فرمایا ہے فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ (پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان داخل کر دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے)

اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ نسخ ردِ بدعات اور ابطالِ باطل کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اشرار و مفسدین نے آسمانی صحیفوں اور الٰہی شریعتوں میں جو بدعتیں اور من گھڑت چیزیں ملائیں، انبیاء علیہم السلام نے ان سے دین کو پاک و صاف کیا اور اس کی اصل تعلیمات کو از سرِ نو زندہ کر کے ان کو قائم کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ان کی اکثریت انھی انبیا پر مشتمل تھی جو کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے۔ بلکہ ان میں سے بیشتر کا مشن صرف یہی تھا کہ وہ پہلے سے نازل شدہ شریعت کو بدعتوں اور تحریفات سے پاک کر کے اس کو اس کی اصلی حالت پر لوٹا دیں۔ اس امت میں یہ خدمت اللہ و رسول کی طرف سے علما کے سپرد کی گئی ہے کہ وہ برابر دین کو بدعات و تحریفات سے پاک کرتے اور امت کو کتاب و سنت کی طرف لوٹاتے رہیں۔

پچھلی شریعتوں میں اس قسم کے جو اضافے کیے گئے اور اسلام نے جن کو منسوخ کر کے ان کی اصل حقیقت پیش کی، یہاں ہم ان کی چند مثالیں ذکر کرتے ہیں تاکہ اس پہلو سے نسخ کی جو ضرورت و اہمیت ہے وہ اچھی طرح واضح ہو کر سامنے آ جائے۔

عقائد و ایمانیات کے باب میں یہود اور نصاریٰ نے جس قسم کی لغویات کا اضافہ کیا اور قرآن نے جس کی اصلاح کی ان میں سے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا تین کا تیسرا ہے یا مثلاً یہ کہ یہود اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کو آسمان وزمین کے پیدا کرنے سے تکان ہو گئی اس وجہ سے اس نے ہفتہ کے دن آرام فرمایا، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اس بات کا اقرار لے رکھا ہے کہ جب تک کوئی نبی وہ قربانی پیش نہ کرے جس کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ اترے اس وقت تک وہ اس پر ایمان نہ لائیں یا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں برص کی بیماری تھی۔ قرآن مجید نے اس قسم کی تمام باتوں کی تردید کر کے اصل حقائق واضح فرمائے۔

اسی طرح یہود نے اپنی بدکارانہ زندگی کو جائز ٹھہرانے کے لیے اکثر انبیا علیہم السلام سے متعلق نہایت بے ہودہ قسم کی روایات اپنے صحیفوں میں شامل کر دیں جو ان کے اخلاق کو بالکل مجروح کر دینے والی تھیں۔ قرآن مجید نے ان انبیاء کو اس قسم کے تمام اتہامات سے بری کر کے ان کی زندگیوں کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کیا۔

اعمال کے باب میں ان لوگوں نے جس قسم کی بدعتیں کیں ان کی بعض مثالیں اس سورہ میں گزر چکی ہیں اور بعض کا ذکر آگے آرہا ہے۔ مثلاً ان کا وہ رویہ جو انھوں نے اپنی قوم کے قیدیوں کے بارہ میں اختیار کیا، یا جو روش انھوں نے سود کے معاملہ میں اختیار کی۔ نصاریٰ نے خنزیر اور گردن مروڑے ہوئے جانور کو جائز کر لیا۔

اسی طرح ان لوگوں نے تاریخ اور واقعات کو بھی مسخ کر کے اپنی خواہشات کے رنگ میں پیش کیا مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کی تاریخ کے اکثر حصہ پر پردہ ڈال دیا گیا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بیت اللہ سے ثابت نہ ہو سکے اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں کو مسخ کیا جا سکے۔ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ سے متعلق بیانات میں بھی اسی مقصد کے تحت بہت سے تصرفات کیے گئے۔ قرآن مجید نے ان تمام تحریفات کا پردہ چاک کیا اور اصل حقائق بے نقاب کیے۔ استاذ امامؒ نے رسالہ ذبیح میں ان چیزوں پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ آگے ہم بھی مناسب مواقع سے بعض مفید باتوں کی طرف اشارے کریں گے۔

شریعت اسلامی میں نسخ کی نوعیت مذکورہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت کا تعلق تمام تر ادیانِ سابقہ سے ہے اور اس میں جس نسخ کا حوالہ ہے اس کی ضرورت اور اس کی حکمت اس قدر واضح ہے کہ کسی انصاف پسند کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلامی شریعت میں بھی نسخ ہے یا نہیں تو اس بارے میں ہمارے یہاں تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو نہ صرف نسخ کے قائل ہیں، بلکہ اس کو بہت زیادہ وسعت دیتے ہیں، دوسرا گروہ اس کا یک قلم منکر ہے، تیسرا گروہ اس کا قائل تو ہے لیکن اس کو صرف چند احکامات تک محدود مانتا ہے۔

ان میں سے پہلے گروہ نے اس کے دائرے کو جو بہت زیادہ وسعت دی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

اس کے نزدیک نسخ کا ایک خاص مفہوم ہے۔ یہ لوگ ان تمام مواقع میں بھی نسخ مان لیتے ہیں، جہاں کوئی بات کسی عام کو خاص یا خاص کو عام کر رہی ہو یا کسی اجمال کو تفصیل کا رنگ دے رہی ہو، حالانکہ اس طرح کے مواقع میں نسخ ماننے سے زیادہ معقول بات یہ ہے کہ عام و خاص اور مجمل و مفصل کے درمیان توفیق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ توفیق نہایت آسانی کے ساتھ پیدا کی جا سکتی ہے۔

جو گروہ نسخ کا یک قلم منکر ہے اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے احکام حالات کے تابع ہیں، جو احکام منسوخ ہوئے ہیں وہ صرف اس وجہ سے منسوخ ہوئے ہیں کہ جن حالات کے اندر وہ نازل ہوئے تھے، وہ حالات تبدیل ہو گئے۔ اب اگر وہی حالات دوبارہ پلٹ آئیں تو وہ احکام بھی از سر نو بحال ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے جو احکام بظاہر منسوخ ہیں، وہ فی الحقیقت منسوخ نہیں ہیں بلکہ اپنے مخصوص حالات کے اندر بدستور قائم و زندہ ہیں۔ یہ گروہ اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں یہ بات بھی پیش کرتا ہے کہ اسلامی شریعت کا ارتقا بتدریج نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے۔ اس وجہ سے جب حالات اس بات کے مقتضی ہو جائیں کہ نرمی کی طرف پلٹا جائے تو یہ پلٹنا اسلامی شریعت کے مزاج کے عین مطابق ہو گا۔

ہمارے نزدیک اس رائے میں متعدد غلطیاں ہیں۔

اول تو بجائے خود یہ دعویٰ ہی بالکل بے بنیاد ہے کہ اول اول شریعت ہلکی تھی، بعد میں یہ سخت ہوئی ہے۔ قرآن مجید پر غور کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض احکام میں اس کا ارتقا اگر نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے۔ مثلاً تحریم شراب اور حکم صیام وغیرہ۔ تو بعض احکام میں سختی سے نرمی کی طرف بھی ہوا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ اللیل اور تعداد متقاتلین کے معاملہ میں۔ اس وجہ سے یہ فارمولا بنا کر کہ شریعت کا ارتقا نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے نسخ کے بارے میں کوئی نتیجہ نکال لینا مغالطہ سے محفوظ نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور ہمارے دور میں جو فرق ہے اس کو اس میں ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلامی شریعت کی دنیا کو دعوت دی ہے اس وقت اسلام کی تعلیمات لوگوں کے لیے بالکل اوپری اور انوکھی تھیں، آپ کے صحابہؓ کی تعداد بہت تھوڑی تھی، لوگ جاہلی رسوم و عادات کے اتنے خوگر تھے کہ ان سے ان کے لیے نکلنا آسان نہ تھا۔ برعکس اس کے اس زمانہ میں حالات اس سے بہت مختلف ہیں۔ دنیا میں مسلمان کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اسلامی احکام و قوانین لوگوں کے لیے کوئی نامانوس اور اجنبی چیز نہیں ہیں، اس وجہ سے اس زمانہ کو اس زمانہ پر قیاس کر کے ایک کے احکام کو دوسرے پر منطبق کرنا ہمارے خیال میں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

تیسری یہ کہ اگر حالات کی تبدیلی کے بہانے شریعت کے منسوخات کی طرف پلٹنے کے جواز کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے فتنہ پسند طبائع کے لیے شریعت سے فرار کی ایک ایسی راہ کھل جاتی ہے جس کا بند کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس زمانے میں بڑی آسانی کے ساتھ اس دلیل کے سہارے روزہ، نماز، حرمت شراب اور حدِ زنا

وغیرہ کے بارے میں سہولت پسند لوگ ایسے اجتہاد شروع کر دیں گے کہ دین کے معاملہ میں امان ہی اٹھ جائے گی۔ چنانچہ ماضی میں بھی گمراہ داعیوں کے ہاتھوں اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور آج بھی اس کا تجربہ ہو رہا ہے۔ اسی چیز کی آڑ لے کر مبتدعین نے اپنے پیروؤں کے لیے شریعت کی حرام کی ہوئی بہت سی چیزوں کو جائز ٹھہرا دیا، اور پھر ان کے اندر سے ان چیزوں کی حرمت کا احساس بھی رخصت ہو گیا۔

اس امر میں شبہ نہیں کہ بگڑے ہوئے ماحول میں بعض مرتبہ اچھے داعیان دین نے بھی نوواردوں اور نومسلموں کے لیے شریعت کے بعض معاملات میں نرمی برتی ہے۔ لیکن اس نرمی کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی، کہ وہ حالات کی تبدیلی کے تحت شریعت کے منسوخات کے اختیار کرنے کے قائل تھے، بلکہ یہ اس قسم کی ایک چشم پوشی اور مسامحت تھی جس قسم کی چشم پوشی بعض مرتبہ اربابِ اصلاح و تربیت اپنے کمزور اور بگڑے ہوئے مریدوں اور شاگردوں کے کسی معاملہ میں اختیار کر لیتے ہیں۔ اس نوع کی مسامحت حکیمانہ تربیت کا ایک جزو ہے۔ یہ اس توقع پر اختیار کی جاتی ہے کہ بالتدریج اس طرح کے خام لوگوں کی حالت صحبت اور تربیت سے اصلاح پذیر ہو جائے گی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر حالات میں یہ توقع پوری بھی ہوتی ہے۔ بشرطیکہ تربیت کرنے والے خود تقویٰ کی صفات سے متصف رہے ہیں، محض گندم نمائی اور جو فروشی کی دکان نہیں چلاتے رہے۔ اس چیز کو اس امر پر محمول کرنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ یہ لوگ حالات کی تبدیلی کے تحت محکمات شریعت کو چھوڑ کر منسوخات کے اختیار کرنے کے قائل تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم نسخ کے باب میں مذکورہ بالا دونوں مسلکوں کو کمزور سمجھتے ہیں۔ اب رہ گیا تیسرا مسلک یعنی ان لوگوں کا مسلک جو قرآن کی بعض آیات کو منسوخ مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی مسلک صحیح ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ آیات کون کون سی ہیں، وہ کن آیات سے منسوخ ہوئی ہیں اور ان کے منسوخ ہونے کی علت کیا ہے تو ان سوالوں کے جواب دینے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس کتاب میں اپنے اپنے موقع پر یہ بحثیں اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آئیں گی۔ یہاں صرف چند اصولی باتیں ذہن نشین کر لیجیے۔

ایک تو یہ کہ قرآن کا کوئی حکم اگر منسوخ ہوا ہے تو قرآن ہی سے منسوخ ہوا ہے اور یہ ناسخ و منسوخ دونوں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآن کے کسی حکم کو قرآن کے سوا کوئی دوسری چیز منسوخ نہیں کر سکتی۔ بعض فقہا نے حدیث کو بھی قرآن کے لیے ناسخ مانا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ مسلک صحیح نہیں ہے۔ اس مسلک کا ضعف اس قدر واضح ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ اس نسخ کا تعلق تمام تر صرف احکام و قوانین سے ہے، عقاید و ایمانیات یا اخلاق و صفات یا واقعات و حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ عقاید و ایمانیات اور واقعات و حقائق ایسی چیزیں نہیں ہیں جو آج کچھ ہوں اور کل کچھ اور بن جائیں۔ لیکن احکام و قوانین میں اگر کوئی ترمیم و اصلاح خود قانون کا دینے والا کر دے تو اس سے قانون کے مقصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس سے اصل مقصد کو تقویت

حاصل ہوتی ہے۔

تیسری یہ کہ اس نسخ کی ضرورت اس وجہ سے نہیں پیش آئی کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی نقص ہے جس کے سبب سے اس کے نازل کیے ہوئے قانون کو تجربات اور آزمائشوں کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ بلکہ اس کی وجہ صرف بندوں کی بعض فطری خامیاں اور کمزوریاں ہیں، جن کے سبب سے وہ بسا اوقات کسی قانون کے قبول کرنے میں تدریج اور تربیت کے محتاج ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے اس وجہ سے اس نے یہ پسند فرمایا کہ وہ اپنے قانون میں اس تدریج و تربیت کو ملحوظ رکھے۔

یہ تدریج اور تربیت قرآن کے ناسخ اور منسوخ احکام پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے، کہ مختلف تقاضوں کے تحت مختلف طرزِ عمل کی مقتضی ہوتی ہے، مثلاً

بعض حالات میں یہ اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ معاشرہ کے ابتدائی حالات کے تقاضوں کی مناسبت سے کسی باب خاص میں کوئی عارضی حکم دیا جائے اور جب معاشرہ اپنے بلوغ کو پہنچ جائے تو اس عارضی حکم کو آخری اور کامل حکم سے بدل دیا جائے۔ مثلاً ابتداءً ورثہ کے حقوق کے تحفظ کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا، بدکاری کے سدباب کے لیے پنچایتی قسم کی تعزیر کی ہدایت کی گئی، انصار و مہاجرین کی اخوت کو اخلاقی اخوت سے بڑھا کر قانونی اخوت کا درجہ دیا گیا۔ لیکن بعد میں جب معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ کی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تو وراثت کے آخری اور حتمی قانون اور زنا کی معین اور قطعی حد نے ان عارضی قوانین کو منسوخ کر کے خود ان کی جگہ لے لی۔

بعض حالات میں یہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ عام انسانی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی قانون درجہ بدرجہ اپنی آخری حد پر پہنچے، مثلاً شراب چونکہ اہل عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، اس وجہ سے ابتداءً یہ صرف نماز کے اوقات کے لیے حرام ہوئی، روزہ چونکہ عرب جیسے گرم ملک کے لیے بڑی سخت چیز تھا اس وجہ سے شروع شروع میں سفر اور مرض کی صورت میں فدیہ دے دینے کی بھی گنجائش رکھی گئی۔ لیکن بعد میں جب طبائع کو ان چیزوں سے اُنس ہو گیا تو شراب کے قطعی حرمت کے حکم، ماہ رمضان کی تعداد کی تکمیل کی ہدایت اور فدیہ کی اجازت کی منسوخی نے ان ابواب میں بھی شریعت کو کامل کر دیا۔ ان احکام کے بعد صرف اضطرار کے تحت ایک محدود و مشروط اجازت باقی رہ گئی۔

بعض صورتوں میں اس کا اقتضا یہ بھی ہوا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ شریعت کے کسی حکم پر عمل کرنے کے لیے کچھ عرصہ تک آزاد چھوڑ دیا گیا۔ لیکن بعد میں اس اجازت کو منسوخ کر کے اس کی جگہ اسلامی شریعت کا مستقل حکم دے دیا گیا۔ مثلاً قبلہ کے معاملہ میں، اس سے مقصود جیسا کہ قرآن میں واضح کیا گیا ہے مسلمانوں کا امتحان لینا تھا کہ کون خدا اور رسول کی وفاداری میں پختہ ہے اور کون اب تک اپنی پچھلی روایات ہی کا اندھا پرستار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امتحان تربیت ہی کا ایک جزو ہے۔

اسی طرح بعض حالات میں یہ اس بات کی مقتضی ہوئی کہ معاشرہ کی افرادی قوت کی کمی کی تلافی کے لیے وقتی طور پر بعض ایسے احکام بھی دیے جائیں جو کیفیت کو بڑھانے والے اور قلت تعداد کی حالت میں زیادہ بوجھ اٹھانے کی صلاحیت پیدا کرنے والے ہوں ۔ مثلاً ابتداءً عام مسلمانوں کو بھی تہجد کی پابندی کا حکم دیا گیا، میدان جہاد میں ایک کو دس کفار کا مدمقابل قرار دیا گیا، جماعتی استحکام و تطہیر کے تقاضوں کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی رازدارانہ بات کرنے سے پہلے صدقہ کی ہدایت کی گئی ۔ بعد میں جب مسلمانوں کی افرادی قوت بڑھ گئی اور تطہیر جماعت کا وقتی مقصد حاصل ہو گیا تو ان چیزوں میں تخفیف کر کے ان کو اسی عام سطح پر کر دیا گیا جو پہلے سے ان کے لیے شریعت میں مقرر تھی۔

یہ ہم نے صرف بعض اصولی باتوں کی طرف اشارات کیے ہیں ۔ یہاں پیش نظر تمام ناسخ و منسوخ آیات کا استقصا اور ان کے مصالح کی وضاحت نہیں ہے ۔ تفصیلی بحث منسوخ آیات کے تحت جیسا کہ عرض کیا گیا اپنے اپنے مقام میں آئے گی ۔

اس تمام تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ خدا کی شریعت قرآن مجید میں اپنے ترقی و کمال کے آخری درجہ پر پہنچ چکی ہے ۔ اب اس کے بعد کسی نسخ کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ اس شریعت میں تمام احکام کے ساتھ مشکل اور مجبور کن حالات کے لیے رخصتیں اور رعایتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں ۔ اس وجہ سے حالات کی تبدیلی کے عذر پر منسوخ احکام کی طرف پلٹنے کے لیے بھی کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہی ، البتہ اہل بدعت کی پیدا کردہ ضلالتوں کے نسخ کا کام قیامت تک باقی رہے گا اور یہ کام اسلام میں علماء اور مصلحین کے سپرد ہے ۔

۴۷ ۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۱۲۲-۱۴۱

حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت

اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود کے لیے قبول اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہ پندار تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں ، اس وجہ سے ہدایت ان کی ہدایت اور مذہب ان کا مذہب ہے ۔ وہ اپنے دائرے سے باہر نہ کسی کے لیے نجات کے قائل تھے نہ کسی نبوت و رسالت کا تصور رکھتے تھے ، نجات اور ہدایت حاصل کرنے کا واحد راستہ ان کے ہاں یہ تھا کہ آدمی یہودی بنے یا نصرانی ۔ قرآن نے اوپر مختلف پہلوؤں سے ان کے اس زعم کی تردید فرمائی ۔ اب آگے ان کے ان مزعومات کی تردید کے لیے ان کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزندوں کی سرگزشت حیات کا وہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کی رسالت کی تائید اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے تمام دعاوی کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں ہی کے مورث اعلیٰ اور پیشوائے روحانی تھے ۔ اس وجہ سے تاریخ کا یہ حصہ یکساں طور پر سب کے لیے حجت کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ اس سورہ کے آغاز سے بنی اسرائیل اور ضمناً بنی اسمٰعیل

کے ساتھ جو بحث شروع ہوئی تھی وہ اس مقام پر آکر اپنے پورے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔

یہاں جو باتیں قرآن نے اس سرگزشت کی روشنی میں واضح کی ہیں ان کی تفصیل تو آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی لیکن ہم خاص خاص اصولی باتوں کی طرف یہاں اشارہ کیے دیتے ہیں تاکہ کلام کا نظم اور تسلسل نگاہ کے سامنے آجائے ۔یہ اصولی باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت وپیشوائی کا جو منصب اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا وہ ان کو وراثت کے طور پر نہیں ملا تھا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ تھا۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے مختلف امتحانوں میں ڈال کر ان کی اطاعت ووفاداری کی اچھی طرح جانچ کی، جب وہ اس جانچ میں پورے اُترے تب ان کو یہ منصب عطا ہوا۔ یہ منصب تمام تر صفات پر مبنی ہے، اس کا کوئی تعلق بھی نسب اور خاندان سے نہیں۔ اس وجہ سے ان کی ذریت میں سے بھی وہی لوگ اس منصب کے سزاوار ہوں گے جو ان صفات کے حامل ہوں جو اس منصب کے شایان شان ہیں۔ بدعہد اور نافرمان لوگ اس کے حق دار نہیں ہوسکتے۔

۲۔ بیت اللہ کو اللہ تعالیٰ نے تمام ذریت ابراہیم کے لیے مرکز قرار دیا، اس کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا اور حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کو اس کی تولیت سپرد ہوئی۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ نے اس گھر کی تعمیر کے وقت اپنی ذریت میں سے ایک اُمتِ مُسلمہ برپا کرنے اور ان کے اندر انھی میں سے ایک رسول مبعوث کرنے کی دعا کی تھی۔

۴۔ یہ پیغمبرؐ اسی دعائے ابراہیمیؑ کے مظہر اور اسی ملتِ ابراہیمیؑ کے داعی ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ ملتِ ابراہیمیؑ کی پیروی کا دعویٰ رکھتے ہوئے ان کی دعوت سے گریز اختیار کر رہے ہیں وہ خود اپنے آپ کو بے وقوف ٹھہرا رہے ہیں۔

۵۔ اسی ملتِ اسلام کی وصیت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنی اپنی اولاد کو کی اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد نے اسی ملت پر جینے اور اسی ملت پر مرنے کا حضرت یعقوبؑ سے عہد کیا۔

۶۔ ان تمام واقعات وحقائق کا تقاضا یہ ہے کہ اہل کتاب یہودیت یا نصرانیت کے تعصب میں مبتلا ہونے کے بجائے اس ملت ابراہیمی کی پیروی کریں جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، خدا کے نبیوں کے درمیان کوئی تفریق نہ کریں بلکہ اس دینِ اسلام کو اختیار کریں جو مشترک طور پر تمام نبیوں اور تمام رسولوں کا دین ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں وہ اسلام کے رنگ کو اختیار کریں اور یہی رنگ اللہ کا رنگ ہے نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ جو لوگ اس رنگ سے الگ کوئی رنگ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ اللہ اور اس کے رسولوں سے الگ اپنی پارٹی بنانے کے درپے ہیں۔

۷۔ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کے سلسلہ کے دوسرے انبیا علیہم السلام یہودی یا نصرانی تھے۔ جو لوگ اس قسم کے دعوے کر رہے ہیں وہ حقیقت پر پردہ ڈال

رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان نبیوں کے دین و مذہب سے ان مدّعیوں کے مقابل میں زیادہ باخبر ہے۔

۸۔ آخری بات جو اس سلسلۂ کلام میں بطور ٹیپ کے بند کے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ دو مرتبہ کہی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے جن آباؤ اجداد پر تم تکیہ کیے ہوئے ہو وہ اپنی زندگیاں گزار چکے اور اپنے اعمال اپنے ساتھ لے گئے، نہ ان کے کارناموں کا کریڈٹ تم کو ملے گا اور نہ ان کے کسی عمل کے بارے میں تم سے مواخذہ ہونا ہے۔

ان مطالب کو ذہن کے سامنے رکھتے ہوئے اب ان آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۲۲-۱۳۱

يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ٱذْكُرُوا نِعْمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي
فَضَّلْتُكُمْ عَلَى ٱلْعٰلَمِينَ ﴿١٢٢﴾ وَٱتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن
نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنفَعُهَا شَفٰعَةٌ
وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿١٢٣﴾ وَإِذِ ٱبْتَلٰىٓ إِبْرٰهٖمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمٰتٍ
فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي
قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي ٱلظّٰلِمِينَ ﴿١٢٤﴾ وَإِذْ جَعَلْنَا ٱلْبَيْتَ مَثَابَةً
لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۖ وَٱتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَآ
إِلٰىٓ إِبْرٰهٖمَ وَإِسْمٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْعٰكِفِينَ
وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ ﴿١٢٥﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهٖمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هٰذَا
بَلَدًا اٰمِنًا وَّٱرْزُقْ أَهْلَهُۥ مِنَ ٱلثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُم بِٱللّٰهِ
وَٱلْيَوْمِ ٱلْاٰخِرِ ۖ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُۥ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُۥٓ
إِلٰى عَذَابِ ٱلنَّارِ ۖ وَبِئْسَ ٱلْمَصِيرُ ﴿١٢٦﴾ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهٖمُ
ٱلْقَوَاعِدَ مِنَ ٱلْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ ۖ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ
أَنتَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَٱجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن

ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ
اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٢٩﴾ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ ع ١٥ ٨ ١٥
اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى
الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٠﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ
اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾ وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ
يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ
قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ
اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّ
نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٣﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ
لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٤﴾ وَقَالُوْا
كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٣٥﴾ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا
وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ
وَمَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَاۤ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ
بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ

مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ
شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ
وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ
اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ
وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿١٣٩﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَ
اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ
اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٠﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا
مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿١٤١﴾ ع ۱۶ ۱۲ ۱۶

ترجمہ آیات ۱۲۲ - ۱۴۱

اے بنی اسرائیل میرے اس فضل کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں اہل عالم پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ قبول ہوگا، نہ اس کو کوئی شفاعت نفع پہنچائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد ہی کی جاسکے گی۔ ۱۲۲-۱۲۳

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ اس نے پوری کر دکھائیں، فرمایا بے شک میں تمھیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ اس نے پوچھا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے۔ ۱۲۴

اور یاد کرو، جب کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مسکن ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو

طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع، سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔ ۱۲۵

اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی کہ اے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے باشندوں کو، جو ان میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں پھلوں کی روزی عطا فرما، فرمایا جو کفر کریں گے میں انھیں بھی کچھ دن بہرہ مند ہونے کی مہلت دوں گا۔ پھر میں ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف دھکیلوں گا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ۱۲۶

اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ انھوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب ہماری جانب سے یہ دعا قبول فرما بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے۔ ۱۲۷

اے ہمارے رب ہم دونوں کو تو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب تو ان میں انھی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔ ۱۲۸-۱۲۹

اور کون ہے جو ملتِ ابراہیم سے اعراض کر سکے مگر وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے۔ ہم نے اس کو دنیا میں بھی برگزیدہ کیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرہ میں ہوگا۔ جب کہ اس کے رب نے اس کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو حوالہ کر دے۔ اس نے کہا میں نے اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کے حوالہ کیا۔ ۱۳۰-۱۳۱

اور ابراہیم نے اسی ملّت کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی۔ اے میرے بیٹو، اللہ نے تمھارے لیے دینِ اسلام کو منتخب فرمایا تو تم نہ مرنا مگر

اسلام کی حالت پر۔ ۱۳۲

کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی موت کا وقت آیا۔ جب کہ اس نے اپنے بیٹوں
سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے آباؤ اجداد۔
ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ ــــ کے معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے
فرماں بردار ہیں۔ ۱۳۳

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو کچھ تم نے
کمایا، اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے سوال نہیں ہو گا۔ ۱۳۴

اور کہتے ہیں کہ یہود یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے۔ کہو بلکہ ابراہیم کی ملّت کی پیروی کرو جو
اللہ کی طرف یک سُو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر
ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد
کی طرف اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور نبیوں کو ان کے رب کی جانب
سے ملی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں۔
۱۳۵-۱۳۶
اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض
کریں تو پھر وہ درپئے مخالفت ہیں۔ ان کے مقابل میں تمہارے لیے اللہ کافی ہو گا وہ سننے والا
اور جاننے والا ہے۔ ۱۳۷

کہہ دو، یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی
کی بندگی کرتے ہیں۔ کہہ دو، کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجّت کر رہے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا
بھی رب ہے، وہی تمہارا بھی رب ہے۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے

اور ہم خالص اسی کے لیے ہیں۔ ۱۳۸-۱۳۹

کیا تم دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور ان کی ذریت کے لوگ یہودی یا نصرانی تھے۔ پوچھو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے چھپائیں۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۱۴۰

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تم کو ملے گا جو کچھ تم نے کمایا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے سوال نہ ہوگا۔ ۱۴۱

۴۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ (۱۲۲)
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ (۱۲۳)

یہ دونوں آیتیں معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ اوپر بھی گزر چکی ہیں اور وہاں ہم ان پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیات ۴۷-۴۸۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَـمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (۱۲۴)

ابتلاء کا مقصد

ابتلاء کے معنی جانچنے اور امتحان کرنے کے ہیں۔ یہ ابتلاء بندوں کی تربیت اخلاقی کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے۔ اسی چیز سے بندوں کی وہ صلاحیتیں ابھرتی اور نشو و نما پاتی ہیں جو ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہیں اور اسی سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہ امتحان نرم اور سخت، سرد اور گرم، خوش کن اور رنج دہ، حوصلہ افزا اور ہمت آزما دونوں طرح کے حالات کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی اس سے مقصود بندے کو دکھ میں مبتلا کرنا نہیں ہوتا بلکہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا صرف اس کی صلاحیتوں کو ابھارنا اور پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔ آگے اس پر مفصل بحثیں آئیں گی۔

کلمات کا مفہوم

کلمات کلمہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی مفرد لفظ کے بھی آتے ہیں اور پوری بات کے بھی۔ یہاں کلمات

سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو اس نے حضرت ابراہیمؑ کی عزیمت و استقامت کے امتحان کے لیے ان کو دیے اور انھوں نے بے چون و چرا ان کی تعمیل کی۔ مثلاً انھوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں عین اپنی قوم کے بتکدے میں اذان دی اور جو بت صدیوں سے معبود بن کر پج رہے تھے ان کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ ان کو دین آبائی کی توہین کے جرم میں آگ میں ڈالا گیا، وہ بے خطر اس آگ میں کود پڑے۔ ایک جبار بادشاہ نے ان کو دینِ حق سے پھیرنا چاہا، انھوں نے حجت ابراہیمی سے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ ان کو خاندان، جائداد اور قوم و وطن سب کو چھوڑ کر ہجرت کا حکم ہوا، وہ سب کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔ ان کو دشتِ غربت میں اکلوتے اور محبوب فرزند کی گردن پر چھری چلا دینے کا حکم ہوا، انھوں نے بے دریغ اس بازی کے لیے بھی آستینیں چڑھا لیں اور سیزدہ سالہ فرزند کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں جان بازی و جان سپاری کے اس قسم کے عظیم کارناموں سے ان کی زندگی کا ہر ورق نورانی ہے۔ ہم نے صرف چند واقعات کی طرف بطورِ مثال اشارہ کر دیا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام و ہدایات کی تعبیر کے لیے کلمات کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے اس میں بلاغت کا ایک خاص نکتہ مضمر ہے۔ وہ یہ کہ لفظ کلمہ ایک قسم کے اجمال و ابہام کا حامل ہے۔ یہ لفظ کلمہ 'کُن' کی طرح ایک واجب التعمیل حکم کو تو مخاطب کے سامنے رکھ دیتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ اس کا فلسفہ، اس کا صلہ اور اس کا انعام بھی بیان ہو۔ وفاداری اور اطاعت کے امتحان کے لیے اس طرح کے احکام سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں، اس وجہ سے جو بندہ اس طرح کے امتحان میں بازی لے جاتا ہے اس کا اجر و انعام بھی بہت بڑا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے خواب میں ایک اشارے کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کو ذبح کر دینے کا حکم دے دیا، نہ اس کی علت و حکمت واضح فرمائی، نہ اس کا اجر و انعام بیان فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چاہتے تو اس خواب کو صرف خواب کا درجہ بھی دے سکتے تھے اور چاہتے تو اس کی کوئی تعبیر بھی نکال لے سکتے تھے لیکن جس طرح اس کائنات کی ہر چیز خدا کے کلمۂ 'کُن' کی تعمیل کرتی ہے، اس کو نہ تو اس کے فلسفہ سے بحث ہوتی ہے نہ اس کے اجر و ثواب سے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے ہر کلمہ کی تعمیل کی، نہ اس کا فلسفہ پوچھا، نہ اس کا اجر و ثواب معلوم کیا۔ حکم ہوا آگ میں کود پڑو، کود پڑے۔ حکم ہوا، قوم و وطن کو چھوڑ دو، چھوڑ دیا۔ حکم ہوا بیٹے کی گردن پر چھری چلا دو، اس کو پچھاڑ دیا۔ ان امتحانی احکام کی اس مخصوص نوعیت کی وجہ سے قرآن نے ان کو کلمات کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

حضرت ابراہیم سے بیٹے کی قربانی کا امتحان

یوں تو ان امتحانات میں سے ہر امتحان نہایت کٹھن تھا لیکن خاص طور پر بیٹے کی قربانی والا امتحان تو ایک ایسا امتحان تھا جس میں پورا اترنا تو الگ رہا، اس کا تصور بھی ایک عظیم امتحان تھا۔ عین جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں بھی پورے اتر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ وعدہ فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا

(میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں) یہ ایک ہی وعدہ بیک وقت دو وعدوں پر مشتمل ہے۔ ایک تو اس پر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے عظیم قومیں پیدا ہوں گی، دوسرے اس پر کہ حضرت ابراہیمؑ ان سب کے پیشوا ہوں گے۔ اس عظیم انعام کے حق دار وہ اس وجہ سے قرار پائے کہ انھوں نے اللہ کی خاطر نہ صرف اپنے خاندان اور اپنی قوم کو چھوڑا بلکہ ایک دشتِ غربت میں اپنے اس اکلوتے فرزند کو بھی قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے جو اس بڑھاپے اور اس تنہائی میں ان کی تمام تمناؤں کا واحد مرکز تھا۔ تورات میں اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح کے خاص اس حصہ میں یہود نے بہت سی تحریفات کر دی ہیں تاہم یہ وعدہ تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۲۲۔

"اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہو گی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیوں کہ تو نے میری بات مانی۔" (۱۵-۱۸)

اس وعدے کے ایفا میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ دونوں کی نسل سے عظیم قومیں پیدا کیں جن کے مورثِ اعلیٰ اور روحانی پیشوا بلا اختلاف حضرت ابراہیمؑ تھے۔ پھر ان کے اندر نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری ہوا۔ ان میں جلیل القدر بادشاہ پیدا ہوئے جو دشمنوں کے پھاٹکوں کے فاتح بنے۔ پھر انہی کی ایک شاخ میں پیغمبرِ خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت ہوئی جن کے واسطہ سے تمام دنیا کو ایمان و ہدایت کی برکت نصیب ہوئی۔

مشرکین اس وعدے سے مستثنیٰ ہیں

اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تو انھوں نے سوال کیا کہ امامت و پیشوائی کا یہ عہد انھی کے ساتھ خاص ہے یا ان کی ذریت بھی اس میں شامل ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے) ظالم سے مراد قرآن میں صرف وہی لوگ نہیں ہوتے جو دوسروں پر ظلم ڈھانے والے ہوں بلکہ اس سے بیشتر وہ لوگ مراد لیے گئے ہیں جو شرک و کفر میں مبتلا ہو کر خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں مثلاً۔ فَمِنْھُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ وَمِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ (پس ان میں کتنے اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے اور کتنے میانہ رو ہیں) فاطر ۳۲۔ وَمِنْ ذُرِّیَّتِھِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ مُبِیْنٌ (اور ان دونوں کی ذریت میں ٹھیک عمل کرنے والے بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم کرنے والے بھی) ۱۱۳۔ صافات۔ مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ تمھاری ذریت میں سے تمھاری روش پر قائم اور میری دی ہوئی شریعت و ہدایت پر استوار رہیں گے وہ تو تمھارے بعد اس امامت کے وارث ہوں گے۔ لیکن جو بدعہدی اور نافرمانی کر کے شیطان کی راہ پر چل پڑیں گے وہ اس امامت میں سے کوئی حصہ نہیں پائیں گے۔

یہ تصریح یہاں اس لیے کی گئی ہے تاکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ان کو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت ہونے پر جو ناز ہے اور جس کے سبب سے وہ ایمان اور عمل کی تمام ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو سبکدوش سمجھے بیٹھے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ ابراہیمؑ کی وراثت میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو شرک و کفر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر اسی روز واضح کر دی تھی جس روز ان کو اس منصبِ امامت پر سرفراز فرمایا تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ اوپر ہم نے تورات کا جو حوالہ نقل کیا ہے، اس میں یہ تصریح بھی ضرور موجود رہی ہوگی لیکن چونکہ یہ بات یہود کے منشا کے خلاف تھی اس وجہ سے انہوں نے جس طرح اس سلسلہ کے واقعات میں دوسری بہت سی تبدیلیاں کر دیں، اسی طرح اپنی خواہش کے خلاف پاکر اس تصریح کو بھی انھوں نے حذف کر دیا۔ استاذ امامؒ نے اپنے رسالۂ ذبیح میں ان تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے۔ تفصیل کے طالب اس رسالہ کو ضرور پڑھیں۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۖ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (۱۲۵)

'بیت' سے مراد بیت اللہ ہے

بیت سے مراد بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ ہے۔ قرآن مجید میں اس شکل میں یہ لفظ خانہ کعبہ ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش باب ۱۲ میں اس کو بیت ایل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایل عبرانی میں اللہ کو کہتے ہیں۔

'مثابة' کا مفہوم

مثابۃ کے معنی مرکز و مرجع کے ہیں جس کی طرف سب رجوع کریں، جس کے ساتھ سب وابستہ ہوں، جو سب کا مرکز اور سب کا قبلہ ہو۔

'لِلنَّاس' سے مراد

"للناس" سے یہاں مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا میں ہوا ہے۔ یعنی وہ تمام ذریت ابراہیمؑ جس کی امامت و پیشوائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حاصل ہوئی عام اس سے کہ وہ حضرت اسحاق کی نسل سے ہوں یا حضرت اسماعیلؑ کے سلسلہ سے ہوں۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی تمام ذریت کا پیشوا بنانے کا فیصلہ کیا گیا اسی طرح یہ فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خدا کی عبادت کے لیے جو گھر وہ بنائیں گے وہ تمام ذریتِ ابراہیمؑ کا مرکز اور قبلہ ہوگا اور پھر ذریت اسماعیل کے واسطہ سے، جیسا کہ آگے ذکر آ رہا ہے، تمام دنیا کی قومیں اس گھر کی برکتوں میں سے حصہ پائیں گی۔

استاذ امام مولانا فراہیؒ اس مسئلہ میں اپنی تحقیق یہ بیان فرماتے ہیں۔

خانہ کعبہ کا ذکر تورات میں

تورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو شروع ہی سے یہ حکم ملا تھا کہ وہ اپنی بڑی قربانیوں کا قبلہ مکہ معظمہ کی سمت کو قرار دیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قربانی کے لیے ضروری تھا کہ وہ معبد میں خداوند کے حضور پیش کی جائے۔ فصل دوم حرف ی میں ہم بتا چکے ہیں کہ جس قربانی کا نام ان کے ہاں قدس الاقدس

تھا اس کا رخ جنوب کی طرف ہونا ضروری تھا۔ اسی طرح سالانہ قربانی جو ان کے ہاں سب سے بڑی قربانی خیال کی جاتی تھی اس کا رخ بھی جانب جنوب ہی ہوتا۔ یہود یا تو اس معاملہ کے اصلی راز سے بے خبر تھے جیسا کہ فصل دوم حرف ی میں ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں یا انھوں نے بالقصد اس معاملہ کو کریدنا نہیں چاہا۔ بلکہ اپنی عادت کے مطابق چاہا کہ اس پر پردہ ہی پڑا رہے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

حالانکہ یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ ان کے خیمہ عبادت کا رخ ابتداء سے جانب شمال تھا دیکھو سفر خروج ۲۷، ۹

مسکن کا گھر جنوب کی جانب برکت حاصل کرنے کے رخ پر بنایا جائے۔ نیز اسی سفر خروج کے باب ۴۰ آیت ۲۱، ۲۴ میں ہے۔

"اور میز کو اس پردے کے باہر مسکن کی شمالی سمت میں خیمۂ اجتماع کے اندر رکھا اور اسی پر خداوند کے حضور روٹی سجا کر رکھی جیسا کہ خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا اور خیمہ اجتماع کے اندر ہی میز کے سامنے مسکن کی جنوبی سمت میں شمعدان رکھا"

ہمارے نزدیک اس ساری ترتیب کا اصلی فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص خداوند کے حضور آئے اس کا رخ جانب جنوب یعنی کعبہ معظمہ اور ابراہیمی قربان گاہ کی طرف ہو۔ اس کا مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خیمہ کے اندر مسکن مقدس بھی جنوب ہی کی سمت میں تھا اور مذبح اس کے سامنے دروازے کی طرف تھا۔ اس لیے جو شخص وہ قربانی پیش کرتا جس کو قدس الاقداس کہتے ہیں وہ مذبح کے شمالی جانب کھڑا ہوتا تاکہ اس کا رخ مسکن ربانی کی طرف ہو سکے جس کے معنی یہ تھے کہ اس کا رخ لازماً خانہ کعبہ کی طرف ہوتا جس کے پاس ہی مروہ ہے جس کو اولین قربان گاہ ہونے کی عزت حاصل ہے اور اس کے پاس ہی مسکن اسماعیل بھی ہے۔"

(ملاحظہ ہو رسالہ ذبیح فصل ۱۵)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ جس طرح ہماری نمازوں اور قربانیوں کا قبلہ خانہ کعبہ ہے اسی طرح ابتدا ہی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام ذریت کی عبادت و قربانی کا قبلہ بھی خانہ کعبہ ہی کو قرار دینے کا فیصلہ تھا تھا۔ چنانچہ اسی رخ پر ان کا خیمہ عبادت بھی تھا اور پھر بعد میں اسی رخ پر بیت المقدس کی بھی تعمیر ہوئی، لیکن یہود نے محض تعصب کی وجہ سے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

آگے اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں۔

"ہمارے مذکورہ دعاوی کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیمؑ کا قبلہ قرار دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

اپنی اولاد کو عرب کے مشرق اور شمال میں آباد کیا اور ان کا قبلہ حضرت اسماعیلؑ کے مسکن کو قرار دیا چنانچہ تورات سے ثابت ہے کہ ان کو ان کے تمام بھائیوں کے آگے بسایا۔ پیدائش ۲۵: ۱۸ میں ہے۔

> اور اس کی اولاد حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں، آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسے ہوئے تھے۔

اور پیدائش ۱۶: ۱۲ میں ہے۔

> "وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا۔"

"سب بھائیوں کے سامنے بسنے" کی جو تاویل ہم نے کی ہے، اس کے سوا اس کی کوئی دوسری صحیح تاویل ممکن نہیں ہے کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد ماسوا بنی اسماعیل کے مشرق و شمال میں آباد ہوئی۔ پس حضرت اسماعیل ان سب کے سامنے اسی وقت ہو سکتے ہیں جب یہ مانا جائے کہ ان کی بستی ان سب کے قبلہ کے سمت میں تھی۔ ہمارے نزدیک اس بات کو ماننے میں کسی تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ یہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے سب کا امام بنایا تھا اور ان کے بعد اس امامت کے وارث حضرت اسماعیل ہوئے۔ قرآن مجید نے اس معاملہ کی طرف بعض اشارات کیے ہیں[۱]۔ (آگے مولاناؒ نے وہی آیت نقل فرمائی ہے جو یہاں زیرِ بحث ہے)

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (اور مسکن ابراہیمؑ کے ایک حصہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ) یہ ٹکڑا اوپر والے ٹکڑے ہی کی مزید وضاحت ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ "ہم نے کہا" یا "ہم نے حکم دیا" کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں جملوں میں ایک ہی بات دو مختلف پہلوؤں سے کہی گئی ہے۔ پہلے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو تمام اولادِ ابراہیمؑ کے لیے مرکز و قبلہ بنانے کا فیصلہ کیا پھر یہ فرمایا کہ اسی فیصلہ کو بروئے کار لانے کے لیے ابراہیمؑ اور اولادِ ابراہیمؑ کو یہ حکم ہوا کہ مسکنِ ابراہیمؑ کے ایک حصّہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ۔

مقامِ ابراہیمؑ سے مراد

یہاں آیت میں مقامِ ابراہیمؑ کا لفظ آیا ہے۔ مقام سے کیا مراد ہے؟ علمائے تفسیر سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد وہ پتھر ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ دوسرے گروہ[۲] کے نزدیک اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے۔ اس گروہ نے مقام کے لفظ کو کسی مخصوص کھڑے ہونے کی جگہ کے بجائے مسکن و مستقر کے مفہوم میں لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے۔ اس تاویل میں وسعت و جامعیت کے ساتھ ساتھ خاص اہمیت رکھنے والا

---

[۱] ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کا رسالہ ذبیح فصل ۱۶ [۲] واضح رہے کہ اس گروہ میں ابن عباس، مجاہد اور عطا جیسے اکابرِ علم تفسیر شامل ہیں۔

پہلو یہ ہے کہ نظمِ کلام کے اعتبار سے یہ اس مقصد کو زیادہ واضح کرنے والی ہے جس کے لیے یہ بات یہاں کہی گئی ہے۔ یہاں یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہی گھر تمام اولادِ ابراہیمؑ کا قبلہ رہا ہے اس لیے کہ یہی گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے اپنے اس مستقر میں تعمیر کیا جس میں ہجرت کے بعد انھوں نے حضرت اسماعیل کے ساتھ سکونت اختیار کی۔

ہمارے اور یہود کے درمیان نزاعی مسئلہ

یہ مسئلہ ہمارے اور یہود کے درمیان ایک بڑا نزاعی مسئلہ ہے۔ یہود نے خانہ کعبہ اور مروہ کی قربان گاہ سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق بالکل کاٹ دینے کے لیے واقعہ قربانی میں بھی اور ان کی سرگزشتِ ہجرت میں بھی نہایت بھونڈی قسم کی تحریفات کر دی ہیں اور اس طرح انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت اسحاق ہیں نہ کہ حضرت اسماعیل، جس جگہ قربانی کی وہ جبل یروشلم ہے نہ کہ مروہ۔ خدا کی عبادت کے لیے انھوں نے جو گھر بنایا وہ بیت المقدس ہے نہ کہ بیت اللہ۔ انھوں نے جس جگہ ہجرت کے بعد سکونت اختیار کی وہ کنعان ہے نہ کہ جوارِ خانہ کعبہ۔ ان بیانات کی تصدیق یا تردید کا واحد ذریعہ چونکہ تورات ہی ہے اور تورات میں یہود نے اپنے حسب منشا جیسا کہ ہم نے عرض کیا، تحریف کر ڈالی، اس وجہ سے اصل حقائق سے پردہ اٹھانا بڑا مشکل کام تھا لیکن ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے یہود کی ان تمام تحریفات کا پردہ خود تورات ہی کے دلائل سے اپنے رسالہ ذبیح میں بالکل چاک کر کے رکھ دیا ہے۔ انھوں نے تورات ہی کے بیانات سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وطن سے نکلنے کے بعد حضرت اسحاقؑ کی والدہ کو تو کنعان میں چھوڑا اور خود حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کے ساتھ بیر سبع کے بیابان میں قیام کیا۔ یہ جگہ ایک غیر آباد جگہ تھی اس وجہ سے انھوں نے یہاں سات کنوئیں کھودے اور درخت لگائے، یہیں ان کو خواب میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم صادر ہوا اور وہ حضرت اسماعیلؑ کو لے کر مروہ کی پہاڑی کے پاس آئے اور اس حکم کی تعمیل کی۔ اسی پہاڑی کے پاس انھوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کو آباد کیا۔ پھر یہاں سے لوٹ کر وہ بیر سبع گئے اور اپنے قیام کے لیے ایسی جگہ منتخب کی جو خانہ کعبہ سے قریب بھی ہو اور جہاں سے وقتاً فوقتاً حضرت اسحاقؑ کو دیکھنے کے لیے بھی جانا آسانی سے ممکن ہو سکے۔

مولاناؒ نے یہ ساری باتیں تورات کے نہایت ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت کر دی ہیں۔ ہر سوال پر اصل کتاب کے اقتباسات پیش کرنے میں طوالت ہے اس وجہ سے ہم نے صرف خلاصۂ بحث اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ جو لوگ تفصیل کے طالب ہوں وہ مولاناؒ کے مذکورہ رسالہ کا مطالعہ کریں۔

ظاہر ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے قیام اسی علاقہ میں فرمایا نہ کہ شام میں تو ان کو نماز کے لیے ایک مرکز کی تعمیر بھی اسی علاقہ میں کرنے کا حکم ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں انھوں نے اس بیت اللہ کی تعمیر کی جس کا ذکر تورات کی کتاب پیدائش میں بیت ایل کے نام سے ہوا ہے۔ بیت اللہ اور بیت ایل

دونوں کے معنی بالکل ایک ہیں سایل کے معنی عبرانی میں اللہ کے ہیں۔ اس بیت ایل سے اگر یہود بیت المقدس کو مراد لیتے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ اس سرزمین کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا مسکن نہیں بنایا، یہود کے اس دعوے کو جھٹلانے والی سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر بالاتفاق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سیکڑوں سال بعد حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہوئی ہے۔ چنانچہ خانہ کعبہ کی اسی قدامت اور اولیت کی وجہ سے قرآن نے اس کو "بیت عتیق" اور "اول بیت" کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ فِیْہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا (۹۶-۹۷ آل عمران) (بے شک پہلا گھر جو لوگوں ــــ اولاد ابراہیم ــــ کے لیے تعمیر ہوا وہی ہے جو بکہ[1] میں ہے، مبارک اور تمام عالم کے لیے سرچشمہ ہدایت۔ اس میں (اس کی اولیت کی) نہایت واضح نشانیاں ہیں، یہ مسکن ابراہیم ہے (اور اس کی روایت ہے کہ) جو اس میں داخل ہوا وہ مامون ہوا)

بیت اللہ کی تعبیر مصلّٰی سے

یہاں بیت اللہ کو "مصلّٰی" کے لفظ سے جو تعبیر فرمایا ہے تو اس سے اس گھر کے اصل مقصد تعمیر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ نماز کا مرکز ہوگا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کے جوارِ رحمت میں حضرت اسماعیلؑ کو بساتے وقت دعا بھی یہی کی تھی کہ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (اے رب میں نے ان کو اس لیے یہاں بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں) لیکن دورِ جاہلیت میں اس کے مشرک اور مبتدع متولیوں نے اس کو بدعات کا ایک اڈا بنا لیا اور ان کی نماز پھونک مارنے اور تالی بجانے کی ایک بت پرستانہ رسم بن کر رہ گئی۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں "مصلّٰی" کے لفظ میں ایک اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ذریت ابراہیمؑ کی دونوں شاخوں نے اپنے قبلہ کے بنیادی مقصد کو ضائع کر دیا[2] اور اب خدا نے اپنے اس نبی کو بھیجا ہے جو اس کے اصلی مقصد کی تجدید کر رہا ہے۔

وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ الآیۃ۔ عَھِد جب اِلٰی کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی پر کوئی ذمہ داری ڈالنے یا اس کو کسی شرط کا پابند کرنے کے آتے ہیں مثلاً وَلَقَدْ عَھِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا (۱۱۵-طٰہٰ) (اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک شرط کا پابند کیا تو وہ بھول بیٹھا اور ہم نے اس میں ارادہ کی مضبوطی نہیں پائی) اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ (۶۰-یٰس)

---

[1] بکہ کے معنی شہر کے ہیں۔ قدیم صحیفوں میں مکہ کے لیے یہی لفظ وارد ہے۔ یہود نے تحریف کر کے اس کو وادی بکاء کر دیا ہے، متعلق آیت کی تفسیر کے تحت ہم اس تحریف پر بحث کریں گے۔

[2] یہ ملحوظ رہے کہ یہود نے جس طرح اپنے دینی لٹریچر سے خانہ کعبہ کے ذکر کو خارج کر دیا اسی طرح نماز کو بھی انھوں نے بالکل خارج کر دیا۔ ان کے ہاں اگر کوئی چیز ہے تو قربانی ہے۔ ان کے معبد کی بھی اصلی حیثیت مرکز نماز کی نہیں بلکہ قربان گاہ کی ہے۔ ہمیں کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے نماز کی نعمت سے محروم ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے اپنے اصل قبلہ خانہ کعبہ سے اپنا تعلق توڑ لیا۔

(کیا میں نے تم کو اس شرط کا پابند نہیں کیا تھا، اے آدم کے بیٹو، کہ تم شیطان کی بندگی نہ کرو گے) پس عَہِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر خانہ کعبہ کی تولیت کی ذمہ داری ڈالی اور ان کو اس شرط کا پابند کیا کہ وہ اس گھر کو طواف، اعتکاف اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھیں۔

تطہیرِ بیت اللہ کا مقصد

پاک صاف رکھنے سے مقصد ظاہر ہے کہ ان ساری چیزوں سے پاک صاف رکھنا ہے جو اس گھر کے مقصدِ تعمیر کے منافی ہوں عام اس سے کہ وہ گندگی اور نجاست ہو جس سے عبادت گزاروں کی طبیعت میں تکدر پیدا ہو، یا ارباب لہو و لعب کے ہنگامے ہوں جن سے ان کی یکسوئی میں خلل واقع ہو یا اصنام و اوثان ہوں جو خدا کے گھر کو شرک و بت پرستی کا گڑھ بنا کے رکھ دیں۔ ان ساری چیزوں سے اس گھر کو پاک رکھنے کی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیلؑ پر ذمہ داری ڈال دی گئی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے اس ذمہ داری کا حق ادا کیا لیکن بعد میں ان کی اولاد جب شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئی تو اس نے اس گھر کی تولیت کی اس شرط کے برعکس اس کے کونے کونے میں بتوں کو لا بٹھایا اور ان لوگوں کو اس گھر سے نہایت ظلم اور بے دردی سے نکالا جو اس کو از سرِ نو ذکرِ الٰہی کے زمزموں، طواف و اعتکاف کی رونقوں اور رکوع و سجود کی جبہ سائیوں سے آباد و معمور کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے یہاں خانہ کعبہ کی ابتدائی تاریخ کی اس حقیقت کی طرف اسی لیے اشارہ فرمایا ہے کہ قریش اس گھر سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں لیکن جب انھوں نے ان کو سمجھنے سے انکار کر دیا تو بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس کی تولیت کے منصب سے ان کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (توبہ ۱۷-۱۸) (مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے منتظم بنے رہیں۔ درآنحالیکہ وہ خود اپنے کفر پر گواہ ہیں یہی لوگ ہیں جن کے تمام اعمال اکارت گئے اور دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے یہی ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کے منتظم تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں)

یہاں اس گھر کو تین چیزوں کے لیے خاص کرنے کا حکم ہوا ہے۔ طواف، اعتکاف اور رکوع و سجود۔

'طواف' کا مفہوم

طواف سے مراد خانہ کعبہ کے ارد گرد پھیرے لگانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے اس کا وہ طریقہ واضح فرما دیا ہے جو اس کا اصل ابراہیمی طریقہ ہے۔ طواف درحقیقت نماز کی ایک قسم ہے لیکن یہ نماز صرف خانہ کعبہ ہی کے پاس ادا ہو سکتی ہے اس کے سوا کہیں اور ادا نہیں ہو سکتی۔ اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے اس کا ذکر سب سے پہلے فرمایا۔ وقار و ادب کے حدود کے اندر رہتے ہوئے محبتِ الٰہی کے جذبات جس حد تک اس نماز میں ابھرتے ہیں بس اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ شمع و پروانہ کی حکایت طواف میں ایک حقیقت بن جاتی ہے بشرطیکہ آدمی کے اندر حیاتِ ایمانی کی رمق ہو۔

'اعتکاف' کا مفہوم

عاکف، عکوف سے ہے جس کی اصل روح دوسری چیزوں سے صرف نظر کرکے کسی خاص چیز کو پکڑ لینا ہے۔ اعتکاف اسی سے اعتکاف ہے جو دھیان گیان اور ذکر و فکر کی عبادت ہے۔ بندہ ہر چیز سے کٹ کر اپنے رب کی یاد کے لیے گوشہ نشین ہو جائے، یہ اعتکاف ہے۔ اس کی صحیح شکل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت سے واضح فرما دی۔ جس طرح طواف محبت الٰہی کے جذبات اُبھارنے کے لیے اپنے اندر ایک خاص صفت رکھتا ہے اسی طرح اعتکاف ذکر الٰہی پر عقل اور دل کو جمانے کے لیے اپنے اندر ایک خاص صفت رکھتا ہے۔

'رکوع' اور 'سجود' کا مفہوم

رُکَّعٌ، رَاکِعٌ کی جمع ہے اور سُجُوْد، ساجد کی۔ رکوع اور سجدہ کی لغوی تحقیق آیات ۴۲-۴۳ کی تفسیر کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ دونوں لفظ نماز کی تعبیر کے لیے وارد ہوئے ہیں۔ نماز کی تعبیر رکوع اور سجود سے دو اہم حقیقتوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ دونوں چیزیں نماز کے قدیم ترین اور اہم ترین ارکان میں سے ہیں۔ نماز کی ظاہری ہیئت میں جو تبدیلیاں بھی واقع ہوئی ہوں لیکن یہ دونوں چیزیں جس طرح ہماری نمازوں میں شامل ہیں اسی طرح ابراہیمی نماز میں بھی شامل تھیں۔ دوسری یہ کہ نماز سے صرف ذکر و فکر ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کی مخصوص صورت و ہیئت بھی مطلوب ہے اور اس کی صورت و ہیئت کا اصلی جمال اس کے رکوع و سجود ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۲۶)

سرزمین حرم کے دو خاص مسئلے

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (اے میرے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے ساکنوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما) آمن کے معنی مامون و مطمئن کے ہیں۔ یہ دعا حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین کے لیے فرمائی ہے جس پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا اور جہاں حرم کی تعمیر کی۔ یہ علاقہ جیسا کہ واضح ہو چکا ہے تہذیب و تمدن اور آبادی و زرخیزی سے بالکل محروم تھا، خانہ بدوش قبائل پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں موسموں کے تغیر کے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر منتقل ہوتے رہتے تھے۔ معاش کا ذریعہ یا تو گلہ بانی تھا یا شکار یا پھر لوٹ مار۔ اس وجہ سے اس سرزمین کے دو مسئلے خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں بڑے اہم تھے۔ ایک امن کا، دوسرا غذا کا۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی قبولیت

حضرت ابراہیمؑ کی مذکورہ دعا انھی دو چیزوں کے لیے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا جس طرح قبول فرمائی اور اس کی جو برکتیں حضرت ابراہیمؑ کی ذریت اور اس علاقہ کے باشندوں کے لیے ظاہر ہوئیں وہ تاریخ کی ایک ایسی زندہ اور محسوس حقیقت ہے کہ کوئی کٹر سے کٹر مخالف بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ پھر عجیب ایمان پرور ماجرا یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے واسطہ ہی سے لوگوں کو بخشیں۔ اس

ڈھونڈنے کے سوا انھیں کسی اور واسطے اور ذریعے کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ قرآن میں اس گھر کو جو مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا گیا ہے، اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کن شکلوں میں پوری ہوئی

اب آئیے دیکھیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا اس سرزمین کے بسنے والوں کے لیے کن کن شکلوں میں پوری ہوئی۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف بیت اللہ کو بلکہ اس سرزمین کو بھی جہاں بیت اللہ واقع ہے محترم قرار دے دیا۔ اس میں لڑنا بھڑنا، کسی پر حملہ کرنا، کسی کو قتل کرنا، سب یک قلم ممنوع ہوگیا۔ جو شخص بھی اس میں داخل ہوگیا وہ خدا کی امان میں داخل ہوگیا۔ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں رہا کہ اس سے کسی قسم کا تعرض کرسکے۔ اس کے حدود سے باہر خطرہ ہی خطرہ تھا لیکن اس کے اندر ربِ ابراہیمؑ نے امن ہی امن پیدا کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کے دائرے میں کسی جانور کو بھی کوئی اذیت پہنچانا حرام ٹھہرا۔ اپنے اسی احسان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قریش کو مخاطب کرکے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۶۷۔ عنکبوت) کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے ایک محفوظ حرم بنا دیا درآنحالیکہ ان کے گرد و پیش کا حال یہ ہے کہ لوگ دن دہاڑے اچک لیے جاتے ہیں)

اشہرِ حرم

دوسری یہ کہ اس گھر کے حج و زیارت کے لیے سال کے چار مہینے بھی محترم قرار دے دیے گئے۔ ان مہینوں میں لڑنا بھڑنا اور خونریزی و فساد بالکل ممنوع ہوگیا۔ وحشی سے وحشی لوگ بھی ان کے احترام میں اپنی تلواریں میانوں میں کر لیتے تھے اور خطرناک سے خطرناک علاقے بھی بالکل پُرامن ہو جاتے تھے تاکہ لوگ ملک کے ہر گوشے اور کونے سے حج و عمرہ کے لیے آسکیں اور پھر امن و سلامتی کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹ سکیں۔

بیرونی خطرات سے حفاظت

تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو بیرونی دشمنوں کے خطرات سے بھی بالکل مامون و محفوظ بنایا۔ اس گھر کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ بیرونی دشمنوں کو اوّل تو اس پر حملہ آور ہونے کی کبھی جرأت ہی نہیں ہوئی اور اگر کبھی کسی نے یہ جسارت کی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی قدرتِ قاہرہ سے نہایت عبرت ناک سزا بھی دی ہے۔ ابرہہ کی فوجوں کا جو حشر ہوا وہ تاریخ کی بھی ایک مشہور حقیقت ہے اور اس کا ذکر قرآن کی سورۂ فیل میں بھی ہوا ہے۔

معاشی فراغت کے مختلف پہلو

اسی طرح اس گھر کی برکت نے اس سرزمین کے ساکنوں کے لیے معاشی فراغت کے دروازے بھی کھول دیے۔ اس کے بھی بعض پہلوؤں کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ مرکزِ حج قرار پا جانے کی وجہ سے اس سرزمین کی طرف لوگوں کا رجوع بہت بڑھ گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت جتنی ہی پھیلتی گئی اسی حساب سے لوگ گوشہ گوشہ سے حج و زیارت کے لیے آنے لگے۔ اور پھر اسی اعتبار سے، قدرتی طور پر، تجارت اور کاروبار کو فروغ ہوا۔ باہر سے ہر قسم

کی چیزیں مکہ کے بازار میں پہنچنے لگیں اور یہاں سے جو چیزیں باہر جا سکتی تھیں وہ باہر نکلنے لگیں۔ اس گھر کی تعمیر سے پہلے اس علاقہ میں معاش کا تمام تر انحصار جیسا کہ ہم نے ذکر کیا یا تو گلہ بانی اور شکار پر تھا یا لوٹ مار پر لیکن اب تجارت کی راہ کھل جانے کی وجہ سے ہر قسم کی اجناس اور پھل اور ضرورت کی دوسری چیزوں کی فراوانی ہوئی جس سے لوگوں کی معیشت میں ایک نہایت خوشگوار تبدیلی آگئی۔

دوسرا یہ کہ خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو وقار و احترام کا ایک ایسا مقام حاصل ہو گیا کہ تمام عرب پر ان کی سیاسی اور مذہبی دھاک بیٹھ گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے تجارتی قافلے شام اور یمن وغیرہ تک برابر جاتے اور کوئی ان سے مزاحمت کی جرأت نہ کرتا۔ بلکہ تاریخوں سے یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ ان کے قافلے جن شاہراہوں سے گزرتے ان پر بسنے والے قبائل ان سے تعرض کرنے کے بجائے اپنے اپنے حدود کے اندر ان کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے بدرقہ فراہم کرتے۔ سورۂ "لایلاف" میں قرآن مجید نے قریش کے انھی تجارتی سفروں کا حوالہ دے کر ان سے مطالبہ کیا ہے فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ (پس چاہیئے کہ اس گھر کے رب کی وہ بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خطرے سے نچنت کیا) اس لیے کہ فی الواقع یہ اسی گھر کی برکت تھی کہ وہ ایک پرخطر اور چٹیل بیابان میں امن سے بھی بہرہ مند ہوئے اور ان کے لیے معاش کی راہیں بھی فراخ ہو گئیں۔

ایک سوال کا جواب

بحث کے یہ سارے پہلو تو بالکل واضح ہیں البتہ یہاں ایک بات ایسی ہے جو ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہنوں میں کھٹکے وہ یہ کہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لیے رزق کے لیے جو دعا کی ہے وہ مخصوص طور پر پھلوں کے رزق کی دعا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے رزق و فضل کی دعا کرنا بالخصوص جب کہ وہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بسائی جا رہی ہو ایک بالکل فطری چیز ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس رزق کے لیے پھلوں کی شرط کیوں لگائی۔ ذوق تو یہ کہتا ہے کہ انھیں رزق کی ایک جامع دعا مانگ کر معاملہ اپنے رب پر چھوڑنا تھا کہ یہ رزق وہ انھیں کس شکل میں دے۔ اپنی طرف سے کسی خاص نوعیت کے رزق کی تجویز پیش کرنا ایک پیغمبر کے لیے کچھ موزوں نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید میں دوسرے انبیاء کی یا خود حضرت ابراہیمؑ کی دوسری دعائیں جو مذکور ہیں ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی تخصیص و تعیین سے جو ایک تجویز کی سی شکل اختیار کر لے ان میں بالعموم احتراز فرمایا گیا ہے۔

ثمرات کا مفہوم

ہمارے نزدیک یہ کھٹک محض اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ثمرات سے مراد صرف میوہ جات ہیں حالانکہ ثمرات کے معنی صرف میوہ جات کے نہیں آتے بلکہ میوہ جات کے ساتھ ساتھ اجناس اور غلہ جات بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ میوہ جات کے لیے مخصوص لفظ عربی میں فواکہ کا ہے ثمرات کا لفظ اس سے عام اور وسیع ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اسی ابراہیمی دعا کی برکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ثمرات کل شیء (ہر چیز کے پھل) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں أَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ

ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ (۵۷۔ قصص) (کیا ہم نے ایک مامون حرم میں ان کے قدم نہیں جمائے جہاں ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں)

ہم اوپر یہ ذکر کر چکے ہیں کہ یہ سرزمین جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیلؑ کو بسایا ایک چٹیل اور غیر آباد جگہ تھی۔ تورات میں اس کے لیے بیابان کا لفظ استعمال ہوا ہے اور خود حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں اس کو وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی وادی) سے تعبیر کیا ہے۔ تورات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی بسر اوقات گلہ بانی اور شکار پر تھی جس کے سبب سے ان کا زیادہ تر وقت باہر بسر ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب معاش کا انحصار گلہ بانی اور شکار پر ہو تو وہ پُرسکون اور برقرار زندگی وجود میں نہیں آسکتی تھی جو بیت اللہ کی تولیت کے فرائض اور اس مشن کی تکمیل کے لیے ضروری تھی جو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے سپرد فرمایا تھا۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لیے یہ دعا کی کہ ان کو بدویانہ زندگی کی بے اطمینانیوں اور پریشانیوں کی جگہ حضری زندگی کا سکون و اطمینان نصیب ہو تاکہ وہ توحید اور عبادت الٰہی کے اس عالم گیر مرکز کی پوری دلجمعی کے ساتھ خدمت کر سکیں جس کی خدمت پر وہ مامور کیے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا سورۂ ابراہیمؑ میں بھی نقل ہوئی ہے۔ وہاں کچھ الفاظ زیادہ ہیں جن سے وہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ فرمایا۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ	اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد میں سے بعض
غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ	کو ایک بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم گھر کے پاس
رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً	بسایا ہے۔ اے ہمارے رب، میں نے اس لیے بسایا
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ	ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں پس تو لوگوں کے دل ان کی
مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ	طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما
(۳۷۔ ابراھیم)	تاکہ یہ تیرا شکر ادا کرتے رہیں۔

اس دعا کے الفاظ پر اچھی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی اولاد کے لیے یہاں اپنے رب سے دو چیزوں کی درخواست کی ہے اور اس درخواست کے حق میں دو چیزوں کو بطور سفارش پیش کیا ہے۔ درخواست تو یہ پیش کی ہے کہ تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی دے اور اس کے حق میں سفارش یہ پیش کی ہے کہ یہ سرزمین زراعت سے بالکل محروم سرزمین ہے لیکن میں نے اپنی اولاد کو صرف اس لیے یہاں لا ڈالا ہے کہ یہ تیرے محترم گھر کی خدمت کریں اور تیری بندگی کی دعوت کے لیے نماز قائم کریں۔ غور کیجیے کہ جب ثمرات کی روزی کے لیے وہ وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ بن کھیتی کی زمین ہے تو ان کا مدعا ثمرات سے صرف میوہ جات تو نہیں ہو سکتے بلکہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ گلہ بانی اور شکار کی بدویانہ زندگی کی بے اطمینانیوں سے چھوٹ کر حضری زندگی کے سکون سے بہرہ مند

ہوں کہ تیرے گھر اور تیرے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ آیت کے آخر میں لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ کے جو الفاظ آئے ہیں وہ بھی نہایت معنی خیز ہیں یعنی میں ان کے لیے جو سکون کی زندگی کا طالب ہوں تو اس لیے نہیں کہ ان کے لیے سامانِ عیش کی فراوانی چاہتا ہوں بلکہ صرف اس لیے اس کا طالب ہوں کہ وہ اپنے مشن کے لیے یکسو رہ کر زیادہ سے زیادہ تیری شکر گزاری کا حق ادا کر سکیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی شرط

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الآیۃ۔ حضرت ابراہیمؑ نے رزق کے لیے جو دعا فرمائی اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ اس کے حق دار صرف وہی لوگ ٹھہریں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہوں۔ یقیناً یہاں یہ پیش بندی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لیے فرمائی کہ اوپر امامت و خلافت کے معاملہ میں ان کو یہ صاف جواب مل گیا تھا کہ اس عہد کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا جو شرک و کفر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ بات سامنے تھی اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے اس پر قیاس کر کے یہاں اپنی دعا میں از خود یہ قید لگا دی کہ میں یہ درخواست صرف اہلِ ایمان کے لیے کر رہا ہوں۔ اس سے حضرت ابراہیمؑ کے اس مرتبۂ تسلیم و رضا کا اندازہ ہوتا ہے جس پر وہ فائز تھے۔ اشارہ بھی اگر مل گیا ہے کہ فلاں سمت میں رب کی رضا ہے تو جھپٹ کر ادھر کو چل پڑے ہیں، اگرچہ اس اشارہ کا مطلب بعد میں کچھ اور ہی واضح ہوا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ امامت و خلافت اور معیشتِ دنیا کے معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کے نافرمان ہیں وہ خدا کی خلافت کے سزاوار تو ہرگز نہیں ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی نافرمانی کے سبب سے خدا ان کی روزی بھی چھین لے۔ روزی اللہ تعالیٰ نافرمانوں اور فرمانبرداروں دونوں کو اس حیاتِ چند روزہ میں دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس زندگی میں جو لوگ اس کے رزق سے نافرمانی کرتے ہوئے متمتع ہوتے ہیں ان کو مرنے کے بعد وہ دوزخ میں جھونک دے گا۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ بڑی وضاحت کے ساتھ آگے مختلف سورتوں میں بیان ہوگی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۲۷)

تعمیرِ کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی دعا

قواعد، قاعدہ کی جمع ہے۔ قاعدہ کے معنی بنیاد اور اساس کے ہیں۔ اوپر والی آیت میں اس گھر کی تعمیر کے حکم کا حوالہ تھا۔ اب آگے یہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ اس کی بنیادیں اٹھاتے وقت حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ نے کیا دعا کی تھی، اس گھر کے ساتھ ان کی کیا آرزوئیں اور تمنائیں وابستہ تھیں اور مستقبل میں اس سے کس فیضِ عالم گیر کے جاری ہونے کی انھوں نے اپنے پروردگار سے التجا کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کا یہ حصہ صرف قرآن کے ذریعہ سے ہمارے علم میں آیا ہے، اس لیے کہ یہود نے جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا تورات سے خاص اس حصہ کو یا تو حذف کر دیا یا اس میں اپنے حسبِ منشا تحریف کر دی۔ لیکن یہ آپ کی سرگزشت

کا ایک ایسا ضروری حصہ ہے کہ اس کے بغیر یہ بالکل ناتمام معلوم ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ تحریف کردہ حصہ بے نقاب کر کے اس کی تکمیل کر دی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، اے ہمارے رب ہماری طرف سے قبول کر، کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تیری عبادت اور تیری بندگی کی دعوت کے لیے یہ گھر جو ہم بنا رہے ہیں اس کو شرفِ قبولیت بخش اور ہماری یہ خدمت قبول فرما اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تیرے گھر کی بنیادیں اٹھاتے وقت کچھ التجائیں پیش کرتے ہیں ہماری یہ التجائیں قبول فرما۔ ہم اس دوسرے مطلب کو ترجیح دیتے ہیں۔ اول تو اس وجہ سے کہ اس صورت میں یہ جملہ خاص خانہ کعبہ سے متعلق ہونے کے بجائے اس پوری دعا کی تمہید بن جاتا ہے جو آگے آ رہی ہے، دوسرے جہاں تک خانہ کعبہ کی تعمیر کا تعلق ہے یہ کام حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق کر رہے تھے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کی قبولیت پہلے سے معلوم تھی۔ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ میں خدا کی ان دو صفتوں کا حوالہ ہے، جن پر اعتماد کر کے بندہ خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے اندر حصر کا جو مضمون ہے وہ دعا کرنے والوں کی طرف سے کامل سپردگی اور کامل اعتماد کا اظہار ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۲۸)

دعا کی وضاحت

دُعا کے بیچ بیچ میں بار بار "رَبَّنَا" کا اعادہ اور دعا کے مناسب صفاتِ الٰہی کا حوالہ دعا کے آداب میں سے ہے۔ اس سے دعا شرفِ قبولیت حاصل کرتی ہے۔ یہ دعا ان دونوں چیزوں کے حکیمانہ استعمال کی بہترین مثال ہے۔

سب سے پہلے باپ بیٹے دونوں نے جس چیز کی دعا کی ہے وہ خود اپنے مسلم بنائے جانے کی ہے۔ مسلم کے معنی خدا کے کامل فرمانبردار کے ہیں۔ اس سے کئی حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان و اسلام اور طلبِ خشیت و تقویٰ کی دعاؤں میں انسان سب سے پہلے اپنے آپ کو سامنے رکھے، یہ چیزیں ایسی نہیں جن سے کوئی بھی مستغنی ہو سکے اگرچہ وہ کتنا ہی عالی مقام ہو۔ دوسری یہ کہ اسلام کے درجات و مراتب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیل جیسے مسلم کامل بھی جن کے ذریعہ سے دنیا اسلام کے نام اور اس کی روح سے آشنا ہوئی اپنے مسلم بنائے جانے کے لیے دعا کرتے تھے، تیسری حقیقت، جو خاص اس موقع سے تعلق رکھنے والی اور نظمِ کلام کو کھولنے والی ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تاریخی موقع پر، جب کہ وہ اپنے مشن کا مرکز تعمیر کر رہے تھے، اپنے لیے جس چیز کی دعا کی تھی، مسلم بنائے جانے کی تھی نہ کہ یہودی یا نصرانی بنائے جانے کی۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۔ اپنے مسلم بنائے جانے کی دعا کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت

اسماعیلؑ نے اپنی ذریت کے اندر سے ایک پوری امتِ مسلمہ اٹھائے جانے کی بھی اس موقع پر دعا فرمائی۔
اس دعا میں چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کی ذریت میں سے صرف حضرت اسماعیلؑ شریک تھے۔ اس وجہ سے اس کا واضح مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ یہ انہی کی اولاد سے متعلق تھی چنانچہ انہی کی نسل کے اندر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا اور آپ کی دعوت سے وہ امتِ مسلمہ ظہور میں آئی جس کے لیے یہ دعا کی گئی تھی۔ تورات سے یہ چیزیں تو غائب کر دی گئیں لیکن قربان ہونے والے فرزند سے متعلق یہ پیشین گوئی موجود ہے کہ "تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی"۔

لفظ 'ارائت' کا مفہوم

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا: اَرِنَا کے اصل معنی "ہمیں دکھا" کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنی شریعت کی طرف اپنے بندوں کی رہنمائی اس طرح کی وحی کے ذریعہ سے بھی کرتا ہے جس کا مظہر قرآن مجید ہے اور کبھی رؤیا یا کشف میں براہ راست اپنا کوئی فرشتہ بھیج کر اس کام کو عملاً دکھا یا بتا بھی دیتا ہے جو مطلوب ہوتا ہے۔ اس قسم کی رہنمائی قرآن مجید کی اصطلاح میں ارادت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء تشریف لائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی رہنمائی زیادہ تر ارادت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ یعنی یا تو رویا میں ان کو ایک بات دکھا دی جاتی تھی یا کوئی فرشتہ خداوندی ظاہر ہو کر مطلوب کام کی طرف رہنمائی کر دیتا تھا۔ تورات سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں دعا میں حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ نے اسی ارادت کی درخواست کی ہے۔

'مناسک' کی تحقیق

مناسک، منسک کی جمع ہے، نسک کے اصل معنی دھونے اور پاک کرنے کے ہیں۔ نَسَکَ الثَّوْب کے معنی ہیں کپڑے کو دھو کر پاک کیا۔ اسی سے نُسُک ہے جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ قربانی بندے کو گناہ کی آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کا تقرب عطا کرتی ہے۔ پھر اسی سے منسک ہے، جس کے معنی قربانی کے طریقے کے بھی ہیں اور قربان گاہ کے بھی۔ اس کی جمع مناسک ہے جو حج کے تمام سلسلۂ عبادات و مراسم پر حاوی ہے، فرمایا ہے۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ ۔ ۲۰۰۔ بقرہ (جب تم حج کے مراسم ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو)۔

'توبہ' کا مفہوم

وَتُبْ عَلَيْنَا: توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں، اس کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو، جیسا کہ آیت ۳۷ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں، اس بات پر دلیل ہوتا ہے کہ اس کے اندر رحم کا مضمون پوشیدہ ہے۔ رحم کے اس پوشیدہ مضمون کو یہاں اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کہہ کر کھول بھی دیا ہے۔ بندہ جب اپنے رب کی طرف خشیت کے ساتھ رجوع کرتا ہے تو رب رحیم رحمت کے ساتھ بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۲۹)

دعا کا تعلق ذریتِ اسمٰعیل سے ہے

ان میں انھی میں سے ایک رسول اٹھا۔ یعنی ہماری ذریت میں سے۔ چونکہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ صرف حضرت اسماعیلؑ ہی تھے اور وہی اس وادیٔ غیر ذی ذرع میں بسائے جا رہے تھے اس وجہ سے اس دعا کا تعلق لازماً انھی کی ذریت سے تھا۔ اس کا کوئی تعلق بھی حضرت اسحاقؑ کی ذریت سے نہیں ہو سکتا۔ تورات کے الفاظ سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ آخری نبی کی بعثت حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہونے والی تھی۔ تثنیہ باب ۱۸ میں حضرت موسیٰؑ کی جو مشہور پیشین گوئی ہے اس میں فرمایا ہے "تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا" آگے چل کر ہے "میں ان کے لیے انھیں کے بھائیوں میں سے" یہ الفاظ صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسماعیل ہی ہیں۔ اگر بنی اسرائیل مراد ہوتے تو صحیح تعبیر "انھی کے بھائیوں میں سے" کے بجائے "انھی میں سے" کی ہوتی۔ اسی طرح "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کی جگہ "تمھارے ہی اندر سے" کے الفاظ وارد ہوتے۔ علاوہ ازیں یہاں "میری مانند" کے الفاظ بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نبی کی بعثت کی پیشین گوئی کی گئی تھی ایک صاحبِ رسالت رسول کی تھی۔ قرآن مجید کی مذکورہ دعا میں اسی لحاظ سے رسول کا لفظ وارد ہوا ہے۔ ہم آگے کسی مناسب موقع پر رسول اور نبی کے فرق کو ظاہر کریں گے۔

یہاں جس رسول کی بعثت کے لیے دعا کی گئی ہے، اس کے تین مقاصد بتائے گئے ہیں۔ ایک تلاوتِ آیات، دوسرا تعلیم کتاب و حکمت، تیسرا تزکیہ۔

'تلاوتِ آیات' کا مفہوم

آیت لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں، جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جا سکے۔ اس پہلو سے آسمان و زمین کی ہر چیز آیت ہے، اس لیے کہ ان میں سے ہر چیز خدا کی قدرت و حکمت اور اس کی مختلف صفات خلق و تدبیر پر ایک دلیل ہے۔ اسی طرح وہ معجزات بھی آیت ہیں جو انبیاء علیہم السلام سے ظاہر ہوئے اس لیے کہ وہ بھی اپنے پیش کرنے والوں کی سچائی پر دلیل تھے۔ علیٰ ہذا القیاس قرآن مجید کے الگ الگ جملوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ فی الحقیقت ان میں سے ہر آیت کی حیثیت ایک دلیل و برہان کی ہے جس سے خدا کی صفات اور اس کے احکام و قوانین اور اس کی مرضیات کا علم ہوتا ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ کے الفاظ سے اس زور اور اختیار کا اظہار ہو رہا ہے، جس سے مسلح ہو کر خدا کا ایک رسول اس دنیا میں آتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ رسول محض ایک خوش الحان قاری کی طرح لوگوں کو قرآن سنانے نہیں آتا، بلکہ وہ خدا کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو آسمان و زمین کے خالق و مالک کے احکام و فرامین اور اس کے دلائل و براہین سے آگاہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وحی الٰہی کے لیے آیات کے لفظ سے اس حقیقت کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ خدا کا دین تحکم اور جبر پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر دلائل و براہین پر مبنی ہے اور اس کے ہر ٹکڑے کے اندر اس کی دلیل ہے۔

'تعلیم کتاب و حکمت' کا مفہوم

اب آیئے تعلیم کتاب و حکمت کے الفاظ پر غور فرمایئے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ تعلیم، تلاوت

سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ تلاوت آیات تو یہ ہوئی کہ رسول نے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ خدا نے اس کے اوپر یہ وحی نازل کی ہے۔ تعلیم یہ ہے کہ نہایت شفقت و توجہ کے ساتھ ہر استعداد کے لوگوں کے لیے اس کی مشکلات کی وضاحت کی جائے، اس کے اجمالات کی تشریح کی جائے، اس کے مقدرات کھولے جائیں اور اس کے مضمرات بیان کئے جائیں اور اس توضیح و بیان کے بعد بھی اگر لوگوں کے ذہن میں سوالات پیدا ہوں تو ان کے سوالوں کے جواب دیے جائیں۔ مزید برآں لوگوں کی ذہنی تربیت کے لیے خود ان کے سامنے سوالات رکھے جائیں اور ان کے جوابات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ لوگوں کے اندر فکر و تدبر کی صلاحیت اور کتاب الٰہی پر غور کرنے کی استعداد پوری طرح بیدار ہو جائے۔ یہ ساری باتیں تعلیم کے ضروری اجزا میں سے ہیں اور ہر شخص جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا ہے اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ آپ نے اپنے صحابہؓ کے لیے تعلیم کتاب کے یہ تمام طریقے اختیار فرمائے۔

تعلیم کے ساتھ یہاں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک کتاب کا، دوسری حکمت کا۔

'حکمت' کی تحقیق

کتاب سے مراد تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے۔ اس لفظ کی تحقیق ہم اس سورہ کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ لفظ حکمت کی تحقیق مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں جو بیان فرمائی ہے اس کا ضروری حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> رہی حکمت تو وہ تعبیر ہے اس قوت و صلاحیت کی جس سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کی تعریف میں ارشاد ہوا ہے وَاٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ہم نے اس کو حکمت عطا کی اور فیصلۂ معاملات کی صلاحیت) یہاں فصل الخطاب کے لفظ سے اس اثر کو بیان کیا ہے جو حکمت کا ثمرہ ہے۔ جس طرح فیصلۂ معاملات کی صلاحیت حکمت کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب بھی اس کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اہل عرب حکمت کا لفظ نفس کی اس قوت و صلاحیت کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں جو عقل و رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع ہوتی ہے۔ چنانچہ دانش مند اور مہذب آدمی کو حکیم کہا جاتا ہے اور جو بات عقل اور دل دونوں کے نزدیک بالکل واضح ہو اس کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں۔

حکمت کا ذکر یہاں کتاب کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب سے ایک زائد شے ہے، اگرچہ یہ حکمت سرتاسر قرآن حکیم ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں، ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حکمت چونکہ حکیمانہ بات کو بھی کہتے ہیں اور حکیمانہ بات کہنے کی صلاحیت کو بھی، اس وجہ سے تعلیم حکمت کے معنی جس طرح کسی کو کوئی حکیمانہ بات بتا دینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی لوگوں کے اندر حکمت کی صفت و صلاحیت پیدا کرنے کے بھی ہیں۔

'تزکیہ' کا مفہوم

رسول کا تیسرا مقصد تزکیہ بتایا گیا ہے۔ لفظ تزکیہ دو مفہوموں پر مشتمل ہے۔ ایک پاک و صاف کرنے پر، دوسرے نشوونما دینے پر، ہمارے نزدیک یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جو چیز

مخالف و مزاحم رد ایدہ و مفاسد سے پاک ہو گی وہ لازماً اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان بھی چڑھے گی۔ انبیاء علیہم السلام نفوسِ انسانی کا جو تزکیہ کرتے ہیں اس میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں اور ان کے اعمال و اخلاق کو غلط چیزوں سے پاک صاف بھی کرتے ہیں اور ان کے اعمال و اخلاق کو نشو و نما دے کر ان میں مفاسد اور مخالف و مزاحم چیزوں کے بالمقابل استقلال کے ساتھ سینہ سپر رہنے اور استقامت دکھانے کی قوت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کتاب کے مقابلہ میں نفوس کا تزکیہ کہیں زیادہ دیدہ ریزی، مشقت اور صبر و ریاض کا طالب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کا ذکر تمام دین و شریعت کے غایت و مقصد کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت ہم انشاء اللہ آگے کسی موزوں مقام پر کریں گے۔

عزیز اور حکیم کا مفہوم

آیت کے خاتمہ پر خدا کی دو صفتوں — عزیز و حکیم — کا حوالہ ہے۔ عزیز کے معنی غالب اور عزت و قوت والے کے ہیں۔ یعنی وہ ذات جو پوری قوت و صولت اور پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ اس کائنات پر فرمانروائی کر رہی ہے — حکیم کے معنی ہیں جس کے ہر کام میں حکمت، مصلحت اور مقصد و غایت ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفتوں کا حوالہ بالعموم ایک ساتھ آتا ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات پر پوری قوت اور پورے غلبہ کے ساتھ حاوی اور متصرف ہے، لیکن اس کے اس غلبہ و اقتدار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کے زور میں جو چاہے کر ڈالے، بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت و مصلحت کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا کوئی کام بھی حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔

یہاں ان دونوں صفتوں کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جو خدا عزیز و حکیم ہے، اس کی عزت و حکمت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی اس مملکت میں اپنا سفیر اور پیغمبر بھیجے جو اس کی رعیت کو اس کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۳۰)

رَغِبَ کا صلہ جب عَنْ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی چیز سے بے رغبت اور بیزار ہونے کے ہوتے ہیں۔

لفظ سَفِہَ کی تحقیق

سَفِہَ زیادہ تر لازم آتا ہے۔ لیکن متعدی بھی آتا ہے۔ مثلاً سَفِہَ نَفْسَہٗ کے معنی ہوں گے اس نے اپنا نصیبہ بگاڑ لیا سَفِہَ رَأیَہٗ کے معنی ہوں گے اس نے احمقانہ رائے اختیار کی۔ اسی طرح سَفِہَ نَفْسَہٗ کے معنی ہوں گے۔ اس نے اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کیا۔

یہ اسلوب کلام اظہارِ تعجب اور اظہارِ افسوس دونوں کا جامع ہے۔ اشارہ یہاں یہود کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ملت ابراہیمؑ کے پیرو ہونے کے مدعی ہیں، بلکہ اپنے زعم میں اس کے

واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، دوسری طرف ان کا یہ حال ہے کہ جو پیغمبر ملتِ ابراہیمؑ کا داعی بن کر آیا ہے اس سے اور اس کی دعوت سے یہ سب سے زیادہ بیزار ہیں اور ان لوگوں کو بے وقوف قرار دے رہے ہیں جو اس دعوت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ حماقت اور خرد باختگی کی اس سے بڑھ کر مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا (اور ہم نے دنیا میں اس کو برگزیدہ ٹھہرایا) یہ اس برگزیدگی کی طرف اشارہ ہے جو ان کو دنیا کی قوموں کی سرداری و پیشوائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بخشی اور جس کا ذکر اوپر آیت ۱۲۴ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے سب کی امامت کے لیے منتخب فرمایا، احمق ہی ہوگا جو اس کی ملت کی پیروی سے اعراض اختیار کرے گا۔

صالحین کا لفظ قرآن مجید میں عام نیکو کاروں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اس پورے زمرے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جو انبیاء، صدیقین اور شہداء اور صالحین سب پر مشتمل ہے۔ اس آیت میں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۳۱)

اسلام کا مفہوم

اسلام کے معنی اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کی مرضی اور اس کے احکام کے حوالہ کر دینا ہے۔ یہاں ہمارے نزدیک اس سے بیٹے کی قربانی کی طرف اشارہ ہے۔ یوں تو وہ تمام امتحانات، جن سے وہ گزارے گئے، ان کے اسلام کی جانچ ہی کے لیے تھے، گویا ہر امتحان زبانِ حال سے ان کے سامنے اَسْلِمْ ہی کا مطالبہ رکھنے کے لیے نمودار ہوا لیکن خاص طور پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کا حکم جس میں کامیابی کے بعد وہ برگزیدگی اور امامت کی عزت سے نوازے گئے ہیں، کامل سپردگی اور کامل حوالگی کا ایک ایسا مطالبہ تھا جس کی تعبیر کے لیے سب سے زیادہ جامع اور حقیقت افروز لفظ اگر کوئی ہو سکتا تھا تو اَسْلِمْ ہی کا لفظ ہو سکتا تھا۔ یہ لفظ واقعہ قربانی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے قرآن مجید میں بعض دوسرے مقامات میں بھی آیا ہے مثلاً فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۱۰۳۔ صافات (پس جب باپ اور بیٹے دونوں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالے کر دیا اور ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا)

یہاں اس واقعہ کی طرف اسلام کے لفظ سے اشارہ کر کے قرآن نے کئی حقیقتیں واضح کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت دونوں میں جو برگزیدگی بخشی وہ، جیسا کہ آیت ۱۲۴ میں اشارہ ہو چکا ہے، ان کی ان جان بازیوں اور قربانیوں کا صلہ ہے جو انھوں نے رب کی رضا طلبی کی راہ میں کیں۔ یہ عظمت ان کو مفت میں نہیں حاصل ہوئی جس طرح یہود اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو کامل سپردگی اور کامل حوالگی یعنی اسلام کا حکم ہوا تھا اور انھوں نے اپنے قول و عمل سے اسی اسلام کا مظاہرہ کیا نہ کہ یہودیت یا نصرانیت کا جیسا کہ یہود یا نصاریٰ گمان کرتے ہیں۔ تیسری یہ کہ اسلام کی اصل روح اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دینا ہے

یہاں تک کہ کوئی عزیز سے عزیز چیز بھی بندے کے نزدیک خدا سے زیادہ عزیز نہ رہ جائے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

تَوْصِیَہ کے معنی تعلیم و تلقین کرنے کے ہیں، عام اس سے کہ یہ تعلیم و تلقین کوئی شخص اپنی وفات کے وقت کرے یا زندگی کے کسی دوسرے مرحلہ میں۔

بِهَا میں ضمیر ملت اسلام کے لیے ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ کے لفظ سے ہوا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی وصیت

حضرت ابراہیمؑ کی اس وصیت کا ذکر اگرچہ یہود کے صحیفوں میں کہیں نہیں ملتا لیکن ظاہر ہے کہ دین کے معاملہ میں اپنی اولاد اور اپنے اتباع کو وصیت و نصیحت انبیاء علیہم السلام کی عام سنت رہی ہے۔ بنی اسرائیل و بنی اسماعیل کے عام بزرگانِ خاندان اور سردارانِ قبائل سے متعلق بھی اس طرح کی تلقین و نصیحت کی بکثرت روایات منقول ہیں۔ یہاں تک کہ تالمود میں ایک وصیت حضرت یعقوبؑ کی بھی قرآن مجید کی بیان کردہ وصیت سے ملتی جلتی موجود ہے۔ خاندانوں اور ملتوں میں اس طرح کی روایات خاندانوں کے اکابر ہی کے طرزِ عمل سے قائم ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے یہ بات بالکل قرینِ قیاس ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خود اپنے طرزِ عمل سے اپنے بعد والوں کے لیے یہ سنت چھوڑی ہو۔ رہی یہ بات کہ انھوں نے اپنی اولاد کو ملتِ اسلام کی وصیت کی تو یہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپر ان کی جو سرگزشتِ حیات بیان ہوئی ہے اس سے یہ واضح ہے کہ وہ جس ملت سے آشنا ہوئے، جس ملت کی انھوں نے دعوت دی اور اپنی عظیم قربانی سے جس ملت کی حقیقت کا انھوں نے مظاہرہ کیا، وہ اسلام ہے، تو پھر وہ اس ملت کو چھوڑ کر اپنی اولاد کو یہودیت یا نصرانیت کی تلقین کس طرح کرتے جن سے وہ سرے سے آشنا ہی نہیں ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت یعقوب کا ذکر یہاں اس خصوصیت کی وجہ سے ہوا کہ بنی اسرائیل براہ راست انھی کی اولاد تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ روایت اگر ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نیچے تین پشتوں تک برابر ملتِ اسلام ہی کی وصیت کی ہے نہ کہ یہودیت و نصرانیت کی، تو ملتِ ابراہیمی کی پیروی کے مدعیوں کے لیے پیروی کی چیز اسلام ہے یا یہودیت اور نصرانیت؟

'الدین' سے مراد

اَلدِّیْن سے مراد وہ دینِ حقیقی ہے جو شروع سے اللہ کا دین ہے یعنی اسلام۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۱۹۔ آل عمران (حقیقی دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے) ایک جگہ ارشاد ہے۔ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۸۳۔ آل عمران (کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں، حالانکہ

آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں طوعاً یا کرہاً سب اسی کے مطیع ہیں اور سب اسی کی جانب لوٹیں گے) یہی دین اللہ کا دین ہے اور یہی دین اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہمیشہ بھیجا۔ اسی دین کی پیروی اور اسی پر جینے اور مرنے کی وصیت حضرت ابراہیمؑ و حضرت یعقوبؑ نے اپنی اپنی اولاد کو فرمائی لیکن بعد میں بنی اسرائیل نے اس میں تحریف کر کے اس کا حلیہ بگاڑ ڈالا اور اس کی جگہ یہودیت و نصرانیت کے فتنے کھڑے کر دیے۔

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (پس تم نہ مرنا مگر حالتِ اسلام پر) میں یہ مضمون پوشیدہ ہے کہ اس دین کی امانت ایک بھاری امانت ہے، اس امانت کا حق تمہیں مہد سے لے کر لحد تک ادا کرنا ہے۔ اس راہ میں بڑی بڑی آزمائشیں پیش آتی ہیں اور تمہیں ان آزمائشوں کا پورے عزم و ہمت سے مقابلہ کرنا ہے، خیال رکھنا، شیطان تمہیں کسی مرحلہ میں اس مقام سے ہٹانے نہ پائے۔ تمہیں اسی کے لیے جینا اور اسی کے لیے مرنا ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰــهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۳)

حضرت یعقوبؑ کی وصیت

یہ سوال کا انداز مخاطب کو متنبہ کرنے اور تقریر کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے اختیار فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ تمہارے بزرگ آباء و اجداد یہودیت یا نصرانیت پر تھے تو کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کا آخری وقت آیا اور انھوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کے لیے بلایا ہے۔ اس وقت انھوں نے ان سے کس چیز کا اقرار لیا۔ توحید اور اسلام کا یا یہودیت اور نصرانیت کا؟ اس سوال کے بعد قرآن نے حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹوں سے سوال اور ان کے بیٹوں کا متفقہ جواب نقل کیا ہے جو صاف صاف دینِ توحید اور اسلام کے حق میں ہے۔ یہود کے لٹریچر میں بھی اس وصیت سے متعلق جو روایت ملتی ہے اس کے الفاظ اگرچہ قرآن کے الفاظ سے کچھ مختلف ہیں لیکن ان سے تائید بہرحال قرآن ہی کے بیان کی نکلتی ہے نہ کہ بنی اسرائیل کے مذکورہ دعوے کی۔ اس لیے کہ اس میں یہودیت یا نصرانیت کی طرف کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے[1]۔

---

[1] ہمارے مخدوم مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے یہود کے لٹریچر سے تلاش کر کے اس موقع پر اپنی تفسیر میں دو حوالے نقل کیے ہیں، ایک حضرت اسحاقؑ کی وصیت سے متعلق ہے، دوسرا حضرت یعقوب کی وصیت سے متعلق۔

"جب اسحاقؑ نے دیکھا کہ اس کا وقت موعود آپہنچا تو انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ میں تمہیں خدائے تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات اعلیٰ، عظیم، قیوم، عزیز ہیں۔ اور جو آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا خالق ہے کہ تم خوف اسی کا رکھنا اور عبادت اسی کی کرنا۔" گنزبرگ کی قصص یہود جلد اول ص ۴۱۲

(باقی بر ص ۳۴۶)

حضرت یعقوبؑ کی وصیت کے حوالے کی حکمت

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ قرآن نے خاص طور پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے وقتِ موت کی وصیت کا حوالہ دیا ہے جس سے کئی باتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف کہ حضرت یعقوبؑ نے یہ عہد و اقرار اپنی اولاد سے اپنے بالکل آخری لمحاتِ زندگی میں لیا ہے، اس وجہ سے یہ گمان کرنے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے بعد ان کے مسلک و مذہب میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی ہو۔ دوسری اس بات کی طرف کہ ایک شفیق و مہربان باپ، جو خدا کا ایک پیغمبر بھی ہے، اپنی اولاد سے جو عہد و اقرار اپنے بالکل آخری لمحاتِ زندگی میں لیتا ہے، اس کے اور اس کی اولاد کے درمیان سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا واقعہ وہی عہد و اقرار ہو سکتا ہے اور باوفا اولاد کا یہ سب سے بڑا اور سب سے مقدس فرض ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات کے اندر اس عہد کو نباہے، صرف ناخلف اولاد ہی اس نوعیت کے عہد و اقرار کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ تیسری یہ کہ اللہ سے ڈرنے والے اور اپنی اولاد سے سچی محبت کرنے والے ایک باپ کا زندگی میں اپنی اولاد سے متعلق آخری فریضہ یہ ہے کہ وہ مرتے دم ان کی دنیا سے زیادہ ان کی آخرت کی فکر کرے اور ان کو دینِ حق پر قائم رہنے اور اسی دین پر جینے اور مرنے کی تلقین کرے۔

وصیت اور اس کے جواب کے بعض دقیق پہلو

حضرت یعقوب علیہ السلام نے مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ (تم میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے؟) میں سوال کے لیے مَا کا لفظ استعمال کر کے سوال میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کر دی تاکہ جواب دینے والوں کے ذہن میں معبود سے متعلق اگر کوئی تردد ہو تو وہ اس سوال کے جواب میں ظاہر ہو جائے لیکن ان کے بیٹوں کا جواب واضح کرتا ہے کہ اس وقت تک ان کے ذہن میں معبود سے متعلق کوئی الجھن موجود نہیں تھی، انہوں نے نہایت واضح الفاظ میں اس کی توحید کا بھی اقرار کیا اور اسی کو سزاوارِ عبادت اور سزاوارِ اطاعت قرار دیا۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یعقوب کی اولاد نے اس موقع پر جس احساسِ فخر و اعتماد کے ساتھ حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے آبا و اجداد میں گنایا ہے، اسی فخر و اعتماد کے ساتھ انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے زمانے تک ان کی اولاد کے اندر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کے خلاف وہ تعصبات نہیں پیدا ہوئے تھے جو بعد میں پیدا ہو گئے۔

(البقرۃ ۲: ۱۳۳) "یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا، مجھے اندیشہ ہے، کہ تم میں سے کوئی بت پرستی کا میلان رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں بارہ بیٹوں نے کہا، سن اے اسرائیل! اے ہمارے باپ، ہمارا خدا وہی خدائے لم یزل ہے۔ جس طرح تیرا دل ایمان ایک خدا پر ہے۔ اسی طرح ہم سب کا دلی ایمان ایک خدا پر ہے۔"

گنزبرگ کی قصص یہود جلد ۲ صفحہ ۱۴۱

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۳۴)

خلاصۂ بحث

یہ آیت اس سلسلۂ بیان میں دو مرتبہ آئی ہے۔ ایک یہاں، پھر چند ہی آیات کے بعد پارے کے خاتمے پر جہاں یہ سلسلۂ بیان ختم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ خلاصۂ بحث ہے جو مخاطب کے سامنے رکھنا مقصود ہے۔ بتانا یہ ہے کہ تمہارا سارا فخر واعتماد اپنے باپ دادا پر رہ گیا ہے، تم سمجھتے ہو کہ تمہارے حصے کے اعمال بھی وہ انجام دیے گئے، اب تمہیں صرف ان کی نیکیوں کے پھل کھانے ہیں، تمہارے اوپر کوئی ذمہداری نہیں رہ گئی ہے۔ یہ فخر واعتماد بالکل وہم وخیال پر مبنی ہے، انھوں نے اپنے حصے کی ذمہ داریاں انجام دی ہیں اور ان ذمہ داریوں کو انجام دے کر اپنے رب کے پاس پہنچ چکے ہیں، وہ اپنی نیکیوں کا صلہ خود پائیں گے، اس کا کوئی حصہ بھی تمہیں ملنے والا نہیں ہے۔ تمہاری ذمہ داریاں تمہارے اوپر ہیں، اگر تم ان کو انجام دو گے تو ان کا صلہ پاؤ گے، ورنہ ان کی سزا بھگتو گے۔ خدا کے ہاں تم سے تمہارے آباؤ اجداد کے اعمال سے متعلق پرسش نہیں ہونی ہے بلکہ خود تمہارے اپنے اعمال سے متعلق ہونی ہے۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۱۳۵)

اسلام اصل ملتِ ابراہیم ہے

اوپر آیت ۱۱۱ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسلام کی مخالفت کے جوش میں یہود اور نصاریٰ دونوں متحد ہو کر یہ بات کہتے تھے کہ جو شخص ہدایت اور نجات کا طالب ہو وہ یہودیت اختیار کرے یا نصرانیت، یہ دونوں خدائی دین ہیں، یہ تیسرا دین، جو اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے کوئی دین نہیں ہے۔

جواب میں فرمایا۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا۔ (کہہ دو، بلکہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو یکسو تھا) 'ملت' کا لفظ یہاں حالتِ نصب میں ہے اس وجہ سے لازماً یہاں کوئی فعل محذوف ماننا پڑے گا۔ عام طور پر لوگ یہاں ماضی کا صیغہ محذوف مانتے ہیں۔ یعنی کہو ہم نے پیروی کی ملتِ ابراہیم کی۔ میں نے یہاں امر کا صیغہ محذوف مانا ہے اور ترجمہ میں اسی کا لحاظ کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں یہ جواب جیسا کہ لفظ 'قُلْ' سے واضح ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دلوایا گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بالخصوص اہل کتاب کی گمراہ کن دعوت کے جواب میں دعوت ہی کا خطاب موزوں تھا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی زبان سے اپنے ایمان واسلام کا بیان آگے والی آیت میں قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ الآیۃ کے الفاظ سے آ رہا ہے۔ اس وجہ سے اس آیت کو دعوت ہی کے مفہوم میں لینا زیادہ مناسب ہے۔ تیسری یہ کہ عربی زبان میں جب اس طرح منصوب آتا ہے تو اس کا مزاج مخاطب کو کسی بات پر ابھارنے یا اس کو کسی چیز سے ڈرانے کے موقع ومحل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جس کے لیے امر کا صیغہ زیادہ موزوں ہے۔

حنیف کا مفہوم

حَنِيفًا، حنف سے ہے جس کے اصل معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔ حنیف اس شخص کو کہتے ہیں جو

ہر طرف سے کٹ کر پوری یکسوئی کے ساتھ خدا کا ہو رہے۔ یہاں یہ لفظ ابراہیمؑ سے حال پڑا ہوا ہے، اگرچہ ابراہیمؑ حالتِ جر میں ہے اور مجرور سے حال پڑنے کے معاملہ میں اہلِ نحو بہت متردد ہیں لیکن مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر سورۂ فیل میں نہایت قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ عربی زبان میں یہ طریقہ معروف ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے حنیف کی صفت قرآن مجید نے بار بار استعمال کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب ان کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے اور ان تینوں ہی گروہوں کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ جس مذہب پر ہیں یہ حضرت ابراہیمؑ ہی کی وراثت ہے۔ قرآن مجید نے مختلف دلائل سے پہلے ان کے اس دعوے کی تردید کی۔ پھر فرمایا کہ ابراہیمؑ حنیف تھے، وہ خدا کی قائم کردہ صراطِ مستقیم — ملتِ اسلام — سے سرِ مو ادھر ادھر نہیں ہوئے، نہ وہ یہودیت اور نصرانیت کی پگڈنڈیوں کی طرف مڑے، نہ مشرکین کی ضلالتوں میں مبتلا ہوئے۔ بلکہ برابر اسلام کی اسی شاہراہ پر قائم رہے جو خدا نے کھولی تھی اور جو خدا تک پہنچانے والی واحد سیدھی راہ ہے۔

قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَمَآ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَآ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَمَآ اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ ۖ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ (١٣٦)

امتِ مسلمہ کا موقف

یہ یہود و نصاریٰ کی دعوت کہ یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے، کا مسلمانوں کی طرف سے جواب ہے کہ تم کہہ دو کہ ہم اللہ اور اللہ کی اُس ہدایت پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتری ہے اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب کی مختلف شاخوں پر ان کے انبیاء کے واسطہ سے اتری ہے اور اس ہدایت پر بھی ہمارا ایمان ہے جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی جانب سے ملی۔ ہم ان انبیا کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں۔

خدا کی شریعت اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے باب میں یہ امتِ مسلمہ یا امتِ وسط کا موقف یا بالفاظ دیگر کلمہ بیان ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امت خدا کی اتاری ہوئی کسی ہدایت کی نہ تو تردید کرتی اور نہ کسی نبی یا رسول کی تکذیب کرتی بلکہ بغیر کسی تفریق و استثنا کے سب پر ایمان رکھتی ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ خدا کے ان نبیوں اور رسولوں نے اپنی اپنی امتوں کو جو تعلیمیں دی تھیں ان کی امتوں نے ان میں یا تو ملاوٹ کر دی یا ان کے کچھ حصہ کو فراموش کر دیا، اب اس امت کو جو شریعت ملی ہے وہ خدا کی اصل ہدایت کو اس کی آخری اور مکمل شکل میں پیش کرتی ہے۔

اُسباط کا

آیت میں اَسباط کا لفظ سبط کی جمع ہے۔ اس کا لغوی مفہوم بڑھنے اور پھیلنے کا ہے۔ اسی مفہوم کے لحاظ سے ایک باپ کی اولاد اور ان کی مختلف شاخوں کے لیے اس کا استعمال ہوا اور نسلِ یعقوب کی مختلف شاخوں کے لیے تو اس کا استعمال اس قدر معروف ہے کہ معلوم ہوتا ہے انھی کے لیے وضع ہوا ہے۔

"لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ" (ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے) کا مطلب یہ ہے کہ ہم

رسولوں کے درمیان تفریق

یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں کرتے کہ ان میں سے کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں۔ اس مطلب کی وضاحت خود قرآن نے دوسری جگہ کر دی ہے۔ يُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۱۵۰۔ نساء (اور وہ چاہتے ہیں کہ تفریق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ سے کوئی راہ پیدا کریں) اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء میں سے کسی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا سب کے انکار کے ہم معنی ہے اور یہ صرف نبیوں اور نبیوں ہی میں تفریق نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول میں بھی تفریق ہے۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۱۳۷)

یہود اور نصاریٰ کے لیے نجات کی راہ

یعنی اگر یہی کلمۂ جامعہ وہ بھی قبول کر لیں، جس طرح تم تمام انبیاء اور تمام ہدایتوں پر ایمان لائے ہو اسی طرح یہ بھی ایمان لائیں تو بلاشبہ وہ راہ یاب ہوں گے۔ راہ یاب ہونے کا راستہ یہودی یا نصرانی ہونا نہیں ہے جیسا کہ یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں، بلکہ اس کا راستہ وہی ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔ یعنی تمام نبیوں اور تمام رسولوں پر بلا کسی تفریق و تعصب کے ایمان لانا۔ اگر وہ اس چیز سے انکار کرتے ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ تمہاری مخالفت کے درپے ہیں اور اتحاد و اتفاق کی راہ چھوڑ کر یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے خلاف اپنی ایک الگ پارٹی کھڑی رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو انھیں ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر چلنے دو، ان کے مقابلہ کے لیے تمہاری طرف سے اللہ کافی ہے۔ آخر میں اپنی صفات میں سے سمیع و علیم کا حوالہ دینے کا مقصد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلانا ہے کہ تمہاری مخالفت میں یہ جو سازشیں اور ریشہ دوانیاں بھی کریں تم ان سے مطلق ہراساں نہ ہو، جو خدا تمہاری طرف سے ان سے لڑنے کھڑا ہوا ہے وہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ (۱۳۸)

یہود و نصاریٰ کو دعوت

یہود و نصاریٰ کو مخاطب کر کے دعوت دی گئی ہے کہ اگر اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہو تو یہودیت و نصرانیت کو چھوڑ کر یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ یہ کلمۂ جامعہ جس کا اوپر ذکر گزرا، اپنے اندر اللہ کی تمام ہدایتوں اور اس کے تمام نبیوں اور تمام رسولوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہی کلمہ ہے جس سے زندگی پر خدا کا اصلی رنگ چڑھتا ہے، پس اگر زندگی کو خدا کے رنگ میں رنگنا ہے تو اس رنگ میں رنگو، اس رنگ سے بڑھ کر کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟ اس میں یہود و نصاریٰ کے بپتسمہ کی طرف ایک تعریض بھی ہے اور بغیر کسی فعل کے لفظ صبغہ کا منصوب ہونا ہمارے نزدیک اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کوئی ایسا صیغہ محذوف مانا جائے جو ابھارنے اور جوش دلانے کے مضمون پر مشتمل ہو۔

قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ (۱۳۹)

یہود و نصاریٰ سے اظہارِ برات

یعنی اگر اس کلمہ جامعہ کو نہیں مانتے جو تمام نبیوں اور رسولوں اور اللہ کی اتاری ہوئی تمام ہدایتوں پر ایمان اور اللہ ہی کی بندگی و اطاعت کے اقرار پر مشتمل ہے، بلکہ اس بات پر اڑ گئے ہیں کہ خدا کے بعض نبیوں کو مانیں گے بعض کو نہیں مانیں گے، اس کی بعض ہدایتوں کو قبول کریں گے، بعض کو نہیں قبول کریں گے درآنحالیکہ یہ تمام انبیا و رسل خدا ہی کے بھیجے ہوئے اور یہ ساری ہدایتیں اسی کی نازل کی ہوئی ہیں تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ خود خدا کے بارے میں تم سے جھگڑ رہے ہیں، گویا ان کا خدا کوئی اور ہے اور تمہارا خدا کوئی اور، حالانکہ تمہارا اور ان کا رب ایک ہی ہے۔ اگر انھوں نے فی الواقع بات اس حد تک بڑھا دی ہے کہ اپنا خدا بھی الگ بنا لیا ہے تو اب ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو بلکہ اب یہ بحث و گفتگو بالکل ختم کر کے صاف صاف کہہ دو کہ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ۔ یعنی اب ہم تمہارے ساتھ کوئی بحث و مناظرہ کرنا بالکل لاحاصل سمجھتے ہیں۔ جب تم خدا کے بارے میں بھی یکسو نہیں ہو تو ہم تم سے کوئی بحث کرنے کے بجائے صرف یہ واضح کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ ہم تو خالص اپنے رب ہی کے لیے ہیں۔

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصٰرٰى قُلْ ءَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللّٰهُ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۱۴۰)

یہ یہود و نصاریٰ سے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کے باب میں ان کے دعوے کو پھر دہرانے کا مطالبہ بطور اتمامِ حجت کے کیا ہے۔ یعنی کیا فی الواقع تم یہ سنگین بات کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کے اخلاف یہودی یا نصرانی تھے؛ پھر سرزنش کے انداز میں سوال کرایا ہے کہ ان لوگوں کے مذہب و عقیدہ کا حال تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؛ پھر بانداز حسرت و افسوس فرمایا کہ ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو چھپائیں، یعنی تورات موجود ہے اس میں ان لوگوں کے مذہب و عقیدہ کی تفصیلات موجود ہیں، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے زمانوں میں یہودیت اور نصرانیت کا کہیں نام و نشان بھی پایا نہیں جاتا تھا۔ یہ نام تو تم نے ان کے صدیوں بعد گھڑے ہیں۔ خدا نے ہمیشہ اپنے نبیوں اور رسولوں پر وہی دین اتارا ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس کے بعد نہایت سخت دھمکی کے انداز میں فرمایا کہ یہ اللہ کے دین کے خلاف جو شرارتیں تم کر رہے ہو، خدا ان سے بے خبر نہیں ہے، اس کا انجام تمہارے سامنے آئے گا۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۴۱)

بعینہٖ یہی آیت اوپر بھی گزر چکی ہے۔ جس سیاق میں یہ اوپر آئی ہے اسی سیاق میں یہاں بھی آئی ہے۔

وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیت ۱۲۴۔

۴۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات کی آیت ۱۲۹ کی وضاحت اگرچہ بقدرِ ضرورت ہم اوپر کر آئے ہیں، لیکن چونکہ اس کا تعلق براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی سے ہے جن کے بارے میں منکرین سنت نے اس زمانے میں بعض بہت بے ہودہ سوالات اٹھا دیے ہیں اس وجہ سے ہم اس آیت پر یہاں مزید روشنی ڈالیں گے۔

منکرین سنت کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی ذمہ داری بحیثیت پیغمبر کے صرف یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ پر جو وحی نازل فرمائے آپ وہ لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد بحیثیت رسولؐ کے آپؐ کا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر کوئی ذمہ داری ہی ہے اور نہ وحی الٰہی (یا بالفاظِ دیگر قرآن) کے سوا آپ کے کسی قول یا فعل کی کوئی مستقل شرعی اہمیت ہی ہے۔ ہمارے نزدیک منکرینِ سنت کے اس دعوے کی تردید کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت ہی کافی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کی جو تفصیل کی گئی ہے اس میں صرف لوگوں کو قرآن سنا دینے ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ متعدد دوسری چیزوں کا بھی ذکر ہے اور اس آیت سے واضح ہے کہ ان چیزوں کا ذکر بھی آپ کے فرائض نبوت ہی کی حیثیت سے ہوا ہے۔ آیت پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ فرمایا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۲۹۔ بقرہ)

اے ہمارے رب، ان میں بھیجیو ایک رسول انھی میں سے جو ان کو پڑھ کر سنائے تیری آیتیں اور ان کو تعلیم دے کتاب اور حکمت کی اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ اس دعا کے الفاظ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے فرمائی تھی۔ اسی دعا کے مطابق جب آنحضرتؐ کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب پر اپنے اس احسانِ عظیم کا اظہار یوں فرمایا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۲۔ جمعہ)

وہی خدا ہے جس نے بھیجا امیوں (بنی اسماعیل) میں ایک رسول انھی میں سے جو ان کو پڑھ کر سناتا ہے اس کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن صفات کے

پیغمبر کے لیے دعا کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعینہٖ انھیں صفات کے ساتھ مبعوث ہوئے اور آپ نے امیوں کے اندر عملاً وہ سارے کام انجام دیے بھی جن کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی تھی۔

ان دونوں ہی مقامات میں جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض کا تعلق ہے ان کے بیان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف یہ کہ اوپر والی آیت میں تزکیہ کا ذکر سب کے آخر میں ہے اور دوسری آیت میں تعلیم کتاب وحکمت سے پہلے لیکن تلاوتِ آیات کے بعد۔ یہ فرق کوئی خاص اہمیت رکھنے والا فرق نہیں۔ تزکیہ کے مقدم و مؤخر ہونے کی وجہ ایک دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں[ل] کہ تزکیہ تمام دین و شریعت کی غایت اور بعثتِ انبیا کا اصل مقصود ہے اور جو چیز کسی کام میں غایت و مقصود کی حیثیت رکھتی ہے وہ عمل میں اگرچہ مؤخر ہوتی ہے لیکن ارادہ میں مقدم ہوتی ہے اس وجہ سے اصل اسکیم میں اس کا ذکر مقدم بھی ہو سکتا ہے اور مؤخر بھی۔ چنانچہ اسی اعتبار سے تزکیہ کا ذکر ایک آیت میں مقدم ہوا ہے دوسری میں مؤخر۔ اس ترتیب کے فرق کے علاوہ دوسری ساری باتیں دونوں آیتوں میں بالکل مشترک ہیں

نبی صلعم کے فرائض — اور ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل فرائض بتائے گئے ہیں۔

۱۔ تلاوتِ آیات

۲۔ تعلیم کتاب وحکمت

۳۔ تزکیہ

تلاوت آیات — ان میں سے جہاں تک پہلی چیز — تلاوتِ آیات — کا تعلق ہے، ہم بلا کسی بحث و نزاع کے تسلیم کیے لیتے ہیں کہ اس سے مراد لوگوں کو قرآن مجید سنانا ہی ہے۔ دین و دانش دونوں ہی سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ خدا کے ایک رسول کا اولین فریضہ یہی ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے بندوں تک اس کی وحی کو پہنچائے لیکن اس تلاوت کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اس طرح نہیں ہوئی ہے کہ لوگوں کو پوری کتاب بیک دفعہ سنا دی گئی ہو بلکہ یہ ۲۳ سال کی وسیع و طویل مدت میں تھوڑی تھوڑی کر کے اتاری گئی اور اسی تدریج کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سبقاً سبقاً اس کی تعلیم دی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب کوئی سہل اور سپاٹ کتاب نہیں ہے بلکہ یہ نہایت گہرے علوم و معارف اور اعلیٰ اسرار و حقائق کی کتاب ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے یہ ضروری ہوا کہ یہ سبق سبق کر کے پڑھائی جائے تاکہ لوگوں کی اس کے خزانوں تک رسائی ہو سکے۔ اس حقیقت کو قرآن نے یوں واضح کیا ہے وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ (۱۰۶ - بنی اسرائیل) اور ہم نے اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ تو لوگوں کو اس کو وقفہ وقفہ کے ساتھ سنائے۔

[ل] اس نکتہ کی وضاحت کے لیے ہماری کتاب "تزکیہ نفس" کی فصل اول ملاحظہ ہو۔

تعلیم کتاب و حکمت

قرآن حکیم کی مذکورہ بالا خصوصیت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ایک تاری کی طرح صرف سنا دینے ہی پر اکتفا نہ فرمائیں بلکہ ایک معلم کی طرح پوری دلسوزی اور پوری شفقت کے ساتھ لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیں۔ چنانچہ اسی بنا پر تلاوت کے ساتھ ساتھ آپؐ کا دوسرا فرض تعلیم کتاب بتایا گیا۔ یہ تعلیم کتاب کا فریضہ آپ کے فرائض نبوت ہی کا ایک جزو اور آپ کا معلم ہونا آپؐ کے منصب رسالت ہی کا ایک پہلو ہے۔ اس وجہ سے اپنی اس حیثیت میں آپ نے جو کچھ لوگوں کو سکھایا اور بتایا اس کو آپ کے فرائض نبوت سے نہ تو خارج کیا جا سکتا اور نہ اس کا درجہ اصل کتاب کے مقابل میں گرایا ہی جا سکتا۔

اب غور فرمائیے کہ اس تعلیم کے تقاضے کیا کیا ہو سکتے ہیں؟

اس کا ایک بالکل ابتدائی تقاضا تو یہ ہے کہ قرآن میں جو شرعی اصطلاحات مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صیام، طواف، عمرہ، نکاح، طلاق وغیرہ استعمال ہوئی ہیں لیکن ان کی عملی شکلیں واضح نہیں کی گئی ہیں ان کو آپ اچھی طرح لوگوں پر واضح کر دیں تاکہ لوگ عملی زندگی میں ان کو اختیار کر سکیں اور ان کے مختلف اجزاء کا دین میں جو مقام ہے اس کو متعین کر سکیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن میں فکر و عمل کی تصحیح کے جو اصول دیے گئے ہیں ان کے لوازم و تضمنات کے ضروری گوشے واضح کر دیے جائیں تاکہ ان ابواب میں مزید رہنمائی حاصل کرنے کے لیے وہ روشنی کے میناروں کا کام دیں۔

اسی طرح ایک چیز یہ بھی ہے کہ قرآن میں جو احکامِ شریعت دیے گئے ہیں ان کی حیثیت صرف اصولی احکام کی ہے۔ ان میں سے ہر باب کے تحت بے شمار صورتیں ایسی آتی ہیں جن میں احکام کا تعین معلم کی رہنمائی اور اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اجتہاد کے لیے امت کو بہترین رہنمائی ان مثالوں ہی سے مل سکتی تھی جو اس کتاب کے معصوم معلم نے اپنے اجتہاد سے قائم کیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن اجتماعی زندگی کا ایک نظام بھی پیش کرتا ہے لیکن اس کے صرف چاروں گوشے متعین کر دینے والے اصول دے کر اس کی جزئیات و تفصیلات اور اس کے عملی ڈھانچے کے معاملہ کو معلم کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس چیز کو بھی لوگوں نے حضورؐ ہی کی تعلیم سے سیکھا۔

ان کے علاوہ ایک اہم چیز یہ بھی ہے کہ زیر بحث آیت میں صرف تعلیم کتاب ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ تعلیم حکمت کا بھی ذکر ہے۔ تعلیم حکمت تعلیم شریعت سے بہت وسیع چیز ہے۔ اس سے مراد، جیسا کہ اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں، وہ دانش و بینش اور وہ بصیرت و معرفت ہے جو زندگی کے ان بعید گوشوں میں بھی انسان کی رہنمائی کرتی ہے جہاں رہنمائی کرنے والی اس کے سامنے کوئی اور روشنی نہیں ہوتی۔

اب غور کیجیے کہ یہ ساری باتیں تعلیم کے تقاضوں میں سے ہیں یا نہیں؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ان ساری چیزوں کی تعلیم کے لیے بحیثیت ایک خدائی معلم کے مامور تھے یا نہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا جواب اثبات ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے تو غور کیجیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس حیثیت میں جو کچھ کہا اور کیا ہے اس کو آپ کے فرائض نبوت کے دائرے سے الگ کس طرح کیا جا سکتا ہے اور اس کی اہمیت کو گھٹایا کس طرح جا سکتا ہے؟ اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ احادیث میں ان چیزوں کے سوا اور کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیتِ معلم کتاب و حکمت ہونے کے بتائی ہیں یا ان پر عمل کر کے دکھایا ہے؟

اسی طرح اب تزکیہ پر غور کیجیے۔ تزکیہ کا عمل ظاہر ہے کہ تعلیم سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور وسیع الاطراف ہے۔ اوپر ہم واضح کر آئے ہیں کہ اس لفظ میں پاک صاف کرنے اور نشوونما دینے، دونوں کا مفہوم شامل ہے۔ یہ بہ یک وقت علمی بھی ہے اور عملی بھی، ظاہری بھی ہے باطنی بھی، مادی اور جسمانی بھی ہے اور عقلی و روحانی بھی، نیز یہ انفرادی بھی ہے اور سماجی و اجتماعی بھی۔ مختصراً چند بنیادی تقاضے اس کے بھی سامنے رکھ لیجیے۔

اس کا ایک ضروری تقاضا تو یہ ہے کہ لوگوں کے اذہان، اعمال اور اخلاق پر خورد بینی نگاہ ڈال کر ان جراثیم سے ان کو پاک کیا جائے جو روحانی اور اخلاقی بیماریوں کے سبب بنتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے اندر ان نیکیوں کی تخم ریزی کی جائے جو انسان کے ظاہر و باطن کو سنوارتی اور اس کے عادات و خصائل کو مہذب بناتی ہیں۔

اس کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ ہر خوبی ان کے اندر جڑ پکڑ جائے اور ہر برائی کے خلاف طبیعتوں میں نفرت بیٹھ جائے۔

اس کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اس تعلیم و تربیت سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے جو تزکیہ نفوس کے لیے ایک وسیع تربیت گاہ کا کام دینے لگ جائے، جو شخص بھی اس میں اٹھے اسی ماحول کے اثرات لیے ہوئے اٹھے اور جو شخص بھی اس کے اندر داخل ہو جائے اس پر اسی کا رنگ چڑھ جائے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ خیال بڑا مغالطہ انگیز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضۂ منصبی بحیثیت رسول کے صرف یہ تھا کہ آپ لوگوں کو قرآن پہنچا دیں۔ قرآن کا پہنچا دینا آپ کے فرائض منصبی کا صرف ایک جزو تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ آپ ایک معلم کی طرح لوگوں کو اس قرآن کی تعلیم دیں، اس کے مضمرات و تضمنات، اس کے اجمالات و اشارات اور اس کے اسرار و حقائق لوگوں پر واضح کر دیں، اس کے عجائب حکمت کے خزانوں تک لوگوں کی رہبری فرمائیں۔ اسی طرح آپ کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ آپ قرآنی حکمت کی روشنی میں افراد اور معاشرہ کی تربیت کے اصول و فروع بھی متعین فرمائیں اور ان اصولوں کے مطابق لوگوں کا تزکیہ بھی کریں۔

یہ سارے کام آپ کے فرائضِ نبوت میں شامل تھے۔ اس وجہ سے ان مقاصد کے تحت آپ نے جو کچھ بتایا یا جو کچھ کیا اس سب کو امت نے اسی طرح واجب التعمیل سمجھا جس طرح قرآن کو سمجھا اور اسی اہمیت کے ساتھ اس کی حفاظت اور اس کے نقل و روایت کا اہتمام کیا۔ اس کے کسی جزو کے متعلق یہ سوال تو اٹھایا جا سکتا ہے کہ اس کا انتساب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پوری صحت کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں لیکن اس کو دین و شریعت سمجھنے سے انکار کرنا خود قرآن مجید کے انکار کے ہم معنی ہے۔

۵۰۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۴۲-۱۶۲

منصبِ امامت سے یہود کی معزولی کے اسباب و وجوہ کی تفصیل اس مجموعہ آیات پر ختم ہو رہی ہے۔ اب گویا ان کو معزول کر کے ایک نئی امت کے قیام کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ یہ امت امتِ وسط ہے یعنی یہ اس صراطِ مستقیم پر قائم ہے جو دینِ حق کی اصل خدائی شاہراہ ہے۔ اس کی ملت، ملتِ ابراہیم اور اس کا قبلہ، قبلۂ ابراہیمی بیت اللہ الحرام ہے۔ اس کا فریضۂ منصبی یہ ہے کہ جس طرح پیغمبرؐ نے اس کے سامنے اللہ کے اصلی دین کی گواہی دی ہے اسی طرح یہ خلقِ خدا کے سامنے اللہ کے دین کی شہادت دینے والی ہو گی۔

اِن آیات کے زمانۂ نزول تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان نمازوں میں بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے۔ اب ملتِ ابراہیمی کے تعلق سے ضروری ہوا کہ اس امت کا قبلہ مسجد حرام ہو۔ اس وجہ سے تحویلِ قبلہ کا حکم ہوا۔ پھر اس ردِ عمل کی تفصیلات بیان ہوئیں جو اس واقعہ کا یہود اور مسلمانوں کے بعض گروہوں پر ہوا اور ساتھ ہی تحویلِ قبلہ کی حکمتیں اور قبلہ سے متعلق وہ ضروری ہدایات بیان ہوئیں جو مسلمانوں کو قبلہ کے باب میں جادۂ مستقیم پر استوار رکھنے کے لیے ضروری تھیں اور جن کا اہتمام نہ رکھنے کی وجہ سے یہود اور نصاریٰ اصل قبلہ سے منحرف ہو گئے۔

پھر ایک مستقل امت کی حیثیت سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ تحویلِ قبلہ کے بعد اب تم یہود و نصاریٰ سے الگ ایک مستقل امت کی حیثیت سے ممتاز ہو گئے۔ جس طرح تمہارا رسول ایک الگ رسول ہے جو ان تمام صفات کا مظہر ہے جن کے لیے ابراہیمؑ نے دعا کی تھی اسی طرح تمہارا قبلہ ابراہیمی قبلہ ہے۔ اب تم ان یہود سے ذرا بھی نہ ڈرو۔ صرف اللہ ہی سے ڈرو تاکہ تمہیں اللہ کے دینِ کامل کی نعمت نصیب ہو اور تمہارے لیے شریعتِ الٰہی کی راہیں کھلیں۔ تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ میری شکر گزاری کرتے رہنا، ناشکری نہ کرنا۔

اس کے بعد ان متوقع خطرات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ایک مستقل امت کی حیثیت سے نمایاں ہونے کے بعد مخالفین و معاندین کی طرف سے پیش آ سکتے ہیں اور ان خطرات کے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو جن تیاریوں اور جن ایمانی و اخلاقی اسلحہ سے مسلح ہونے کی ضرورت ہے، ان کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

آخر میں خانہ کعبہ کے تعلق سے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ خانہ کعبہ کی طرح صفا اور مروہ بھی اللہ کے شعائر میں داخل ہیں اس لیے کہ یہی مروہ ہے جو اصل قربان گاہ ہے، لیکن یہود نے تحریف کے ذریعہ سے ان نشاناتِ راہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق اس گھر سے بالکل کاٹ دیں۔ یہود اپنی اس شرارت کے سبب سے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہو۔

اس تمہید کے بعد اب آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۴۲-۱۴۷ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا
عَلَيْهَا ۚ قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا
شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۗ وَمَا
جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ
مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ
هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ
لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ
قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَ
حَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا
الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ
آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُم
بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ

مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٥﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ وقف لازم
الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا
مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وقف منزل
فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾ ع وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا ع ١٧ ١
الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى وقف النبي صلی اللہ علیہ وسلم
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٤٨﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ
شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۤ اِلَّا الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۤ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۤ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ
وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥٠﴾ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ
مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ معانقة ٣
وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿١٥٢﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ ع ١٨ ٢
الصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٥٣﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿١٥٤﴾
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ

وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ
صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ
الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ
شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ
وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ
يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا
وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ
اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا
يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

ترجمۂ آیات ۱۴۲-۱۶۲

اب جو بے وقوف لوگ ہیں وہ کہیں گے کہ ان لوگوں کو اس قبلہ سے جس پر یہ پہلے تھے کس چیز نے رُوگرداں کر دیا۔ کہہ دو مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔ اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو صرف اس لیے ٹھہرایا تھا کہ ہم الگ کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرنے والے ہیں

ان لوگوں سے جو پلیٹھ پیچھے پھر جانے والے ہیں۔ بے شک یہ بات بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ ہدایت نصیب کرے۔ اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمھارے ایمان کو ضائع کرنا چاہے، اللہ تو لوگوں کے ساتھ بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ ۱۴۲-۱۴۳

ہم آسمان کی طرف تمھارے رُخ کی گردش دیکھتے رہے ہیں، سو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم تمھیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں جس کو تم پسند کرتے ہو۔ تو تم اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے رخ اسی کی طرف کرو۔ جن لوگوں کو کتاب ملی وہ جانتے ہیں کہ یہی ان کے رب کی جانب سے حق ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اور اگر تم اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں بھی پیش کر دو تو بھی یہ تمھارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے۔ اور اگر تم اس علم کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے اُن کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو بلاشبہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ جن کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ البتہ ان میں ایک گروہ ہے جو جانتے بوجھتے حق کو چھپاتا ہے۔ یہی حق ہے تمھارے رب کی جانب سے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بن جانا۔ ۱۴۴-۱۴۷

ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رخ کرنے والا ہے تو تم نیکیوں کی راہ میں سبقت کرو۔ جہاں کہیں بھی تم ہو گے، اللہ تم سب کو جمع کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۴۸

اور جہاں کہیں سے بھی تم نکلو تو اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو۔ بے شک یہی

حق ہے تمہارے رب کی جانب سے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۱۴۹
اور جہاں کہیں سے بھی نکلو تو اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو۔ اور جہاں کہیں بھی
تم ہو تو اپنے رخ اسی کی جانب کرو تاکہ لوگوں کے لیے تمہارے خلاف کوئی حجت باقی نہ
رہے، مگر جو ان میں سے ظالم ہیں تو ان سے نہ ڈرو مجھی سے ڈرو۔ اور تاکہ میں اپنی نعمت
تم پر تمام کروں اور تاکہ تم راہ یاب ہو۔ چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے
جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا
ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ تو تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں
یاد رکھوں گا۔ میری شکر گزاری کرتے رہنا، میری ناشکری نہ کرنا۔ ۱۵۰-۱۵۲

اے ایمان والو، ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو۔ بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔ بے شک ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف، بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور ان ثابت قدموں کو خوش خبری سنا دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں ہیں اور رحمت، اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں۔ ۱۵۲-۱۵۷

بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں تو جو بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ ان کا طواف کرے۔ اور جس نے کوئی نیکی خوش دلی کے ساتھ کی تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری اتاری ہوئی

کھلی کھلی نشانیوں اور ہماری ہدایت کو، بعد اس کے کہ ہم نے وہ کتاب میں کھول کر لوگوں کے لیے بیان کر دی تھیں تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور جن پر لعنت کرنے والے لعنت کریں گے۔ ۱۵۸-۱۵۹

البتہ جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کر لی اور واضح طور پر بیان کر دیا تو ان کی توبہ میں قبول کروں گا۔ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مرگئے ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی۔ ۱۶۰-۱۶۲

۱۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۱۴۲)

یہود کو بے وقوف قرار دینے کی وجہ

سُفَہَاء سفیہ کی جمع ہے جس کے معنی نادان اور بے وقوف کے ہیں۔ یہاں اس سے اشارہ یہود کی طرف ہے۔ یہود کے بے وقوف قرار دینے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم آیت وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ ۱۳۰۔ بقرہ (اور ابراہیم کی ملت سے اس کے سوا کون بے رغبت ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے) میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہود ایک طرف تو ملت ابراہیم کے پیرو ہونے کے مدعی تھے دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم و دعوت کے سخت دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے حالانکہ آپ اصل ملتِ ابراہیمی کے داعی بن کر تشریف لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی الٹی حرکت نادان اور بے وقوف لوگ ہی کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کے لیے سفہا کا لفظ استعمال کیا۔

تحویل قبلہ کے متوقع ردعمل کی طرف پہلے سے اشارہ

یہ تمہید ہے تحویل قبلہ کے اس حکم کی جس کا ذکر آگے دو آیتوں کے بعد آ رہا ہے۔ اس تمہید میں اشارہ ہے اس ردعمل کی طرف جو اس حکم کا یہود اور منافقین پر ہوگا۔ اصل حکم سے پہلے اس کے ردِ عمل کے بیان کرنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم کوئی معمولی حکم نہیں تھا، اسلام کے مخالفوں اور اس کے حامیوں دونوں ہی کے اندر یہ خاصی ہلچل پیدا کر دینے والا حکم تھا۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس حکم سے پہلے اس

کے متوقع ردِ عمل کے لیے ذہنوں کو تیار کر دیا جائے۔ دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ اس سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر ہر قاری کے سامنے آچکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کا مذہب اسلام تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ میں عبادتِ الٰہی کے لیے جو مرکز تعمیر کیا وہ ان کی ساری ہی ذریت کا مرکز اور قبلہ تھا۔ یہاں تک کہ بیت المقدس بھی جب تعمیر ہوا تو اس کی تعمیر بھی اس طرح ہوئی کہ بنی اسرائیل کی قربانیوں کا رُخ خانہ کعبہ کی طرف ہو۔ یہ تمام باتیں بالکل غیر مبہم طور پر اس بات کو ظاہر کر رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ایک بالکل عارضی معاملہ تھا اور اب وقت آگیا ہے کہ آپ کو بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم دے دیا جائے۔ اس وجہ سے یہ تمہید ایک ایسے واقعہ کی تمہید تھی جس کے واقع ہونے کا انتظار یہود و نصاریٰ کو بھی تھا اور مسلمانوں کو بھی۔

تحویلِ قبلہ پر یہود کا اعتراض

مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا (ان کو ان کے اس قبلہ سے کس چیز نے ہٹا دیا جس پر وہ اب تک تھے) یہ تحویلِ قبلہ کے حکم پر اہلِ کتاب کے ردِ عمل کا بیان ہے کہ اب تک یہ لوگ مسلمانوں پر جو اعتراضات کرتے رہے ہیں ان کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔ اب جب قبلہ بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قرار دیا جائے گا تو یہ اس پر بھی ہنگامہ اٹھائیں گے کہ مسلمانوں نے تمام انبیاء کے قبلہ — بیت المقدس — کو جس کی طرف رُخ کر کے وہ اب تک نماز پڑھتے رہے تھے، چھوڑ کر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد یہ الگ کیوں بنائی؟

اعتراض کا جواب

قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (کہہ دو، مشرق اور مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھا دیتا ہے) یہ یہود و نصاریٰ کے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب ہے کہ تمھیں اب قبلہ سے کیا واسطہ؟ تم تو اصل قبلہ کے بجائے مشرق و مغرب کے چکر میں پھنس گئے ہو، نصاریٰ مشرق کو اپنا قبلہ قرار دے بیٹھے ہیں اور یہود مغرب کو، حالانکہ سمتوں میں سے کسی سمت کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں، اللہ تعالیٰ تو ہر سمت میں ہے، مشرق و مغرب، شمال و جنوب سب اسی کی فرمانروائی میں ہیں۔ اس کے ساتھ اگر خصوصیت ہو سکتی ہے تو کسی ایسے گھر ہی کو ہو سکتی ہے جس کو وہ مخصوص فرمائے اور قبلہ قرار دے۔ یہ خصوصیت رکھنے والا گھر ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا تعمیر کردہ گھر مکہ کا بیت اللہ ہے۔ وہی تمام اولادِ ابراہیمؑ کا قبلہ قرار پایا تھا اور اسی کو قبلہ قرار دے کر بیت المقدس کی بھی تعمیر ہوئی تھی۔ اس حقیقت کے نشانات و آثار تورات میں موجود تھے۔ لیکن تم نے تعصب کی وجہ سے یہ نشانات مٹا دیے تھے۔ لیکن تمہاری ان مخالفانہ کوششوں کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے جن کو چاہا سیدھا راستہ دکھا دیا اور اب وہ تمہارے پیدا کردہ پیچ و خم سے

نکل کر ایک صراطِ مستقیم پر چل کھڑے ہوئے ہیں۔[1]

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ كَذٰلِكَ کا اشارہ اوپر والے معاملہ کی طرف ہے یعنی جس طرح ہم نے قبلہ کے معاملہ میں یہود و نصاریٰ کے پیدا کردہ پیچ وخم اور مشرق و مغرب کے چکر سے تمھیں نکال کر صراطِ مستقیم کی طرف تمھاری رہنمائی کی، اسی طرح ہم نے تم کو یہودیت اور نصرانیت کی پگڈنڈیوں سے بچا کر دین کی بیچ شاہراہ پر قائم رہنے والی امت بنایا تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دیں اور تم خلقِ خدا پر اللہ کے دین کی گواہی دو۔

امتِ وسط

وَسَط لفظ ولد کی طرح مذکر اور مؤنث، واحد اور جمع سب کے لیے آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ شے جو دو طرفوں کے درمیان بالکل وسط میں ہو۔ یہیں سے اس کے اندر بہتر ہونے کا مفہوم پیدا ہو گیا اس لیے کہ جو شے دو کناروں کے درمیان ہوگی وہ نقطۂ توسط و اعتدال پر ہوگی اور یہ اس کے بہتر ہونے کی ایک فطری دلیل ہے۔ امتِ مسلمہ کو امتِ وسط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت ٹھیک دین کی اس بیچ شاہراہ پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لیے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کھولی ہے اور جو ابتدا سے ہدایت کی اصلی شاہراہ ہے۔ یہود و نصاریٰ اللہ کے نبیوں میں تفریق کر کے اس شاہراہ سے ہٹ گئے اور انھوں نے یہودیت و نصرانیت کی پگ ڈنڈیاں نکال لیں، اسی طرح وہ اصل قبلہ سے منحرف ہو کر مشرق و مغرب کے جھگڑوں میں پڑ گئے۔ لیکن یہ امت ان کج پیچ کی راہوں میں بھٹکنے کے بجائے دین کی اصلی راہ پر قائم ہے۔ اس کا کلمہ تفریق کے بجائے وحدت کا کلمہ ہے جس کا حوالہ اوپر ان الفاظ میں گزر چکا ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا	تم کہہ دو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز
وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ	پر جو ہم پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو ابراہیم،
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ	اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتاری
وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ	گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰ اور عیسیٰ اور
النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ	دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی۔
اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ	ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور
(۱۳۶ - بقرہ)	ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

---

[1] یہاں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے آیات ۱۱۵ اور ۱۲۵ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اسی طرح اس امت نے قبلہ کے معاملہ میں مشرق و مغرب کے جھگڑے میں پڑنے کے بجائے اس قبلہ ابراہیمی کی پیروی کی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد مبارک سے برابر تمام نبیوں اور رسولوں کا قبلہ رہا، چنانچہ بیت المقدس کی تعمیر بھی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے اسی کو قبلہ قرار دے کر ہوئی لیکن یہود نے بربنائے تعصب اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی۔

دین کے معاملہ میں امت مسلمہ کی یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے قرآن میں دوسری جگہ اس امت کو خیر امت (بہترین امت) کہا گیا ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ جو چیز ٹھیک نقطۂ اعتدال و توسط پر ہوگی وہ لازماً بہترین بھی ہوگی، یہ امت چونکہ امتِ وسط ہے اس وجہ سے یہ خیر امت بھی ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہود کا دین بہت سخت اور نصاریٰ کا دین بہت نرم ہے۔ اسلام ان دونوں کے درمیان ایک معتدل دین ہے اس وجہ سے اس دینِ معتدل کی حامل امت کو امتِ وَسَط قرار دیا گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے یہود و نصاریٰ دونوں کا دین ایک ہی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت پر تورات کی پابندی اسی طرح واجب قرار دی تھی جس طرح اس کی پابندی یہود پر واجب تھی۔ اگر انھوں نے اس سے الگ کوئی تعلیم دی ہے تو اس کی نوعیت تورات سے جدا کسی مستقل تعلیم کی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت صرف حکمتِ دین اور روحِ دین کی ہے۔ یہود اپنی دنیا پرستی کی وجہ سے دین کی اصل حقیقتوں سے ہٹ کر صرف رسوم و قیود کے غلام اور الفاظ و کلمات کے پرستار بن کے رہ گئے تھے، حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو حکمتِ دین سے آشنا کیا۔ انجیل تورات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ تورات ہی کے رموز و حقائق کی طرف ایک حکیمانہ توجہ دلاتی ہے۔

امتِ وسط کا فریضۂ منصبی

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کے گواہ بنو اور رسول تمھارے اوپر اللہ کے دین کا گواہ بنے) یہ امتِ وسط کے فریضۂ منصبی اور اس کے قیام کی ضرورت کا بیان ہے۔ اوپر کی تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو رہنمائی کے منصب پر مامور کیا تھا انھوں نے خدا کے میثاق کو توڑ دیا، اس کی شریعت میں تبدیلیاں کر دیں، اس کی صراطِ مستقیم گم کر دی، اس کے مقرر کیے ہوئے قبلہ سے منحرف ہو گئے اور جن شہادتوں کے وہ امین بنائے گئے تھے ان کو انھوں نے چھپا دیا۔ ایسے حالات میں عالمِ انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی امت برپا کرے جو خدا کی سیدھی راہ پر قائم ہو، جو اللہ کے رسول کے ذریعہ سے اصل دین کی حامل بنے اور پھر رہتی دنیا تک لوگوں کے سامنے اس دین کی گواہی دے۔

" رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو" سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شہادت علی الناس

کا جو فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسول کے تھا آپ کے بعد آپ کی امت کی طرف منتقل ہوا اور اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور، ہر ملک اور ہر زبان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے، اگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہیوں کے نتائج بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہوگی۔

ہمارے اربابِ تاویل نے عام طور پر اس شہادت کو آخرت سے متعلق مانا ہے کہ یہ امت گمراہوں کے خلاف انبیا کی تائید میں آخرت میں شہادت دے گی کہ ان گمراہوں کو اللہ کا دین پہنچ چکا تھا، اس کے باوجود انھوں نے گمراہی کی یہ روش اختیار کی۔ لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص و تحدید کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس امت کو شہداء اللہ ہونے کا یہ مرتبہ آخرت میں بھی حاصل ہوگا لیکن آخرت میں یہ مرتبہ اسی وجہ سے حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اس کو اس منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔ جو امت اس دنیا میں دینِ حق کی گواہ ہے، ظاہر ہے کہ وہی آخرت میں بھی اس پوزیشن میں ہوگی کہ گواہی دے کہ لوگوں کو اللہ کا دین ٹھیک ٹھیک پہنچا یا نہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ

جَعَلَ کا مفہوم

جَعَلَ کا لفظ وسیع معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنی جائز ٹھہرانے اور مشروع قرار دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً مَا جَعَلَ اللَّهُ مِن بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ ۱۰۳- مائدہ (اور خدا نے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ کو مشروع نہیں کیا)۔

عَلِمَ یَعْلَمُ کا مفہوم

عَلِمَ یَعْلَمُ کے معنی جس طرح جان لینے اور معین کر لینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی ممیز کر دینے، چھانٹ کر الگ کر دینے اور ظاہر کر دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ ۳۱- محمد (اور ہم تمہیں جانچیں گے یہاں تک کہ ظاہر کر دیں تمہارے اندر سے ان لوگوں کو جو جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں) أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ ۱۴۲- آل عمران (کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تمہارے اندر سے ان لوگوں کو ظاہر نہیں کیا جنھوں نے جہاد کیا)۔

بیت المقدس کو عارضی طور پر قبلہ قرار دینے کی حکمت

مطلب یہ ہے کہ یہ جو تمہیں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی گئی تھی تو اس لیے نہیں کہ یہی تمہارا مستقل قبلہ ہے بلکہ یہ اجازت ایک عارضی اور وقتی اجازت تھی اور مقصود اس اجازت سے یہ تھا کہ پھر اس قبلہ کی تبدیلی تمہارے لیے امتحان کی ایک کسوٹی بنے اور اس کے ذریعہ سے یہ ظاہر کر دیا جائے کہ تمہارے اندر کتنے آدمی ایسے ہیں جو فی الواقع رسول کے پیرو ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو رسول سے زیادہ اپنی پچھلی روایات کے پرستار ہیں اور وہ پھر مڑ کر اپنے قدیم دین ہی کی طرف چلے جاتے ہیں۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نماز کا حکم ہوا تو آپ نے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا۔ شروع شروع میں حضور کا طریقہ یہ تھا کہ جن معاملات میں آپ کے سامنے وحی الٰہی کی کوئی واضح رہنمائی نہ ہوتی ان میں آپ پچھلے انبیاء کے طریقہ پر عمل کرتے چنانچہ قبلہ کے معاملے میں بھی آپؐ نے یہی کیا۔

جب تک آپ مکہ میں رہے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نمازوں کے لیے اس طرح کھڑے ہوتے کہ بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں سامنے ہوتے لیکن جب آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو سمت کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا امکان باقی نہیں رہا۔ قدرتی طور پر خانہ کعبہ سے یہ انقطاع آپ کے قلب مبارک پر شاق گزرا اور آپ کو اس بارے میں وحی الٰہی کا انتظار رہنے لگا۔ لیکن حکمتِ الٰہی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ ابھی کچھ عرصہ تک آپ اور بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھیں۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بھی ۱۶، ۱۷ مہینے آپ بیت المقدس ہی کی طرف نمازیں پڑھتے رہے، یہاں تک کہ غزوہ بدر سے کم و بیش دو ماہ پہلے قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے اتنے عرصہ تک بیت المقدس کے قبلہ پر قائم رکھنے اور پھر اس سے ہٹا کر خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دینے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اس طرح اس نے مسلمانوں کو ایک امتحان میں ڈال کر ان کے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کیا ہے تاکہ مدینہ آنے کے بعد جو خام قسم کے عناصر اہل کتاب میں سے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں وہ اس امتحان سے گزر کر یا تو اسلام کی طرف یک سو ہو جائیں یا چھٹ کر ان سے الگ ہو جائیں۔ دین میں آزمائشوں کی حکمت

وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ۔ یعنی یہ قبلہ کی تبدیلی ہے تو ایک سخت امتحان اس لیے کہ اس طرح کے معاملات میں جن کا تعلق دین سے ہو اور دین کی بھی ایک بنیادی چیز سے، آدمی فطری طور پر جذباتی اور روایت پرست بن جایا کرتا ہے، ان میں کوئی معمولی سی تبدیلی بھی اس کو سخت گراں گزرتی ہے، لیکن دین میں اصلی چیز جس کا وزن ہے وہ خدا اور رسول کی کامل اطاعت اور اخلاص ہے۔ اس وجہ سے ان تعصبات پر جو اخلاص کے لیے حجاب بنتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیا وقتاً فوقتاً ضرب لگاتے رہے ہیں۔ انبیا اور ادیان کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر نبی کی آمد پر امتوں کو اس قسم کے امتحانوں سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے، اسی سنت کے تقاضے سے ہر نبی کے زمانے میں دین کے رسوم و ظواہر میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں تاکہ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہو سکے۔ جو لوگ اپنے قومی اور گروہی تعصبات کے پھندوں میں گرفتار ہو چکے ہیں ان کا کھوٹ ان امتحانوں سے ظاہر ہو جاتا ہے، وہ خدا اور رسول کی ہدایت اختیار کرنے کے بجائے اپنی روایات پر اڑ جاتے ہیں لیکن جن کے اندر اخلاص کی روح موجود ہوتی ہے وہ اپنے اس اخلاص کے فیض سے اللہ کی ہدایت قبول کرنے کی توفیق پاتے ہیں ــــ چنانچہ قبلہ کی اس تبدیلی کا ردِ عمل بھی اسی طرح کا ہوا جو لوگ اپنے

پچھلے تعصبات میں لپٹے ہوئے محض کسی وقتی مصلحت کے تحت اسلام کی صفوں میں آگھسے تھے اس تبدیلی کے بعد وہ پھر پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے برعکس جو لوگ محض اللہ کی بندگی اور اس کے رسول کی اطاعت کے جذبے کے ساتھ اسلام میں آئے تھے ان کے لیے اس تبدیلی نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رحمت کے نہایت وسیع دروازے کھول دیے۔

ایک اہم سوال کا جواب

یہ بات کہ اللہ کا معاملہ یوں نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے، وہ تو لوگوں کے معاملہ میں نہایت مہربان ہے۔ یہاں ایک نہایت اہم سوال کا جواب ہے جو از خود پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب قبلہ کی تبدیلی خود قرآن کے اپنے بیان کے مطابق بھی ایک سخت امتحان ہے تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس قسم کے سخت امتحان میں کیوں ڈالنا پسند فرمایا جس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس امتحان میں ناکام رہ جانے کے سبب سے اپنے ایمان ہی کھو بیٹھیں۔ قرآن نے اس شبہ کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس طرح کے امتحانوں میں اس لیے نہیں ڈالتا کہ لوگ اپنے ایمان ضائع کر بیٹھیں بلکہ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی رأفت و رحمت کے مظہر ہیں۔ انھی امتحانوں سے بندوں کی صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں۔ انھی کے ذریعہ سے ان کی وہ قوتیں اور صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں جن کے خزانے قدرت نے ان کے اندر ودیعت کیے ہیں۔ انھی کے ذریعے سے ان کے کھرے اور کھوٹے، ان کے مخلص اور منافق اور ان کے سچے اور جھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہ امتحان نہ ہو تو اچھے اور برے، خام اور پختہ، گہرا اور سطحی میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے۔ ہر مدعی کو اس کے دعوے میں سچا ماننا پڑے اور ہر کاذب کی باتوں کی تصدیق کرنی پڑے، یہاں تک کہ آخرت میں بھی کسی کو انعام یا کسی کو سزا دینے کے لیے کوئی حجت و دلیل باقی نہ رہ جائے۔ مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کارخانۂ کائنات کا سارا حسن و جمال اور اس کی ساری حکمت و برکت اللہ تعالیٰ کی اسی سنتِ ابتلا کے اندر مضمر ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ بالکل بے حکمت اور بے مصلحت بلکہ کھلنڈرے کا ایک کھیل بن کے رہ جائے۔

زبان کا یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء میں سے رؤف اور رحیم کا حوالہ دیا ہے۔ رؤف رافت سے ہے جس کے اندر دفع شر غالب ہے اور رحیم رحمت سے ہے جس کے اندر اثباتِ خیر کا پہلو نمایاں ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی دونوں پہلو اللہ تعالیٰ کی اس سنت ابتلاء و امتحان میں ملحوظ ہیں جس کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے یعنی بندوں کو خرابیوں اور کمزوریوں سے پاک کر کے فضائل و محاسن سے آراستہ کرنا۔ یہاں ان اشارات پر ہم کفایت کرتے ہیں، آگے مختلف مقامات پر یہ سنت اللہ مختلف پہلوؤں سے زیر بحث آئے گی۔

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کو اس سیاق میں لیا ہے کہ تحویلِ قبلہ کے بعد لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ پہلے ہی قبلہ کے دوران میں وفات پا چکے ان کا کیا بنے گا۔ ان کی نمازیں قبول ہوں گی یا نہیں؟ یہ اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک نہ تو اس سوال کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ تھی اور

نہ اس کے جواب دینے کی ضرورت تھی۔ اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

عربی زبان کا ایک خاص اسلوب

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا۔ یہاں عربی زبان کا ایک خاص اسلوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے وہ یہ کہ افعالِ ناقصہ کے صیغے عموماً مضارع سے پہلے حذف کر دیے جاتے ہیں مثلاً کَانَ یَفْعَلُ میں صرف 'یفعل' کو کافی سمجھیں گے۔ کلامِ عرب اور قرآن مجید دونوں میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ چند مثالیں ہم قرآن سے پیش کرتے ہیں۔

سورۂ ہود میں ہے۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ (۱۰۹- ہود)	پس تم ان چیزوں سے شک میں نہ پڑو جن کو یہ پوجتے ہیں، یہ ان چیزوں کو نہیں پوجتے مگر اسی طرح جس طرح اس سے پہلے ان چیزوں کو ان کے باپ دادا پوجتے تھے۔

اس آیت میں دیکھیے کَمَا کَانَ یَعْبُدُ کی بجائے صرف کَمَا یَعْبُدُ فرمایا۔ کَانَ کو حذف کر دیا۔

اسی طرح سورہ زخرف میں ہے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۶-۷ زخرف)	اور ہم نے کتنے نبی بھیجے اگلوں میں، اور نہیں آتا تھا ان کے پاس کوئی نبی مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

اس میں وَمَا یَاْتِیْهِمْ دراصل وَمَا کَانَ یَاْتِیْهِمْ ہے لیکن عربی اسلوب کے مطابق کَانَ کو حذف کر دیا۔

سورۂ انعام میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۷۵- انعام)	اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے کارخانہ کا مشاہدہ کراتے تھے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ دراصل کُنَّا نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ ہے لیکن عام اسلوب کے مطابق مضارع سے پہلے کُنَّا حذف ہو گیا۔

اسی اسلوب کے مطابق آیت زیر بحث میں قَدْ نَرٰی دراصل قَدْ کُنَّا نَرٰی ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس حذف کو کھول دیا ہے اس لیے کہ اردو میں حذف کا یہ اسلوب بیان نہیں ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ ہم تمہارے چہرے کی گردش آسمانوں کی طرف دیکھتے رہے تھے کہ تمہیں تحویلِ قبلہ کے لیے شدت سے انتظار ہے تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو تم پسند کرتے ہو۔

تحویلِ قبلہ کے لیے آنحضرتؐ کے انتظار کی وجہ

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں رہے اس وقت تک تو دونوں قبلوں کو جمع کر لینا ممکن رہا لیکن مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد یہ صورت باقی نہیں رہی۔ اس وجہ سے قبلۂ ابراہیمی

سے یہ انقطاع آپ پر شاق گزرنے لگا۔ بالخصوص جب وحی الٰہی کے ذریعہ سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آپ ملتِ ابراہیم پر مبعوث ہوئے ہیں، آپ کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی، نیز حضرت ابراہیمؑ کا قبلہ ہی درحقیقت تمام اولادِ ابراہیم کا مشترک قبلہ ہے تو برابر آپ کو تحویل قبلہ کا انتظار رہنے لگا اور جیسا کہ قاعدہ ہے اگر کسی کا انتظار ذوق و شوق کے ساتھ ہو تو بار بار نگاہ دروازے کی طرف اُٹھ جاتی ہے اسی طرح آپ کی نظر بار بار اوپر آسمان کی طرف اٹھ جاتی، اس لیے کہ حضرت جبریل امین کا ظہور اسی طرف سے ہوتا تھا۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ کے لفظ میں اس فیصلہ کا اظہار ہے جو اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کے بارے میں فرمایا۔ میں نے ترجمہ میں لفظ کے اس مخفی مضمون کو کھول دیا ہے لیکن ضرورت اس پر بعض نظائر کے حوالہ کی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعض نظائر کی طرف اشارہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ دمِ تحریر میرے پاس حوالہ کی ضروری کتابیں موجود نہیں ہیں۔ ممکن ہے کتاب کی طباعت کے موقع پر اس کمی کی تلافی کر سکوں۔

تحویلِ قبلہ کے باب میں اصل حکم

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔ شطر کے معنی جہت، جانب اور طرف کے ہیں۔ مسجد حرام سے مراد وہ مسجد محترم ہے جو بیت اللہ کو اس کی ہر جہت سے ہالہ کی طرح اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ قبلہ تو دراصل بیت اللہ ہی ہے چنانچہ مسجد حرام کے اندر لوگ ہر چہار طرف سے بیت اللہ ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں لیکن باہر والوں کے لیے یہ مسجد بھی قبلہ ہی کے حکم میں داخل ہے۔ اس طرح امت کے لیے قبلہ کے معاملہ میں تھوڑی سی وسعت اور آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ جس طرح اصل قربان گاہ تو دراصل مروہ ہے لیکن اُمّت کی آسانی کے لیے اس کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی آیت ہے جس نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کی اس اجازت کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں دی گئی تھی، منسوخ کیا اور اس کی جگہ مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے ساتھ یہ جو فرمایا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو تو اپنے رخ اسی کی طرف کرو، یہ مسلمانوں کو اس غلطی سے بچانے کے لیے ہدایت دی گئی ہے جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے۔ اوپر آیت ۱۱۵ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بیت المقدس کے اندر تو بیت المقدس کو قبلہ بناتے تھے لیکن اس سے باہر نکل کر ان کا قبلہ مشرق یا مغرب بن جاتا۔ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی گمراہی سے بچانے کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ تم جہاں کہیں بھی ہو، مسجد حرام کے اندر یا باہر، نمازوں کے اوقات میں تمہارا رخ اسی معین قبلہ ہی کی طرف ہونا چاہیے۔

یہاں خطاب کی اس تبدیلی پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے جو اس آیت میں نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

خطاب کی تبدیلی کی حکمت و بلاغت

پہلے تو خطاب واحد کے صیغہ سے ہے فَوَلِّ وَجْهَكَ پھر جمع کی صورت میں فرمایا فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ اس تبدیلی کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ پہلا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہے۔ اس دوسرے خطاب نے پہلے خطاب کے اس مضمر پہلو کو واضح کر دیا کہ اگرچہ وہ خطاب بظاہر ہے تو واحد کے صیغہ سے لیکن صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نہیں ہے بلکہ اس میں پوری امت شامل ہے۔ علاوہ ازیں پہلے خطاب کے واحد کے صیغہ سے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کو تحویلِ قبلہ کے لیے جیسا کہ اوپر اشارہ ہے نہایت اضطراب تھا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ پہلے خاص طور پر آپ کو مخاطب کر کے اس تبدیلی کی بشارت دی جائے۔

اس قبلہ کا حق ہونا اہلِ کتاب پر واضح تھا

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ۔

اَنَّهٗ سے مراد یہاں مسجدِ حرام کا اس امت کے لیے قبلہ ہونا ہے۔ اس بات کا حق ہونا اور خدا کی طرف سے ہونا اہلِ کتاب پر بالکل واضح تھا، اس لیے کہ اوپر جو تفصیلات قرآن نے پیش کی ہیں ان سے مندرجہ ذیل باتیں واضح طور پر سامنے آگئی ہیں۔

ایک یہ کہ یہود کو یہ بات معلوم تھی کہ بیت اللہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کی تعمیر ہے اور یہی بیت اللہ تمام ذریتِ ابراہیم کا اصلی قبلہ رہا ہے۔

دوسری یہ کہ آخری نبی ذریتِ اسماعیلؑ میں پیدا ہوں گے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایک امتِ مسلمہ برپا کرے گا۔

تیسری یہ کہ اس ذریتِ اسماعیل کا مرکز اور قبلہ شروع سے یہی بیت اللہ رہا ہے۔

ان تمام باتوں کے اشارات و قرائن تورات میں موجود تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور آپ کے واقعاتِ زندگی سے ہر قدم پر ان اشارات و قرائن کی تصدیق ہو رہی تھی لیکن یہود اس حسد اور عناد کے سبب سے جو ان کو بنی اسماعیل اور مسلمانوں سے تھا، جانتے بوجھتے ان ساری باتوں کو چھپاتے تھے۔ ان کے اسی کتمانِ حق پر باندازِ تہدید یہ فرمایا ہے کہ "جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے" یعنی یہ اپنے اس کتمانِ حق کی قرار واقعی سزا پا کے رہیں گے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۴۵)

ایک التفات

یہ آیت بطور التفات کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہی ہے کہ قبلہ کے معاملہ میں اہلِ کتاب کا یہ رویہ کسی شک و شبہ کی بنا پر نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا، دیدہ دانستہ محض ضد و عناد اور حسد کی بنا پر ہے۔ اس وجہ سے اگر تم ان کو دنیا جہان کے تمام معجزے بھی دکھا دو جب بھی یہ تمہارے قبلہ

کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کو مطمئن کرنے والی کوئی چیز ہو سکتی ہے تو دلائل و معجزات نہیں بلکہ یہ کہ تم خود ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن جاؤ لیکن حق کے اچھی طرح واضح ہو چکنے کے بعد تمھارے لیے اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا کہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کر سکو۔ پھر یہ بات بھی واضح فرما دی کہ یہ ضدم ضدا کا رویہ کچھ تمھارے ہی ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ یہود و نصاریٰ خود ایک دوسرے کے قبلہ کی بھی پیروی نہیں کر سکتے۔ اب یہ مشرق و مغرب کے جس جھگڑے میں پڑ گئے ہیں یہ جھگڑا ختم ہونے والا نہیں۔ اور جب ایک ہی قبلہ کی پیروی کے مدعی آپس میں متحد نہیں ہو سکتے تو تمھارے قبلہ کی پیروی بھلا یہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ علم وحی کے آ جانے کے بعد اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو تم بھی ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔ یہ ایک نوع کی تہدید ہے جس کا ظاہرا خطاب تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس کا رخ درحقیقت یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ یہاں "العلم" سے مراد علم حقیقی ہے جو وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور اھواء سے مراد اہل کتاب کی بدعتیں ہیں۔ ان دونوں لفظوں کا مفہوم آیت ۱۲۰ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۱۴۶)

"الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ" سے مراد یہاں صالحین اہل کتاب کا گروہ ہے جو اپنے علم کے حد تک اپنے دین پر قائم اور ان تمام پیشین گوئیوں کے ظہور کا دل سے متمنی تھا جو آخری بعثت سے متعلق ان کے صحیفوں میں موجود تھیں۔ اس سے صالحین اہل کتاب مراد لینے کے وجوہ و دلائل پوری تفصیل کے ساتھ ہم آیت ۱۲۱ کے تحت واضح کر چکے ہیں۔

"يَعْرِفُونَهُ" میں ضمیر کا مرجع قرآن مجید اور اس کا یہ بیان ہے جو اس نے آخری بعثت اور اس کے قبلہ سے متعلق اوپر دیا ہے۔ یہ آیت بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۂ انعام میں بھی وارد ہے۔ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۲۰۔ انعام (جن کو ہم نے کتاب عنایت کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)

تشبیہ کی بلاغت

بیٹوں کی طرح پہچاننے میں یہ تشبیہ مضمر ہے کہ جس طرح ایک مہجور باپ اپنے دور افتادہ بیٹے کے لیے پریشان و مضطرب رہتا ہے اور ایک مدت کی جدائی کے بعد جب وہ آتا ہے تو دور سے اس کے پیراہن کی خوشبو اس کے لیے نوید مسرت لاتی ہے اسی طرح یہ صالحین اہل کتاب آخری بعثت سے متعلق تمام پیشین گوئیوں کے ہر مصداق سے اچھی طرح آشنا ہیں اور ان میں سے جو مصداق بھی ان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے وہ اس کا خیر مقدم یوسف گم گشتہ کی طرح کرتے ہیں۔ اچھے اہل کتاب کے اندر موعود و منتظر حق کے لیے انتظار و شوق کا جو جذبہ تھا اس کی تعبیر قرآن مجید نے ایک اور مقام میں اس طرح فرمائی ہے۔ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ

تَرٰٓی اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ۸۳ ۔ مائدہ ۵ (اور جب وہ اس چیز کو سنتے ہیں جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس حق کی وجہ سے جس کو وہ اس کے اندر پہچانتے ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو حق کی شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ۔)

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ (۱۴۷)

مبتدا کو محذوف کرنے کی بلاغت

اَلْحَقُّ ہمارے نزدیک خبر ہے اور مبتدا اس کا محذوف ہے۔ اگر مبتدا کو واضح کر دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ یعنی یہی بات حق ہے۔ مِنْ رَّبِّكَ خبر سے متعلق ہے۔ مبتدا کو عموماً عربی میں اس موقع پر حذف کر دیتے ہیں جہاں مخاطب کی پوری توجہ خبر پر مرکوز کر دینی ہو۔ اَلْحَقُّ آیت ۱۴۴ میں خبر ہی کے محل میں وارد ہے اور اسی حیثیت سے وہ آیت ۱۴۹ میں بھی آیا ہے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ کا خطاب ظاہر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن تنبیہ و عتاب کا رخ مخالفین کی طرف ہے۔[1]

ملاحظہ ہو آیت نمبر ۱۴۵

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ؕ اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۱۴۸)

لفظ کُل کا مفہوم

"کل" کا لفظ اگرچہ لفظاً نکرہ ہے لیکن عموماً اس سے مراد وہ خاص گروہ یا اشخاص ہی ہوتے ہیں جن کا ذکر کلام میں اوپر گزر چکا ہوتا ہے مثلاً وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِیًّا ۴۹ - مریم (اور ہم نے اس کو عطا کیے اسحاق اور یعقوب اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا) وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِدْرِیْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ ۸۵ - انبیاء - (اور اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل، ان میں سے ہر ایک صابروں میں سے تھا)

چنانچہ یہاں بھی لِکُلٍّ سے مراد یہود و نصاریٰ کے وہی گروہ ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ ان کے متعلق فرمایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے قبلہ کے لیے ایک جہت ٹھہرا لی ہے۔ کسی نے مشرق، کسی نے مغرب، یہ اپنی اسی ٹھہرائی ہوئی جہت ہی کو قبلہ بنائیں گے، تم کتنا ہی زور لگاؤ یہ ٹس سے مس کسی طرح اپنے مقام سے کھسکنے والے نہیں ہیں۔ اس وجہ سے تم ان کے پیچھے اپنی راہ کھوٹی نہ کرو بلکہ خدا کی دکھائی ہوئی صراطِ مستقیم پر آگے بڑھو اور نیکیوں اور بھلائیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔

تحویلِ قبلہ کے معاملہ میں اہلِ کتاب کے رویے سے اظہارِ بیزاری

گویا وہی بات جو اوپر والی آیت میں فرمائی تھی کہ وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ

---

[1] خطاب کے مختلف پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مناسب ہے کہ مولانا فراہیؒ کے مقدمہ تفسیر میں خطاب کی فصل ضرور پڑھ لیجیے۔ تفسیر سورۂ عبس بھی اس مقصد کے لیے مفید ہوگی۔

مَا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ الآیۃ اس آیت میں ایک دوسرے اسلوب سے فرما دی۔ مقصود اس سے ہرگز ہرگز قبلہ کے معاملہ میں کسی رواداری کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہود و نصاریٰ کے رویہ سے بیزاری کا اظہار ہے۔ مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کی جا رہی ہے کہ ان جامدوں اور ہٹ دھرموں کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور تم حصولِ سعادت کی راہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

قبلہ راہِ عبدیت میں مسابقت کے لیے ایک نشان ہے

فَاسْتَبِقُوْا کا مصدر استباق ہے جس کے معنی ہیں دوڑ میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرنا مثلاً اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ (۱۷۔ یوسف) (ہم دوڑ میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے) جس طرح دوڑ کے مقابلوں میں ایک نشان ٹھہرا کر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح قبلہ عبدیت و انابت اور فلاح و سعادت کی جدوجہد میں مقابلہ کے لیے خدا کا مقرر کردہ ایک نشان یا گول ہے۔ اس نشان کو، جیسا کہ اوپر تفصیل گزر چکی ہے، پچھلی امتوں نے ضائع کر دیا تھا اس وجہ سے ان کی بھاگ دوڑ بھی بالکل دوسری وادیوں میں ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس نشانِ حق کو امتِ وسط کے لیے پھر نمایاں کیا اور اس کو دعوت دی کہ اگر دوسرے اس میدان میں اترنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور تم اپنی سرگرمیوں سے اس میدان کو پھر گرم کرو۔

قبلہ کے متعلق یہ بات کہ وہ فلاح و سعادت کے حصول کے لیے ایک نشان اور عَلَم کی حیثیت رکھتا ہے محض کوئی استعارہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے اس عظیم تاریخ کو حافظہ میں از سرِ نو تازہ کرنے کی کوشش کیجیے جو اس گھر کے ایک ایک پتھر پر نقش ہے جس کو قبلہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ گھر وہ گھر ہے جس کی تعمیر ابراہیم خلیل اللہؑ اور اسماعیل ذبیح اللہؑ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے کی ہے۔ یہ گھر وہ گھر ہے جو اس دنیا کے بتکدے میں خدائے واحد کی عبادت کا اولین مرکز ہے۔ اسی گھر کے پہلو میں مروہ کی پہاڑی ہے جس کے دامن میں چشمِ فلک نے رضائے الٰہی کے لیے بوڑھے باپ کو محبوب اور اکلوتے فرزند کی گردن پر چھری چلاتے اور اسلام کی حقیقت کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔ یہی گھر ہے جس کے اردگرد کے چٹیل میدانوں کو قدرت نے اس امتِ مسلمہ کے نشوونما کے لیے منتخب فرمایا جس کے ذریعہ سے دنیا کی تمام قوموں کو خدا کی رحمت تقسیم ہونے والی تھی۔ یہی گھر ہے جو حضرت ابراہیم کے وقت سے لے کر برابر تمام قدوسیوں کا قبلہ رہا ہے اور جس میں طواف و اعتکاف اور رکوع و سجود کی سعادت اتنے انسانوں نے حاصل کی ہے کہ جس طرح زمین کے ذروں اور آسمان کے تاروں کا شمار ناممکن ہے اسی طرح ان نفوسِ قدسیہ کا شمار بھی ناممکن ہے۔ اسی کے قرب میں وہ میدان ہے جس کی ریت کا ایک ایک ذرہ توبہ و استغفار کے سجدوں کا گواہ اور خوفِ خدا سے رونے والوں کے آنسوؤں کا امین ہے۔ اسی گھر کے ایک کونے میں وہ مقدس پتھر ہے جس کو خدا کے دہنے ہاتھ سے تشبیہ دی گئی ہے اور جس کو ہاتھ لگا کر یا بوسہ دے کر لاکھوں کروڑوں انبیاء و صدیقین اور صلحاء و ابرار نے اپنے رب سے عہدِ بندگی و وفاداری استوار کیا ہے۔ اسی کے پاس وہ جمرات ہیں جو اس گھر کے دشمنوں کی ذلت و پامالی کی یادگار ہیں اور جن پر

سنگ باری کر کے اہل ایمان اپنے اندر برابر اعدائے دین کے خلاف جہاد کی روح تازہ کرتے رہے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی گھر کے سایہ میں خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پرورش پائی جن کے لائے ہوئے نور اور جن کی بخشی ہوئی ضیا نے تمام دنیا میں اجالا کر دیا۔

ایک ایسی عظیم روایات کے امین گھر کو قبلہ بنانے کے معنی یقیناً یہی ہیں کہ اس کو ایک نشان قرار دے کر ان روحانی خزانوں کے حصول کے لیے جدوجہد کی جائے جو سیدنا ابراہیمؑ سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک اس گھر کو ودیعت ہوئے یا دوسرے لفظوں میں اس کو ایک پاور ہاؤس سمجھیے جس سے پوری امت زندگی، حرارت، روشنی اور قوت حاصل کرتی ہے۔ جن لوگوں پر قبلہ کی عظمت و اہمیت کا یہ پہلو واضح نہیں ہے وہ اکثر اس امر میں حیران ہوتے ہیں کہ اینٹ اور پتھر کے بنے ہوئے ایک مکان کو دین میں اس درجہ اہمیت کیوں دے دی گئی ہے لیکن اوپر کی تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اصل اہمیت اینٹ پتھر کے مکان کی نہیں بلکہ ان عظیم روایات کی ہے جو اس گھر سے وابستہ ہیں اور جو اس دنیا کی روحانی و ایمانی زندگی کا واحد ذریعہ ہیں۔ ان روایات کی وجہ سے ملت کے نظام اجتماعی میں اس گھر کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ایک جسم کے نظام میں قلب کو حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح قلب کے بغیر جسم کا وجود نہیں اسی طرح قبلہ کے بغیر ملت کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں قبلہ سے متعلق ان اجمالی اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ آگے مناسب مواقع پر ہم اس کی اہمیت کے بعض دوسرے گوشوں پر بھی نظر ڈالیں گے۔

أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا، إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس قبلہ کو قبلہ قرار دے کر جہاں کہیں سے بھی تم نیکی اور بھلائی کی راہ میں کوئی جدوجہد کرو گے وہ ضائع نہیں جائے گی، خدا تم کو ہر جگہ سے اکٹھا کرے گا اور تمہیں تمہاری ہر چھوٹی بڑی نیکی کا بدلہ دے گا۔ یہ استباق الی الخیر کے لیے ایک نشان کی طرح ہے۔ اس سے قرب و بُعد دل کے تعلق کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ ہر شخص ہر جگہ اس سے ربط قائم کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے تعلق رکھنے والوں کو ہر جگہ سے جمع کر سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ جو جس سمت بھی رخ کرنا چاہتا ہے اس کو کرنے دو، تم ان بحثوں میں الجھنے کی بجائے نیکی اور بھلائی کی راہوں میں بڑھو، ایک دن آئے گا جب اللہ تم سب کو جمع کر کے فیصلہ کرے گا کہ کون حق کی راہ چلا اور کس نے ضد اور ہٹ دھرمی کی روش اختیار کی۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۱۴۹)

سفر میں اہتمام قبلہ کی ہدایت

اوپر آیت ۱۴۴ میں تحویل قبلہ کے اصلی حکم کے ضمن میں یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ آدمی جہاں کہیں بھی ہو قبلہ ہی کی طرف رخ کرے لیکن سفر کی حالت سے متعلق وہاں کوئی تصریح نہیں تھی کہ اس صورت میں

بھی اس حکم کی پابندی ضروری ہے یا اس میں کچھ ڈھیل ہے۔ سفر کی حالت میں کسی متعین قبلہ کی جستجو اور تحقیق ایک دشوار کام ہے۔ اس وجہ سے خیال یہی ہوتا ہے کہ اس میں کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن اوپر قبلہ کی جو اہمیت بیان ہوئی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی حالت میں بھی اس روحانی پاور ہاؤس سے انسان کا تعلق منقطع نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر سفر کی حالت میں آزادی دے دی جاتی تو اس سے قبلہ کے معاملہ میں اس گمراہی کو اچھی خاصی راہ مل جاتی جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہوئے۔ اس وجہ سے اس امت کو واضح الفاظ میں اس بات کی تاکید کی گئی کہ حضر کی طرح سفر میں بھی قبلہ کا اہتمام ضروری ہے تاکہ امت اپنے اصل نصب العین سے کسی حالت میں بھی سہل انگاری میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

اس تاکید کے ساتھ ساتھ یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ یہی قبلہ خدا کا مقرر کیا ہوا واقعی قبلہ ہے، سو اس بات کو یاد رکھنا کہ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ یہ تنبیہ عذر سفر کی بنا پر قبلہ کے معاملہ میں ہر قسم کی آزادی، بے پروائی اور ہر قسم کی منافقانہ سہولت تراشی کی جڑ کاٹتی ہے۔ اس کے شروع میں خطاب واحد کے صیغہ سے ہے اور آخر میں جمع کے صیغہ سے، یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ شروع کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیتِ امت کے وکیل کے ہے۔ مراد اس سے پوری امت ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سفر کی حالت میں چونکہ بسا اوقات قبلہ کا تعین سخت مشکل ہو جاتا ہے اس وجہ سے جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ صرف موجود وسائل تحقیق کے حد تک قبلہ کی جستجو ہے۔ اسلام نے کسی معاملہ میں طاقت سے زیادہ امت پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ بس میسر وسائل تحقیق سے جو ظن غالب حاصل ہو جائے آدمی اسی کے مطابق نماز ادا کرے۔ یہ پابندی کسی صورت میں بھی ان رخصتوں کی نفی نہیں کرتی جو مجبوریوں کی حالت میں شریعت نے امت کو دی ہیں اور جن کی تصریح حدیث و فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۙ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۱۵۰)

اعادۂ حکم کی حکمت

اوپر سفر اور حضر دونوں حالتوں سے متعلق یہ دونوں حکم بیان ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے انہی دونوں حکموں کا معاً یہ اعادہ بعینہٖ انہی الفاظ میں اپنے اندر بظاہر کچھ تکرار کی سی گرانی رکھتا ہے اور یہ چیز قرآن میں، جو ایجاز و بلاغت کا ایک معجزہ ہے، طبیعت کو کچھ کھٹکتی ہے، لیکن یہ کھٹک محض قلت تدبر کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہاں ان احکام کے دہرانے سے مقصود ہرگز ہرگز ان احکام کو دوبارہ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی ان تین عظیم حکمتوں اور مصلحتوں کو بیان کرنا ہے جو ان احکام کے اندر اس امت کے لیے پیش نظر ہیں اور جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یہ حکمتیں بحیثیتِ مجموعی دونوں ہی حکموں سے، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، تعلق رکھتی ہیں اور ان سے معمولی بے خبری یا بے پروائی بھی اس امت کو ایسی غلطیوں میں مبتلا کر سکتی ہے جن کی اصلاح

کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ جائے گی اس وجہ سے قرآن نے ان حکمتوں کے بیان سے پہلے تمہید کے طور پر ان احکام کی طرف ذہنوں کو پھر متوجہ کر دیا کہ اس شد و مد اور اس تاکید و تنبیہ کے ساتھ اندر او ر باہر، سفر اور حضر، ہر جگہ اور ہر صورت میں بیت اللہ ہی کی طرف رخ کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے یہ کوئی سر سری اور سطحی حکم نہیں ہے۔ بلکہ نہایت عظیم مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی حکم ہے۔ اگر اس کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھنے میں تم نے ذرا بھی سہل انگاری سے کام لیا اور اس سہل انگاری کے سبب سے ایک قدم بھی غلط اٹھ گیا تو تمہارا سارا سفر ہی ایک غلط سمت میں ہو جائے گا۔ اس وجہ سے ان کا پورا پورا اہتمام کرو اور ان کی حکمتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ اس تمہید کے بعد اب آگے یہ حکمتیں ان الفاظ میں بیان ہو رہی ہیں۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ غور کیجیے تو واضح ہوگا کہ یہاں ان احکام کی تین حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک قطع حجت، دوسری اتمامِ نعمت، تیسری راہ یابی۔ اب ہم اختصار کے ساتھ ان تینوں کی تشریح کرتے ہیں تاکہ مذکورہ احکام کے اعادہ کا فائدہ اور نظمِ کلام اچھی طرح واضح ہو جائے۔

قطع حجت سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود کے لیے بات بات میں تمہارے اوپر گرفت کرنے اور تمہارے خلاف بدگمانی پھیلانے کے لیے کوئی موقع باقی نہ رہ جائے۔ یہاں للناس سے مراد موقع کلام گواہ ہے کہ اہل کتاب ہیں۔ قبلہ کے اشتراک کی وجہ سے اہل کتاب بالخصوص یہود، قدم قدم پر آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے رہتے تھے کہ جب یہ ہمارے قبلہ ہی کی طرف نماز پڑھتے ہیں تو نماز اور عبادت کے طریقوں میں ہمارے طریقہ سے الگ راہ کیوں اختیار کرتے ہیں۔ ایک بنیادی چیز میں اشتراک کے بعد دوسری چیزوں میں اختلاف کو وہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی من گھڑت ایجاد قرار دیتے تھے۔ ان کا یہ پروپیگنڈا سادہ لوح لوگوں پر اثر انداز ہوتا تھا اور اس سے اس حقیقت کے واضح ہونے میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں کہ حضورؐ کی بعثت یہودیت یا نصرانیت پر نہیں بلکہ ملتِ ابراہیم پر ہوئی ہے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اس پروپیگنڈے کا پوری طرح سدِ باب کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ رخنہ بندیاں ضروری ہوئیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ فرض کیجیے یہ احتیاطیں نہ اختیار کی جاتیں۔ مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا کہ جب وہ مسجد حرام سے باہر یا سفر کی حالت میں ہوں تو جس سمت کی طرف چاہیں نماز پڑھ لیا کریں تو قطع نظر اس سے کہ مسلمان قبلہ کے معاملہ میں اسی قسم کی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے جس قسم کی گمراہی میں اہل کتاب مبتلا ہوئے، محض بعض حالات میں ظاہری اشتراک کی وجہ سے یہود مسلمانوں کے خلاف زبان درازی اور وسوسہ اندازی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے۔ مذکورہ قیدوں نے ان تمام رخنوں کو بند کر دیا۔ اگرچہ شریر لوگ اس قطع حجت کے بعد بھی باز رہنے والے نہیں تھے لیکن دنیا میں کوئی احتیاط بھی ہر قسم کے لوگوں کا منہ بند نہیں کر سکتی۔ ایسے لوگوں کا علاج قرآن نے یہ بتایا ہے کہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي (ان سے نہ ڈرو صرف مجھ سے ڈرو)

اتمامِ نعمت سے مراد تکمیلِ دین کی وہ نعمت ہے جس کی پیشین گوئی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اس امت کے بارے میں فرمائی تھی اور جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس وقت فرمایا تھا جب وہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس وقت ان سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس بیٹے کی نسل سے ایک عظیم امت پیدا ہوگی جس سے تمام دنیا کی قومیں دین کی برکت پائیں گی۔ چنانچہ انھیں کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لیے آخری ہادی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، جن کا قبلہ وہ بیت اللہ قرار پایا جو تمام عالم کے لیے سرچشمۂ خیر و برکت اور تکمیلِ دین کا مرکز ٹھہرایا گیا تھا۔

راہ یابی سے مراد ہے اس صراطِ مستقیم کی راہ یابی جو خدا تک پہنچانے والی سیدھی اور فطری راہ ہے جس کے متعلق فرمایا گیا ہے۔ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۱۶۱۔ انعام (کہہ دو میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی ہے۔ فطری دین ——— ملتِ ابراہیم ——— کی طرف جو بالکل یکسو تھا) اس ملتِ ابراہیم کی طرف رہنمائی کرنے والا مینارہ، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، یہ قبلہ ہی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ رہنمائی کا یہ نشان ہمیشہ اس امت کی نگاہوں کے سامنے رہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَكِّیْكُمْ وَیُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

"کما" میں "ک" حرفِ تشبیہ ہے۔ اس وجہ سے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تشبیہ کس چیز کی دی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ "کما" تقریباً اسی موقع میں استعمال ہوا ہے جس موقع میں ہم "چنانچہ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ قبلہ کی تحویل اسی طرح اتمامِ نعمت اور ملتِ ابراہیمؑ کی طرف رہنمائی کے لیے کی ہے جس طرح دعائے ابراہیمی کے مطابق انھی مقاصد کے لیے ایک رسول تمھارے اندر بھیجا ہے۔ اس آیت پر آیت ۱۲۹ کے تحت ہم مفصل بحث کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر میں یہ جو فرمایا ہے کہ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ، یہ بنی اسماعیل پر ایک خاص فضل و کرم کا اظہار ہے کہ تم دین و شریعت سے ناآشنا امی لوگ تھے، خدا نے تمھاری تعلیم و ہدایت کے لیے اس پیغمبر کو بھیجا ہے تو تمھیں تو اس کی سب سے زیادہ قدر کرنی چاہیے۔

فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

اللہ تعالیٰ اور امتِ مسلمہ کے درمیان ایک عظیم معاہدہ

تحویلِ قبلہ کے حکم کے بعد یہ امت ایک بالکل ممتاز امت کی حیثیت سے سامنے آگئی۔ یہود امامت کے منصب سے معزول ہوئے اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری قیامت تک کے لیے اس امت کے سپرد ہوئی۔ اس اہم موقع پر یہ یاد دہانی کی گئی ہے کہ تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمھیں یاد رکھوں گا، میری شکرگزاری کرتے رہنا، ناشکری نہ کرنا۔ اس یاد دہانی کی نوعیت اللہ تعالیٰ اور اس امت کے درمیان ایک عظیم معاہدے کی ہے اور خدا کو یاد رکھنے

سے مقصود ان تمام ذمہ داریوں اور فرائض کو یاد رکھنا اور ان کی بجا آوری ہے جو اس امت کے سپرد کیے جا رہے ہیں۔ ان ذمہ داریوں اور فرائض کی بجا آوری کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ میں تمھیں یاد رکھوں گا، یعنی دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی، نصرت، فتح مندی اور سرخروئی کے جو وعدے میں نے اس امت سے کیے ہیں وہ پورے کروں گا۔ 'میری شکرگزاری کرتے رہنا' سے مراد ان تمام نعمتوں کا صحیح صحیح حق ادا کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں اور آئندہ ملنے والی ہیں، ان نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت خود وہ شریعت تھی جو اب اپنی کامل شکل میں اس امت کو منتقل ہو رہی تھی، آخر کے الفاظ وَلَا تَكْفُرُونِ (اور میری ناشکری نہ کرنا) میں تنبیہ ہے کہ اگر تم نے ناشکری کی تو جس طرح یہود ناشکری کر کے کیفرِ کردار کو پہنچے خدا کے اس قانون کی زد سے تم بھی نہ بچ سکو گے۔

بعینہٖ اسی طرح کی یاد دہانی بنی اسرائیل کو بھی کی گئی تھی لیکن انھوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ قرآن مجید میں اس کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔ اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۴۰ بقرہ (میری اس نعمت کو یاد رکھو جو میں نے تم پر کی ہے اور میرے عہد کو پورا کرو، میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے اور مجھی سے ڈرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۳)

منصبِ امامت کی مشکلات اور ان کا علاج

اب اس آیت اور آگے کی چار آیات میں ان خطرات و مشکلات کے مقابلہ کی تدابیر بتائی جا رہی ہیں، جو اس منصبِ امامت کے بعد پیش آئیں گی یا پیش آسکتی ہیں۔ یہود کو مسلمانوں کے ساتھ جو عناد تھا وہ تو اچھی طرح اوپر واضح ہو چکا ہے مگر قبلہ کے اس اشتراک کی وجہ سے یہود اب تک اس تمام اختلاف و نزاع کے اندر اتفاق کی بھی ایک جھلک دیکھتے تھے لیکن تحویلِ قبلہ کے بعد انھوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مسلمان اب ملتِ ابراہیمؑ کے وارث کی حیثیت سے اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ان سے بالکل ممیز ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ اس چیز نے قدرتی طور پر مسلمانوں کے خلاف ان کے غیظ و غضب کو دوچند کر دیا۔ اسی طرح قریش جو مسلمانوں کو مکہ سے نکال کر اس طمعِ خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ دعوت ایک اجنبی ماحول میں آپ سے آپ دب جائے گی، اب یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی توقعات کے خلاف، مسلمان مدینہ میں ایک طاقت بنتے جا رہے ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ملتِ ابراہیمؑ کے اصلی وارث اور خانہ کعبہ کے جائز متولی وہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اب اس گھر کو اپنا قبلہ بھی بنا لیا ہے، جس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب وہ اس پر قبضہ بھی کرنے کی کوشش کریں۔ اس احساس نے انھیں بھی چوکنا کیا اور وہ اس خطرے کے سدِّباب کی تدبیریں سوچنے لگے، جس کے نتیجہ میں تحویلِ قبلہ کے دو ہی مہینوں کے بعد انھوں نے اس جنگ کے اسباب پیدا کر دیے جو تاریخ اسلام میں غزوۂ بدر کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کے متعلق ہماری تحقیق، جیسا کہ ہم سورۂ انفال کی تفسیر میں پیش کریں گے، یہ ہے کہ یہ یہود مدینہ اور قریش مکہ کی باہمی سازش سے ہوئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان، جو اب ایک منتقل امت

کی حیثیت سے ملّتِ ابراہیمی اور قبلہ ابراہیمی کے دعوے دار بن کر اٹھ رہے ہیں، ان کا زور اُٹھنے سے پہلے ہی توڑ دیا جائے۔

یہ حالات اگرچہ ابھی پس پردہ تھے لیکن اس خدائے علام الغیوب سے مخفی نہیں تھے جو کھلے اور چھپے سب سے باخبر ہے اس وجہ سے اس کی رحمت اور حکمت متقضی ہوئی کہ وہ مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے متنبہ بھی فرمائے اور ان خطرات کے مقابلہ میں جو چیز ان کے عزم و حوصلہ کو برقرار رکھ سکتی ہے، اس کی ہدایت بھی فرمائے۔

اس سلسلہ کی پہلی بات جو آیت زیر بحث میں ارشاد ہوئی، یہ ہے کہ پیش آنے والی مشکلات میں صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ صبر اور نماز کی لغوی تحقیق، ان کے باہمی تعلق اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں ان کی عظمت و اہمیت پر تفصیلی گفتگو ہم اسی سورہ کی آیت ۴۵ کے تحت کر چکے ہیں۔ نیز فصل ۳۲ میں بھی ان کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا چکی ہے اس وجہ سے یہاں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ بعض باتیں مخصوص اس مقام سے متعلق ہیں جن کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

ایک تو یہ کہ مشکلات و مصائب میں جس نماز کا سہارا حاصل کرنے کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد صرف پانچ وقتوں کی مقررہ نمازیں ہی نہیں ہیں بلکہ تہجد اور نفل نمازیں بھی ہیں۔ اس لیے کہ یہی نمازیں مومن کے اندر وہ روح اور زندگی پیدا کرتی ہیں جو راہِ حق میں پیش آنے والی مشکلات پر فتح یاب ہوتی ہے، انھی کی مدد سے وہ مضبوط تعلق باللہ پیدا ہوتا ہے جو کسی سخت سے سخت آزمائش میں بھی شکست نہیں کھاتا، اور انھی سے وہ مقامِ قرب حاصل ہوتا ہے جو خدا کی اس معیت کا ضامن ہے جس کا اس آیت میں صابرین کے لیے وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اس حقیقت کی پوری وضاحت کی سورتوں میں آئے گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

دوسری یہ کہ نماز تمام عبادات میں ذکر اور شکر کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نماز کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی شکرگزاری ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر اس امت سے یہ عہد جو لیا گیا ہے فَاذْكُرُونِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ، اس کے قیام میں نماز سب سے بہتر وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تیسری یہ کہ یہ نماز دعوتِ دین اور اقامتِ حق کی راہ میں عزیمت و استقامت کے حصول کے لیے مطلوب ہے۔ اس وجہ سے اس نماز کی اصلی برکت اس صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب آدمی راہ حق میں باطل سے کشمکش کرتا ہوا اس کا اہتمام کرے۔ جو شخص سرے سے باطل کے مقابل میں کھڑے ہونے کا ارادہ ہی نہیں کرتا ظاہر ہے کہ اس کے لیے یہ ہتھیار کچھ غیر مفید ہی بن کر رہ جاتا ہے۔

چوتھی یہ کہ یہاں صبر اور نماز سے مدد حاصل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ نماز پڑھنے والوں اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ استاذ امامؒ کے

نزدیک یہ ہے کہ نماز میں خدا کی معیت کا حاصل ہونا اس قدر واضح چیز ہے کہ اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، واضح کرنے کی بات یہی تھی کہ جو لوگ راہِ حق میں ثابت قدم رہتے ہیں اور اس ثابت قدمی کے حصول کے لیے نماز کو وسیلہ بناتے ہیں، اللہ ان کے ساتھ ہوجاتا ہے۔

پانچویں یہ کہ اللہ کی معیت جس کا یہاں ثابت قدموں کے لیے وعدہ کیا گیا ہے کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ موقع کلام گواہ ہے کہ یہاں ان دو لفظوں کے اندر بشارتوں کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ تمام کائنات کا بادشاہ حقیقی اور تمام امر و اختیار کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے تو جب وہ کسی کی پشت پر ہے تو اس کو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی کس طرح شکست دے سکتی ہے؟

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (۱۵۴)

زندگی اور موت سے متعلق صحیح تصور

راہِ عزیمت و استقامت میں استوار رہنے کے لیے دوسری چیز جو مطلوب ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے یعنی زندگی اور موت سے متعلق صحیح اسلامی تصور کا استحضار۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے نزدیک تو زندگی نام بس اسی دنیا کی زندگی کا ہے، جو آدمی مرا یا مارا گیا بس وہ ختم ہوگیا۔ لیکن مومن کے نزدیک تو یہ زندگی چند روزہ اور فانی زندگی ہے اصل زندگی کا ابدی ہے، آغاز تو اس کے نزدیک اس وقت سے ہوتا ہے، جب یہ زندگی ختم ہوتی ہے۔ یہ زندگی عالمِ برزخ اور پھر عالمِ آخرت میں حاصل ہوتی ہے۔ جہاں تک موت کے بعد زندگی کا تعلق ہے یہ حاصل تو کافر و مومن سب ہی کو ہوتی ہے لیکن کفار کی زندگی چونکہ کلفت اور عذاب کی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ قابلِ ذکر نہیں۔ البتہ اہلِ ایمان برزخ کی زندگی میں بھی اپنے اپنے مراتب و مدارج کے لحاظ سے مسرور و شادکام ہوتے ہیں۔ بالخصوص ان میں سے جو لوگ راہِ حق میں شہادت کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں ان کی برزخی زندگی کی کامرانیوں کا تو اس ناسوتی زندگی میں کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنے مقدس خونِ شہادت سے اس دنیا کی کشتِ حق کو جو سیرابی اور زندگی بخشتے ہیں اس کے انعامات ان کو عالمِ برزخ ہی سے ملنے شروع ہوجاتے ہیں، چنانچہ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۱۶۹- آل عمران (جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردے نہ خیال کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس روزی پا رہے ہیں)

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (۱۵۵)

آگے کی مشکلات کی طرف اجمالی اشارہ

یہ ان آزمائشوں کی طرف اجمالی اشارہ ہے جو آگے کے مراحل میں پیش آنے والی ہیں۔ یہ آزمائشیں اگرچہ پیش تو آئیں گی دشمنوں کی شرارتوں اور سازشوں کے باعث لیکن چونکہ یہ اس سنت اللہ کے تحت ہیں جو ازل سے اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق اور اہلِ باطل میں امتیاز کے لیے مقرر کر رکھی ہے اس وجہ سے ان کو منسوب اپنی طرف فرمایا ہے کہ ہم تمہیں آزمائیں گے، اور بات بصیغۂ تاکید فرمائی ہے۔ اس لیے کہ اہلِ حق کے لیے یہ

امتحان و آزمائش قانونِ الٰہی میں ناگزیر ہے۔ اس قسم کے امتحانوں سے گزر کر ہی بندوں کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور ان کے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ اس امتحان کے بغیر کوئی گروہ اللہ تعالیٰ کی اُخروی نعمتوں کا سزاوار قرار نہیں پاتا۔

خوف

اس سلسلہ میں سب سے پہلے خوف کا ذکر فرمایا ہے۔ خوف سے مراد دشمنوں کے حملہ و ہجوم کا اندیشہ ہے۔ اوپر اشارہ گزر چکا ہے کہ ایک مستقل امت کی حیثیت سے نمایاں ہوتے ہی قریش نے بھی مسلمانوں پر حملے کے لیے بہانے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور یہود نے بھی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں، پھر آہستہ آہستہ ان کی طرف سے حملوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ باہر کی قوموں نے بھی اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور یہ سلسلہ اس وقت جا کر ختم ہوا جب مسلمانوں نے اپنی عزیمت و استقامت سے اپنے تمام حریفوں کا زور اچھی طرح توڑ دیا۔

اس خوف کا ذکر بِشَیْءٍ یعنی کسی قدر کی قید کے ساتھ کیا ہے جس سے مقصود مسلمانوں کی ہمت افزائی ہے کہ یہ حالت پیش تو آئے گی لیکن یہ اس مقدار سے زیادہ نہ ہو گی جو تمہاری عزیمت و استقامت کی جانچ کے لیے ضروری ہے، اس وجہ سے اس سے دل شکستہ اور پست ہمت ہونے کے بجائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے۔

معاشی مشکلات

جوع سے مراد وہ معاشی مشکلات ہیں جو قریش اور یہود کی مشترکہ مخالفت، خوف و خطرے کی حالت اور ان کی طرف سے غذائی ناکہ بندیوں کے سبب سے پیش آ سکتی ہیں۔ اس وقت تک ملک کی تمام تجارت اور دوسرے معاشی وسائل و ذرائع پر عملاً یہود اور قریش ہی قابض تھے۔ اس وجہ سے ان کے ساتھ جھگڑا مول لینا، دریا میں رہتے ہوئے مگرمچھوں سے بیر مول لینے کے ہم معنی تھا۔ لیکن حق کی رفاقت مقتضی تھی کہ مسلمان یہ خطرہ بھی مول لیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ خطرہ بھی مول لیا اور تاریخ گواہ ہے کہ یہ خطرہ ظاہر تو ہوا بعض حالات میں بہت ہی بھیانک شکل میں لیکن عزم و ایمان کے مقابل میں یہ بھی ٹھہرا پرکاہ (بشیءٍ) ہی کے برابر۔

مال اور جان کی کمی

اس کے بعد اموال و انفس یعنی مال اور جان کی کمی کی آزمائش کی طرف اشارہ فرمایا اس لیے کہ جنگ و جہاد میں یہی دونوں چیزیں وسیلۂ کار بنتی ہیں جس کے سبب سے سب سے زیادہ قربانی انھی کی دینی پڑتی ہے۔ نیز امن و اطمینان کے فقدان کے سبب سے یہ اس نگہداشت سے بھی محروم ہو جاتی ہیں جو ان کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔

ثمرات

ثمرات کا ذکر اگرچہ اموال کے ذکر کے بعد بظاہر کچھ زائد سا معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ یہ بھی اموال میں شامل ہے۔ لیکن اس کے ذکر میں موقع کلام کی رعایت ملحوظ ہے۔ اہلِ عرب کی دولت یا تو اونٹ اور بھیڑ بکریاں تھیں جن کے لیے اموال کا لفظ استعمال ہوتا تھا یا پھر پھل خصوصاً کھجور۔ ملک کی اس مخصوص حالت کی وجہ سے اموال کے ساتھ ثمرات کا ذکر بھی ہوا۔

آخر میں ان لوگوں کو خوش خبری دی گئی ہے جو ان تمام آزمائشوں کے باوجود حق پر جمے رہیں، اور اپنے

عزم وایمان میں کوئی ضعف پیدا نہ ہونے دیں۔ یہ خوش خبری قرآن کی دوسری جگہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی پر مشتمل ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ
عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ
اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ
يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً
فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝
وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ
فَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝
(۱۰-۱۳ صف)

اے ایمان والو، کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت
کا پتہ نہ دوں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے
نجات دینے والی ہے؟ اللہ اور اس کے رسول پر
ایمان لاؤ۔ اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور
جانوں سے جہاد کرو، یہ تمہارے لیے کہیں بہتر ہے،
اگر تم اس بات کو سمجھو۔ اللہ تمہارے گناہوں کو بخشے گا۔
اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے
نہریں جاری ہوں گی اور ایسے اچھے مکانوں میں اتارے گا
جو ابد کے باغوں میں ہیں، یہ دراصل سب سے بڑی
کامیابی ہے۔ مزید برآں ایک دوسری چیز بھی تمہیں
حاصل ہوگی جس کو تم عزیز رکھتے ہو، وہ ہے اللہ کی مدد
اور عنقریب حاصل ہونے والی فتح۔ اور اس بات
کی ایمان والوں کو بشارت سنا دو۔

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۱۵۶)

صابرین کی ڈھال

یہ صابرین کی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ آزمائشوں کا مقابلہ بددلی اور پست ہمتی کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ خندہ پیشانی اور عزم واستقلال کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہاں جو ان کا یہ قول نقل ہوا ہے، یہ درحقیقت ان کے اس عقیدے کا اظہار ہے جس کی چٹان پر صبر واستقامت کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس عقیدے کا ایک جزو تو یہ ہے کہ آدمی اس بات پر ایمان رکھے کہ وہ اس دنیا میں اللہ ہی کا اور اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کا دوسرا جزو یہ ہے کہ مرنے کے بعد اس کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ جو شخص ان دو حقیقتوں پر مضبوط ایمان رکھتا ہے کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کے قدم کو جادۂ حق سے ہٹا نہیں سکتی۔ جب ہم اس دنیا میں خدا ہی کے بھیجے ہوئے آئے ہیں، اسی کے لیے ہمارا مرنا اور جینا ہے اور مرنے کے بعد وہی ہے جس کی طرف ہمیں جانا ہے تو پھر اس کی خاطر تو ہم ہر چیز سے منہ موڑ سکتے ہیں لیکن وہ کون سی طاقت ہو سکتی ہے جو ہمارے رخ کو اس سے موڑ دے؟

یہی کلمہ صابرین کی ڈھال اور سپر ہے۔ اسی پر وہ مصیبت کے ہر وار کو روکتے ہیں۔ اس میں اللہ کی طرف جو تفویض وسپردگی ہے وہ سرفروشی اور جاں بازی کی سپردگی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ بندۂ مومن جب وقت آجاتا

ہے تو یہی نعرہ لگاتا ہوا اپنے رب کے لیے دریا اور پہاڑ سے بھی لڑ جاتا ہے۔ وہ سب کے قدم اکھاڑ دیتا ہے لیکن اس کے قدم کو کوئی چیز بھی اکھاڑ نہیں سکتی۔

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۱۵۷)

'صلوات' کا مفہوم

صَلَوات، صلوٰۃ کی جمع ہے جس کے اصل معنی لغت میں "اقبال الی الشیٔ" یعنی کسی چیز کی طرف بڑھنے کے ہیں۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ نماز کے لیے استعمال ہوا کہ بندہ نماز میں اپنے رب کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی طرح یہ لفظ اس التفات و توجہ کے لیے بھی آتا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف فرماتا ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی الطاف و عنایات ۔ الٰہی کے ہو جاتے ہیں۔ لفظ کی روح تو ایک ہی رہتی ہے لیکن نسبت کے بدل جانے سے ایک میں نیازمندی کا اور دوسرے میں لطف و عنایت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا ترجمہ ہم نے 'عنایتیں' کیا ہے۔ نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے مفہوم میں اس قسم کی تبدیلیوں کی مثالیں عربی زبان میں بہت ملتی ہیں۔ یہاں ان صابرین کے لیے جس عنایت و رحمت اور جس ہدایت کی بشارت ہے اس کا تعلق دین اور دنیا اور آخرت، جیسا کہ اوپر گزرا، دونوں ہی سے ہے۔ صبر و استقامت سے اہل ایمان اپنے رب کے افضال و عنایات کے مستحق قرار پاتے ہیں اور انہی افضال و عنایات سے انہیں اس صراطِ مستقیم کی ہدایت حاصل ہوتی ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی ضامن بنتی ہے۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ (۱۵۸)

اصل سلسلۂ کلام کی طرف رجوع

یہ آیت اصل سلسلۂ بحث یعنی قبلہ کی بحث سے متعلق ہے، اوپر والا مضمون، جیسا کہ واضح ہوا، ضمناً محض ایک تنبیہ کے طور پر آ گیا تھا کہ یہ قبلہ کی تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کے لیے بہت سی آزمائشوں کا پیش خیمہ ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صبر اور نماز وسیلۂ کار ہیں۔ اس ضمنی مضمون کے بعد اصل سلسلۂ بحث کو پھر لے لیا اور صفا و مروہ کے شعائر اللہ میں سے ہونے اور ان سے متعلق احکام و ہدایات کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ یہود نے جس طرح بیت اللہ کے قبلہ ابراہیمی ہونے کے معاملہ کو چھپانے کی کوشش کی جس کا ذکر تفصیل سے اوپر ہو چکا ہے، اسی طرح مروہ کو بھی جو حضرت ابراہیمؑ کی اصل قربان گاہ ہے، چھپانے کی کوشش کی جس کی تفصیل آگے والی آیت کے تحت آ رہی ہے۔

اصل مقام قربانی مروہ ہے

صفا اور مروہ بیت اللہ کے پاس کی وہ دونوں پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان حج و عمرہ کے موقع پر سعی کی جاتی ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب "الرای الصحیح فی من ھو الذبیح" میں پوری تفصیل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اصل قربان گاہ، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی، یہی مروہ ہے[1]۔ جس کا ذکر تورات

---

[1] یہ واضح رہے کہ اصل قربان گاہ تو یہی مروہ ہے لیکن امت کی وسعت کے پیش نظر اس کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔ اس سلسلے کی تفصیلات کے لیے استاذ مرحوم کا رسالہ ذبیح ملاحظہ فرمائیے۔

میں آیا ہے لیکن یہود نے بیت اللہ سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق کاٹ دینے کے لیے اس لفظ کو تحریف کر کے کچھ سے کچھ کر دیا۔

شعائر سے مقصود

شعائر، شعیرہ کی جمع ہے، جس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی، اور اس کا مظہر اور نشان (symbol) ہو۔ اصطلاح دین میں اس سے مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لیے بطور ایک نشان اور علامت کے مقرر کیے گئے ہوں۔ ان مظاہر میں مقصود بالذات تو وہ حقائق ہوا کرتے ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مقرر کیے ہوئے اللہ اور رسول کے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان حقائق کے تعلق سے یہ مظاہر بھی تقدیس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً قربانی حقیقتِ اسلام کا ایک مظہر ہے۔ اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالہ کر دے۔ اپنی کوئی محبوب سے محبوب چیز بھی اس سے دریغ نہ رکھے۔ اس حقیقت کا عملی مظاہرہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کی قربانی کر کے فرمایا، وہ تاریخ انسانی کا ایک بے نظیر واقعہ ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی یادگار میں جانوروں کی قربانی کو ایک شعیرہ کے طور پر مقرر فرما دیا تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کے اندر اسلام کی اصل حقیقت برابر تازہ ہوتی رہے۔

اسی طرح حجر اسود ایک شعیرہ ہے۔ یہ پتھر حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اس روایت کا ایک نشان ہے کہ اس کو بوسہ دے کر یا اس کو ہاتھ لگا کر بندہ اپنے رب کے ساتھ اپنے عہد بندگی اور اپنے میثاق اطاعت کی تجدید کرتا ہے۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں اس کو یمین اللہ (خدا کا ہاتھ) سے تعبیر کیا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ جب اس کو ہاتھ لگاتا ہے تو گویا وہ خدا کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اس سے تجدید بیعت کرتا ہے۔ اور جب اس کو بوسہ دیتا ہے تو گویا یہ اس کی طرف سے خدا کے ساتھ عہد محبت و وفاداری کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح جمرات بھی شعائر اللہ میں سے ہیں۔ یہ نشانات اس لیے قائم کیے گئے ہیں کہ حجاج ان پر کنکریاں مار کر اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کے دشمنوں اور اسلام کے دشمنوں پر، خواہ وہ ابلیس کی ذریات سے تعلق رکھنے والے ہوں یا انسانوں کے کسی گروہ سے، لعنت کرتے ہیں اور ان کے خلاف جہاد کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس بیت اللہ بھی ایک شعیرہ بلکہ سب سے بڑا شعیرہ ہے جو پوری امت کا قبلہ اور توحید و نماز کا مرکز ہے۔ اس کے ارد گرد طواف کر کے اور اپنی نمازوں اور اپنی تمام مسجدوں کا اس کو قبلہ قرار دے کر ہم اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جس خدائے واحد کی عبادت کے لیے یہ گھر تعمیر ہوا ہم اسی کے بندے، اسی کی طرف رخ کرنے والے، اسی کے عبادت گزار اور اسی کی شمع توحید پر پروانہ وار نثار ہیں۔

اسی طرح صفا اور مروہ بھی اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں۔ ان کے شعائر میں سے ہونے کی وجہ

عام طور پر تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ انھی دونوں پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں تگ و دو کی تھی لیکن استاذ امامؒ کا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ اصل قربان گاہ مروہ ہے۔ یہیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں فرمانبردارانہ اور غلامانہ سرگرمی دکھائی اس وجہ سے ان دونوں پہاڑیوں کو شعائر میں سے قرار دے دیا گیا اور اُن کی سعی کی یادگار ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی۔

ان شعائر سے متعلق چند اصولی باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

شعائر سے متعلق چند اصولی باتیں

ایک یہ کہ یہ شعائر، اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ ہیں۔ کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر کسی چیز کو دین کے شعائر میں سے قرار دے دے یا جو چیز شعائر میں داخل ہے اس کو شعائر کی فہرست سے خارج کر دے۔ دین میں اس قسم کے من مانے تصرفات سے شرک و بدعت کی راہیں کھلتی ہیں جن قوموں نے اپنے جی سے شعائر قرار دیے، تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے اس طرح شرک و بت پرستی کی راہیں کھول دیں۔

دوسری یہ کہ جس طرح شعائر اللہ کے مقرر کردہ ہیں اسی طرح اسلام میں ان شعائر کی تعظیم کے حدود بھی خدا اور رسول ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ جس شعیرہ کی تعظیم کی جو شکل شریعت میں ٹھہرا دی گئی ہے وہی اس حقیقت کے اظہار کی واحد شکل ہے جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے، اس سے سرِمُو انحراف نہ صرف اس شعیرہ کی حقیقت سے انسان کو محروم کر دینے والی بات ہے بلکہ اس سے شرک و بدعت کے دروازے بھی کھل سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ حجرِ اسود ایک شعیرہ ہے۔ اس کی تعظیم کے لیے اس کو حالتِ طواف میں بوسہ دینے یا اس کو ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چوم لینے یا اس کی طرف اشارہ کرنے کی شکلیں خود دین کے لانے والے کی طرف سے مقرر کر دی گئی ہیں۔ اگر کوئی شخص تعظیم کی صرف انہی شکلوں پر قناعت نہ کرے بلکہ تعظیمِ شعائر اللہ کے جوش میں وہ اس پتھر کے آگے گھٹنے ٹیکنے لگے یا اس کے سامنے نذریں پیش کرنے لگے یا اس پر پھول نثار کرنے لگے یا اس طرح کی کوئی اور حرکت کرنے لگے تو ان باتوں سے وہ نہ صرف یہ کہ اس حقیقت سے بالکل دور ہو جائے گا جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے بلکہ وہ شرک و بدعت میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔

تیسری یہ کہ ان شعائر میں اصل مطمحِ نظر وہ حقیقتیں ہُوا کرتی ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ ان حقیقتوں کے اظہار کے لیے یہ شعائر گویا قالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ملت کی زندگی کے لیے سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں یہ حقیقتیں برابر زندہ اور تازہ رکھی جائیں۔ اگر یہ اہتمام سرد پڑ جائے تو دین کی اصل روح نکل جاتی ہے، صرف قالب باقی رہ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں کی اصل توجہ صرف قوالب پر مرکوز ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین صرف ایک مجموعۂ رسوم بن کے رہ جاتا ہے۔

زیرِ بحث آیت میں یہ جو فرمایا کہ "صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں" تو اس سے مقصود ایک طرف تو یہ ہے کہ ان دونوں شعائر کو جاہلیت کے گرد و غبار سے پاک کر کے ان کو وراثتِ ابراہیمی کی حامل امت کے لیے از سرِ نو اجاگر کیا جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عرب جاہلیت نے ان دونوں پہاڑوں پر، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے، دو بت رکھ دیے تھے اور ان بتوں کے لیے سعی و طواف کرنے لگے تھے جس کے سبب سے ان شعائر کا نہ صرف شعائر ابراہیمی میں سے ہونا مشتبہ ہو گیا تھا بلکہ یہ علانیہ شرک و بت پرستی کے مظہر بھی بن گئے تھے۔ قرآن نے اوپر کی آیات میں جس طرح بیت اللہ کو، تمام مشرکانہ آلودگیوں سے پاک صاف کر کے، اس کے اصل ابراہیمی جمال میں پیش کیا اسی طرح یہاں صفا اور مروہ کی اصل تاریخ بیان فرمائی کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے شعائر اللہ میں سے ہیں اور ان کے سعی و طواف کی سنت حضرت ابراہیمؑ کی سعی و طواف کی یادگار ہے لیکن مشرکین نے جس طرح توحید کے مرکز بیت اللہ میں سیکڑوں بت لا کر رکھ دیے اسی طرح ان شعائر کو بھی بت پرستی سے ملوث کیا۔ اب یہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ تم گندگی کے اس ڈھیر کو ہٹا کر ان شعائر کو از سرِ نو اجاگر کرو اور ان کے سعی و طواف کو صرف اللہ ہی کے لیے خاص کرو۔

دوسری طرف یہود نے ان شعائر پر تحریف اور کتمان کا جو پردہ ڈال دیا تھا، جیسا کہ آگے والی آیت میں ذکر آ رہا ہے قرآن نے وہ پردہ بھی اٹھا دیا۔ اوپر ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ تورات میں یہ ذکر صراحت کے ساتھ موجود تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی مروہ کے پاس کی لیکن یہود نے محض اس خیال سے اس لفظ کا صحیح تلفظ بالکل مسخ کر ڈالا کہ کسی طرح اس مقام کو مکہ کے بجائے بیت المقدس میں ثابت کر دیں۔ اور اس طرح آخری نبی کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں تورات میں موجود ہیں وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل کی جگہ حضرت اسحاقؑ کی نسل کی طرف منتقل ہو سکیں۔ قرآن نے یہاں مروہ کا حوالہ دے کر اس نشان کی طرف انگلی اٹھا دی جس کو محض حسد اور شرارت کی بنا پر غائب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

ان دونوں پہاڑیوں کے طواف کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی صحیح شکل اور اس کے حدود کا تعین دوسرے مناسکِ حج کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں لفظ طواف کا استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد وہ سعی ہی ہے جو ان دونوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ اس سعی کو طواف کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شکل اس طواف سے ملتی جلتی ہوئی ہے جو خانہ کعبہ کے اردگرد ہوتا ہے۔ اس سعی کو حج و عمرہ کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ حج و عمرہ کے مجموعہ ہی کا ایک جزو ہے، ان سے علیحدہ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ اس سے ان مشرکانہ رسوم کی بالکل نفی ہو جاتی ہے جن کا اضافہ ان شعائر کے سلسلہ میں مشرکین نے کر دیا تھا۔

اس طواف کا حکم جن الفاظ میں وارد ہے وہ کسی قدر وضاحت طلب ہیں۔ فرمایا ہے۔

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا — پس جو حج یا عمرہ کرے تو اس کے لیے اس بات میں

جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف کرے۔

حکمِ سعی کی نوعیت

اس اسلوبِ بیان سے بظاہر یہ بات نکلتی ہے کہ اس سعی کے لیے شریعت میں صرف اجازت ہے، اگر کوئی شخص یہ نہ کرے یا نہ کر سکے تو اس میں بھی کوئی خاص قباحت نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر مراد یہ ہوتی تو اسلوبِ کلام، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا، فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا کے بجائے اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ فرمانے کے بعد کہ صفا اور مروہ دونوں شعائر اللہ میں سے ہیں یہ کہنا کچھ ناموزوں اور بے جوڑ سا ہو جاتا ہے کہ ان کا طواف کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہے۔ پہلی بات کے بعد ان کے ہم وزن اور اس سے ہم آہنگ بات تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان کا طواف ضروری قرار دیا جائے۔ رہا یہ سوال کہ یہ کس درجہ میں ضروری ہے، اس کی حیثیت فرض کی ہے یا واجب کی یا مستحب کی، اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ خیال کرنے کی تو کوئی گنجائش بھی نہیں ہے کہ اس قدر شاندار تمہید کے بعد اصل بات اتنے کمزور درجہ کی ہو۔ اسی وجہ سے ہمارا خیال یہی ہے کہ یہاں سعی کا حکم ہے اور یہ حکم وجوب کے درجہ میں ہے۔

لیکن اس پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر مدعا یہی ہے تو یہاں فَلَا جُنَاحَ کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس رفعِ حرج کا تعلق سعی کے حکم سے نہیں ہے بلکہ اس قباحت سے ہے جو اس حکم کے نزول کے وقت مقامِ سعی میں بتوں کی موجودگی کی وجہ سے پائی جاتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت صفا اور مروہ میں یہ قباحت موجود ہے لیکن چونکہ یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے شعائرِ حج میں سے ہیں اس وجہ سے حج و عمرہ کے موقع پر ان کے درمیان سعی کرو، تمہارا عمل تمہاری نیت کے مطابق ہوگا۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ میں تطوّع سے مراد یہ ہے کہ آدمی کسی فرض سے سبکدوش ہو چکنے کے بعد خدا کی خوشنودی اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے مزید اس کو ایک نفلی نیکی کی حیثیت سے انجام دے۔ یہاں اس تطوع کا تعلق صرف سعی کے حکم سے نہیں ہے۔ اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سعی کوئی مستقل عبادت نہیں ہے بلکہ یہ حج و عمرہ ہی کا ایک ضمیمہ ہے، اس وجہ سے اس تطوع کا تعلق بھی حج و عمرہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو حج و عمرہ وہ ہے جو ادائے فرض کے طور پر انجام دیا جائے، دوسرے تطوع کے طور پر بھی حج و عمرہ کیے جا سکتے ہیں، جو لوگ ایسا کریں گے اللہ ان کی اس نیکی کو قبول فرمائے گا اور یہ اس کے علم میں رہے گی۔ ایک دن وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

شکر کا لفظ صلوٰۃ یا توبہ کے الفاظ کی طرح ان الفاظ میں سے ہے جن کے معنی میں نسبت کی تبدیلی سے فرق ہو جایا کرتا ہے۔ جب بندے کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے تو اس کے معنی شکر گزاری کے ہوتے ہیں، لیکن جب اس کی نسبت خدا کی طرف ہو تو اس کے معنی قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ
فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ (۱۵۹)

یہود کا کتمانِ حق

یہ اشارہ یہود کی طرف ہے اور آیت میں بیّنات اور ہدیٰ سے مراد اگرچہ وہ عام تعلیمات بھی ہیں جن کو یہود نے چھپانے کی کوشش کی لیکن یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ اس سے خاص طور پر وہ نشانیاں مراد ہیں جو تورات میں اللہ تعالیٰ نے اس لیے واضح فرمائی تھیں کہ ان کی مدد سے یہود کو آخری پیغمبر کے باب میں رہنمائی حاصل ہو سکے۔ لیکن یہود نے ان نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ان کو چھپانے کی کوشش کی۔ اس کی بعض مثالیں ہم اس کتاب کے پچھلے صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ہم استاذ امام کی عظیم تصنیف الرای الصحیح فی من ہو الذبیح کی آٹھویں فصل کا حوالہ دیں گے جس میں انھوں نے مروہ سے متعلق یہود کی تحریفات پر بحث کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی جگہ کو تورات سے غائب کرنے کے لیے کیا کیا تدبیریں کیں اور کس بیدردی کے ساتھ لفظ مروہ کا حلیہ بگاڑا تاکہ آخری نبی کی پیشین گوئیوں سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں گھپلا پیدا کیا جا سکے۔

ایک عظیم حقیقت کا چھپانا جب کہ وہ ان کی اپنی کتاب میں اچھی طرح واضح کی جا چکی ہو اور جس کو خلق کے سامنے واضح کرنے کا ان سے عہد بھی لیا جا چکا ہو، جیسا کہ آل عمران، ۱۸۷ میں حوالہ ہے۔ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ (اور یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے میثاق لیا کہ اس کتاب کو اچھی طرح لوگوں کے سامنے واضح کرنا) یہود کا ایک ایسا جرم تھا جس پر وہ خدا کی لعنت کے مستحق ٹھہرے اور کتاب الٰہی کی امانت جو ان کے سپرد کی گئی تھی ان سے چھین کر دوسروں کے سپرد کر دی گئی۔

اس لعنت کے متعلق فرمایا ہے کہ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ اس کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح اصطفاء یعنی کسی امت کا دنیا کی امامت کے لیے منتخب کیا جانا اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے اسی طرح یہ لعنت اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑی سزا ہے جس قوم کو یہ سزا دی جاتی ہے وہ دنیا میں توفیق ہدایت اور منصبِ امامت سے محروم کر کے ذلت و خواری میں مبتلا کر دی جاتی ہے اور آخرت میں اس کے لیے ابدی عذاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی حق پوشی سے صرف اپنی ہی ضلالت کا سامان نہیں کرتی بلکہ راہ کے نشانات ہدایت غائب کر کے دوسرے بے شمار لوگوں کو بھی گمراہی اور ہلاکت میں مبتلا کرتی ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۱۶۰)

توبہ کے لیے شرط

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس لعنت سے محفوظ رہیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حق پوشی کے جرم سے توبہ کر لیں، اس توبہ کے ساتھ اَصْلَحُوْا کی شرط لگائی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ توبہ اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک آدمی اس غلطی کی اصلاح نہ کرے جس کا مرتکب ہو رہا ہے۔ مزید شرط اس کے ساتھ

"بَیَّنُوْا" کی لگائی۔ یہ موقع کی مناسبت سے ہے اور سابق الذکر "اَصْلَحُوْا" کی وضاحت کر رہی ہے۔ یعنی آخری نبی سے متعلق تورات کے جن حقائق و بینات کو انھوں نے چھپایا ہے اس کو ظاہر کریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کم از کم یہود کے خواص اور علماء ان تحریفات سے بے خبر نہیں تھے جو حق پوشی کی سازش کے تحت کی گئی تھیں یا کی جا رہی تھیں۔ اس کا ثبوت اس امر سے بھی بہم پہنچ رہا ہے کہ یہود کے اہلِ علم میں سے جو لوگ نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہوئے انھوں نے اس قسم کے بہت سے حقائق سے پردے اٹھائے بھی۔

اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ میں توبہ کے ساتھ علیٰ کا صلہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس کے اندر رحمت کا مضمون بھی پوشیدہ ہے یعنی ایسے لوگوں کی توبہ میں قبول کرتا اور ان پر رحم کرتا ہوں۔ لفظ کی اس مخفی حقیقت کو اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ کہہ کر واضح فرما دیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (۱۶۱)

"جن لوگوں نے کفر کیا اور حالت کفر ہی میں مرے" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی ضد پر اڑے رہ گئے اور توبہ و اصلاح اور اظہار و اعلان حق سے محروم ہی دنیا سے اٹھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق پوشی ایک ایسا جرم ہے جو ان کی دینداری کی دوسری باتوں اور ان کے ایمان و محبتِ الٰہی کے تمام دعووں کو بالکل باطل کر دے گا۔ اور اس کی پاداش میں وہ اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کے سزاوار ہوں گے۔ یہاں اللہ کی لعنت کے ساتھ فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت کا ذکر اس اجمال کو واضح کر رہا ہے جو اوپر والی آیت کے الفاظ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ میں موجود تھا اور النَّاس کے ساتھ اجمعین کی قید یہ حقیقت واضح کر رہی ہے کہ قیامت کے روز جب اصل حقیقت سے پردہ اُٹھے گا تو صرف نیک لوگ ہی ان پر لعنت نہیں بھیجیں گے بلکہ وہ گنہگار بھی ان پر لعنت بھیجیں گے جو ان کی پیروی میں گمراہ ہوں گے۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ (۱۶۲)

یعنی نہ تو جس عذاب میں وہ ڈالیں جائیں گے اس میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ اس کے تسلسل میں کوئی وقفہ یا انقطاع واقع ہوگا کہ اس سے انہیں ذرا دم لینے ہی کا موقع مل جائے۔

۵۲۔ آگے کا مضمون —— آیات ۱۶۳-۱۷۶

سورہ کے مطالب کا دوسرا باب

آیات ۱۶۲ پر اس سورہ کا پہلا باب ختم ہوا۔ اس باب میں یہود منصبِ امامت سے معزول ہوئے اور ایک نئی امت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ نمایاں ہوئی۔ اب آگے آیت ۱۶۳ سے اس سورہ کے مطالب کا دوسرا باب شروع ہو رہا ہے جس میں اس نئی امت کے لیے از سر نو شریعتِ الٰہی کی تجدید کی جا رہی ہے۔ اس باب میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ امت کو وہ احکام دیے گئے ہیں جن کے لیے سورہ

کے زمانہ نزول کے حالات متقاضی تھے اور ساتھ ہی ہر حکم کے تحت ان بدعات کی تردید کی گئی ہے جو یہود یا مشرکین نے شریعت الٰہی میں ملا دی تھیں۔

اس باب کا آغاز توحید کے بیان سے ہو رہا ہے اس لیے کہ تمام دین کی بنیاد اسی چیز پر ہے۔ توحید کے دعوے کے ذکر کے بعد اس کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ توحید کی یہ دلیل وہی دلیل ہے جس کی طرف اس کتاب کی فصل ۲۲ میں ہم دلیل توافق کے نام سے اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں یہ دلیل اپنے بعض نئے پہلوؤں کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے جن کی وضاحت آیات کی تفسیر کے تحت آئے گی۔ پھر شرک کی تردید فرمائی ہے اس ضمن میں کسی چیز کو خدا کے حکم کے بغیر حرام یا حلال ٹھہرانے کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ اس لیے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ چیز بھی شرک ہی میں داخل ہے۔

پھر ان چیزوں کی طرف ایک سرسری اشارہ فرمایا جو فی الواقع اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مشرکین یا اہل کتاب نے بعض چیزیں جو اپنے جی سے محض اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت یا اپنی خواہشوں کے لیے حرام یا حلال کی ہیں ان کی تحریم و تحلیل کو شریعت الٰہی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بعد چند آیات میں مشرکین کو ان کی اندھی بہری تقلید آبا پر اور اہل کتاب کو ان کی حق پوشی پر سرزنش فرمائی ہے کہ اگر یہ عقل سے کام لیتے اور محض خواہشات نفس کی پیروی میں ضلالت کو ہدایت پر ترجیح نہ دیتے تو وہ توحید کی مخالفت اور شرک کی حمایت نہ کرتے لیکن انھوں نے اپنی شامت اعمال سے اپنے لیے ابدی ہلاکت کی یہی راہ اختیار کی ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۶۳-۱۷۶ ع ۱۹ وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾
اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ
بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ
مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَ

الَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ۗ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ
الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾
إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ
وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ
أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ
اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ
النَّارِ ﴿١٦٧﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ع ٢٠
وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿١٦٨﴾ إِنَّمَا
يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾
وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ
مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ
شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي
يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ
لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ
وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ
الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ
فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَحِيمٌ ﴿١٧٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَ

يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ
بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى
وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ
اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ
لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۱ ۵

ترجمہ آیات ۱۶۳-۱۷۶

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمان اور رحیم ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اس میں ہر قسم کے جان دار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مامور ہیں، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ ۱۶۳-۱۶۴

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھہراتے ہیں، جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیئے۔ لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جب کہ یہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب

دینے والا ہے۔ ۱۶۵

اس وقت کا خیال کرو جب کہ مقتدا اپنے پیرووں سے اظہار براءت کریں گے، اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تعلقات یک قلم ٹوٹ جائیں گے اور ان کے پیرو بھی کہیں گے کہ اے کاش ہمیں دنیا میں ایک بار اور جانا نصیب ہوتا کہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہار براءت کرسکتے جس طرح انھوں نے ہم سے اظہار براءت کیا ہے! اس طرح اللہ ان کے اعمال ان کو سرمایہ حسرت بنا کر دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ ۱۶۶-۱۶۷

اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں ان کو کھاؤ۔ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تو بس تمھیں برائی اور بے حیائی کی راہ سوجھائے گا اور اس بات کی کہ تم خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمھیں کوئی علم نہیں ہے۔ ۱۶۸-۱۶۹

اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہ ہدایت پر رہے ہوں؟ ان کافروں کی تمثیل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیزوں کو پکارے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سنتی سمجھتی ہوں۔ یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، یہ سمجھ نہیں سکتے۔ ۱۷۰-۱۷۱

اے ایمان والو، جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ اور اللہ ہی کے شکر گزار بنو اگر تم اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔ اس نے تو بس تمھارے لیے مردار، خون، سور کا گوشت

اور غیر اللہ کے نام کے ذبیحہ کو حرام ٹھہرایا ہے۔ اس پر بھی جو مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس کے لیے کوئی گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ۱۷۲-۱۷۳

بے شک جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو خدا نے اپنی کتاب میں سے اتاری ہے اور اس کے عوض میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں صرف دوزخ کی آگ بھر رہے ہیں۔ ان لوگوں سے خدا قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا، نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے بس عذاب دردناک ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت پر اور عذاب کو مغفرت پر ترجیح دی، یہ دوزخ کے معاملہ میں کتنے ڈھیٹ ہیں! ۱۷۴-۱۷۵

یہ اس لیے ہو گا کہ اللہ نے اپنی کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے اور جن لوگوں نے اس کتاب کے معاملہ میں اختلاف کیا ہے وہ مخالفت میں بہت دور نکل گئے۔ ۱۷۶

۵۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۱۶۳)

اِلٰـہ کے معنی معبود کے ہیں۔ اسی پر الف لام تعریف کا داخل کر کے لفظ اللہ، اللہ تعالیٰ کے لیے بطور اسم ذات استعمال ہوا۔ رحمان اور رحیم کی تحقیق اور ان دونوں کے فرق کی وضاحت سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

یہ توحید ہی سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز ہے جو ملت ابراہیمؑ کی وراثت کی حیثیت سے اس امتِ مسلمہ کی طرف منتقل ہوئی۔ اس کا ذکر یہاں مثبت اور منفی دونوں ہی پہلوؤں سے فرمایا ہے تاکہ اس میں کسی رخنہ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس میں اگر کوئی رخنہ پیدا ہو جائے تو یہ بنیاد کا رخنہ ہے جس سے شیطان کو پورے دین میں رخنہ اندازی کے لیے راہ مل جاتی ہے۔

رحمان اور رحیم کے ذکر کے دو پہلو

اس توحید کے ذکر کے ساتھ اسمائے حسنیٰ میں سے رحمان اور رحیم کا حوالہ دو مختلف پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔

اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ شرک کے اسباب و محرکات میں سے ایک بہت بڑا سبب خدا کے ہر قسم کے شغل و عمل اور ہر نوع کے تعلق سے ارفع اور بالاتر ہونے کا غلط تصور بھی ہے۔ یہ تصور ہے تو ایک تنزیہی تصور لیکن بعض صورتوں میں یہ خدا کی بے ہمگی کو اس قدر بڑھا دیتا ہے کہ خلق سے اس کا تعلق بالکل ہی منقطع ہو جاتا ہے اور اس تک رسائی حاصل کرنا یا خلق کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق رکھنا اس کی شانِ الوہیت کے منافی قرار پا جاتا ہے۔ خدا کی بے ہمگی کا یہ تصوّر فطری طور پر دلوں میں اس کی طرف سے ایک مایوسی پیدا کرتا ہے اور یہ مایوسی بالآخر ان وسائل و وسایط کو جنم دیتی ہے جن کو انسان خدا کے نہ پا سکنے کی شکل میں اپنے لیے تسلی و طمانیت کا ذریعہ بناتا ہے۔ قرآن نے معرفتِ الٰہی کی راہ کے اس مغالطے کو دور کرنے کے لیے جگہ جگہ یہ کیا ہے کہ خدا کی وحدانیت، اس کی بے ہمگی اور اس کی برتری کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کی ایسی صفات کا بھی حوالہ دے دیا ہے جو خلق کے ساتھ اس کے تعلق کو واضح کرنے والی ہیں تاکہ انسان وسائل و وسائط کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے خود خدا کے دامنِ رحمت کو پکڑنے اور اسی میں چھپنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس پہلو سے سورۂ اخلاص میں، جو توحید کی سب سے بڑی سورہ ہے، اگر ایک طرف خدا کی بے ہمگی کو واضح کرنے کے لیے هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (وہ اللہ بے ہمہ ہے) فرمایا تو ساتھ ہی اس کی باہمگی کو واضح کرنے کے لیے اَللّٰهُ الصَّمَدُ (اللہ باہمہ ہے) بھی فرما دیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ خدا سب سے بے نیاز اور بالاتر ہونے کے باوجود سب کے لیے پناہ، سب کے لیے مرجع اور سب کے لیے سہارے کی چٹان بھی ہے۔

اسی اصول پر زیرِ بحث آیت میں بھی خدا کی وحدانیت کو مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے بیان کرنے کے بعد یہ بھی واضح فرما دیا کہ وہ خدا رحمان اور رحیم ہے۔ ہم سورۂ فاتحہ میں ان دونوں لفظوں کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ان میں سے پہلا لفظ خدا کی رحمت کے جوش پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا اس کی رحمت کے تسلسل اور دوام پر۔ مقصد یہ ہے کہ خدا ہے تو واحد اور یکتا، سب سے بے نیاز، اور سب سے بالاتر لیکن وہ رحمان اور رحیم بھی ہے۔ اس نے اپنے جوشِ رحمت سے تمھیں وجود بخشا ہے، اپنی رحمت ہی کے آغوش میں تمھاری تربیت اور پرورش کر رہا ہے اور اپنی اس رحمت ہی کے لیے اس نے تمھارے واسطے جزا اور سزا کا ایک دن مقرر کیا ہے پس تم اسی کے لیے جیو اور اسی کے لیے مرو اور اپنی تمام آرزوئیں اور امیدیں اکیلے اسی سے وابستہ کرو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ مشرک اور بت پرست قوموں نے ہمیشہ قہر و غضب کو الوہیت کے ضروری لوازم میں سے سمجھا ہے۔ انھوں نے کائنات کے بادشاہ کو دنیاوی بادشاہوں پر قیاس کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ جب دنیا کے بادشاہ صرف ایک ایک علاقے کے بادشاہ ہو کر یہ جلال و جبروت رکھتے ہیں کہ ان کے مقربین اور درباریوں کے سوا کسی کے لیے بھی ان کے سامنے مجالِ دم زدن نہیں ہوتی، وہ جس کو چاہیں اور جب چاہیں دار پر چڑھا دیتے ہیں تو جو سارے جہان کا بادشاہ ہے اس کے جلال و جبروت اور اس کے قہر و غضب کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس طرح انھوں نے خدا کا تصور ایک نہایت خوفناک اور ہولناک ہستی کی حیثیت سے کیا اور پھر اس کے

کچھ مقربین اور درباری محض اپنے ذہن سے ایجاد کر کے ان کی پرستش شروع کی تاکہ یہ ان کو اس ہولناک خدا کی آفتوں سے محفوظ رکھیں۔ آسمانی مذاہب رکھنے والی قومیں اگرچہ خدا کے صحیح تصور سے ناآشنا نہیں تھیں لیکن امتدادِ زمانہ نے مشرک قوموں کے اثرات سے ان کے عقائد کو بھی آلودہ کر دیا اور ان کے یہاں بھی خدا کی جمالی صفات پر اس کی جلالی صفات کا رنگ غالب ہو گیا۔ چنانچہ تورات کے مطالعہ سے یہ حقیقت صاف عیاں ہوتی ہے کہ یہود نے بھی خدا کے قہر و جلال کی داستان اتنی بڑھا دی تھی کہ اس کے مقابل میں خدا کے رحمان و رحیم ہونے کا تصور بالکل دب گیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ وہ بھی مشرک قوموں کی طرح خدا کی رحمت حاصل کرنے کے لیے مقربین اور سفارشیوں کے محتاج ہوئے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے ان بزرگوں کو وسیلہ ٹھہرایا جن کے تقدسُ تقرب کی روایتیں ان کے ہاں موجود تھیں اور پھر آہستہ آہستہ خاندانِ اسرائیل کو تو انھوں نے خدا کے چہیتوں اور محبوبوں میں شامل کر لیا اور غیر بنی اسرائیل خدا کے قہر و غضب کے لیے رہ گئے —— چونکہ آیت زیرِ بحث میں توحید کی یہ امانت بنی اسرائیل سے واپس لے کر امتِ مسلمہ کے حوالے کی جا رہی ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہُوا کہ خدا کی صفاتِ رحمانیت و رحیمیت پر سے وہ پردہ اٹھا دیا جائے جو مشرکین کی تقلید میں یہود نے ان پر ڈال دیا تھا تاکہ یہ امت صفاتِ الٰہی کے باب میں اس نقطۂ اعتدال پر آ جائے جو امتِ وسط ہونے کے پہلو سے اس کے مزاج کی خصوصیت ہے اور اس طرح شرک کے فتنوں کا سدِ باب ہو جائے۔

ہم یہاں صرف انھی دو پہلوؤں کے ذکر پر قناعت کرتے ہیں۔ اس کے کچھ اور پہلو بھی توجہ کے قابل ہیں لیکن ان کے ذکر کے لیے ہماری اس کتاب میں زیادہ موزوں مواقع آگے آئیں گے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۱۶۴)

آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف ایک جامع اشارہ

آسمان اور زمین کی خلقت سے مراد ان کی وہ پیدائش بھی ہے جس سے خالق کی عظیم قدرت واضح ہوتی ہے، ان کی وہ ساخت بھی ہے جس سے اس کی بے مثال کاریگری اور حیرت میں ڈال دینے والی حکمت کی شہادت ملتی ہے، ان کی وہ نفع رسانی اور فیض بخشی بھی ہے جس سے خالق کی رحمانیت و رحیمیت اور پروردگاری ثابت ہوتی ہے، وہ مقصدیت بھی ہے جو گواہی دیتی ہے کہ اتنی حکمتوں سے یہ معمور کارخانہ عبث اور بے غایت نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم مقصد ہے جس کے ظہور کے لیے ایک دن مقرر ہے، اور ان کی وہ موافقت اور سازگاری بھی ہے جو ثابت کرتی ہے کہ آسمان اور زمین دونوں ایک ہی خالق کے ارادہ سے ظہور میں آئے ہیں اور اسی کی اسکیم اور اسی کے حکم کے تحت چل رہے ہیں، ان کے اندر کسی اور کے ارادہ اور تصرف

کو کوئی دخل نہیں ہے ــــ یہ مختلف پہلو قرآن مجید میں گوناگون اسلوبوں سے واضح کیے گئے ہیں جن کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

اختلافِ لیل ونہار سے مراد ایک تو رات اور دن کی یکے بعد دیگرے، پورے نظام، پوری پابندیِ اوقات اور کامل تسلسل کے ساتھ آمد و شد ہے، جیسا کہ فرمایا ہے۔ هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۶۲- الفرقان (اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا، ان لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کرنا چاہیں یا خدا کے شکر گزار بننا چاہیں) دوسرے ان کا وہ اختلاف بھی ہے جو ان کے مزاج، ان کی فطرت، ان کی شکل و صورت اور ان کے ظاہری اور باطنی اثرات و نتائج میں ہے لیکن اس اختلاف و تضاد کے باوصف یہ دونوں اس کائنات کی مجموعی خدمت و بہبود میں شب و روز سرگرم ہیں۔

فُلک کے معنی کشتی کے ہیں۔ یہ لفظ اسی شکل میں واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔ مؤنث تو اس آیت ہی میں استعمال ہوا ہے۔ مذکر کے لیے قرآن مجید میں 'فی الفلك المشحون' کی ترکیب موجود ہے۔

'بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ' سے مراد وہ سامان تجارت و معیشت ہے جس کے حمل و نقل کا یہ کشتیاں ذریعہ بنتی ہیں اور جس سے معاشرت و تمدن کی توسیع و ترقی کی نہایت وسیع راہیں کھلی ہیں۔

زمین کی موت اور اس کی زندگی سے مراد اس کا خشک اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو سبزوں اور پودوں سے لہلہا اٹھنا ہے۔

لفظ 'دابة' کا استعمال

'دَابَّة' کا معروف استعمال تو زمین پر چلنے پھرنے والوں جانوروں ہی کے لیے ہے بلکہ زیادہ نمایاں طور پر ان جانوروں کے لیے جو سواری یا بار برداری کے کام آتے ہیں، لیکن یہ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس معنی میں ہم "جاندار" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے پہلے معنی کے لحاظ سے پرندے اس کے مفہوم سے خارج ہیں، صرف زمین پر چلنے پھرنے یا رینگنے والے جانور ہی اس سے مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے بعض مقامات پر پرندوں کو اس لفظ کے مفہوم سے الگ رکھا ہے، مثلاً فرمایا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ ۳۸- انعام (اور نہیں ہے زمین پر چلنے والا کوئی جانور اور نہ اپنے بازوؤں سے اڑنے والا کوئی پرندہ) لیکن جب یہ اپنے دوسرے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے تحت سارے ہی جاندار آجاتے ہیں، عام اس سے کہ وہ چرند ہیں یا پرند بلکہ اس صورت میں یہ بنی نوع انسان کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اس مفہوم کے لیے قرآن مجید سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ فرمایا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا	اور اگر اللہ لوگوں کو ان کی بدعملیوں پر فوراً سزا دینے
تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ ۴۵- فاطر)	والا ہوتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی جیتا نہ چھوڑتا

اس آیت میں ' دابۃ ' کا لفظ تمام جانداروں کے لیے استعمال ہوا ہے ، عام اس سے کہ وہ چرند و پرند ہوں یا انسان ۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ (۶۰ - عنکبوت)	اور کتنے جاندار ہیں جو اپنے ساتھ اپنی روزی اٹھائے نہیں پھرتے ، اللہ ان کو بھی روزی دیتا ہے اور تم کو بھی ۔

اس آیت میں ' دابہ ' کا لفظ چرند و پرند سب پر حاوی ہے ۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۶ - هود)	اور زمین میں کوئی جاندار نہیں ہے مگر اللہ ہی کے ذمہ ہے اس کی روزی ۔

اس آیت میں بھی یہ لفظ اپنے وسیع معنی ہی میں استعمال ہوا ہے

ہمارے نزدیک آیت زیر بحث میں بھی یہ لفظ جاندار کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ اسی مفہوم کے لحاظ سے کیا ہے ۔

'تصریف ریاح' سے مراد

' تَصْرِيْفِ رِيَاح ' سے مراد ہواؤں کی گردش ہے ۔ ان کی اس گردش کے مختلف پہلو خود قرآن میں بیان ہوئے ہیں ۔ کبھی یہ اپنے کندھوں پر پانی سے بوجھل بادلوں کو لاد کر لاتی ہیں اور زمین کو جل تھل کر دیتی ہیں ، کبھی یہ انھی بادلوں کو اس طرح اڑا کر لے جاتی ہیں کہ کہیں ان کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا ۔ ایک قوم کے لیے یہ عذاب بن کر نمودار ہوتی ہیں ، دوسری قوم کے لیے رحمت بن کر ۔ انھی کی گردش سے فرعون اور اس کی قوم غرقِ دریا ہوئی اور انھی کے تصرف نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اسی دریا سے پار کرایا ۔ پھر کبھی یہ مرطوب بن کر فصلوں کو نشو و نما دیتی ، ان کو اگاتی اور پروان چڑھاتی ہیں ، کبھی گرم اور خشک ہو کر ان کو پکاتی اور تیار کرتی ہیں ، کبھی یہ خزاں بن کر پتوں کو مرجھاتی اور چمن کو اجاڑتی ہیں ، کبھی بہار بن کر ایک ایک ٹہنی اور ایک ایک شاخ کو پھولوں اور کلیوں سے لاد دیتی ہیں ۔ ان کے بھیس مختلف ہیں اور ہر بھیس میں نئی آن اور نئی شان ہے اور جو شان بھی ہے وہ ان کے مُصرِّف (خدا) کی حکمت و قدرت اور اس کی رحمت و ربوبیت کا ایک عظیم نشان ہے ۔

'تسخیر' کا مفہوم

تسخیر کے معنی ہیں کسی کو مطیع و فرمانبردار بنا کر بلا کسی اجرت و معاوضہ کے کسی کی خدمت میں لگا دینا ۔ بادلوں کے آسمان و زمین کے درمیان مسخر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ خدا کے امر و حکم کے تحت بالکل مقہور و مجبور ہر لمحہ و ہر آن ، بالکل تیار کھڑے ہیں کہ جب ، اور جس جگہ کے لیے اور جس شکل میں ان کو حکم ہو وہ اس حکم کی تعمیل کریں ۔ یہ مسخر خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی اپنی ربوبیت اور اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت ان کو رحمت یا عذاب کی جس شکل میں چاہتا ہے استعمال کرتا ہے ۔ قرآن میں انسانوں کی نسبت کے ساتھ جب ابر و ہوا کی تسخیر کا ذکر آتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ ابر یا ہوا یا سورج یا چاند انسان کے ہاتھ میں مسخر ہیں یا وہ ان کو مسخر کر سکتا ہے بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ پروردگارِ عالم نے ان چیزوں کو مسخر کر

کے ان کو انسان کی نفع رسانی اور اس کی خدمت میں لگا دیا ہے اور یہ رات دن خدمت میں لگے رہنے کے باوجود انسان سے کسی اُجرت یا صلہ کے طالب نہیں بنتے۔ اسی وجہ سے جہاں کہیں یہ مضمون بیان ہوا ہے وہاں سَخَّرَ لَكُمْ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے ان کو تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا ہے، یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے۔ تابع فرمان یہ صرف خدا ہی کے ہیں۔ انسان زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ خدا نے ان چیزوں کو جن طبیعی قوانین کے ماتحت رکھا ہے ان میں سے بعض کو اپنی سائنس کے زور سے دریافت کر لے اور ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ لیکن ان تمام قوانین کا اصل سر رشتہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان اس سر رشتہ پر کبھی قابو نہیں پا سکتا۔

عقل کی تربیت

مذکورہ بالا تمام چیزوں کا حوالہ دے کر فرمایا کہ ان کے اندر عقل سے کام لینے والوں کے لیے آیات ہیں، آیت کے معنی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، نشانی اور علامت کے بھی آتے ہیں۔ جو چیز کسی چیز کی نشانی اور علامت ہوتی ہے، وہ اس کی دلیل ہوا کرتی ہے اس وجہ سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مذکورہ چیزیں کس چیز پر اور کس نوعیت سے دلیل ہیں، یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ یہاں یہ تو فرمایا کہ ان چیزوں کے اندر دلیلیں ہیں لیکن یہ نہیں واضح فرمایا کہ یہ دلیلیں کن چیزوں پر ہیں اور ان کے دلیل ہونے کی شکل کیا ہے۔ نشانیوں کی طرف اشارہ کر کے، اصل سوال کو ہماری عقل و بصیرت پر چھوڑ دیا ہے کہ جو لوگ اپنی عقل اور سمجھ سے کام لیں گے وہ ان دلیلوں کو خود سمجھ جائیں گے۔ قرآن مجید نے یہ طریقہ اکثر مقامات میں اختیار کیا ہے اور مقصود اس سے ہماری عقل و فکر کی تربیت ہے کہ ہم آفاق و انفس کے اندر پھیلے ہوئے دلائل کو خود سمجھنے اور ان سے صحیح نتائج تک پہنچنے کے قابل ہو سکیں۔

قرآن کے اجمالی اشارات پر غور کرنے کا طریقہ

اس طرح کے مواقع میں قرآن پر غور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اجمالی اشارات کو خود قرآن کی روشنی میں تفصیل کا رنگ دینے کی کوشش کی جائے تاکہ واضح ہو سکے کہ پیش کردہ چیزوں سے اس دعوے پر کس طرح دلیل قائم ہوتی ہے۔

مثلاً دیکھیے آسمان و زمین کی خلقت سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، کہیں تو خدا کی قدرت و حکمت پر استدلال کیا ہے، کہیں اس کی پروردگاری اور رحمانیت و رحیمیت پر۔ کہیں ان کے بامقصد و باغایت ہونے پر استدلال کیا ہے اور کہیں ان کے توافق کے پہلو سے ان کے خالق و مالک کی توحید پر۔

اسی طرح رات اور دن کے اختلاف کو کہیں تو حق و باطل کی کشمکش اور غلبۂ حق کی شہادت کے طور پر پیش کیا ہے، کہیں تمثیلی رنگ میں اس سے حیات بعد الموت پر استشہاد کیا ہے اور کہیں ان کے تضاد کے باوجود ان کے اندر ایک اعلیٰ و برتر مقصد کے لیے جو سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے اس کو اس حقیقت کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ نور اور ظلمت، روشنی اور تاریکی سب کا خالق ایک ہی ہے، وہی ان اضداد کو اپنی قدرت سے وجود میں لایا ہے اور وہی اپنی حکمت سے ان اضداد کے اندر سازگاری پیدا

کرتا اور اس کائنات کی مجموعی خدمت کے لیے ان کو استعمال کرتا ہے۔

کشتی اور سمندر کا ذکر بھی قرآن میں مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے۔ بعض جگہ تو اس سے انسانی زندگی کا جزو مدنمایاں کیا گیا ہے کہ انسان ذرا میں مغرور اور ذرا میں مایوس ہونے والی مخلوق ہے، زندگی کی کشتی ہمواری کے ساتھ رواں دواں رہے تو اس چیز کو وہ اپنی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھتا ہے اور اگر یہ کشتی حوادث کے تلاطم میں گھر جائے تو خدا خدا پکارنے لگتا ہے۔ پھر یہیں سے توحید کی اَنفُسی دلیل پیش کی ہے کہ اصل معبود جس کی شہادت دل کی گہرائیوں میں موجود ہے وہ تو اللہ واحد ہی ہے، جس کا سہارا انسان اس وقت ڈھونڈھتا ہے جب دوسرے تمام سہاروں پر سے اس کا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ بعض جگہ سمندر اور کشتی دونوں کے اختلاف و تضاد مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ کس طرح ایک بالاتر ہستی کا قانون قدرت و حکمت سمندر اور کشتی میں سازگاری پیدا کر دیتا ہے کہ انسان موجوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم تک فتح و تسخیر کے دام بچھاتا اور تہذیب و تمدن کے عَلم گاڑتا پھرتا ہے۔

آسمان سے بارش کا ذکر بھی گوناگوں پہلوؤں سے ہوا ہے۔ ربوبیت اور رحمت کی شہادت تو یہ ہے ہی۔ حیات بعد الموت پر بھی اس کی شہادت نہایت واضح ہے، اور اس کی طرف یہاں بھی اشارہ ہے۔ توحید پر بھی اس سے استدلال کیا ہے کہ جب آسمان سے اترنے والی بارش زمین کو زندگی اور روئیدگی بخشتی ہے تو یہ کس طرح باور کرتے ہو کہ زمین کے دیوتا الگ اور آسمان کے دیوتا الگ ہیں، اگر اس طرح ہر چیز کی خدائیاں الگ الگ تقسیم ہوتیں تو اس کارخانۂ کائنات میں ایسی حیرت انگیز سازگاری کس طرح پیدا ہوتی کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اس پانی کی بدولت اپنے تمام خزانے اگل دیتی اور پھر انسان اور چرند پرند سب ان سے فائدہ اٹھاتے۔ بعض جگہ تمثیلی رنگ میں بارش اور اس کے اثرات کے اختلاف کو اس اختلاف کو نمایاں کرنے کے لیے پیش کیا ہے جو آسمانی ہدایت قبول کرنے کے معاملہ میں مختلف صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کے اندر نمایاں ہوتا ہے۔ ایک ہی بارش کہیں تو سبزے اور نباتات کی بانات بچھا دیتی ہے، کہیں خار و خس اور جھاڑیاں اُگاتی ہے اور کہیں صاف چٹیل میدان چھوڑ دیتی ہے، اسی طرح فرمایا ہے کہ آسمانی ہدایت کی جو بارش نازل ہوتی ہے اس سے ساری طبیعتیں یکساں فیضیاب نہیں ہوتیں، بعض تو اس کے چھینٹے پڑتے ہی باغ و چمن کی طرح کھلکھلا اٹھتی ہیں، بعض شور زمینوں کے مانند مردہ ہی پڑی رہ جاتی ہیں اور بعض صرف ضلالت اور عداوت کی خاردار اور بس بھری جھاڑیاں اُگاتی ہیں۔

ہواؤں اور بادلوں کی گردش کو بھی مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے۔ خدا کی رحمت اور پروردگاری کی شہادت تو ان سے واضح طور پر ملتی ہی ہے، خاص طور پر جو چیز قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے وہ ہوا کے تصرفات کے پردہ میں خدا کی رحمت اور اس کے عذاب کا ظہور ہے جس سے بالآخر ایک روز

جزا و سزا کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن نے اس پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اگر آسمان و زمین اور ابر و ہوا میں سے ہر ایک پر الگ الگ ارادوں کی کارفرمائی ہے تو ان مختلف عناصر کے اندر وہ ربط و تعلق کون پیدا کرتا ہے جس ربط و تعلق کے بغیر اس دنیا کا وجود اور بقا ناممکن ہے۔

یہاں ہمارا مقصود ان دلائل کی تفصیل نہیں ہے جو اوپر کے اجمالات کے اندر مضمر ہیں۔ ان دلائل کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا یا بیان کرنا ان مواقع ہی پر زیادہ موزوں رہے گا جن میں قرآن نے ان کی وضاحت کی ہے۔ یہاں ان اشارات سے ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ قرآن مجید نے یہ جو فرمایا ہے کہ ان چیزوں کے اندر آیات یعنی دلیلیں اور نشانیاں ہیں تو یہ بات یونہی نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے اور یہ حقیقت اجمال اور تفصیل کی مختلف شکلوں میں قرآن میں بیان ہوئی ہے اس وجہ سے ان اجمالات کو تفصیل کے آئینہ میں دیکھنا چاہیے۔

آیت ۱۶۴ کے مطالب پر ایک خصوصی نظر

یہ تو اس آیت پر ایک عمومی نظر ہوگی۔ اب ہم اس پر ایک خصوصی نظر اس دعوے کو پیش نظر رکھ کر ڈالیں گے جو یہاں عنوان زیر بحث ہے۔ اور یہ بات گزر چکی ہے کہ یہاں اصل چیز جو زیر بحث ہے وہ توحید ہے اور یہ آیت اس توحید کی دلیل کے طور پر وارد ہوئی ہے اس وجہ سے اس آیت کے تمام مذکورہ حقائق و لطائف سب ضمنی ہیں، نظم کلام کے پہلو سے اصلی چیز جو واضح کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں توحید کی دلیل کیا ہے چنانچہ اب ہم اختصار کے ساتھ اس کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس آیت پر اگر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اس میں شروع سے لے کر آخر تک اس کائنات کے متقابل بلکہ متضاد اجزا و عناصر کا حوالہ دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے اس حیرت انگیز اتحاد و توافق اور ان کی اس بے مثال باہم آمیزی و سازگاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ان کے اندر اس کائنات کی مجموعی خدمت کے لیے پائی جاتی ہے۔ آسمان کے ساتھ زمین، رات کے ساتھ دن، کشتی کے ساتھ دریا۔ بظاہر دیکھیے تو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ضدین کی نسبت رکھتے ہیں لیکن ذرا گہری نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اگر یہ ایک طرف ضدین کی نسبت رکھتے ہیں تو دوسری طرف اس کائنات کی خانہ آبادی کے نقطۂ نظر سے آپس میں زوجین کا سا ربط و اتصال بھی رکھتے ہیں۔ یہ آسمان اور اس کے چمکتے ہوئے سورج اور چاند نہ ہوں تو ہماری زمین کی ساری رونقیں اور بہاریں ختم ہو جائیں بلکہ اس کی ہستی ہی نابود ہو جائے۔ اسی طرح یہ زمین نہ ہو تو کون بتا سکتا ہے کہ اس فضائے لامتناہی کے بے شمار ستاروں اور سیاروں میں سے کس کس کا گھر اجڑ کے رہ جائے۔ علیٰ ہذا القیاس، ہماری اور ہماری طرح اس دنیا کے تمام جانداروں کی زندگی جس طرح دن کی حرارت، تمازت، روشنی اور نشاط انگیزی کی محتاج ہے، اسی طرح شب کی خنکی، لطافت، سکون بخشی اور خواب آوری کی بھی محتاج ہے۔ یہ دونوں مل کر اس گھر کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سمندر کو دیکھیے اس کا پھیلاؤ کتنا ہوشربا اور ناپیدا کنار ہے اور اس کی موجیں کتنی مہیب اور ہولناک ہیں، لیکن دیکھیے اس سرکشی و طغیانی کے باوجود کس طرح اس نے عین اپنے سینہ پر سے ہماری کشتیوں اور ہمارے جہازوں کے

لیے نہایت ہموار اور صاف سڑکیں نکال رکھی ہیں جن پر ہمارے جہاز دن رات دوڑ رہے ہیں اور تجارت معیشت، تمدّن و معاشرت اور علوم و فنون ہر چیز میں مشرق اور مغرب کے ڈانڈے ملائے ہوئے ہیں۔

آگے آسمان سے بارش اور اس بارش سے زمین کے از سرِ نو باغ و بہار اور معمور و آباد ہو جانے کا ذکر ہے۔ غور کیجیے کہاں زمین ہے اور کہاں آسمان۔ لیکن اس دوری کے باوجود دونوں میں کس درجہ گہرا ربط و اتصال ہے۔ زمین اپنے اندر روئیدگی اور زندگی کے خزانے چھپائے ہوئے ہے لیکن یہ سارے خزانے اس وقت تک مدفون ہی رہتے ہیں جب تک آسمان سے بارش نازل ہو کر ان کو ابھار نہیں دیتی۔ اسی طرح کا رشتہ بادلوں اور ہواؤں کے درمیان ہے۔ بادلوں کے جہاز لدے پھندے اپنے بادبان کھولے کھڑے ہیں لیکن یہ اپنی جگہ سے ایک انچ سرک نہیں سکتے جب تک ہوائیں ان کو دھکے دے کر ان کی جگہ سے نہ ہلائیں اور ان کو ان کی مقرر کی ہوئی سمتوں میں آگے نہ بڑھائیں، یہ ہوائیں ہی ہیں جو ان کو مشرق و مغرب اور شمال وجنوب میں ہنکائے پھرتی ہیں اور جب چاہتی ہیں ان کو غائب کر دیتی ہیں اور جب چاہتی ہیں ان کو افق پر نمودار کر دیتی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ غور و تدبر کی نگاہ اس دنیا کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے۔ کیا یہ اضداد اور متناقضات کی ایک رزم گاہ ہے جس میں مختلف ارادوں اور قوتوں کی کشمکش برپا ہے یا ایک ہی حکیم و مدبر ارادہ ان سب پر حاکم و فرمانروا ہے جو ان تمام عناصر مختلفہ کو اپنی حکمت کے تحت ایک خاص نظام اور ایک مجموعی مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کائنات کے مشاہدہ سے یہ دوسری ہی بات ثابت ہوتی ہے۔ پھر مزید غور کیجیے تو یہیں سے ایک اور بات بھی نکلتی ہے وہ یہ کہ یہ دنیا آپ سے آپ وجود میں نہیں آئی ہے اور نہ اس کے اندر جو ارتقا ہوا ہے وہ آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے عناصر مختلفہ میں ایک بالاتر مقصد کے لیے وہ سازگاری کہاں سے پیدا ہوئی جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔

غور کیجیے تو یہ ایک ہی حقیقت ایک طرف شرک کے تمام امکانات کا سدّباب کر رہی ہے اور دوسری طرف یہ ڈارونزم کے بھی تمام وساوس کی جڑ کاٹ رہی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ (۱۶۵)

یعنی توحید کی اس واضح دلیل کے باوجود جو اوپر بیان ہوئی اس دنیا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو خدا کے شریک اور ساجھی ٹھہراتے ہیں اور ان شریکوں اور ساجھیوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیئے۔ یہ اندازِ کلام اظہارِ تعجب کا ہے۔ یعنی اس بے عقلی کے لیے کوئی گنجائش

تو موجود نہیں تھی لیکن جو لوگ اپنی عقل سے کام ہی نہیں لیتے ان کا کیا علاج، ان کے لیے آسمان و زمین میں پھیلی ہوئی ساری دلیلیں بے کار ہیں!

محبت کا اصل حق دار اللہ ہے

ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے مزعومہ شریکوں اور ساجھیوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنے کا حق ہے حالانکہ محبت کا اصلی حقدار اللہ ہی ہے۔ وہی ہے جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے، وہی ہے جس کے ہاتھ میں سارا انتظام ہے اور اس کائنات کے ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی ربوبیت و رحمت سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ وہ رحمان و رحیم ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا اس کے برابر کی محبت کا حقدار کس طرح ہو سکتا ہے۔ پھر کوئی دوسرا کسی نسبت اور تعلق کی وجہ سے محبت کا حق دار نکلے بھی تو بہر حال اس کی محبت خدا کی محبت کے تحت ہی ہو سکتی ہے نہ کہ اس کے برابر یا خدانخواستہ اس سے زیادہ۔ اس سے جہاں یہ بات نکلی کہ محبتِ حقیقی خدا کے حقوق میں سے ہے۔ اس میں کسی اور کو شریک کرنا شرک ہے وہیں یہ بات بھی نکلی کہ دوسروں کے لیے محبت کی مطلق نفی نہیں ہے۔ دوسروں سے بھی محبت کی جا سکتی ہے مثلاً بیوی بچوں، قوم، قبیلہ اور ملک و وطن سے یا کسی بزرگ یا استاذ یا شیخ یا پیر سے لیکن اس محبت کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ خدا کی محبت کے تابع ہو یعنی جہاں کہیں اور جب کبھی اس محبت اور خدا کی محبت کے تقاضوں میں کوئی ٹکراؤ ہونے لگے تو آدمی خدا کی محبت کے تقاضے کو مقدم رکھے اور دوسری محبتوں کو نظر انداز کر دے۔ اس صورت میں بلاشبہ وہ توحید کا حق ادا کرنے والا ٹھہرے گا۔ چنانچہ حقیقی اہلِ ایمان کی یہی شان بیان ہوئی ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (جو حقیقی ایمان رکھتے ہیں وہ خدا کی محبت میں سخت تر ہوتے ہیں) یعنی جب ان کے سامنے اللہ اور غیر اللہ کی محبت کے ایک دوسرے سے متضاد مطالبات ابھرتے ہیں تو وہ ہمیشہ محبتِ الٰہی کے پہلو کی طرف جھکتے ہیں۔ یہی توحید خالص کی حقیقت اور یہی چیز ایمان کی روح ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک محبت کے ہونے کا تعلق ہے، یہ اللہ کے ساتھ ساتھ دوسروں سے بھی ہو سکتی ہے، یہ چیز ایمان اور توحید کے منافی نہیں ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ دوسروں کی محبت اللہ کی محبت کے تابع ہو، اس کے برابر یا اس سے بڑھ کر نہ ہو۔

وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا الآیۃ۔ یہاں عربی زبان کے عام قاعدہ کے مطابق لَوْ کا جواب محذوف ہے اور اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا اور اس کے بعد کے الفاظ اس محذوف جواب کی وضاحت کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اپنی جانوں پر یہ ظلم ڈھانے والے لوگ جو خدا کے ہمسر اور شریک ٹھہرائے ہوئے ہیں اور ان سے خدا کی طرح محبت کر رہے ہیں اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ وہ عذاب الٰہی سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ خدا کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں جو اس کے برابر کی محبت کا حق دار ہو بلکہ وہی تنہا تمام قوت و اختیار کا مالک ہے اور وہ اپنے ساتھ شریک کرنے والوں کو

نہایت سخت عذاب دینے والا ہے جس سے ان کو کوئی بھی بچانے والا نہ ہوگا۔

اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ ہم بقصدِ اختصار صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ	اگر آج جان سکتے یہ کفر کرنے والے اس وقت کو
لَا يَكُفُّونَ عَنْ وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا	جب کہ یہ اپنے چہروں اور اپنی پیٹھوں سے آگ کو
عَنْ ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ٥	دفع نہ کر سکیں گے اور نہ اس وقت ان کی کوئی مدد
(۳۹-انبیاء)	کی جائے گی۔

اس آیت میں بھی لَوْ کا جواب محذوف ہے۔ یعنی اگر آج یہ اس عذاب کو جان سکتے جس کو آخرت میں جائیں گے تو یہ اس سرکشی کا اظہار نہ کرتے جس کا اظہار کر رہے ہیں لیکن یہ اس کو اس وقت جانیں گے جب یہ جاننا کچھ نفع نہ بخشے گا بلکہ صرف باعثِ حسرت و اندوہ ہوگا۔ سورۂ سبا میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ (۱۶۶)

یہ إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ سے بدل پڑا ہوا ہے اور اسی عذاب کی مزید وضاحت کر رہا ہے کہ آج جن کو یہ خدا کا شریک و ہمسر ٹھہراتے ہیں اور جن سے اس طرح محبت کر رہے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے، جب عذابِ آخرت ظاہر ہوگا تو یہ اپنے ان جاں نثاروں اور پیروں سے صاف صاف اظہارِ برأت کر دیں گے اور اس عذاب سے بچانے میں ان کے کچھ کام نہ آئیں گے جو ان کے سر پر کھڑا ہوگا۔

اسباب کا مفہوم

اسباب، سبب کی جمع ہے جس کے اصل معنی رسی کے ہیں۔ پھر یہیں سے اس کے اندر تعلق و توسل اور اسباب و وسائل کا مفہوم پیدا ہوا اور پھر مزید وسعت پا کر کسی شے کے متعلقات و اطراف کے لیے بھی اس کا استعمال ہونے لگا چنانچہ قرآن میں اسباب السماء کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ بِهِمْ کی ضمیر الَّذِينَ اتُّبِعُوا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین نے جن لوگوں کو شریک و شفیع سمجھ کر ان کے ساتھ تعلقاتِ محبت و ارادت قائم کر رکھے ہیں ایک دن ان کے ان تعلقات کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے اور یہ ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجیں گے۔

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ (۱۶۷)

متبوعین اور تابعین

متبوعین کے بعد اب یہ تابعین کا ردِّ عمل بیان ہو رہا ہے کہ جب پیرو دیکھیں گے کہ جن کو انھوں نے خدائی کا درجہ دیا اور زندگی بھر جن کو اپنی تمام محبتوں اور نیاز مندیوں کا مرکز بنا رکھا وہ اس سب سے مشکل وقت میں اس طرح اظہارِ بیزاری کر رہے ہیں تو وہ بھی نہایت حسرت کے انداز میں کہیں گے کہ کاش ہمیں ایک بار پھر دنیا میں جانا نصیب ہو کہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہارِ بیزاری کر سکیں جس طرح انھوں نے

ہم سے اظہارِ بیزاری کیا ہے۔ لیکن ان کی یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی، جس عذاب میں وہ پڑ چکے ہوں گے اس سے ان کو نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ یہاں ہم اس کی وضاحت کے لیے بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے۔

إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا (۲۵۔ عنکبوت)

اور یہ جو تم خدا کو چھوڑ کر دوسرے بت بنائے بیٹھے ہو تو یہ محض اس دنیا کی زندگی میں دوستی کے لیے ہیں، پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔

وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۝ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ۝ (۶۷-۶۸ احزاب)

وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور لیڈروں کی بات مانی تو انھوں نے ہمیں راستے سے بھٹکایا۔ اے ہمارے پروردگار ان کو دونا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت کر۔

الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ۝ (۶۷۔ زخرف)

دنیا کے دوست اس دن سب ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے! صرف متقی اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

یہاں یہ جو فرمایا ہے کہ ان کے اعمال، اللہ تعالیٰ ان کو سرمایۂ حسرت بنا کر دکھائے گا تو اس سے مراد ہمارے نزدیک ان کی وہ وفاداریاں اور قربانیاں ہیں جو ان مشرکین نے اپنے ان باطل معبودوں یا اپنے ان گمراہ کرنے والے سرداروں اور لیڈروں کے لیے کی ہوں گی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (۱۶۸)

یہ خطاب عربوں سے ہے جن کے شرک کی طرف اوپر کی آیات میں اشارہ کیا تھا۔ پہلے توحید کے سلسلہ میں ان کی بدعات سے تعرض کیا ہے۔ پھر آگے چل کر اہل کتاب کی بدعات کی تردید کی ہے۔ عربوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ زمین کی چیزوں میں سے جو جائز و پاکیزہ چیزیں ہیں ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ شیطان کے نقش قدم کی پیروی سے مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنے جی سے محض اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت جو حلال و حرام ٹھہرا رکھے ہیں ان کی کوئی شرعی سند نہیں ہے، بلکہ یہ راہ تمھیں شیطان نے سجھائی ہے اور تم نے اس کی پیروی میں خدا کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرا لیا اور اس طرح خدا کے

حق تحریم و تحلیل میں مداخلت کر کے شرک کے مرتکب ہوئے۔

حکم الٰہی کے بغیر تحلیل و تحریم شرک ہے

چونکہ خدا کے حکم کے بغیر تحریم و تحلیل شرک ہے اس وجہ سے قرآن میں شرک اور تحریم و تحلیل کا مضمون جگہ جگہ ایک ساتھ بیان ہوا ہے مثلاً سورہ نحل میں ہے وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ وَلَا حَرَّمْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ (۳۵) (اور مشرک کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اس کے سوا کسی چیز کو پوج سکتے اور نہ اس کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے) اسی طرح سورہ انعام ۱۴۸ میں ہے۔ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ (یہ مشرک کہیں گے، اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور ہمارے آبا و اجداد کسی چیز کو اس کا شریک بنا سکتے اور نہ کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ شرک اور تحریم و تحلیل دونوں ایک دوسرے سے متعلق مضمون ہیں۔ اسی تعلق سے آیت زیر بحث میں بھی شرک کی تردید کے سلسلہ میں یہ بات فرمائی گئی کہ تمام جائز و پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کی پیروی میں مشرکانہ توہمات کے تحت خدا کی جائز کردہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ۔ رہی یہ بات کہ شیطان کی پیروی میں مشرکین عرب نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت کن چیزوں کو حرام یا حلال ٹھہرایا تھا تو اس کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارے کیے ہیں۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا ۖ فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ○ وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ○ وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَن نَّشَاءُ

اور جو کھیتیاں اور چوپائے خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں ان میں انھوں نے اپنے شرکا کے ساتھ ساتھ خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کر رکھا ہے۔ کہتے ہیں، یہ تو اللہ کے لیے ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور اتنا ہمارے شرکا کے لیے ہے۔ تو جو حصہ ان کے شرکا کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا اور جو اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکا کو منتقل ہو سکتا ہے، کتنا برا فیصلہ یہ کرتے ہیں! اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے شرکا نے قتل اولاد کو ایک پسندیدہ فعل بنا دیا ہے تاکہ ان کو تباہ کریں اور ان کے دین کو گھپلا کر کے رکھ دیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ کچھ وہ نہ کر پاتے تو ان کو اور ان کے اس افترا کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں قسم کی فصلیں ممنوع ہیں، ان کو صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جن کو ہم اجازت دیں۔

بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا
وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا
افْتِرَآءً عَلَيْهِ ط سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ه وَقَالُوْا مَا فِيْ
بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ
لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا
وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ط
سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ
عَلِيْمٌ ه قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا
اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا
مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى
اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا
مُهْتَدِيْنَ (۱۳۶ - ۱۴۰ انعام)

ان کے گمان کے مطابق، کچھ چوپائے ایسے ہیں جن
کی پیٹھیں حرام قرار دے دی گئی ہیں اور کچھ پر اللہ کا
نام نہیں لیتے۔ یہ محض اللہ پر ان کا افترا ہے۔ اللہ
ان کو ان کے اس افترا کا بدلہ دے گا، اور یہ کہتے ہیں
کہ فلاں فلاں چوپایوں کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ صرف
ہمارے مردوں ہی کے لیے جائز ہے، ہماری عورتوں کے
لیے یہ ناجائز ہے اور اگر وہ مردار ہو تو دونوں اس میں
شریک ہو سکتے ہیں۔ اللہ ان کو ان کی اس تشخیص کا بدلہ
چکھائے گا، وہ حکیم و علیم ہے۔ نامراد ہوئے وہ لوگ جنہوں
نے اپنی اولاد کو قتل کیا، محض بے وقوفی سے، بغیر کسی علم
کے اور اللہ کے بخشے ہوئے رزق کو حرام ٹھہرایا محض اللہ
پر افترا کر کے۔ یہ لوگ گمراہ ہوئے اور ہدایت حاصل کرنے
والے نہ بنے۔

اسی طرح مشرکین نے بعض قسم کے چوپایوں کو اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت یا اپنے بتوں کی نسبت سے تقدیس کا درجہ دے دیا تھا جن پر کسی قسم کا تصرف وہ ناجائز خیال کرتے تھے۔ قرآن نے ایک جگہ اس کی تردید کی ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ
وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰۳ - مائدہ)

اور یہ بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام خدا نے مشروع
نہیں ٹھہرائے ہیں بلکہ یہ کافر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں
جو کہتے ہیں کہ خدا نے مشروع کیے ہیں، اور ان میں سے
اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔

ایک اور مقام پر ان کی اس مشرکانہ تحریم و تحلیل پر بدیں الفاظ گرفت فرماتی ہے۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا
كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ه ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ
مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ
قُلْ ءٰۤالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ
اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ط

اور چوپایوں میں سے بوجھ اٹھانے والے بھی پیدا کیے
اور زمین سے لگے ہوئے بھی۔ خدا نے جو تمھیں بخشے ہیں
ان میں سے کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ
کرو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ آؤ ان
چوپایوں کی آٹھوں قسموں کو لو۔ بھیڑوں میں سے دو اور
بکریوں میں سے دو۔ پوچھو ان سے کہ خدا نے ان کے
نروں کو حرام ٹھہرایا ہے یا ماداؤں کو یا ان بچوں کو جو

نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝
وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ
اثْنَیْنِ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ
حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ
عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ
شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ
كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝
قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا
عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ
مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ
لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ
اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ

پ ۸ (۱۴۳-۱۴۵- انعام)

ان ماداؤں کے پیٹوں میں ہیں۔ کہو کہ مجھے کسی سند کے ساتھ بتاؤ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو۔ اور اسی طرح دو اونٹوں میں سے اور دو گایوں میں سے لو اور ان سے پوچھو کہ ان کے نروں کو حرام کیا ہے یا ان کی ماداؤں کو یا ان کو جو ان ماداؤں کے پیٹوں میں ہیں۔ ان سے پوچھو کیا تم اس وقت موجود تھے جب خدا نے تمہیں ان باتوں کا حکم دیا؟ تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو خدا پر جھوٹا بہتان لگائیں تاکہ لوگوں کو کسی علم و سند کے بغیر گمراہی میں مبتلا کریں۔ خدا ظالموں کو کبھی راہ یاب نہیں کرے گا۔ کہہ دو مجھ پہ جو وحی ہوئی ہے اس میں تو میں کسی کھانے والے پر بجز اس کے کوئی چیز حرام نہیں پاتا کہ یا تو مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت۔ یہ چیزیں نجس ہیں۔ یا کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، خدا کے حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آیت زیر بحث میں شیطان کے نقش قدم کی پیروی سے مراد یہی مشرکانہ توہمات کے تحت اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرانا ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ شیطان اور اس کی ذریات کو خاص اس مسئلہ سے بڑی دلچسپی ہے۔ اس نے لوگوں کو توحید کے راستے سے ہٹانے کے لیے اس راستے کو بہت کامیاب اور آسان پایا ہے۔ اس وجہ سے شروع ہی سے اس کو اپنے پروگرام میں شامل کر کے پوری جرأت اور صفائی کے ساتھ اس کا اعلان بھی کر رکھا ہے۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت پر غور فرمائیے۔

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا
مَّفْرُوْضًا ۙ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ
وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ
فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یَّتَّخِذِ
الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا

(۱۱۹- نساء)

اور شیطان نے کہا کہ میں تیرے بندوں میں سے اپنا ایک متعین حصہ الگ کر کے رہوں گا۔ میں ان کو گمراہ کروں گا، ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا اور ان کو سمجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سمجھاؤں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کریں گے اور جو اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا کارساز بنائے گا تو وہ کھلی ہوئی نامرادی میں مبتلا ہوا۔

آیت میں حلال کے ساتھ طیب کی صفت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اسلام میں جو چیزیں جائز ہیں وہ لازماً پاکیزہ بھی ہیں۔ گویا ہر چیز کے ساتھ جواز و عدم جواز کے امتیاز کے لیے جس طرح ایک شرعی اور قانونی معیار ہے اسی طرح ایک عقلی اور فطری معیار بھی ہے۔ جو چیزیں ظاہری گندگی اور عقلی و اخلاقی مفاسد سے آلودہ نہیں ہیں وہ سب چیزیں حلال ہیں، اس کے برعکس جن چیزوں کے اندر کوئی ظاہری یا باطنی گندگی موجود ہے وہ ناجائز ٹھہرادی گئی ہیں۔

شیطان کے لیے 'عدو مبین' کی صفت

شیطان کے لیے 'عدو مبین' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ بنی نوع آدم کے ساتھ اس کی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے بلکہ وہ روز اول سے آدم اور ان کی ذریت کا دشمن ہے اور اپنی اس دشمنی کا قیامت تک کے لیے کھلم کھلا اعلان بھی کر چکا ہے۔ اوپر ہم ایک آیت سورۂ انعام کی نقل کر آئے ہیں جس سے واضح ہے کہ وہ اپنی اس دشمنی کا خود اللہ تعالیٰ کے سامنے پوری جسارت کے ساتھ اظہار کر چکا ہے۔ اسی مضمون کی ایک دوسری آیت بھی ملاحظہ ہو۔

قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝
قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ
عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قَالَ
اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ
جَهَنَّمَ جَزَاۗؤُكُمْ جَزَاۗءً مَّوْفُوْرًا ۝
وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ
بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ
وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَ
الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ
الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝

(۶۱-۶۴ - بنی اسرائیل)

ابلیس بولا بھلا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی
سے بنایا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت
بخشی ہے! اگر تو نے مجھے قیامت تک کے لیے مہلت
بخشی تو میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔
صرف تھوڑے ہی میرے فتنوں سے محفوظ رہ سکیں گے
خدا نے فرمایا، جا، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے
تو جہنم تمہارا پورا پورا بدلہ ہے۔ اور ان میں سے جن
کو اپنے شور و غوغا سے گھبرا سکے ان کو گھبرا لے اور
ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے اور ان کے
مال و اولاد میں شریک بن جا اور ان کو وعدوں کے سبز
باغ دکھا لے اور شیطان کے یہ وعدے فریب کے سوا
اور کچھ نہیں ہیں۔

ایک دوسرے مقام میں شیطان کے الٹی میٹم کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ
صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ
مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ
وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ

بولا، بوجہ اس کے کہ تو نے آدم کے سبب سے مجھے گمراہی
میں ڈالا، میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں
بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے
سے، ان کے دہنے سے، ان کے بائیں سے ان کی

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ (۱۶-۱۷-اعراف) راہ ماروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہیں پائے گا۔

جو دشمن اتنے کھلے ہوئے الفاظ میں اعلان جنگ دے چکا ہو اس کے ایک کھلے ہوئے دشمن (open - enemy) ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس کو عدوٌ مبین سے تعبیر کیا ہے اور مقصود اس سے بنی آدم کو آگاہ کرنا ہے کہ ایک چھپے ہوئے دشمن سے دھوکا کھا جانا تو کچھ بعید نہیں ہوتا لیکن ایک کھلے ہوئے دشمن سے دھوکا کھا جانا، یہاں تک کہ اس کو دوست اور کارساز سمجھ کر اس کے مشوروں پر کاربند ہونا ایک ایسی حماقت ہے جس سے بڑی حماقت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶۹)

'امر' کے معنی — 'امر' کے معنی جس طرح کسی بات کا حکم دینے کے ہیں اسی طرح کوئی بات سمجھانے یا اس کا مشورہ دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً

امرتهم امری بمنعرج اللوی فلم یستبینوا الرشد الا ضحی الغد

(میں نے ان کو اپنے مشورے سے منعرج اللوی ہی میں آگاہ کر دیا تھا لیکن میری بات ان کی سمجھ میں دوسرے دن کی صبح سے پہلے نہ آسکی)۔

یا

اطعت لآمریك بصرم حبلی

(تو نے بالآخر انہی لوگوں کی بات سنی جو تجھے مجھ سے قطع تعلق کا مشورہ دینے والے تھے)۔

'سوء' کا استعمال وسیع معنوں میں — 'سوء' کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے جسمانی اور مادی نقصان اور گزند بھی مراد ہوتا ہے مثلاً فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ - ۱۷۳- آل عمران (اور وہ خدا کی نعمت اور اس کا فضل لے کر لوٹے اور ان کو کوئی گزند نہ پہنچا) اس سے بیماری بھی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۱۲-نمل (اور تم اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کرو، وہ اس کے اندر سے سفید برآمد ہوگا بغیر کسی مرض کے) اسی طرح یہ بدی اور گناہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، عام اس سے کہ بدی چھوٹی ہو یا بڑی مثلاً اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ - ۱۷-نساء (اللہ کے ذمہ ان کی توبہ کی قبولیت ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھیں پھر فوراً توبہ کر لیں)

'فحشاء' کا مفہوم — 'فحشاء' کا لفظ کھلی ہوئی بدکاری اور بے حیائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں اس سے زنا، لواطت اور ننگے ہو کر طواف کرنے کی قسم کی برائیوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ جب سوء اور فحشاء دونوں لفظ ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں تو یہ نہ صرف تمام چھوٹی بڑی برائیوں ہی کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں بلکہ ہر طرح کے مالی، جسمانی اور عقلی نقصانات و مصائب بھی ان کے تحت آجاتے ہیں۔

قول علی اللہ اور افترا علی اللہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی خدا کی طرف کوئی جھوٹی اور من گھڑت بات منسوب کرنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خدا نے فلاں اور فلاں کو اپنا ساجھی اور شریک قرار دیا ہے یا بغیر کسی سند کے یہ دعوے کرنا کہ خدا نے فلاں فلاں قسم کی چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔

شیطان کے امر کرنے سے یہاں مطلب اس کا ان باتوں کے لیے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنا اور لگاتار ان کو کھبانا ہے۔ شیطان کے مفہوم میں اس کی ساری ذریت شامل ہے، عام اس سے کہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ یہی مضمون ایک دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے۔ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ۭ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓي اَوْلِيٰۗـــِٕــهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۱۲۱- انعام (اور وہ چیزیں نہ کھاؤ جن پر خدا کا نام نہیں لیا گیا ہے بے شک شیاطین اپنے دوستوں کی طرف القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے)

ایک نکتہ — یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ رحمان اور شیطان کے احکام میں ایسا واضح اور محسوس عقلی و فطری امتیاز موجود ہے کہ کسی سلیم الفطرت اور خوش ذوق انسان کو ان کے درمیان کوئی گھپلا پیش نہیں آسکتا۔ اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں کھانے پینے کے لیے جائز ٹھہرائی ہیں وہ اپنے اثرات اپنے ظاہر، اور اپنے باطن کے لحاظ سے پاکیزہ، خوشگوار، معتدل، صحت بخش اور روح پرور ہیں، اس کے بالمقابل شیطان جن باتوں کو اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے وہ سب کی سب روح، عقل، جسم اور اخلاق کو نقصان پہنچانے والی اور بے حیائی و بدکاری کی راہیں کھولنے والی ہیں۔ اس واضح فرق کے بعد بھی جو لوگ شیطان کی پیروی اختیار کریں ان کی شامت ہی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۱۷۰)

تقلید کے ساتھ ماضی کے ورثہ کا احترام — یعنی ان تمام مشرکانہ رسوم کے معاملہ میں ان کا اعتماد کسی دلیل اور سند پر نہیں بلکہ محض پچھلوں کی تقلید اور ان کی بے سند روایات کی پیروی پر ہے اور جب ان کو اس بات کی دعوت دی جاتی ہے کہ ان بے سند باتوں کی جگہ اس کتاب کی پیروی کرو جو خدا کی اصل شریعت سے آگاہ کرنے کے لیے تم پر نازل کی جارہی ہے تو وہ بڑے غرور کے ساتھ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو بدستور اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلتے رہیں گے۔ اس پر قرآن نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا باپ دادا کے طریقے کی پیروی پر ان کا یہ جمود اور اصرار اس شکل میں بھی معقول قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ یہ واضح ہو کہ ان کے باپ دادا نے نہ تو ان معاملات میں عقل کی رہنمائی پر اعتماد کیا ہے نہ خدا کی تعلیم پر بلکہ یا تو بے سمجھے بوجھے پچھلوں کی لکیر پیٹتے رہے ہیں یا اپنی خواہشات اور شیطان کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کی ہیں؟

قرآن کے اس سوال کے انداز سے یہ بات نکلتی ہے کہ مجرد یہ چیز کہ ایک بات باپ دادا سے چلی آرہی ہے اس کی صحت و صداقت ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر اس کو رکھ کر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ بات اگر مجرد عقل و رائے سے تعلق رکھنے والی ہے تو وہ عقل کی میزان پر پوری اترتی ہے یا نہیں اور اگر دین سے تعلق رکھنے والی ہے تو اس کی کوئی مضبوط اور قابلِ اعتماد سند ہے یا نہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ قرآن ایک طرف تو مجرد تقلید پر اعتماد کرنے کے بجائے تحقیق اور تنقید کے لیے برابر آنکھیں کھولے رکھنے کی دعوت دیتا ہے، دوسری طرف وہ ماضی کے ورثہ کو احترام کی نگاہ سے دیکھنے کی بھی ہدایت کرتا ہے اور بغیر تحقیق و تنقید اس سے دستبردار ہو جانے کی اجازت نہیں دیتا۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۱۷۱)

'نعق ینعق' کے معنی

نَعَقَ يَنْعِقُ کے معنی چیخنے اور آواز دینے کے آتے ہیں۔ نعق المؤذن کے معنی ہیں مؤذن نے اذان دی۔ نعق الراعی بغنمہ کے معنی ہیں چرواہے نے اپنے گلے کو للکارا یا پکارا۔

صورتِ حال کی تمثیل صورتِ حال

یہ ایک تمثیل ہے جس میں ایک صورتِ حال کی تمثیل دوسری صورتِ حال سے دی گئی ہے۔ اس طرح کی تمثیلات میں، جیسا کہ ہم آیات ۱۷-۱۸ کی تمثیلات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں، مُمَثَّل اور مُمَثَّل بہ کے تمام اجزا کی ایک دوسرے سے مطابقت ضروری نہیں ہوتی بلکہ صرف صورتِ واقعہ کی صورتِ واقعہ سے مطابقت ضروری ہوتی ہے۔ نیز اس بات کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ جس چیز کی تمثیل دی جا رہی ہے اس کی پوری صورت واضح کی جائے بلکہ صرف اس صورتِ واقعہ کی وضاحت ضروری ہوتی ہے جس سے تمثیل دی جاتی ہے۔ اسی کے آئینہ میں اس کا عکس بھی دیکھ لیتے ہیں جس کی تمثیل پیش کرنی مقصود ہے۔

جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے اندھے بہرے ہو کر محض باپ دادا کی تقلید پر اڑ گئے ہیں ان کی تشبیہ بھیڑ بکریوں کے گلے سے دی گئی ہے جو عقل و ادراک سے بالکل عاری اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہوتا ہے۔ چرواہے کی آواز بے شک اس کے کانوں سے جا ٹکراتی ہے لیکن اس سے آگے اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ چرواہا کس کام کے لیے پکار رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ اس تمثیل کے بعد فرمایا کہ یہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں، جس سے مقصود اس امر کی وضاحت ہے کہ یہ تمثیل تمام عقلی اور روحانی تقاضوں سے ان کی محرومی کی تمثیل ہے۔ اس اسلوب کی بعض بلاغتیں آیت ۱۸ کے تحت بھی گزر چکی ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (۱۷۲)

مسلمانوں کے تردد کا ازالہ

مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا اگر یہ مشرکین اپنی مشرکانہ بدعات پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور تم ان ناروا پابندیوں کو اٹھا کر ان تمام پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ جو اللہ نے تمہیں بخشی ہیں۔ پھر فرمایا اگر تم اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو اسی کے شکر گزار بنو۔ اس کے بخشے ہوئے رزق اور اس کے پیدا کیے

ہوئے چوپایوں کو کسی اور کی نسبت سے حرام ٹھہرانا خدا کی بندگی کے بھی منافی ہے اور اس کی شکر گزاری کے بھی۔

مسلمانوں کو خاص طور پر مخاطب کر کے یہ بات کہنے کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ کھانے پینے کا معاملہ، بالخصوص جب کہ ایسی چیزوں کے کھانے کا معاملہ ہو جن کو پرانے زمانہ سے مذہبی تقدس کی بنیاد پر حرمت کا درجہ حاصل رہا ہو، ایک نازک معاملہ تھا۔ اس طرح کے معاملات میں انسان کچھ شکی اور وہمی سا بن جاتا ہے۔ روایت کے خلاف کسی چیز کے کھانے سے طبیعت میں نہ صرف یہ کہ ایک قسم کی جھجک پیدا ہوتی ہے بلکہ بعض لوگ اس کو تقویٰ اور دینداری کے بھی خلاف سمجھتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ حالت کچھ مسلمانوں کو بھی پیش آئی اس وجہ سے قرآن نے ان کو یہ تنبیہ کی کہ یہ چیز خدا کی شکر گزاری اور اس کی بندگی کے منافی ہے۔

سورۂ انعام کے بعض مقامات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین کی حرام کردہ چیزوں کو جب قرآن نے مباح کر دیا کہ اللہ کے نام پر ذبح ہونے کی صورت میں تم ان کو شوق سے کھاؤ تو مشرکین نے یہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے ان چیزوں کو بھی حلال کر دیا ہے جو باپ دادا کے زمانوں سے حرام چلی آرہی تھیں، چونکہ اس طرح کے معاملات میں طبیعتیں، جیسا کہ اوپر گزرا، بڑی حساس ہو جاتی ہیں اس وجہ سے کچھ مسلمانوں پر اس پروپگنڈے کا اثر ہوا۔ سورہ انعام کی آیات ذیل میں اسی پروپگنڈے کا رد ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ○ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ○ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ○ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ○ (۱۱۸-۱۲۱- انعام)

پس جس پر اللہ کا نام ذبح کے وقت لے لیا گیا ہو اس کو بے جھجک کھاؤ، اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھنے والے ہو۔ اور آخر تم ان چیزوں کو کیوں نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے جب کہ وہ چیزیں تمہارے سامنے وضاحت سے بیان کی جا چکی ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں الا آنکہ تم ان میں سے بھی کسی چیز کے کھانے پر مجبور ہو جاؤ۔ بہت سے لوگ اپنی من گھڑت باتوں کی آڑ لے کر بغیر کسی علم کے لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کو۔ گناہ ظاہر اور گناہ باطن دونوں سے باز آؤ۔ جو لوگ گناہ کی کمائی کر رہے ہیں وہ اپنی کمائی کا عنقریب بدلہ پائیں گے۔ ہاں ان چیزوں میں سے نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، یہ خدا کی نافرمانی ہے۔ اور یہ شیاطین ہیں جو اپنے دوستوں کو القا کر رہے ہیں تاکہ وہ تمہارے ساتھ بحثیں اٹھائیں اور اگر تم نے ان کی بات مان لی تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے۔

ہمارے نزدیک آیت زیر بحث بھی بالکل اسی موقع و محل میں اور مسلمانوں کے سامنے اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے وارد ہوئی۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۷۳)

ملتِ ابراہیم میں حرام و حلال

یہ اشارہ ہے ان چیزوں کی طرف جو اصلاً ملتِ ابراہیم میں حرام ٹھہرائی گئی تھیں اور مقصود اس سے ہرگز ہرگز حرام و حلال کی تفصیل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ صرف مشرکین کی تردید ہے کہ انھوں نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت چوپایوں میں سے بعض کو جو حرام قرار دے دیا ہے یہ بالکل بے سند بات ہے، ملتِ ابراہیم میں صرف یہ یہ چیزیں حرام تھیں۔ بالکل اسی سیاق میں یہی بات سورۂ انعام میں اس طرح فرمائی گئی ہے۔ قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَن يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ۔ ۱۴۵ (کہہ دو کہ مجھے جو وحی کی گئی ہے اس میں تو کسی کھانے والے کے لیے میں بجز اس کے کسی چیز کو حرام نہیں پاتا کہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت، یہ چیزیں ناپاک ہیں، یا پھر خدا کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے)

"قُل لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ" کے الفاظ پر ان کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مشرکین کے سامنے اس بات کی وضاحت کرائی جا رہی ہے کہ تم نے جو بعض چوپایوں کی حرمت کو ملتِ ابراہیم کی نسبت دے رکھی ہے یہ بالکل بے سند بات ہے، مجھ پر ملتِ ابراہیم کے ضابطۂ حلّت و حرمت سے متعلق جو بات وحی کی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ فلاں فلاں چیزوں کے سوا چوپایوں میں سے کوئی چیز بھی حرام نہیں ٹھہرائی گئی۔

بعض لوگ زیر بحث آیت کو اس کے موقع و محل سے بالکل الگ کر کے اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں بس یہی چیزیں حرام ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے لیکن یہ خیال صریحاً غلط ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی تردید کے لیے دوسری باتوں سے قطع نظر تنہا یہی بات کافی ہے کہ زیر بحث آیت میں "میتہ" کا جو لفظ آیا ہے سورۂ مائدہ کی آیت ۳ میں اس کی وضاحت میں پانچ چیزیں گنائی گئی ہیں۔ پھر مزید بعض دوسری چیزوں کی بھی حرمت بیان ہوئی ہے جن کی طرف آیت زیر بحث میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔

ظاہری گندگی اور باطنی گندگی

ان بیان کردہ چیزوں میں سے مردار، خون اور لحمِ خنزیر کی حرمت تو ان کی ظاہری گندگی کے سبب سے ہے اس لیے کہ اسلام میں صرف پاکیزہ چیزیں ہی، جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، حلال ٹھہرائی گئی ہیں، جو چیزیں دیکھنے ہی سے گندی اور نجس محسوس ہوتی ہیں ان کو اس دینِ فطرت میں حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ رہی غیر اللہ کے ذبیحہ کی حرمت، تو اس کی حرمت کی وجہ اس کی باطنی گندگی ہے۔ یہ حقیقت اسلام میں اپنی جگہ پر بالکل مسلم

اور واضح ہے کہ شرک سب سے بڑی عقلی اور باطنی نجاست ہے اس وجہ سے اگر کسی پہلو سے اس کی چھوت کسی پاک چیز کو بھی لگ جاتی ہے تو وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔ ان دونوں قسموں کی نجاستوں کی طرف اشارہ خود قرآن ہی نے کر دیا ہے چنانچہ انعام ۱۴۵ میں مردار، خون اور لحم خنزیر کے ذکر کے بعد فرمایا کہ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ یہ چیزیں اس وجہ سے حرام ہیں کہ یہ نجس ہیں اور غیر اللہ کے ذبیحہ کا ذکر اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے الفاظ کے ساتھ کیا جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس کی نجاست ظاہری نہیں بلکہ عقلی اور عقائدی ہے۔ پھر سورۂ انعام میں انہی مسائل کے بیان کے سلسلہ میں دین کی یہ ایک بہت بڑی حقیقت بھی واضح کر دی کہ اسلام کا مطالبہ اپنے ہر پیرو سے صرف گناہ ظاہر ہی کے چھوڑنے کا نہیں ہے بلکہ گناہ باطنی کے چھوڑنے کے لیے بھی ہے اس وجہ سے ظاہر گندگی سے آلودہ چیزوں کے ساتھ ساتھ باطنی اور روحانی گندگی سے ملوث چیزوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہے وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (انعام) اسی ضابطہ کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض چیزوں کو حرام ٹھہرایا۔

'اضطرار' کا مفہوم

"اضطر" ضرر سے باب افتعال ہے۔ عربی زبان کے قاعدے کے مطابق "ض" کی مناسبت سے افتعال کی "ت" "ط" سے بدل گئی ہے۔ ضرہ الی کذا کے معنی ہیں الجاءہ الیہ اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر کے دھکیل دیا۔ اضطرہ الیہ کے معنی ہیں احوجہ والجاءہ اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر دیا۔ بغی یبغی کے معنی یہاں چاہنے اور طلب کرنے کے ہیں۔ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ یہاں حال پڑے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ 'اضطرار' کے ساتھ مخمصہ کی قید بھی لگی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو جائے تو وہ حرام کردہ چیزیں بھی جان بچانے کے لیے استعمال کر سکتا ہے لیکن یہ اضطرار واقعی ہو، نہ تو اس کے اندر حرام کی کسی چاہت کو دخل ہو اور نہ آدمی اس حد سے آگے بڑھنے والا ہو جس حد تک بڑھنا جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔ ان احتیاطوں کے ساتھ کسی واقعی مجبوری میں اگر کوئی شخص کسی حرام چیز سے فائدہ اٹھائے تو فرمایا ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

رخصت اور عزیمت

قرآن کے الفاظ سے یہ ظاہر ہے کہ یہ اس حالتِ اضطرار کے لیے ایک رخصت ہے جو غذا میسر نہ آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر اسی پر قیاس کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص حالتِ اکراہ میں مبتلا ہو جائے وہ بھی اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے لیکن بعض فقہا نے اس حد سے بڑھ کر اس کو عزیمت کا درجہ دیا ہے۔ چنانچہ حنفیہ کے نزدیک تو وہ شخص خودکشی کا مجرم ٹھہرے گا جو اس طرح کے حالات میں حرام سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے گا۔ ہمارے نزدیک اس اجمال کے ساتھ یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک تفصیل بھی ہے جس کے سامنے آئے بغیر اس سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہم آگے مستقل عنوان سے یہ تفصیل پیش کریں گے تاکہ رخصت و عزیمت کے معاملہ میں اسلام کا جو مزاج ہے وہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۷۴)

اہل کتاب کی بعض تحریمات

یہ اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے جس طرح مشرکین نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت بعض چیزیں حرام ٹھہرالی تھیں اور اسلام کی طرف سے ان کی تحلیل کو خلاف تقویٰ و طہارت قرار دیتے تھے اسی طرح اہل کتاب نے بھی اپنے جی سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے لیا تھا اور اب جب کہ اسلام حرام و حلال کے معاملہ میں اس ضابطے کی طرف لوگوں کو لوٹا رہا تھا جو توہمات و بدعات کے بجائے ملت ابراہیم کی اساس اور وحی الٰہی کی رہنمائی پر مبنی تھا تو یہ لوگ اس کی تائید کرنے کی جگہ کتاب الٰہی کی باتوں کو چھپاتے تھے۔ اس طرح کی ایک سے زیادہ چیزوں کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً یہود اونٹ کے متعلق دعوے کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیم کے وقت سے حرام ہے حالانکہ تورات میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں تھا چنانچہ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تورات لاکر پیش کرو۔ جو اس کے بعد بھی خدا پر جھوٹ باندھیں تو وہی لوگ اصلی ظالم ہیں)

اسی طرح بعض چیزیں یہود پر ان کی سرکشی اور کٹ حجتی کے سبب سے یا ان کے سوال در سوال کی بیماری کے باعث حرام ہوگئی تھیں لیکن اس طرح کی حرمتوں سے متعلق ان کو یہ آگاہی دے دی گئی تھی کہ جب آخری نبی مبعوث ہوں گے تو وہ تمھارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دیں گے اور جو قیدیں اور بندشیں تم پر آج عائد ہیں وہ سب دور ہو جائیں گی۔ لیکن یہود نے اس معاملہ میں بھی حق پوشی اور کفران نعمت کی وہی روش اختیار کی جو ابتدا سے ان کی روش تھی۔ انھوں نے ان چیزوں کی تحلیل کو آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا احسان قرار دینے کے بجائے اس کو دین داری اور تقویٰ کے خلاف قرار دیا اور اس کی آڑ میں قرآن، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوب خوب مخالفت کی۔

اس باب میں بعض جرائم نصاریٰ کے بھی بڑے شدید ہیں۔ اگرچہ ان کا جرم تحریم سے زیادہ تحلیل کی نوعیت کا ہے۔ پال نے جو موجودہ مسیحیت کا بانی ہے، یہ فلسفہ پیش کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے احکام غیر بنی اسرائیل پر واجب نہیں ہیں۔ اس طرح اس نے مسیحیوں کے لیے شراب بھی کھلے بندوں جائز کر دی اور خنزیر اور گلا گھونٹے ہوئے جانور کو بھی ان کے لیے مباح کر دیا۔

ان اہل کتاب کے متعلق قرآن نے فرمایا کہ یہ لوگ جو حق پوشی کر رہے ہیں اور اپنی دنیا بنانے کی خاطر دین کو جو بیچ رہے ہیں یہ سودا ان کو بڑا مہنگا پڑے گا۔ دین فروشی کے عوض جو دنیا آتی ہے، یہ آگ ہے جو وہ اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں اور اب قیامت کے دن نہ تو خدا ان سے بات کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔

اب ان کے لیے اذیت ناک عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اہل کتاب پر عتاب

بات نہ کرنے کا مطلب ظاہر ہے کہ لطف و عنایت کی بات نہ کرنا ہے۔ گویا فعل کی نفی سے مقصود حقیقی فعل کی نفی ہے۔ دوسری جگہ اس سلسلہ میں وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ کے الفاظ بھی ہیں اس سے بھی مراد نگاہ التفات کی نفی ہے۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ خدا جس قوم کو کتاب و شریعت دیتا ہے اور اپنا پیغام پہنچانے کے لیے اس کے اندر اپنا نبی بھیجتا ہے تو یہ بھی نبی کے واسطہ سے خداوند تعالیٰ گویا اس قوم کو اپنے شرفِ تکلم سے نوازتا ہے۔ پھر خاص طور پر بنی اسرائیل کو تو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے پیغمبر کو اپنے خطاب کے شرف سے نوازا۔ اس عظیم عزت افزائی کا تقاضا یہ تھا کہ یہود دل و جان سے خدا کی شریعت اور اس کے کلام کی قدر کرتے اور گوشے گوشے میں اس کا چرچا پھیلاتے لیکن جب انھوں نے اس کو شرف سمجھ کر اس کو پھیلانے کی جگہ اس کو عیب کی طرح چھپانے کی کوشش کی تو اب ان کا کیا منہ رہ گیا ہے کہ خدا ان کو قیامت کے دن پھر اپنے شرفِ خطاب سے نوازے۔

"اور نہ ان کو پاک کرے گا" یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت اور کتاب کی نعمت سے اسی لیے نوازا تھا کہ ان کو پاکیزہ بنائے لیکن جب انھوں نے اس نعمت کے باوجود گمراہیوں اور آلودگیوں ہی میں لتھڑے رہنا پسند کیا تو اب خدا ان کو آخرت میں پاک نہیں کرے گا۔ آخرت میں پاک نہ کرنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت تزکیہ و تطہیر کا محل نہیں ہے بلکہ جزا و سزا کا محل ہے اس وجہ سے وہاں کسی کے تزکیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی ان بداعمالیوں کے سبب سے چونکہ ان کا ایمان سلب ہو چکا ہے اس وجہ سے ان کو یہ موقع بھی نہیں حاصل ہوگا کہ یہ دوزخ میں اپنے اعمال کی سزا بھگت کر اور پاکیزہ ہو کر جنت میں جاسکیں بلکہ ان کے لیے دائمی عذاب ہوگا اور یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

مسلم شریف کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی آیت کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے زانی، جھوٹے بادشاہ اور گدائے متکبر کو بھی داخل کیا ہے۔ یہ حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں بلکہ اشتراکِ علت کی وجہ سے آیت کے حکم کی توسیع ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۱۷۵)

'فَمَا أَصْبَرَ' کا اسلوب 'مَا أَحْسَنَ' کی طرح اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو اس دیدہ دلیری کے ساتھ ہدایت کی جگہ ضلالت اور مغفرت کی جگہ عذاب کو ترجیح دے رہے ہیں تو دوزخ کے معاملہ میں ان کی ڈھٹائی اور جرأت حیرت انگیز ہے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ (۱۷۶)

عتاب کا سبب

یہ اس ناراضگی اور غضب کا سبب بیان ہو رہا ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس عتاب کے مستحق اس وجہ سے ٹھہریں گے کہ خدا نے ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے ایک ایسی کتاب اتاری جو تمام جھگڑوں اور سارے اختلافات کو چکا دینے والی ہے لیکن انھوں نے اس کے بعد بھی ہدایت کی جگہ ضلالت ہی کو اختیار کیا تو یہ اسی بات کے مستحق ہیں کہ یہ ہمیشہ کے لیے خدا کی نظرِ التفات سے محروم ہو کر اس عذاب میں پڑیں جس سے ان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہو۔

اس میں بالحق[1] کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ خدا نے یہ کتاب قولِ فیصل کے ساتھ اتاری ہے۔ یعنی اہل کتاب نے حق پوشی اور تحریف کر کے اللہ کے دین میں جو طرح طرح کے اختلافات پیدا کر دیئے تھے اور جس کے سبب سے یہ معلوم کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا کہ کیا حرام ہے، کیا حلال، کیا حق ہے اور کیا باطل، اللہ نے قرآن کے ذریعہ سے اس اختلاف و نزاع کو بالکل رفع کر دیا، اب حق کی راہ ہر طالبِ حق کے لیے پھر کھل گئی ہے اور خدا کی شریعت اپنی صحیح اور مکمل شکل میں لوگوں کے سامنے آگئی ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ انھی جھگڑوں میں پڑے رہیں تو ان کی شامت اور بدبختی ہی ہے۔

شقاق کے معنی مخالفت اور عناد کے ہیں، چنانچہ فرمایا ہے یٰقَوۡمِ لَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شِقَاقِیۡۤ اَنۡ یُّصِیۡبَکُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ الآیۃ ۸۹۔ ہود (اے میری قوم کے لوگو، میری مخالفت اور دشمنی تمھارے لیے اس بات کا باعث نہ بن جائے کہ تمھارے اوپر بھی اس طرح کا عذاب آدھمکے جس طرح کا عذاب قومِ نوح پر آیا) شقاق کے ساتھ جب بعید کی صفت لگ جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی شخص یا چیز کی مخالفت اور دشمنی میں کوئی شخص اس قدر آگے بڑھ جائے اور اتنی دور نکل جائے کہ اس کو اپنے نفع و نقصان کا بھی کچھ ہوش نہ رہ جائے، اور پھر اس کے لیے اتنی دور سے پلٹنے اور تلافیٔ مافات کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔ ان اہل کتاب کے متعلق فرمایا کہ تورات کے بعد اب قرآن میں بھی انھوں نے یہ جو اختلاف کیا ہے یہ محض ان کی ضدم ضدا کا کرشمہ ہے اور یہ اب اس راہ میں اتنی دور تک نکل گئے ہیں کہ ان کے واپس لوٹنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔

۴۵۔ رخصت اور عزیمت کے معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر

آیت ۱۷۳۔ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ کی وضاحت کے ضمن میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اس شخص کے لیے کسی حرام سے وقتی طور پر فائدہ اٹھا لینے کی رخصت ہے جس کی بھوک کے سبب سے جان پر آ بنی ہو اور زندگی بچانے کی کوئی اور صورت حرام کھا لینے کے سوا اس کو نظر نہ آ رہی ہو۔ قرآن کے الفاظ

---

[1] لفظ حق کے مختلف معانی کی تحقیق آیت ۷۱، کے تحت ملاحظہ ہو۔ یہاں مراد قولِ فیصل ہے۔

فَــلَآ اِثۡــمَ عَلَيۡهِ (ایسی صورت میں اس پر کوئی گناہ نہیں) اور اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (اللہ ایسی حالت میں بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے) صاف بتا رہے ہیں کہ یہ مجبوری کے حالات کے لیے ایک رخصت ہے اسی وجہ سے ہم ان فقہاء کی رائے کے بارے میں متردد ہیں جو اس رخصت کو عزیمت کا درجہ دیتے ہیں اور اس شخص پر خودکشی کا حکم لگاتے ہیں جو اضطرار کی حالت میں حرام سے فائدہ نہ اٹھائے اور اس کے نتیجہ میں اس کی جان چلی جائے۔

ہمارے نزدیک یہ بات اس اجمال کے ساتھ، جیسا کہ ہم آیت کی تاویل کرتے ہوئے ظاہر کر چکے ہیں، صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ رخصت بہرحال رخصت ہے۔ کسی رخصت کو مطلق طور پر عزیمت کا درجہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص اضطرار کے باوجود حرام سے فائدہ نہیں اٹھاتا اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی موت حرام کی موت ہوئی۔

اس امر میں تو شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں جو رخصتیں رکھی ہیں وہ سب اس کی مہربانی اور رحمت کا مظہر ہیں۔ وہ ہماری کمزوریوں اور ہماری مجبوریوں سے سب سے زیادہ باخبر ہے۔ اس وجہ سے اس نے ہم پر کوئی بوجھ ایسا نہیں ڈالا ہے جو ہماری طاقت سے زیادہ ہو۔ اس نے وضو کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ اجازت بھی دے دی کہ اگر سفر کی حالت ہو، پانی نہ دستیاب ہو سکتا ہو یا بیماری کے سبب سے وضو کرنے میں مضرت کا اندیشہ ہو تو آدمی تیمم کر سکتا ہے۔ اس نے نماز کا حکم دیا تو ساتھ ہی یہ رخصت بھی عنایت فرمائی کہ سفر کی حالت میں آدمی قصر کر سکتا ہے۔ اسی طرح روزہ کا حکم دیا تو یہ اجازت بھی دی کہ اگر روزے کے مہینہ میں سفر پیش آجائے یا آدمی بیمار پڑ جائے تو دوسرے دنوں میں اپنے روزے پورے کرے۔ اس طرح کی رخصتیں دین کے ان تمام احکام کے ساتھ مذکور ہیں جن کی تعمیل کے کسی مرحلہ میں کوئی ایسی مشکل پیش آ سکتی ہے جو عام قوتِ برداشت سے زیادہ ہو۔ ان کے بارے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ آدمی ضرورت پیش آ جانے پر ان سے فائدہ اٹھائے اور عزیمت کے جوش میں خواہ مخواہ اپنی جان کو مشقت میں نہ ڈالے۔ اگر کوئی شخص مضرت کے اندیشہ کے باوجود تیمم کے بجائے وضو پر اصرار کرے یا زحمتوں کے باوجود سفر میں اتمامِ نماز ہی کو تقاضائے تقویٰ سمجھے یا مشقت کے باوجود سفر کی حالت میں بھی روزے پورے کرنے ہی کو عزیمت جانے تو ہمارے نزدیک ایسا شخص اسلام کا اصلی مزاج سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ یہ دین کے معاملہ میں تشدد پسندی ہے اور جو شخص دین میں تشدد پسندی کی راہ اختیار کرتا ہے اور رخصتوں کو خلاف عزیمت جانتا ہے وہ درحقیقت دین سے دھینگا مشتی کرتا ہے اور ایسا شخص حدیث میں وارد ہے کہ دین سے شکست کھا جاتا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو تنبیہ فرمائی جو سفر میں روزے کی وجہ سے اپنے آپ کو سخت مشقت میں ڈالے ہوئے تھے لیکن اگر کسی شخص کو سفر میں ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہوں وہ بلا کسی خاص زحمت کے پوری نمازیں پڑھ سکتا ہے یا روزے رکھ سکتا ہے تو اس سے کسی گناہ کے لازم ہونے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی شخص کو حالتِ اضطرار پیش آجائے اور جان بچانے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر باقی ہی نہ رہ جائے کہ وہ کسی حرام سے فائدہ اٹھائے تو عام حالات میں اسلام کا مزاج یہی تقاضا کرتا ہے کہ جان بچانے کی حد تک وہ اس حرام سے فائدہ اٹھالے۔ اس چیز کو نہ خلافِ تقویٰ خیال کرے نہ خلافِ عزیمت لیکن بعض شکلیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جب ایک غیرت مند مسلمان کے شایانِ شان بات یہی ہوتی ہے کہ وہ جان تو دے دے لیکن حرام کو ہاتھ لگانا گوارا نہ کرے۔ مثلاً اگر کسی جگہ فساق و فجار کے صاحبِ اختیار ہونے کی وجہ سے حرام و حلال کی تمیز اٹھ گئی ہو اور آدمی کو کوئی حرام چیز کھانے پر مجبور کیا جائے تو اس کے ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ وہ عزیمت کی راہ اختیار کرے اور دوسروں کے ایمان کو زندہ کرنے کے لیے اپنی زندگی قربان کر دے۔ یہ بازی کھیل کر وہ گنہگار نہیں ہو گا بلکہ ان شاء اللہ اپنی غیرتِ ایمانی اور احترامِ حقوقِ شریعتِ الٰہی کے صلے میں شہادت کا مقام حاصل کرے گا۔ کم از کم علماء و مصلحین کے لیے تو ایسے حالات کے اندر یہی روش بہتر ہے حضرات صحابہؓ نے مکہ کی ابتدائی زندگی میں جو تکلیفیں کلمۂ توحید کی خاطر اٹھائی ہیں وہ کس سے مخفی ہیں؟ کتنے اصحاب نے اعدائے توحید کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا اور زندگی تو سب ہی حضرات کی خطرے میں رہی لیکن ان میں سے کسی ایک صحابیؓ کے متعلق بھی ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ انھوں نے جان بچانے کی خاطر کلمۂ کفر زبان سے نکالا ہو حالانکہ قرآن میں اس بات کی صریح اجازت موجود تھی کہ اکراہ کی صورت میں آدمی جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ سکتا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ نہ تو دین کی رخصتوں کو حقیر سمجھنے کا رجحان صحیح ہے اور نہ رخصتوں ہی کو عزیمت قرار دے دینے کا رجحان صحیح ہے بلکہ صحیح مسلک یہ ہے کہ عام حالات میں جس طرح رخصتوں سے فائدہ اٹھانا مزاجِ شریعت کے مطابق ہے اسی طرح خاص حالات میں عزیمت کے تقاضوں پر عمل کرنا بھی دین کا مطالبہ ہے۔

۵۵۔ آگے کا مضمون ـــــ آیت ۱۷۷

دین محض چند رسوم ظواہر کا نام نہیں

اوپر والے مجموعہ آیات میں، جیسا کہ واضح ہوا، توحید کا بیان تھا۔ اب آگے والی آیت میں اس کے لوازم و ثمرات یعنی ایمان، انفاق، اقامتِ صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، ایفائے عہد اور ہر طرح کے حالات میں حق پر استقامت کا بیان ہو رہا ہے۔ اس مضمون کی تمہید اس طرح ہے کہ خدا کے ساتھ وفاداری کا حق مشرق یا مغرب کی طرف رخ کر لینے سے ادا نہیں ہو گا جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے سمجھ رکھا ہے، چنانچہ اسی مسئلہ پر ان کے ہاں ایک مدت سے معرکۂ جدال و قتال گرم ہے گویا ان کے خیال میں اصل دین یہی ہے۔ بلکہ اس کے لیے فلاں فلاں چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس تمہید سے مقصود مسلمانوں کو یہ آگاہی دینا ہے کہ دین محض چند رسوم و ظواہر کا نام نہیں ہے بلکہ وہ زندگی سے نہایت گہرے تعلق رکھنے والے اعمال و اخلاق کا مجموعہ ہے اس وجہ سے وہ اگلی امتوں کی طرح صرف رسوم کے بندے بن کر نہ رہ جائیں بلکہ دین کی اصلی حقیقتوں کو اپنائیں جو یہ ہیں۔ انہی کو اپنا کر وہ خدا

کے ساتھ اپنی وفاداری کا حق ادا کر سکیں گے۔ ان کے بغیر محبت و وفاداری کے دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔ اس
روشنی میں آیت کی تلاوت فرمائیے ارشاد ہوتا ہے۔

آیت ۱۷۷

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ آیت ۱۷۷

خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کر لو بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدق دل سے ایمان لائیں۔ اور اپنے مال، اس کی محبت کے باوجود، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں۔ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں، خاص کر وہ لوگ جو فقر و فاقہ، تکالیف جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔

۵۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

بِرّ کے معنی — 'بِرّ' کا اصل مفہوم عربی لغت میں کسی کے حق کو پورا کرنا ہے۔ عام اس سے کہ خدا کا حق ہو، ماں باپ کا حق ہو، یا اللہ کے بندوں کا حق ہو۔ ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں

شامل ہے جو معاہدات، قول و قرار، حلف و ولاء، عقود اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں۔ بَرّ اور بارّ اس سے صفت کے صیغے ہیں۔ بَرٌّ بِوَالِدَيۡهِ اس سعادت مند بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور ان کے حقوق پورے پورے ادا کرنے والا ہو۔ برّ بالقسم کے معنی ہیں اس نے اپنی قسم پوری کر دی۔[1] اللہ تعالیٰ کے لیے بھی بَرّ کی صفت استعمال ہوئی ہے اس لیے کہ اس نے بندوں کے جو حقوق اپنے اوپر لیے ہیں یا جو وعدے ان سے کیے ہیں وہ ان کو ایک ایک کر کے دنیا اور آخرت دونوں جگہ پورے کرنے والا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حقوق و واجبات ہوں یا نیکیاں اور بھلائیاں سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے ہمیں ترجمہ کے لیے اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر دے۔ ہم نے جو لفظ اختیار کیا ہے وہ ہمارے نزدیک ایک حد تک لفظ کی اصل روح کو ادا کرتا ہے۔

یہاں اصل بیان تو ایمان و انفاق اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کا ہے لیکن جیسا کہ اس باب کی تمہید میں ہم بیان کر آئے ہیں، ان احکام و شرائع کے پہلو بہ پہلو تجدید دین کے تقاضوں کے تحت ان بدعات کی تردید بھی ہے جو اہل کتاب یا مشرکین نے شریعتِ الٰہی میں داخل کر دی تھیں اور جن کے سبب سے پوری شریعت یا تو مسخ ہو کر رہ گئی تھی یا صرف چند ظواہر اور رسوم کا مجموعہ بن گئی تھی۔ یہاں اسی تجدید دین کے تقاضے کے تحت اصل احکام کے بیان کی تمہید اس طرح اٹھائی کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کا حق صرف مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینے سے ادا نہیں ہو جاتا بلکہ اصل شے وہ اعمال و اخلاق ہیں جن کی شریعت نے تعلیم دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے جن کے ہاں تورات و انجیل کی اصل تعلیمات تو طاقِ نسیاں پر رکھ دی گئی تھیں لیکن قبلہ کے معاملہ میں مشرق و مغرب کا جھگڑا، جیسا کہ آیات ۱۱۵، ۱۴۲ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں، ان کے درمیان اس طرح اٹھ کھڑا ہوا تھا گویا سارے دین کا انحصار بس اسی چیز پر ہے۔

اس امت کے لیے ایک تنبیہ

یہ تمہید جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے اس امت کے لیے تنبیہ ہے کہ اس طرح کی فروعی باتوں میں الجھ کر اصل دین سے دستبردار نہ ہو جانا ورنہ یہود و نصاریٰ ہی کی طرح تم بھی مچھر کو چھاننے والے اور اونٹ کے نگلنے والے بن کر رہ جاؤ گے اور جس طرح ان کا دعوائے خدا پرستی بے معنی ثابت ہوا اسی طرح تمہاری خدا پرستی بھی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ ٹھیک اسی مفہوم کی تنبیہ آگے حج کے بیان کے سلسلہ میں بھی فرمائی ہے۔ وَلَيۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُيُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۱۸۹- بقرہ (یہ کوئی تقویٰ نہیں ہے کہ گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو، تقویٰ تو اس کا ہے جو حدودِ الٰہی کا احترام ملحوظ رکھے) ان تمام تنبیہات

---

[1] لفظ بِرّ کی یہ تحقیق زیادہ تر مولانا فراہیؒ کی مفردات القرآن سے ماخوذ ہے۔

سے مقصود، جیسا کہ عرض کیا گیا، اس امت کو یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی بدعات اور ظاہر پرستیوں سے بچا کر دین کی اصل حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا تھا لیکن افسوس ہے کہ یہ امت بھی انھیں وادیوں میں بھٹک کر رہ گئی جن میں پچھلی امتیں ہلاک ہوئی تھیں۔

"وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ" میں ایک مضاف عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق محذوف ہے گویا پوری عبارت یوں ہوگی وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ. مضاف کے حذف کی مثال خود اسی زیر بحث آیت میں موجود ہے۔ فرمایا ہے۔ وَفِي الرِّقَابِ۔ ظاہر ہے کہ یہ وَفِي فَكِّ الرِّقَابِ ہے۔

ایمان اور اس کے اجزاء

ایمان سے یہاں، سیاق و سباق دلیل ہے کہ حقیقی ایمان مراد ہے۔ اس لیے کہ حقیقی ایمان ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی خدا کی وفاداری کا حق ادا کر سکتا ہے۔ حقیقی ایمان اللہ پر یہ ہے کہ آدمی بلا کسی شائبہ شرک کے اپنے کو پورا پورا اپنے رب کے حوالہ کر دے۔ آخرت پر حقیقی ایمان یہ ہے کہ آدمی مرنے کے بعد اٹھائے جانے کو تسلیم کرے، اپنے ہر قول و فعل کا خدا کے سامنے اپنے کو جواب دِہ سمجھے اور جھوٹی شفاعتوں کے وہم میں مبتلا نہ ہو۔ فرشتوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ہستی کو تسلیم کرے، ان کو معصوم اور قدسی صفت جانے، ان کو اللہ کی ہدایت لانے والا، امین اور معتمد مانے اور ان کو قضا و قدر کے فیصلوں کی تنفیذ کا ذریعہ سمجھے۔ ایمان بالکتاب کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اللہ کا اتارا ہوا صحیفۂ ہدایت مانے، اس کو حق و باطل کی کسوٹی سمجھے اور زندگی کے ہر پہلو میں اس کی رہنمائی پر پورا پورا اعتماد کرے۔ نبیوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ان کو خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہادی مانے، ان کے علم کو بے خطا سمجھے، ان کے عمل کو زندگی کے لیے اسوہ قرار دے اور ان کی اطاعت، اتباع اور محبت کو لازم جانے۔

ایمان بالملائکہ

یہاں ایک بات ممکن ہے بعض ذہنوں میں کچھ کھٹکے۔ وہ یہ کہ ایمان کے اجزاء میں فرشتوں پر ایمان کو کیوں داخل کر دیا ہے جب کہ ان کا تجربہ صرف نبیوں ہی کو ہوا ہے اور ان پر ایمان لانے کا کوئی خاص علمی یا عملی فائدہ ایک عام آدمی پر واضح نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایمان باللہ کا حق آخرت، کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے بغیر ادا نہیں ہوتا، انھی چیزوں پر ایمان لانے سے ایمان باللہ ہماری زندگی کی ایک محسوس، مؤثر اور فعال حقیقت بنتا ہے اسی طرح ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسل کا ایک غیر منفک جزو ایمان بالملائکہ ہے۔ ملائکہ کو مانے بغیر خدا اور اس کے نبیوں کے درمیان کا واسطہ غیر واضح اور غیر معین رہ جاتا ہے، جس کے غیر واضح رہنے سے نہ صرف سلسلۂ علم و ہدایت کی ایک نہایت اہم کڑی گم شدہ رہ جاتی ہے بلکہ ہدایت آسمانی کے باب میں عقل انسانی کو گمراہی کی بہت سی راہیں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ بات تو دنیا ہمیشہ سے مانتی آئی ہے کہ خدا ہے اور یہ بات بھی اس نے ہمیشہ محسوس کی ہے کہ جب وہ ہے تو اسے اپنی مرضیات سے اپنے بندوں کو آگاہ بھی کرنا چاہیے لیکن جب وہ کبھی بے نقاب اور روبرو ہو کر ہمارے سامنے نہیں آتا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ذریعہ اور واسطہ کیا ہے جس سے وہ خلق کو

اپنے احکام و ہدایات سے آگاہ کرتا ہے۔ اگر اس مقصد کے لیے اس نے اپنے خاص خاص بندوں کو منتخب کیا ہے، جن کو انبیاء و رُسل کہتے ہیں تو بعینہٖ یہی سوال ان کے بارے میں بھی اٹھتا ہے کہ ان نبیوں اور رسولوں کو وہ اپنے علم و ہدایت سے آگاہ کرنے کا کیا ذریعہ اختیار کرتا ہے۔ کیا رو در رو ہو کر خود ان سے بات کرتا ہے یا کوئی اور ذریعہ اختیار فرماتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے درمیان علم کا واسطہ وحی ہے جو وہ اپنے فرشتوں بالخصوص اپنے مقرب فرشتے جبریلؑ کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔ یہ فرشتے خدا کی سب سے زیادہ پاکیزہ اور برتر مخلوق ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ یہ براہ راست خدا سے وحی اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے رب کی حمد و تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ خدا کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرتے ہیں اور چونکہ خدا کے حکم و اختیار کے تحت اور اس کی نگرانی میں کرتے ہیں اس وجہ سے نہ تو کوئی اور مخلوق ان کے کسی کام میں رکاوٹ ڈال سکتی اور نہ وہ خود ہی اس میں کبھی بھول چوک یا کسی غلطی کے مرتکب ہو سکتے۔ انہی کے زمرہ کی ایک مقرب ہستی حضرت جبریلؑ ہیں جو خدا کے ہاں سب سے زیادہ بلند مرتبہ اور مقرب ہیں۔ قرآن میں ان کی صفت ذی قوت، مطاع اور امین بھی آئی ہے، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے وہ اس کے لیے تمام صلاحیتوں اور قوتوں سے بھرپور ہیں، دوسری قوتیں یا ارواح خبیثہ ان کو متاثر یا مغلوب نہیں کر سکتیں۔ ان کے دائرۂ کار میں سب بے چون و چرا ان کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں، مجال نہیں ہے کہ کوئی ان کے حکم سے سرتابی کر سکے، وحی الٰہی کی جو امانت نبیوں اور رسولوں تک پہنچانے کے لیے ان کے سپرد کی جاتی ہے وہ اس کو بے کم و کاست پہنچاتے ہیں، ممکن نہیں کہ اس میں کسی زیر زبر کا بھی فرق ہو سکے۔

وحی و رسالت کے ساتھ فرشتوں کے اس گہرے تعلق کی وجہ سے نبیوں اور کتابوں پر ایمان لانے کے لیے ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہوا۔ یہ خدا اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے درمیان رسالت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اس اعتبار سے یہ ناگزیر ہیں کہ یہی ایک ایسی مخلوق ہیں جو عالم لاہوت اور عالم ناسوت دونوں کے ساتھ یکساں ربط رکھ سکتے ہیں، یہ اپنی نورانیت کی وجہ سے خدا کے انوار و تجلیات کے بھی متحمل ہو سکتے ہیں اور اپنی مخلوقیت کے پہلو سے انسانوں سے بھی اتصال پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کے سوا کوئی اور مخلوق خدا تک رسائی کا یہ درجہ اور مقام نہیں رکھتی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ان رسولوں پر بھی ایمان لایا جائے جو خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان رسالت کا واسطہ ہیں۔

یہ حقیقت یہاں پیشِ نظر رہے کہ عقل انسانی عالم لاہوت سے تعلق رکھنے والی ارواح کے تجسس میں ہمیشہ سے رہی ہے اور اس ضرورت کو اس نے اس شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ اس تلاش میں اگر اس کو کوئی صحیح چیز نہیں مل سکی ہے تو جو غلط سے غلط چیز بھی اس کے ہاتھ آ گئی ہے اسی کا دامن اس نے پکڑ لیا ہے۔ عرب کے کاہن و ساحر جنات، شیاطین اور ہاتف غیبی کو عالمِ لاہوت سے تعلق کا ذریعہ سمجھتے تھے، ہندوستان کے جوتشی اور منجم ستاروں کی گردشوں کے اندر غیب کے اسرار ڈھونڈتے تھے، چین کے مندروں کے پجاری اپنے

باپ دادا کی ارواح کے توسط سے عالمِ غیب سے توسّل پیدا کرتے تھے۔ قرآن نے ان تمام غلط وسائل اور واسطوں کی نفی کر دی اور ان کے ذریعہ سے حاصل شدہ علم کو رطب و یابس کا مجموعہ ٹھہرایا اور ساتھ ہی یہ حقیقت واضح فرمائی کہ علمِ الٰہی کا قابلِ اعتماد ذریعہ صرف ملائکہ ہیں جو انبیاء کے پاس آتے ہیں اور جتنا کچھ خدا ان کو دیتا ہے وہ بے کم و کاست ان کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ایمان بالملٰئکہ، ایمان بالکتاب، اور ایمان بالانبیاء سب ایک دوسرے سے اتصال رکھنے والی کڑیاں ہیں اور جس طرح ایمان بالکتاب اور ایمان بالانبیاء ہماری زندگی کی نہایت محسوس حقیقتیں ہیں اسی طرح ایمان بالملٰئکہ بھی ہماری زندگی کی ایک نہایت اہم علمی و عملی حقیقت ہے۔

'عَلٰی حُبِّہٖ' میں ضمیر کا مرجع

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ، میں ضمیر مجرور یوں تو خدا کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے یعنی آدمی اپنا مال خدا کی محبّت کی راہ میں خرچ کرے لیکن ہمارے نزدیک مختلف وجوہ سے ان لوگوں کا قول قابلِ ترجیح ہے جو اس کا مرجع مال کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی آدمی مال کی محبّت کے باوجود اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرے۔

مال کی محبّت کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مال بجائے خود قیمتی اور دل پسند ہو، دوسرا یہ کہ آدمی خود اس کا ایسا ضرورت مند ہو کہ دوسرے کے لیے ایثار کرنا نفس پر شاق ہو رہا ہو۔ تیسرا یہ کہ زمانہ قحط اور گرانی کا ہو جس میں کشادہ دست آدمی بھی محتاط اور کفایت پسند بن جایا کرتا ہے۔ عَلٰی حُبِّہٖ کا لفظ ان تینوں ہی صورتوں پر حاوی ہے۔ اس مفہوم کو ترجیح دینے کی ہمارے نزدیک کئی وجہیں ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ قرآن کے نظائر سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بِرّ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و وفاداری کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنے کے لیے انسان کو کس قسم کا انفاق کرنا چاہیے۔ یہ مضمون دوسرے مقامات میں جہاں جہاں بیان ہوا ہے وہاں صراحت کے ساتھ یہ بات بتائی گئی ہے کہ یہ مرتبہ اس مال کے خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے جو محبوب ہو، مثلاً لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۹۲۔ آل عمران (تم کامل وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک اس مال میں سے خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے) اسی طرح دوسرے مقام میں سچے اہلِ ایمان کی تعریف فرمائی گئی ہے کہ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ ۹۔ حشر (اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو)

دوسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ سب سے افضل صدقہ کون سا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ جو ایک بے مایہ اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنے کسی ایسے عزیز پر خرچ کرتا ہے جو اس کے خلاف اپنے دل میں عداوت رکھتا ہے۔

تیسری یہ کہ اہلِ عرب کے ہاں بھی سب سے زیادہ قابلِ تعریف فیاضی انھی لوگوں کی سمجھی جاتی تھی جو زمانۂ قحط و گرانی میں فیاضی کرتے تھے جب کہ مال، مالداروں کی نظر میں بھی بڑی محبوب چیز بن جاتا ہے۔ عرب شعراء نے اس صفت کی بالاتفاق تعریف کی ہے۔ دوسری قوموں میں بھی یہ صفت بلا اختلاف ممدوح ہے۔

چوتھی یہ کہ اس طرح کا انفاق اغلب یہی ہے کہ خدا کی محبت ہی میں ہو، اس لیے کہ بغیر اس قوی محرک کے نفس کا اس قسم کے ایثار پر آمادہ ہونا بڑا مشکل ہے۔ اس پہلو سے یہ مفہوم پہلے مفہوم پر خود بخود حاوی ہوجاتا ہے۔

انفاق کے مصارف

انفاق کے مصارف میں سب سے پہلے قرابت مندوں کو رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے اعزہ و اقربا اگر وہ ضرورت مند ہیں، اس کی اعانت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ دل میں عداوت بھی چھپائے ہوئے ہوں جب بھی سب سے افضل انفاق، جیسا کہ اوپر والی حدیث سے واضح ہوا، وہی ہے جو ان کے لیے کیا جائے۔

قرابت مندوں کے بعد معاً یتامیٰ کا ذکر اسلامی معاشرہ میں ان کے درجہ و مرتبہ کو واضح کرتا ہے کہ اپنے عزیزوں کے بعد پہلی نظر آدمی کی ان بچوں پر پڑنی چاہیے جو سایۂ پدری سے محروم ہوچکے ہیں اور جن کی کفالت و تربیت کی ساری ذمہ داری معاشرہ پر منتقل ہوچکی ہے۔

اِبْنُ السَّبِیْل سے مراد مسافر ہے۔ مسافر مجرد اپنی مسافرت کی حالت کی بنا پر مستحق اعانت ہوتا ہے اس سے قطع نظر کہ وہ صاحب استطاعت ہے یا غیر صاحبِ استطاعت اگر مستحق اعانت ہونے کے لیے غیر صاحب استطاعت ہونے کی شرط ہوتی تو مسکین کے بعد اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

سائلین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اعانت کے لیے سوال کر بیٹھیں۔ مساکین کے بعد ان کے مستقل ذکر کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو شخص سوال کر بیٹھے اس کے متعلق زیادہ کھوج کرید کی ضرورت نہیں ہے کہ واقعی وہ محتاج ہے یا نہیں۔ اگر وہ بے ضرورت سوال کر رہا ہے تو اس کی جواب دہی خود اس کے اوپر اللہ کے ہاں ہے ہمارا حق صرف یہ ہے کہ اگر ہم امداد کرسکتے ہوں تو ایسے شخص کی امداد کریں اور اگر معذور ہوں تو، جیسا کہ قرآن اور حدیث میں ہدایت ہے، شائستہ انداز سے اس کے سامنے اپنی معذرت پیش کردیں۔

"وَفِی الرِّقَابِ" میں رقاب رقبہ کی جمع ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی فِی فَکِّ الرِّقَابِ گردنوں سے مراد یہاں غلاموں کی گردنیں ہیں۔ ان کو طوقِ غلامی سے چھڑانا اور آزاد انسانوں کی سطح پر لانا انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے اس وجہ سے اسلام نے اپنی مدّاتِ خیر میں ان کو بھی شامل کرلیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کا معاملہ اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو نہیں تھا، وقت کے بین الاقوامی قانونِ جنگ کے تحت اسلام نے اس کو محض وقتی طور پر اس لیے گوارا کیا تھا کہ اس وقت بین الاقوامی سطح پر جنگ کے قیدیوں کے مسئلہ کا کوئی اور حل موجود نہیں تھا۔ لیکن اس کو گوارا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام نے اپنے ماحول میں غلاموں کی آزادی کی مختلف نوعیتوں سے حوصلہ افزائی کی۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کو خرید کر آزاد کردینے یا ان کی مکاتبت یعنی شرطِ آزادی کی رقم ادا کرنے کو ایک ثواب کا کام ٹھہرا دیا۔

اب اس زمانہ میں غلامی اگرچہ قانوناً ختم ہو چکی ہے اور یہ بات عین منشائے اسلام کے مطابق ہوئی ہے لیکن عملاً آج بھی بے شمار انسان اپنی معاشی مجبوریوں اور خاص طور پر سودی قرضوں کی لعنت کے سبب سے ایسے بندھنوں میں گرفتار یا جیلوں میں بند ہیں کہ ان کو اگر غلام نہیں تو غلاموں سے مشابہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی گلو خلاصی اور ان کے رہن شدہ مکانوں اور کھیتوں کو چھڑانا بھی انشاء اللہ فَكُّ رَقَبَةٍ ہی کے درجے کی نیکی ہے۔

نماز اور زکوٰۃ — اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَى الزَّكٰوۃَ۔ پر مفصل بحث اس کتاب کے شروع میں ہو چکی ہے۔ یہاں ایمان و انفاق کے ذکر کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ان دونوں کے قانونی و عملی مظاہر کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ایمان کی عظیم حقیقت کا مظہر عملی نماز ہے اور انفاق کی وسیع حقیقت کا مظہر قانونی زکوٰۃ۔ مطلب ان دونوں کے ذکر سے یہ ہے کہ ایمان اور انفاق کی شہادت دینے کے لیے کم سے کم جو چیز مطلوب ہے وہ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں غائب ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ ایمان باقی رہا نہ انفاق درآنحالیکہ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے بندہ خالق اور خلق کے ساتھ اپنے تعلق کو صحت مندانہ بنیاد پر قائم کرتا ہے۔

یہاں زکوٰۃ کا علیحدہ ذکر کرنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ اوپر جس انفاق کا ذکر ہے وہ اس قانونی مطالبہ سے الگ چیز ہے۔ بر و تقوی کا درجہ صرف ادائے زکوٰۃ سے نہیں بلکہ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فیاضانہ خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اسلوب کا رد و بدل — وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ (اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں) میں دفعتہً اسلوبِ کلام بدل گیا ہے۔ اوپر ایمان، انفاق، نماز اور زکوٰۃ کا ذکر فعل کی شکل میں آیا تھا، اَلْمُوْفُوْنَ کا عطف تو انھی پر ہے لیکن یہ اسم فاعل اور صفت کی صورت میں ہے۔ پھر آگے الصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَاءِ (اور ثابت قدم رہنے والے) آ رہا ہے جو ہے تو صفت کی صورت میں لیکن 'مُوْفُوْنَ' پر معطوف ہونے کے باوجود صَابِرُوْنَ کے بجائے صَابِرِيْنَ یعنی حالتِ نصب میں ہو گیا ہے۔

اسلوب کا یہ رد و بدل صرف تنوع کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ معنوی فوائد بھی ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

عربی زبان کے طلبہ اس بات سے واقف ہیں کہ عربی میں فعل کے صیغے تو صرف کسی فعل کے وقوع کو ظاہر کرتے ہیں لیکن صفت کے صیغے کسی مستقل صفت، کسی خصلت اور کسی کردار کو ظاہر کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے اندر ایک عزم و جزم کی روح بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ سلسلۂ کلام میں اگر کسی صفت کا ذکر بغیر کسی ظاہری سبب کے حالتِ نصب میں ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ متکلم اس پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہے۔ ہمارے اہلِ نحو اس بات کو 'عَلٰى سَبِيْلِ الْمَدْحِ' یا 'عَلٰى سَبِيْلِ الْاِخْتِصَاصِ' کی اصطلاح میں تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً یہاں 'مُوْفُوْنَ' کے بعد دفعتہً اس سے بالکل مختلف اسلوب میں 'الصّٰبِرِيْنَ' جو آ گیا تو اس سے

معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ گویا متکلم یہ کہنا چاہتا ہے کہ اَخُصُّ بِالذِّکرِ الصّابِرِین میں صابرین کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔

اسلوب کی اس وضاحت کے بعد اب یہ سوال ذہن میں پیدا ہوگا کہ اوپر عقائد اور عبادات کا ذکر تو سیدھے سادے فعل کے صیغوں سے کیا، پھر یہ ایفائے عہد اور صبر کی کیا خصوصیت تھی کہ ان کا ذکر اسلوب بدل بدل کر اس اہتمام واختصاص اور اس تاکید وتنبیہ کے ساتھ فرمایا؟ اس کے جواب میں چند باتیں پیش نظر رکھیے۔

دین میں سیرت وکردار کی اہمیت

ایک تو یہ کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق سیرت وکردار سے ہے۔ سیرت وکردار کا معاملہ بڑے عزم وجزم اور ریاضت وتربیت کا محتاج ہوتا ہے۔ جہاں تک ظاہری عقائد وعبادات کا تعلق ہے ان کو نبھانے والے تو دین کے زوال وانحطاط کے بعد بھی بہت سے نکل آتے ہیں لیکن کردار جو مغز دین اور روح دین ہے اس کا اہتمام بڑے بڑوں کے اندر بھی نہیں پایا جاتا۔ اہل مذاہب میں یہ کمزوری بہت نمایاں رہی ہے کہ انھوں نے عقائد وعبادات کے ظواہر پر تو بڑے بڑے معرکے اٹھائے ہیں لیکن کردار کی تعمیر پر انھوں نے بہت کم توجہ کی ہے یہاں چونکہ اس آخری امت کی رہنمائی مقام بر واطاعت کی طرف کی جا رہی ہے اس وجہ سے کردار کے پہلو پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ یہ مقام بغیر اعلیٰ کردار کے جن میں ایفائے عہد اور صبر کو اولین اہمیت ہے، حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسری یہ کہ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تمام عقائد وعبادات سے اصل مقصود اعلیٰ سیرت وکردار کی تعمیر ہی ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور نماز روزے کے اہتمام سے مقصود صرف چند باتوں کو مان لینا یا چند رسوم کو بجا لانا ہی تو نہیں ہے۔ ان کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ اللہ ورسول پر ایمان لانے سے انسان کے اندر جو روشنی پیدا ہوتی ہے اس سے ہمارے دل جگمگا اٹھیں اور نماز روزے سے جو مضبوط انفرادی واجتماعی کردار پیدا ہوتا ہے وہ ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کی خصوصیت بن جائے۔ یہ نہ ہو تو تمام عقائد وعبادات سمجھیے کہ بالکل بے جان وبے روح ہیں۔ یہی نکتہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ عقائد وعبادات کے پہلو بہ پہلو ان کے عملی اثرات کی طرف ضرور توجہ دلائی ہے تاکہ ان سے غفلت نہ ہونے پائے۔

تیسری یہ کہ امتحان وآزمائش کا اصلی میدان سیرت وکردار ہی کا میدان ہے۔ انسان کا اصلی خزانہ جو وہ دین کی مدد سے فراہم کرتا ہے یا کر سکتا ہے مضبوط اور پاکیزہ سیرت ہی ہے۔ یہی چیز اس کو انفرادی زندگی میں بھی مقام بر وتقویٰ پر سرفراز کرتی ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی اس کے لیے ابرار وصالحین اور شہدا وصدیقین کی معیت کی ضامن بنتی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس پر خاص طور پر زور دیا جائے کہ مسلمان ہر قسم کی آزمائشوں اور ہر طرح کے فتنوں میں اپنے اس خزانہ کی حفاظت کے لیے چوکنا رہے۔

صبر اور ایفائے عہد

ایک سوال یہاں اور بھی پیدا ہو سکتا ہے وہ یہ کہ یہاں سیرت وکردار سے متعلق صرف دو ہی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ ایک ایفائے عہد کا، دوسری صبر کا۔ اس فہرست میں اور بھی چیزیں شامل ہو سکتی تھیں، آخر ان کا ذکر

کیوں نہیں فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں درحقیقت سیرت و اخلاق سے متعلق تمام اجزا کے لیے بمنزلہ شیرازہ ہیں۔ ایفائے عہد کے اندر تمام چھوٹے بڑے حقوق و فرائض آجاتے ہیں خواہ وہ خلق سے متعلق ہوں یا خالق سے، خواہ وہ کسی تحریری معاہدہ سے وجود میں آتے ہوں یا کسی نسبت، تعلق، رشتہ داری اور قرابت سے، خواہ ان کا اظہار و اعلان ہوتا ہو یا وہ ہر اچھی سوسائٹی میں بغیر کہے ہوئے سمجھے اور مانے جاتے ہوں۔ اللہ اور رسول، ماں اور باپ، بیوی اور بچے، خویش و اقارب، کنبہ اور خاندان، پڑوسی اور اہل محلہ، استاذ اور شاگرد، نوکر اور آقا، ملک اور قوم، ہر ایک کے ساتھ ہم کسی نہ کسی ظاہری یا مخفی معاہدہ کے تحت بندھے ہوئے ہیں اور یہ بر و تقویٰ کا ایک لازمی تقاضا ہے کہ ان تمام معاہدوں کے حقوق ادا کرنے والے بنیں۔ گویا ایفائے عہد کی اصل روح ایفائے حقوق ہے اور ایفائے حقوق انسان کے تمام چھوٹے بڑے فرائض کو محیط ہے۔

اس کے ساتھ صبر کی صفت کو جمع کرکے یہ واضح فرما دیا کہ ہر وہ مزاحمت جو ایفائے حقوق کی اس راہ میں حائل ہو مومن عزیمت و استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرے اور کسی حال میں بھی طمع، پست ہمتی یا خوف سے مغلوب نہ ہو۔

صبر کے تین مواقع کا حوالہ دیا ہے۔ ایک بَاْسَآءِ کا جس سے فقر و فاقہ کی تکالیف مراد ہیں۔ دوسرے ضَرَّآء کا جس سے تکالیف جسمانی کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرے بَاْس کا جس سے جنگ کے حالات مراد ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انسان کا عزم انھی تین راہوں سے آزمائش میں پڑ سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان تینوں حالتوں کے اندر موقف حق پر ثابت قدم رہنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے بر و تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوائے وفاداری میں سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں متقی ہیں) اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ جو لوگ محض چند خالی خولی ظاہر داریوں سے خدا کی وفاداری کا حق ادا کرتے ہیں وہ نہ تو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں، نہ متقی ہیں۔

ایک نکتہ یہاں اور بھی ملحوظ رہے وہ یہ کہ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ کے ساتھ اِذَا عٰهَدُوْا کی جو قید لگی ہوئی ہے اس سے بھی اس عزم و استقلال کا اظہار ہو رہا ہے جو ان وفا پرستوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہے کہ جب وہ کوئی عہد کر بیٹھتے ہیں تو خواہ کچھ ہی ہو، اس کے سبب سے انھیں کیسے ہی نقصانات و آلام سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے لیکن وہ پیٹھ نہیں دکھاتے بلکہ جان کی بازی لگا کر اس کو پورا کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس معاملہ میں جو رویہ رہا ہے وہ پوری تاریخ انسانی میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ خاص کر صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے ابوجندل کے معاملہ میں معاہدہ کا جو احترام کیا وہ تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

۵۷۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۷۸۔۱۷۹

قیامِ امن و عدل کی دو بنیادیں

برّ و تقویٰ کی اصلی حقیقت واضح کرنے کے بعد ان معاملات کی طرف توجہ فرمائی جو اسی برّ و تقویٰ پر مبنی ہیں اور جن کی اس اعتبار سے بڑی اہمیت ہے کہ انھی پر معاشرہ کے امن و عدل اور اس کے تحفظ و بقا کا انحصار ہے۔ اگر ایک متوسط درجہ کا ذہن رکھنے والا آدمی بھی غور کرے گا تو وہ نہایت آسانی سے اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے کہ انسانوں اور انسانوں کے تعلقات کی استواری کی بنیاد اصلاً دو چیزوں پر ہے۔ ایک اس چیز پر کہ ہر شخص دوسرے کی جان کا احترام کرے۔ دوسرے اس چیز پر کہ ہر شخص دوسرے کے مال کا احترام کرے۔ اسی وجہ سے حرمتِ جان اور حرمتِ مال کے قانون کو ہمیشہ سے دوسرے تمام قوانین پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ اسی اصل کے تحت، جو تمام تر فطرتِ انسانی پر مبنی ہے، قرآن نے بھی برّ اور تقویٰ کی بنیاد استوار کرنے کے بعد سب سے پہلے احترامِ جان کے قانون کو لیا اور قصاص کو پورے معاشرے کی ذمہ داری قرار دیا۔ یعنی اگر کوئی شخص قتل ہو گیا ہے تو یہ صرف اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں ہی کی ذمہ داری نہیں ہے کہ اس کے قاتل کا کھوج لگائیں اور اس کو سزا دیں بلکہ پورے معاشرے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا تعاقب کرے اور اس کو کیفرِ کردار کو پہنچائے۔ گویا ایک شخص کا قتل ہونا سب کا قتل ہونا اور اس کا زندہ ہونا سب کا زندہ ہونا ہے۔

قصاص کا یہ قانون موجود تو اہلِ کتاب کے ہاں بھی تھا اور اہلِ عرب کے ہاں بھی۔ مگر انھوں نے جس طرح ہر قانون کی روح کچل کے رکھ دی تھی اسی طرح اس قانون کی روح بھی ختم کر دی تھی۔ اس قانون کی اصل روح بے لاگ انصاف اور کامل مساوات ہے۔ یعنی اس معاملے میں ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، شریف و وضیع اور آقا و غلام سب ایک ہی سطح پر رکھے جائیں اور قانون اور عدالت، ہر ایک کے ساتھ بالکل یکساں معاملہ کریں۔ لیکن یہ بات نہ اہلِ کتاب کے یہاں باقی رہ گئی تھی نہ اہلِ عرب کے یہاں بلکہ یہ کہنا بھی شاید بے جا نہیں ہے کہ آج بھی تہذیب و تمدن کی اس ترقی کے باوجود، دنیا کے کسی ملک اور کسی قانون میں بھی احترامِ جان اور مساوات کا یہ تصور نہیں پایا جاتا جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیت ۱۷۸ اور ۱۷۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ
اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ
فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ
اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى

بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

ترجمۂ آیات ۱۷۸-۱۷۹

"اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ آزاد آزاد کے بدلے غلام غلام کے بدلے، عورت عورت کے بدلے۔ پس جس کسی کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی تو اس کے لیے دستور کی پیروی کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے ایک قسم کی تخفیف اور مہربانی ہے۔ تو اس کے بعد جو زیادتی کرے گا اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور تمھارے لیے قصاص میں اے عقل والو، زندگی ہے۔ تاکہ تم حدودِ الٰہی کی پابندی کرو۔"

۵۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

'قصاص' کا مفہوم

قصاص، قصص سے ہے جس کے اصل معنی کسی کے پیچھے، اس کے نقشِ قدم کے ساتھ ساتھ چلنے کے ہیں۔ مثلاً وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۱۱- قصص (اور اس نے اس کی بہن سے کہا، اس کے پیچھے پیچھے جا، تو وہ دور سے اس کو دیکھتی رہی اور ان لوگوں کو اس کا علم نہیں ہوا) قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۶۴ کہف (اس نے کہا یہی تو ہمیں مطلوب تھا، پس وہ دونوں اپنے نقشِ قدم کا تعاقب کرتے ہوئے پیچھے پلٹے) اسی سے قصہ کو قصہ کہتے ہیں کیونکہ جس کا قصہ بیان کیا جاتا ہے، قصہ بیان کرنے والا گویا اس کے قدم بقدم اس کے حالات کا تعاقب کرتا ہے۔ اسی سے قصاص نکلا اس لیے کہ قاتل کا بھی کھوج لگایا جاتا اور اس کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ پھر قصاص اس سزا کو کہنے لگے جس میں مجرم کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جس کا مرتکب وہ خود ہوا ہے۔ اس قصاص کی دو صورتیں ہیں۔ ایک جانی، دوسری مالی جس کو دیت یا خونبہا کہتے ہیں۔ قصاص کا لفظ اپنے وسیع معنی میں ان دونوں ہی صورتوں پر حاوی ہو جاتا ہے اس لیے کہ دیت بھی درحقیقت قصاص ہی کی ایک شکل ہے۔ اصل قانون تو جان کے بدلے جان ہی کا ہے۔ لیکن اولیائے مقتول کی بہبود کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں اتنی رعایت فرما دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو جان کے بدلے دیت بھی لے سکتے ہیں۔

"کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى" میں کُتِبَ کے بعد عَلیٰ کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اس کے اندر فرضیت اور وجوب کا مضمون موجود ہے۔ قَتْلَى قتیل کی جمع ہے جس کے معنی مقتول کے ہیں۔ یہ لفظ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر کُتِبَ عَلَيْكُمْ سے قصاص کی فرضیت ثابت ہوتی ہے تو اس حکم کا مخاطب کون ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ قصاص کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے۔ اگر مقتول کے ورثا چاہیں تو قاتل کو قتل بھی کر سکتے ہیں، چاہیں تو دیت بھی لے سکتے ہیں، چاہیں تو کچھ معاف بھی کر سکتے ہیں۔ تو جب وہ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ تم پر قصاص لینا فرض کیا گیا ہے۔"

قصاص کی ذمہ داری حکومت پر ہے

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس حکم کا مخاطب پورا اسلامی معاشرہ بحیثیت مجموعی یا بالفاظ دیگر اسلامی حکومت ہے۔ اس کے اوپر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ اس کے علاقہ میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو اس کے قاتلوں کا سراغ لگائے، ان کو گرفتار کرے اور قانون کے مطابق ان پر سزا نافذ کرے۔ یہ ذمہ داری معاشرہ یا حکومت پر اس اصول کے تحت ڈالی گئی ہے کہ جو شخص کسی شخص کو بغیر کسی حق کے قتل کر دیتا ہے تو وہ صرف ایک شخص ہی کا قاتل نہیں ہے بلکہ سب کا قاتل ہے اس لیے کہ اس نے تحفظ جان کے اس قانون کو ہدم کر دیا ہے جو سب کے لیے حرمتِ جان کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ پورے معاشرے اور پورے نظامِ اجتماعی کی ذمہ داری ٹھہری کہ سب اس کے قصاص کے درپے ہوں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک حرمتِ جان کے اس قانون کو زندہ کر کے سب کی زندگی کی ضمانت کو بحال نہ کر لیں۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ مائدہ میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے۔ اَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۳۲ (کہ جس نے کسی جان کو، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان ماری ہو یا زمین میں فساد مچایا ہو، قتل کر دیا تو گویا اس نے سارے ہی لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا تو گویا سب کو زندہ کیا)

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ قصاص کی اصل ذمہ داری حکومت ہی پر ہونی چاہیے نہ کہ مقتول کے وارثوں پر اس لیے کہ اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص قتل ہو جائے اور اس کا کوئی والی وارث نہ ہو، اس کا بھی امکان ہے کہ ایک شخص کے کچھ ورثا ہوں تو سہی لیکن کسی سبب سے ان کو مقتول کے قصاص کے معاملہ سے کچھ دلچسپی نہ ہو۔ بلکہ امکان تو خاصی حد تک اس بات کا بھی ہے کہ ورثا کی اصل ہمدردی اور دلچسپی کسی سبب سے مقتول کے بجائے قاتل اور اس کے شرکائے کار ہی کے ساتھ ہو جائے۔ علاوہ ازیں کسی اس طرح کے معاملہ میں تحقیق و تفتیش کی ذمہ داریاں اور پھر حدود کی تنفیذ بڑے وسیع اختیارات کی مقتضی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے جہاں تک قصاص لینے کے فرض کا تعلق ہے وہ تو اسلامی حکومت ہی پر عائد کیا ہے لیکن اس سلسلے میں اس نے

حکومت پر یہ پابندی بھی عائد کر دی ہے کہ وہ بجائے خود فیصلہ کرنے کے مقتول کے اولیاء کو یہ اختیار دے دے کہ وہ اسلامی قانون کے حدود کے اندر مجرم کے ساتھ جو معاملہ پسند کریں وہ کر لیں۔ خواہ اسے قتل کر دیں، خواہ اس سے خونبہا قبول کر لیں۔ ورثا کو یہ اختیار دے دینا اور ان کے اختیار کو نافذ کر دینا حکومت کو اس فرض سے سبکدوش کر دے گا جو اس پر کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی کی رُو سے عائد ہوتا ہے۔

قصاص میں اولیائے مقتول کی مرضی کے لحاظ کی حکمت

قصاص کے معاملہ میں مقتول کے اولیاء کی مرضی کو اسلام نے یہ اہمیت جو دی ہے، یہ مختلف پہلوؤں سے نہایت حکیمانہ ہے۔ قاتل کی جان پر مقتول کے وارثوں کو براہ راست اختیار مل جانے سے ایک تو ان کے بہت بڑے زخم کے اندمال کی ایک شکل پیدا ہوتی ہے، دوسرے اگر اس صورت میں یہ کوئی نرم رویہ اختیار کریں تو قاتل اور اس کے خاندان پر یہ ان کا براہِ راست احسان ہوتا ہے جس سے نہایت مفید نتائج کی توقع ہو سکتی ہے، تیسرے دیت کی شکل میں مقتول کے ورثا کی، بالخصوص جب کہ وہ غریب ہوں، ایسی مدد ہو جاتی ہے جس سے ان کو بڑا سہارا مل سکتا ہے۔ اگر ورثا کو اس میں کوئی دخل نہ رہ جائے، سارا اختیار پولیس اور عدالت ہی کو سونپ دیا جائے جیسا کہ موجودہ قوانین میں ہے تو وہ ان تمام فوائد سے یکسر محروم ہو جاتے ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا لیکن ان کے اس حق کے تسلیم کیے جانے کے باوجود قصاص کی اصل ذمہ دار اور اس کی نافذ کرنے والی ہے حکومت ہی۔ اس وجہ سے اگر وہ کسی خاص معاملہ میں محسوس کرے کہ وارثوں کی سرد مہری یا ان کی قاتلوں کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے قصاص کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے جس سے حرمتِ جان کا قانون متاثر ہو رہا ہے تو وہ اس نقصان سے قانون کو بچانے کے لیے مناسب اقدام کرے گی۔

قصاص میں مساوات کا اہتمام

"آزاد، آزاد کے بدلے، غلام، غلام کے بدلے، عورت، عورت کے بدلے" یہ اس کامل مساوات کا بیان ہے جو قصاص میں لازماً ملحوظ رکھنی ہے۔ یعنی اگر ایک آزاد نے دوسرے آزاد کو قتل کیا ہے تو النفس بالنفس کے قانون کے بموجب وہ آزاد ہی اس آزاد کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور بصورت خونبہا ایک آزاد ہی کی دیت اس کے بدلے میں واجب ہوگی۔ عربِ جاہلیت کے طریقہ کے مطابق یہ نہیں ہوگا کہ مقتول کے ورثا اپنی شرافت و برتری کے زعم میں یہ مطالبہ کریں کہ وہ اپنے ایک مقتول کے بدلے میں قاتل کے خاندان کے دو یا اس سے زیادہ آزادوں کو قتل کریں گے، یا عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کریں گے یا غلام کے بدلے میں آزاد کو قتل کریں گے یا بصورتِ دیت عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر وصول کریں گے یا غلام کی دیت آزاد کی دیت کے معیار سے لیں گے۔ اسی طرح قاتل اور اس کے خاندان و قبیلہ والوں کو بھی اپنی شرافت و نجابت اور برتری کے زعم میں یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ ہمارا غلام دوسروں کے آزاد کا کفو یا ہماری ایک عورت دوسروں کے مرد کے برابر ہے اس وجہ سے ہم قصاص جانی یا مالی میں اسی نسبت کا لحاظ کرتے ہوئے مقتول کے ورثا سے معاملہ کریں گے۔ اسلام نے اس کامل مساوات کا اعلان کر کے زمانہ جاہلیت کی مذکورہ تمام نابرابریوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہود نے بھی اس معاملے میں شریف و رذیل اور اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان امتیاز قائم کر رکھا تھا۔ اس

اعلان سے اس امتیاز کی بنیاد بھی ڈھے گئی۔ ایک طرف اسلام کے اس قانون کو ملاحظہ فرمائیے، جو چودہ سو سال سے اسلام کی کتاب تعزیرات میں موجود ہے، دوسری طرف عدل و مساوات کے علمبردار امریکہ میں کالوں اور گوروں کے اس امتیاز پر نظر ڈالیے جو زندگی کے ہر شعبہ میں آج اس بیسویں صدی میں بھی برتا جا رہا ہے۔

دیت کی ادائیگی میں فیاضی

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ۔ یعنی اگر مقتول کے ورثا کی طرف سے قاتل کو کچھ چھوٹ دے دی جائے تو اس کو چاہیئے وہ اس کی قدر کرے۔ اس چھوٹ کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ وہ قصاص جانی کے بجائے قصاص مالی پر راضی ہو جائیں تو قاتل اور اس کے خاندان والوں کا فرض ہے کہ وہ احسان مندی اور شکر گزاری کے جذبے کے ساتھ معروف کے بموجب دیت ادا کریں اور ادائیگی نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کریں۔ معروف سے مراد یہاں اہلِ عرب کا رواج اور دستور ہے جس کو دیت کے معاملے میں اسلام نے قانون کی حیثیت دے دی۔ حسن و خوبی کے ساتھ ادائیگی کی تاکید اس لیے فرمائی کہ عرب میں دیت کی ادائیگی بالعموم نقد کی صورت میں نہیں بلکہ جنس و مال کی شکل میں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اگر ادائیگی کرنے والوں کی نیت اچھی نہ ہوتی تو وہ اس میں بہت کچھ چالیں چل سکتے تھے۔ یہ بات بڑی آسانی سے ممکن ہے کہ اونٹوں یا بکریوں کی تعداد یا غلّہ اور کھجور کی مقدار و کمیت کے لحاظ سے تو دیت کا مطالبہ پورا کر دیا جائے لیکن باعتبارِ حقیقت و کیفیت اس کی حیثیت محض خانہ پری ہی کی ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان لوگوں کے احسان کی کوئی قدر نہیں کی گئی جنھوں نے ایک شخص کی جان پر شرعی اختیار پا کر اس کو معاف کر دیا اور اس کی طرف سے مال قبول کر لینے پر راضی ہو گئے۔ ان کے احسان کا جواب تو احسان ہی ہونا چاہیئے۔ یعنی دیت کی ادائیگی اس خوبی، فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ کی جائے کہ ان کو یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑے کہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کے خون کے بدلے میں بھیڑ بکریاں قبول کر کے کوئی غلطی یا بے غیرتی کی۔

قصاص کے حکم کے تحت یہاں بغیر کسی سابق قرینہ کے جو خونبہا کا ذکر آگیا ہے تو اس کی بڑی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے یعنی قصاص کا لفظ اپنے عام مفہوم میں قصاص جانی اور قصاص مالی دونوں ہی پر مشتمل ہے۔ اس میں کچھ چھوٹ ملنے کے معنی، جیسا کہ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ کے الفاظ سے واضح ہے، یہ ہے کہ اولیائے مقتول جان کے بدلے جان لینے کے بجائے رواج کے مطابق خونبہا لینے پر راضی ہو جائیں۔ یہ خونبہا کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رعایت و رحمت ہے۔ حرمت جان کا اصل حق تو یہی تھا کہ جان کے بدلے جان لی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی مہربانی سے اس میں رعایت فرما دی ہے تو اس رعایت کی قدر کرنی چاہیے اور اس سے کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ یعنی جو لوگ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد کسی ظلم و زیادتی کی راہ کھولیں گے تو وہ یاد رکھیں کہ پھر ان کے لیے آخرت کا عذاب دردناک ہی ہے جس سے چھڑانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوگی۔ اس میں قاتل اور اس کے خاندان والوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد یہ انتہائی کفرانِ نعمت ہوگا کہ اس کے پردے میں مقتول کے خاندان پر کسی نئے ظلم کے لیے اسکیم بنائی جائے۔ مثلاً یہ کہ قاتل اور اس کے اعزا یہ منصوبہ بنائیں کہ اس وقت تو کسی طرح مقتول کے ورثا کو راضی کر کے اپنی جان بچا لو پھر موقع پیدا کر کے اس کو مزید نقصان پہنچائیں گے۔ اسی طرح اس میں مقتول کے وارثوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ انھیں اپنے دل میں یہ منصوبہ رکھ کے دیت کا راضی نامہ نہیں کرنا چاہیے کہ اس وقت تو قاتل سے دیت لے لیتے ہیں، بعد میں موقع ملنے پر اس کی جان بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ خدا کی بخشی ہوئی ایک رعایت کے تحت جو راضی نامہ ہو گیا ہے، دونوں فریقوں کو سچے دل سے اس کا احترام کرنا چاہیے۔ جو بھی یہ راضی نامہ ہو چکنے کے بعد کوئی زیادتی کرے گا وہ اللہ کے غضب کا مستحق ٹھہرے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۹)

قانون جذبات سے بالاتر ہے

یہ معاشرہ کو تلقین ہے کہ قصاص کے معاملہ میں کسی سہل انگاری، کسی جانب داری، کسی چشم پوشی اور کسی بے جا رحم و مروت کو حائل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ جو کسی کو قتل کر دیتا ہے وہ صرف ایک شخص ہی کو قتل نہیں کرتا بلکہ ایک قانون کو قتل کرتا ہے جو سب کی جان کی حفاظت کا ضامن ہے اس وجہ سے وہ گویا سب ہی کو قتل کر دیتا ہے اس وجہ سے یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا قصاص لے کر اس ضمانت کو بحال کریں جس میں سب کی زندگی ہے۔ معاشرے کا جو شخص کسی قاتل کو پکڑتا ہے، یا اس کا سراغ لگاتا ہے یا اس کے جرم کے ثبوت فراہم کرتا ہے اور اس طرح مقتول سے قصاص کی راہ کھولتا ہے وہ گویا اس مقتول کو بھی زندہ کرتا ہے اور ساتھ ہی پورے معاشرے کو بھی زندگی بخشتا ہے کیونکہ وہ اپنی اس خدمت سے اس قانون کو زندہ کرتا ہے جو سب کے لیے زندگی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف سورۂ مائدہ میں یوں اشارہ فرمایا ہے جس کا حوالہ اوپر بھی گزر چکا ہے۔

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ	یہ کہ جس نے قتل کر دیا کسی جان کو بغیر اس کے کہ اس نے
اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ	کسی جان کو قتل کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد برپا کیا ہو تو
جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا	گویا اس نے سب کو قتل کر دیا اور جس نے اس کو زندہ کیا
النَّاسَ جَمِيْعًا (۳۲۔ مائدہ)	تو گویا اس نے سب ہی کو زندہ کیا۔

اس میں ان لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے جو بے جا قسم کی مروت و پاسداری یا ناروا قسم کے احترام شرافت و امارت کے جذبے کے تحت بسا اوقات مقتول کے بجائے قاتل ہی کی ہمدردی کو ثواب قرار دے بیٹھتے ہیں حالانکہ اصلی ہمدردی ہر ایک کے ساتھ، غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا رذیل، قریب ہو یا بعید، جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۱۳۵ میں ہے، یہی ہے کہ اس کو خدا اور اس کے قانون کے حوالہ کیا جائے نہ کہ خدا کے قانون سے چھڑا کر شیطان کے حوالہ۔ لیکن اس حقیقت کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اہلِ عقل

ہیں۔ اس وجہ سے آیت میں اہلِ عقل کو خاص طور پر خطاب فرمایا ہے۔

کیا تعزیرات خلافِ عقل ہیں؟

اہلِ عقل کو خاص طور پر توجہ دلانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح جذبات بعض اوقات قانون قصاص کے نفاذ میں مزاحم ہوتے ہیں اسی طرح جذبات سے مرعوب و مغلوب عقل بھی اس قانون کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے۔ خاص طور پر اس زمانے میں تو تمام جسمانی سزاؤں کے خلاف ایک مستقل فلسفہ بن گیا ہے جس کو پیش تو کیا جاتا ہے عقلیت اور فلسفہ کے روپ میں لیکن تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کے اندر بھی اصلی روح عقل کی نہیں بلکہ جذبات ہی کی ہے۔

ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ مجرموں سے جو جرم سرزد ہوتے ہیں وہ اصلاً جذباتی بے اعتدالی، عقلی عدم توازن اور ذہنی انتشار اور الجھاؤ کے نتیجہ میں صادر ہوتے ہیں اور یہ حالتیں آدمی کی بیماری کی حالتیں ہیں جن میں وہ مستحق اصلاح و تربیت اور علاج و دوا کا ہوتا ہے نہ کہ سزا کا۔ اس وجہ سے اس گروہ کے نزدیک کسی قاتل کو قتل کی سزا دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض کو بیمار ہونے پر اس کے علاج کے بجائے کوئی سزا دے دینا۔ اس گروہ کے نزدیک اس طرح کے مجرموں یا خود ان کے الفاظ میں اس طرح کے مریضوں کا علاج تعلیم و تربیت اور اصلاح نفسی و ذہنی کے ذریعہ سے ہونا چاہیئے نہ کہ سولی اور پھانسی سے۔

یہ نظریہ موجود تو دنیا میں ایک خاص گروہ میں شروع سے رہا ہے لیکن اس کو علمی اعتبار سے کبھی اہمیت حاصل نہیں ہوسکی اور نہ شاید کبھی حاصل ہوسکے۔ تاہم اس دورِ آخر میں چونکہ ٹالسٹائی اور مہاتما گاندھی جیسے لوگوں نے اس کی وکالت کی ہے اس وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن اس سے متاثر ہیں۔ ایسے لوگوں کی الجھن دور کرنے کے لیے قانون قصاص کی اس حکمت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے خاص طور پر اہلِ عقل کو مخاطب کرکے یہ فرمایا ہے کہ اس کے اندر زندگی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ زندگی فرد کے لحاظ سے نہیں بلکہ معاشرے کے لحاظ سے ہے۔ اگر ایک شخص قتل کے جرم میں قتل کردیا جاتا ہے تو بظاہر تو ایک جان کے بعد یہ دوسری جان بھی گویا تلف ہی ہوتی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے اگر دیکھیے تو اس کے قتل سے پورے معاشرے کے لیے زندگی کی ضمانت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس سے قصاص نہ لیا جائے، تو یہ جس ذہنی خرابی میں مبتلا ہوکر ایک بے گناہ کے قتل کا مرتکب ہوا ہے وہ خرابی پورے معاشرے میں متعدی ہوجائے۔ بیماری اور بیماری میں فرق ہوتا ہے۔ جو بیماریاں قتل، ڈکیتی، چوری اور زنا وغیرہ جیسے خطرناک جرائم کا سبب بنتی ہیں ان کی مثال ان بیماریوں کی ہے جن میں پورے جسم کو بچانے کے لیے بسا اوقات جسم کے کسی عضو کو کاٹ کر الگ کردینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کسی عضو کو کاٹ پھینکنا ایک سنگ دلی کا کام معلوم ہوتا ہے لیکن ایک ڈاکٹر کو یہ سنگ دلی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ طبیعت پر جبر کرکے یہ سنگ دلی اختیار نہ کرے تو اس ایک عضو کی ہمدردی میں اسے مریض کے پورے جسم کو ہلاکت کے حوالہ کرنا پڑے گا۔

معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں ایک جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس جسم کے بعض اعضا میں بھی بسا اوقات

اسی قسم کا فساد و اختلال پیدا ہو جاتا ہے جس کا علاج مرہم و ضماد سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ عضوِ مریض پر اپریشن کر کے اس کو جسم کے مجموعے سے الگ کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ عضو مریض ہے اس وجہ سے نرمی اور ہمدردی کا مستحق ہے تو اس نرمی کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ ایک دن یہ عضو سارے جسم کو سڑا اور گلا کر رکھ دے۔

یہی نکتہ ہے کہ قرآن مجید نے اس قسم کی سزاؤں کو، جو سخت نوعیت کی ہیں، 'نکال'، کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ 'نکال' عربی میں اس سزا کو کہتے ہیں جو دوسروں کو عبرت دلانے والی ہو، جس کو دیکھ کر دوسرے نصیحت پکڑیں اور اس قسم کے جرم کے ارتکاب سے باز رہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح کی سزائیں نافذ کر کے گویا پورے معاشرہ کو ایسے ٹیکے لگا دیئے جاتے ہیں جس سے وہ متعدی جرائم کے اثرات سے محفوظ ہو جائے۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں بھی قرآن نے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے جس کے معنی ہیں تاکہ تم بچو یعنی اللہ کے حدود کی خلاف ورزی اور ایک دوسرے پر ظلم و تعدی سے بچو۔

۵۹۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۸۰-۱۸۲

حرمتِ جان کے اس قانون کے بعد حرمتِ مال کے قانون کی طرف توجہ فرمائی۔ یہ دونوں مضمون قرآن[1] و حدیث دونوں میں بالعموم ساتھ ساتھ آتے ہیں اور عقل و فطرت میں بھی ان دونوں کے درمیان بڑا قریبی رشتہ ہے۔ حرمتِ مال کے سلسلے میں بنیادی چیز یہ ہے کہ ایک قانون کے تحت ہر شخص کے اور اس کے بعد اس کے وارثوں کے حقوق متعین و محفوظ ہوں اور دوسرے ان حقوق کا احترام کریں۔ اہلِ عرب میں اگرچہ معروف کے تحت والدین اور اعزا و اقربا کے حقوق کا فی الجملہ تعین تھا لیکن ان کی زندگی کے ہر پہلو میں جس طرح خرابیاں پیدا ہو گئیں اسی طرح اس پہلو میں بھی فساد رونما ہوا اور ان کے زور آور لوگوں میں کمزور وارثوں اور حق داروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا رجحان اس شدت کے ساتھ زور پکڑ گیا کہ معروف کی ان کے ہاں کوئی قدر و قیمت ہی باقی نہیں رہ گئی۔ سورۂ فجر میں اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (اور تم وراثت کو سمیٹ کر کھاتے ہو) یہ صورت تقاضا کر رہی تھی کہ قانون کے ذریعہ سے اعزا و اقربا کے حقوق کا تعین کر کے ان کی حفاظت کا سامان کیا جائے لیکن اس سورہ کے زمانۂ نزول تک معاشرہ ابھی اتنا مستحکم نہیں ہوا تھا کہ تقسیمِ وراثت کا وہ مستقل قانون نافذ ہو سکے جو سورۂ نساء میں ہے، اس وجہ سے عبوری دور کے لیے مورثوں کو دستور کے مطابق والدین اور قرابت مندوں کے لیے وصیت

---

[1] ملاحظہ ہو آیت ۲۹۔ نساء۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ حرمۃ مالہ کحرمۃ دمہ (اس کے مال کی عزت اس کی جان کی عزت کی طرح ہے)

کی ہدایت ہوئی اور وارثوں کو اس وصیت کی تعمیل کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حقوق کے تعین سے متعلق خود اپنی وہ وصیت نازل فرما دی جو سورۂ نساء میں مذکور ہے تو بندوں کی وصیت منسوخ ہو گئی، صرف اللہ تعالیٰ کی وصیت باقی رہ گئی۔ پھر بندوں کے لیے وصیت کا حق صرف ایک محدود دائرے کے اندر رہ گیا جس کا ذکر سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کے تحت آئے گا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸۰-۱۸۲

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ
الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى
الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ
عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ
مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ
ع ۲۲ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

ترجمۂ آیات ۱۸۰-۱۸۲

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کیا گیا ہے والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرنا، خدا سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے۔ تو جو لوگ اس وصیت کو اس کے سننے کے بعد بدل ڈالیں تو اس کا گناہ ان بدل ڈالنے والوں ہی پر ہے، بے شک اللہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔ جس کو کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی بے جا جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو اور وہ آپس میں صلح کرا دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

۶۰- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۱۸۰)

وصیت کا عموم

"كُتِبَ عَلَيْكُمْ" فرض کر دینے کے معنی میں قرآن اور کلام عرب، دونوں میں معروف ہے۔ وصیت کے لفظ کی

تحقیق پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے کہ عربی میں یہ لفظ کسی بڑے کی طرف سے چھوٹوں کو تلقین وہدایت کے معنی میں آتا ہے۔ عام اس سے کہ یہ تلقین وہدایت کوئی شخص اپنے آخری وقت میں کرے یا عام حالات میں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں، قرآن میں ان کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہاں لفظ وصیت چونکہ مصدری معنی میں ہے، نیز اپنے فعل سے فاصلہ پر واقع ہے، اسی وجہ سے تذکیر و تانیث کا لحاظ نہ تو فعل میں ضروری ہوا نہ بعد کی ضمیروں ہی میں۔

وصیت کے لیے دو شرطیں

اس وصیت کی فرضیت کے ساتھ دو شرطیں لگائی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اس وقت کرے جب اسے اپنی موت قریب ہوتی نظر آنے لگے اور دوسری یہ کہ جب وہ کچھ مال اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہو۔ پہلی شرط کا ذکر 'اذا' کے ساتھ کیا ہے اس لیے کہ موت کا مرحلہ سب کو پیش آتا ہے۔ دوسری کا ذکر 'ان' کے ساتھ کیا ہے اس لیے کہ مال کا ہونا ہر ایک کے پاس ضروری نہیں۔ 'ان' اور 'اذا' کے استعمال کا یہ فرق عربی زبان کے طلبہ سے مخفی نہیں۔ وصیت میں یہ دونوں پہلو بڑی اہمیت رکھنے والے ہیں۔ جو لوگ اپنی چلتی پھرتی زندگی میں وصیت کر دیتے ہیں وہ بسا اوقات بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے ہیں اور جو لوگ مال رکھتے ہوئے وصیت سے گریز کرتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے پیچھے جھگڑے چھوڑ جاتے ہیں۔

خیر کا لفظ مال کے لیے

خیر کے اصل معنی مطلوب و مرغوب شے کے ہیں اس وجہ سے علم، عقل، حکمت، عدل، نیکی اور بھلائی سب کے لیے اس کا استعمال ہے۔ پھر یہیں سے یہ مال کے لیے بھی استعمال ہونے لگا اس لیے کہ مال بھی ایک مرغوب و مطلوب شے ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حوالہ کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے مال کے لیے اس لفظ کو اختیار کر کے گویا بالواسطہ اس غلط فہمی کی اصلاح کر دی ہے جو عام طور پر رہبانی تصور کے زیر اثر لوگوں میں پھیلی ہوئی تھی کہ مال فی نفسہٖ ایک ناپاک و نجس چیز ہے اس وجہ سے اللہ والوں کے لیے اس سے آلودہ ہونا جائز نہیں۔

معروف اور شریعت میں نسبت

مَعروف کے لغوی معنی جانی پہچانی ہوئی چیز کے ہیں، یعنی جس کو عقل مانتی ہو، جو عدل پر پوری اُترتی ہو، اچھے لوگ جسے پہچانتے ہوں، سوسائٹی کے شریفوں میں جس کا چلن اور رواج ہو۔ یہ معروف بہت سے معاملات میں اسلامی قانون کا درجہ رکھتا ہے اور اس حیثیت سے قرآن میں اس کا جگہ جگہ حوالہ آیا ہے۔ اُوپر دیت کے سلسلہ میں بھی اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ قانون کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو معروف پر مبنی ہے، دوسرا وہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہے جس چیز کے بارے میں خدا کا قانون موجود نہ ہو اس میں معروف معتبر ہوتا ہے لیکن جس باب میں خدا کا قانون نازل ہو گیا اس میں معروف کا اعتبار ختم ہو گیا۔ اس لیے کہ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد ستاروں سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہ حکم وصیت عبوری دور کے لیے تھا

اس آیت میں والدین اور اقربا کے لیے جو وصیت کا حکم دیا گیا وہ معروف کے تحت تھا اور اس عبوری دور کے لیے تھا جب کہ اسلامی معاشرہ ابھی اس استحکام کو نہیں پہنچا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ آخری حکم

دیا جائے جو سورۂ نساء میں نازل ہوا۔ اس حکم کے نزول کے لیے حالات کے سازگار ہونے سے پہلے یہ عارضی حکم نازل ہوا اور اس سے دو فائدے پیش نظر تھے۔ ایک تو فوری طور پر ان عصبداروں کے حقوق کا ایک حد تک تحفظ جن کے حقوق عصبات کے ہاتھوں تلف ہو رہے تھے۔ اور دوسرے اس معروف کو ازسرِنو تازہ کرنا جو شرفائے عرب میں زمانہ قدیم سے معتبر تھا لیکن اب وہ آہستہ آہستہ جاہلیت کے گرد و غبار کے نیچے دب چلا تھا تاکہ یہ معروف اس قانون کے لیے ذہنوں کو ہموار کر سکے جو اس باب میں نازل ہونے والا تھا۔

اور وصیت کے متعلق فرمایا کہ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ حَقًّا فعل محذوف کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی یہ تمام اہل ایمان پر جو خدا سے ڈرنے والے ہیں واجب اور ضروری ہے، جو اس سے گریز کریں گے ان کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس عبوری مدت میں، جو اصل قانونِ وراثت سے پہلے گزری، ہر مسلمان پر اس کی تعمیل ضروری تھی۔ اس کی حیثیت صرف ایک نیکی اور فضیلت کی نہیں تھی۔

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۸۱)

شاہدوں کی عظیم ذمہ داری

چونکہ اس قانون کے ٹھیک ٹھیک نفاذ کا تمام تر انحصار شاہدوں اور گواہوں کی امانت و دیانت ہی پر تھا، شریعت میں وارثوں کے حقوق کا ابھی تعین نہیں ہوا تھا، اس وجہ سے شاہدوں کی عظیم ذمہ داری واضح فرما دی کہ اگر وہ صاحبِ وصیت کی وصیت میں کوئی ردو بدل کریں گے تو اس کا سارا بارِ گناہ انھی کے سر ہوگا۔ اس کی کوئی ذمہ داری نہ تو صاحبِ وصیت پر عائد ہوگی نہ اس کو نافذ کرنے والوں پر۔ سمیع و علیم کی صفات کے حوالہ میں تبدیلی کی جسارت کرنے والوں کے لیے تنبیہ اور دھمکی ہے کہ وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، وہ اس جرمِ عظیم کی سزا دیئے بغیر نہ رہے گا۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۸۲)

'خوف' کے معنی

'خوف' کے اصل معنی گمان کرنے، خیال کرنے، توقع کرنے، اندیشہ کرنے کے ہیں۔ پھر یہیں سے یہ ڈرنے کے معنی کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ایک حماسی شاعر کا شعر ہے۔

ولو خفت انی ان کففت تحیتی

تنکب عنی رمت ان یتنکبا

(اگر مجھے توقع ہوتی کہ میں بڑھاپے کا خیر مقدم نہ کروں گا تو وہ مجھ سے رک جائے گا تو میں اپنے خیر مقدم سے بازرہ کر اس کو روکنے کی کوشش کرتا)

یہاں زیرِ بحث آیت میں یہ لفظ اندیشہ گمان اور علم ہی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ صاحبِ کشاف نے اس معنی کی طرف اشارہ تو کیا ہے لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ ہم نے اس کی دلیل پیش کر دی ہے۔

'جنف' کے معنی

'جَنَفٌ' کے اصل معنی مائل ہونے کے ہیں لیکن اس کا غالب استعمال نیکی اور حق سے ہٹ کر برائی اور ناانصافی کی طرف مائل ہونے کے لیے ہے۔ آیت میں یہ بے جا پاسداری اور ناروا جانب داری کے لیے

استعمال ہوا ہے۔

'اثم' کے معنی

'اِثْم' میں اصلاً تاخر یعنی پیچھے رہ جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آثمہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تھک جانے کی وجہ سے پیچھے رہ جائے۔ پھر یہ لفظ ادائے حقوق میں پیچھے رہ جانے کے لیے استعمال ہوا، عام اس سے کہ وہ خدا کے حقوق ہوں یا بندوں کے۔ اپنے اس مفہوم کے لحاظ سے یہ 'بِرّ' کا ضد ہے۔ 'بِرّ' کا اصل مفہوم، جیسا کہ ہم آیت ۱۷۷ کے تحت واضح کر چکے ہیں، ایفائے حق ہے۔ یہ لفظ 'عدوان' کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے کہ حقوق کے معاملہ میں گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کوتاہی اور حق تلفی کی نوعیت کے، دوسرے دست درازی اور تعدی کی نوعیت کے۔ پہلی قسم کے لیے اثم کا لفظ ہے۔ دوسری کے لیے عدوان کا۔ آیت زیر بحث میں یہ لفظ جنف کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ جنف کے معنی ہم واضح کر چکے ہیں کہ جانب داری کے ہیں اس کے بالمقابل اثم کا ٹھیک مفہوم حق تلفی کا ہوگا۔ اور ایک نامنصف وصیت کرنے والے سے انھی دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کا اندیشہ ہو سکتا ہے یا تو وہ وارثوں میں سے کسی ایک کی جانبداری کرے گا یا کسی کی حق تلفی کا مرتکب ہوگا۔

تبدیلی کی ممانعت اصلاح کی ممانعت کے ہم معنی نہیں ہے

اوپر والی آیت میں وصیت کرنے والے کی وصیت میں کسی تبدیلی کرنے کی نہایت شدت کے ساتھ ممانعت فرمائی گئی تھی۔ اب اس آیت میں یہ ارشاد ہوا کہ تبدیلی کی یہ ممانعت اصلاح کی ممانعت کے ہم معنی نہیں ہے۔ اگر کسی وصیت کرنے والے کے اندر جانب داری یا حق تلفی کا رجحان محسوس ہو رہا ہے یا اس کی وصیت واضح طور پر جانب داری اور حق تلفی کا پہلو لیے ہوئے ہے تو وصیت کے گواہوں کی طرف سے اس جانب داری اور حق تلفی کی اصلاح کی کوشش اس تبدیلی کے حکم میں نہیں ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے بلکہ یہ چیز جائز ہے۔ البتہ یہ اصلاح انھیں بطور خود کر دینے کا حق نہیں ہے بلکہ اس کے لیے انھیں فریقوں کے درمیان سمجھوتے اور مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اگر اس کا موقع ہے کہ خود وصیت کرنے والے کو سمجھا بجھا کر عدل و انصاف کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے تو یہ راہ اختیار کی جائے ورنہ بصورت دیگر وارثوں کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوشش کی جائے۔ یہ مفہوم فَاَصْلَحَ بَیْنَهُمْ کے الفاظ سے نکلتا ہے۔ اس لیے کہ ان الفاظ کا واضح مفہوم ان کے درمیان مصالحت کرا دینا ہے نہ کہ بطور خود کوئی اصلاح کر دینا۔

۱۶۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۱۸۳-۱۸۷

روزے کا بیان تربیت نفس کے لیے

حرمتِ جان اور حرمتِ مال کے مذکورہ بالا قوانین کے بعد اب یہ روزے اور اس سے متعلق احکام بیان ہو رہے ہیں۔ ہماری معروف فقہی ترتیب کے لحاظ سے تو روزہ عبادات کی فہرست میں شامل ہے اس وجہ سے خیال دل میں یہ گزرتا ہے کہ اس کا ذکر اوپر کی اس آیت کے ساتھ ہونا تھا جس میں نماز اور انفاق کا ذکر ہے لیکن قرآن حکیم میں احکام کے بیان کی ترتیب وہ نہیں ہے جو ہماری فقہ کی کتابوں میں ملحوظ رکھی گئی ہے

بلکہ حکمت شریعت، اصلاح معاشرہ، تزکیہ نفوس اور رعایت احوال کے تقاضوں کے تحت ہے۔ ان پہلوؤں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حرمتِ جان و حرمتِ مال کے قوانین کے بعد یہ روزے کا بیان اس عبادت کو سامنے لارہا ہے جو ضبطِ نفس اور تربیت تقویٰ کے لیے اسلام نے مقرر کی ہے تاکہ طمع اور اشتعال، لالچ اور انتقام، خواہش اور ہیجان کے غیر معتدل رجحانات و داعیات کو انسان لگام لگا سکے اور اپنے رہوار نفس کو اس راستے پر ڈال سکے جو تقویٰ کا راستہ ہے۔ روزہ صبر اور تقویٰ پیدا کرنے کی خاص عبادت ہے اور یہی صفات ہیں جو انسان کو دست درازی اور حق تلفی سے بچاتی بھی ہیں اور بر و احسان اور حق و عدل کے قیام پر ابھارتی بھی ہیں چنانچہ یہاں روزے کا حکم جس طرح پچھلے احکام پر عمل کے لیے تربیت کی بنیاد قائم کرتا ہے اسی طرح اس کے بعد جو احکام رشوت دہی کی ممانعت اور حج و جہاد سے متعلق آرہے ہیں ان کے لیے بھی صبر کی اساس فراہم کرتا ہے۔ گویا ترتیب میں اس کے موقع و محل ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ روزہ اسلام میں کیوں فرض کیا گیا اور اس کے مقاصد و فوائد کیا ہیں، زندگی کن پہلوؤں سے اس سے متاثر ہوتی ہے اور پھر حیاتِ اجتماعی پر اس کے اثرات کیا پڑتے ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۸۳۔۱۸۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ
مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ
يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ
خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ
رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ
مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ
وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ؗ وَلِتُكْمِلُوا
الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾
وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾
أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ
لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ
أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا
مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ
الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى
اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ
حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

اے ایمان والو، تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔ گنتی کے چند دن۔ اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرلے۔ اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ ۱۸۳-۱۸۴ (ترجمہ آیات ۱۸۳-۱۸۷)

رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرلے۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اور چاہتا ہے

کہ تم تعداد پوری کر لو اور اللہ نے جو تمہیں ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔ ۱۸۵

اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق سوال کریں تو میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہیئے کہ وہ میرے حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔ ۱۸۶

تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز کیا گیا۔ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم سے درگزر فرمایا تو اب تم ان سے ملو اور اللہ نے تمہارے لیے جو مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو۔ اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔ اور جب تم مسجد میں اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے نہ ملو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں تو ان کے پاس نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

۶۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (۱۸۳)

لفظ صوم کی تحقیق

صوم اور صیام مصدر ہیں۔ صوم کے لغوی معنی کسی شے سے رک جانے اور اس کو ترک کرنے کے ہیں۔ صام الفرس صوماً کے معنی ہیں گھوڑے نے چارہ نہیں کھایا۔ نابغہ کا شعر ہے۔

خیل صیام وخیل غیر صائمة تحت العجاج واخری تعلك اللجما

بہت سے بھوکے اور بہت سے آسودہ گھوڑے میدانِ جنگ کے غبار میں کھڑے تھے اور دوسرے بہت سے اپنی لگامیں چبا رہے تھے۔

مولانا فراہیؒ لفظ صوم کی تحقیق کے سلسلے میں اپنی کتاب اصول الشرائع میں فرماتے ہیں۔

"اہل عرب اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو بھوک اور پیاس کا عادی بنانے کے لیے باقاعدہ ان کی تربیت کرتے تھے تاکہ مشکل اوقات میں وہ زیادہ سے زیادہ سختی برداشت کر سکیں۔ اسی طرح وہ اپنے گھوڑوں کو تند ہوا کے مقابلے کی بھی تربیت دیتے تھے۔ یہ چیز سفر اور جنگ کے حالات میں جب کہ ہوا کے تھپیڑوں سے سابقہ پیش آجائے، بڑی کام آنے والی ہے۔ ...... جریر نے اپنے ایک شعر میں ان دونوں باتوں کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

ظللنا بمستن الحرور كأننا　　لدى فرس مستقبل الريح صائم

(ہم لو کے تھپیڑوں کی جگہ جمے رہے گویا ہم ایک ایسے گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہوں جو بادِ تند کا مقابلہ کر رہا ہو اور روزہ رکھے ہوئے ہو)

اس شعر میں اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حال کی تشبیہ ایک ایسے شخص سے دی ہے جو اپنے گھوڑے کے ساتھ کھڑا ہو اور اس کو بھوک اور بادِ تند کے مقابلے کی تربیت دے رہا ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اہلِ عرب تشبیہ کے لیے انھی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں جو ان کے عام تجربے میں آئی ہوں۔ ان کو نادر چیزوں کی تلاش زیادہ نہیں ہوتی ...... الغرض گھوڑوں کے صوم کے بارے میں اشعار بہت ہیں"۔

اسی سے صائم ہے جس کے معنی ہیں وہ شخص جو کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جائے۔ اس کے لیے کچھ مخصوص شرعی حدود و قیود ہیں جن کی تفصیل قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

روزہ تربیتِ نفس کی قدیم ترین عبادت ہے

"كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ" یعنی روزہ کی یہ عبادت صرف تمہارے ہی اوپر پہلی بار فرض نہیں ہوئی ہے بلکہ تم سے پہلے دوسری امتوں پر بھی فرض کی گئی تھی۔ آسمانی شریعتوں میں یہ ابتدا سے تربیتِ نفس کی خاص ریاضت رہی ہے۔ مقصود اس بات کا حوالہ دینے سے صرف عام طبیعتوں کی گھبراہٹ دور کرنا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، شرائع الٰہی کی یہ قدیم وراثت ہے جو تمہاری طرف منتقل ہو رہی ہے اور تم اس کو اختیار کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے سب سے زیادہ اہل اور حق دار ہو۔

روزے کا مقصد

"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" یہ روزے کی اصل غایت بیان ہوئی ہے۔ تمام شریعت کی بنیاد تقویٰ پر ہے، تقویٰ پیدا ہوتا ہے جذبات و خواہشات پر قابو پانے کی قوت و صلاحیت سے اور اس قوت و صلاحیت کی سب سے بہتر تربیت روزوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۱۸۴)

"گنتی کے چند دن" یعنی روزے کی یہ مشقت تم پر کچھ زیادہ مدت کے لیے نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ سال میں صرف گنتی کے چند دن اس کے لیے خاص کیے گئے ہیں جس طرح اوپر والی آیت میں كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ

مِنْ قَبْلِكُمْ کے الفاظ تالیف قلوب کے طور پر آئے ہیں۔ اسی طرح اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کے الفاظ بھی بطور تالیف قلب وارد ہیں کہ تربیت تقویٰ اور تزکیہ نفس کا یہ کورس چند روزہ ہے، اس سے پست ہمت اور دل شکستہ نہیں ہونا چاہیئے۔ نفس پر شاق ہونے والی عبادات کے بیان میں قرآن مجید نے تالیف قلب کا یہ انداز اکثر مقامات میں ملحوظ رکھا ہے۔ انفاق اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض چیزوں کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ آگے زیادہ واضح مثالیں اس کی آئیں گی۔

'ایام معدودات' سے مراد

"گنتی کے چند دنوں" سے یہاں کیا مراد ہے؟ اہل تاویل کے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد ہر مہینے میں تین دن کے روزے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے ہر ماہ میں یہی تین دنوں کے روزے فرض ہوئے تھے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد رمضان کے روزے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اسلام میں فرض روزوں کی حیثیت سے صرف رمضان ہی کے روزوں کا علم ہے۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے آنحضرت صلعم ہر ماہ میں جو تین دن کے روزے رکھتے تھے ان کی حیثیت فرض روزوں کی نہیں بلکہ نفلی روزوں کی تھی۔

امام ابن جریرؒ ان دونوں گروہوں کے اقوال نقل کر کے اپنی رائے دوسرے گروہ کے حق میں دیتے ہیں۔ ہمیں چونکہ ان کی اس رائے سے اتفاق ہے اس وجہ سے ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ہمارے نزدیک حق سے قریب تر بات ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد ماہ رمضان ہی کے ایام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قابل اعتماد روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مسلمانوں پر رمضان کے روزوں کے سوا کوئی اور روزہ فرض کیا گیا ہو جو رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوا ہو۔ آیت کا سیاق خود اس بات پر دلیل ہے کہ جو روزے ہم پر فرض ٹھہرائے گئے وہ رمضان ہی کے روزے ہیں۔ کوئی اور روزے نہیں ہیں۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے الفاظ خود ان ایام کی بلا کسی اشتباہ کے تعین کیے دیتے ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ رمضان کے سوا کوئی اور روزے مسلمانوں پر فرض تھے اجو رمضان کے روزوں سے منسوخ ہوئے ان سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی روایت پیش کریں جو حجت بن سکے۔"

بارہ مہینوں میں سے صرف ۳۰ یا ۲۹ دن کے روزے، روزوں کی روحانی برکات کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی بڑی مدت نہیں ہے بلکہ گنتی کے چند دن ہی ہیں اس وجہ سے خدا کی رضاجوئی اور اصلاح نفس کے طالب اس مدت کو کوئی طویل مدت نہیں سمجھتے بلکہ نہایت قلیل اور چند روزہ سمجھتے ہیں۔ قرآن نے اس کی اس قدر و قیمت نیز تالیف قلب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے تعبیر فرمایا ہے۔

ایک غلط تاویل

" وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ " کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ شروع

شروع میں جب روزوں کا حکم نازل ہوا تو چونکہ اہل عرب اس سخت عبادت کے عادی نہیں تھے۔ اس وجہ سے ان کی آسانی کے لیے یہ گنجائش رکھی گئی کہ جو شخص روزہ رکھنے کی قدرت کے باوجود روزہ نہ رکھنا چاہے وہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ بعد میں یہ اجازت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن یہ تاویل کسی طرح بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

اوّل تو روزے کی فرضیت کیا ہوئی جب کہ اس بات کی کھلی اجازت موجود تھی کہ کوئی شخص چاہے تو روزہ رکھے، نہ چاہے تو نہ رکھے، اس کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اگر روزے کے ابتدائی حکم کی نوعیت یہ تھی تو كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (تم پر روزے فرض کیے گئے) کا ٹکڑا بالکل غیر ضروری سا ہو جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں اس کی فرضیت بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ ایک طرف تو مریض اور مسافر دونوں کے لیے دوسرے دنوں میں اپنے قضا کیے ہوئے روزوں کی تعداد روزے رکھ کر پورے کرنے کا حکم ہو، جیسا کہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کے الفاظ سے واضح ہے اور دوسری طرف یہ آزادی ہو کہ جو شخص چاہے روزے رکھے اور جو شخص چاہے مقدرت کے باوجود، نہ رکھے، صرف ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مریض اور مسافر پر تو یہ پابندی ہے کہ وہ روزے ضرور رکھیں، یہاں تک کہ اگر سفر یا مرض کے سبب سے معین دنوں میں نہ رکھ سکیں تو دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کریں درآنحالیکہ دوسروں پر کسی حالت میں بھی روزے رکھنا ضروری نہیں، ایک تندرست اور مقیم بھی چاہے تو روزے کا بدل ایک مسکین کو کھانا کھلا کر پورا کر سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس مشکل سے بچنے کے لیے يُطِيقُونَهٗ کے معنی یہ لیے ہیں کہ "جو لوگ مشکل سے طاقت رکھتے ہیں" یہ معنی لے لینے سے اوپر کے اعتراضات تو رفع ہو جاتے ہیں اور كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ الآیہ کے ٹکڑے کا ایک محمل نکل آتا ہے لیکن اس صورت میں مذکورہ بالا اعتراضات سے بھی بڑا اعتراض اس پر یہ وارد ہوتا ہے کہ "يُطِيقُونَ" کے یہ معنی لغت میں ہیں بھی یا محض اپنے جی سے گھڑ لیے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک عربی لغت اس لفظ کے اس معنی سے بالکل خالی ہے۔ بعض لوگ یہ دعوے کرتے ہیں کہ باب افعال کا ایک خاصہ سلب ماخذ بھی ہے اس وجہ سے 'اطاقت' کے معنی طاقت نہ رکھنے کے بھی آ سکتے ہیں۔ ہمیں اس بات سے تو انکار نہیں ہے کہ باب افعال کے خواص میں سے سلب ماخذ بھی ہے لیکن خاصیات الابواب کا معاملہ، جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں، قیاسی نہیں بلکہ سماعی ہے اس وجہ سے اصل شے لفظ کا استعمال ہے۔ اگر اہل زبان نے اس لفظ کو مذکورہ معنی میں استعمال کیا ہو اور اس کی مثالیں موجود ہوں تب تو بلاشبہ اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن اگر اس معنی میں اس لفظ کے استعمال کی کوئی نظیر کلامِ عرب اور قرآن و حدیث میں موجود نہیں ہے تو محض اس مفروضہ پر کہ باب افعال کے خواص میں ایک خاصہ سلب ماخذ نامی بھی ہے، لفظ کو اثبات کے

بجائے نفی کے معنی میں لے لینا عربی زبان پر بھی بہت بڑا ظلم ہے اور یہ چیز دین میں بھی ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اگر کوئی صاحب اس اصول کو بے دھڑک استعمال کرنے لگ جائیں تو وہ دین کے ایک بہت بڑے حصّہ کو بڑی آسانی سے امر و حکم کے بجائے نفی و نہی سے بدل سکتے ہیں۔

بعض کم سواد یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کہنا کہ "فلاں شخص فلاں چیز کی طاقت رکھتا ہے" اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اس چیز کی مشکل سے طاقت رکھتا ہے۔ یہ بات بالکل طفلانہ ہے اس وجہ سے اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتے ہیں کہ طاقت رکھنے کے مفہوم میں مشکل کا یہ مضمون موجود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ طاقت آدمی کو تکالیف شرعیہ اور احکام دینیہ کے اٹھانے کا ذمہ دار بناتی ہے یا اس کو شریعت کی ذمہ داریوں سے بری قرار دیتی ہے۔ جہاں تک اسلامی شریعت کا تعلق ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ طاقت آدمی کو مکلف بناتی ہے نہ کہ اس کو بری قرار دیتی ہے۔ جب آپ یہ کہیں کہ میں فلاں چیز کی طاقت رکھتا ہوں تو اس کے واضح معنی یہی ہیں کہ آپ اس کے لیے مکلف ہونے کے درجہ میں ہیں نہ کہ اس سے استثنا کے درجہ میں، قطع نظر اس سے کہ آپ اس کی طاقت آسانی سے رکھتے ہیں یا مشکل سے۔

پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اگر کہنا یہ تھا کہ "جو لوگ روزہ رکھنے کی مشکل سے طاقت رکھتے ہیں" تو اس کے لیے عربی زبان میں بیسیوں اسلوب اور الفاظ نہایت معلوم و مشہود موجود ہیں جو اہلِ زبان استعمال کرتے ہیں آخر ان کو چھوڑ کر قرآن نے ایک ایسا لفظ کیوں استعمال کیا جس کا استعمال اس معنی کے لیے کسی کو معلوم نہیں۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ "انا اطیق حمل السلاح" تو ہر شخص اس کا مطلب یہی سمجھے گا کہ وہ ہتھیار اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ مطلب تو کوئی بھی نہیں سمجھے گا کہ وہ ہتھیار اٹھانے کی مشکل سے طاقت رکھتا ہے اس وجہ سے مستحق ہے کہ اسے جہاد کی ذمہ داریوں سے بری رکھا جائے۔ اسی طرح فرض کیجیے کہ کہا جائے کہ "لنا طاقۃ بجالوت وجنودہ" تو اس کا واضح مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ہمیں جالوت اور اس کی فوجوں سے مقابلہ کی طاقت ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا کہ ہمیں طاقت نہیں ہے، یا ہم مشکل سے طاقت رکھتے ہیں، تب تو قرآن میں بنی اسرائیل کا جو قول نقل ہوا ہے کہ "لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ" اس میں لائے نفی کی مطلق ضرورت نہیں تھی بلکہ اثبات کی صورت میں ان کا مطلب صحیح طور پر ادا ہو جاتا۔

اصل اشکال اور اس کا حل

بہر حال جن لوگوں نے 'یطیقون' کے یہ معنی لیے ہیں انھوں نے بالکل غلط معنی لیے ہیں لیکن یہ معنی اگر غلط ہیں تو اس کے معروف معنی لینے کی صورت میں آیت کی تاویل کیا ہو گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ٹکڑے میں جو اشکال ہے وہ یطیقون کے لفظ میں نہیں ہے، اس کے معنی تو وہی ہیں جو معروف و مشہور ہیں، اس کے سوا کسی اور معنی کے لیے اس لفظ میں کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے، دراصل اس میں اگر اشکال ہے تو 'یُطِیْقُوْنَهٗ' کی ضمیر مفعول میں ہے کہ اس کا مرجع کیا ہے؟ عام طور پر لوگ اس کا مرجع صوم کو مانتے ہیں اس

وجہ سے وہ سارے اشکالات پیدا ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ لیکن اس کا مرجع صوم نہیں بلکہ طعام ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یہ تاویل ہمارے پچھلے اہلِ تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے لی ہے اور یاد پڑتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تاویل بھی یہی ہے۔ یہ تاویل ہمارے نزدیک بالکل واضح ہے لیکن ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکے کہ طعام کا لفظ چونکہ اوپر کہیں مذکور نہیں ہوا ہے اس وجہ سے اس کے ذکر سے پہلے اس کے لیے ضمیر لانا اضمار قبل الذکر ہے، جو کلام کا ایک عیب ہے جس سے قرآن کو پاک ہونا چاہیئے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اضمار قبل الذکر کلام کا ایک عیب ہے لیکن یہ عیب اس شکل میں ہے جب ضمیر کا مرجع متکلم کی نیت میں مقدم نہ ہو اور وہ اس کے لیے ضمیر لائے لیکن اگر مرجع متکلم کی نیت میں مقدم ہو اور محض تکرار سے بچنے کے لیے یا بلاغت کے کسی اور تقاضے کے تحت وہ مرجع کو موخر کرنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں اضمار قبل الذکر نہ صرف یہ کہ عیب نہیں ہے بلکہ کلام کی ایک خوبی ہے اور اس کی نہایت عمدہ مثالیں کلامِ عرب میں موجود ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ضمیر بھی جس کو ہمارے اہلِ نحو ضمیر شان کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اسی نوعیت کی چیز ہے۔ اس میں بھی متکلم ضمیر درحقیقت اس مرجع کے لیے لاتا ہے جو اس کے مافی الضمیر میں مضمر ہوتا ہے۔

یہاں پوری بات یوں تھی کہ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ طَعَامَ مِسْكِينٍ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہیں تو ان کے لیے بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے) لیکن اس صورت میں جملہ نہایت ثقیل ہو جاتا تھا اس وجہ سے کلام کی روانی، ایجاز اور بلاغت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک جگہ طعامِ مسکین کو حذف کر کے اس کی جگہ ضمیر لا دی جائے اور دوسری جگہ جہاں اس کا اظہار ناگزیر ہے اس کو ظاہر کر دیا جائے تاکہ کلام غیر ضروری تکرار کے عیب سے پاک رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے اضمار قبل الذکر کی صورت تو ضرور پیدا ہوئی لیکن دیکھیے ضمیر اصلاً جس چیز کے لیے لائی گئی ہے وہ صرف عبارت میں موخر ہے متکلم کی نیت میں موخر نہیں ہے۔

اس تاویل کو قبول کر لینے کے بعد مسئلہ کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ پہلے جو روزے فرض ہوئے تھے اس میں اس بات کی بھی گنجائش تھی کہ اگر لوگ روزے نہ رکھنا چاہیں تو اس کا بدل مسکین کو کھانا کھلا کر پورا کر دیا کریں بلکہ قرآن کے الفاظ سے اس کی اصلی شکل یہ سامنے آتی ہے کہ جو لوگ بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہیں کر سکتے تھے ان کو اس بات کی اجازت تھی کہ دوسرے دنوں میں یا تو روزے رکھ کر ان چھوڑے ہوئے روزوں کی تلافی کر دیں یا ایک روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا بدل پورا کر دیں۔ گویا اس وقت تک قضا روزوں کی تلافی مسکین کو کھانا کھلا کر بھی ہو سکتی تھی، بعد میں یہ اجازت، جیسا کہ آگے والی آیت سے واضح ہوگا، منسوخ ہو گئی، یعنی قضا شدہ روزوں کی

جگہ بھی روزے رکھنا ہی ضروری قرار دے دیا گیا۔

"جو کوئی از خود کچھ مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزہ رکھو تو یہ زیادہ بہتر ہے" کا مطلب یہ ہے کہ قضا روزے کا یہ فدیہ جو مذکور ہوا، یہ ایک مستطیع سے کم سے کم مطالبہ ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا ان کے ساتھ کوئی اور نیکی کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ نیز یہ کہ اس فدیہ کی نوعیت صرف ایک رخصت اور رعایت کی ہے، اللہ کے نزدیک زیادہ بہتر یہی ہے کہ آدمی فدیہ کے بجائے دوسرے دنوں میں یہ روزے ہی پورے کر دے۔ یہ گویا اس رخصت کے ساتھ ساتھ ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا گیا تھا کہ یہ اجازت عارضی اور وقتی ہے جو منسوخ ہونے والی ہے اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ روزوں کی تعداد پوری کی جائے چنانچہ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا اور آگے آ رہا ہے، کچھ عرصے کے بعد یہ فدیہ کی اجازت منسوخ ہو گئی اور فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کا اصل حکم باقی رہ گیا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا ھَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۸۵)

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اوپر والی آیت کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی جس میں ایک حقیقت تو یہ واضح کی گئی کہ رمضان کے مہینہ کو اللہ تعالیٰ نے روزوں کے لیے کیوں منتخب فرمایا۔ دوسری یہ کہ اب تک سفر یا بیماری کے سبب سے قضا شدہ روزوں کے لیے فدیہ کی جو اجازت تھی وہ اجازت منسوخ ہوئی۔ اب روزوں کی تلافی روزوں ہی کے ذریعہ سے ضروری قرار دے دی گئی۔

روزے کے لیے رمضان کے مہینے کے انتخاب کی حکمت

پہلی حقیقت اس طرح واضح کی گئی ہے کہ یہی مبارک مہینہ ہے جس میں دنیا کی ہدایت کے لیے قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس ہدایت کے متعلق فرمایا کہ یہ ہدایت بھی ہے اور اس میں ہدایت اور فرقان کی بینات بھی ہیں۔ یعنی یہ صراط مستقیم کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عقل کی رہنمائی اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لیے وہ واضح اور قاطع حجتیں بھی اپنے اندر رکھتی ہے جو کبھی کہنہ ہونے والی نہیں ہیں۔ لفظ "ہدیٰ" کی تحقیق اسی سورہ کی آیت ۲ کے تحت اور "فرقان" کی تحقیق آیت ۵۳ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ بینات سے مراد واضح، دل نشین اور ہر الجھن کو دور کر دینے والے براہین و حجج ہیں۔ قرآن صرف حلال و حرام بتانے کا ضابطہ ہی نہیں ہے بلکہ حجج و حکمت کے بینات کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ بھی ہے اس وجہ سے یہ رہتی دنیا تک عقل انسانی کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

اس عظیم نعمت کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا

تاکہ بندے اس میں اپنے نفس کی خواہشات اور شیطان کی ترغیبات سے آزاد ہو کر اپنے رب سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکیں اور اپنے قول و فعل، اپنے ظاہر و باطن اور اپنے روز و شب ہر چیز سے اس حقیقت کا اظہار و اعلان کریں کہ خدا اور اس کے حکم سے بڑی ان کے نزدیک اس دنیا کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔

غور کرنے والے کو اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آسکتی کہ خدا کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے اور عقل سے بھی بڑی نعمت قرآن ہے اس لیے کہ عقل کو بھی حقیقی رہنمائی قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے، یہ نہ ہو تو عقل سائنس کی ساری دوربینیں اور خوردبینیں لگا کر بھی اندھیرے ہی میں بھٹکتی رہتی ہے اس وجہ سے جس مہینے میں دنیا کو یہ نعمت ملی وہ سزاوار تھا کہ وہ خدا کی تکبیر اور اس کی شکرگزاری کا خاص مہینہ ٹھہرا دیا جائے تاکہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر و عظمت کا اعتراف ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے۔ اس شکرگزاری اور تکبیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی عبادت مقرر فرمائی جو اس تقویٰ کی تربیت کی خاص عبادت ہے جس پر تمام دین و شریعت کے قیام و بقا کا انحصار ہے اور جس کے حاملین ہی کے لیے درحقیقت قرآن ہدایت بن کر نازل ہوا ہے جیسا کہ اس سورہ کی بالکل پہلی ہی آیت میں اس نے خود یہ حقیقت واضح فرما دی ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (یہ آسمانی کتاب ہے، اس کے آسمانی ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، یہ متقیوں کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے) گویا اس حکمتِ قرآنی کی ترتیب یوں ہوئی کہ قرآن حکیم کا حقیقی فیض صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہے جن کے اندر تقویٰ کی روح ہو اور اس تقویٰ کی تربیت کا خاص ذریعہ روزے کی عبادت ہے اس وجہ سے رب کریم و حکیم نے اس مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اس دنیا کے لیے بہار ہے اور رمضان کا مہینہ موسم بہار اور یہ موسم بہار جس فصل کو نشو و نما بخشتا ہے وہ تقویٰ کی فصل ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔

یہ اوپر کے مبتدا کی اصل خبر ہے۔ یعنی یہ مہینہ اپنی مذکورہ خصوصیات کی وجہ سے روزوں کے لیے منتخب کیا گیا ہے تو جو شخص اس مہینے میں حاضر ہو وہ اس پورے ماہ کے روزے رکھے۔ حاضر ہونے کا مفہوم خود آگے کے الفاظ سے واضح ہو رہا ہے کہ آدمی سفر یا بیماری کی حالت میں نہ ہو اور فَلْيَصُمْهُ کے معنی یہ ہوئے کہ اس پورے مہینہ کے روزے رکھے، اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے، اور اگر بیماری یا سفر کی وجہ سے روزے پورے نہ کر سکتا ہو تو دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر یہ کمی پوری کر دے۔ یہاں سے اوپر والی آیت کے الفاظ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ، وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ حذف فرما دیے جس کے معنی یہ ہیں کہ اصل حکم میں اس حصہ کے بقدر ترمیم ہو گئی۔ سفر یا بیماری کے زمانوں کے چھوٹے ہوئے روزوں کے لیے اب تک جیسا کہ اوپر گزرا، فدیے کی بھی اجازت تھی، مذکورہ الفاظ کے حذف ہو جانے سے وہ ختم ہو گئی۔

روزے کے احکام کی حکمتیں

آگے يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ سے آخر آیت تک صعودی ترتیب کے ساتھ اوپر کے تمام احکام کی حکمت و مصلحت واضح فرمادی۔ اوپر جو باتیں بیان ہوئی تھیں ان کو ایک مرتبہ پھر ذہن کے سامنے کر لیجئے۔ ایک تو یہ بات بیان ہوئی تھی کہ رمضان کا مہینہ روزوں کے لیے کیوں مخصوص کیا گیا؟ دوسری یہ کہ فدیہ کی اجازت منسوخ کر دی گئی اب سفر اور بیماری کے زمانے کے روزوں کی تعداد بھی پوری کرنی ہوگی۔ تیسری یہ کہ سفر اور مرض کی حالت میں روزے دوسرے دنوں پر ملتوی کیے جا سکتے ہیں۔

ان تینوں کی حکمت و علت نیچے سے شروع کر کے اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے یوں بیان فرمائی کہ سفر اور بیماری کی حالت میں روزے ملتوی کر دینے کی اجازت تمھیں اس لیے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ تمھیں کسی تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا، فدیہ کی اجازت اس لیے منسوخ کر دی گئی کہ تم رمضان کے روزوں کی تعداد پوری کرو اور اس خیر و برکت سے محروم نہ ہو جو اس کے اندر مضمر ہے اور رمضان کے مہینہ کو اس کے لیے مخصوص اس وجہ سے فرمایا کہ تم اس نعمتِ عظمٰی پر اللہ کی بڑائی اور اس کا شکر کرو جو تمھیں قرآن کی صورت میں اس مبارک مہینے میں عطا ہوئی۔ اس ترتیب صعودی کی مثالیں سورۂ قصص کی آیت ۲، اور انفال کی آیت ۱ میں موجود ہیں۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ میں تکبیر سے مراد خدا کی عظمت و جلالت اور اس کی بزرگی و کبریائی کے احساس و اعتراف کی وہ حالت ہے جو ایک روزہ دار پر روزے کی حالت میں عملاً طاری ہوتی ہے اور جس کے سبب سے بندہ اپنی تمام جائز خواہشوں سے بھی محض اپنے رب کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں دستبردار ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت پر مسلم کی اس حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ کل عمل ابن اٰدم یضاعف، الحسنۃ بعشر امثالھا الی سبع مائۃ ضعف، قال اللہ تعالیٰ الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ، یدع شھوتہ وطعامہ من اجلی" ابنِ آدم کا ہر نیک عمل بڑھایا جائے گا، دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صرف روزے کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اپنے ہاتھوں اس کا بدلہ دوں گا کیونکہ بندہ صرف میری ہی خاطر اپنی خواہشوں اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ احادیث میں جو رخصتیں حاملہ، مرضعہ یا پیر فانی وغیرہ سے متعلق بیان ہوئی ہیں وہ تمام تر يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ کے اصول یا اسی رخصت پر مبنی ہیں جو مریض و مسافر کے لیے بیان ہوئی ہے۔ قرآن حکیم کی حکمت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان گوشوں میں بھی وسعت دے دی ہے جو اس کے دائرہ میں آتے تھے۔ جن لوگوں نے يُطِيْقُوْنَ کے لفظ سے حاملہ یا مرضعہ وغیرہ کے لیے احکام نکالنے کی کوشش کی ہے انھوں نے دو بالکل غیر متعلق چیزوں میں جوڑ ملانے کا تکلف کیا ہے۔ ہم اوپر اس کی تردید کر چکے ہیں۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (۱۸۶)

شبہات اور مشکلات میں خدا کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت

یہ آیت تمہید ہے ان سوالوں کے جوابات کی جو روزے کے حکم کے نزول کے بعد ماہ رمضان کے احترام اور روزے کے احکام و آداب سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں ابھرے یا ان کی زبانوں پر آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی وضاحت فرمائی۔ ایسے لوگوں کو قرآن نے یہ ہدایت فرمائی کہ اپنے اس قسم کے شبہات و اعتراضات کو خدا اور اس کی شریعت کی مخالفت یا اس کی تنقید و تضحیک کا ذریعہ نہ بنا لیں بلکہ ان میں رہنمائی کی طلب کے لیے خدا ہی کی طرف رجوع کریں۔ جو آدمی اخلاص و صداقت کے ساتھ اپنی کسی حقیقی ضرورت کے لیے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے خدا اس کی طلب ضرور پوری کرتا ہے، عام اس سے کہ وہ ضرورت اس کی معاش سے متعلق ہو یا معاد سے، ذہنی و عقلی الجھنوں سے متعلق ہو یا شریعت اور اس کے احکام کے فوائد و مصالح سے۔

منافقین کا حال یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو دین کی کسی بات میں کوئی مشکل محسوس ہوئی وہ اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اس بات کو اعتراض و استہزا کا نشانہ بنا لیتے اور مسلمانوں کے اندر وسوسہ اندازی اور فتنہ انگیزی کی ایک مہم شروع کر دیتے۔ قرآن میں ان کی اس خصلت کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے۔ خاص طور پر سورۂ مجادلہ میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو واضح ہوئے ہیں۔ اہلِ ایمان کی پسندیدہ روش قرآن نے یہ بتائی کہ وہ اپنی مشکلات کے لیے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی مشکلات دور فرما دیتا ہے۔

یہ تمہید ایک جامع تمہید ہے جو مختلف مواقع کے ساتھ مناسبت رکھنے والی ہے لیکن یہاں اس کا تعلق، جیسا کہ ذکر کیا گیا، خاص طور پر ماہ رمضان اور اس کے روزوں کے باب میں چند سوالوں کے جواب سے ہے۔ یہ سوالات مسلمانوں کے اندر جب پیدا ہوئے تو قرآن نے ان کی وضاحت فرمائی اور ساتھ ہی ان کی حوصلہ افزائی کی کہ جب خدا اور اس کی شریعت سے متعلق کوئی سوال پیدا ہو تو اس کے لیے خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، خدا سب سے قریب ہے اور وہ سب کی مشکلات حل فرماتا ہے۔

(وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ) میرے متعلق سوال، سے مراد ضروری نہیں کہ خدا کی ذات و صفات ہی سے متعلق سوال ہو بلکہ یہ سوال اس کی ذات و صفات، اس کی پسند و ناپسند اور اس کے احکام و شرائع سب ہی پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ سوال کا تعلق ان احکام سے ہے جو ماہِ رمضان اور روزوں کے آداب و شرائط سے متعلق اصل حکم کے نزول کے بعد پیدا ہوئے۔ قرآن کے تدبر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس میں سائلوں کے سوالات نہایت اجمال کے ساتھ نقل ہوتے ہیں، سوال کی اصلی نوعیت اس جواب سے واضح ہوتی ہے جو اس کے بعد قرآن دیتا ہے۔ سوال کے اجمال کے ساتھ نقل کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کلام غیر ضروری طوالت سے محفوظ رہے، دوسری یہ کہ اکثر سوالوں کے جواب میں قرآن کی وضاحت صرف سوالوں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ جب اس کا ابر کرم برسا ہے تو اس نے خشک و تر سب ہی کو سیراب

کر دیا ہے۔ جواب کی اس وسعت و ہمہ گیری کا تقاضا یہ ہُوا کہ سوال مبہم شکل میں نقل کیا جائے تاکہ سوال اور جواب میں عدمِ مطابقت نمایاں نہ ہو۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے موزوں مواقع آگے آئیں گے اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

خدا اور بندے کا تعلق

"فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ" ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ اس لیے کہ خدا سے قرب و بُعد کا انحصار بندے کے اپنے دل کی حالت پر ہے۔ اگر بندہ خدا سے غافل اور بے پروا ہے تو اس سے زیادہ دور کوئی چیز بھی نہیں لیکن اگر وہ خدا کی طرف متوجہ رہے، اس کی یاد سے اپنے دل کو معمور رکھے، اس کی نعمتوں پر اس کا شکر گزار رہے اور اس کی آزمائشوں میں طلبِ صبر و استقامت کے لیے اسی کے آگے روئے اور گڑگڑائے تو خدا سے زیادہ قریب بندے سے کوئی چیز بھی نہیں۔ وہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

یہ قرابت بندوں کو یوں تو ہر حال اور ہر مقام میں حاصل ہے لیکن خاص کر نبی کی بعثت کا زمانہ تو، جس کی طرف یہاں اشارہ ہے، خدا سے قرب و اتصال کا خاص زمانہ ہوتا ہے۔ نبی خدا کا نائب اور بندوں کا وکیل ہوتا ہے۔ خدا کے فرشتے ہر وقت اس کے پاس آتے رہتے ہیں، وحی کا سلسلہ اس کے اور خدا کے درمیان قائم رہتا ہے۔ بندے اپنی جو مشکلات اور اپنے جو سوالات نبی کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ گویا اس کے واسطے سے اپنے رب کے حضور ہی میں پیش کرتے ہیں اور وحی کا زمانہ ہونے کی وجہ سے ہر لمحہ توقع ہوتی ہے کہ جو سوال اس کے حضور میں پیش ہُوا ہے اس کا جواب نازل ہو جائے۔ اسی حقیقت کی طرف مائدہ کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔ وَاِنْ تَسْــَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (۱۰۱) اور اگر تم ان کی بابت اس زمانے میں سوال کرو گے جب کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی)

"اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ" بھی ایک حقیقت کا بیان ہے۔ بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے تو وہ اس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ جواب دینے سے مراد قبولیت کا جواب ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ بندہ اپنے رب کو پکارے اور وہ اس کی مدد، فریاد رسی اور داد رسی کو نہ پہنچے۔ شرط صرف یہ ہے کہ بندہ اخلاص و تضرع کے ساتھ پکارے اور اسی چیز کے لیے پکارے جس کے لیے پکارنا اس کو زیبا ہے۔ اگر بندہ اپنے رب سے وہ چیز مانگتا ہے جو مانگنے کی ہے اور اس طرح مانگتا ہے جس طرح مانگنا چاہیے تو وہ چیز اس کو ضرور عطا ہوتی ہے۔ اگر فوراً عطا نہیں ہوتی تو اس کے مستقبل کے لیے یا اس کی آخرت کے لیے خدا کے ہاں محفوظ ہو جاتی ہے اور اگر اس شکل میں نہیں ملتی جس شکل میں اس نے مانگی ہے تو اس سے بہتر شکل میں وہ اس کو مل جاتی ہے یا اس کے لیے محفوظ کر دی جاتی ہے۔ قبولیتِ دعا کے باب میں اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص سنت ہے جس کے مختلف اجزا اپنے اپنے مقامات میں بیان ہوں گے۔ یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

"فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ"، اوپر اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں یہ ان کا لازمی تقاضا یا نتیجہ بیان ہُوا ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ بندوں سے قریب تر بھی ہے اور وہ ان کی پکار سنتا اور اس کا جواب بھی دیتا ہے

توپھر اسی کا حق ہے کہ سب اس کی دعوت پر لبیک کہیں اور اس پر ایمان لائیں، پھر اس سے منحرف ہو کر کسی اور کی طرف رخ کرنے کے لیے کوئی ادنیٰ وجہ جواز بھی نہیں ہے۔ خاص کر یہ تو اپنی جان پر بہت بڑا ظلم ہے کہ جو پروردگار اپنی شریعت کے اجمالات کی توضیح خود فرمانے کے لیے سراپا رحمت و کرم ہے اس کے کسی حکم کو کوئی اعتراضات و شبہات کا ہدف ٹھہرائے یا اس کے سبب سے کسی خیانت یا تنگی میں مبتلا ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت کے سیاق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اہلِ ایمان کی اس بات کے لیے حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے کہ اگر ان کو خدا اور اس کی شریعت کے باب میں کوئی کھٹک پیدا ہو تو وہ خدا اور اس کے رسول ہی کی طرف رجوع کریں، اللہ تعالیٰ ان کی کھٹک دور فرمائے گا۔ بظاہر یہ بات اس ہدایت کے خلاف معلوم ہوتی ہے جو لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ اور اس کی ہم معنی دوسری آیات میں دی گئی ہے۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ جہاں سوالات کرنے کی ممانعت ہے وہاں اس سے مراد اس طرح کے غیر ضروری سوالات ہیں جو یہود اپنے پیغمبر سے محض اس کو زچ کرنے اور شریعت سے فرار اختیار کرنے کے لیے کرتے تھے۔ وہ سوالات اس کے تحت نہیں آتے جو شریعت کی توضیح و تبیین کے لیے ضروری ہیں۔ اللہ اور رسول نے ایسے سوالات کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور ان کے جوابات سے دین کی دولت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ اللہ اور رسول نے ایسے سوالات کے مواقع فراہم کیے ہیں تاکہ لوگوں پر دین کی حکمتیں اور مصلحتیں اور بندوں کی ضروریات کے ساتھ شریعت کی مناسبتیں واضح ہوں۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ
اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ
وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ
الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۱۸۷)

روزے سے متعلق سوالات کے جوابات

اوپر کی تمہید کے بعد اب یہ ان سوالات کا جواب ہے جو روزے کے احکام و آداب سے متعلق اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوئے۔ اس کے آخر میں كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ کے الفاظ اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ آیت اصل حکم کے نزول کے کچھ عرصہ بعد توضیح و تبیین کے طور پر نازل ہوئی۔ جو لوگ قرآن مجید کے اندازِ بیان سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن میں جب کسی حکم کے بعد اس کی کوئی مزید توضیح و تفصیل نازل ہوئی ہے تو اس کے ساتھ بالعموم یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حکم بعد میں بطورِ وضاحت نازل ہوا ہے۔ یہ قرآن سے متعلق اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں ہوا ہے کہ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ "رفث" کے اصل معنی تو شہوانی باتوں کے ہیں

لیکن یہاں اس کے بعد الیٰ کا صلہ اس کے اندر بیویوں سے اختلاط و ملاقات کا مضمون پیدا کر دیتا ہے۔ پس اس کے جائز کر دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے یہ چیز حرام ٹھہرائی گئی تھی بعد میں یہ جائز کر دی گئی۔ یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ ابتدائی حکم میں اس قسم کی کوئی وضاحت چونکہ موجود نہیں تھی اس وجہ سے بہت سے مسلمانوں نے بنظرِ احتیاط و تقویٰ یہ سمجھا کہ جس طرح روزے کی حالت میں، دن میں زن و شو کے تعلقات کی اجازت نہیں ہے اسی طرح شب میں بھی اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت پہنچی ہوگی کہ یہود کے ہاں روزہ افطار کے بعد معاً پھر شروع ہو جاتا تھا جس کے سبب سے انھیں شب میں بھی وہ پابندیاں نباہنی پڑتی تھیں جو دن میں تھیں۔ چونکہ مسلمانوں کے سامنے عملی مثال کی حیثیت سے اہل کتاب ہی کا روزہ تھا اور قرآن میں اس کا حوالہ بھی دیا گیا تھا اس وجہ سے انھوں نے از خود اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لی کہ دن کی طرح شب میں بھی ازدواجی تعلقات سے احتراز کرتے تھے لیکن اس معاملہ میں چونکہ اب تک کوئی واضح ہدایت نہیں تھی اس وجہ سے اس کی نوعیت ایک مشتبہ معاملہ کی تھی۔ اس اشتباہ کے سبب سے بعض لوگ نفس کی اکساہٹ کے باعث کبھی کبھی اس چیز کے مرتکب بھی ہو جاتے جو خود ان کے ضمیر کے نزدیک مشتبہ ہوتی۔ مشتبہ معاملات میں شریعت کی ہدایت، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے، یہ ہے کہ دع ما یریبک الی ما لا یریبک " مشتبہ کو چھوڑ کر آدمی اس پہلو کو اختیار کرے جو غیر مشتبہ ہو، اگر اس کے برعکس آدمی مشتبہ پہلو کو اختیار کرے تو یہ خود اپنے نفس کے ساتھ ایک قسم کی خیانت ہوتی ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کو اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر فرمایا لیکن چونکہ یہ احتیاط شریعت کے منشا کے خلاف تھی محتاط مسلمانوں نے از خود اپنے اوپر عائد کر لی تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس خیانت سے درگزر فرمایا اور واضح الفاظ میں شب میں بیویوں سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

میاں بیوی کے لیے لباس کے استعارے کی بلاغت

ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ ۔ (وہ تمھارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو) میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ جس نوعیت کی وابستگی رکھتے ہیں، یہ اس کی طرف اشارہ ہے اور مقصود اس اشارے سے یہ بتانا ہے کہ ان دونوں میں ایسا چولی دامن کا رشتہ ہے اور یہ باہم دگر ایسے فطری تقاضوں کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں کہ ان کو کسی حالت میں بھی ایک دوسرے سے الگ الگ رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس وجہ سے دینِ فطرت نے ان کے باہمی تعلق پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کی ہے جو فطری داعیات کے درمیان کوئی دیوار کھڑی کر دے۔ اگر کوئی محدود قسم کی پابندی خاص خاص حالات میں عائد بھی کی گئی ہے تو وہ صرف تربیتِ نفس کی ضرورت کی حد تک ہے، ذرا بھی اس سے متجاوز نہیں ہے۔

میاں اور بیوی کے لیے لباس کا استعارہ ایک نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ اس کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

لباس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کے جسم کے لیے ساتر ہوتا ہے۔ اس سے اس کے

عیوب برہنگی کو پردہ پوشی نصیب ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی ننگا ہو کر حیوانات کے درجے میں آجائے۔ ٹھیک اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے جنسی جذبات و داعیات کے لیے پردہ فراہم کرتے ہیں۔ ان کے اندر جو صنفی میلانات اُبھرتے ہیں وہ ان کی تسکین اور آسودگی کے لیے خود اپنے اندر سامان رکھتے ہیں اس وجہ سے کبھی ان کے عریاں اور بے نقاب ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ اگر یہ نہ ہو تو جذبات کا ہیجان جنسی انارکی کا ایک ایسا طوفان برپا کردے کہ کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہ رہ جائے۔ جسم کے جو حصے اپنے اندر جنسی کشش رکھتے ہیں وہ عریاں ہونے کے لیے زور لگائیں، زبان اور قلم پر فحاشی کا بخار و ہذیان طاری ہو جائے، دل ہرزہ گرد اور نگاہ بالکل آوارہ ہو کر رہ جائے۔ ہمارے نفس کے ان سارے عیوب کی پردہ پوشی اگر ہو سکتی ہے تو صرف بیوی کے لیے شوہر کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور شوہر کے لیے بیوی کے ذریعہ سے۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نگاہ کو باحیا بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز نکاح کو قرار دیا ہے۔ حیا کے متعلق معلوم ہے کہ وہ خود ایک باطنی لباس ہے بلکہ سچ پوچھیے تو اصلی لباس یہی ہے، باطن کا یہی لباس ہے جس کے سبب سے ہم ظاہر کے لباس کو اختیار کرتے ہیں اور حیا قائم رکھنے میں جو مدد شوہر کو بیوی سے اور بیوی کو شوہر سے ملتی ہے وہ کسی چیز سے بھی نہیں ملتی۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ زینت ہے۔ یہ درجہ ستر پوشی کے بعد کا ہے۔ انسان لباس کے ذریعہ سے آرائش، حسن و جمال اور تہذیب و سلیقہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرتا ہے اور تمدن و ترقی کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ غور کیجیے تو یہی چیز اس سے بلند تر درجے میں عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے علمائے عمرانیات کہتے ہیں کہ انسان نے تہذیب و تمدن کا پہلا قدم اسی دن اٹھایا جس دن پہلے مرد نے پہلی عورت سے اپنا تعلق استوار کیا۔ یہ بات اپنے اندر ایک بہت بڑی حقیقت رکھتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ مرد کے اندر گھر در کی خواہش، تجمّل و تزیّن کا جذبہ، حصولِ مال و جائداد کا ولولہ اصلاً عورت کے تعلق ہی سے پیدا ہوا، بعد میں دوسرے عوامل کی شرکت سے اس میں اضافہ ہوا۔ اسی طرح عورت کی زینت و آرائش، اس کے سگھڑ پن اور سلیقہ اور اس کی گھرداری کے جوش و انہماک میں اصلی دخل مرد کی تسخیر کی خواہش کو ہے۔ عورت اور مرد میں سے کوئی بھی اگر اپنے اس فطری محرک سے محروم ہو جائے تو ان کے تمام مذکورہ جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ مرد اگر بیوی سے محروم ہو تو ایک مسافر بلکہ کچھ خانہ بدوش سا بن کے رہ جاتا ہے، اسی طرح عورت اگر شوہر سے جُدا یا اس سے محروم ہو تو اس کے سارے احساسات مردہ اور اس کے سارے اسلحہ زنگ آلود اور کند ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ مرد اور عورت کا باہمی ارتباط و تعلق ہی ہے جس کے صدقے میں گھریلو زندگی کی وہ تمام رونقیں اور بہاریں ہمیں نصیب ہوتی ہیں جن سے دنیا میں تہذیب و تمدن پروان چڑھتے ہیں۔

لباس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ سردی اور گرمی کی سختیوں اور دشمن کے بہت سے خطرات سے آدمی

کو محفوظ رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے۔ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (اور ہم نے اس کو ایسے لباسوں کی صنعت سکھائی جو تمھیں حملہ سے محفوظ رکھے) اخلاقی پہلو سے ٹھیک یہی حال عورت کا مرد کے لیے اور مرد کا عورت کے لیے ہے۔ عورت مرد کے لیے زرہ اور بکتر ہے اور مرد عورت کے لیے زرہ اور بکتر ہے۔ جب یہ دونوں اپنے اپنے زرہ اور بکتر سے آراستہ اور مسلح ہوں تو شیطان کے حملے ان میں سے کسی پر بھی کارگر نہیں ہوتے اور اگر وہ اس لباس سے عاری ہوں تو دونوں ہی کے لیے شیطان سے مار کھا جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ایک عارف کا قول ہے کہ بیوی کو سفر و حضر میں گلے کا تعویذ بناؤ تاکہ شیطان کے حملوں سے محفوظ رہو۔

لباس کے یہ تینوں مقصد قرآن پاک میں مذکور ہوئے ہیں اور ان تینوں ہی اعتبارات سے عورت مرد کے لیے اور مرد عورت کے لیے لباس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے، جو دین فطرت ہے، ان کے تعلق کی اس فطری اہمیت کو ملحوظ رکھا ہے اور اس کو نہ صرف یہ کہ تقویٰ کے خلاف نہیں قرار دیا بلکہ، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا ہے، اس کو مختلف اعتبارات سے تقویٰ کا معاون قرار دیا ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں مسلمانوں نے غلط فہمی کے سبب سے، یا اہل کتاب کے طریقہ سے متاثر ہو کر، اپنے اوپر اس سلسلہ میں جو پابندی عائد کر لی تھی اس آیت کے ذریعہ سے وہ دور فرما دی گئی۔

خیانت سے کیا مراد ہے — 'عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ' یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بعض لوگوں نے یہ گمان رکھتے ہوئے کہ رمضان میں دن کی طرح راتوں میں بھی ازدواجی تعلقات جائز نہیں ہیں، اس کی خلاف ورزی کی۔ اس چیز کو قرآن نے اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ مشتبہ معاملات میں آدمی کو وہ پہلو اختیار کرنا چاہیے جس میں احتیاط ہو اور پھر اسی کا التزام کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز اس کے اجتہاد یا گمان میں حکم شریعت ہے (اگرچہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم نہ ہو) اس نے اس کی خلاف ورزی کی اور یہ چیز واضح طور پر اپنے ضمیر کے ساتھ خیانت ہے۔ ہمارے نزدیک یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ مجتہد کو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر ایک چیز اس کے اجتہاد کی رو سے صحیح ہے تو پھر اس کی خلاف ورزی اس کے لیے درست نہیں ہے الا آنکہ دین ہی اس کے لیے متقاضی ہو ـــــ مگر یہ پابندی چونکہ منشائے الٰہی کے خلاف تھی اس وجہ سے اس خیانت پر اللہ تعالیٰ نے گرفت تو فرمائی لیکن ساتھ ہی معاف بھی فرما دی اور آئندہ کے لیے واضح الفاظ میں بیویوں سے ملاقات کی اجازت دے دی۔

ازدواجی زندگی کا اصل مقصد — 'وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ' (اور اللہ نے جو کچھ تمھارے لیے مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو) یعنی اولاد جو ازدواجی زندگی کا اصل مقصد ہے اس کے طالب بنو۔ اور یہ یاد رکھو کہ اس چیز کا تمام تر انحصار تقدیر الٰہی پر ہے نہ کہ تمھارے اختیار پر یا اللہ کے سوا کسی اور کے تصرف پر۔ اس چیز کا حوالہ دینے سے مقصود

یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی اصل غایت صرف لذت نہیں ہے بلکہ بقائے نسل ہے جو عین منشائے الٰہی ہے۔ اگر آدمی صرف لذت کے درپے ہو تب تو اس کا چھاپ انسان پر برا پڑ سکتا ہے لیکن اگر نگاہ اصلی غایت پر ہو تو یہ بھی عبادت ہی میں داخل ہے۔ اس زمانے میں ضبط ولادت کی تحریک اس کے بالکل برعکس ازدواجی زندگی کے اصل مقصد کی بیخ کنی کر رہی ہے اور لذت کو اصل مقصد کی اہمیت دے رہی ہے۔

کُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے) یہ چیز ہمارے روزوں کو اہل کتاب کے روزوں سے بالکل الگ کر دیتی ہے۔ ان کے ہاں رات کو اٹھ کر کھانے پینے یا ازدواجی تعلقات کی اجازت نہیں تھی۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت دی بلکہ اس کی تاکید کی ہے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی یہ اجازت صبح صادق کے اچھی طرح نمایاں ہو جانے تک ہے، اسی بات کی تائید احادیث اور صحابہؓ کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے محض احتیاط میں غلو کے سبب سے اپنے یا دوسروں کے روزے محض معمولی تقدیم و تاخیر پر مشتبہ قرار دے بیٹھنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

قرآن کے یہ الفاظ اس قدر واضح ہیں کہ تعجب ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے دور میں ان کا مفہوم سمجھنے میں بعض لوگوں کو زحمت کیوں پیش آئی؟ عدی بن حاتمؓ کی روایت، جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہے کہ انھوں نے فجر کو پہچاننے کے لیے دو سیاہ و سفید دھاگے باندھ لیے اگر پوری طرح قابلِ اعتماد ہے تو اس کو محض ان کی اس شدتِ احتیاط پر محمول کرنا چاہیے جو نئے نئے اسلام لانے والوں میں بالعموم پائی جاتی ہے۔ اس طرح کی باتوں کو صحابہؓ کی فہم و بصیرت پر طعن کا بہانہ نہیں بنانا چاہیے۔

'اعتکاف' سے مراد

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ۔ "عَکَفَ" کے اصل معنی اپنے آپ کو کسی چیز سے روک لینے یا کسی چیز پر جما دینے کے ہیں۔ اصطلاح دین میں اس سے مراد ہر چیز سے الگ ہو کر یادِ الٰہی کے لیے گوشہ نشین ہو جانا ہے۔ اسی چیز کو اعتکاف کہتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ سے واضح ہے کہ رمضان کے مہینے اور مسجد سے اس عبادت کو خاص مناسبت ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور آپ کے ارشادات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

اعتکاف سے مقصود چونکہ تبتل الی اللہ ہے اور اس میں دل کی کامل یکسوئی مطلوب ہے، نیز مسجد کا قیام اس کے لوازم میں سے ہے اس وجہ سے اس کے دوران میں بیویوں سے زن و شو کا تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے نفس کی آزادی کے لیے جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان کی پوری احتیاط سے نگرانی کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو ان سے بچائے رکھنے کے لیے ذرا ان سے دور ہی دور رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو جانور کسی چراگاہ کے بالکل پاس پاس چرتا ہے اس کے متعلق

بڑا اندیشہ ہے کہ وہ چراگاہ کے اندر جا پڑے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ ہم اوپر یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جب کسی حکم کے نزول کے بعد لوگوں کے سوال پر یا محض حالات کے اقتضا کے تحت اس حکم ہی کے متعلق کچھ مزید تفصیل نازل ہوئی ہے تو اس کے بعد بالعموم یہ آیت آتی ہے۔ اسی سورہ میں اس کی بعض مثالیں آگے آرہی ہیں اس وجہ سے ہم وہاں اس کے نظائر پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس قسم کی تفصیلات سے چونکہ تقویٰ کے طالبوں کے لیے تقویٰ کی مزید راہیں کھلتی ہیں اس وجہ سے فرمایا کہ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

۶۳۔ روزے کا اثر انسان کی صلاحیتِ کار پر

اس زمانہ میں جو لوگ مغرب کے مادہ پرستانہ فلسفۂ زندگی سے متاثر ہیں وہ روزے کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اس سے انسان کی صلاحیتِ کار اور اس کی قوتِ کارکردگی بہت کم ہو جاتی ہے جس سے فرد اور معاشرہ دونوں کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اعتراض کرنے والے دو بنیادی حقیقتیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ ان لوگوں کی نظر میں انسان کی جو کچھ قدر و قیمت ہے وہ محض اس کے مادی وجود کی ہے۔ اس کے روحانی وجود کی ان کی نگاہوں میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح ایک فربہ بیل زیادہ ہل چلا سکتا ہے اسی طرح ایک آسودہ اور پیٹ بھرا آدمی زیادہ کام کر سکتا ہے۔ یہ لوگ سیدنا مسیحؑ کی اس حکمت سے بالکل ناآشنا ہیں کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اس حقیقت سے بھی بالکل بے بہرہ ہیں جس کی طرف ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے (انی ابیت، لِی مُطعِمٌ یطعمنی وساق یسقینی) میں اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ ایک کھلانے والا مجھے کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا مجھے پلاتا ہے۔

انسان اگر صرف گوشت پوست کا مجموعہ ہے تب تو بلاشبہ ان معترضین کے اعتراض کے اندر کچھ وزن ہے لیکن اگر انسان کے اندر روح نامی کوئی شے بھی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کی تازگی و توانائی کے لیے بھی کوئی غذا اور تدبیر ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کیا یہی دودھ مکھن، جن سے ہمارے جسم کی پرورش ہوتی ہے اس کے لیے بھی کافی ہیں یا اس کے لیے کسی اور تدبیر و غذا کی ضرورت ہے؟ مذہب اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ انسان کے اندر روح کا جوہر ارضی نہیں بلکہ آسمانی اور خدائی ہے اس وجہ سے اس کی غذا اس زمین سے نہیں بلکہ خدا کے تعلق و توصل اور اس کے کلام و الہام سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا تعلق خدا سے قریب تر اور قوی تر اس وقت ہوتا ہے جب یہ جسم کے (جو اس کے لیے صرف ایک مرکب کی حیثیت رکھتا ہے) تقاضوں، اس کی خواہشات اور اس کے جذبات و میلانات سے فی الجملہ آزاد ہوتی ہے۔ جب تک یہ ان سفلی پابندیوں

میں گرفتار رہتی ہے اس وقت تک یہ ان بلندیوں میں پرواز نہیں کر سکتی جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اس کی اصلی جولانگاہ ہیں اور جن میں پرواز کرنے ہی سے اس کے وہ شاہینی کارنامے ظہور میں آتے ہیں جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔

روزہ روح کو یہ آزادی دلانے کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔ اس سے انسان کے نفس کی جو تربیت ہوتی ہے اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ روح پر خواہشات و شہوات کا غلبہ کمزور ہو جاتا ہے، انسان کی قوتِ ضبط اور اس کی قوت ارادی مضبوط ہو جاتی ہے اور اس طرح اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ایک فرمانبردار غلام کی طرح ہاتھ باندھے ہوئے اپنی خواہشوں کے پیچھے پیچھے چلے وہ ایک صاحبِ عزم و ایمان کی طرح اپنی خواہشات و جذبات کو اپنے رب کی رضا اور اس کے احکام کے پیچھے لگا دیتا ہے۔

غور کیجیے تو یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گی کہ انسان کے اندر قوت اور طاقت کا اصلی خزانہ اس کے جسم کے اندر نہیں بلکہ اس کے دل اور اس کی روح کے اندر ہے۔ اگر دل کمزور اور روح پراگندہ ہو تو نہایت راحت و تنعم میں پلے ہوئے جسموں کا حال یہ ہوتا ہے کہ گویا وہ لکڑی کے کندے ہیں جن کو خوب صورت پوشاک پہنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ان کے خوف و بزدلی کی تصویر اس طرح کھینچی ہے کہ یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ، دنیا کے کسی گوشہ میں بھی کوئی خطرہ نمودار ہو، ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ بجلی ہمارے ہی خرمن پر گرنے والی ہے۔ برعکس اس کے جن کی روح بیدار، جن کے دل پُرعزم اور جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں وہ نانِ جویں پر گزارہ کر کے بھی بازوئے حیدرؓ کے کارنامے دکھاتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا ہے کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آ گئیں۔ اور اسی چیز کی طرف شاعر نے بھی اشارہ کیا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دوسری حقیقت جس سے یہ معترضین غفلت برت رہے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے وقتی اثرات و نتائج سے نہیں لگایا جاتا ہے بلکہ اس مستقل اور پائیدار اثر سے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے جو زندگی پر اس کا پڑتا ہے یا متوقع ہوتا ہے بشرطیکہ صحیح طور پر اس کو برتا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دوا تقویتِ قلب و دماغ کے لیے نہایت مفید و مجرب ہو، اس کے اثرات نہایت پائیدار مترتب ہوتے ہوں، لیکن فوری طور پر اس کا ردِ عمل سستی یا اعضا شکنی یا خمار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس دوا کے اس فوری اثر کو دلیل قرار دے کر اس کو ایک مضر یا بے قیمت دوا قرار دے دینا کسی طرح بھی صحیح

نہیں ہے۔

ٹھیک یہی حال روزے کا ہے۔ اس کا فوری اثر —— خاص طور پر خام اور نومشق لوگوں پر —— تو ضرور کسل اور اضمحلال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس سے وقتی طور پر ان کی صلاحیتِ کار بھی متاثر ہوتی ہے لیکن دیکھنے کی چیز اس کا یہ وقتی اثر نہیں ہے بلکہ وہ پائیدار اثر ہے جو انسان کے ظاہر و باطن پر (بشرطیکہ اس کو ٹھیک ٹھیک برتا جائے) اس کا مترتب ہوتا ہے۔

روزے کے لیے عربی میں، جیسا کہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں، صوم کا لفظ ہے۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق کے سلسلہ میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ ابتداءً یہ لفظ ان گھوڑوں کے لیے استعمال ہوا جن کو جوانی پر آنے کے بعد، جنگ کے لیے تیار کیا جاتا اور اس تیاری کے لیے بتدریج ان کا چارہ اور دانہ کم کیا جاتا تاکہ ان کا بدن بھاگ دوڑ کے لیے سبک نکل آئے اور وہ میدانِ جنگ کی سختیوں اور بھوک پیاس کی مشقتوں کو برداشت کرنے کے اچھی طرح قابل ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ گھوڑوں پر یہ عمل اس لیے نہیں کیا جاتا تھا کہ اس سے ان کی قوتِ کارکردگی کم ہو جائے بلکہ مقصود اس سے ان کی قوتِ کارکردگی کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہوتا تھا تاکہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق کے لیے پوری طرح کارآمد ہو جائیں۔ ایک پلے ہوئے گھوڑے پر اگرچہ اس ٹریننگ کا فوری اثر اچھا نہیں پڑتا، وہ کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے، لیکن ٹریننگ دینے والے اس کے اس پائیدار اثر کو نگاہ میں رکھتے ہیں جو گھوڑے کو ہر سختی و نرمی کے برداشت کے قابل بنا دیتا ہے اور جس سے وہ تھان پر بندھے ہوئے ایک پرخور جانور کے بجائے میدانِ جنگ کا ایک سخت کوش اور جاں باز سپاہی بن جاتا ہے۔

یہی صوم (روزہ) ہے جو مذہب نے انسانوں کی ظاہری و باطنی تربیت کے لیے تجویز فرمایا ہے اور مقصود اس سے ان کی صلاحیتِ کار کو ضعیف کرنا نہیں ہے بلکہ اس صلاحیتِ کار کو صبر اور تقویٰ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا ہے تاکہ انسان حق کی مخالف طاقتوں کے مقابل میں، خواہ یہ طاقتیں شیطانی ہوں یا انسانی، جہاد کا اہل ہو سکے۔ قرآن اور حدیث پر نگاہ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ روزے کے بنیادی مقصد دو بیان کیے گئے ہیں۔ تقویٰ اور صبر۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر مرحلہ میں اور ہر قسم کے حالات میں اپنے نفس کو حدودِ الٰہی کا پابند رکھے۔ صبر یہ ہے کہ اس راہ میں خارج سے یا اس کے اپنے باطن سے جو مشکلات و موانع بھی سر اٹھائیں ان کا پورے عزم و جزم کے ساتھ مقابلہ کرے اور ان کے آگے سپر انداز نہ ہو۔ یہ جہادِ زندگی بھر کا جہاد ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ہر مسلمان اسی جہاد کی ٹریننگ حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان ہے کہ نئے نئے بھرتی ہونے والوں پر اس ٹریننگ کا فوری اثر اضمحلال اور ضعف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہو۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ فوری اثر نہیں بلکہ اس کا مستقل اثر ہے۔ اس کا مستقل اثر یقیناً، اس کو صحیح طور پر برتنے کی شکل میں، یہی ہونا چاہیئے کہ انسان کی بلادت کم ہو، اس کی روح قوی ہو، اس کا دل توانا ہو، اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہو، اس کی قوتِ برداشت بڑھ جائے، وہ جہادِ زندگانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پوری طرح تیار ہو جائے۔

غور کیجیے کہ یہ انسان کی صلاحیتِ کار کا گھٹنا ہے یا بڑھنا؟ ہمارے نزدیک تو جن کے اندر یہ صفات ہوں وہی درحقیقت انسانیت کے گل سرسبد ہیں۔ جن میں یہ صفات نہیں وہ آدمی نہیں بلکہ گاڈ پروا ری ہیں۔

۶۴۔ آگے کا مضمون ——— آیت ۱۸۸

روزے سے آگے اور پیچھے کے احکام میں مناسبت

اوپر ہم یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ روزے کے حکم سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق اور دوسروں کے اموال و املاک غصب کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس سے شریعت کے نظام میں روزے کا مقام واضح ہوتا ہے کہ اس عبادت کا اصل مقصود حرص و طمع، بخل اور لالچ اور اس قبیل کی دوسری بیماریوں پر قابو پانا ہے۔ ان پر قابو پانے ہی سے انسان کے اندر وہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو حقوق و معاملات میں اس کو عدل پسند اور محتاط بناتا ہے۔ گویا جن چیزوں سے بچتے رہنے کی ہدایت کی ان سے نفس کو بچانے میں جو تدبیر سب سے زیادہ کارگر ہو سکتی ہے اس کی طرف بھی رہنمائی فرما دی۔

مزید غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی واضح ہوگی کہ روزے کے بیان سے پہلے تو حق داروں کے لیے وصیت کرنے کی، اس وصیت میں عدل و انصاف اور پھر اس وصیت کے، ایمان داری کے ساتھ، اجراء و نفاذ کی ہدایت کی اور روزے کے بیان کے بعد رشوت کے ذریعہ سے حکام کو خریدنے اور اس چیز کو دوسروں کے حقوق کے غصب کا ذریعہ بنانے کی ممانعت فرمائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ایمان باللہ کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک وہ شرک کی ملاوٹ سے پاک ہے، جہاں اس میں شرک ملا زندگی کے لیے اس کی ساری افادیت ختم ہوئی۔ اسی طرح قانون کی ساری افادیت اسی وقت تک ہے جب تک قانون کے نفاذ کے لیے دیانت دار حکام موجود ہیں اور معاشرہ رشوت کی بیماری سے پاک ہے، جہاں رشوت معاشرے میں رواج پائی بس قانون کی افادیت کا جنازہ نکلا۔ اس وضاحت کی روشنی میں غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ گویا ایک ہی حکم کے دو پہلو یہاں مذکور ہوئے۔ ایک کا ذکر روزے سے پہلے کیا، دوسرے کا بعد میں اور روزے کا ذکر دونوں کے بیچ میں رکھ دیا تاکہ نظمِ کلام ہی سے یہ بات واضح ہو جائے کہ جو شخص اپنے آپ کو ان مطامع اور ان خواہشات پر غالب کرنا چاہتا ہے وہ اپنے نفس کی تربیت روزے سے کر کے یہ چڑھائی چڑھ سکتا ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیت تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

آیت ۱۸۸

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ
لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

ع ۲۳ / ۷

ترجمۂ آیت ۱۸۸

اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ اور اس کو حکام رسی کا ذریعہ

نہ بناؤ کہ اس طرح دوسروں کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کر کے ہڑپ کر سکو۔ درانحالیکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو۔

۶۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اکل اموال بالباطل کا مطلب

"وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" اکلِ اموال سے مراد مجرد کھانا نہیں بلکہ اس کا ناجائز استعمال و تصرف ہے۔ باطل، حق کا ضد ہے، جس طرح حق کا لفظ، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، مختلف معنوں میں آتا ہے اسی طرح اس کا ضد بھی مختلف معنوں میں آتا ہے۔ باطل ایک تو عبث اور بے مقصد کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا " (۱۹۱۔ آل عمران) پروردگار تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں بنایا ہے) اس کے دوسرے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جس کی عقل یا فطرت یا شریعت کے اندر کوئی بنیاد نہ ہو۔ مثلاً وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ۵۔ غافر (اور انھوں نے باطل کے ذریعہ سے مخالفت کی تاکہ اس سے حق کو پسپا کریں) اسی طرح باطل اس طریقہ کو کہتے ہیں جو عدل، انصاف، شریعت، معروف اور سچائی کے خلاف ہو۔ اس کے تحت جھوٹ، خیانت، غصب، رشوت، سود، سٹہ، جوا، چوری اور معاملات کی وہ ساری قسمیں آتی ہیں جن کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ کہی گئی ہے۔ دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل آگئی ہے اور پھر مزید تفصیل احادیث میں ہے۔ اسلام میں تمام معاملات کی بنیاد اسی اصول پر ہے۔

ادلاء کا مفہوم

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ۔ اِدْلاء کے اصل معنی کنوئیں میں ڈول ڈالنے کے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ (یوسف) یہیں سے اس کے اندر رسائی اور قربت حاصل کرنے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ جس طرح رسی کے ذریعہ سے ڈول پانی تک پہنچتا ہے اسی طرح مال رشوت بھی حکام تک رسائی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ فرمایا کہ دوسروں کا مال ہڑپ کرنے کے لیے مال کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ اس لیے کہ رشوت حصولِ مال کا جائز ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ اثم یعنی گناہ، حق تلفی اور غصب حقوق کا راستہ ہے وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی اس کا گناہ اور حق تلفی ہونا تمھیں معلوم ہے۔ تمام دنیا کے معروف اور ہر دین و شریعت میں اس کا گناہ ہونا مسلم رہا ہے۔ عقل کے نزدیک بھی اس کا گناہ ہونا ایک امر بدیہی ہے۔

اس جملہ کا عطف پہلے جملہ پر ہے اور چونکہ یہ پہلے جملے ہی کی وضاحت کر رہا ہے اس وجہ سے اس میں حرف 'لا' کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اسی سورہ کی آیت ۴۲ کے تحت ہم اس اسلوب کی بقدرِ ضرورت تشریح کر چکے ہیں۔

رشوت کی حرمت کے مختلف پہلو

یہ آیت رشوت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالتی ہے۔

ایک تو یہ کہ یہ ناجائز طریقہ سے دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہاں دوسروں کا مال ناجائز طریقہ سے کھانے کی ممانعت کے بعد خاص طور پر اسی چیز کا ذکر کیا۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ قانون، جو لوگوں کے حقوق کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کی افادیت کا تمام تر انحصار، جیسا کہ ہم نے فصل کے شروع میں اشارہ کیا احکام کی راست روی اور دیانت پر ہے۔ وہی قانون کے اصلی محافظ ہیں۔ اس وجہ سے اگر ان کو کسی ذریعہ سے بد دیانت بنا دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اب حقوق لکاؤ مال ہیں جس کے پاس پیسے ہوں وہ ان کو خرید سکتا ہے۔ رشوت حکام کو بد دیانت بنانے کا ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ کارگر حربہ ہے۔

دوسرا یہ کہ رشوت کی گرم بازاری میں سب سے زیادہ مؤثر عامل خود معاشرہ ہے۔ جب لوگوں میں دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی غرض پوری کرنے کے لیے رشوت کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس طرح حکام کے منہ کو خون لگا دیتے ہیں۔ پھر جب ان کے منہ رشوت کا خون لگ جاتا ہے تو وہ اس کے ایسے رسیا ہو جاتے ہیں کہ وہ رشوت لیے بغیر لوگوں کو خود ان کے واجبی حقوق بھی نہیں دیتے۔ اس وجہ سے اسلام نے سب سے پہلے خود معاشرے کو یہ راہ اختیار کرنے سے روکا ہے کہ اپنے ہی پہرہ داروں کو خود اپنی ہی بدآموزی سے چور نہ بناؤ۔ اور اس معاملہ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ حکام کو تحفے اور ہدیے پیش کرنے اور ان کے لیے ان کے قبول کرنے کو بھی، جیسا کہ احادیث سے واضح ہے، ناپسند نہیں کیا اس لیے کہ یہ بھی رشوت کا ایک چور دروازہ ہے۔

تیسرا یہ کہ رشوت کا گناہ ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کو سب جانتے ہیں، عقل اس کی گواہ ہے، فطرت انسانی اس کی شاہد ہے، دنیا کا معروف اس پر حجت ہے اور تمام مذاہب و ادیان اس کی حرمت پر متفق ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (اور تم اس بات کو جانتے ہو)

۱۰۶۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۸۹-۲۰۳

اوپر روزے کے بیان کے ساتھ جس پہلو سے ضمناً لوگوں کے مال ہڑپ کرنے اور اس کے لیے رشوت کو ذریعہ بنانے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے، اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اب آگے حج اور جہاد کا بیان آ رہا ہے جن کی مناسبت روزے کے ساتھ کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔

حج بھی درحقیقت ایک جہاد ہے اور جہاد صبر و برداشت کی جن صفات کا متقاضی ہے وہ سب سے بہتر طریقہ پر روزے سے پیدا ہوتی ہیں۔ حج کے بیان کے سلسلہ میں سب سے پہلے ان محترم مہینوں کے احکام و آداب سے متعلق لوگوں کے سوال کو نقل کیا ہے جو حج و عمرہ کے لیے مخصوص اور اشہر حرم

کے نام سے معروف ہیں۔ یہ سوال لوگوں کے ذہنوں میں اس وجہ سے پیدا ہوا ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو امتِ مسلمہ کا قبلہ اور کفار کے قبضہ سے اس کو آزاد کرانا ضروری قرار دیا ہے، جیسا کہ قبلہ کی بحث میں (آیات ۱۴۲-۱۶۰) گزر چکا ہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ حج کے لیے جہاد کے مرحلہ سے گزرنا پڑے گا۔ پھر اس جہاد کے تعلق سے کئی سوالات پیدا ہوئے۔ مثلاً یہ کہ اس جہاد کی نوبت محترم مہینوں میں آئے تو اس کا حکم کیا ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ان محترم مہینوں میں جنگ ہمیشہ سے ممنوع رہی ہے، زمانہ جاہلیت میں بھی عرب ان کا پورا احترام کرتے رہے ہیں اور اسلام نے بھی ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ اگر اس جنگ کی نوبت عین حرم اور حدودِ حرم میں پیش آئے تو اس کا حکم کیا ہوگا؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوا کہ حرم میں جنگ تو درکنار اس میں کسی جاندار کو چھیڑنے کی بھی زمانہ قدیم سے ممانعت تھی۔ اسی طرح جہاد کے تعلق سے انفاق کا سوال بھی سامنے آیا اس لیے کہ جہاد ممکن نہیں ہے جب تک کہ لوگ جان کے ساتھ ساتھ اپنے مال بھی پوری فیاضی سے راہِ خدا میں خرچ کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ انفاق اس انفاق سے زائد ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس طرح گویا حج کے مسئلہ نے اپنے اندر حج کے مسائل و احکام کے ساتھ ساتھ گوناگوں سوالات وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر جہاد، اشہرِ حرم اور انفاق وغیرہ سے متعلق بھی جمع کر لیے۔ ایک ظاہر بین جب ان مختلف قسم کے مسائل کو ایک دوسرے کے ساتھ الجھا ہوا دیکھتا ہے تو اس کو کلام میں بے ربطی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر کوئی شخص اس زمانہ کو پیش نظر رکھ کر اس پورے سلسلہ پر غور کرے جس زمانہ میں یہ احکام اترے ہیں تو اس کو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ یہ ساری باتیں ایک ہی سلسلہ کی مربوط کڑیاں ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸۹-۲۰۳

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ ھِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ
وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِھَا
وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٨٩﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ
يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿١٩٠﴾
وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَيْثُ
اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ
كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٩١﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٩٢﴾
وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ
انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩٣﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ
بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ
فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٩٤﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا
تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٩٥﴾ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ
فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ
الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ
رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ وقفة
فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا
رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ
حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ﴿١٩٦﴾ ع اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ ع ٢٤ ٨
الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ
يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ
رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ
الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا ھَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ
الضَّاۗلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا
اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا
اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۗءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ
يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ
حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ النصف
وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ
فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ
اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

ترجمہ آیات ۸۹ ۔ ۲۰۳

وہ تم سے محترم مہینوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو یہ لوگوں کے فوائد اور حج کے اوقات ہیں۔ اور تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھیں۔ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۱۸۹

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کریں اور حد سے بڑھنے والے نہ ہو۔ بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور ان کو جہاں کہیں تم پاؤ قتل کرو اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس خود پہل کر کے جنگ نہ کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔ پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان کو قتل کرو، یہی کافروں کا بدلہ ہے۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ اور اگر یہ باز آجائیں تو پھر اقدام صرف ان کے خلاف جائز ہے جو ظالم ہیں۔ ۱۹۰-۱۹۳

شہر حرام، شہر حرام کا بدلہ ہے اور اسی طرح دوسری محترم چیزوں کا بھی قصاص ہے، تو جو تم پر زیادتی کریں تم بھی ان کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر ان کو جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ حدودِ الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ۱۹۴

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو۔ اور انفاق خوبی کے ساتھ کرو، بے شک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۱۹۵

اور حج و عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو۔ پس اگر تم گھر جاؤ تو جو ہدی میسّر ہو وہ پیش کر دو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک ہدی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ جو تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اس کے لیے روزے یا صدقہ یا قربانی کی شکل میں فدیہ ہے۔ جب اطمینان کی حالت ہو تو جو کوئی حج تک عمرہ سے فائدہ اٹھائے تو وہ قربانی پیش کرے جو میسّر آئے۔ جس کو میسّر نہ آئے تو وہ تین دن کے روزے دورانِ حج میں رکھے اور سات

دن کے روزے واپسی کے بعد، یہ کل دس دن ہوئے۔ یہ ان کے لیے ہے جن کا گھر در جوارِ حرم

میں نہ ہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اچھی طرح جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۱۹۶

حج کے متعین مہینے ہیں تو جو کوئی ان میں حج کا عزم کرے تو پھر اس کے لیے حج تک نہ

شہوت کی کوئی بات کرنی ہے، نہ فسق و فجور کی، نہ لڑائی جھگڑے کی، اور نیکی کے جو کام بھی

کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے اور اس کے لیے تقویٰ کا زادِ راہ لو۔ بہترین زادِ راہ تقویٰ کا زادِ راہ

ہے اور مجھ سے ڈرتے رہو، اے عقل والو۔ ۱۹۷

اس امر میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے رب کے فضل کے طالب ہو۔ پس جب عرفات

سے چلو تو خدا کو یاد کرو مشعرِ حرام میں ٹھہر کر اور اس کو اس طرح یاد کرو جس طرح خدا نے تم کو

ہدایت کی ہے۔ اس سے پہلے بلاشبہ تم گمراہوں میں تھے۔ ۱۹۸

پھر تم بھی وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلیں اور اللہ سے گناہوں کی معافی مانگو،

بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ۱۹۹

پھر جب تم حج کے مناسک ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو، جس طرح تم پہلے اپنے باپ دادا

کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی

ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں کامیابی عطا کر، حالانکہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں

ہے۔ اور کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی کامیابی عطا فرما

اور آخرت میں بھی اور دوزخ کے عذاب سے بچا۔ یہی لوگ ہیں جن کو ان کے کیے کا حصہ

ملنا ہے اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۲۰۰-۲۰۲

اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ سو جو دو ہی دنوں میں اٹھ کھڑا ہوا اس پر کوئی گناہ

نہیں اور جو ٹھہرا رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ۔ یہ رعایت ان کے لیے ہے جو تقویٰ کو ملحوظ رکھیں ، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ تم اسی کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۲۰۳

۶۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِھَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۱۸۹)

اھلّۃ سے مراد — اَھِلّۃ ہلال کی جمع ہے ۔ ہلال شروع ماہ کے چاند کو بھی کہتے ہیں اور اس سے مراد مہینہ بھی ہوتا ہے ۔ خاص طور پر جمع کی صورت میں تو اس کا استعمال مہینوں ہی کے لیے معروف ہے ۔ اہلّہ پر الف ، لام اس بات کی دلیل ہے کہ سوال کچھ مخصوص مہینوں سے متعلق ہے اور سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال اشہر حرم اور ان کے احکام و آداب سے متعلق تھا ۔ چنانچہ آگے کی آیات میں اس سوال کے جو جواب

سوالات نقل کرنے میں قرآن کا طریقہ — دیئے ہیں وہ تمام تر حج اور اشہر حرم ہی سے متعلق ہیں ۔ قرآن مجید میں ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں ، سائلوں کے سوالات چونکہ اجمال و اختصار کے ساتھ نقل ہوئے ہیں اس وجہ سے عام اہلِ تاویل کو یہ گمان ہوا کہ یہ سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق تھا ۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے ۔ اس کے صحیح نہ ہونے کے مختلف وجوہ ہیں جن میں سے بعض کا ہم ذکر کریں گے ۔

اول یہ کہ اس قسم کا سائنسی اور فلکیاتی سوال عربوں کے مذاق اور ان کی عام افتادِ مزاج کے خلاف ہے ۔ اہل عرب سورج اور چاند کو خدا کی مخلوق اور اس کے قانون طبیعی کے تحت ان کو مسخر اور محکوم مانتے تھے پھر اس نامعقول سوال کی کیا گنجائش تھی کہ چاند گھٹتا بڑھتا کیوں ہے ؟ وہ خود سمجھ سکتے تھے کہ یہ سوال پیغمبر کو زچ کرنے والا نہیں بن سکتا ، وہ بڑی آسانی سے اس کا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ یہ خدا کے حکم سے گھٹتا بڑھتا ہے اور یہ اس کے مسخر و محکوم ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل ہے ۔ یہ جواب اس سے پہلے مختلف اسلوبوں اور شکلوں میں مکی سورتوں میں دیا بھی جا چکا تھا بلکہ وہ دلیلیں بھی ان کے سامنے موجود تھیں جو چاند کے طلوع و غروب سے حضرت ابراہیم نے توحید کے حق میں نکالی تھیں ۔ پھر اس قسم کے سوال کا کیا موقع تھا ؟

دوسری یہ کہ یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ سوال عام عربوں یا اہل کتاب کی طرف سے نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی طرف سے ہے ۔ مسلمانوں کی طرف سے چاند یا سورج کے گھٹنے بڑھنے کا سوال ایک بالکل ہی بعید از قیاس سوال ہے ۔ وہ سوال کر سکتے تھے تو مہینوں کے احکام و آداب سے متعلق کر سکتے تھے نہ کہ ایک بالکل ہی غیر ضروری اور لایعنی سوال ۔

تیسری یہ کہ اگر سوال چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق ہوتا تو یہ یوں نقل ہوتا کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْهِلَالِ (وہ تم سے چاند کے بابت سوال کرتے ہیں) یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ کے الفاظ نہ ہوتے کیونکہ اس کے معروف معنی تو، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہوں گے کہ وہ تم سے مخصوص مہینوں کی بابت سوال کرتے ہیں۔

چوتھی یہ کہ قرآن نے یہ سوال نقل کر کے اس کے جو جوابات دیے ہیں وہ تمام تر جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، حج اور اشہر حرم کے احکام و آداب ہی سے متعلق ہیں، ان میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علت کی طرف نہیں ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ قرآن نے ان کے اس سوال کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اس وجہ سے اس سے بالکل صرف نظر کر کے ان کو مہینوں سے متعلق کچھ مفید باتیں بتا دیں تو کم از کم یہاں کوئی اشارہ اس بات کی طرف ضرور ہونا تھا کہ لوگوں کو غیر ضروری سوالات نہیں کرنے چاہئیں جیسا کہ دوسرے بعض مقامات پر اس قسم کی تنبیہ لوگوں کو کی گئی ہے۔

سوال اشہر محرم سے متعلق تھا

بہر حال ہمارے نزدیک اس سوال کا کوئی تعلق بھی چاند اور اس کے اتار چڑھاؤ سے نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان محترم مہینوں سے اس کا تعلق ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے محترم چلے آ رہے تھے اور جن میں لڑنا بھڑنا جاہلیت کے زمانے میں بھی حرام سمجھا جاتا تھا۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا کہ خانہ کعبہ کے قبلہ قرار پا جانے اور کفار کے قبضہ سے اس کا چھڑانا ضروری ہو جانے کے بعد ان کے احترام کے ملحوظ رکھنے کے حدود و قیود کیا ہوں گے؟ اس سوال کو قرآن نے اجمال کے ساتھ نقل کر کے اس کا تفصیل کے ساتھ جواب دیا ہے اوپر آیت ۱۰۸ کے تحت ہم یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ قرآن میں بالعموم لوگوں کے سوالات نہایت اختصار کے ساتھ نقل ہوتے ہیں اور یہی بلاغت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ سوال کی اصلی نوعیت تو خود اس جواب ہی سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے جو اس کے بعد دیا جاتا ہے، پھر سوال کے نقل کرنے میں طول بیان کی کیا ضرورت ہے؟ یہی اسلوب عربی زبان میں پسندیدہ اسلوب ہے، دوسری زبانوں میں بھی ماہرین زبان کا معروف طریقہ یہی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قرآن میں اس اختصار کی وجہ سے لوگوں کو تاویل میں الجھنیں پیش آئیں۔ بہت سے لوگوں نے سوال کی نوعیت جواب سے متعین کرنے کے بجائے خود سوال کے مجمل الفاظ سے کرنے کی کوشش کی اور اس طرح انھوں نے سوال اور جواب میں ”سوال از آسمان جواب از ریسمان“ کی شتر گربگی پیدا کر دی۔ لیکن یہ قرآن کا قصور نہیں ہے بلکہ تاویل کرنے والوں کا اپنا قصور ہے۔

قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ، یہ سوال کے جواب کا ایک حصہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ محترم مہینے لوگوں کی عوامی بہبود اور خاص کر حج و عمرہ کی سہولتوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ ہم اوپر قبلہ کی بحث میں یہ وضاحت کر آئے ہیں کہ اشہر حرم نہ صرف عبادت کے نقطۂ نظر سے اہل عرب کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے بلکہ ان کی معاشی و تجارتی سرگرمیوں کا تمام تر انحصار بھی انھیں مہینوں پر تھا۔ اہل عرب زمانہ جاہلیت

میں سارا سال لڑنے بھڑنے میں گزارتے اس وجہ سے ملک میں تجارتی نقل و حرکت تقریباً معطل رہتی۔ یہ صرف اشہر حرم کا فیض تھا کہ سال میں پورے چار مہینے امن و امان سے گزرتے اور ان مہینوں میں اہل ملک حج و عمرہ کی برکتوں سے بھی سعادت اندوز ہوتے اور ملک و بیرونِ ملک کی تجارتی منڈیوں تک بھی بغیر کسی خطرہ کے پہنچتے اور ان سے لین دین کرتے، بالخصوص قریش کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے تو یہ مہینے گویا بہار کے مہینے تھے۔ سارا عرب ان مہینوں میں مکہ کا رخ کرتا اور یہ وادی غیر ذی زرع سارے ملک کی تجارت کا مرکز بن جاتی۔ خانہ کعبہ اور اشہر حرم کی روحانی برکتوں کے ساتھ ساتھ قرآن نے ان کی ان مادی برکتوں کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے اور قریش کو اپنے اس احسانِ عظیم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ یعنی ان محترم مہینوں کے اندر لوگوں کے لیے گوناگوں فوائد و مصالح مضمر ہیں اس وجہ سے ان کا احترام ہر حال میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ اس عام فائدے کے ذکر کے بعد اس کے خاص فائدہ — حج — کا بھی ذکر فرمایا کہ یہی مہینے ہیں جن میں لوگ امن و امان کے ساتھ اس سنت ابراہیمیؑ کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ یہ پہلو بھی خاص طور پر ان کی حرمت کا متقاضی ہے۔

ایک تجدیدی اصلاح

"وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ" یہ حج کے ذکر کے ساتھ اسی طرح کی ایک تجدیدی اصلاح و تنبیہ ہے جس طرح کی اصلاحی و تجدیدی تنبیہ و تذکیر آیت ۱۷۷ میں دین کی بنیادی باتوں کے ذکر کے ساتھ گزر چکی ہے کہ تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم مشرق و مغرب کی طرف رخ کرو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو ایمان لائیں ...... یہاں ارشاد ہوا کہ تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھیں۔

اہل عرب کی حج کے سلسلہ کی بدعتیں

امتوں کی یہ عام بیماری رہی ہے کہ آہستہ آہستہ لوگ دین کے اصلی احکام و فرائض تو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور ان کی خانہ پری بدعات و رسوم سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اہل عرب پر بھی یہی گزری۔ یہ لوگ حج تو زمانۂ جاہلیت میں بھی کرتے رہے لیکن اس کی اصل روح سے اس کو بالکل خالی کر کے اور رسوم و اوہام کا ایک گورکھ دھندا بنا کر۔ ازاں جملہ انھوں نے حج کے سلسلہ میں یہ بدعت ایجاد کر لی تھی کہ حج کے لیے احرام باندھ چکنے کے بعد اگر انھیں گھروں میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آتی یا حج کے بعد جب گھروں کو واپس ہوتے تو ان دروازوں سے گھروں میں داخل نہ ہوتے جن دروازوں سے نکلتے بلکہ مکانوں کے پچھواڑوں سے کسی دوسرے راستے سے داخل ہوتے۔ اس عجیب و غریب حرکت کا محرک یہ وہم رہا ہوگا کہ جن دروازوں سے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے نکلے ہیں، پاک ہو جانے کے بعد انھی دروازوں سے گھروں میں داخل ہونا خلاف تقویٰ ہوگا۔ یہ وہم اسی طرح کا ایک وہم تھا جس طرح کے وہم میں وہ طواف کے معاملہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بہت سے عرب جاہلیت میں ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ غالباً ان کا خیال یہ رہا ہوگا کہ لباس، جو زینت و آرائش کی چیزوں میں داخل ہے، اس کی کوئی دھجی بھی زہد و رہبانیت کی اس عبادت میں جسم سے لگی کیوں رہ جائے۔

قرآن نے اس بدعت کی تردید کی اور فرمایا کہ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو، اس سے تقویٰ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا البتہ آخرت کی فلاح اور خدا کی خوشنودی مطلوب ہے تو اس کے حدود کی پاسداری ملحوظ رکھو اور اس سے برابر ڈرتے رہو۔ حج سے اصل مقصود یہی تقویٰ ہے۔

اشہر حرم میں دفاعی جنگ جائز ہے

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۱۹۰)

یہ مسلمانوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ اگر حج کے سلسلہ میں جنگ کی نوبت آجائے تو اشہر حرم میں دفاعی جنگ جائز ہے۔ البتہ حدود سے تجاوز اللہ کو پسند نہیں ہے۔ یعنی نہ تو یہ بات جائز ہے کہ تم خود اشہر حرم میں جنگ کے لیے پہل کرو اور نہ یہ جائز ہے کہ مدافعت کے لیے جتنی کارروائی ضروری ہے، اس سے آگے کوئی قدم اٹھاؤ البتہ مدافعت کرنے کے تم پورے طور پر مجاز ہو، اشہر حرم یا خود حرم کا احترام اس میں کسی پہلو سے مانع نہیں ہے بلکہ یہ عین ان کے احترام کا تقاضا ہے۔ اس نکتہ کی تفصیل آگے کی آیات میں آ رہی ہے۔

حج کے ذکر کے ساتھ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہوئی کہ اس وقت تک حرم پر مشرکین کا قبضہ تھا اس وجہ سے اس بات کا اندیشہ نہایت قوی تھا کہ اگر مسلمان حج کے لیے جائیں گے تو کفار روکیں گے اور جنگ کی نوبت آجائے گی۔ بالخصوص جب کہ مشرکین پر اس دوران میں یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ مسلمانوں نے بیت اللہ کو اپنا قبلہ قرار دے لیا ہے اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے اس گھر کی تولیت کے اصلی وارث وہی ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ضروری ہوا کہ مسلمانوں کو حرم اور اشہر حرم کے احکام و آداب سے متعلق وہ ضروری ہدایات دے دی جائیں جو آگے کے امکانی حالات میں ان کی رہنمائی کر سکیں۔ یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ حرم اور اشہر حرم کے احترام کے باب میں پوری قوم عرب کے احساسات نہایت نازک تھے۔ ان میں لڑنا بھڑنا سب ہی کے نزدیک سب سے بڑی معصیت تھی اس وجہ سے مسلمان بھی اس وقت تک ان میں کسی جنگ کے لیے، اگرچہ وہ مدافعت ہی کیوں نہ ہو، تیار نہیں ہو سکتے تھے جب تک قرآن اس کی اجازت نہ دے۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ (۱۹۱)

یعنی بیت اللہ کا حج تم پر فرض ہے اور ملت ابراہیمؑ کے اصلی وارث ہونے کی حیثیت سے یہ تمہارا حق بھی ہے بلکہ اس کے اصلی حق دار تم ہی ہو اس وجہ سے اگر تمہارے اس حق و فرض کی راہ میں قریش مزاحم ہوں تو ان کا مقابلہ کرو اور جہاں کہیں ان سے تصادم ہو وہیں ان کو قتل کرو۔ اگرچہ اس قتال کی نوبت حرم اور حدودِ حرم ہی میں پیش آجائے اور جس مکہ سے انھوں نے تم کو نکالا ہے تم بھی ان کو وہاں سے نکالو، اس لیے کہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی وراثت صرف نسل و نسب کی بنا پر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ خود حضرت ابراہیم

کے ارشاد کے بموجب اس کے اصلی حق دار وہ ہیں جو ان کی ملت پر قائم ہیں۔ یہ درجہ تم کو حاصل ہے نہ کہ ان کو۔ اس وجہ سے اس گھر سے نکالے جانے کے مستحق وہ ہیں نہ کہ تم۔

'فتنہ' کا مفہوم

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (اور فتنہ قتل سے بھی بڑا جرم ہے) فتنہ کے معنی یہاں کسی کو جبر و ظلم سے اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ انگریزی میں اس کو (Persecution) کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۱۰۔ بروج (بے شک جن لوگوں نے ایمان لانے والوں اور ایمان لانے والیوں کو دین سے پھیرنے کے لیے اذیتیں پہنچائیں ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے) عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۸۳۔ یونس (فرعون اور اس کے درباریوں سے ڈرتے ہوئے کہ مبادا وہ ان کو مصیبت میں مبتلا کر دیں) ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ۱۱۰۔ نحل (پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ہجرت کی بعد اس کے کہ وہ طرح طرح کی ایذاؤں میں مبتلا کیے گئے)

اوپر کی اجازت کی دلیل

اوپر مشرکین قریش سے قتال کی جو اجازت دی گئی ہے یہاں تک کہ اگر حدود حرم اور اشہر حرم میں بھی وہ جنگ کریں تو ان کو قتل کرنا اور مکہ سے ان کو بے دخل کرنا جائز ٹھہرایا گیا ہے، یہ اس کی دلیل ارشاد ہوئی ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چند حدود حرم اور اشہر حرم میں قتل و قتال بڑی سنگین بات ہے لیکن جس گھر میں اللہ کے بندوں اور بندیوں کو اس بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان کیوں لائے، یہ ظلم و ستم اس قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ اس سنگین تر فتنہ کو مٹانے کے لیے تمھیں یہ اجازت دی جاتی ہے کہ اگر نوبت جنگ پیش آ جائے تو تم کفار کو ترکی بہ ترکی جواب دو اور جہاں کہیں وہ تمھارے مقابل میں آئیں ان کو قتل کر دو۔ یہ چیز نہ احترام حرم کے منافی ہے نہ حرمت اشہر حرم کے۔

احتیاط کی تاکید

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ۔ یہ تاکید ہے اس بات کی کہ مسلمان مسجد حرام کے پاس جنگ میں پہل نہ کریں۔ ہاں اگر ان کو مسجد حرام سے روکنے کے لیے ان پر کفار کی طرف سے حملہ کیا جائے تو اس کا منہ توڑ جواب دیں۔ مسجد حرام کا احترام ایک مشترک ذمہ داری ہے اگر کفار مسلمانوں کی دشمنی میں اس کے احترام کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں تو پھر وہ خود بھی اس کے احترام کے نام پر کسی رعایت کے مستحق نہیں رہتے ہیں۔ یہ درحقیقت ان کے اپنے کیے کی سزا ہے۔ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ یعنی ایسے کافروں کا ایسا ہی بدلہ ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۹۲)

'فان انتهوا' کا مطلب

"پس اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ غفور رحیم ہے۔" "باز آ جائیں" سے مراد صرف جنگ سے رک جانا نہیں ہے۔ یہاں اس "باز آ جانے" کا صلہ یہ بتایا ہے کہ "پھر اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔" ظاہر ہے کہ کفار اگر مسلمانوں سے جنگ نہ کریں تو اس کا زیادہ سے زیادہ صلہ یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان بھی ان کو مہلت دیں اور بالفعل ان

سے جنگ نہ کریں، یہ مطلب تو اس کا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام کفر و فسق معاف کر دے۔ اس وجہ سے یہاں باز آجانے سے مقصود اس عناد و مخالفت، اور اس جبر و ظلم (PERSECUTION) سے باز آجانا ہے جس کے قریش مرتکب ہو رہے تھے اور جس کے ذریعہ سے انھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا تھا۔ اور ساتھ ہی بیت اللہ سے مسلمانوں کو روکنے سے باز آجانا ہے جس کے وہ کسی پہلو سے بھی حق دار باقی نہیں رہ گئے تھے۔

کفار قریش اور مسلمانوں کی نزاع

اس سورہ میں قبلہ کی بحث سے لے کر یہاں تک کے مباحث پر اگر آپ کی نظر ہے تو یہ حقیقت آپ سے مخفی نہیں ہو سکتی کہ یہ ساری بحث عام کفار سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق خاص کفار قریش سے ہے۔ ان کی اور مسلمانوں کی نزاع کسی جزوی معاملہ کے لیے محض ایک وقتی نزاع نہیں تھی بلکہ اصلاً یہ نزاع بیت اللہ کی تولیت کے لیے تھی۔ قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت ابراہیم کے بنائے ہوئے اس گھر کی تولیت کے اصل حقدار اہل ایمان ہیں نہ کہ کفار و مشرکین جنھوں نے اس گھر کو اس کے بنیادی مقاصد کے بالکل خلاف شرک و کفر کا ایک گڑھ بنا کے رکھ دیا ہے۔ قرآن کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور وعدہ الٰہی کے بموجب جس آخری نبی کے ذریعہ سے اس گھر کے مقاصد کی تجدید و تکمیل ہونی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی نے اس وعدے کی تکمیل کر دی اور اب یہ لازمی ہے کہ یہ گھر کفار و مشرکین کے تسلط سے آزاد اور کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک ہو کر ملت ابراہیم ــــ اسلام ــــ کا مرکز اور تمام اہل ایمان کا قبلہ بنے۔ یہ دعویٰ جن دلائل و براہین اور جس زور و قوت کے ساتھ اس پوری سورت میں پیش ہوا ہے اس میں کہیں کسی لچک اور کسی نرمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ واضح الفاظ میں بات یوں کہی جا سکتی ہے کہ بیت اللہ کو کفار کے قبضہ سے چھڑانا اور اس کو شرک و کفر کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے از سر نو اس کو توحید اسلام اور ملت مسلمہ کا مرکز بنانا رسالت محمدی کا اصلی نصب العین تھا اور اس نصب العین کا حصول ہی گویا آنحضرت صلعم کے مقدس مشن کا آخری کام تھا۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ فَاِنِ انْتَهَوْا کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ کفار قریش جنگ سے رک جائیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی ان تمام مخالفانہ و معاندانہ حرکتوں سے، جن کے وہ آج اس دعوت حق کی مزاحمت کے لیے مرتکب ہو رہے ہیں، باز آکر اس کے حامی و معاون بن جائیں۔ اگر وہ یہ راہ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے وہ تمام جرائم معاف کر دے گا جن کے وہ اب تک مرتکب ہوئے ہیں۔ بعینہٖ یہی بات کفار قریش ہی کو مخاطب کر کے سورۂ انفال میں یوں فرمائی گئی ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا	ان کافروں کو بتا دو کہ اگر وہ باز آگئے تو جو کچھ وہ
يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا	پہلے کر چکے ہیں وہ معاف کر دیا جائے گا اور اگر انھوں نے
فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ٥	پھر اسی طرح کی حرکتوں کا اعادہ کیا تو ہمارے اس طریقہ

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۸-۳۹- انفال)

کو یا درکھیں جو ہم نے پچھلی قوموں کے معاملے میں اختیار کیا اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ بالکل باقی نہ رہ جائے اور اس سرزمین پر سارا دین صرف اللہ کا ہو جائے۔ پس اگر وہ باز رہے تو جو کچھ وہ کریں گے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

یہی حقیقت سورۂ توبہ میں اس طرح واضح کی گئی ہے کہ بیت اللہ کی تولیت میں کفار قریش کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ یہ خاص مسلمانوں کا حق ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ (۱۷-۱۸- توبہ)

مشرکین کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے منتظم بنے رہیں جب کہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال اکارت ہیں اور یہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کے منتظم تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی چیز سے نہ ڈریں۔ انھی لوگوں کے متعلق توقع ہے کہ وہ بامراد ہوں۔

یہی خاص پہلو ہے جس کے سبب سے عام کفار کے برخلاف کفار قریش کے لیے یہ حکم ہوا کہ جب تک یہ توبہ کر کے نماز نہ قائم کریں اور زکوٰۃ نہ دیں اس وقت تک ان کے لیے کوئی ڈھیل نہیں ہے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵- توبۃ)

پس جب اشہر حرم گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور ان کے لیے ہر گھات میں بیٹھو۔ پس اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں ہم ان اجمالی اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں ان شاء اللہ کفار قریش کے اس مسئلہ پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (۱۹۳)

سرزمین حرم میں اسلام کے سوا کسی اور دین کے لیے گنجائش نہیں

اس آیت سے اوپر والی آیت کے مضمون کی مزید وضاحت ہوگئی کہ کفار قریش سے یہ جنگ اس وقت تک جاری رہنی ہے جب تک سرزمین حرم پر فتنہ کا کوئی اثر باقی ہے اور اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین یہاں قائم ہے۔ یہ گھر صرف اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا تھا اس لیے اللہ کے دین کے سوا کسی دوسرے دین کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اور اب یہ کام حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور اللہ کے وعدے کے مطابق ہونا ہے، کفار اس کو پسند کریں یا ناپسند۔ اسی بات کو سورۂ صف میں یوں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی — وہی خدا ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا اپنی ہدایت
وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ — اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس دین کو سارے دینوں
كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ٥ (٩- صف) — پر غالب کرے، اگرچہ مشرکین اس چیز کو ناپسند کریں۔

رسولوں کے باب میں سنت الٰہی

"وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ" کا صحیح موقع و محل اور اس کا اصلی زور سمجھنے کے لیے یہاں بالاجمال اس سنت اللہ کو سمجھ لینا ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے باب میں پسند فرمائی ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو وہ رسول اس قوم کے لیے خدا کی آخری اور کامل حجت ہوتا ہے۔ جس کے بعد کسی مزید حجت و برہان کی اس قوم کے لیے ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ قوم ایمان نہیں لاتی بلکہ تکذیب رسول اور عداوت حق ہی پر اڑی رہ جاتی ہے تو وہ فنا کر دی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی عذاب کے ذریعہ سے فنا ہو یا حق کے اعوان و انصار اور رسول کے ساتھیوں کے ہاتھوں اور عام اس سے کہ یہ واقعہ رسول کی زندگی ہی میں ظہور میں آئے یا اس کی وفات کے بعد۔ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ، جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا اور اس مضمون کی دوسری آیات میں اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے اور اس کے ظہور کے لیے قرآن میں ایک مخصوص ضابطہ بیان ہوا ہے جس کی تفصیل کے لیے موزوں مقامات ہماری اس کتاب میں آئیں گے۔[1]

اسی سنت اللہ کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ اس آخری رسالت کے مقصد کی تکمیل اس بات پر ہونی ہے کہ سرزمین حرم پر دین حق کے سوا اور کوئی دین باقی نہیں رہنے پائے گا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے کفار عرب کے سامنے، جن کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت براہ راست تھی اور جو بیت اللہ پر بالکل ناجائز طور پر قابض تھے، صرف دو ہی راہیں باقی رکھی تھیں۔ یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔ دوسرے کفار کی طرح ان کے لیے جزیہ کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ جب اتمام حجت کا تقاضا پورا ہو گیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی کی اور بیت اللہ پر قبضہ کر کے اس کو کفر و شرک کی تمام آلائشوں سے بالکل پاک کر دیا اور جَآءَ

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ ہم نے یہاں جس سنت اللہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا تعلق خاص طور پر رسولوں سے ہے، ان انبیاء سے نہیں ہے جو صرف نبی تھے رسول نہیں تھے۔ نبی اور رسول کے اس فرق پر بھی مفصل بحث اپنے مقام میں آئے گی

اَلْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا اعلان فرما دیا۔

حرم الٰہی کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کا فرض

پھر حرم الٰہی کو مستقل طور پر کفر و شرک کے غلبہ سے پاک رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ اس پورے علاقہ کو غیر اسلامی قبضہ یا مداخلت سے بالکل محفوظ کر دیا جائے جس میں یہ حرم واقع ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے جزیرہ عرب کے متعلق یہ ہدایت دے دی کہ لَا يَجْتَمِعُ فِيْهِ دِيْنَانِ اس میں دین حق کے ساتھ کوئی اور دین جمع نہیں ہو سکتا۔ اور آخر وقت میں آپ نے یہود و نصاریٰ کو بھی اس سرزمین سے نکال دینے کی وصیت فرمائی جس کی تعمیل حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں کی۔ یہ تدبیر مرکز اسلام کے سیاسی تحفظ کے لیے ضروری تھی اور یہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس گھر کے تحفظ کے لیے ہمیشہ بیدار رہیں اور کسی بھی غیر اسلامی طاقت کے قدم اس سرزمین پر جمنے نہ دیں۔

عربی زبان کا ایک اسلوب

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ۔ اِنْتَهَوْا کا مفہوم ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ عدوان کے اصلی معنی تو تعدی اور زیادتی کے ہیں لیکن یہاں یہ لفظ مجرد اقدام (aggression) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں کبھی کبھی بعض الفاظ محض مجانست و ہم آہنگی کے لیے استعمال ہو جاتے ہیں۔ ان کا مفہوم موقع و محل سے متعین ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوا (ہم نے ان کو بدلہ دیا جیسا کہ انھوں نے ہمارے ساتھ کیا) ظاہر ہے کہ یہاں دانوا محض دِنَّا کی مشابہت کی وجہ سے لایا گیا ہے ورنہ موقع فَعَلُوْا یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا ہے۔ یا قرآن میں ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (برائی کا بدلہ اسی کے مانند بدلہ ہے) ہر شخص جانتا ہے کہ کسی برائی کا بدلہ کوئی برائی نہیں ہے لیکن محض سابق لفظ کی ہم آہنگی کی وجہ سے جرم کے ساتھ اس کی سزا کو بھی سَيِّئَةٌ سے تعبیر کر دیا۔ اسی طرح آگے والی آیت میں ہے فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ (جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کی زیادتی کے برابر اس کے خلاف اقدام کرو) اس آیت میں کسی کی زیادتی کے جواب میں جو اقدام کیا جائے اس کو بھی اعتدا کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ یہ معنی میں محض اقدام کے ہے، صرف اپنے ماسبق کے ساتھ ہم آہنگی کی وجہ سے اس شکل میں استعمال ہوا۔ عربی زبان کے اسی معروف اسلوب کے مطابق زیر بحث آیت میں بھی لفظ عدوان استعمال ہوا لیکن مراد اس سے مجرد وہ اقدام ہے جو جوابی کارروائی کے طور پر کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز آ کر اسلام کی راہ اختیار کر لیں تو ان کے پچھلے جرائم کی بنا پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو گی، پھر صرف انھی کے خلاف کوئی اقدام ہو گا جو اپنے کفر و شرک اور اپنے ظلم و عدوان پر جمے رہ جائیں۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۱۹۴

اوپر بیان کیے ہوئے احکام کی یہ دلیل ارشاد ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اشہر حرم میں یا حدود حرم میں لڑائی

بھڑائی ہے تو بہت بڑا گناہ لیکن جب کفار تمہارے لیے اس کی حرمت کا لحاظ نہیں کرتے تو تمہیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ قصاص کے طور پر تم بھی ان کو ان کی حرمت سے محروم کردو۔ ہر شخص کی جان شریعت میں محترم ہے لیکن جب ایک شخص دوسرے کی جان کا احترام نہیں کرتا، اس کو قتل کر دیتا ہے تو اس کے قصاص میں وہ بھی حرمتِ جان کے حق سے محروم کر کے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اشہر حرم اور حدود حرم کا احترام مسلم ہے بشرطیکہ کفار بھی ان کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان میں دوسروں کو ظلم و ستم کا ہدف نہ بنائیں لیکن جب ان کی تلواریں ان مہینوں میں اور اس بلد امین میں بے نیام ہوتی ہیں تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے قصاص میں وہ بھی ان کے امن و احترام کے حقوق سے محروم کیے جائیں۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اشہر حرم کا یہ قصاص ضروری ہے، اسی طرح دوسری حرمتوں کا قصاص بھی ہے۔ یعنی جس محترم چیز کے حقوق حرمت سے وہ تمہیں محروم کریں تم بھی اس کے قصاص میں اس کے حق حرمت سے انھیں محروم کرنے کا حق رکھتے ہو۔ پس جس طرح کے اقدامات حرم اور اشہر حرم کی حرمتوں کو برباد کر کے وہ تمہارے خلاف کریں، تم ان کے جواب ترکی بہ ترکی دو۔ البتہ تقویٰ کے حدود کا لحاظ رہے۔ کسی حد کے توڑنے میں تمہاری طرف سے پیش قدمی نہ ہو اور نہ کوئی اقدام حدِ ضرورت سے زائد ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت انھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ہر طرح کے حالات میں اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (١٩٥)

انفاق کا حکم جہاد کے لیے

انفاق کا یہ حکم، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس جہاد کے لیے ہے جس کا یہاں حکم دیا گیا ہے۔ جہاد، جان اور مال دونوں کی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے، اس وجہ سے قرآن میں جہاں کہیں بھی جہاد و قتال کا بیان ہوا ہے انفاق کا حکم بھی اس کے ساتھ ضرور جڑا ہے۔ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (اور تم جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے)

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ میں بِاَيْدِيْكُمْ کے الفاظ سے ایک ایسے شخص کی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے، کسی دریا یا غار میں چھلانگ لگا رہا ہو۔ بعض عرب شاعروں نے بھی یہ اسلوب استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے سے جی چراتے ہیں بظاہر تو وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خطرات سے بچا رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہلاکت کے جہنم میں جھونکتے ہیں۔ انسان کے لیے زندگی اور بقا کا اصلی خزانہ خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی ہی ہے نہ کہ ان کے سینتنے اور بچانے میں۔ قرآن نے جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف اشارے کیے ہیں۔ سورۂ توبہ میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا — اور وہ عنقریب تمہیں اللہ کی قسمیں کھا کر یقین دلائیں گے

لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ (۴۲-توبہ)

کہ اگر ہم سامان کر پاتے تو ضرور آپ کے ساتھ جہاد کے لیے نکلتے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ہلاکت میں جھونک رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔

اس آیت میں یُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ کے الفاظ سے اسی بخل اور بزدلی کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے بچنے کی تاکید وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کے ٹکڑے میں فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کو زندگی اور مال کے حریص کامیابی سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہ موت اور ہلاکت ہے۔

'انفاق اور احسان' کا مفہوم

وَأَحْسِنُوا کا عطف أَنْفِقُوا پر ہے۔ یہاں احسان کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو اور وہ مال خرچ کرو جو تمھیں عزیز و محبوب ہو۔ انفاق کے معاملے میں اس احسان کی تاکید قرآن نے جگہ جگہ فرمائی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝ (۲۶۷-بقرہ)

اے ایمان والو، ان پاکیزہ مالوں سے خرچ کرو جو تم نے تجارت وغیرہ سے کمائے ہوں اور جو ہم نے زمین سے تمہارے لیے پیدا کیے ہیں اور اس میں سے بُرے مال کے خرچ کرنے کا خیال نہ کرو، جسے خرچ تو کرو لیکن اگر وہی مال تمھیں لینا پڑ جائے تو آنکھ میچے بغیر نہ لے سکو اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ رکھو کہ اللہ بے نیاز اور حمید ہے۔

انفاق میں جب تک اللہ تعالیٰ کے لیے یہ جوش و جذبہ اور یہ احتیاط شامل نہ ہو اس وقت تک اس کو احسان کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے مال کا محتاج نہیں ہے۔ وہ سب سے بے نیاز و بے پروا ہے۔ البتہ ہم خود اس کے جود و کرم کے ہر وقت محتاج ہیں۔ وہ اگر ہم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے تو اپنے لیے نہیں بلکہ خود ہمارے لیے کرتا ہے تاکہ اس طرح وہ ہمارے خلوص کا امتحان کرے اور ہمارے خزف ریزوں کو قبول فرما کر ان کو ایک ابدی اور لازوال خزانے کی شکل میں ہمیں ایک دن واپس لوٹائے۔

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۖ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۚ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذَٰلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۱۹۶)

'عمرہ' کی نوعیت

جس طرح فرض نمازوں کے ساتھ سنتیں اور نوافل ہیں جن سے اصل نماز کے لیے طبیعت میں بیداری

اور آمادگی بھی پیدا ہوتی ہے اور اگر اس میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو ان سے اس کسر کا جبر بھی ہوتا ہے اسی طرح عمرہ کی نوعیت بھی حج کے لیے ایک ریہرسل کی ہے۔ اس سے حج کے لیے طبیعت میں آمادگی بھی پیدا ہوتی ہے اور بعض حالات میں اس کے کسر کا جبر بھی ہوتا ہے۔ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ لفظ تعمیر، رونق اور آبادی کے مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کے گھر کی رونق بھی ہے اور دلوں کی زندگی اور بیداری بھی۔ اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آیت ۱۹۶ کا اصلی مفہوم

"اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ لِلّٰہِ" میں اصل زور لِلّٰہِ کے لفظ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب جنگ و جہاد کے مراحل سے گزر کر حج و عمرہ کی سعادت حاصل ہو تو تم یہ حج و عمرہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے لیے پورا کرو۔ اس تاکید و تنبیہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حج و عمرہ تو اہل عرب اسلام سے پہلے بھی کیا کرتے تھے لیکن یہ حج و عمرہ صرف اللہ واحد کے لیے نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں ان کے وہ معبودانِ باطل بھی شریک تھے جن کے بت انھوں نے عین بیت اللہ میں بھی اور مناسک حج کے دوسرے مقامات میں بھی نصب کر رکھے تھے۔ چنانچہ جب یہ حرم میں نماز کے لیے جاتے یا حج و عمرہ کے قصد سے وہاں پہنچتے تو ان کے پیش نظر صرف اللہ ہی کی عبادت نہ ہوتی بلکہ اللہ سے زیادہ ان بتوں کی خوشنودی اور ان کی پرستش ہوتی۔ وہ ان کی پوجا بھی کرتے، ان کے آگے نذر و نیاز بھی پیش کرتے اور ان کے لیے قربانیاں بھی کرتے۔ چونکہ آیت زیر بحث کے نزول کے وقت یہ حالات مکہ میں موجود تھے اس لیے مسلمانوں کو یہ تاکید کی گئی کہ جب تم حج و عمرہ کرو تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرو، اس میں کسی شرک و بدعت کی کوئی آلائش شامل نہ ہونے پائے۔ اس حقیقت کی طرف سورۂ کوثر میں بھی ارشاد فرمایا ہے "اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ، فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ" (ہم نے تمھیں کوثر عطا کیا تو تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور اسی کے لیے قربانی کرو) مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر سورۂ کوثر میں وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ کوثر سے یہاں مراد خانہ کعبہ ہے، جو آخرت کے حوض کوثر کا اس دنیا میں مجاز ہے اور اللہ ہی کے لیے نماز اور قربانی کی تاکید اس لیے ہوئی کہ اسلام سے پہلے نماز اور قربانی دونوں ہی بیشتر غیر اللہ کے لیے تھیں۔

علاوہ ازیں "لِلّٰہِ" پر زور دینے کی ایک دوسری وجہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ اہل عرب کے لیے حج و عمرہ عبادت سے زیادہ تجارت کا ذریعہ بن گئے تھے۔ ان کے لیے ان کی حیثیت تجارتی میلوں کی رہ گئی تھی اور وہ مقاصد امتدادِ زمانہ سے ان کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئے تھے جن کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کی تعمیر فرمائی تھی۔ چنانچہ اس تجارتی مقصد ہی کے تحت انھوں نے نسئی کا قاعدہ ایجاد کر کے حج کے مہینے کو قمری کے بجائے شمسی حساب کے مطابق کر لیا تھا تاکہ یہ مہینہ تجارتی نقطۂ نظر سے ان کے لیے مناسب زمانہ میں پڑے۔ یہاں "لِلّٰہِ" کے لفظ سے مسلمانوں کو حج و عمرہ کے اصل مقصود کی طرف توجہ دلائی گئی کہ یہ عبادتیں اللہ کی رضا حاصل کرنے اور تقویٰ کی تربیت کے لیے مقرر کی گئی ہیں نہ کہ میلوں کے انعقاد اور کاروباری سرگرمیوں

کے لیے اس وجہ سے تم کفار و مشرکین کے برخلاف اللہ کو اپنا مقصود بناؤ۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو تجارتی فوائد حاصل کرنے کی جو محدود اجازت دی گئی ہے، اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

امکانی خطرے کے بیے ہدایت

'فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ' احصار کے معنی گھیر لینے کے ہیں اور یہاں گھیر لیے جانے سے مراد دشمن کی طرف سے گھیر لیے جانے کے ہیں۔ آگے فَإِذَا أَمِنتُمْ کے الفاظ سے بھی اسی مضمون کا اشارہ نکلتا ہے اور وقت کے حالات بھی اسی بات کے حق میں ہیں، اس لیے کہ ان آیات کے نزول کے زمانہ میں مکہ پر مشرکین قریش کا قبضہ تھا اور انھوں نے وہاں سے مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ نکال چھوڑا تھا بلکہ کسی قیمت پر بھی ان کو دوبارہ مکہ آنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے، اس امر کا سخت اندیشہ تھا کہ مسلمان اگر حج یا عمرہ کے لیے مکہ کا رخ کرنے تو وہ پوری قوت سے مزاحم ہوتے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا تو کفار نے سخت مزاحمت کی۔ یہ صورت حال متقاضی تھی کہ پہلے اس امکانی خطرے کے لیے مسلمانوں کو ہدایت دے دی جائے۔ چنانچہ یہ ہدایت دے دی گئی کہ اگر دشمن تمھیں گھیرے اور بیت اللہ تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو جو قربانی تمھیں میسر ہو وہ وہیں پیش کر دو، جہاں گھر جاؤ۔ حضورؐ نے اسی ہدایت کے بموجب حدیبیہ ہی میں قربانی کر کے احرام کھول دیا۔

'مَحِلّ' کا مفہوم

'وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ' مَحِلّ، جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے، حَلَّ يَحِلُّ سے ظرف ہے اور وقت اور جگہ دونوں کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سر اس وقت تک نہ مونڈو جب تک قربانی ٹھکانے نہ لگ جائے اور نذر پوری نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ امن اور احصار کی دو مختلف حالتوں میں قربانی کے ٹھکانے لگنے کی شکلیں دو مختلف ہوں گی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے دونوں کے ثبوت موجود ہیں۔ حدیبیہ کے موقع پر آپ نے اس صورت پر عمل فرمایا جس پر مجبوری کی صورت میں عمل کرنے کی اجازت ہے اور بعد میں حج اور عمرہ دونوں کے موقع پر وہ طریقہ اختیار فرمایا جو عام حالات کے لیے ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہاں جس امن یا احصار کا ذکر ہے اصلاً اس کا تعلق دشمن سے ہے۔ دوسری مزاحمتیں جو مرض یا کسی اور مجبوری کے سبب پیش آجائیں ان کا حکم اصلاً نہیں بلکہ تبعاً یہاں سے نکلتا ہے اور اس کا تعلق اجتہاد سے ہے۔

قربانی سے پہلے سر منڈانے کا کفارہ

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ۔ کسی بیماری یا تکلیف کے سبب سے اگر کوئی قربانی سے پہلے ہی سر منڈانے پر مجبور ہو جائے تو اس صورت میں اس کے اوپر کفارہ ہے۔ قرآن میں اس کفارے کی تین صورتیں بالاجمال بیان ہوئی ہیں۔ روزے یا صدقہ یا قربانی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تشریح فرما دی ہے کہ یا تو تین دن کے روزے رکھ دے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا کم از کم ایک بکری کی قربانی دے دے۔

آفاقی حجاج کے لیے ایک رخصت

فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ؕ تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ یہ آفاقی حاجیوں یعنی حدودِ حرم سے باہر کے عازمینِ حج کے لیے ایک رخصت بیان ہوئی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات حدودِ حرم کے اندر رہنے والوں کے لیے تو ٹھیک تھی، اس لیے کہ ان کے لیے حج اور عمرہ کے لیے الگ الگ سفر کرنا کچھ مشکل نہ تھا لیکن دور سے آنے والے حجاج کے لیے اس میں زحمت تھی اس وجہ سے شریعت نے ان کو یہ رخصت مرحمت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں حج و عمرہ دونوں ادا کر سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ وہ پہلے عمرہ کر کے احرام کی پابندیوں سے فارغ ہو جائیں پھر حج کی تاریخوں میں اس کے لیے نیا احرام باندھیں اور مناسکِ حج ادا کریں۔ البتہ اس صورت میں ان کے لیے قربانی ضروری ہے۔ اگر قربانی میسر نہ آئے تو دس دن کے روزے رکھنے ضروری ہیں۔ تین دن کے روزے ایامِ حج میں اور سات دن کے حج سے لوٹنے کے بعد۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ، یہ احکام و ہدایات کی تفصیل کے بعد احکام کی اصل روح کی طرف توجہ دلادی کہ اصل مقصود ان تمام احکام سے تقویٰ ہے۔ یہی ان کا حاصل ہے اور اسی سے ان کے اندر زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان اس چیز کو نگاہ میں نہ رکھے تو نہ تو ان کا حق ہی ادا کر پاتا ہے اور نہ ان سے کچھ حاصل ہی کر پاتا بلکہ اس کی ساری زندگی خدا سے جھوٹی آرزوئیں باندھنے اور اپنے نفس کو ناروا الاؤنس دینے میں گزر جاتی ہے حالانکہ خدا کے طبعی قوانین جس طرح اپنے نتائج میں بے لاگ ہیں اسی طرح اس کے شرعی و اخلاقی قوانین بھی اپنے نتائج میں بے لاگ ہیں۔

اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؔؕ وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى وَاتَّقُوۡنِ يٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ (۱۹۷)

لفظ حج کا جامع استعمال

موقع دلیل ہے کہ حج کا لفظ یہاں حجِ اکبر اور حجِ اصغر یعنی حج اور عمرہ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لفظ قصاص پر بحث کرتے ہوئے ہم الفاظ کی اس مخصوص نوعیتِ استعمال کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

'معلومات' سے مقصود

'اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ' سے مقصود، ایامِ معدودات، کی طرح ان کے معین و محدود ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ کچھ ایسی غیر محدود و غیر معین مدت نہیں ہے کہ حج یا عمرہ کی نیت کرنے والا ان کی پابندیوں کے تصور سے گھبرا اٹھے۔ بس چند معلوم و متعین مہینے ہیں تو جو شخص ان میں حج یا عمرہ کا عزم کرے وہ ان کی پابندیوں کو نباہے اور شہوت رانی، نافرمانی اور لڑائی جھگڑے سے بچے اور زیادہ سے زیادہ نیکی اور تقویٰ کی کمائی کرنے کی کوشش کرے اگرچہ انسان کو اس جہاد میں اپنے جذبات و شہوات کی قربانی ضرور دینی پڑتی ہے لیکن یہ چیز ہراساں ہونے کی نہیں۔ انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ جو چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی کرتا ہے وہ اللہ کے علم میں رہتی ہے اور وہ اس کا ایک دن بھرپور صلہ دے گا۔

حج میں رفث، فسوق اور جدال کی ممانعت کے وجوہ

یہاں رفث، فسوق اور جدال تین چیزوں کی نفی کی ہے۔ رفث سے مراد شہوانی باتیں ہیں، اس لفظ کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے، فسوق کے معنی خدا کی نافرمانی کے ہیں اور جدال سے مراد آپس کے لڑائی جھگڑے ہیں۔

ان تینوں چیزوں کی ممانعت سے نفسانی محرکات کے وہ تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں جن سے انسان گناہ میں داخل ہوتا ہے۔ حج میں ان چیزوں کی قطعی ممانعت کے بعض خاص وجوہ ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلام میں یہ عبادت انسان کو ترکِ دنیا اور زہد کی اس آخری حد سے آشنا کرنے والی ہے جس سے آشنا ہونا اسلام میں مطلوب و مرغوب ہے اور جو تربیت و تزکیہ کے لیے ضروری ہے، اس سے آگے رہبانیت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں داخل ہونے سے اسلام نے روکا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ احرام کی پابندیوں کی وجہ سے ان چیزوں کے لیے نفس کے اندر اکساہٹ بہت بڑھ جاتی ہے۔ انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جائے اس کی خواہش اس کے اندر دوچند ہو جاتی ہے اور شیطان اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ سفر کی حالت ہونے کے سبب سے ان چیزوں کے مواقع بہت پیش آتے ہیں۔ آدمی اگر چوکنا نہ رہے تو ہر قدم پر فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔

زبان کا ایک خاص اسلوب

"وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى" میں ہمارے نزدیک اصل ترکیب کلام یوں ہے کہ تَزَوَّدُوا التَّقْوٰى فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ یعنی سفرِ حج کے لیے نکلو تو تقویٰ کا زادِ راہ لے کر نکلو کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ پہلی جگہ ایجاز و بلاغت کے تقاضے کے تحت تقویٰ کے لفظ کو حذف کر دیا اس لیے کہ آگے اس کا اظہار ضروری تھا۔ اگر پہلے مقام میں بھی اس کا اظہار کر دیا جاتا تو اس سے کلام میں تکرار کا عیب پیدا ہو جاتا اور قرآن مجید ہر عیب سے پاک ہے۔

اکثر لوگ یہاں تقویٰ کے لفظ کو محذوف نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک "تَزَوَّدُوْا" کے لفظ سے لوگوں کو حج کے لیے مادی زادِ راہ لے کر نکلنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ان کے خیال میں اس تاکید کی وجہ یہ پیش آئی کہ اکثر اہلِ عرب بغیر کسی زادِ راہ ہی کے حج کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور اس طرح خود بھی زحمت اٹھاتے تھے اور دوسروں کے لیے بھی موجبِ زحمت بنتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب حج کے لیے نکلا کریں تو اس کے لیے زادِ راہ کا انتظام کر کے نکلا کریں۔

اگرچہ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے کہ حج کے لیے زادِ راہ کا انتظام مقدم ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شریعت نے حج فرض ہی ان لوگوں پر کیا ہے جو ہر پہلو سے اس کے لیے استطاعت رکھتے ہیں لیکن یہاں یہ معنی لینا عربیت کے بالکل خلاف ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں "فَاِنَّ" کا لفظ جب اس طرح آیا کرتا ہے جس طرح اس آیت میں آیا ہے تو وہ اپنے ماسبق کی توجیہ و تعلیل کے لیے آیا کرتا ہے۔ اگر "تَزَوَّدُوْا" سے مراد مادی زادِ راہ ہوتا

تو اس کے بعد اس کی توجیہہ و تعلیل میں بھی اسی کی حکمت بیان ہوتی کہ کیوں اس سفر کے لیے زادِ راہ کا اہتمام ضروری ہے لیکن یہاں حکمت بیان ہوئی ہے تقویٰ کے زادِ راہ کی۔

اس ہدایت کے موقع و محل سے بھی اسی مضمون کی تائید نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اوپر والے ٹکڑے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص حج کے عزم سے نکلے تو وہ شہوانی باتوں، فاسقانہ حرکتوں اور لڑائی جھگڑے سے کلیتہً احتراز کرے۔ اس مضمون کے ساتھ اگر سب سے زیادہ قریبی جوڑ ہو سکتا ہے تو اسی بات کا ہو سکتا ہے کہ اس مقدس سفر کے لیے آدمی کو رفث، فسوق اور جدال کے بجائے تقویٰ کا زادِ راہ لے کر نکلنا چاہیے اس لیے کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہی کا زادِ راہ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ (۱۹۸)

فضل سے مراد

یعنی حج سے اصل مقصود تو تقویٰ ہے، اس لیے اس کے واسطے اصل زادِ راہ تقویٰ ہی کا ہونا چاہیے لیکن اس امر میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ کوئی شخص اس سفر سے کوئی چھوٹا بڑا تجارتی فائدہ بھی اٹھا لے۔ یہاں فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ سے مراد تجارتی فائدہ ہے۔ اس قسم کے معاشی فوائد کے لیے قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ خدا کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہوئے بندہ جو معاشی فتوحات حاصل کرتا ہے وہ سب فضلِ رب میں داخل ہیں۔

اوپر والی آیت کے تحت ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جاہلیت میں حج کا اجتماع ایک بہت بڑے تجارتی میلے کی نوعیت اختیار کر گیا تھا جس کے سبب سے حج کا اصل مقصد بالکل دب کر رہ گیا تھا۔ قرآن نے یہاں واضح کیا کہ حج کا اصل مقصد عبادت ہے نہ کہ تجارت۔ اس وجہ سے اس سفر میں اسی کے شانِ شایان زادِ راہ لو، اور وہ ہے تقویٰ۔ لیکن اس کے اصلی مقصد کے اہتمام کے ساتھ اگر کوئی شخص کوئی نفع بخش کاروبار بھی کرے تو اس سے اس عبادت میں کوئی خرابی واقع نہ ہوگی۔ یہ چیز جائز ہے۔

جاہلی رسوم کی مخالفت

"وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ" عرفات سے واپس ہوتے ہوئے مشعرِ حرام (مزدلفہ) میں رات گزارنے اور وہاں اللہ کی یاد کرنے کا حکم ہے۔ اس یاد کرنے کے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ یہ اس طریقہ پر ہو جو اللہ نے تمھیں بتایا اور سکھایا ہے، یعنی تسبیح و تہلیل اور ذکر و عبادت کی صورت میں۔ اس طریقہ پر نہ ہو جو تم نے جاہلیت کے زمانے میں اختیار کر رکھا تھا جس طرح اس زمانے میں لوگ عید وغیرہ کے موقعوں پر چراغاں کرتے ہیں، پکنک کے پروگرام بناتے ہیں، مشاعروں کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں، یہاں تک کہ رقص و سرود کی محفلیں بھی کہیں کہیں آراستہ ہو جاتی ہیں، اسی طرح جاہلیت میں بھی لوگ مزدلفہ میں جگہ جگہ آگ جلاتے اور قصیدہ خوانی، داستان گوئی اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد کرتے۔ قرآن نے ان چیزوں کی جگہ ان کو تسبیح و تہلیل کی ہدایت فرمائی اس لیے کہ اصلاً ان مقامات کی حاضری اسی مقصد کے لیے ہے۔

"وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ" بطور امتنان واحسان کے ارشاد ہوا ہے۔ جس طرح سورۂ جمعہ میں ہے۔ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے) مطلب یہ ہے کہ ان مقامات کے احکام وآداب سے متعلق تمھیں جو رہنمائی کی جا رہی ہے اس کی قدر کرو، اس لیے کہ اب تک تم ان مقامات کو کھیل تماشے کی جگہیں بنائے بیٹھے تھے حالانکہ یہ مقامات انوارِ معرفت کی جلوہ گاہ ہیں لیکن تم نے اپنی جہالت کے سبب سے جواہرات کے معادن کو کوئلے کی کانیں سمجھا۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۹۹)

قریش کی ذہنیت پر ایک ضرب

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں خطاب خاص قریش سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مناسک حج کے معاملہ میں جو پابندیاں دوسروں پر ہیں بعینہٖ وہی پابندیاں تمھارے اوپر بھی ہیں اس وجہ سے جس طرح دوسرے تمام لوگ عرفات جاتے اور وہاں سے لوٹتے ہیں اسی طرح تم بھی عرفات جا کر وہاں سے لوٹا کرو۔ اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ قریش زمانۂ جاہلیت میں حج کے موقع پر خاص اپنے لیے عرفات کی حاضری ضروری نہیں سمجھتے تھے، صرف مزدلفہ تک جاتے اور وہیں سے لوٹ آتے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ بیت اللہ کے پروہت اور مجاور ہیں اس وجہ سے ان کے لیے حدودِ حرم سے باہر نکلنا مناسب نہیں۔ بندگی میں بھی انھوں نے اپنے لیے ایک امتیاز قائم کر لیا تھا۔ قرآن نے ان کے اس خود ساختہ امتیاز کو ختم کر کے سب کو ایک سطح پر کر دیا۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲۰۰)

ایک لغویت کی اصلاح

مناسک حج سے فراغت کے بعد لوگوں پر، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، تفریحات اور دلچسپیوں کا موڈ طاری ہوتا تھا اور شعر وشاعری اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، خاص کر قیام منیٰ کے ایام تو انھی چیزوں کے لیے خاص ہو کر رہ گئے تھے۔ شعراء اور خطباء اپنے اپنے قبیلوں اور اپنے اپنے آباؤ اجداد کے مفاخر نثر ونظم میں بیان کرتے اور طلاقت لسانی سے ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے۔ قرآن نے اس لغویت کی بھی اصلاح کی اور اس کی جگہ اس سے زیادہ اہتمام اور اس سے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنے کی ہدایت کی۔

طالبینِ دنیا کو تنبیہ

"فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ الآیۃ" یہ اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جن کے دل ودماغ کے ہر گوشے پر محبت دنیا کا غلبہ ہوتا ہے اور اس غلبہ کی وجہ سے وہ ہر جگہ اسی چیز پر نگاہ رکھتے ہیں جو ان کے دل میں سرفہرست ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انھیں حج جیسی عظیم عبادت کا موقع بھی نصیب ہوتا ہے تو اس میں بھی قبولیت دعا کے ہر موقع ومحل میں خدا سے اپنی دنیوی آرزوؤں ہی کی تکمیل کے لیے دعا کرتے ہیں درآنحالیکہ ان کی آخرت کا خانہ بالکل ہی خالی ہوتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو حج کرتے ہی اپنے کسی نہ کسی دنیوی مقصد کے لیے ہیں، وہ جس مقام کو بھی سمجھتے ہیں کہ یہاں دعا قبول ہوتی ہے وہاں وہ اپنی وہی درخواست پیش کرتے ہیں جو ان کے

دل پر غالب ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ اخروی فلاح کا کوئی ذکر بھی پسند نہیں کرتے کہ مبادا یہ چیز ان کی اصل آرزو کے لیے خدا کے سامنے کوئی حجاب بن جائے۔

اسی طرح کے لوگ ہیں جنھوں نے دین کی ہر چیز کو دنیوی مفادات کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، جس سے دین کا حلیہ بگڑا ہے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جن کی دنیا پرستیوں نے حج جیسی عظیم عبادت کو بھی زمانۂ جاہلیت میں، جیسا کہ اوپر گزرا، ایک تجارتی میلے کی شکل میں بدل دیا، اور یہی رجحان ہے جو اس دور میں حج کو صرف ایک سالانہ کانگریس کی حیثیت سے نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ حالانکہ حج کی اصل ابراہیمی روح ہجرت الی اللہ ہے۔ اس کے دنیوی فوائد صرف ضمنی ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ٥
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲۰۱-۲۰۲)

صحیح روش کی طرف اشارہ

یہ اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جن کے ذہن دنیا اور آخرت دونوں کے معاملہ میں بالکل متوازن ہیں اور جو دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی اپنے رب سے مانگتے ہیں۔ پہلے گروہ کے بعد اس گروہ کا ذکر یہ بتانے کے لیے ہے کہ اس گروہ کی طلب اللہ کی نگاہوں میں پسندیدہ ہے اور اہلِ ایمان کو یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے اس دعا سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ بندے کو اپنے رب سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرنی چاہیئے۔ اور اس بھلائی کا فیصلہ اور انتخاب اسی پر چھوڑنا چاہیئے۔ وہی سب سے زیادہ بہتر طریقہ پر جانتا ہے کہ ہمارے لیے حقیقی خیر کس چیز میں ہے۔ خاص طور پر دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کا خیر ہونا تو منحصر ہے اس امر پر کہ وہ چیز ہمارے لیے آخرت کی کامیابی کا وسیلہ و ذریعہ بن سکے اور کسی چیز کے اس پہلو کو جاننا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ اس وجہ سے بندے کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اس معاملے کو اللہ تعالیٰ ہی پر چھوڑے، اپنی طرف سے کوئی تجویز پیش نہ کرے۔ البتہ دوزخ کے عذاب سے برابر پناہ مانگتا رہے، یہ بڑی سخت چیز ہے بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے پناہ میں رکھے۔

"اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا" (یہی لوگ ہیں جو اپنی کمائی کا حصہ پائیں گے) پہلے گروہ کے متعلق، جو صرف دنیا کا طالب بنتا ہے، یہ فرمایا کہ "ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے" لیکن اس دوسرے گروہ کے متعلق ارشاد ہوا کہ یہ اپنی کمائی کا حصہ پائیں گے اور یہ حصہ اس اصول کے مطابق ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی نیکیوں کے بدلہ کے لیے مقرر فرما رکھا ہے۔

وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ کا مفہوم

"وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ" (اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے) تہدید اور تسلی دونوں موقعوں کے لیے موزوں ہے اور قرآن مجید میں یہ دونوں ہی موقعوں پر استعمال ہوا ہے۔ جو لوگ آخرت کے عذاب و ثواب کو ایک بہت بعید چیز سمجھ کر اپنی بدعملیوں میں بدمست رہتے ہیں کہ جو چیز اتنی دور ہے اس کی فکر میں ابھی سے مبتلا ہو کر اپنے عیش کو کیوں مکدر کریں، ان کو ان الفاظ سے یہ بات یاد دلائی جاتی ہے کہ آج تم جس حساب و کتاب

کو بہت دور کی چیز سمجھ رہے ہو جب وہ سر پر آئے گا تو تم یہ سمجھو گے کہ اس پر تو ایک صبح و شام بھی نہیں گزری۔

اسی طرح جو لوگ اللہ کے اچھے وعدوں کو وعدہ فردا سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کے ظہور میں ایک غیر متناہی مدت باقی ہے، ان کو ان الفاظ سے یہ تسلی دی جاتی ہے کہ اطمینان رکھو، خدا کے وعدوں کے پورے ہونے میں دیر نہیں ہوگی، جب تمھیں اجر ملے گا تو محسوس کرو گے کہ تمھاری مزدوری تمھارا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی تم کو مل گئی۔

موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ دھمکی کے سیاق میں نہیں بلکہ تسلی کے سیاق میں ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ان معاملات میں ساری اہمیت اس احساس کی ہے جو انسان کو جزا و سزا کے وقت ہوگا۔ اگر جزا و سزا کے وقت کا احساس یہی ہو گا کہ عمل اور جزا کے درمیان کا فاصلہ بالکل غائب ہو گیا تو پھر یہ فاصلہ بالکل ناقابلِ لحاظ ہے۔ پھر تو صحیح یہی ہے کہ مجرم اپنی سزا کو سامنے رکھے اور مومن اپنی جزا کو۔ نہ وہ مہلت سے مغرور رہو نہ یہ تاخیر سے بے صبر، اور اگر کوئی شخص اپنی نافہمی سے اس فاصلہ کو اہمیت دے بھی تو اسے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ "من مات فقد قامت قیامتہ" کہ جو شخص مرا اس کی قیامت کھڑی ہو گئی۔ جو مومن ہے آنکھ بند ہوتے ہی، اس پر اس کے نیک اعمال کی کیفیات کا ظہور شروع ہو جاتا ہے اور کافر پر اس کے بد اعمال کی۔
پھر عمل اور جزاء میں فاصلہ کیا رہا؟ ادھر انسان نے زندگی کا بوجھ اتارا ادھر جزا اور سزا کھڑی ہے!

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۲۰۳)

حج کا اجتماع روز حشر کے اجتماع کی یاد دہانی ہے

"ایام معدودات" کے الفاظ جس مقصد سے روزے کے ذکر میں وارد ہوئے ہیں اسی مقصد سے یہاں بھی وارد ہوئے ہیں اور مراد ان سے ایام تشریق یعنی قیام منیٰ کے ایام ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ گنتی کے چند دن ہی تو ہیں تو ان میں ذکر الٰہی کے خزانے میں جتنا اضافہ کر سکتے ہو کر لو۔ اس قلیل مدت کو بھاری اور گراں سمجھ کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ ویسے اس امر کی اجازت ہے کہ جسے کوئی عجلت ہو تو ۱۲ ذی الحجہ ہی کو واپس ہو جائے ورنہ ۱۳ تک کے قیام کا ثواب حاصل کرے۔ دونوں ہی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ البتہ یہ ملحوظ رہے کہ اس عجلت کا باعث ان ایام کی گرانی اور طوالت کا احساس نہ ہو بلکہ کوئی واقعی ضرورت اس کی داعی ہو۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ بہت سے لوگ عرفات سے واپس ہوتے ہی جلد سے جلد بقیہ مناسک سے فارغ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ چیز ایک حد تک تو فطری ہے لیکن اس میں بیزاری اور گھبراہٹ کی کیفیت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اس چیز کا کوئی اثر ہو تو یہ تقویٰ سے بعید بات ہے اور انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے اور اس دن اس کے حکم کے بغیر کوئی اس کے سامنے سے ہٹ نہ سکے گا۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ کے الفاظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ حج کا یہ اجتماع روز حشر کے اجتماع کی ایک یاد دہانی ہے اس وجہ سے اس مجاز میں اس حقیقت سے غفلت نہیں ہونی چاہیے۔

٦٨۔ آگے کا مضمون ___ آیات ۲۰۴-۲۱۴

اوپر حج کے بیان کے سلسلے میں آخر میں یہ بات جو آگئی تھی کہ بعض لوگ حج کو صرف اپنی دنیوی تمنا برآریوں ہی کا ذریعہ بناتے ہیں، آخرت کی طلب سے ان کے سینے بالکل خالی ہوتے ہیں، وہیں سے کلام منافقین کے ذکر کی طرف مڑ گیا۔ اس لیے کہ جو لوگ اتنے دنیا طلب ہوں کہ حج کی دعاؤں میں بھی اپنی دنیا ہی بنانے کی کوشش کریں وہ منافق ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ذکر کی مناسبت سے چند آیتوں میں منافقین کے کردار پر تبصرہ بھی ہو گیا اور ساتھ ہی پکے اہل ایمان کا جو کردار ہونا چاہیے اس کا ذکر بھی آگیا اور ان کو بعض مناسب موقع ضروری تنبیہات بھی کر دی گئیں تاکہ منافقوں کی منافقانہ روش ان کے لیے کسی ٹھوکر کا باعث نہ بنے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ
۲۰۴-۲۱۴ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا
تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ
الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ
النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ
بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪
وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ
زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ
ع ۲۵ ۹ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع
سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ ۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ

نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾
زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ وقف لازم
يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ
اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ
اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۚ
فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ
وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ
اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ
قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ
الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ
قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی باتیں تو اس دنیا کی زندگی میں تمہیں بڑی میٹھی ترجمۂ آیات
معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنی دلی نیت پر خدا کو گواہ بھی بناتے ہیں لیکن ہیں وہ کٹر دشمن ۲۰۴-۲۱۴
اور جب وہ تمہارے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اس لیے ہوتی ہے کہ
زمین میں فساد مچائیں اور کھیتی اور نسل کو تباہ کریں اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب
ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کا خوف کرو تو گھمنڈ ان کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔ سوالیسوں کے

لیے جہنم کافی ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضاجوئی کے لیے اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔ ۲۰۷

اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اگر تم ان کھلی ہوئی تنبیہات کے بعد بھی جو تمہارے پاس آچکی ہیں، پھسل گئے تو جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ۲۰۸، ۲۰۹

اب تو یہ لوگ صرف اسی بات کے منتظر ہیں کہ اللہ نمودار ہو جائے بدلیوں کے سایہ میں اور اس کے فرشتے اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے۔ یہ امور اللہ ہی کے حوالے ہیں۔ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے ان کو کتنی کھلی کھلی نشانیاں دیں۔ اور جو اللہ کی نعمت کو، اس کے پانے کے بعد، بدل ڈالے تو اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ان کافروں کی نگاہوں میں دنیا کی زندگی کھبا دی گئی ہے اور یہ اہل ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں حالانکہ جو لوگ تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہیں، قیامت کے دن، وہ ان پر بالا ہوں گے۔ اور اللہ جسے چاہے بے حساب روزی دے۔ ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲

لوگ ایک ہی امت بنائے گئے انھوں نے اختلاف پیدا کیا تو اللہ نے اپنے انبیاء بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے اور ان کے ساتھ کتاب بھیجی قول فیصل کے ساتھ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں، ان میں فیصلہ کر دے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کیا مگر ان ہی لوگوں نے جن کو یہ دی گئی تھی، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات آچکی تھیں، محض باہمی ضد م ضدا کے سبب سے۔ پس اللہ نے اپنی توفیق بخشی سے

اہل ایمان کی اس حق کے معاملے میں رہنمائی فرمائی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا۔ اللہ جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمھیں ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تمہارے اگلوں کو پیش آیا، ان کو آفتیں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی! بشارت ہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے! ۲۱۳-۲۱۴

۶۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲۰۴)

منافقین کردار کے کمزور اور گفتار کے غازی ہوتے ہیں

یہ اشارہ ہے منافقین کی طرف۔ جن لوگوں کے کردار کمزور ہوتے ہیں، عموماً وہ گفتار کے بڑے غازی ہوتے ہیں۔ یہ اپنی عملی کمزوریوں پر اپنی چرب زبانی اور خوش گفتاری سے پردے ڈالتے اور مخاطب کی نیک نیتی اور کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر اس کو اپنے طرزِ عمل کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدینہ کے منافقین میں بھی ایک گروہ ایسے لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ کھاتے پیتے، سہل پسند، تن آسان اور چرب زبان تھے۔ شکلیں اچھی، لباس صاف ستھرے، مجلسی آداب میں مشاق لیکن دل کے بودے اور عمل کے چور تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اسلام کی حمایت میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے لیکن جب وہاں سے ہٹتے تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اسلام کی مخالفت کی راہ میں ہوتی۔ انھی لوگوں کی تصویر سورۂ منافقون میں ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ	اور جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کی شکلیں تمھیں اچھی لگتی
وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ	ہیں اور اگر وہ بات کہتے ہیں تو ان کی چرب زبانی کی وجہ
كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ	سے تم ان کی بات سنتے ہو (لیکن حقیقت میں یہ) لکڑی کے
كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ	کندوں کے مانند ہیں جن کو ٹیک لگا دی گئی ہو، یہ ہر خطرے
الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قَاتَلَهُمُ	کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں، اصلی دشمن یہی ہیں، پس ان سے

اللهُۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ (۴) — بچ کر رہو۔ اللہ انہیں ہلاک کرے، یہ کس طرح اوندھے ہوئے جاتے ہیں۔

یعنی ان کے پلے ہوئے جسم اور پالش کی ہوئی شکلیں بظاہر دل کو بھاتی ہیں اور ان کی چکنی چپڑی باتیں، جو یہ تمہیں خوش کرنے کے لیے کرتے ہیں، حمایت اسلام کے جوش میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں اس وجہ سے تمہیں دل کش معلوم ہوتی ہیں اور تم ان کی یہ باتیں سنتے ہو، لیکن حقیقت میں یہ اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں۔ ان کے سینوں میں نہ دل ہیں، نہ ایمان نہ اسلام۔ یہ بالکل لکڑی کے کھوکھلے کندوں کے مانند ہیں جن کو گویا لباس پہنا کر دیواروں سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا گیا ہے۔ دولتِ ایمان سے محروم ہونے کے سبب سے یہ انتہا درجہ کے بزدل ہیں اس وجہ سے یہ ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر آتا دیکھتے ہیں اور اپنی اس بزدلی کو اپنی چکنی چپڑی باتوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تمھاری توجہ ہٹانے کے لیے تو دوسروں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں کہ وہ اسلام کے لیے خطرہ ہیں لیکن اسلام کے لیے حقیقی خطرہ خود ان کے نفاق اور ان کی بزدلی کی طرف سے ہے اس وجہ سے ان کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہو۔

بعینہٖ یہی بات اس زیر بحث آیت میں فرمائی گئی ہے کہ جہاں تک ان کی باتوں کا تعلق ہے یہ دل کو بڑی موہ لینے والی ہوتی ہیں لیکن یہ ساری باتیں ملمع کی ہوتی ہیں اور اس ملمع کی یہ مصنوعی آب و تاب چند روزہ ہے۔ اس دنیا میں بے شک وہ ان جھوٹے موتیوں سے لوگوں کو جُل دینے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن عنقریب وہ دن آنے والا ہے جب جھوٹے اور سچے اور کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہو جائے گا اور ان کے چہرے کی یہ پر فریب نقاب اتر جائے گی۔

وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ (اور وہ اپنے دل کی نیت پر خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے) خدا کو گواہ ٹھہرانے کے معنی خدا کی قسم کھانے کے ہیں۔ منافق کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لیے بات بات پر قسم کھاتا ہے۔ اس کے پاس چونکہ کردار کی حجت نہیں ہوتی اس وجہ سے ہر قدم پر قسم کو بطور دلیل پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جھوٹا آدمی، اپنی نفسیاتی کمزوری کی وجہ سے، سمجھتا ہے کہ مخاطب اس کی بات اس وقت تک باور نہیں کرے گا جب تک وہ اس کو قسم کھا کر یقین نہ دلائے۔ ایک راستباز اور صاحب کردار اپنے عمل پر اعتماد کرتا ہے اور جب اس پر کوئی گرفت ہوتی ہے تو وہ اپنے عمل ہی کی دلیل سے اس کی مدافعت کرتا ہے لیکن ایک منافق کے پاس چونکہ عمل کا سہارا نہیں ہوتا اس وجہ سے جب اس پر کوئی گرفت ہوتی ہے تو وہ قسم کو اپنی ڈھال بناتا ہے اور اسی کے سہارے لوگوں کی گرفت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ سورۂ منافقون میں منافقین کے اس کردار کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

إِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ — جب تمہارے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم

إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ — گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں

إِنَّكَ لَرَسُولُهُ ۚ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۝ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱-۲ منافقون)

اللہ خوب جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک یہ منافق بالکل جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اس طرح وہ اللہ کے راستہ سے رک گئے ہیں بہت ہی بری ہے وہ حرکت جو یہ کر رہے ہیں۔

وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ، خصام خصم کی جمع ہے اور اَلَدّ کے معنی شدید الخصومۃ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو ان کی باتیں تمھارے سامنے بڑی چکنی چپڑی ہوتی ہیں لیکن ان کے دلوں کے اندر تمھارے اور اسلام کے خلاف نہایت شدید قسم کا بغض و حسد بھرا ہوا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ منافقون میں هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ (اصل دشمن وہی ہیں، ان سے بچ کے رہو) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (۲۰۵)

اسلام کی مخالفت فساد فی الارض ہے

یعنی تمھارے سامنے تو ان کی باتیں بڑی دل لبھانے والی ہوتی ہیں لیکن تمھارے پاس سے ہٹنے کے بعد ان کی ساری بھاگ دوڑ فساد فی الارض کی راہ میں ہوتی ہے۔ فساد فی الارض سے مراد، جیساکہ ہم آیت ۱۱ کے تحت واضح کر چکے ہیں، اللہ کی بندگی اور اطاعت کی اس دعوت کی مزاحمت و مخالفت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ زمین کے تمام امن و عدل کا انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ کے بندے اللہ ہی کی بندگی اور اسی کی اطاعت میں داخل ہو جائیں، جیساکہ آگے ارشاد ہو رہا ہے۔ ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (اللہ کی اطاعت میں سب کے سب داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو) اس بندگی و اطاعت میں داخل ہو جانے کے بعد شیطان کے لیے دراندازیوں اور فساد کی تمام راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ بصورتِ دیگر تمام نسل انسانی شیطان کی فساد انگیزیوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہے اور وہ برابر بغض و عداوت کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے جو حرث و نسل دونوں کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ اہل عرب نے اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں اس صورت حال کا اچھی طرح تجربہ کر لیا تھا اس وجہ سے ان کے لیے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ تباہی کے اس جہنم سے خلق خدا کو نکالنے کے لیے سلم و اطاعت کی وہ دعوت کتنی بڑی رحمت و برکت تھی جو قرآن نے پیش کی تھی اور پھر انسانیت کے کتنے بڑے دشمن تھے وہ لوگ جو اس دعوت کی مخالفت کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا اسی جہنم میں پڑی جلتی رہے۔

وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ، یعنی بظاہر وہ کتنی ہی چکنی چپڑی باتیں کیوں نہ کریں اور اسلام اور پیغمبر کی دوستی کا دم کیوں نہ بھریں لیکن وہ اللہ کی نظروں میں کوئی مقام کس طرح حاصل کر سکتے ہیں جب وہ اپنے طرزِ عمل سے اس فساد کو ہوا دے رہے ہیں جس کے نتیجہ میں تمام انسانیت کی تباہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ دنیا بنائی ہے تو وہ اس کی فلاح و بہبود کو پسند کرتا ہے، اس میں فساد اور مفسدین کو وہ پسند نہیں کرتا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ (۲۰۶)

دینداری کے جھوٹے مدعیوں کا غرور

اسلام دوستی اور دینداری کے ایسے جھوٹے دعویداروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب ان کی کسی خلاف اسلام حرکت پر گرفت کی جائے اور ان کی توبہ اور اصلاح کی طرف توجہ دلائی جائے تو ان کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی ہے۔ وہ اپنی کمزوری و بے اعتمادی اور احساس کہتری کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ انھوں نے اپنی کمزوری تسلیم کرلی تو ان کا سارا بھرم ختم ہو جائے گا، اس وجہ سے وہ اپنی اکڑ میں کوئی خم نہیں پیدا ہونے دیتے۔ منافقین کے اس خاص پہلو کی طرف سورۂ منافقون میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (۵-۶)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ توبہ کرو، اللہ کا رسول بھی تمہارے لیے خدا سے مغفرت مانگے گا تو وہ اپنی گردن موڑ لیتے ہیں اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ استکبار کے ساتھ اعراض کرتے ہیں۔ ان کے لیے یکساں ہے، تم ان کے لیے مغفرت مانگو یا نہ مانگو۔ اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ بدعہدوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

اسی حقیقت کی طرف سورہ نساء کی یہ آیتیں بھی اشارہ کر رہی ہیں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ۝ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ۝ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات کے فیصلے کے لیے اللہ کی اتاری ہوئی چیز اور رسول کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ وہ تم سے بڑی بے پروائی سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت کیا ہوگا جب ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کوئی مصیبت پہنچے گی پھر یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ، خدا کی قسم، ہم نے تو یہ محض خیر خواہی اور سازگاری پیدا کرنے کے جذبے کے تحت کیا! اللہ ان کے دلوں کی بات کو خوب جانتا ہے تو ان سے اعراض کرو اور ان کو نصیحت کرو اور ان کو خود ان کے مفاد میں دلنشین بات کہو۔ اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر وہ اس وقت جب کہ انھوں نے اپنے اوپر

فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (۶۱-۶۴- نساء)

ظلم کیا، تمھارے پاس آتے، پھر اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت مانگتا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ (پس اس کے لیے جہنم ہی کافی ہے) یہ ٹکڑا بالعموم اس موقع پر آیا ہے جہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جن کو دنیا میں ان سنگین شرارتوں کے باوجود ڈھیل دی جاتی ہے تو یہ ڈھیل ان کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے بلکہ یہ صرف اس لیے دی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے آگے جو جہنم تیار ہے وہ ساری کسر پوری کر دینے والی ہے، اس کے ہوتے ان کے لیے اس دنیا میں کسی عذاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (۲۰۷)

اہل اخلاص کی حوصلہ افزائی

شری یشری کے معنی بیچنے کے ہیں۔ یہ اشارہ ہے مخلص اہل ایمان کی طرف جنھوں نے اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے اپنا سب کچھ تج دیا ہے۔ ان کا ذکر یہاں دو پہلوؤں سے ہے۔ ایک یہ کہ ان منافقین کو غیرت آئے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے کہ سب تمھارے ہی جیسے مفاد پرست اور ابن الوقت نہیں ہیں بلکہ تمھارے ہی آنکھوں کے سامنے اللہ کے وہ بندے بھی ہیں جو اپنا تن، من، دھن سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور اپنی زندگی کا مقصد اس کی رضا کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ دوسرا یہ کہ اس ذکر سے ان اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہو، جو ان منافقین کے برعکس اللہ ہی کے لیے جینے اور اللہ ہی کے لیے مرنے والے تھے۔ منافقین کے ذکر کے پہلو بہ پہلو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر فرما دیا کہ اس کے جانباز و وفادار بندے بھی موجود ہیں اور وہی اس کی رافت و رحمت کے سزاوار ہیں۔

"وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر چند اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیع و شرا کا عہد بڑا کٹھن ہے اور اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنی ساری زندگی کو تج دینا ایک عظیم جہاد ہے جس کے تقاضے بڑے صبر آزما ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، وہ ان پر ان کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، اور اگر اس عہد کے تقاضوں میں ان سے کوئی بھول چوک ہو جاتی ہے تو اس کو معاف کرتا ہے، لغزشوں اور کوتاہیوں کے لیے اس نے توبہ و اصلاح کی راہیں کھلی رکھی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۲۰۸)

سلم کا مفہوم

سلم کے معنی اطاعت کے ہیں اور مراد اس سے اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی اسلام کے لیے ہیں۔ لیکن یہ فرق محض ظاہر کا فرق ہے، اس لیے کہ اسلام کی اصل حقیقت اللہ و رسول کی اطاعت ہی ہے۔ یہ لفظ حرب کا ضد بھی آتا ہے اس صورت میں اس کے معنی صلح و امن کے ہوتے ہیں، اس

مفہوم میں بھی اسلام کی روح موجود ہے، اس لیے کہ صلح و امن کی اصل راہ اللہ و رسول کی اطاعت ہی ہے۔

'کافّۃ' کا مفہوم 'کافّۃ' کے معنی جماعت کے ہیں اور یہ یہاں حال پڑا ہوا ہے۔ قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی یہ اسی شکل میں استعمال ہوا ہے۔

منافقین کو مخلصانہ اطاعت کی دعوت خطاب اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے عام یعنی تمام مسلمانوں سے ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ ان سے خطاب کر کے یہ کہا جا رہا ہے کہ سچے اور پکے اہل ایمان کی طرح تم بھی اللہ و رسول کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اس ہدایت کی وجہ یہ ہے کہ ان منافقین کی وفاداری تقسیم تھی، یہ ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے مدعی تھے اور اسلام کی حمایت کا دم بھرتے تھے اور دوسری طرف اسلام کے مخالفین کے ساتھ بھی ان کا ساز باز تھا۔ قرآن نے جگہ جگہ ان کی اس روش کی طرف اشارے کیے ہیں، مثلاً سورۂ محمد میں انھیں لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ (۲۶- محمد)

یہ اس وجہ سے ہے کہ ان منافقین نے ان لوگوں سے جنھوں نے اللہ کی اتاری ہوئی چیز کا برا مانا، یہ کہا کہ ہم بعض معاملات میں آپ ہی لوگوں کی اطاعت کریں گے اللہ ان کی اس رازداری کو خوب جانتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں 'لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا' سے اشارہ یہود اور مشرکین کے لیڈروں ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔

سورۂ نساء کی مندرجہ ذیل آیات بھی ان کی اسی روش کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝ (۶۰-۶۱ نساء)

ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو مدعی ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان لائے ہیں جو تم پر اتری ہے اور اس چیز پر بھی جو تم سے پہلے اتری ہے، یہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلہ کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس کا انکار کریں۔ شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بڑی ہی دور کی گمراہی میں پھینک دے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف تو تم ان منافقین کو دیکھتے ہو کہ وہ طرح طرح سے گریز کی راہیں اختیار کرتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ یہاں طاغوت سے مراد یہود کی عدالتیں ہیں۔ چونکہ ان عدالتوں سے رشوت وغیرہ دے کر خلاف عدل و انصاف فیصلے کرانا بڑی آسانی سے ممکن تھا، نیز علمائے یہود نے اپنی کتر بیونت سے

شریعت کے بہت سے احکام اپنی خواہشات کے مطابق کر دیئے تھے اس وجہ سے منافقین اپنے بہت سے معاملات انھی کی عدالتوں میں لے جانا چاہتے تھے اور جب ان سے کہا جاتا کہ ایمان واسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کریں تو وہ مختلف حیلوں حوالوں سے گریز اختیار کرنے کی کوشش کرتے۔

منقسم وفاداری شرک ہے

وفاداری کی یہ تقسیم ایمان واسلام کے منافی بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے۔ یہیں سے شیطانوں کو انسانوں کو گمراہ کرنے کی، جیسا کہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں اشارہ ہے، نہایت کشادہ راہ مل جاتی ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس فتنہ کے دروازے کو بند کرنے کی ہدایت کی اور حکم دیا کہ سب کے سب بغیر کسی استثناء اور بغیر کسی تحفظ کے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں داخل ہو جائیں۔ اطاعتِ کامل کا یہی راستہ امن وعدل کا راستہ ہے اور اسی راستہ پر چلنے والوں کے لیے فوز وفلاح ہے۔ جو لوگ اس سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنی چاہتے ہیں اور بیک وقت کفر اور اسلام دونوں سے رسم وراہ رکھنے کے خواہشمند ہیں، وہ شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں اور شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے اس لیے کہ اس نے روزِ اول ہی سے اس کی راہ مارنے اور اس کو گمراہ کرنے کا کھلم کھلا الٹی میٹم دے رکھا ہے۔

فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۰۹)

'بیّنات' سے مراد

'بیّنات' سے مراد وہ تنبیہات وتہدیدات بھی ہیں جو شیطان کی چالوں اور اس کے فتنوں سے آگاہ کرنے کے لیے نہایت تفصیل کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور وہ واضح اور قطعی ہدایات بھی جو ایمان واسلام کے تقاضوں کو بیان کرنے کے لیے وارد ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر سورج کی طرح روشن ہدایات وتنبیہات کے بعد بھی تم نے (خطاب منافقین ہی سے ہے) اپنے ازلی اور کھلے ہوئے دشمن ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کی تو اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا کی پکڑ سے تم کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ خدا عزیز وحکیم ہے۔

'عزیز' اور 'حکیم' کی وضاحت

'عزیز' کی صفت کے حوالہ سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ خدا کوئی کمزور وناتواں ہستی نہیں ہے بلکہ وہ غالب وتوانا ہے تو جو اس کی تنبیہات کے باوجود شیطان کی پیروی کریں گے ان کو وہ اس عذاب میں ضرور پکڑے گا جو شیطان کے پیروؤں کے لیے اس نے مقدر کر رکھا ہے اور جس کی اس نے پہلے سے خبر دے رکھی ہے۔ دوسرا اس طرف کہ جو لوگ ان واضح ہدایات کے بعد بھی راہِ حق کو چھوڑ کر شیطان ہی کی پیروی اختیار کریں گے وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنا ہی بگاڑیں گے اس لیے کہ خدا عزیز ہے یعنی ہر نفع ونقصان سے بالاتر۔

اسی طرح حکیم کی صفت بھی یہاں دو حقیقتوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس دنیا کا خالق حکیم ہے اور اس کے حکیم ہونے کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہدایت پر جمے رہنے والوں اور اس سے منحرف ہو جانے والوں کے درمیان ان کے انجام کے لحاظ سے امتیاز کرے، اگر وہ ان میں کوئی امتیاز نہ کرے بلکہ دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے

یا دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ایک حکیم نہیں بلکہ ایک کھلنڈرا ہے اور یہ دنیا ایک پر حکمت اور با مقصد کارخانہ نہیں بلکہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے۔ دوسری یہ کہ بدی اور نیکی کے نتائج کے ظہور میں جو دیر سویر ہوتی ہے وہ سب حکمت پر مبنی ہوتی ہے، بسا اوقات شیطان کے پیروکاروں کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے اور بسا اوقات اہلِ حق کسی آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، اس سے نہ تو اہلِ باطل کو مغرور ہونا چاہیئے نہ اہلِ حق کو مایوس۔ بلکہ یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ مہلت اور یہ آزمائش دونوں خدائے حکیم و دانا کی حکمت پر مبنی ہے اور اس حکمت کے تحت اس کے قوانین اور ان کے نتائج بالکل قطعی اور اٹل ہیں، ان میں سرِ مُو فرق ممکن نہیں ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۲۱۰)

نظر ینظر کے معنی جس طرح دیکھنے کے آتے ہیں اسی طرح اس کے معنی انتظار کرنے کے بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان بینات اور ان تنبیہات و تہدیدات کے بعد بھی جو لوگ جادۂ مستقیم پر ہموار نہ ہو سکے بلکہ شیطان کے پیچھے بھٹکتے ہی رہ گئے، اب سنت اللہ کے تحت تو ان پر اتمام حجت کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اب بھی اگر وہ کسی چیز کے منتظر ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اس طرح ان کو اپنا جلال دکھائے کہ اس کے ساتھ بدلیوں میں اس کا عذاب چھپا ہوا ہو اور اس کے جلو میں اس کے فرشتوں کی افواج قاہرہ ہوں اور حق و باطل کی اس کشمکش کا آخری فیصلہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ فیصلہ نبی کے کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کس قوم کا فیصلہ کب ہونا چاہیئے اور کس طرح ہونا چاہیئے۔

معتبر ایمان

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان و ہدایت وہ معتبر ہے جو نتیجہ ہو آیاتِ الٰہی کے سننے اور سمجھنے کا نہ کہ وہ جو منتظر ہو جلالِ الٰہی اور قہر خداوندی کے ظہور اور مشاہدہ کا۔ جو گروہ اس چیز کا منتظر ہوتا ہے وہ صرف اپنی شامت کے ظہور کا منتظر ہوتا ہے اس لیے کہ وہ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو مطلوب یہ ہے کہ انسان اپنی عقل سے کام لے اور اس کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی رہنمائی کو قبول کرے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۲۱۱)

ایمان کی راہ اہلِ عقل کے لیے کھلتی ہے

آیات بینات سے مراد ہیں وہ کھلے کھلے معجزات جو بنی اسرائیل کو دیے گئے۔ ان کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ایمان و ہدایت کا راستہ ان لوگوں پر کھلتا ہے جو عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں، جو عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی بدستور اپنے تذبذب اور اپنی بے اعتقادی ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ آخر دیکھو، بنی اسرائیل نے کتنے معجزے اپنی آنکھوں سے دیکھے، ان معجزات سے قطع نظر جو حضرت موسیٰ کے ہاتھوں سرزمین مصر پر ظاہر ہوئے، خود بنی اسرائیل کے لیے سمندر خشک ہوا، کوہ طور شق ہوا، ایک خشک پہاڑی

سے اکٹھے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ایک صحرائے بے آب و گیاہ میں ان کے لیے من و سلوٰی کا خوانِ نعمت بچھا دیا گیا، غرض قدم قدم پر ان کے لیے معجزے ظاہر ہوئے لیکن جو بے اعتقادی ان پر روزِ اول سے مسلط تھی وہ بدستور مسلط رہی، پھر انھی کے نقشِ قدم پہ چلنے والوں سے یہ توقع کس طرح کرتے ہو کہ اگر ان کے سامنے ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر ہو جائے گا تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ یہ غلط ہے۔ ان کی آنکھیں بڑے سے بڑے معجزے دیکھنے کے بعد بھی بند ہی رہیں گی۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کا حوالہ دینے میں خاص پہلو یہ ہے کہ جن منافقین کے حال پر یہاں تبصرہ ہو رہا ہے وہ زیادہ تر بنی اسرائیل ہی کے گروہ سے تعلق رکھنے والے تھے، اس وجہ سے ان کے سامنے انھی کی پچھلی تاریخ کا آئینہ رکھ دینے میں ایک نہایت ہی بلیغ تعریض ہے۔

'نعمۃ اللہ' سے مراد

"وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ"۔ نِعْمَةَ اللّٰهِ سے مراد یہاں اللہ کی ہدایت اور شریعت ہے۔ اور اس کے بدلنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی قدر کر کے اس کو ایمان و ہدایت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کی ناقدری کر کے اس کو کفر کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بعض مقامات میں تبدیلی کی اس نوعیت کی وضاحت بھی ہو گئی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا ۲۸ - ابراھیم (ذرا دیکھو تو ان لوگوں کو جنھوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل دیا) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی اس عظیم نعمت کو پا کر اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کسی ایسے نشان کے ظہور کے منتظر ہیں جو حق کے آگے ان کی گردنیں زبردستی خم کر دے تو وہ درحقیقت ہدایت کو ضلالت سے اور نعمت کو نقمت سے بدل رہے ہیں اور ایسے لوگ سنتِ الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی سخت پاداش سے دوچار ہوتے ہیں۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۱۲)

اہلِ باطل کا فریبِ نظر

یہ اس فریبِ نظر کی طرف اشارہ ہے جس میں مبتلا ہونے کے سبب سے اہلِ باطل اپنی باطل پرستیوں ہی میں مگن زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں اور ان کو نبی اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے جب ان کی اس غفلت کے انجامِ بد کی خبر دی جاتی ہے تو ان کا مذاق اڑاتے اور ان کو زچ کرنے کے لیے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر والی آیت میں اشارہ ہو چکا ہے۔

'حق و باطل' دونوں کے لیے مہلت کا قانون

فریبِ نظر یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں حق اور باطل اور کفر و ایمان دونوں کو مہلت ملی ہوتی ہے۔ کوئی شخص اگر نیکی اور اطاعت کی راہ اختیار کرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ ابتلاء کے قانون سے بالاتر ہو جائے بلکہ بعض حالات میں اس کا ابتلاء اس کے ایمان کے اعتبار سے سخت سے سخت تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کفر و نافرمانی کی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بھی سنتِ الٰہی یہ نہیں ہے کہ فوراً خدا کے فرشتے اتر کر اس کی گردن ناپ دیں بلکہ اکثر حالات میں اس کو ایسی ڈھیل پر ڈھیل ملتی جاتی ہے کہ اس کی جسارت

دن پر دن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اسی فریبِ نظر کو یہاں زُیِّنَ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی اس دنیاوی زندگی کا یہ فریب اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دیا گیا ہے کہ وہ اس کے اس پہلو سے نگاہ ہٹا کر کسی اور پہلو سے اس کو دیکھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نگاہوں میں اس زندگی کی اس خاص پہلو سے تزئین شیطان نے کی ہے، جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں اس کی تصریح ہے۔ اور یہ امر بھی ظاہر ہے کہ شیطان کو اس تزئین کا موقع انسان کی عاجلہ پرستی اور اتباعِ شہوات نے فراہم کیا ہے۔

جو لوگ اس فریبِ نظر میں مبتلا ہوتے ہیں ان کو جب اہلِ ایمان ان کے اعمال و عقائد پر دنیا یا آخرت میں کسی پکڑ یا سزا وغیرہ کی یاد دہانی کرتے ہیں تو وہ ان پر ہنستے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ بتاؤ، تمہارا حال اچھا ہے یا ہمارا، اگر ہمارا حال اچھا ہے اور ظاہر ہے کہ تم سے بدرجہا اچھا ہے تو ہم کیوں نہ سمجھیں کہ ہمارا ہی رویہ بھی صحیح ہے۔ پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی تمام بدمستیوں کے باوجود اس قسم کی کوئی گرفت ان پر نہیں ہو رہی ہے جس کے ڈراوے اہلِ ایمان ان کو سناتے ہیں تو اپنی روش پر ان کا اطمینان اور بھی بڑھ جاتا ہے اور وہ ان کا مذاق اڑانے میں اور بھی زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔

"وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ" یعنی اس دنیا میں تو بلاشبہ صورت حال ایسی ہی ہے کہ ظاہر پرست، اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ کا مذاق اڑا سکتے ہیں اس لیے کہ اس دنیا کا کارخانہ جزا اور سزا کے قانون پر نہیں چل رہا ہے بلکہ ابتلا کی سنت کے تحت چل رہا ہے لیکن اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے جو جزائے اعمال کا مظہر ہوگی، اس دن وہ اہلِ ایمان جو دنیا کے اس فریبِ نظر میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے تقویٰ کی زندگی گزاری ہے وہ بالا ہوں گے۔

یہاں صرف یہ فرمایا کہ وہ بالا ہوں گے، یہ نہیں بتایا کہ ان کے مذاق اڑانے والے کہاں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیز بالکل متعین تھی، اس کی خبر ان کو پیغمبر اور اہلِ ایمان کے انذار کے ذریعہ سے دے دی گئی تھی اس وجہ سے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ اہلِ ایمان کی فوقیت کی وضاحت کے لیے یہ فرما دیا کہ "اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔" 'رزق' تعبیر ہے اللہ تعالیٰ کے فضل کی اور اس فضل کے بابت ارشاد ہوا کہ بے حساب ہوگا، یعنی توقعات اور اندازوں، قیاسوں اور گمانوں کے تمام پیمانے ان کے ناپنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اس حقیقت کی تمثیل بعض احادیث میں نہایت مؤثر انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل دوسرے مقام میں آئے گی۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٢١٣)

اہل ایمان کی حوصلہ افزائی

اوپر اہل ایمان کے ساتھ کفار و منافقین کے مذاق و استہزا کا ذکر ہوا ہے، اب اس آیت میں اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے کہ اطمینان رکھو، موقف حق پر تم ہی ہو، اختلافات و نزاعات کے درمیان فیصلہ کرنے والی حقیقت تمہارے ہی پاس ہے اور کفر و ضلالت کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر صرف تمہی ہو جن کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہوئی ہے۔ یہ کفار و منافقین جو تمہاری مخالفت کر رہے ہیں اور تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں یہ سب اس باہمی ضد اور عناد کا کرشمہ ہے جس میں یہ ہمیشہ سے مبتلا ہیں اور جس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہ خدا کی ہدایت کے ایسے دشمن ہو گئے ہیں کہ نہ اس کو خود پانا چاہتے اور نہ کسی دوسرے کو پانے دینا چاہتے تو تم ان کی ان مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود اپنے موقف پر جمے رہو، آزمائش کا یہ دور، جو اللہ تعالیٰ کی سنت کے تحت ہے، گزر جانے کے بعد کامیابی اور فتح مندی تمہارے ہی لیے ہے۔

"کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً" میں کَانَ ہمارے نزدیک تامہ ہے دوام کے مفہوم میں جیسا کہ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے اس نے لوگوں کو ایک ہی دین دیا اور ایک ہی امت بنایا، جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ہمیشہ سے اللہ کا دین اسلام ہی ہے فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا یہی دین فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا اور یہی دین ہے جو اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا۔ نہ اس نے اسلام کے سوا کسی اور دین کو پسند فرمایا نہ امت مسلمہ کے سوا کوئی امت بنانی چاہی۔ اس کے ہاں دین صرف اسلام اور امت صرف امت مسلمہ ہے۔

آیت ۲۱۳ میں اجزا کی تالیف

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً کے بعد فَاخۡتَلَفُوۡا کا لفظ محذوف ہے۔ اس محذوف کو آگے چل کر کھول دیا ہے چنانچہ فرمایا ہے لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ۔ یہ حذف عربی اسلوب کے مطابق تکرار سے بچنے کے لیے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو ایک ہی دین دیا اور ایک ہی امت بنائی لیکن لوگوں نے اس دین میں اختلاف کیا اور اس کے نتیجے میں تحزب اور گروہ بندی میں مبتلا ہوئے تو اللہ نے اپنے انبیا بھیجے کہ وہ لوگوں کو دین میں اختلاف کے نتائج بد سے آگاہ کریں اور حق پر قائم رہنے والوں کو کامیابی اور نجات کی خوشخبری سنا دیں۔ اللہ نے ان نبیوں کو کتابیں عطا فرمائیں، یہ کتابیں حق یعنی قول فیصل کے ساتھ اتریں تاکہ ان تمام نزاعات کا جو دین حق میں پیدا کر دی گئی تھیں، فیصلہ کر کے از سر نو حق کو اجاگر کر دیا جائے۔ لیکن جن امتوں کو یہ حق عطا ہوا انھوں نے نہایت واضح دلائل کی روشنی میں اس حق کو سمجھ لینے کے بعد محض آپس کی ضد م ضدا کے سبب سے خود ہی اس حق میں اختلاف کیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار حق کی وضاحت کے باوجود اختلاف قائم ہی رہا اور انھی لوگوں کے ہاتھوں قائم رہا جو اس حق کے امین بنائے گئے تھے۔

اب اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے اس نزاع و اختلاف میں حق کی راہ پھر اس قرآن کے ذریعہ سے اہل ایمان یعنی پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں پر کھول دی ہے اور اللہ ہی ہے جو اپنی مشیت

اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔

امت مسلمہ کی عظیم ذمہ داری

اس آخری ٹکڑے کے اندر اس عظیم ذمہ داری کی طرف اشارہ بھی ہے جو اس امت پر دینِ حق کی امانت سے متعلق عائد ہوتی ہے کہ اس حق کو پا کر تم بھی اس میں اس طرح کے اختلافات برپا کرنے والے نہ بن جانا جس طرح دوسرے تم سے پہلے بن گئے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بازی کوئی آسان بازی نہیں ہے بلکہ یہ بڑی جان جوکھوں کا کام ہے، دینداری اور حق پرستی کے پشتینی ٹھیکیدار، جن کے کاروبار کی ساری کامیابی کا دارو مدار حق کے گم ہی رہنے میں ہے، تمھیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے بلکہ تمہارے پیچھے جھاڑ کے کانٹے بن کر پڑ جائیں گے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲۱۴)

حاملینِ حق کے لیے امتحان کی کسوٹی

یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جس کی کسوٹی پر ہر وہ جماعت پرکھی جاتی ہے جو اصل حق کی حامل بن کر اٹھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منافقین اور کفار کی اس مخالفت اور اس استہزا سے گھبرا نہ جاؤ، ابھی تو اس راہِ عشق کی یہ ابتدا ہے، آگے اس سے کہیں کٹھن مقامات آنے ہیں، تمھیں بھی ان سارے مراحل سے گزرنا ہے جن سے تم سے پہلے اٹھنے والے حاملینِ حق کو گزرنا پڑا ہے، تم سے پہلے جنھوں نے اس راہ میں قدم رکھے ان کو ایسے مصائب و شدائد پیش آئے اور وہ آزمائشوں کے ہاتھوں اس طرح جھنجھوڑ دیئے گئے کہ رسول اور اس کے ساتھی سب مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ پکار اٹھے۔

'حَتّٰى يَقُوْلَ' ہمارے نزدیک حال کے معنی میں ہے اور مقصود اس سے تصویرِ حال ہے۔ اور مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ کا اسلوب اس فریاد کو ظاہر کرتا ہے جس کی نوعیت امید کے دروازے پر آخری دستک کی ہوتی ہے۔ فرمایا کہ نصرتِ الٰہی کا دروازہ اسی دستک کی کلید سے کھلتا ہے۔ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ ؎

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا ‏ ‏ ‏ ‏ اب لیا چشمۂ بقا تونے

۷۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۱۵-۲۲۱

اوپر کا مضمون، واضح ہو چکا ہے کہ حج کے مضمون سے بطور ایک التفات کے پیدا ہو گیا تھا جس سے اہلِ نفاق کو ایک مناسب موقع تنبیہ ہو گئی اور اہلِ ایمان کو ایک برمحل تذکیر۔ اصل سلسلہ بیان حج اور جہاد و انفاق سے متعلق تھا چنانچہ اس ضمنی مضمون کے ختم ہونے کے بعد وہ سلسلۂ کلام پھر لوٹ آیا اور مذکورہ چیزوں سے متعلق اس دوران میں لوگوں کے اندر جو سوالات پیدا ہوئے ان کے جوابات دیئے گئے۔

عربِ جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کا جوڑ

یہ سوالات، جیسا کہ آگے کی تفصیلات سے واضح ہو گا، انھی مسائل سے متعلق ہیں جو اوپر زیرِ بحث آئے ہیں۔ البتہ شراب اور جوئے سے متعلق جو سوال ہے وہ اس موقع پر ان لوگوں کو شاید بے جوڑ معلوم ہو جو عرب کے اس زمانے کے تمدنی و معاشرتی حالات سے واقف نہیں ہیں جس زمانے میں یہ آیتیں اتری ہیں۔ یہ سوال درحقیقت اس انفاق کے تعلق سے یہاں پیدا ہوا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اہلِ عرب کی ایک محبوب روایت

ہم آیات کی وضاحت کرتے ہوئے بتائیں گے کہ عربِ جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کے جہاں بہت سے مضر پہلو تھے وہاں ان کے بعض مفید پہلو بھی تھے۔ عرب کے سخی اور حوصلہ مند لوگوں میں یہ روایت تھی کہ قحط، خاص طور پر سردیوں کے زمانے میں، وہ جگہ جگہ اکٹھے ہوتے، خوب شراب پیتے، پھر شراب کی مستی میں جس کسی کے اونٹ یا اونٹنی کو چاہتے ذبح کر دیتے، پھر اس کے مالک کو منہ مانگے دام دے دیتے اور اس کے گوشت پر جوا کھیلتے اور ہر شخص جتنا گوشت جیتتا جاتا وہ ان غریبوں اور فقیروں میں لٹاتا جاتا جو اس طرح کی کسی تقریب کی خبر سن کر موقع پر پہلے ہی سے جمع ہو جاتے۔ یہ روایت عرب میں بڑی محبوب روایت تھی۔ جب شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں اور ملک میں حط کی سی حالت پیدا ہو جاتی تو جو لوگ اس قسم کی تقریبیں منعقد کرتے یا ان میں شریک ہوتے ان کو بڑا سخی داتا سمجھا جاتا اور سوسائٹی میں ان کی بڑی عزت ہوتی۔ اس کے برعکس جو لوگ اس چیز سے الگ الگ رہتے ان کے لیے ایک خاص لفظ 'برم' کا استعمال ہوتا جس کے معنی بخیل کے ہیں۔

عرب شعراء اس جوئے اور شراب کا ذکر اپنے قصائد میں بڑی دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ میں یہاں بعض مشہور شعراء کے کلام کے حوالے نقل کرنا چاہتا تھا لیکن اس قسم کی خالص علمی چیزوں سے عام قارئین کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھاتے اس وجہ سے ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

غرض جوئے اور شراب کا یہ پہلو تھا جس کی وجہ سے عربِ جاہلیت کی سوسائٹی میں ان کا شمار فیاضی اور سخاوت کے خصائل اور خدمتِ خلق اور ہمدردیٔ غربا کے محرکات میں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ جب قرآن نے انفاق اور ہمدردیٔ غربا پر بہت زور دیا تو بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب اسلام غریبوں اور یتیموں کی ہمدردی اور ان کی امداد کے لیے مال خرچ کرنے پر اتنا زور دیتا ہے تو آخر اس جوئے اور شراب میں کیا خرابی ہے جو قحط کے زمانے میں غربا کی امداد کا ذریعہ بنتے ہیں۔ قرآن نے یہاں اسی سوال کو نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ ان چیزوں سے سوسائٹی کو بعض اعتبارات سے کچھ فائدے تو ضرور پہنچ جاتے ہیں لیکن ان سے فرد اور سماج دونوں کو جو مادی و اخلاقی نقصانات پہنچتے ہیں وہ ان کے فوائد کی نسبت سے بہت زیادہ ہیں اس وجہ سے اسلام نے ان کو حرام قرار دیا۔

یہ سوال بالکل اسی طرح کا سوال ہے جس طرح کا سوال وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو آج قحط، زلزلہ اور سیلاب وغیرہ کے مصیبت زدوں کی امداد کے لیے فنڈ جمع کرنے کی خاطر رقص و سرود کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں یا سینما کے

شو دکھاتے ہیں یا فلم اسٹاروں کے مظاہرے اور ان کے میچ کراتے ہیں۔ ان لوگوں کو بھی اگر ان برے راستوں کے اختیار کرنے پر (اگرچہ وہ کسی اچھے ہی مقصد سے اختیار کیے گئے ہوں) ملامت کی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ جب ہم یہ کام انسانیت کی خدمت کے لیے کر رہے ہیں تو آخر اس میں کیا خرابی ہے؟ درحقیقت یہ لوگ بھی عرب جاہلیت کی طرح اپنی ان حماقتوں کے صرف انھی پہلوؤں کو دیکھتے ہیں جو ان کی نگاہوں میں بظاہر نفع عوام کے ہیں، ان کی نظر ان ہولناک نقصانات کی طرف نہیں جاتی جو ان سے پورے معاشرے کو پہنچتے ہیں۔ یہاں ہم صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔ آگے آیات کی تفسیر کے تحت اس کی ضروری تفصیل آئے گی۔

اسی طرح اس ضمن میں یتامیٰ سے متعلق بھی ایک سوال پیدا ہوا۔ اوپر انفاق کے سلسلہ میں والدین اور اقربا کے ساتھ یتیموں کا بھی حوالہ دیا گیا تھا کہ اس انفاق کے مستحق وہ بھی ہیں۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے خاندان کے کسی یتیم کے معاملات کو، جس کی اس کے سر ذمہ داری ہے، اپنے ساتھ شامل کر لے اور اس کی ماں کے ساتھ نکاح کر لے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ یہاں قرآن نے اس سوال کے بھی بعض پہلوؤں کو واضح فرمایا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت کیجیے تو وہ بالکل مربوط کڑیوں کی شکل میں نظر آئیں گی۔

آیات يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلْ مَآ أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَٰلِدَيْنِ
۲۱۵-۲۲۱ وَٱلْأَقْرَبِينَ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا۟
مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٌ ﴿٢١٥﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ
لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰٓ أَن
ع ۲۶ ۱۰ تُحِبُّوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾
يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلشَّهْرِ ٱلْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ
كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَكُفْرٌۢ بِهِۦ وَٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ
وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِۦ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ ٱللَّهِ ۚ وَٱلْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ
ٱلْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَـٰتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ
إِنِ ٱسْتَطَـٰعُوا۟ ۚ وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِۦ فَيَمُتْ وَ
هُوَ كَافِرٌ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَـٰلُهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْـَٔاخِرَةِ ۖ وَ

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ
آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ
يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢١٨﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ
الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ
إِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ۗ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۖ قُلِ
الْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١٩﴾ فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَهُمْ
خَيْرٌ ۖ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ
الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٢٠﴾
وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ
مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ
يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ أُولَٰئِكَ
يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ
بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٢١﴾ ع ۲۷ ۵ ۱۱

ترجمہ آیات ۲۱۵ - ۲۲۱

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دو جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو تو وہ والدین، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۲۱۵

تم پر کفار سے جنگ فرض کی گئی اور وہ تمہارے لیے ایک ناگوار شے ہے۔ ممکن ہے

تم ایک شے کو ناگوار خیال کرو حالانکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک شے کو پسندیدہ سمجھو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ۲۱۶

وہ تم سے شہر حرام میں جنگ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اس میں جنگ بڑی سنگین بات ہے۔ لیکن اللہ کے راستہ سے روکنا، اس کا کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس جنگ سے بھی زیادہ سنگین ہے اور جبر و ظلم کے ذریعہ سے لوگوں کو دین سے پھیرنا قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور یہ لوگ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ تم کو تمھارے دین سے پھیر دیں اگر وہ پھیر سکیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اور حالت کفر میں مرے گا تو یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور یہی لوگ دوزخ میں پڑنے والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ البتہ جو لوگ ایمان پر جمے رہیں گے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کے متوقع ہیں۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۲۱۷-۲۱۸

وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو ان دونوں چیزوں کے اندر بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضروریات سے بچ رہے۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم غور کرو، دنیا اور آخرت دونوں کے معاملات میں۔ ۲۱۹

اور وہ تم سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو جس میں ان کی بہبود ہو وہی بہتر ہے

اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کر لو تو وہ تمھارے بھائی ہی ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ کون بگاڑ چاہنے والا ہے اور کون بہبود، اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۲۲۰

اور مشرکہ عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرو۔ ایک مومنہ لونڈی ایک آزاد مشرکہ سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بھلی لگے اور مشرکوں کو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اپنی عورتیں نکاح میں نہ دو، ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بھلا لگے۔ یہ لوگ دوزخ کی طرف بلانے والے ہیں اور اللہ اپنی توفیق بخشی سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنی آیتیں لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ ۲۲۱

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ (۲۱۵)

سوال کرنے والوں کی پس پردہ ذہنیت

اس سورہ میں شروع ہی سے انفاق اور زکوٰۃ کا حکم بار بار آ رہا ہے۔ خاص طور پر آیت ۹۵ میں بیت اللہ کی آزادی کے جہاد کے سلسلے میں بڑی تاکید سے انفاق پر ابھارا ہے۔ وہاں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے تو خطاب عام ہے لیکن روئے سخن درحقیقت ان مسلمانوں کی طرف ہے جو جان و مال کی قربانی میں کمزور تھے قاعدہ ہے کہ آدمی کے دل میں اگر کسی چیز سے متعلق کمزوری ہو، وہ اس کے کرنے کی ہمت نہ کر رہا ہو تو وہ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے بار بار سوال کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ جہاں تک اصل کام کا تعلق ہے اس کو کرنے کے لیے تو وہ جی جان سے حاضر ہے لیکن کرے کیا کہ ابھی تو اصل بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ یہی بھید ہے کہ سوالات سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے بہت کم کیے گئے زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے کیے گئے جو کم ہمت اور بخیل تھے اور اپنی اس کمزوری کو سوالات کے پردے میں چھپانا چاہتے تھے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جنھوں نے انفاق کے حکم کے جواب میں یہ سوال اٹھایا جس کا آیت

زیر بحث میں حوالہ دے کر جواب دیا گیا ہے۔ اس سوال سے خود اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ گویا وہ انفاق کے مطالبوں سے دبے جا رہے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ مطالبے کس حد پر جا کر رکیں گے۔ چنانچہ قرآن نے سوال کرنے والوں کی اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر جواب دیا ہے اور اس جواب کے دو حصے ہیں۔

جواب کے دو پہلو

ایک حصہ تو یہ ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اس کا کوئی حصہ بھی خدا کے جیب میں نہیں جاتا، وہ کسی کے مال و اسباب کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہاتھ سے جو کچھ لیتا ہے دوسرے ہاتھ سے ہماری ہی طرف لوٹا دیتا ہے، ہمارے ہی ماں باپ، ہمارے ہی خویش و اقارب، ہمارے ہی یتیم، ہمارے ہی مسکین اور ہمارے ہی مسافر ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گویا خدا کی راہ میں ہم جو کچھ خرچ کرتے ہیں، کسی دوسرے کی خدمت پر نہیں بلکہ اپنی ہی خدمت پر خرچ کرتے ہیں۔ بس فرق ہے تو یہ ہے کہ اس خرچ کی نوعیت ایک اجتماعی نظم کی ہے جس کا فائدہ سب کو بحیثیت مجموعی پہنچتا ہے۔ یہی حقیقت حضورؐ نے تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِھِمْ وَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَاءِھِمْ (ان کے مالداروں سے لے کر ان کے غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے) کے الفاظ سے واضح فرمائی اور اسی بات کی طرف سورۂ سبا کی آیت قُلْ مَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَھُوَ لَکُمْ ۴۷ (کہہ دو میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے وہ تمہارے ہی لیے ہے) بھی اشارہ کر رہی ہے۔

اس جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان جو نیکی بھی کرتا ہے اسے اطمینان رکھنا چاہیے کہ اس کا ایک ایک ذرہ سب خدا کے علم میں ہے۔ کوئی چیز نہ تو اس کے علم سے باہر ہے اور نہ کسی چیز کو وہ فراموش کرنے والا ہے، پھر جب وہ سب کچھ جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس کا بھرپور صلہ بھی دے گا، پھر جب ہر چیز کا صلہ ملنے والا ہے اور وہ بھی دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک تو ایسے نفع بخش کاروبار میں سرمایہ لگانے سے انسان کیوں گھبرائے؟ وَلَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِیْرَةً وَّلَا کَبِیْرَةً وَّلَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۱۲۱۔ توبہ (اور وہ خدا کی راہ میں جو چھوٹا یا بڑا انفاق کرتے ہیں یا کوئی وادی قطع کرتے ہیں تو یہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کو اس سے بہتر بدلہ دے)

ناگزیر حالات میں انفاق فی سبیل اللہ کی آخری حد

یہ جواب اگرچہ نہایت واضح اور جامع تھا لیکن اس کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ غالباً اسی کمزوری کے سبب سے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، سوال کرتے ہی رہے چنانچہ آگے آ رہا ہے وَیَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ، قُلِ الْعَفْوَ ۲۱۹ (اور وہ تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دو کہ جو ضروریات سے فاضل بچ رہے) اس جواب نے انفاق کی آخری حد معین کر دی کہ یہ انفاق چونکہ امت کے تحفظ و بقا کے جہاد کے سلسلہ کا انفاق ہے اس وجہ سے اس میں دین کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اپنی ناگزیر ضروریات سے جو کچھ بچا سکے وہ سب خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے تیار رہے۔

مولانا فراہیؒ اس آیت کو ذرا اس سے مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی تاویل یہ ہے کہ چونکہ یہ انفاق اس جہاد کے لیے تھا جس کا حکم خانہ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے ہوا تھا اس وجہ سے اس

نے مسلمانوں کی ساری توجہ اپنی طرف جذب کر لی اور اس جہاد کی تیاریوں میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے کہ انفاق کے دوسرے مصارف ـــ والدین، اقربا، یتامٰی، مساکین وغیرہ ـــ کی طرف ان کو وہ توجہ نہیں رہی جو ہونی چاہیے تھی اس وجہ سے لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی مقدار کیا ہو۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے اس کے اوّل حق دار وہ مستحقین ہیں جن کا ذکر ہوا، پھر مزید جو کچھ خرچ کیا جائے تو وہ سب اللہ کے علم میں رہے گا اور وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یہاں مقدار کی تشریح نہیں فرمائی کہ لوگ خود اپنی عقل سے کام لیں اور مختلف دینی ضروریات میں توازن قائم کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی بعض لوگوں کے ذہن میں مقدار سے متعلق شبہ رہ گیا تو انھوں نے پھر سوال کیا۔ ان کے جواب میں یہ تصریح کر دی گئی کہ جو کچھ مستحقین سے فاضل بچے وہ خرچ کرو، چونکہ اوپر مستحقین کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے یہ مختصر جواب کافی ہوا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۱۶)

جہادِ مالی اور جہادِ جانی

اوپر یہ بات تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ یہ انفاق اور یہ جنگ دونوں ایک ہی سلسلے کی باتیں ہیں اس لیے کہ جہاد جان اور مال دونوں سے ہوتا ہے۔ اوپر والی آیت میں اس تردد کو دور کیا ہے جو بعض ذہنوں میں مالی قربانی سے متعلق پیدا ہوا اب اس آیت میں وہ تردد رفع کیا جا رہا ہے جو جان کی قربانی کے معاملہ میں تھا۔ اس تردد کو رفع کرنے کے لیے ایک اصولی حقیقت جو واضح فرمائی وہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے فوز و فلاح اور عروج و کمال کا راستہ خود نہیں طے کر سکتا ہے بلکہ وہ خدا ہی طے کر سکتا ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے، اس لیے کہ اسی کو علم ہے کہ انسانی فطرت کے مضمرات اور اس کی صلاحیتیں کیا ہیں اور وہ طریقے اور قاعدے کیا ہیں جن کو اختیار کر کے وہ اپنی تمام صلاحیتیں اجاگر کر سکتا ہے۔ اگر اپنے لیے خیر و شر کا فیصلہ کرنے کا سارا معاملہ انسان کی اپنی ہی خواہش اور اس کی اپنی ہی عقل پر چھوڑ دیا جاتا تو عجب نہیں کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اپنی زندگی کے پروگرام سے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے خارج کر دیتا جو اس کے عروج و کمال اور اس کے روحانی و اخلاقی ارتقا کا ذریعہ ہیں کیونکہ ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے نفس کے لیے دل پسند ہو بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر نفس پر شاق گزرنے والی ہیں۔ اسی طرح اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ اپنے اندر وہ ساری باتیں جمع کر لیتا جو اس کو اسفل سافلین میں لے جانے والی ہیں کیونکہ یہ ساری باتیں نفس کے لیے نہایت آسان اور لذیذ ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ عجیب رمز ہے کہ جو چیزیں اس کے نفس کو مرغوب ہیں وہ اس کو پست کرنے والی ہیں اور جو چیزیں اس کو بلند کرنے والی ہیں وہ اس کے نفس کو عموماً بہت شاق ہیں۔ اس وجہ سے اس کی فلاح کی راہ بتانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے اور اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے اس کی رہنمائی کی ہے۔

جہاد کا ایک خاص پہلو

جنگ و جہاد کے معاملے کی نوعیت بھی بعینہ یہی ہے۔ اس کے ظاہری پہلو پر نگاہ ڈالی جائے تو اس سے زیادہ ہولناک چیز کیا ہو سکتی ہے، لیکن بسا اوقات اس ہولناک شے کو سب سے زیادہ محبوب بنانا پڑتا ہے اس لیے کہ اگر اس سے گریز کیا جائے تو تمام انسانی اقدار بالکل تباہ ہو کر رہ جائیں۔

یہ جو فرمایا ہے کہ "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان کسی معاملے میں خیر و شر کے پہلو کو متعین کر ہی نہیں سکتا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو اس راہ میں بہت سے مغالطے پیش آتے ہیں اس وجہ سے وہ بسا اوقات ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ یہ صرف اللہ ہی کی شان ہے کہ اس کا علم ظاہر و باطن اور ماضی و مستقبل سب کو محیط ہے اس وجہ سے اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے زندگی کا سارا پروگرام خود بنا کر نازل فرمادیا ہے۔ اور یہ پروگرام ایسا جامع ہے کہ اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی و ترقی کا ضامن ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (٢١٧)

اشہر حرم سے متعلق مزید سوال اور ان کے جواب

اوپر آیات ۱۹۰-۱۹۵ میں اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا تھا کہ اگر مشرکین تمہارے ارادہ حج میں مزاحم ہوں اور ان کی مزاحمت کے سبب سے جنگ کی نوبت آجائے تو تم ان سے جنگ کرو اور ان کو قتل کرو اگرچہ یہ جنگ اشہر حرم میں بلکہ عین حدود حرم میں لڑنی پڑے۔ یہ بات اگرچہ واضح تھی لیکن اشہر حرم کے معاملہ میں زمانہ جاہلیت سے عربوں کی روایات اتنی سخت تھیں اور ان میں جنگ و خونریزی کو وہ اتنا بڑا گناہ سمجھتے تھے کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات آسانی سے نہیں اتر سکتی تھی۔ اس طرح کے معاملات میں چونکہ جذبات کو بڑا دخل ہوتا ہے اس وجہ سے مخالفین کو پروپیگنڈے کا بھی بڑا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق لوگوں کی طرف سے سوال ہوا اور قرآن نے اس سوال کا تفصیل سے جواب دیا۔

اشہر حرم کی حرمت کا قصاص

قرآن نے جس طرح اوپر کی آیات میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اشہر حرم میں قتل و خونریزی بڑا سنگین گناہ ہے اسی طرح یہاں بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ "قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ" (کہہ دو کہ اشہر حرم میں جنگ کرنا بڑی سنگین بات ہے) لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرمادی ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا، اللہ کا کفر کرنا، مسجد حرام سے اللہ کے بندوں کو محروم کرنا اور جو اپنے اعمال و عقائد کے اعتبار سے اس مسجد حرام کے سب سے زیادہ حقدار رہیں ان کو یہاں سے ہجرت پر مجبور کرنا، اشہر حرم میں جنگ کرنے سے بھی بڑے جرائم ہیں، اس وجہ سے اگر ان سنگین تر جرائم کے سدباب کے لیے اشہر حرم میں جنگ کرنی پڑ جائے تو یہ اشہر حرم کی حرمت کا قصاص ہوگا اور یہ گناہ نہیں بلکہ بہت بڑی نیکی ہے۔

فتنہ کا استیصال

پھر خاص طور پر "فتنہ" کا حوالہ دیا ہے کہ اَلْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ کہ یہ فتنہ جو مکہ میں پایا جا رہا ہے یہ تو قتل سے بھی کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔ فتنہ کی تحقیق ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اس سے مراد وہ سنگدلانہ اذیتیں اور تکلیفیں ہیں جو کفار و مشرکین مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کے لیے پہنچا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ فتنہ تو قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ پھر جب یہ فتنہ آج عین بلد امین اور بلد حرام میں موجود ہے، نہ سرزمینِ حرم کا احترام اس سے ظالموں کو روک رہا ہے اور نہ اشہرِ حرم کا احترام اس میں مانع ہے تو آخر مظلوموں کی مدافعت ہی کے لیے اشہرِ حرم میں جنگ کیوں گناہ ٹھہرے!

پھر اس فتنہ کی سنگینی کو واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ کفار و مشرکین مسلمانوں کو دینِ حق سے پھیرنے کے لیے جو مظالم کر رہے ہیں ان کی نوعیت صرف انفرادی واقعات ہی کی نہیں ہے جو کسی وقتی جوش کے تحت صادر ہو گئے ہوں بلکہ مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کے لیے یہ لوگ خونریز جنگوں کا ایک سلسلہ چھیڑنے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور یہ (اگر ان کے امکان میں ہو تو) اس وقت تک دم لینے والے نہیں ہیں جب تک تمہیں اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ کیا ایسے سخت و شدید فتنہ کے مقابلہ کے لیے بھی اشہرِ حرم میں لڑائی گناہ ہی رہے گی۔

ایک مناسب موقع تنبیہ

یہاں تک تو اصل سوال کا جواب تھا۔ اس کے بعد ارتداد کے ذکر کے تعلق سے ایک مناسب موقع تنبیہ مسلمانوں کو بھی کر دی کہ اگر ان کے ظلم و ستم سے مرعوب ہو کر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا اور اسی حالت میں مر جائے گا تو اس کے تمام اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو جائیں گے اور وہ دوزخ میں پڑے گا جس میں ہمیشہ رہے گا۔ یہاں اکارت ہونے کے لیے حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو بظاہر نیکی کے ہیں اور حبط سے مراد ان کا بالکل بے نتیجہ اور بے اثر ہو جانا ہے یعنی اس کفر کے بعد اس نے اسلام کے جو کام کیے وہ بھی بالکل برباد ہو کر رہ جائیں گے۔

ارتداد کی سزا

اس آیت میں ایک خاص نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے۔ اعمال کے اکارت ہونے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو کر رہ جائیں گے، حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ آخرت میں مرتد ہو جانے والوں کے اعمال کا اکارت ہو جانا تو واضح ہے البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں ان کے اعمال کے اکارت ہونے کی شکل کیا ہو گی؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص مرتد ہو جاتا ہے وہ اسلامی ریاست میں جملہ شہری حقوق سے محروم ہو جاتا ہے، ریاست پر اس کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری باقی نہیں رہتی چنانچہ اسی اصول پر اسلامی تعزیرات کا وہ قانون مبنی ہے جو مرتدوں کی سزا سے متعلق ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۱۸)

اہلِ استقامت کا مقام

کفار کے ظلم و ستم سے گھبرا کر مرتد ہو جانے والوں کا انجام بتانے کے بعد ان لوگوں کا مقام بھی بتا دیا جو

کفار کی ان تمام ستم رانیوں کے باوجود اپنے ایمان پر جمے رہیں گے اور ہجرت و جہاد کی بازیاں کھیلیں گے۔ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ بے شک اس بات کے سزاوار ہیں کہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں۔ موقع و محل دلیل ہے کہ یہاں لفظ "اٰمَنُوْا" اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی وجہ سے ہم نے اس کا ترجمہ "اپنے ایمان پر جمے رہے" کیا ہے۔

اس وقت ہجرت اور جہاد مسلمانوں پر بیک وقت دونوں واجب تھے، بیت اللہ کی آزادی اور فتنہ کے قلع قمع کے لیے جہاد کا بھی حکم ہو چکا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور ایمان کے تحفظ کے لیے ہجرت کا بھی، اور یہ دونوں ہی مہم کے بڑے سخت تھے اس وجہ سے ان دونوں ہی باتوں کا ذکر فرمایا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے یہ رہنمائی بھی تھی کہ کفار کی ستم رانیوں کا جواب ارتداد نہیں بلکہ ہجرت اور جہاد ہے۔

جو لوگ یہ بازیاں کھیل سکیں ان کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ یعنی یقین تو ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد بھی کسی کو نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ کوئی بھی اپنے عمل سے نجات نہیں حاصل کرے گا بلکہ جس کو بھی نجات حاصل ہوگی خدا کی بخشش اور اس کی مہربانی ہی سے ہوگی، چنانچہ آگے فرما دیا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲۱۹)

جوئے اور شراب سے متعلق سوال کی نوعیت

اوپر فصل کی تمہید میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ شراب اور جوئے سے متعلق یہ سوال ان کے ان فوائد کو سامنے رکھ کر بعض لوگوں نے کیا جو اس وقت کی عرب کی مخصوص سوسائٹی کی روایات کی بنا پر ان میں پائے جاتے تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کی نوعیت موجودہ قمار بازی اور موجودہ بادہ خواری سے بالکل مختلف تھی۔ ہمارے ہاں جوا نری قسمت آزمائی اور بربادی اور شراب نوشی نری عیاشی ہے لیکن عرب جاہلیت میں ان کے اندر ہمدردیِ خلق کے بعض ایسے پہلو بھی تھے جن کی بنا پر اہلِ عرب ان کو رذائل میں نہیں بلکہ فضائل میں گنتے تھے۔ اسی پہلو سے یہاں انفاق اور جہاد کے سلسلے میں ان کے متعلق بھی سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی ایک راہ تو یہ بھی ہے کہ قحط کے زمانے میں مالدار لوگ شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں اور جو کچھ جیتتے جاتے ہیں وہ غریبوں میں لٹاتے جاتے ہیں، پھر اس کے متعلق قرآن کا کیا ارشاد ہے؟

مضر چیز کے بارے میں اسلامی شریعت کا مزاج

قرآن نے اس کا جواب دیا کہ ٹھیک ہے، ان میں بعض پہلو فائدے کے بھی ہیں لیکن ان سے سوسائٹی کو جو نقصانات پہنچتے ہیں وہ ان کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں اس وجہ سے اخلاقی بہبود کے نقطۂ نظر سے یہ ناجائز ہیں۔ گویا قرآن نے یہاں اسلامی شریعت کا یہ مزاج بتا دیا کہ جن چیزوں کا نقصان ان کے نفع سے زائد

ہے وہ اس شریعت میں ممنوع ہیں۔

ایک غلط فہمی

بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ قرآن نے یہاں جوئے اور شراب کے جن فوائد و منافع کا اعتراف کیا ہے وہ ان کے مادی اور طبّی منافع ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے اوّل تو قرآن کو اشیا یا اعمال کے طبّی و مادی فوائد سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور اگر کسی پہلو سے ہو بھی تو آخر دنیا میں کون سی بُری سے بُری اور ناپاک سے ناپاک چیز ہے جس کے اندر مضرت کے ساتھ کچھ پہلو فوائد کے نہ ہوں، پھر جوئے اور شراب ہی کی کیا خصوصیت ہے کہ قرآن نے ان کے ان فوائد کا اعتراف کیا؟ آخر چوری، زنا، سود اور خنزیر وغیرہ کے اندر جو بعض پہلو فوائد کے ہیں قرآن نے ان کا اظہار کیوں نہیں کیا۔

غلط فہمی کے وجوہ

ہمارے نزدیک اس ساری غلط فہمی کے سبب تین ہیں۔

ایک تو یہ کہ لوگوں نے اس جوئے اور شراب کو بالکل اس جوئے اور شراب پر قیاس کیا جس کا رواج ہماری سوسائٹی میں ہے اس وجہ سے وہ اس کے اندر کسی اخلاقی اور انسانی قدر کے پائے جانے کا تصور ہی نہیں کر سکے۔

دوسرا یہ کہ لوگوں کی نظر عام طور پر عرب جاہلیت کے کلام، ان کی روایات اور ان کے معروف و منکر پر بہت کم ہے اس وجہ سے قرآن کے ایسے اشارات تک مشکل ہی سے نگاہ پہنچتی ہے۔

تیسرا یہ کہ لوگ قرآن کے الفاظ پر بھی غور کرنے کا حق پورا پورا ادا نہیں کرتے سرسری طور پر جو بات سامنے آجاتی ہے اسی کو لے اُڑتے ہیں۔ دیکھیے یہاں آیت میں "نفع" کا مدِمقابل لفظ "اثم" استعمال کر کے قرآن نے بالکل واضح کر دیا تھا کہ یہاں زیر بحث ان کے مادی اور طبّی فوائد نہیں ہیں بلکہ اخلاقی فائدے ہیں اس لیے کہ اثم کا لفظ طبّی نقصانات کے لیے نہیں استعمال ہوتا بلکہ اخلاقی مفاسد اور گناہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگر سوال شراب کے طبّی نفع و نقصان سے متعلق ہوتا تو نفع کے مقابل میں "ضرر" کا لفظ استعمال ہوتا نہ کہ "اثم" کا۔

اس آیت نے اسلامی شریعت کا یہ مزاج واضح کر دیا کہ جو چیزیں اخلاقی اعتبار سے مضر ہیں، اگر ان سے کوئی فائدہ بظاہر بنی نوع انسان کو پہنچتا بھی ہو یا پہنچایا بھی جا سکتا ہو جب بھی ان کے ضرر کے پہلو کے غلبہ کے سبب سے اسلام میں ان سے احتراز ہی واجب ہے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ لوگ لاٹری ڈالیں تاکہ اس کی یافت سے ایک شاندار مسجد تعمیر کریں یا فلم اسٹاروں کا ایک امدادی شو منعقد کریں تاکہ اس کے ٹکٹ فروخت کر کے کسی مصیبت زدہ علاقے کے مسلمانوں کی مدد کریں۔ بظاہر یہ کام نیکی اور خدمتِ خلق کے ہیں لیکن اسلام نے اس نیکی کو جائز نہیں رکھا کیونکہ اس نیکی کے پردے میں جو بدی پرورش پاتی ہے وہ اس نیکی سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

جواب میں تدریج کی حکمت

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ

ایک ہی چیز سے متعلق اس بار بار کے سوال کا سبب میں واضح کر چکا ہوں کہ یہ سوالات ان کمزور قسم کے لوگوں

کی طرف سے ہیں جو انفاق میں مشقت محسوس کر رہے تھے۔ ان کی اسی کمزوری کا لحاظ تھا کہ قرآن نے ان کو جواب بھی درجہ بدرجہ دیا تاکہ ان پر زیادہ شاق نہ گزرے۔ دوا سے گھبرانے والے مریض کو اگر پوری خوراک ایک ہی مرتبہ میں نہ دی جا سکتی ہو تو تقاضائے حکمت یہی ہے کہ وہ دو تین مرتبہ میں دی جائے۔ چنانچہ انفاق کے متعلق بار بار سوال کرنے والوں کو بھی قرآن نے آخری اور فیصلہ کن جواب یہ تیسری مرتبہ میں دیا۔ یہ جواب اگر پہلی ہی مرتبہ میں دے دیا جاتا تو عجب نہیں کہ زیادہ کمزور قسم کے لوگوں کے ایمان کے لیے آزمائش بن جاتا۔

یہ جواب نہایت مختصر ہے مگر ساتھ ہی نہایت واضح اور قطعی ہے۔ فرمایا کہ قُلِ الْعَفْوَ (جو فاضل بچے وہ خرچ کرو) فاضل سے مراد ظاہر ہے کہ آدمی کی اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچے وہ ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں وہ انفاق زیرِ بحث نہیں ہے جو عام مستحقین کے لیے صدقات واجبہ اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں ہر مسلمان پر ضروری ہے بلکہ یہ وہ انفاق ہے جس کا تعلق جہاد، اعلائے کلمۃ اللہ اور تحفظ و دفاعِ ملت سے ہے۔ ان مقاصد کے لیے ایک مسلمان پر انفاق کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی یہ آخری حد بتا دی گئی ہے کہ اگر ملت کی حفاظت و مدافعت کے لیے ضرورت پڑ جائے تو اپنی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچا سکو وہ سب اس جہاد میں قربان کر دو۔ قومی زندگی میں ایسے حالات و اوقات بھی پیش آتے ہیں جب قوم و مذہب کے لیے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے اور دنیا کی ہر غیرت مند قوم خواہ کافر ہو یا مومن، یہ بازی کھیلنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اسلام نے یہ چاہا ہے کہ ہم اس قربانی و جاں بازی کے لیے اپنی خوشی سے تیار رہیں۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ: یہ اوپر کے پورے سوال و جواب پر تبصرہ ہے۔ ہم عرض کر آئے ہیں کہ یہ سارے سوالات انھی مسائل سے متعلق ہیں جو اشہرِ حرم، جہاد اور انفاق سے متعلق حج کے سلسلہ میں مذکور ہوئے تھے، انھی مسائل سے متعلق بعد میں کچھ مزید سوالات پیدا ہوئے تو ان کی وضاحت فرمائی اور بطور تذکیرِ نعمت کے اشارہ فرما دیا کہ یہ اوپر کے اجمالات کی توضیح اور اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جو اس نے سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (کہ ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا سنانا، تو جب ہم سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت)۔

یہاں اس تبیین کا فائدہ یہ بتایا ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم غور و فکر کرو۔ قرآن مجید نے مسائل کے بیان کرنے میں یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ ہر بات کے ہر پہلو کو ایک ہی ساتھ نہیں پیش کیا بلکہ ان کے بعض پہلو مجمل چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب ذہنوں میں ان سے متعلق سوالات پیدا ہوئے تو تدریج کے ساتھ ان کی وضاحت فرمائی، یہ محض اس لیے ہے کہ لوگوں کو غور و فکر کی تربیت حاصل ہو اور لوگ دین کے معاملات میں محض لکیر کے فقیر بن کر نہ رہیں بلکہ اس کے اسرار و رموز اور فوائد و مصالح تک پہنچنے کے لیے خود اپنی عقل بھی

استعمال کریں۔

ایک پر حکمت اضافہ

بظاہر تو یہ آیت تَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ پر ختم ہو جاتی ہے لیکن یہاں اس کے بعد فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ کا اضافہ بھی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ نہایت قیمتی ہے۔ اوپر کے سارے سوالات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سوالات جو پیدا ہوتے تو محض اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ لوگوں کی نگاہوں میں عام طور پر وہ توازن نہیں ہوتا جو دین اور دنیا دونوں کے فوائد و مصالح کو صحیح صحیح تول سکے۔ اس عدم توازن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر دینداری کی طرف میلان ہوا تو لوگ دین کو نری رہبانیت بنا کے رکھ دیتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ و جہاد خواہ کسی حالت میں بھی ہو، ان کے ہاں خلافِ تقویٰ قرار پا جاتا ہے اور اگر دنیا داری کی طرف میلان ہوگا تو جوئے اور شراب جیسی چیزوں کو بھی محض اس خیال کی بنا پر نیکی قرار دینے کی کوشش کریں گے کہ آخر ان میں بھی تو کچھ پہلو فائدے کے ہیں۔ قرآن نے فکرِ انسانی کی تربیت کی جو راہ اختیار کی ہے وہ اس عدم توازن کو دور کر کے اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا حق صحیح صحیح پہچان سکے۔

لفظ عفو سے اشتراکیت کا غلط استدلال

عفو کے لفظ سے اشتراکی نظریات سے متاثر لوگوں نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ ناگزیر ضروریات سے فاضل آمدنی ایک اسلامی حکومت اجتماعی مقاصد کے لیے اپنے قبضہ میں لے سکتی ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق حکومت سے نہیں بلکہ عام افراد سے ہے کہ وہ اپنی آزادیِ رائے سے اس حد تک ایثار کے لیے تیار ہیں، دوسرے یہ کہ اس چیز کا تعلق، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، عام حالات سے نہیں ہے بلکہ ایمرجنسی کے حالات سے ہے جب ملت کے تحفظ کا سوال سامنے آن کھڑا ہو۔ ایسے حالات میں اول تو افراد خود ہی ہر طرح کی قربانیاں کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اگر حکومت کوئی پابندی عائد کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ اگرچہ اسلام کا حقیقی رجحان یہی ہے کہ افراد کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کے اندر ارادہ و اختیار کی آزادی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ اسلام کی نظر میں اس آزادی کی جتنی قدر ہے، اتنی قدر مجبوری اور پابندی کی نیکی کی نہیں ہے۔

فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (۲۲۰)

یتیموں کے بارے میں مسلم معاشرہ کی ذمہ داری

یتامیٰ سے متعلق یہ سوال بھی اسی معاشرتی خدمت و تعاون کے تعلق سے پیدا ہوا جس کی ہدایت آیت ۲۱۵ میں دی گئی ہے۔ اسلام نے جب ہر شخص پر اس کے والدین و اقربا کے ساتھ ساتھ یتامیٰ اور خاص کر خاندان کے یتامیٰ کی ذمہ داری بھی ڈالی کہ اگر وہ محتاج و بے وسیلہ ہوں تو ان پر خرچ کرو اور اگر ان کے پاس مال ہو تو پوری احتیاط کے ساتھ (حتی الامکان بلا معاوضہ) اس کی نگرانی اور اس کو نشو و نما دینے کی کوشش کرو تو لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ایک شخص انتظامی سہولت کے پیشِ نظر کسی یتیم کے مال یا اس

کے کاروبار کو اپنے مال اور کاروبار میں شامل کرلے اور اس کے حقوق کی حفاظت کے پہلو سے ایسے یتیم کی ماں سے نکاح کرلے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؛ یہ سوال خاص طور پر اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اسلام نے یتیموں کے حقوق اور ان کے مال کے تحفظ سے متعلق جن احتیاطوں کی تاکید فرمائی ہے وہ بڑی ہی سخت ہیں۔ قرآن میں صاف ارشاد ہے کہ نیک مقصد کے سوا یتیموں کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو، یہ بھی تنبیہ ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرتے ہیں، ایک متقی آدمی ان تنبیہات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کی اجازت کے بغیر یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ یتیموں کے معاملات اور اپنے معاملات کو یکجا کر سکے۔

اس سوال کے جواب میں قرآن نے اصولی بات جو فرمائی وہ یہ ہے کہ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ اصل مقصود یہ ہے کہ ہر پہلو سے یتیموں کی بہبود پیش نظر رہے، جس چیز میں ان کی بہتری ہو وہی بہتر ہے۔ اگر تمھارے حالات کے لحاظ سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان کے معاملات الگ رکھ کر ان کی دیکھ بھال کرو تو ایسا کرو، اور اگر محسوس کرو کہ اپنے ساتھ شامل کر کے زیادہ بہتر طریقہ سے یہ فرض انجام دے سکتے ہو تو تمھیں اس کی بھی اجازت دی جاتی ہے، آخر وہ تمھارے اپنے ہی بھائی بند تو ہیں، پھر علیحدگی کیوں لازم قرار دی جائے؛ لیکن اس اجازت کے ساتھ یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ یعنی ہر شخص یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ اس اشتراک سے کس کے پیش نظر یتیم کی بہبود ہے اور کس کے پیش نظر اس پردے میں اس کے مال کو ہڑپ کرنا، اگر کسی نے اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھایا تو وہ یاد رکھے کہ خدا عزیز و حکیم ہے، کوئی اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکے گا۔ ساتھ ہی اس احسان کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے تمھاری سہولت کے پیش نظر تمھیں اس قسم کے اشتراک کی اجازت دے دی ورنہ یہ عین ممکن تھا کہ وہ تمھیں اس اشتراک سے روک دیتا اور ساتھ ہی یہ حکم دے دیتا کہ یتیم کے مال یا جائداد کی حفاظت کرو۔ اگر ایسا ہوتا تو تم ایک بڑی مشقت میں پڑ جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تم پر بڑا کرم فرمایا کہ اس نے بغیر کسی مشقت میں ڈالے تمھارے لیے خدمت اور نیکی کی ایک راہ کھولی تو تم میں سے ہر شخص خدا کے اس احسان کا شکر گزار ہو اور اس اجازت سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

’عنت‘ کا مفہوم اسلامی شریعت کا مزاج

’عنت‘ کے معنی زحمت اور مشقت کے ہیں اور ’اعنات‘ کے معنی مشقت میں ڈالنے کے ہیں۔ اس سے اسلامی شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے کہ اس شریعت نے مشقت میں ڈالنے کی نہیں بلکہ مشقتوں سے بچانے کی راہیں کھولی ہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا
الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ
وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲۲۱)

مشرکات سے نکاح کی ممانعت

اور پر یتیموں کی بہبود کے پہلو سے جس اشتراک کی اجازت دی گئی ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی یتیم کا ولی، یتیم کے حقوق ہی کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے یہ مناسب خیال کرے کہ اس یتیم کی ماں سے نکاح کر لے تاکہ اس طرح ایک بیوہ کی پرورش اور اس کی حفاظت و عصمت کا انتظام بھی ہو جائے اور یتیم کے حقوق کی نگہداشت کے لیے اس کے گھر میں ایک بیدار نگاہ رکھنے والی بھی آ جائے تو اس کا حکم کیا ہے؟ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مصلحت بجائے خود اہمیت رکھنے والی ہے اور اس کو پیشِ نظر رکھ کر یتامیٰ کی ماؤں سے نکاح کیا جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مومنہ ہوں، یہ شرط اس وجہ سے لگائی ہے کہ اس وقت تک صورتِ حال یہ تھی کہ بہت سے ایسے یتیم بھی تھے جن کی مائیں اسلام میں داخل نہیں ہوئی تھیں اس وجہ سے یہ ہدایت ہوئی کہ اس مصلحت کی خاطر بھی مشرکات سے نکاح کی اجازت بہرحال نہیں ہے کیونکہ اس سے دوسرے مفاسد کے پیدا ہونے کے اندیشے ہیں جن کی طرف آگے اشارہ فرمایا ہے۔

مشرکین اور مشرکات کا استعمال بطور اصطلاح

یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرکین اور مشرکات کا لفظ قرآن میں خاص عرب کے مشرکین اور مشرکات کے لیے بطور لقب یا علَم کے استعمال ہوا ہے، دوسری قومیں جن میں شرک پایا جاتا ہے، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشابہ اہل کتاب میں سے، وہ براہِ راست اس لفظ کے تحت نہیں ہیں اس وجہ سے ان کے احکام کی تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔

پسند اور ناپسند کے لیے اسلامی معیار

یہاں بنی اسماعیل کے مشرکین اور مشرکات سے متعلق یہ وضاحت فرما دی کہ نہ ان کی عورتوں کو اپنے نکاح میں لینا تمہارے لیے جائز ہے اور نہ اپنی لڑکیاں ان کو دینا جائز ہے۔ اس ممانعت کے ساتھ یہ وضاحت بھی بڑی تاکید کے ساتھ فرما دی کہ ایک مسلمان لونڈی ایک آزاد مشرکہ پر ترجیح رکھتی ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنی ہی دلکش معلوم ہو، اسی طرح ایک غلام مومن ایک آزاد مشرک پر ترجیح رکھتا ہے، اگرچہ وہ تمہیں کتنا ہی بھلا لگتا ہو۔ پھر اس کی وجہ بتا دی کہ اسلام میں پسند اور ناپسند کے لیے معیار نہ ظاہری شکل و صورت ہے، نہ نسل و نسب اور نہ آزادی اور غلامی بلکہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ اس وجہ سے اب تمہارے رشتے ناتے قبائل اور برادریوں کے پابند نہیں رہ گئے بلکہ عقیدے اور عمل کے تابع ہو گئے ہیں۔ قریش کی ایک مہ جبین شہزادی تمہارے لیے دو کوڑی کی ہے اگر وہ ایمان کے زیور سے آراستہ نہیں ہے اور سواحلِ افریقہ کی ایک کالی کلوٹی لونڈی تمہارے لیے حورِ جنت ہے اگر اس کا دل جمالِ ایمان و اسلام سے نورانی ہے۔ اسی طرح تمہارے لیے یہ بات تو جائز ہے کہ تم اپنی لڑکی کا ہاتھ ایک غلام زادہ کے ہاتھ میں پکڑا دو اگر وہ دولتِ ایمان رکھتا ہے اور قریش کے ایک صاحبِ شوکت سردار کو بھی اپنی لڑکی دینے سے انکار کر دو اگر وہ ایمان و اسلام سے محروم ہے۔

زندگی پر رشتے ناتے کے اثرات

پھر اس کا فلسفہ بتایا کہ رشتے ناتے کے اثرات زندگی پر سطحی اور سرسری نہیں ہوتے بلکہ بڑے گہرے ہوتے ہوتے ہیں، اگر آدمی ان چیزوں میں عقائد و اعمال کو کوئی اہمیت نہ دے، صرف حسن، یا مال، یا خاندان یا مصلحت ہی کو سامنے رکھے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ہی خرچ پر اپنے گھر میں ایک ایسی بلا پال لے جو صرف اسی کے نہیں بلکہ اس کی آئندہ نسلوں کے ایمان و اسلام کا بیج بھی مار دے۔ شادی بیاہ کے تعلقات سے مذہب، روایات

اور تہذیب و تمدن میں جو عظیم تبدیلیاں کی ہیں اس کی عملی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر بے شمار عقائدی گمراہیاں ان عورتوں کے ذریعہ سے پھیلیں جو وہ دوسری بت پرست قوموں میں سے بیاہ کے لائے۔ اسی طرح ہمارے ہاں مغل سلاطین نے ہندو راجاؤں کے ہاں سیاسی مصالح کے تحت جو شادیاں کیں تو ان کی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد، اوہام، رسوم اور عبادت کے طریقے بھی اپنے گھروں میں گھسا لائے۔ آج بھی جو لوگ قوموں اور مذہبوں کے امتیازی نشانات و نظریات کو ختم کرنے کے درپے ہیں وہ اس کا سب سے زیادہ کارگر نسخہ آپس کی شادیوں ہی کو سمجھتے ہیں اس وجہ سے ایک مسلمان کو اس معاملے میں بے پروا اور سہل انگار نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس عظیم حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس رب پر وہ ایمان رکھتا ہے اس کی دعوت مغفرت اور جنت کی طرف ہے اور جو لوگ اس ایمان سے محروم ہیں وہ دوزخ کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں، عام اس سے کہ عورت ہوں یا مرد۔

یہ آیت بھی چونکہ اوپر کے مباحث کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہے اس وجہ سے آخر میں فرما دیا کہ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ اور اللہ اپنی آیتوں کی وضاحت کر رہا ہے تاکہ لوگ یاددہانی حاصل کریں۔

اوپر کی دو آیتوں میں یتامیٰ سے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں سورۂ نساء میں بھی ان کی طرف اشارے ہیں۔ ہم متعلق آیات یہاں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ دونوں کو سامنے رکھنے سے ہر پہلو واضح ہو جائے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا	اور یتیموں کا مال ان کے حوالہ کرو اور ان کے اچھے مال
الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ	کے بدلے اپنا برا مال نہ دو اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں
اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝	کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اگر تمہیں
وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى	اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ کما حقہٗ انصاف نہ کر سکو گے
فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى	تو جو راضی ہوں عورتوں میں سے ان سے نکاح کر لو، دو دو
وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا	تین تین چار چار تک۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ عورتوں میں عدل نہ کر
فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ	سکو گے تو ایک ہی پر قناعت کرو، یا پھر جو تمہاری لونڈیاں
اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ وَاٰتُوا النِّسَاۗءَ صَدُقٰتِهِنَّ	ہوں۔ اور یہ زیادہ اس بات کے قرین ہے کہ تم عدل سے
نِحْلَةً ۭ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ	نہ ہٹو۔ اور ان عورتوں کو راضی خوشی ان کے مہر دو، اگر
مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْۗــــًٔـا مَّرِيْۗـــــًٔا ۝	وہ اس کا کوئی حصہ تمہارے لیے بخوشی چھوڑ دیں تو
وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ	اس کو بااطمینان اپنے تصرف میں لاؤ اور بے وقوف یا
جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْھُمْ	نادان بچوں کو اپنا وہ مال حوالہ نہ کرو جو خدا نے تمہاری
فِيْهَا وَاكْسُوْھُمْ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا	قیام معیشت کا ذریعہ بنایا ہے، البتہ اس میں ان کو کشادگی

مَعْرُوْفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا	کے ساتھ کھلاؤ پہناؤ اور ان کو تسلی دیتے رہو اور یتیموں
النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا	کو جانچتے رہو، جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تو اگر تم
فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ	ان میں معاملات کی سوجھ بوجھ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے
اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَ	کرو اور فضول خرچی اور جلد بازی کے ساتھ کہ کہیں وہ بڑے
مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ	ہو جائیں ان کا مال ہڑپ نہ کرو۔ جو غنی ہو تو چاہیئے کہ
كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ	وہ احتراز کرے اور جو محتاج ہو تو وہ دستور کے مطابق اس
فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ	میں سے لے، پھر جب تم ان کا مال ان کے حوالہ کرنے
فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ	لگو تو ان پر گواہ ٹھہرا لو، ویسے اللہ حساب لینے کے
حَسِيْبًا (۶-۴ نساء)	لیے کافی ہے۔

۷۲۔ آگے کا مضمون —— آیات ۲۲۲-۲۳۱

اوپر آپ نے دیکھا کہ کس طرح حج کے تعلق سے جہاد، جہاد کے تعلق سے انفاق، انفاق کے تعلق سے جوئے اور شراب اور ساتھ ہی یتامیٰ کی ہمدردی کے مسائل یکے بعد دیگرے پیدا ہو گئے۔ اسی طرح یتامیٰ کی ماؤں کے ساتھ نکاح کے مسئلہ نے ایک طرف تو طلاق و نکاح سے متعلق بعض مناسب وقت مسائل کے بیان کے لیے تقریب پیدا کر دی اور دوسری طرف عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے تقاضے سے بعض احکام و ہدایات کے نزول کے لیے نہایت سازگار فضا پیدا ہو گئی اور قرآن مجید کا طریقہ یہی ہے کہ جب ایک بات کے بیان کے لیے موزوں حالات پیدا ہو گئے ہیں تو بارش کی طرح کلام ایک وسیع دائرے میں برس گیا ہے چنانچہ یہاں بھی متعلق مسائل کا ایک نہایت اہم حصہ بیان ہو گیا ہے۔ ان مسائل کا آغاز ایام ماہواری سے متعلق ایک سوال کے جواب سے ہوا ہے۔ اس خاص سوال کی اہمیت اس سلسلے میں یہ ہے کہ نکاح و طلاق کے بہت سے مسائل کی، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو گا، یہی چیز حد بندی کرتی ہے۔ اس وجہ سے اصل مسائل سے پہلے خود اس چیز سے متعلق شریعت کے احکام و ہدایات کا جاننا نہایت ضروری تھا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۲۲-۲۳۱

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ
فِى الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ
فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ

يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ
اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ
مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٢٣﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ
اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿٢٢٤﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ
يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٢٥﴾ لِلَّذِيْنَ
يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٢٧﴾
وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ
لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ
اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٨﴾ اَلطَّلَاقُ ع ٢٨ ١٧
مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ
لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا
يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا
تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٢٩﴾

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا
غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ
ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ
يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ
بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا ۚ
وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ
هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ
الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
ع ۲۹ ۴ ۱۳ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾

ترجمۂ آیات ۲۲۲-۲۳۱

اور وہ تم سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو، یہ ناپاکی ہے تو عورتوں سے حیض کے دنوں میں الگ رہو، اور ان سے قربت نہ کرو جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں۔ پس جب وہ صفائی کر لیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے، اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ، اور اپنے لیے آگے بڑھاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ تمہیں اس سے لازماً ملنا ہے اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دو۔ ۲۲۲-۲۲۳

اور اللہ کو اپنی ایسی قسموں کا ہدف نہ بناؤ کہ احسان نہ کرو گے یا حدودِ الٰہی کا احترام نہ کرو گے یا لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ گے، اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اللہ تم سے

تمھاری عادی قسموں کے باب میں تو کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن ان قسموں کے باب میں تم سے ضرور مواخذہ کرے گا جو تمھارے دل کے ارادے کا نتیجہ ہیں اور اللہ بخشنے والا اور حلیم ہے جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے اور اگر طلاق کا فیصلہ کر لیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۲۴۔۲۲۷

اور مطلقہ عورتیں اپنے بارے میں تین حیض تک توقف کریں، اور اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو کچھ پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں۔ اور اس دوران میں ان کے شوہر ان کے لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ سازگاری کے طالب ہیں اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں، ہاں مردوں کے لیے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ۲۲۸۔

طلاق دو مرتبہ ہے۔ پھر دستور کے مطابق یا تو روک لینا ہے یا احسان کے ساتھ رخصت کر دینا ہے، اور تمھارے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ ان عورتوں کو دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لو مگر اس صورت میں کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے تو ان پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیہ میں دے، یہ اللہ کے حدود ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرو اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے جائز

نہیں ہے تاآنکہ وہ اس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔ پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو پھر ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ مراجعت کر لیں، اگر یہ توقع رکھتے ہوں کہ وہ اللہ کے حدود پر قائم رہ سکتے ہیں، یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں، وہ ان کو واضح کر رہا ہے، ان لوگوں کے لیے جو علم کے طالب ہیں۔ ۲۲۹-۲۳۰

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ پہنچ جائیں اپنی مدت کو تو ان کو دستور کے مطابق روک لو یا دستور کے مطابق رخصت کر دو اور تم ان کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہ روکو کہ تم حدود سے تجاوز کرو اور جو ایسا کرے گا تو وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو اور اس کتاب و حکمت کو یاد رکھو جو اس نے تمہاری نصیحت کے لیے اتاری اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۲۳۱

۷۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ (۲۲۲)

ایامِ حیض کے احکام

ایامِ ماہواری سے متعلق یہ سوال صرف اسی پہلو سے نہیں پیدا ہوا کہ اس زمانے میں عورت سے قربت جائز ہے یا نہیں، اس زمانے میں قربت تو نہ صرف تمام آسمانی مذاہب میں ممنوع رہی ہے بلکہ عرب جاہلیت بھی اس کو ناجائز سمجھتے تھے، ان کے اشعار میں مختلف پہلوؤں سے اس کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ اس سے متعلق دوسرے بہت سے مسائل تھے، جن میں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی تھی مثلاً یہ کہ اس زمانے میں عورت سے اجتناب کے حدود کیا ہیں، اس کے لیے طہارت کے کیا آداب و شرائط ہیں اور طلاق و عدت وغیرہ کے معاملات میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ بالخصوص موخر الذکر سوال کی بڑی اہمیت تھی اس لیے کہ اس کے اثرات نکاح، طلاق، عدت، وراثت اور دوسرے تقریباً تمام عائلی مسائل پر پڑتے تھے اس وجہ سے نکاح و طلاق کی اس

بحث میں قرآن نے سب سے پہلے اسی سوال کو لیا اور اس کا جواب دیا۔

علیحدگی کی حد

اس زمانے میں عورت سے علیحدہ رہنے (اعتزال) کا جو حکم دیا ہے اس کی صحیح حد آگے کے الفاظ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ (اور تم ان سے قربت نہ کرو یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں تو جب وہ پاکیزگی حاصل کر لیں تو ان کے پاس آؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے) سے خود واضح ہو رہی ہے کہ یہ علیحدگی صرف زن و شو کے خاص تعلق کے حد تک ہی مطلوب ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کو بالکل اچھوت بنا کے رکھ دو، جیسا کہ دوسرے مذاہب میں ہے۔ اس چیز کی وضاحت احادیث اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ہوئی ہے۔

اس آیت میں 'طہر' اور 'تطہر' دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ طہر کے معنی تو یہ ہیں کہ عورت کی ناپاکی کی حالت ختم ہو جائے اور خون کا آنا بند ہو جائے اور تطہر کے معنی یہ ہیں کہ عورت نہا دھو کر پاکیزگی کی حالت میں آجائے۔ آیت میں عورت سے قربت کے لیے طہر کو شرط قرار دیا ہے اور ساتھ ہی فرما دیا ہے کہ جب وہ پاکیزگی حاصل کر لیں تب ان کے پاس آؤ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ چونکہ قربت کی ممانعت کی اصلی علت خون ہے اس وجہ سے اس کے انقطاع کے بعد یہ پابندی تو اٹھ جاتی ہے لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب عورت نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کر لے تب اس سے ملاقات کرو۔

تمام بدیہیات فطرت شریعت کے اجزا ہیں

فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ (تو ان کے پاس آؤ، جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں حکم دیا ہے) سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام بدیہیات فطرت اللہ کے اوامر میں شامل ہیں اور اس پہلو سے وہ شریعت الٰہی کے اجزا ہیں اگرچہ لفظوں میں خدا کی طرف سے ان کا حکم دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو۔ مثلاً یہ کہ اگرچہ اس بات کا کہیں حکم نہیں دیا گیا ہے کہ لقمہ منہ میں ہی ڈالنا چاہیے، ناک یا آنکھ میں نہیں ڈالنا چاہیے تاہم یہ خدا کا حکم ہے اس لیے کہ فاطر نے ہماری فطرت یہی بنائی ہے، اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرے تو درحقیقت وہ خدا کے ایک واضح بلکہ واضح تر حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اس پر وہ خدا کے ہاں سزا کا مستحق ہوگا۔ ہم نے اس کو واضح کے بجائے واضح تر اس لیے قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے معاملات کو صرف اس وجہ سے ہماری فطرت پر چھوڑ دیا ہے کہ فطرت ان کی وضاحت کی وجہ سے ان میں کسی رہنمائی کی محتاج نہیں تھی۔ بعینہٖ یہی معاملہ محلِ مباشرت کا ہے، اگر کوئی شخص اس میں اندھے پن کا ثبوت دیتا ہے تو وہ حیوانات سے بھی گیا گزرا ہے اس لیے کہ وہ اس میں کوئی غلطی نہیں کرتے اگرچہ وہ کسی قرآن اور کتاب سے آشنا نہیں ہیں۔

توبہ اور تطہر کی حقیقت

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ توبہ اور تطہر کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ توبہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کا نام ہے اور تطہر اپنے ظاہر کو نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے اس اعتبار سے ان دونوں کی حقیقت ایک ہوئی اور مومن کی یہ دونوں خصلتیں اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں اس کے برعکس جو لوگ ان سے محروم ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں۔ یہاں جس سیاق میں یہ بات

آئی ہے اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو لوگ عورت کی ناپاکی کے زمانے میں قربت سے اجتناب نہیں کرتے یا قضائے شہوت کے معاملے میں فطرت کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔ احادیث میں اس بات کی وضاحت موجود ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (۲۲۳)

"حرث" کے معنی عربی میں کھیتی کے ہیں، عام اس سے کہ وہ باغوں کی نوعیت کی ہو یا دوسری فصلوں کی۔

عورت کے لیے کھیتی کا استعارہ — عورتوں کے لیے کھیتی کے استعارہ میں ایک سیدھا سادا پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لیے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے، نیز بیج کھیت ہی میں ڈالے جاتے ہیں کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے، کوئی کسان اس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اسی طرح عورت کے لیے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایام ماہواری کے زمانے میں یا کسی غیر محل میں اس سے قضائے شہوت نہ کی جائے اس لیے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جمام اور غیر آمادگی کا زمانہ ہوتا ہے، اور غیر محل میں مباشرت باعث اذیت و اضاعت ہے۔ اس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے اس کا ارتکاب جائز نہیں۔ اپنے اس پہلو سے یہ آیت اوپر والی آیت کی گویا توضیح مزید ہوئی۔

آزادی اور پابندی کے حدود — "فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ" (پس اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ) میں بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی کے مالک کو اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں حاصل ہوتی ہے اور دوسری اس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی والا اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اس دوسری چیز کی طرف "حرث" کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف أَنَّىٰ شِئْتُمْ کے الفاظ۔ وہ آزادی اور یہ پابندی، یہ دونوں چیزیں مل کر اس رویہ کو متعین کرتی ہیں جو ایک شوہر کو بیوی کے معاملہ میں اختیار کرنا چاہیئے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون و سرور فریقین کے اس اطمینان میں ہے کہ ان کی خلوت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید، کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش و سرور کے اس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اس نشہ سے سرشار ہو لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں بلکہ اس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں بلکہ اس کی اپنی کھیتی ہے، اس وجہ سے وہ اس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان، جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے لیکن اس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے، اس کے کسی آنے میں بھی اس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔

اپنی کھیتی سے متعلق ہر کسان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس سے اسے برابر نہایت اچھی فصل حاصل

ہوتی رہے، مناسب وقت پر اس میں ہل چلتے رہیں، ضرورت کے مطابق اس کو کھاد اور پانی ملتا رہے، ارضی آفتوں سے وہ محفوظ رہے، آئندو روند، چرند و پرند اور دشمن اور چور اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں، جب وہ اس کو دیکھے تو اس کی طراوت و شادابی اس کو خوش کر دے اور جب وقت آئے تو وہ اپنے پھلوں اور پھولوں سے اس کا دامن بھر دے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے نظریے کی لغویت

قرآن نے عورت کے لیے کھیتی کے استعارے میں یہ ساری باتیں جمع کر دی ہیں اور اس استعارے نے ان لوگوں کے نظریے کی تو جڑ ہی کاٹ دی ہے جو خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیمیں چلاتے ہیں۔ اس لیے کہ کھیتی سے متعلق یہ رہنمائی تو معقول قرار دی جا سکتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی پیداوار کس طرح حاصل کی جائے لیکن یہ بات بالکل غیر منطقی ہے کہ لوگوں کو اس بات کے سبق پڑھائے جائیں کہ وہ بیج تو زیادہ سے زیادہ ڈالیں لیکن فصل کم سے کم حاصل کریں۔ اس قسم کی نامعقول منطق صرف نادانوں ہی کو سوجھ سکتی ہے۔

'وَقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ' (اور اپنے لیے آگے بڑھاؤ) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح زمین کی کھیتی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے تم اپنے مستقبل کی معاش کا انتظام کرو اسی طرح عورت کی کھیتی کی اصلی غایت یہ ہے کہ اس سے تم نسل انسانی کے مستقبل میں اپنی جگہ محفوظ اور اس کے قیام و بقا میں اپنا حصہ ادا کر سکو۔ 'فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ' کے بعد ان الفاظ کے اضافے نے یہ حقیقت نہایت واضح الفاظ میں سامنے رکھ دی کہ عورت سے مواصلت کی اصل غایت بقائے نسل ہے، لذت اس کا صرف ضمنی فائدہ ہے اس وجہ سے ہر وہ طریقہ جو اس مقصد کو ضائع کرنے والا یا اس کو نقصان پہنچانے والا ہو اگرچہ لذت کے تقاضے اس سے پورے ہو جاتے ہیں، فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے تقاضوں کے بالکل خلاف ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ انسان جس طرح اپنی اولاد کے ذریعہ سے نسل انسانی کے اندر اپنا ایک مقام محفوظ کرتا ہے اسی طرح ان کے ذریعہ سے اگر وہ ان کی اچھی تربیت کر سکے، آخرت میں بھی اپنے سرمائے میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے اس لیے کہ اولاد صالح کی نیکی ایک خیر جاری ہے جس کا سلسلہ آدمی کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ احادیث میں اس کی دلیل موجود ہے۔ 'قَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ' میں یہ دونوں ہی پہلو موجود ہیں۔

بعض اہل تاویل نے اس کی تاویل اس سے مختلف کی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اسی سورہ میں، دوسری جگہ اس طرح وارد ہے 'فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ' ۱۸۷۔ بقرہ (پس اب تم ان سے مباشرت کرو، اور وہ چیز چاہو جو اللہ نے تمھارے لیے مقدر کی ہے) اس آیت کی تاویل اوپر گزر چکی ہے۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ' (اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ بالآخر تمھیں اس سے ملنا ہے) کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم فطرت کے ان قوانین اور اللہ کے ان حدود کو آج خلوت میں بھی اور جلوت

میں بھی توڑ سکتے ہو اور تمھیں اس کی مہلت ملی ہوئی ہے لیکن یاد رکھو کہ ایک دن تمھیں خدا کو بھی منہ دکھانا ہے جس کی آنکھیں تمھیں ہر جگہ دیکھ رہی ہیں اور جس کی پکڑ سے تمھیں کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔ اس دھمکی کے ساتھ ان اہلِ ایمان کو بشارت بھی دے دی جو نفس کی تمام ترغیبات کے باوجود اس امر کو یاد رکھتے ہیں کہ ایک دن انھیں اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۴)

اللہ کو قسموں کا ہدف بنانے کا مطلب

'عُرْضَةٌ' کے معنی ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ اللہ کو قسموں کا ہدف بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نام پر بے ضرورت اور لایعنی قسمیں یا ایسی قسمیں کھائی جائیں جو نیکی و تقویٰ اور مقصدِ اصلاح کے خلاف ہوں۔ خدا کے عظیم نام کو لایعنی قسموں کے لیے استعمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مچھر مارنے کے لیے توپ داغتا پھرے اور نیکی اور تقویٰ کے خلاف قسموں کے لیے اس کے پاک نام کو استعمال کرنا گویا اسی کے نام سے نیکی اور تقویٰ کی جڑ کاٹنا ہے جو تمام نیکی اور تمام خیر کا سرچشمہ ہے۔

عربی زبان میں 'اَن' سے پہلے بعض حالات میں مضاف اور بعض مواقع میں اس کے بعد حرف "لا" کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس محذوف کو سیاق و سباق سے سمجھتے ہیں۔ یہاں واضح قرینہ ہے کہ 'اَن' کے بعد 'لا' محذوف ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ استاذ امامؒ نے اس کے شواہد اپنی کتاب الاسالیب میں جمع کر دیے ہیں۔

'بر' 'تقویٰ' اور 'اصلاح' سے مراد

بر، تقویٰ اور اصلاح کے تینوں لفظوں نے یہاں خیر اور نیکی کے تمام اقسام کو جمع کر لیا ہے۔ "بر" ان تمام نیکیوں پر حاوی ہے جن کا تعلق والدین، رشتہ داروں، مسکینوں، یتیموں اور دوسرے حقوق العباد سے ہے۔ "تقویٰ" ان نیکیوں پر حاوی ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور "اصلاح" سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو معاشرہ سے تعلق رکھنے والی ہیں۔

آیت ۲۲۴ آگے کے مسائل کی تمہید ہے

یہ آیت آگے بیان ہونے والے مسائل کی تمہید ہے۔ آگے ایلاء کا اور اس کے بعد نکاح و طلاق سے متعلق بعض اہم مسائل کا ذکر آ رہا ہے۔ ایلاء اس قسم کو کہتے ہیں جو کوئی شخص بیوی سے ازدواجی تعلق نہ رکھنے کے لیے کھا بیٹھے۔ قسم چونکہ تمام معاشرتی، سماجی اور سیاسی معاملات و معاہدات میں اعتماد و استحکام کا ذریعہ ہے اور اس سے تمدن کے نہایت اعلیٰ مقاصد پورے ہوتے ہیں اس وجہ سے ایلاء اور نکاح و طلاق کے مسائل سے پہلے خود قسم کی اہمیت واضح کرنے کے لیے یہ فرمایا کہ خدا کے نام کو کبھی ایسی قسموں کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے جو نیکی و تقویٰ اور اصلاح کے منافی ہوں۔ خدا کی قسم کھانے کے معنی اس کو گواہ ٹھہرانے کے ہیں، اگر کوئی شخص اس کے نام پر کوئی ایسی قسم کھاتا ہے جو نیکی یا سچائی یا عدل کی مخالفت کے لیے ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خدا کو خود خدا کے خلاف اور شیطان کے حق میں گواہ بنانا چاہتا ہے۔ اس قسم کی تمام

قسمیں خدا کے ساتھ مذاق کے ہم معنی ہیں اس وجہ سے ایسی قسمیں اول تو جائز ہی نہیں ہیں لیکن اتفاق سے کوئی شخص کھا بیٹھے تو اسلام نے اس کو توڑ دینے کا حکم دیا ہے۔

آخیر میں سمیع اور علیم کے حوالہ میں کچھ دھمکی کا انداز ہے کہ جو لوگ خدا کے قدوس نام کو اس طرح تختۂ مشق ستم بنائیں گے وہ اس حقیقت کو نہ بھولیں کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے، وہ ایسے گستاخوں کو سزا دیے بغیر نہ رہے گا۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۲۲۵)

ارادی اور غیر ارادی قسمیں

یعنی اس مواخذہ سے صرف وہی قسمیں مستثنیٰ ہیں جو بالکل غیر ارادی طور پر زبان پر جاری ہو جاتی ہیں، جن کا تعلق دل سے نہیں بلکہ محض زبان سے ہوتا ہے، جو کسی نفع و نقصان کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں کھائی جاتی ہیں بلکہ محض سخن تکیہ کے طور پر زبان سے اثنائے کلام میں ٹپک پڑا کرتی ہیں۔ لیکن جو قسمیں دل کے قصد وارادہ اور قلب کے تعمد کا نتیجہ ہوں گی اور جن کا کوئی قریب یا بعید اثر آدمی کے اپنے یا دوسرے کے حقوق و مفادات پر پڑنے والا ہو گا، اگر ان میں خدا کے نام کو غلط طور پر استعمال کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان قسموں پر ضرور مواخذہ فرمائے گا۔

'لغو' قسموں کو اگرچہ مواخذہ سے مستثنیٰ رکھا ہے اس لیے کہ خدا غفور اور حلیم ہے لیکن ان کو لغو کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ثقہ اور سنجیدہ لوگوں کو ان سے بھی احتراز کرنا واجب ہے۔ قرآن میں شریف و شائستہ لوگوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں یہ بات خاص طور پر بیان ہوئی ہے کہ وہ لغو چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَاۗءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۲۶) وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۷)

ایلاء کے احکام

قسموں کے متعلق مذکورہ بالا تمہید کے بعد اب یہ ایک ایسا مسئلہ شرعی بیان ہو رہا ہے جس میں اصل عامل کی حیثیت قسم کو حاصل ہے۔ یہ مسئلہ ایلا کا ہے۔ 'ایلاء' 'الا یالو' سے باب افعال ہے۔ 'الا یالو' کا اصل لغوی مفہوم کسی امر میں کوتاہی اور کمی کرنا ہے اور 'ایلاء' کے معنی کسی چیز کے ترک کی قسم کھا لینے کے ہیں۔ یہ عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم بیوی سے زن و شوہر کا تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا لینا ہے۔ چونکہ اس لفظ میں ترک کا مضمون خود موجود ہے اس وجہ سے قطع تعلق کے معنی کو ادا کرنے کے لیے کسی اور لفظ کی اس کے ساتھ ملانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

اس قسم کی قسم چونکہ ازدواجی مقاصد کے خلاف اور بر و تقویٰ کے منافی ہے، اس سے بیوی بالکل معلق ہو کے رہ جاتی ہے، اس وجہ سے اسلام نے اس طرح کی قسم کھا بیٹھنے والوں کے لیے چار ماہ کی حد مقرر

کردی ہے کہ اس کے اندر یا تو وہ بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کرلیں یا طلاق دینے کا فیصلہ ہے تو اس کو طلاق دے دیں۔ جو پہلی شکل اختیار کریں گے ان کے متعلق فرمایا کہ اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یعنی اگرچہ ان کی یہ قسم ایک حق تلفی پر مبنی تھی اور قسم کو کسی حق تلفی کے لیے سپر بنانا جائز نہیں لیکن اصلاح حال کے بعد اللہ تعالیٰ اس کوتاہی کو معاف کر دے گا۔ یہاں اگرچہ اس قسم کے توڑنے پر کسی کفارہ کا ذکر نہیں ہے لیکن قسموں کے توڑنے کے بارے میں قرآن نے دوسرے مقام میں جو عام ضابطہ بیان فرمایا ہے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ یہ صورت اس سے مستثنیٰ رہے؟ اس وجہ سے ہم ان فقہاء کی رائے کو زیادہ قوی سمجھتے ہیں جو اس صورت میں بھی کفارہ کے قائل ہیں۔

دوسرے گروہ سے متعلق فرمایا کہ اگر انھوں نے طلاق کا فیصلہ کر لیا ہے تو وہ یہ راہ اختیار کر سکتے ہیں لیکن اس معاملے میں اللہ نے جو حدود و قیود مقرر کر دیے ہیں ان کی پوری پوری نگہداشت ملحوظ رہے۔ اللہ ہر چیز کو سنتا اور جانتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر چار ماہ کی مذکورہ مدت گزر جائے اور اس دوران میں ایک شخص نہ رجوع ہی کرے اور نہ طلاق ہی دے تو کیا ہوگا؟ فقہاء کا ایک گروہ اس سوال کا یہ جواب دیتا ہے کہ چار ماہ کی مدت گزرتے ہی ایک طلاق آپ سے آپ پڑ جائے گی، بعض کے نزدیک یہ ایک طلاق بائن ہوگی اور بعض کے نزدیک رجعی، دوسرے گروہ کے نزدیک چار ماہ کی مدت گزرنے پر معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوگا اور وہ شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو وہ رجوع کرے یا طلاق دے۔ قرآن کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ چار ماہ گزرنے پر شوہر کو ہر حال یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ یا تو رجوع کرے یا طلاق دے۔ اگر وہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہ کرے تو عورت ایسے شوہر سے بذریعہ عدالت طلاق حاصل کرے گی۔

قرآن کے الفاظ سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ عورت کو طلاق حاصل کرنے کا یہ حق صرف اس صورت میں حاصل ہوگا جب شوہر نے بربنائے بغض و نفرت بیوی سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہو اور پیش نظر اس کو معلق بنا کے رکھنا ہو۔ اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ کسی اور وقتی اور عارضی مصلحت، خواہ بتقاضائے صحت یا بارادۂ تنبیہ، کوئی شخص بیوی سے مخصوص ازدواجی تعلق منقطع رکھے تو یہ صورت اس حکم کے تحت نہیں آتی اگرچہ اس انقطاع کی مدت چار ماہ سے متجاوز ہی کیوں نہ ہو جائے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۲۸)

'قروء' کا مفہوم

"قروء" قرء کی جمع ہے۔ اس کے معنی کی تعیین میں اہل لغت نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے اس کے معنی حیض کے لیے ہیں اور بعض نے طہر کے۔ اس کے اصل مادہ اور اس کے مشتقات پر ہم نے جس قدر غور کیا ہے اس سے ہمارا رجحان اسی بات کی طرف ہے کہ اس کے اصل معنی تو حیض ہی کے ہیں لیکن چونکہ ہر حیض کے ساتھ طہر بھی لازماً لگا ہوا ہے اس وجہ سے عام بول چال میں اس سے طہر کو بھی تعبیر کر دیتے ہیں، جس طرح رات کے لفظ سے اس کے ساتھ لگے ہوئے دن کو یا دن کے لفظ سے اس کے ساتھ لگی ہوئی رات کو۔ اس قسم کے استعمال کی مثالیں ہر زبان میں مل سکتی ہیں۔

یہاں جو مسئلہ بیان ہوا ہے اس کا ظاہری قرینہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ "قروء" سے مراد حیض ہی ہے۔ اس لیے کہ آیت میں مطلقہ عورتوں کو جس توقف کی ہدایت ہے اس کی اصل حکمت، جیسا کہ اس آیت سے خود واضح ہے، یہ ہے کہ یہ متعین ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ حاملہ ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ اصلاً حیض ہی سے ہوتا ہے نہ کہ طہر سے۔ اس وجہ سے اس کو حیض ہی کے معنی میں لینا زیادہ اقرب ہے۔ معنی کے اس اختلاف کی وجہ سے زمانہ عدت کے تعین میں حنفیہ اور شافعیہ کے درمیان اختلاف ہوا جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

طلاق کی عدت کی حکمت

اصل مقصود اس تین حیض کی مدت سے چونکہ یہ متعین کر لینا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں، اس لیے کہ اس چیز پر بہت سے اہم امور کا انحصار ہے اس وجہ سے ان مطلقات کے ایمان و اسلام کا یہ لازمی تقاضا ٹھہرایا ہے کہ اگر حمل کے قسم کی کوئی چیز وہ محسوس کرتی ہیں تو اس کو چھپانے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس سے ان تمام مصالح کو سخت نقصان پہنچے گا جو شریعت نے اس حکم میں عورت اور مرد اور پیٹ میں موجود بچے کے لیے ملحوظ رکھے ہیں۔

اس مدت کے دوران میں شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ اگر سازگاری اور بحالیٔ تعلقات کا طالب ہے تو وہ مراجعت کر سکتا ہے۔ شریعت میں میاں بیوی کے تعلق کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، اس کا ٹوٹنا صرف اسی صورت میں گوارا کیا گیا ہے جب سازگاری کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہ گیا ہو۔ اس وجہ سے یہ مدت رکھ دی گئی ہے جس میں دوسرے مصالح کے ساتھ یہ مصلحت بھی ہے کہ اگر طلاق کا باعث کوئی وقتی ناراضگی ہوئی ہے تو فریقین اطمینان کے ساتھ ٹھنڈے دل سے اپنے معاملے پر نظر ثانی کر سکتے ہیں لیکن قرآن نے شوہر کے اس حق مراجعت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگا دی ہے کہ یہ صرف بارادۂ اصلاح یعنی خوشگواری اور محبت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے ہو، اس سے ہرگز ہرگز عورت کو تنگ کرنا اور ستانا نہ ہو، ورنہ یہ اس حق کا نہایت ظالمانہ استعمال ہو گا جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔

میاں اور بیوی دونوں کے حقوق ہیں

اس کے بعد عورت اور مرد دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق کی نہایت جامع الفاظ میں وضاحت فرما دی ہے کہ شوہروں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ حقوق صرف انہی کے ہیں، بیویوں کا کوئی حق ہی نہیں ہے بلکہ

جس طرح ان پر شوہروں سے متعلق فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اسی طرح دستور کے مطابق شوہروں پر ان کے حقوق بھی ہیں، اور یہ فرائض اور یہ حقوق دونوں بالکل متوازن ہیں۔ ہر شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے حقوق کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ بیوی کے حقوق کا بھی لحاظ کرے؛ اسی لحاظ پر میاں بیوی کے سنجوگ اور ان کی ازدواجی زندگی کی خوشگواری کا انحصار ہے۔

گھر کا قوام مرد ہے

البتہ یہ بات ہے کہ خاندانی نظام کے بقا و استحکام کے نقطۂ نظر سے اسلام نے مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح کا دیا ہے۔ اس ترجیح سے مراد، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات کی تصریحات سے واضح ہے، یہ ہے کہ خاندان کا قوام اور سرپرست اسلام نے عورت کو نہیں بلکہ مرد ہی کو بنایا ہے۔ جس طرح ایک ریاست کا نظم ایک سربراہ کی سربراہی کا محتاج ہے، اسی طرح چھوٹے پیمانہ پر ایک گھر کا نظم بھی ایک قوام کی قوامیت کا محتاج ہے اور اس قوامیت کے لیے اپنی فطرت اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے مرد ہی موزوں ہے نہ کہ عورت۔

مرد کے وجوہ ترجیح پر قرآن نے دوسری جگہ دلیل دی ہے اس وجہ سے یہ بحث اپنے مقام ہی پر موزوں رہے گی۔ یہاں جس چیز کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ قرآن کے یہ الفاظ ہیں کہ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اس کے معنی ظاہر ہیں کہ یہی ہو سکتے ہیں کہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ ترجیح حاصل ہے۔ قرآن کے ان واضح الفاظ کی موجودگی میں ایک مسلمان کے لیے مساوات مرد و زن کے اس نظریے پر ایمان لانے کی تو کوئی گنجائش نظر نہیں آتی جو ہمارے ہاں مغرب سے درآمد ہوا ہے۔ قرآن اس امر کو تو تسلیم کرتا ہے کہ عورت پر جس درجے کی ذمہ داریاں ہیں، اسی کے ہم وزن اس کے حقوق بھی ہیں لیکن وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ عورت اور مرد دونوں ہر اعتبار سے بالکل برابر ہیں بلکہ صاف الفاظ میں مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح دیتا ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ جو فرمایا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ تو اس کے معنی بھی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ عورت اور مرد دونوں کے حقوق برابر ہیں بلکہ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عورت پر جس طرح ذمہ داریاں ہیں، اسی طرح اس کے حقوق بھی ہیں۔

قرآن نے اسی لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کے اصول کو بنیاد قرار دے کر خاندان میں قوامیت اور سربراہی کا مقام، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، مرد کو دیا ہے اور پھر اسی پر اس نے تمام عائلی قوانین و احکام کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر اس بنیاد کو ڈھا کر مغربی نظریۂ مساوات کی اساس پر، جو ہر اعتبار سے عورت و مرد دونوں کو ایک ہی درجہ میں رکھنے کا مدعی ہے، اسلام کے عائلی قوانین کو سمجھنے اور ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو اس کوشش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ پورا دین محرف ہو کر رہ جائے۔

'عزیز' اور 'حکیم' کی وضاحت

آیت کے آخر میں خدا کی دو صفتوں — عزیز اور حکیم — کا حوالہ ہے۔ خدا عزیز ہے اس وجہ سے اسی

ملے جو لوگ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے طالب ہوں، وہ ہماری کتاب اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام پڑھیں۔ اس میں ہم نے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، قرآن اور فلسفہ جدید دونوں کی روشنی میں۔

کو حق ہے کہ وہ حکم دے اور وہ حکیم ہے اس وجہ سے جو حکم بھی اس نے دیا ہے وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے بندوں کا کام یہ ہے کہ اس کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کریں۔ اگر وہ اس کے احکام کی مخالفت کریں گے تو اس کی غیرت و عزت کو چیلنج کریں گے اور اس کے عذاب کو دعوت دیں گے اور اگر خدا سے زیادہ حکیم اور مصلحت شناس ہونے کے خبط میں مبتلا ہوں گے تو خود اپنے ہاتھوں اپنے قانون اور نظام سب کا تیا پانچا کر کے رکھ دیں گے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـئًا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (۲۲۹)

طلاق کا صحیح طریقہ

اب یہ طلاق کا صحیح طریقہ بتا دیا کہ تمام معاشرتی زندگی کی بنیاد چونکہ نکاح کے پاکیزہ رشتے ہی پر ہے اس وجہ سے اگر کسی مجبوری کے باعث اس کے ٹوٹنے کی نوبت آئے تو یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ آدمی ایک ہی جھٹکے میں اس مقدس رشتے کو توڑ تاڑ کے رکھ دے بلکہ مطلقہ کے لیے جس طرح یہ ہدایت ہے کہ وہ تین حیض تک انتظار کرے اسی طرح طلاق دینے والے کے لیے یہ ہدایت ہے کہ وہ الگ الگ دو طہروں میں دو مرتبہ میں طلاق دے اور پھر تیسرے طہر میں یا تو بیوی سے مراجعت کرے اگر مراجعت کرنا چاہے یا اس کو رخصت کر دے اگر اس کا آخری فیصلہ اس کو رخصت کر دینے ہی کا ہے۔ مراجعت کی شکل میں اس کو معروف کی پابندی کی ہدایت کی گئی یعنی اس مراجعت سے مقصود بیوی کو اس طریقہ سے بیوی بنا کر رکھنا ہو جس طرح ایک شریف، مہذب اور خدا ترس آدمی بیوی کو رکھتا ہے اور جس کا بھلے لوگوں میں چلن ہے، مقصود اس سے بیوی کو معلق رکھنا اور دکھ دینا نہ ہو۔ رخصت کرنے کی شکل میں اس کو احسان کی ہدایت ہوئی کہ ہرچند اب اس کا بیوی کی حیثیت سے کوئی حق باقی نہ رہا لیکن مرد کی مردانگی اور فتوت کی شان یہی ہے کہ جس کے ساتھ مہر و محبت کے روابط رہ چکے ہوں اور جو ایک صنف ضعیف بھی ہے اس کو حسب توفیق دے دلا کر خوب صورتی کے ساتھ رخصت کرے۔

مطلقہ کے لیے تین حیض تک توقف میں جس طرح بہت سی مصلحتیں ہیں اسی طرح طلاق دینے والوں کے لیے مذکورہ ترتیب کے ساتھ طلاق دینے میں بہت سی برکتیں ہیں جن سے وہ لوگ محروم ہو جاتے ہیں جو غصہ اور جوش کی حالت میں شریعت کی اس ہدایت کی پیروی نہیں کرتے اور ایک ہی سانس میں تین یا اس سے زیادہ طلاقیں دے ڈالتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ عموماً اپنے کیے پر زندگی بھر پچھتاتے ہیں لیکن ان کا یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوتا ہے۔ شریعت نے یہ طریقہ اسی لیے بتایا ہے کہ ازدواجی رشتہ ایک نہایت اہم رشتہ ہے، اس کا ٹوٹنا نہیں بلکہ تا حدِ امکان اس کا جڑا رہنا مطلوب ہے، اس وجہ سے اس کے متعلق کوئی فیصلہ غصہ یا عجلت میں نہیں ہونا چاہیئے بلکہ سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے ہونا چاہیئے، اور یہ اسی صورت

میں ممکن ہے جب مذکورہ ہدایت پر عمل کیا جائے[1]۔

مرد کی فتوت کا حق

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا (اور تمہارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ تم نے ان کو جو کچھ دیا دلایا ہو وہ ان سے واپس لو) سے ظاہر ہے کہ نان نفقہ اور مہر وغیرہ کی قسم کی چیزیں مراد نہیں ہو سکتیں اس لیے کہ یہ چیزیں تو عورت کا حق ہیں، ان کو واپس لینے یا کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس وجہ سے اس سے لازماً وہ چیزیں مراد ہیں جو بطور تحفہ وغیرہ دی گئی ہوں۔ ان چیزوں کے بارے میں فرمایا کہ طلاق ہو جانے کے بعد مرد کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ ان کا حساب کتاب کرنے بیٹھ جائے۔ اس ممانعت کی وجہ، جیسا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ اس قسم کی خست اس فتوت اور بلند حوصلگی کے منافی ہے جو ایک مرد میں ہونی چاہیے۔ چنانچہ عورتوں کے معاملے میں قرآن نے مردوں کو اس فتوت کی طرف ایک سے زیادہ مقامات میں توجہ دلائی ہے، خاص طور پر تعلقات کے منقطع ہو جانے کی صورت میں۔ مثلاً وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ ۱۹- نساء (اور ان کو اس مقصد سے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرو کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا تھا اس کو واپس لے سکو) دوسری جگہ ہے وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۲۱- نساء (اور تم ان سے کس طرح لوگے جب کہ تم ایک دوسرے کی طرف محبت سے بڑھ چکے ہو اور وہ تم سے نہایت مضبوط عہد لے چکی ہیں) اور اسی بقرہ میں آگے مردوں کو خطاب کر کے یہ آیت آ رہی ہے وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۲۳۷- بقرۃ (اور یہ کہ عورت کی طرف سے معافی کے خواہشمند ہونے کے بجائے تم اپنا حق چھوڑ دو، یہ زیادہ تقویٰ سے قریب ہے اور تم میں سے ایک کو دوسرے پر جو ترجیح حاصل ہے اس کو نہ بھولو)

خُلع کے احکام

اس کے بعد وہ شکل بیان ہوئی ہے جو اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے۔ یہ وہ شکل ہے جب کہ بیوی کو بھی میاں سے ایسا اختلاف ہو کہ صاف نظر آ رہا ہو کہ ازدواجی زندگی کے نباہ کے لیے جن حدود و قیود کی نگہداشت ضروری ہے ان کو فریقین ملحوظ نہیں رکھ سکتے تو اس امر میں کوئی حرج نہیں ہے کہ بیوی کوئی مال یا رقم فدیہ کے طور پر دے کر ایسے میاں سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں۔ اس صورت میں چونکہ غالب مصلحت عورت کی ہوتی ہے اس وجہ سے کمزور عنصر ہونے کے باوجود اس معاوضہ کو لینے کی اجازت دی گئی۔

قرآن کے الفاظ سے اس خلع کے متعلق دو باتیں نمایاں ہوتی ہیں۔

۱- ایک تو یہ کہ اگر میاں بیوی آپس میں کوئی بات طے نہ کر سکیں تو عورت لازماً یہ معاملہ عدالت میں لے

---

[1] یہ ملحوظ رہے کہ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ اگر کوئی شخص اس ہدایت کے خلاف طلاق دے تو وہ طلاق واقع ہی نہیں ہوگی۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب "عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ" میں کی ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

جاسکتی ہے اور عدالت خلع اور معاوضہ دونوں کا فیصلہ کرے گی۔ اس کا ثبوت فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ (پس اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ میاں بیوی اللہ کے حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو.....) سے ملتا ہے۔ اس میں خِفْتُمْ کا خطاب ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرہ سے بحیثیت مجموعی ہے اور معاملات و نزاعات میں معاشرے کی مداخلت عدالت ہی کے واسطے سے ممکن ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ خلع یا فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق عورت کو اسی صورت میں ہے جب یہ ثابت ہو سکے کہ ازدواجی زندگی میں جن حدود اللہ کا قیام مطلوب ہے مرد ان کو قائم رکھنے کے قابل نہیں یا ان کو قائم نہیں رکھنا چاہتا اور عورت کے لیے ان کے قیام کے بغیر حدود اللہ پر قائم رہنا ناممکن یا دشوار ہے۔ اس کا ثبوت اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ سے ملتا ہے۔ اگر اختلاف محض ذوقی اور سطحی نوعیت کا ہے جس کو انگیز کیا جا سکتا ہے تو ایسی صورت میں عورت کو خلع یا فسخ نکاح کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھنا چاہیے۔ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی عورت کو یہ حق استعمال کرنے کی راہ کھول دی جائے تو اس سے خاندانی نظام کی چولیں ہل جائیں گی درآنحالیکہ خاندان کے اس نظام ہی کو اسلام میں سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ معاملے کی اسی اہمیت کی وجہ سے خلع یا فسخ نکاح کے مطالبے کی شکل میں عدالت یہ دیکھے گی کہ کیا فی الواقع صورت معاملہ ایسی ہے کہ فریقین کے لیے نباہ ناممکن یا دشوار ہے یا محض کندھا بدلنے اور ذائقہ تبدیل کرنے کی خواہش ہے جس کے تحت عورت نے مرد کو عدالت میں کھینچ بلایا ہے۔

"تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ الایۃ" یہ ان تمام احکام و ہدایات سے متعلق ہے جو آیت (۲۲۲) سے لے کر یہاں تک بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ تمھاری ازدواجی زندگی سے متعلق خدا کی حد بندیاں ہیں، جس طرح تم اپنے رقبوں اور اپنی چراگاہوں کے اردگرد حد بندیاں کرتے ہو اور یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان حدوں کو توڑے اور اگر کوئی ان حدود میں مداخلت کرتا ہے تو تم اس کو اپنی ملکیت میں مداخلت اور اپنی عزت و غیرت کے لیے ایک چیلنج سمجھتے ہو اسی طرح خدا نے بھی اپنے محارم کے اردگرد یہ حدیں قائم کر دی ہیں، تم ان سے باہر آزاد ہو لیکن ان کے اندر تمھیں مداخلت کی اجازت نہیں ہے، اگر کسی نے ان حدوں کو توڑنے یا لانگنے کی جسارت کی تو وہ یاد رکھیں کہ وہی لوگ ظالم ہیں۔ یعنی اس کے نتیجے میں جو کچھ اس دنیا میں یا آخرت میں ان کے سامنے آئے گا اس کی ساری ذمہ داری خود انھیں پر ہے، خدا پر نہیں ہے اور اس سے وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھائیں گے خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ خدا کے قوانین تمام تر فطرتِ انسانی کے تقاضوں اور بندوں کے اپنے مصالح پر مبنی ہیں اسی وجہ سے جو لوگ ان کو توڑتے ہیں وہ اپنی ہی فطرت اور اپنے ہی مصالح کی دھجیاں خود اپنے ہی ہاتھوں بکھیرتے ہیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا

يَّعْلَمُوْنَ (۲۳۰) لِقَوْمٍ

ایک پُرحکمت پابندی

آخری طلاق دے چکنے کے بعد اگر کوئی شخص پھر اس عورت سے نکاح کرنا چاہے تو یہ اس کا حکم بیان ہو رہا ہے کہ جب تک وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے اور وہ اس کو طلاق نہ دے اس وقت تک یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے جائز نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اوپر والا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ طلاق کا فیصلہ غصہ یا عجلت میں نہ کیا جائے اسی طرح اس پابندی سے مقصود طلاق کو ایک سہل کھیل بنانے سے بچانا ہے۔ اگر طلاق کے بعد بھی طلاق دینے والے کے لیے اس عورت سے نکاح کی آزادی باقی رہتی تو بہت سے لوگ طلاق کی حقیقی اہمیت نہ سمجھ سکتے لیکن جب یہ پابندی لگ گئی کہ چھوڑی ہوئی بیوی دوبارہ اسی صورت میں مل سکتی ہے جب وہ کسی اور کی بیوی بنے اور وہ کسی سبب سے چھوڑے اور عورت اس سے نکاح پر راضی ہو تو گویا بیچ میں ایک پورا ہفتخواں حائل ہو گیا، ظاہر ہے کہ اب اس پابندی کے سامنے آجانے کے بعد جو طلاق دے گا وہ سو بار سوچ کر طلاق دے گا اور اسلام کا منشا یہی ہے کہ جو بھی طلاق دے وہ خوب سوچ سمجھ کر طلاق دے، دور تک سارے نتائج کو سامنے رکھ کر۔

لفظ نکاح، عقدِ نکاح کے مفہوم میں

"حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ" میں نکاح کا لفظ ہمارے نزدیک عقد نکاح ہی کے معنی میں ہے جن لوگوں نے اس کو وطی کے معنی میں لیا ہے انھوں نے ایک غیر ضروری سا تکلف کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ معنی لینے سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہاں اس لفظ کا طریق استعمال اس معنی سے ابا کر رہا ہے۔ یہاں تَنْكِحَ کا فاعل ظاہر ہے کہ عورت ہے، اگر اس کے معنی وطی کے لیے جائیں تو اس کا ترجمہ ہوگا کہ "یہاں تک کہ وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے وطی کرے"۔ وطی کرنا مرد کا کام ہے نہ کہ عورت کا۔ اور اگر یہ ترجمہ کریں کہ یہاں تک، کہ "وہ کسی اور شوہر سے وطی کرائے" تو اس نادر معنی کے لیے ثبوت کہاں سے لائیں گے؟

نکاح کا اصل مقصد

اصل یہ ہے کہ لفظ نکاح شریعتِ اسلامی کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایک عورت اور مرد کے اس ازدواجی معاہدہ پر ہوتا ہے جو زندگی بھر کے نباہ کے ارادے کے ساتھ زن و شو کی زندگی گزارنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ارادہ کسی نکاح کے اندر نہیں پایا جاتا تو وہ فی الحقیقت نکاح ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک سازش ہے جو ایک عورت اور ایک مرد نے باہم مل کر کر لی ہے۔ نکاح کے ساتھ شریعت نے طلاق کی جو گنجائش رکھی ہے تو وہ اصل اسکیم کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ یہ کسی ناگہانی افتاد کے پیش آ جانے کا ایک مجبورانہ مداوا ہے۔ اس وجہ سے نکاح کی اصل فطرت یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کے سنجوگ کے ارادے کے ساتھ عمل میں آئے۔ اگر کوئی نکاح واضح طور پر محض ایک معیّن و مخصوص مدت تک ہی کے لیے ہو تو اس کو متعہ کہتے ہیں اور متعہ اسلام میں قطعی حرام ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس نیت سے کسی عورت سے نکاح کرے کہ اس نکاح کے بعد طلاق دے کر وہ اس عورت کو اس کے پہلے شوہر کے لیے

جائز ہونے کا حیلہ فراہم کرے تو شریعت کی اصطلاح میں یہ حلالہ ہے اور یہ بھی اسلام میں متعہ ہی کی طرح حرام ہے۔ جو شخص کسی کی مقصد برآری کے لیے یہ ذلیل کام کرتا ہے وہ درحقیقت ایک قرم ساق یا بھڑوے یا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کرایہ کے سانڈ کا رول ادا کرتا ہے اور ایسا کرنے والے اور ایسا کروانے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

متعہ اور حلالہ میں فرق

البتہ متعہ اور حلالہ میں اس اشتراک کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ وہ یہ کہ متعہ صریح طور پر ایک متعین مدت کے لیے ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے متعلق واضح طور پر ایک فقیہ یہ حکم لگا سکتا ہے کہ یہ نکاح منعقد نہیں ہوا لیکن حلالہ کی نوعیت ایک درپردہ سازش کی ہوتی ہے، اس کے متعلق کوئی ظاہری ثبوت اس بات کا موجود نہیں ہوتا کہ نکاح کے نام سے یہ اللہ کی شریعت کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے اس وجہ سے اللہ کے نزدیک تو یہ نکاح اور یہ طلاق سب باطل ہوگا لیکن ایک فقیہ جو صرف ظاہر حالات کو سامنے رکھ کر فتویٰ دینے پر مجبور ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کا نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر بعض فقہا اس کے انعقاد کو مانتے ہیں اور مجھے ان کی یہ بات قوی معلوم ہوتی ہے۔

ایک تحلیل بات

رہی یہ بات کہ ایسی عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے صرف اس صورت میں جائز ہوگی جب اس کا دوسرا شوہر اس کو وطی کے بعد طلاق دے تو کم از کم اس وطی کے لیے قرآن سے کوئی ثبوت نہیں نکلتا تَنْكِحَ کے لفظ سے جو دلیل دی جاتی ہے اس کا بے بنیاد ہونا، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بالکل واضح ہے، پھر دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ فعل وطی کے واقع ہو جانے سے حلالہ کی سنگینی اور اس کی ملعونیت میں کیا کمی ہو جائے گی؟ اگر ایک نکاح حلالہ کی سازش کے تحت ہوا ہے تو اس بات سے اس کی نوعیت میں کیا فرق پیدا ہوتا ہے کہ طلاق قبل از وطی دی گئی یا بعد از وطی؟ اگر بغیر وطی کے دی گئی تو یہ بھڑوا پن ہے اور اگر وطی کے بعد دی گئی تو ایسے شخص کو حدیث کے الفاظ میں تیس مستعار یعنی کرائے کا سانڈ سمجھیے، بہر حال دونوں ہی صورتوں میں یہ نکاح و طلاق کا ڈرامہ شریعت الٰہی کے ساتھ ایک مذاق ہوا۔ اس آیت میں ہمیں جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عورت فی الواقع زندگی بھر کے نباہ کے ارادہ کے ساتھ کسی دوسرے شوہر کے حبالۂ عقد میں داخل ہو اور یہ دوسرا شوہر اسی طرح کی کسی مجبوری کے تحت اس کو طلاق دے جس طرح کی مجبوریوں میں کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے۔ اگر یہ صورت ہوگی تو بلاشبہ یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن اگر اس نکاح و طلاق میں کسی سازش کو دخل ہے تو یہ نکاح و طلاق اور اس کے سارے شرکاء عند اللہ ملعون و مغضوب ہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ یہ سب کچھ وطی کے بعد ہوا ہے یا وطی کے بغیر۔

یہ مسئلہ درحقیقت پیدا ایک حدیث کی بنا پر ہوا ہے، قرآن سے اس کے لیے استدلال تو محض ایک نکتہ بعد الوقوع ہے، لیکن ہمارے نزدیک حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ بھی نہایت کمزور ہے۔

حدیث کے مختلف طریقوں کو جمع کر کے جو نتیجہ سامنے آتا ہے ہم نے دیکھا ہے کہ وہ قرآن کے بالکل موافق ہے۔ اگر ہم نے اپنی اس کتاب میں فقہی مباحث کے لیے ایک خاص حد نہ مقرر کر لی ہوتی تو ہم اس حدیث پر بھی تفصیل کے ساتھ بحث کر کے دکھاتے کہ اصل حقیقت کیا بیان ہوئی ہے اور لوگوں نے اس کو کیا بنا دیا ہے لیکن یہ بحث ہمارے دائرے سے باہر ہے۔

آگے فرمایا کہ دوسرے شوہر سے طلاق مل جانے کے بعد اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ دونوں سابق میاں بیوی آپس میں پھر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں بشرطیکہ یہ توقع رکھتے ہوں کہ وہ اللہ کے حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ نکاح و طلاق بہر حال بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ جب بھی عمل میں آئے، سچے ارادے اور سازگاری کی مخلصانہ خواہشوں کے ساتھ ہی عمل میں آئے۔

فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں

آخر میں فرمایا کہ اللہ نے اپنی مقرر کی ہوئی حدوں کو اچھی طرح لوگوں کے لیے واضح کر دیا ہے کہ جو لوگ حدود الٰہی کے علم کے طالب ہیں ان کی قدر کریں اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچیں۔ یَعۡلَمُوۡنَ کا ترجمہ ہم نے "جو لوگ علم کے طالب ہیں" کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں فعل کے استعمالات کے مواقع پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فعل جس طرح اپنے ظاہری یا ابتدائی معنی کے لیے آتا ہے یا جس طرح اپنے کامل اور حقیقی معنی کے لیے آتا ہے اسی طرح ارادۂ فعل اور طلبِ فعل کے لیے بھی آتا ہے اور امتیاز ان کے درمیان موقع کلام اور سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمَآ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ (۲۳۱)

شریعت الٰہی سے مذاق کا انجام

ایک مطلقہ کے لیے انتظار کی جو مدت شریعت نے مقرر کی ہے وہ آیت ۲۲۸ میں بتا دی گئی ہے اور آیت ۲۲۹ میں طلاق کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ تیسرے طہر میں یا تو دستور کے مطابق بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لو اور اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر حسن و خوبی کے ساتھ اس کو رخصت کر دو۔ اب اس آیت میں اس امر کی مزید وضاحت فرما دی کہ دستور کے مطابق روکنے سے شریعت کا کیا منشا ہے؟ اس منشا کی وضاحت یوں فرمائی کہ یہ روکنا ہرگز ہرگز اس ارادے کے ساتھ نہ ہو کہ اس طرح بیوی تمہارے پنجۂ ستم میں اسیر رہے اور تم اس کو اپنی خواہش کے مطابق اذیت پہنچا سکو۔ مثبت پہلو سے بات اوپر کہہ چکنے کے بعد منفی پہلو سے بھی اس کی وضاحت اس لیے کر دی گئی کہ ظالم لوگ طلاق اور طلاق کے بعد مراجعت کے شوہری حق کو اس ظلم کے لیے استعمال کر سکتے تھے حالانکہ یہ صریح اعتداء یعنی اللہ کے حدود سے تجاوز اور اس کی شریعت کو مذاق بنانا ہے۔ فرمایا کہ جو ایسی جسارت کرتے ہیں بظاہر تو وہ ایک عورت کو نشانۂ ظلم

بناتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ سب سے بڑا ظلم اپنی جان پر کرتے ہیں کیونکہ اللہ کے حدود کو پھاندنے اور اس کی شریعت کو مذاق بنانے کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ اس نے تمہیں ایک برگزیدہ امت کے منصب پر سرفراز فرمایا، تمہاری ہدایت کے لیے تمہارے اندر اپنا نبی بھیجا، تمہیں خیر و شر اور نیک و بد سے آگاہ کرنے کے لیے تمہارے اوپر اپنی کتاب اتاری جو قانون اور حکمت دونوں کا مجموعہ ہے۔ اللہ کی ایسی عظیم نعمتیں پانے کے بعد اگر تم نے ان کا یہی حق ادا کیا کہ خدا کے حدود کو توڑا اور اس کی شریعت کو مذاق بنایا تو سوچ لو کہ ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے! پھر فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان رکھو کہ وہ تمہاری ہر بات سے باخبر ہے، یعنی وہ لوگوں کی شرارتوں کے باوجود ان کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن جب وہ پکڑے گا تو اس کی پکڑ سے کوئی بھی چھوٹ نہ سکے گا۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ شریعت کو مذاق بنانے سے صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جائے بلکہ اس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی ہے کہ ظاہری اعتبار سے تو کام ایسا کیا جائے کہ اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے لیکن مقصد و منشا کے لحاظ سے وہ کام شریعت کے مقصد کے بالکل خلاف ہو۔ مثلاً تیسرے طہر میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مراجعت کرے تو از روئے شریعت اس کو اس کا حق تو حاصل ہے لیکن اگر اس سے اس کا مقصد بیوی کو تنگ کرنا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اللہ کی آیات کے پردے میں اللہ ہی کی مخالفت کی۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ اور اس کی شریعت کے ساتھ صریح مذاق ہے۔

۴۷۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۳۲-۲۴۲

نکاح و طلاق سے متعلق جو مضمون اوپر بیان ہوا اسی سلسلے کی مزید ہدایات آگے بیان ہو رہی ہیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ آیات
يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ ۲۳۲-۲۴۲
يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ
ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾
وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ
اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ

كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ
وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ
مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا
أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٣﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَ
يَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ
فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي
أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٣٤﴾ وَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي
أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ
سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ
حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي
أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾ لَا ع ٣٠ ١٤
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ
تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ
وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾
وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ

فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ
بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا
تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٧﴾

ترجمہ آیات
۲۳۲-۲۳۷

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو تم اس بات میں مزاحم نہ بنو کہ وہ اپنے ہونے والے شوہروں سے نکاح کریں جب کہ وہ آپس میں معاملہ دستور کے مطابق طے کریں۔ یہ نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے، اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ۲۳۲

اور مائیں اپنے بچوں کو ان لوگوں کے لیے پورے دو سال دودھ پلائیں جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہتے ہوں۔ اور بچے والے کے ذمے بچوں کی ماؤں کا دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا ہے۔ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ کسی ماں کو اس کے بچے کے سبب سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کے سبب سے اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور صلاح سے دودھ چھڑا دینا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، جب کہ تم ان کو دستور کے مطابق وہ ادا کرو جو تم نے دینے کا وعدہ کیا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۳۳

اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے بارے میں

چار ماہ دس دن توقف کریں پھر جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں اور اللہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور اس بات میں بھی کوئی گناہ نہیں جو تم ان عورتوں سے پیغامِ نکاح کے قسم کی بطریق کنایہ واشارہ کہو یا اپنے دلوں میں رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان سے ذکر کرو گے لیکن چپکے سے ان کے ساتھ نکاح کا قول و قرار نہ کر بیٹھو، ہاں دستور کے مطابق کوئی بات کہہ سکتے ہو۔ اور عقدِ نکاح کا عزم اس وقت تک نہ کرو جب تک قانون اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے اور جان رکھو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ ۲۳۴ - ۲۳۵

اور اگر تم عورتوں کو اس صورت میں طلاق دو کہ نہ ان کو ہاتھ لگایا ہو اور نہ ان کے لیے متعین مہر مقرر کیا ہو تو ان کے مہر کے باب میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ البتہ ان کو دستور کے مطابق دے دلا کر رخصت کرو، صاحبِ وسعت اپنی وسعت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق، یہ بھلے لوگوں پر حق ہے۔ اور اگر تم نے ان کو طلاق تو دی ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے لیکن ایک متعین مہر ٹھہرا چکے ہو تو مقررہ مہر کا آدھا ادا کرو الّا آنکہ وہ اپنا حق چھوڑیں یا وہ اپنا حق چھوڑے جس کے ہاتھ میں سررشتۂ نکاح ہے اور یہ کہ تم اپنا حق معاف کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اور تمہارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو نہ بھولو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۳۶ - ۲۳۷

۷۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ

بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲۳۲)

'عضل' کا مفہوم

'عَضْل' کے معنی رکاوٹ پیدا کرنے اور اڑنگے ڈالنے کے ہیں اور 'اَزْوَاجَهُنَّ' میں ازواج سے مراد ان کے وہ ہونے والے شوہر ہیں جن سے آئندہ وہ نکاح کرنے کی خواہش مند ہیں۔

مطلقہ کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے

جو عورت طلاق پاکر اپنی عدت پوری کر چکی ہو وہ آزاد ہے کہ جہاں پسند کرے نکاح کرے۔ اس کے اس ارادے میں طلاق دینے والے شوہر یا اس کے خاندان والوں کو کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرنی چاہیے، عام اس سے کہ یہ رکاوٹ صریح ممانعت کے قسم کی ہو یا اندرونی سازش اور جوڑ توڑ کی نوعیت کی۔ بعض خاندانوں اور برادریوں میں یہ جہالت پائی جاتی ہے کہ اگر ان کے اندر کوئی عورت بیاہی جا چکی ہو تو اس کے طلاق پا جانے یا اس کے شوہر کے وفات پا جانے کے بعد بھی یہ لوگ برداشت نہیں کرتے کہ ایسی عورت کہیں اور نکاح کرے، اس میں وہ اپنی توہین خیال کرتے ہیں اور طرح طرح کے اڑنگے اس کے راستے میں ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے سبب سے بسا اوقات قتل و فساد کے نہایت سنگین حادثے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح یہ جہالت ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے، اسی طرح عرب میں بھی پائی جاتی تھی۔ قرآن نے اس سے روکا کہ جس نے ایک عورت کو طلاق دے چھوڑی اب اسے اس کی راہ میں رکاوٹ بننے کا کوئی حق نہیں رہا، وہ جہاں چاہے اور جس کے ساتھ اس کا معاملہ طے پا جائے اگر معاملہ دستور کے مطابق طے پایا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

'دستور کے مطابق' سے مراد یہاں عرب کے شرفا کا وہ رواج و دستور ہے جس کو اسلام نے بُرے رواجوں سے پاک کر کے اسلامی شریعت کا جزو بنا لیا تھا اور بہت سے معاملات میں لوگوں کو انہی پر عمل کرنے کی یا تو ہدایت کی یا ان پر عمل کی آزادی دے دی۔ یہاں معاملہ طے کرنے کے لیے معروف کی جو شرط لگائی ہے تو اس سے مقصود یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ معاملہ طے کرنے میں کوئی ایسی بات نہ کریں جو شریف خاندانوں کی روایات کے خلاف ہو اور جس سے سابق شوہر یا ہونے والے شوہر یا خود عورت کے خاندان کی عزت و شہرت کو بٹہ لگنے کا اندیشہ ہو۔

فرمایا کہ یہ نصیحتیں ان لوگوں کو کی جا رہی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، یعنی جن لوگوں کے اندر خدا اور آخرت پر ایمان موجود ہے ان کے ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ان نصیحتوں پر عمل کریں۔ پھر فرمایا کہ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے۔ یعنی اگر عورت کی حسب مرضی نکاح کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی گئی تو اس سے خاندان اور پھر معاشرے میں بہت سی برائیاں پھیلنے کے اندیشے ہیں۔ یہیں سے خفیہ روابط، پھر زنا، پھر اغوا اور فرار کے بہت سے چور دروازے پیدا ہوتے ہیں اور ایک دن ان سب کی ناک کٹ کے رہتی ہے جو ناک ہی اونچی رکھنے کے زعم میں فطری جذبات کے

مقابل میں بے ہودہ رسوم کی رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے؛ یعنی تمھارا علم اور تمھاری نظر بہت محدود ہے، تمھارے لیے زندگی کے تمام نشیب و فراز کو سمجھ لینا بڑا مشکل ہے اس وجہ سے جو کچھ تمھیں خدا کی طرف سے حکم دیا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى
الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ
بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ
مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۳۳)

رضاعت سے متعلق مسائل

اس آیت میں رضاعت سے متعلق اکٹھے بہت سے مسائل بیان ہو گئے ہیں جو بالترتیب یہ ہیں۔

۱۔ مطلقہ پر اپنے بچے کو پورے دو سال دودھ پلانے کی ذمہ داری ہے اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت یہ رضاعت کی مدت پوری کرے۔

۲۔ اس مدت میں بچے کے باپ پر مطلقہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری ہے اور اس معاملہ میں دستور کا لحاظ ہو گا یعنی شوہر کی حیثیت، عورت کی ضروریات، اور مقام کے حالات پیش نظر رکھ کر فریقین فیصلہ کریں گے کہ عورت کو نان و نفقہ کے طور پر کیا دیا جائے۔

۳۔ فریقین میں سے کسی پر بھی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، نہ بچے کے بہانے سے ماں کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی اور نہ بچے کی آڑ لے کر باپ پر کوئی ناروا دباؤ ڈالا جائے گا۔

۴۔ اگر بچے کا باپ وفات پا چکا ہو تو بعینہ یہی پوزیشن مذکورہ ذمہ داریوں اور حقوق کے معاملے میں اس کے وارث کی ہو گی۔

۵۔ اگر باہمی رضامندی اور مشورہ سے دو سال کی مدت کے اندر ہی اندر بچے کا دودھ چھڑا دینے کا عورت مرد فیصلہ کر لیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

۶۔ اگر باپ یا بچے کے ورثا بچے کی والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہتے ہیں تو وہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں بشرطیکہ بچے کی والدہ سے دینے دلانے کی جو قرارداد ہوئی ہے وہ پوری کر دی جائے۔

آخر میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب خدا کے سامنے کرتے ہو، کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہتی۔

مذکورہ بالا معاملات عام حالات میں تو عورت اور مرد اور متعلقہ خاندان کے ذمہ داروں کے خود طے

کر لینے کے ہیں لیکن اگر کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو انھی اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر پنچائتیں اور عدالتیں فیصلہ کردیں گی۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۲۳۴

بیوہ کی عدت

اگر کسی عورت کے شوہر کی وفات ہو جائے تو ایسی عورت کی عدت چار ماہ دس دن ہے (اور حاملہ ہونے کی صورت میں وضعِ حمل) عام مطلقہ کی نسبت سے بیوہ کی عدت میں یہ اضافہ استبرائے رحم، عورت کی سہولت اور سوگ وغیرہ کی مختلف مصلحتوں سے ہے۔ عورت کمزور فریق، نازک دل اور شدید الاحساس ہونے کی وجہ سے شوہر کے صدمہ کو محسوس بھی زیادہ کرتی ہے اور حالتِ بیوگی میں وہ ہمدردی کی محتاج بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کا زمانۂ عدت زیادہ رکھا گیا ہے تاکہ شوہر کی وفات کے صدمے کے ساتھ ساتھ معاً اس کو شوہر کی ڈیوڑھی چھوڑنے کا صدمہ بھی نہ اٹھانا پڑ جائے۔ چنانچہ اسی مصلحت کے تحت آگے اسی آیت کی مزید توضیح کے طور پر ایک عارضی ہدایت یہ بھی ہوئی کہ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ښ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۲۴۰-بقرہ ۲ (اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں، وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ انھیں گھر سے نکالے بغیر ایک سال تک نان و نفقہ دیا جائے۔ اور اگر وہ خود نکلیں تو جو کچھ وہ اپنے معاملے میں دستور کے مطابق کریں اس میں تم پر کوئی الزام نہیں۔ اللہ غالب اور حکیم ہے)

مذکورہ عدت گزار چکنے کے بعد وہ آزاد ہیں کہ اپنے معاملہ میں دستور کے مطابق جو قدم مناسب خیال کریں اٹھائیں۔ اس کے بعد نہ اولیاء پر کوئی الزام ہے اور نہ انھی پر کوئی الزام ہے، اگر انھوں نے معروف کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غیر شرعی رسوم کو شریعت کا درجہ دے کر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو موردِ طعن و الزام نہیں بنانا چاہیے۔ نہ شوہر کے وارثوں اور عورت کے اولیاء کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ عورت اپنے شوہر کا پورا سوگ بھی نہ منا چکی کہ وہ اس سے تنگ آ گئے اور نہ عورت کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ ابھی شوہر کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ یہ شادی رچانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خدا نے جو حدود مقرر کر دیے ہیں بس انھیں کی پابندی کرنی چاہیے اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ بندوں کے ہر عمل سے باخبر ہے۔

عورت کے لیے معروف کی پابندی کی جو شرط لگائی ہے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ نکاح کے معاملے میں کفو کا بھی لحاظ ہونا چاہیے تاکہ متعلق خاندانوں کی وجاہت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ

سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۥ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (۲۳۵)

اسلامی معاشرہ میں جذبات کا احترام

اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے کے جذبات کے لحاظ و احترام کی بڑی اہمیت ہے۔ اس وجہ سے ممانعت فرمائی گئی کہ اگر کوئی انتقال کر جائے تو کسی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اس کی بیوہ سے اس کے زمانہ عدت ہی میں نکاح کی پینگیں بڑھانا شروع کر دے۔ اپنے ایک مرحوم بھائی کے لیے ایک حساس اور دردمند بھائی کے اندر جو جذبات ہونے چاہئیں، یہ بات اس کے بھی منافی ہے اور ایک غمزدہ بیوہ کے جذبات کا ایک شریف آدمی کو جو لحاظ ہونا چاہیئے یہ اس کے بھی خلاف ہے۔ مسلمانوں کا معاشرہ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا معاشرہ ہے، جانوروں کا گلہ نہیں ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی شخص بیوہ سے نکاح کا طالب ہو تو وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کوئی کلمہ بطورِ اشارہ زبان سے نکال دے یا اپنے دل میں نکاح کا ارادہ کر لے لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ پوشیدہ طور پر نکاح کا قول و قرار کر لے۔ بس تعزیت و ہمدردی تک بات محدود رہنی چاہیئے جو اس طرح کے حالات کے لیے معروف ہے، اگر اس ہمدردی کے سلسلہ میں کوئی کلمہ ایسا تراوش کر جائے جو غمازی کر دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ۔ بطورِ جملہ معترضہ ہے اور مقصود اس سے تنبیہ ہے کہ دلوں کے مخفی ارادوں کے متعلق یہ گمان نہ رکھو کہ یہ خدا سے مخفی رہتے ہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ تم اس ارادے کو ظاہر کرو گے، سو ظاہر کرو تو اس طرح نہ کرو کہ وہ قول و قرار اور عہد و پیمان کی شکل اختیار کر لے بلکہ اسی انداز میں ہو جو اس طرح کے حالات کے لیے پسندیدہ اور دستور کے موافق ہے۔

کتاب کا لفظ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں کسی متعین شرعی قانون کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد چار ماہ دس دن کی عدت کا وہ قانون ہے جو ایک بیوہ کے لیے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کسی خاص قانون کو کتاب کے لفظ سے تعبیر کرنا اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے، فرمایا کہ جب تک قانون کی مدت پوری نہ ہو جائے اس وقت تک عقدِ نکاح کا عزم نہ کرو۔

اخیر میں اپنی صفتِ علم کا حوالہ دیا جس کی یادداشت ہی پر خدا کے قوانین کا صحیح احترام مبنی ہے۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ خدا سے ڈرتے رہو، اس کی ڈھیل سے دھوکے میں نہ پڑو، وہ غفور اور بردبار ہے اس وجہ سے درگزر کرتا ہے لیکن کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًاۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (۲۳۶)

اہلِ احسان پر ایک حق

اس آیت میں لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ کا تعلق ایک محذوف سے ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ اگر صورت

یہ ہو کہ ایک شخص اپنی منکوحہ کو اس حال میں طلاق دے کہ نہ اس نے ابھی اس کے ساتھ تعلق زن و شو قائم کیا ہو نہ اس کے لیے مہر ہی مقرر کیا ہو تو ایسی صورت میں درباب مہر اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ مہر کے بجائے اسے چاہیئے کہ وہ دستور کے مطابق اس کو کچھ دے دلا کر رخصت کرے۔ دستور کے موافق سے مراد یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی حد معین نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار آدمی کے معیار زندگی پر ہے، ایک غریب اپنی وسعت کے مطابق دے، امیر اپنی وسعت کے مطابق۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی بنانے اور سنوارنے کے خواہش مند ہیں اور اہل احسان کے زمرے میں شامل ہونا چاہتے ہیں ان پر یہ ایک حق ہے۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۷﴾

مرد کی فتوت کے تقاضے

یہ اوپر کی صورت سے ایک مختلف صورت بیان ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ مہر تو طے شدہ ہے لیکن طلاق ملاقات سے پہلے ہی دے دی گئی۔ ایسی صورت میں مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔ البتہ عورت اگر اپنا حق چھوڑ دے تو الگ بات ہے یا مرد اپنا حق چھوڑ دے یعنی نصف کے بجائے پورا مہر ادا کر دے۔ اگرچہ ایک محرک عورت کے لیے بھی مہر چھوڑنے کا موجود ہے کہ شوہر نے ملاقات سے پہلے ہی طلاق دی ہے لیکن قرآن نے مرد کو اکسایا ہے کہ اس کی فتوت اور مردانہ بلند حوصلگی اور اس کے درجے مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عورت سے اپنے حق کی دستبرداری کا خواہش مند نہ ہو بلکہ اس میدانِ ایثار میں خود آگے بڑھے۔ اس ایثار کے لیے قرآن نے یہاں مرد کو تین پہلوؤں سے ابھارا ہے۔ ایک تو یہ کہ مرد کو خدا نے یہ فضیلت بخشی ہے کہ وہ نکاح کی گرہ کو جس طرح باندھنے کا اختیار رکھتا ہے اسی طرح اس کو کھولنے کا بھی مجاز ہے، دوسرا یہ کہ ایثار و قربانی جو تقویٰ کے اعلیٰ ترین اوصاف میں سے ہے وہ جنس ضعیف کے مقابل میں جنس قوی کے شایان شان زیادہ ہے، تیسرا یہ کہ مرد کو خدا نے اس کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت پر جو ایک درجہ ترجیح کا بخشا ہے اور جس کے سبب سے اس کو عورت کا قوام اور سربراہ بنایا ہے یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کو عورت کے ساتھ کوئی معاملہ کرتے وقت مرد کو بھولنا نہیں چاہیئے، اس فضیلت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہیں بلکہ اس کو دینے والا بنے۔

اس دور کے معاشرتی مفکروں کے لیے ایک تنبیہ

یہاں بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ کے الفاظ میں ایک اور نکتہ بھی ہے جو اس دور کے معاشرتی مفکروں اور مصلحتوں کو خاص طور پر نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔ وہ یہ کہ نکاح کی گرہ جس طرح مرد کے قبول سے بندھتی ہے اسی طرح اسی کی طلاق سے کھلتی ہے، گویا یہ سررشتہ اصلاً شریعت نے مرد ہی کے اختیار میں

رکھا ہے اس وجہ سے طلاق کے معاملے میں عورت کو مرد کے مساوی اختیار دینے کا رجحان، جو مغرب کی نقالی میں، ہمارے مسلمان ممالک میں بڑھتا جا رہا ہے، شریعت کے بالکل خلاف ہے اور اس سے خاندانی نظام کا شیرازہ بالکل پراگندہ ہو کر رہ جائے گا۔

۶۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۲۳۸-۲۴۲

احکام و قوانین کا باب جو آیت ۱۶۳ سے توحید اور اس کے بعد نماز اور زکوٰۃ کے ذکر سے شروع ہوا تھا اب ان آیات پر ختم ہو رہا ہے۔ اس مجموعۂ آیات کی ترتیب اس طرح ہے کہ ایک آیت، جو اصل خاتمۂ باب کی حیثیت رکھتی ہے، خوف اور امن ہر طرح کے حالات میں نمازوں کی حفاظت سے متعلق ہے اور دو آیتوں میں بیوہ اور مطلقہ سے متعلق، جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا تھا، بعض ضمنی ہدایات ہیں جو بعد میں نازل ہوئیں۔ یہ دونوں آیتیں خاتمۂ باب کے ساتھ ملحق کر دی گئیں تاکہ کلام میں ان کی ترتیب ہی سے واضح ہو جائے کہ یہ آیات اصل احکام کے بعد بطور وضاحت نازل ہوئی ہیں چنانچہ ان کے ساتھ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ کا ٹکڑا لگا کر ان کے توضیحی آیات ہونے کی طرف اشارہ بھی فرما دیا تاکہ نظمِ کلام کے طالب کو ربطِ کلام کے سمجھنے میں کوئی زحمت نہ پیش آئے۔

نماز سارے دین کے لیے حصار ہے

گویا خاتمۂ باب کی اصل آیت حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى والی آیت ہے۔ اب اس باب کے آغاز پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے آغاز میں توحید کے ذکر کے بعد احکامِ شریعت کے سلسلہ میں سب سے پہلے آیت ۱۷۷ میں نماز اور ساتھ ہی زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے۔ یہاں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس باب کا خاتمہ بھی نماز ہی کے ذکر پر ہوا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دین میں جو اہمیت نماز کی ہے وہ دوسری کسی چیز کی بھی نہیں ہے۔ ساری شریعت کا قیام و بقا اسی کے قیام و بقا پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو شریعت کی اقامت اور اس کی محافظت کے لیے ایک حصار اور ایک باڑھ کی حیثیت دی ہے۔ جو شخص اس کی حفاظت کرتا ہے وہ گویا پوری شریعت کی حفاظت کرتا ہے اور جو شخص اس میں رخنے پیدا کر دیتا ہے وہ، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے، باقی دین کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کر دیتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ شروع باب میں جس نماز کا ذکر ہے وہ امن و اطمینان کے حالات کی پنج وقتہ معروف نماز ہے اور یہاں امن و اطمینان کی نماز کے علاوہ خوف و خطرے کی نماز کا بھی ذکر ہے۔ یہ نماز کے احکام کے بیان میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ ایک تدریجی ارتقا ہوا ہے۔ جس وقت باب کے آغاز کی آیتیں نازل ہوئی ہیں جنگ و جہاد کے حالات نہیں تھے لیکن تحویلِ قبلہ کے بعد سے آپ نے پڑھا کہ جنگ و جہاد کے احکام نہایت تفصیل سے بیان ہوئے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل سلسلہ کلام جو چل

رہا تھا تو وہ جہاد اور انفاق ہی کا تھا، دوسرے مسائل تو، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، ضمناً پیدا ہو گئے ہیں۔ حالات کی یہ تبدیلی متقاضی ہوئی کہ امن کی نماز کے ساتھ خوف اور خطرے کی نماز کا بھی ذکر کر دیا جائے چنانچہ پہلی صورت کی نماز کا ذکر اقامتِ صلوٰۃ کے لفظ سے کیا ہے اور اس دوسری حالت کی نماز کا ذکر محافظت علی الصلوات کے الفاظ سے فرمایا۔ بیان کے ان دونوں اسلوبوں میں شدتِ اہتمام کا جو فرق نمایاں ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہو سکتا۔

یہ بات کہ نماز پورے دین کے لیے بمنزلہ حصار اور شہر پناہ ہے اگرچہ قرآن میں تدبر کرنے والوں سے مخفی نہیں ہو سکتی، اس کے شواہد و نظائر قرآن میں بہت ہیں، لیکن ممکن ہے، ایک عام قاری کو یہ شبہ ہو کہ یہاں ہم نے ربطِ کلام جوڑنے میں تکلف سے کام لیا ہے اس وجہ سے ہم سورہ مومنون کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اس ربطِ کلام کی نہایت واضح مثال موجود ہے۔ فرمایا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ
صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ
عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ
لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ
لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ
وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى
صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۱-۹- مومنون)

ان اہلِ ایمان نے فلاح پائی جو اپنی نمازوں
میں خشوع کرنے والے ہیں، جو لغو سے منہ
موڑنے والے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں،
جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں،
مگر اپنی بیویوں یا لونڈیوں سے، سو اس بارے
میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو اس سے
آگے بڑھے تو وہ لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں،
اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ
کرنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی برابر
نگہداشت رکھتے ہیں۔

ان آیات پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کا آغاز نماز سے ہوا ہے اور پھر دین و اخلاق کی چند بنیادی باتیں بیان کرنے کے بعد ان کا خاتمہ بھی نماز ہی پر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں پہلی نماز کے ساتھ خشوع کا ذکر ہے جو نماز کی اصل روح ہے اور اس دوسری نماز کے ساتھ محافظت کا حوالہ ہے جو اس کے تمام ظاہری اہتمام کی ایک جامع تعبیر بھی ہے اور جس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ درحقیقت نمازوں کی حفاظت ہی ہے جو دین کی دوسری باتوں کی حفاظت کی ضامن ہے۔

بالکل اسی طرح کا نظم سورۂ معارج کی مندرجہ ذیل آیات میں بھی ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ
الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ

بے شک انسان جلد باز پیدا ہوا ہے۔ جب
اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے گھبرا اٹھتا ہے

مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ (۱۹-۳۴ معارج)

اور جب اس کو بھلائی پہنچتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔ صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو اپنی نمازوں پر قائم و دائم رہنے والے ہیں، جن کے مالوں میں سائلوں اور محروموں کا ایک معین حق ہے، جو روز جزا کی تصدیق کرتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے برابر ڈرتے رہنے والے ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب نچنت رہنے کی چیز نہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں مگر اپنی بیویوں اور لونڈیوں سے سو ان کے باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں البتہ جو اس حد سے آگے قدم بڑھائیں تو وہ لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرنے والے ہیں اور جو اپنی شہادتوں کے قائم کرنے والے ہیں اور جو اپنی نماز کی برابر نگہداشت رکھتے ہیں۔

یہاں بھی دیکھیے نماز ہی سے آغاز اور نماز ہی پر اختتام ہے۔ جس طرح ایک شہر پناہ پورے شہر کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہوتی ہے اسی طرح نماز دوسری تمام نیکیوں کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے اور مقصود اس سے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ سارے دین کی محافظ نماز ہے۔ جس نے اس کی حفاظت کی اس نے سارے دین کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کیا اس نے سارے دین کو ضائع کیا۔

بالکل اسی اصول پر سورہ بقرہ میں بھی اس پورے باب کو جو احکام و قوانین سے متعلق ہے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے نماز کے حکم سے گھیر دیا ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝۲۳۸ آیات
۲۳۸-۲۴۲ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ
مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى
الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا
فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَ
لِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿٢٤١﴾ كَذَٰلِكَ
ع ٣١ ١٥ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٢٤٢﴾

ترجمہ آیات ٢٣٨-٢٤٢ نمازوں کی نگہداشت رکھو، خاص طور پر بیچ کی نماز کی اور نمازوں میں خدا کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہو۔ اگر خطرے کی حالت ہو تو پیدل یا سوار جس صورت میں ادا کر سکو نماز ادا کرو۔ پھر جب خطرہ دور ہو جائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اس نے تم کو سکھایا ہے، جس کو تم نہیں جانتے تھے۔ ٢٣٨-٢٣٩

اور جو تم میں سے وفات پائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں وہ اپنی بیویوں کے لیے سال بھر کے نان نفقے کی گھر سے نکالے بغیر وصیت کر جائیں۔ اگر وہ خود گھر چھوڑیں تو جو کچھ وہ اپنے باب میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ عزیز و حکیم ہے۔ ٢٤٠

اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق کچھ دینا دلانا ہے، یہ خدا سے ڈرنے والوں پر حق ہے۔ ٢٤١

اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کی تمہارے لیے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ٢٤٢

۷۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی ق وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ (۲۳۸)

نماز کی محافظت

نماز کی محافظت میں ان تمام چیزوں کی نگہداشت اور ان کا اہتمام شامل ہے جو اس کے لوازم و شرائط اور اس کے آداب و ارکان سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان چیزوں کا ذکر کتاب کے شروع میں کر چکے ہیں۔ یہاں اقامت کی جگہ محافظت کا لفظ جس نئے پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ مشکل اور پُرخطر حالات میں بھی، ہر طرح کے خطرات کا مقابلہ کر کے، اس کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں صلوٰۃ الخوف کا ذکر بھی ہے جس سے واضح ہے کہ تلواروں کی چھاؤں میں بھی جس چیز کو مومن نہیں بھولتا ہے، وہ یہی ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن تمھاری یاد سے غافل نہیں رہا

'صلوٰۃ وسطیٰ' سے مراد

'الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی' کے لغوی معنی تو بیچ والی نماز کے ہیں، اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس خاص سے کیا مراد ہے تو اس کے جواب میں اہل تاویل نے بڑا اختلاف کیا ہے۔ زیادہ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ ہمارا اپنا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے۔ یہ نماز ہماری شب و روز کی تقسیم میں ایک ایسی نماز کی حیثیت رکھتی ہے جو رات اور دن دونوں کی سرحد پر واقع ہو۔ سرحد پر تو کہہ سکتے ہیں کہ فجر کی نماز بھی واقع ہے لیکن جس سرحد پر عصر کی نماز واقع ہے وہ عام حالات میں بھی پُرخطر ہے اور اگر حالات جنگ کے ہوں تب تو یہ بہت ہی پرخطر بن جاتی ہے۔ عام حالات میں دیکھیے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ چونکہ عصر کے وقت دن کی تمام سرگرمیاں اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو رہی ہوتی ہیں اس وجہ سے دنیا طلبوں کے لیے یہ بڑی آپا دھاپی کا وقت ہوتا ہے، مسافر رات آنے سے پہلے منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، دکاندار دکان بڑھانے سے پہلے کچھ کمائی کر لینے کی دھن میں ہو جاتا ہے، نوکر اپنی مقررہ ڈیوٹی کے سرانجام دینے کے چکر میں پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ میدانوں میں کھلاڑی بھی اپنے آخری داؤں اور اپنی آخری بازی کے منصوبوں میں ایسے غرق ہوتے ہیں کہ کسی کو کسی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں رہ جاتا۔

اب اسی پر قیاس کیجیے کہ اگر خدانخواستہ حالات جنگ کے ہو جائیں تو پھر یہ آپا دھاپی کتنی بڑھ سکتی ہے، خاص طور پر دن کے اس حصے میں جس میں عصر کی نماز واقع ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے عام نمازوں کی نگہداشت کا بھی حکم دیا اور ساتھ ہی عصر کی نماز کی نگہداشت کے لیے

خاص طور پر تاکید فرمائی۔

رہا یہ سوال کہ اگر مقصود عصر کی نماز ہی تھی تو اس کو صاف صاف عصر کے لفظ ہی سے کیوں نہیں تعبیر کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے اس نماز کا وہ نازک جائے وقوع ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کے سبب سے یہ خاص نگہداشت کی محتاج ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہی نماز ہے جس کے بارے میں حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے دو نبیوں کو ابتلا پیش آیا۔ ایک حضرت سلیمان علیہ السلام کو فوجی پریڈ کے موقع پر، دوسرے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ احزاب کے موقع پر۔

'قنت' کے معنی خضوع اور تذلل کے ہیں۔ یہاں اس کا موقع ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ نماز کی محافظت کے حکم میں نماز کا یہ ادب بھی داخل ہے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۲۳۹)

'صلٰوۃ الخوف' سے مراد

رجال، راجل کی اور رکبان، راکب کی جمع ہے۔ فرمایا کہ اگر دشمن نے حالت خطرے کی پیدا کر رکھی ہو، نماز اپنے تمام شرائط و آداب کے ساتھ ادا کرنی ممکن نہ ہو تو سوار پیادہ جس حال میں ہو اسی حال میں نماز ادا کر لو۔ خطرے کے حالات میں نماز کی محافظت یہی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ وہ شکل بھی بتا دی گئی ہے جو خطرے کے حالات میں نماز باجماعت کے قیام کے لیے اختیار کی جا سکتی ہے اگر اس کا امکان ہو۔

پھر فرمایا کہ جب امن کے حالات میسر ہوں تو اس طرح اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا ہے۔ اللہ کو یاد کرو سے مراد ادائیگی نماز ہے۔ ذکر کا لفظ نماز کے لیے قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ نماز کی اصل حقیقت چونکہ ذکر ہی ہے اس وجہ سے کبھی کبھی اصل حقیقت سے اس کی شکل بھی تعبیر کر دی جاتی ہے تاکہ شکل اختیار کرتے وقت آدمی کی نظر اصل روح پر رہے، صرف شکل پر جم کر نہ رہ جائے۔

پیغمبرؐ کی تعلیم عین اللہ کی تعلیم ہے

"كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ" سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم عین اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں نماز کا حکم تو ہوا ہے لیکن اس کے ادا کرنے کا طریقہ کہیں نہیں بتایا گیا ہے، یہ چیز صرف پیغمبرؐ کی تعلیم سے امت کو معلوم ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود فرمایا کہ جیسا کہ اس نے تعلیم دی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر پیغمبرؐ کی تعلیم عین اللہ کی تعلیم نہیں ہے تو وہ کیا چیز ہے جس کو یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیم سے تعبیر فرمایا ہے۔

ہم آیت وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور کہ وہ صرف قرآن سنا دینے کے لیے تشریف لائے تھے بنیادی طور پر غلط ہے۔

آپ قرآن سنانے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کام پر بھی مامور تھے کہ لوگوں کو قرآن پڑھائیں اور سکھائیں اور اس کے مضمرات واشارات اور اس کی حکمتیں اور اس کے اسرار اچھی طرح واضح کر دیں۔ اس کام پر آپ چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مامور تھے اس وجہ سے ایک معلم کی حیثیت سے آپ نے اُمت کو جو کچھ بتایا سکھایا وہ سب آپ کے فریضۂ نبوت ہی کے تحت ہے۔ تعجب ہے کہ ان واضح آیات کی موجودگی میں بھی بعض لوگ نماز کے اوقات اور اس کی رکعات وغیرہ سے متعلق بے سروپا بحثیں اٹھاتے ہیں۔

'مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ' کے الفاظ بطور اظہار فضل واحسان کے ہیں۔ امی عربوں پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہوا تھا کہ ان پر اس نے دین و شریعت کے وہ اسرار کھولے جو نہ ان پر کھلے تھے اور نہ ان کے اگلوں پر کھلے تھے اور نہ کسی اور ہی پر کھلے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس فضل واحسان کا جواب ان کی طرف سے یہی زیبا ہے کہ اس کی قدر کریں، بنی اسرائیل کی طرح اس کی ناقدری نہ کریں۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۚ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (٢٤٠)

وصیت کا لفظ فعل محذوف کا مفعول ہے۔ متاعاً وصیت کا مفعول ہے اور غیر اخراج ہمارے نزدیک لازواجہم سے حال پڑا ہوا ہے۔ ترجمے میں ہم نے یہ ترکیب کلام واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر نہ واضح ہو سکی ہو تو اس کو ہماری کوتاہی پر محمول کیجیے۔ تالیف کلام بہر حال ہمارے خیال میں یہی درست ہے۔

بیوہ کے لیے میت کا عارضی حکم

اوپر آیت ۲۳۴ میں بیوہ عورتوں کی عدت بیان ہوئی ہے۔ انہی سے متعلق بعد میں یہ مزید ہدایت اوپر والی آیت ہی کی توضیح مزید کے طور پر نازل ہوئی کہ بیوائیں چھوڑ جانے والے شوہر اپنی بیواؤں کے لیے ایک سال کے نان ونفقہ اور اپنے گھروں میں سکونت کی اجازت کی وصیت کر جائیں۔ اگر اس دوران میں بیوہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑے اور اپنے نکاح ثانی یا اپنی سکونت کے سلسلہ میں دستور کے مطابق کوئی قدم اٹھائے تو اس کا اس کو حق حاصل ہے۔ میت کے ورثا کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ وصیت کی خلاف ورزی کریں۔

اس وصیت کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ ان آیات کے نزول کے زمانے تک میراث کا قانون ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اسی باب کے شروع میں (آیت ۱۸۰) والدین اور قرابت داروں کے لیے بھی وصیت کی ہدایت گزر چکی ہے اور ہم وہاں بیان کر چکے ہیں کہ یہ حکم عارضی طور پر اس وقت تک کے لیے دیا گیا تھا جب تک سورۂ نساء والا قانون وراثت نازل نہیں ہوا تھا۔ اسی قانون کے تحت بیوگان سے متعلق بھی یہ ہدایت ہوئی کہ ان کے لیے ایک سال کے نان نفقہ اور سکونت کی وصیت کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ بعد میں جب وراثت کا قانون جاری ہو گیا اور مورث کے دوسرے وارثوں کی طرح اس کی بیوہ یا بیوگان کا حصہ بھی شریعت میں معین ہو گیا تو جس طرح والدین اور دوسرے وارثوں سے متعلق وصیت

کی مذکورہ ہدایت منسوخ ہوگئی، بیوگان کے لیے بھی یہ منسوخ ہوگئی اور اس کی جگہ وراثت کے مستقل قانون نے لے لی۔

اگر یہ آیت اوپر والی آیت یعنی آیت ۲۳۴ کے ساتھ ہوتی جس میں بیوہ کی عدت مذکور ہوئی ہے تو اس کا نظم سمجھنے میں کسی کو زحمت نہ ہوتی لیکن اس صورت میں یہ بات نہ واضح ہوسکتی کہ یہ آیت پہلے حکم کے بعد اسی حکم کی توضیح کے طور پر نازل ہوئی ہے، حالانکہ احکام کی تدریج اور ان کی حکمتیں سمجھنے کے لیے یہ چیز ضروری ہے۔ اسی حکمت کے لیے اس آیت کو اور اس کے ساتھ والی آیت کو، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کرچکے ہیں، خاتمہ باب پر رکھ دیا اور یہ اشارہ کردیا کہ یہ بعد میں نازل ہونے والی توضیحات ہیں۔

عزیز وحکیم کی صفات خدا کے حق قانون سازی اور اس کے قانون کے پُر حکمت ہونے کی طرف بھی اشارہ کررہی ہیں اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کی طرف بھی۔ اسلام میں تمام دین وشریعت اور تمام امر ونہی کی بنیاد خدا کی صفات ہی پر ہے، اس وجہ سے کہیں بھی ان کو محض برائے بیت نہیں خیال کرنا چاہیئے بلکہ ہر جگہ ان پر اسلام کے فلسفہ قانون اور فلسفۂ اخلاق کی بنیاد کی حیثیت سے غور کرنا چاہیئے۔

وَلِلۡمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ؕ حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِيۡنَ ۞ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (۲۴۱ - ۲۴۲)

صفات پر مبنی حقوق کا درجہ

اوپر آیت ۲۳۶ میں مطلقہ عورتوں کو دے دلا کر رخصت کرنے کی جو ہدایت فرمائی تھی آخر میں یہ پھر اس کی یاد دہانی کردی اور اس کو اہل تقویٰ پر ایک حق قرار دیا۔ جو حقوق صفات وکردار پر مبنی ہوتے ہیں بعض حالات میں وہ اس دنیوی زندگی میں تو قانون کی گرفت کے دائرے سے باہر ہوتے ہیں لیکن خدا کے ہاں ان صفات کے لیے وہ حقوق ہی معیار ٹھہریں گے۔ اگر ایک چیز مومنین یا محسنین یا متقین پر حق قرار دی گئی ہے تو یہ تو ہوسکتا ہے کہ اسلام کا قانون اس دنیا میں اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آخرت میں بھی ان کی خلاف ورزی پر کوئی اثر مترتب نہیں ہوگا۔ آخرت میں آدمی کا ایمان یا احسان یا تقویٰ انھی حقوق کی ادائگی یا عدم ادائیگی کے اعتبار سے وزن دار یا بے وزن ٹھہرے گا۔

آخری آیت میں كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ الاٰية کا ٹکڑا بطور اظہار احسان ہے اور اس سے، جیسا کہ ہم دوسری جگہوں پر واضح کرچکے ہیں، ان آیات کی نوعیت واضح ہوتی ہے جن کی طرف كَذٰلِكَ کا اشارہ ہے۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ عموماً یہ ٹکڑا ان آیات کے بعد آتا ہے جن کی حیثیت توضیح مزید کی ہوتی ہے اور جو اپنے باب کے اصل احکام کے بعد لوگوں کے اندر سوال یا مزید جستجو اور تلاش پیدا ہونے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ نظم قرآن کے طالبوں کو بہت سے مقامات میں ان سے بڑی قیمتی رہنمائی ملتی ہے اس وجہ سے ان کو نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔

قرآن نے اجمال کے بعد تفصیل، ایجاز کے بعد توضیح اور توضیح کے بعد توضیح مزید کا یہ طریقہ جو اختیار کیا ہے اس میں تربیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ ازاں جملہ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے دین میں غور و فکر اور اس کے فوائد و مصالح اور اس کے اسرار و حکم تک پہنچنے کے لیے ہماری عقل کی تربیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تدریج کو نمایاں کر کے اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرماتا ہے کہ ہم دین میں عقل کو کس طرح استعمال کر سکتے ہیں اور پیش آنے والے حالات و معاملات میں ان کلیّات سے کس طرح جزئیات مستنبط کر سکتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

۷۸۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۲۴۳-۲۵۳

پیچھے کے سلسلۂ مضمون کی طرف اشارہ

یہاں ذرا پیچھے مڑ کر سلسلۂ کلام کو ذہن میں پھر تازہ کر لیجیے۔ فصل ۷۴ میں ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ اصل بیان تو بیت اللہ کے تعلق سے جہاد و انفاق کا ہو رہا تھا لیکن انفاق کی بحث نے یتیموں کی صلاح و فلاح اور ان کی ماؤں کے ساتھ نکاح کا سوال سامنے کر دیا اور اس طرح نکاح و طلاق سے متعلق بعض مناسب وقت مسائل کے بیان کے لیے ایک تقریب پیدا ہو گئی۔ قرآن کا طریقہ یہی ہے کہ جب کسی مسئلے کے بیان کے لیے تقریب پیدا ہو جاتی ہے تو اصل سلسلۂ بیان کو روک کر، اس مسئلے سے متعلق اتنی باتیں بیان کر دیتا ہے جتنی باتوں کے لیے وقت کے حالات تقاضا کر رہے ہوتے ہیں اور پھر اصل سلسلۂ بیان شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ نکاح و طلاق سے متعلق مناسب وقت مسائل بیان کر چکنے کے بعد اصل بیان جہاد و انفاق کا پھر شروع ہو گیا۔

آگے کے مضامین کا خلاصہ اور ان کا نظم

آگے کے مطالب کی ترتیب یوں ہے کہ پہلے بنی اسرائیل کے ایک واقعہ کا حوالہ دیا ہے کہ وہ ایک بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے دشمنوں کے ڈر سے اپنا وطن چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے اور اس طرح انھوں نے اپنے لیے اخلاقی اور سیاسی موت اختیار کر لی۔ اس واقعے کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ انھوں نے مکہ سے مدینہ کو جو ہجرت کی ہے تو یہ موت اور دشمن سے فرار نہیں ہے بلکہ کفر اور فتنہ سے فرار ہے اور اصل مقصد اس سے جانیں بچانا نہیں بلکہ اللہ کے دین کی نصرت اور اس کی راہ میں جہاد کے لیے منظم ہونا ہے۔

اس تمہید کے بعد مسلمانوں کو جہاد و انفاق پر ابھارا ہے اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کی اس جنگ کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کی تحریک ان کے ہاں بھی بعینہٖ اسی مقصد کے لیے ہوئی تھی جس مقصد کے لیے مسلمانوں کو یہاں جہاد پر ابھارا جا رہا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل نے بھی یہ جنگ اپنے قبلہ کی آزادی کے لیے لڑی تھی اور مسلمان بھی اپنے قبلہ ہی کی آزادی کے لیے اٹھ رہے تھے۔

بنی اسرائیل اپنی اس جنگ کے مختلف مراحل میں جن آزمائشوں سے گزرے اور جن فتنوں میں مبتلا

ہوئے وہ بڑے ہی سبق آموز تھے اس وجہ سے مسلمانوں کو جو بعینہٖ انھی مراحل سے گزرنے کے لیے کمربستہ ہو رہے تھے، ان کی سرگزشت کا یہ حصہ سنا دینا ضروری تھا تاکہ مسلمان اس سے سبق حاصل کریں اور ان فتنوں سے اپنے آپ کو بچا سکیں جو آگے کے مراحل میں پیش آ سکتے ہیں۔

اس کے بعد چند آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اس سرگزشت کے ذکر سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے بلکہ یہی کچھ تمہارے سامنے بھی آنے والا ہے اور اس سے تمہاری نبوت کی تصدیق ہوگی لیکن بنی اسرائیل خود اپنے آئینے میں بھی تمہاری تصویر دیکھ لینے کے باوجود اسی طرح اپنی ضد اور مخالفت پر اڑے رہیں گے، سو ان کی مخالفت کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے خدا تمہاری نصرت فرمائے گا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۴۳-۲۵۳ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ
الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ
لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾
وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٤﴾
مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا
كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٤٥﴾ أَلَمْ
وقف لازم تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ
قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا
قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا
مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا
إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٢٤٦﴾ وَقَالَ لَهُمْ
نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّىٰ

يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ
لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ
وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٧﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ
مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ
بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ
اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٤٨﴾ فَلَمَّا ع ٣٢ ٦ ١٦
فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ
فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ
مِنِّىْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا
لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ
فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٢٤٩﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا
لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ
اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوْهُمْ
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ

بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى
الْعَٰلَمِينَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ آيَٰتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَإِنَّكَ
الجزء ۳ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۲۵۲﴾ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ
مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ ۖ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَٰتٍ ۚ وَآتَيْنَا عِيسَى
ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَٰتِ وَأَيَّدْنَٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ وَلَوْ شَاءَ
اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِن بَعْدِهِم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ
الْبَيِّنَٰتُ وَلَٰكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ وَمِنْهُم مَّن كَفَرَ ۚ
ع ۳۳ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿۲۵۳﴾

ترجمہ آیات ۲۵۳-۲۴۳

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے تو اللہ نے ان کو کہا کہ جاؤ مرجاؤ، پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا، اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ ۲۴۳

اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور یہ خوب سمجھ رکھو کہ اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے اور کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ اللہ اس کو اس کے لیے کئی گنا بڑھائے۔ اللہ ہی ہے جو تنگ دستی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی دیتا ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا بھی ہے۔ ۲۴۴-۲۴۵

کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا جب کہ موسیٰ کے بعد انھوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک امیر مقرر کر دیجیے کہ ہم خدا کی راہ میں

جہاد کریں۔ اس نے کہا، ایسا نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کر دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو۔ وہ بولے کہ بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور بچوں سے نکالے گئے ہیں۔ پھر جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان کی ایک قلیل تعداد کے سوا سب منہ موڑ گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے۔ وہ بولے کہ بھلا اس کی امارت ہمارے اوپر کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس سے زیادہ حق دار ہم اس امارت کے ہیں اور اسے تو مال کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے۔ نبی نے کہا اللہ نے تمہاری سرداری کے لیے اسی کو چنا اور اس کو علم اور جسم دونوں میں کشادگی عطا فرمائی ہے۔ اللہ اپنی طرف سے جسے چاہتا اقتدار بخشے، اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی امارت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سامانِ تسکین اور آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ صندوق کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔ ۲۴۶-۲۴۸

پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو انھوں نے بتایا کہ اللہ ایک ندی کے ذریعہ سے تمہاری جانچ کرنے والا ہے تو جو اس میں سے پی لے گا وہ میرا ساتھی نہیں اور جو اس کو نہیں چکھے گا تو بے شک وہ میرا ساتھی ہے، مگر یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ تو انھوں نے اس میں سے خوب پیا، صرف ان میں سے تھوڑے لوگ اس سے بچے۔ پھر جب طالوت اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان پر ثابت قدم رہے دریا پار کر گئے تو

یہ لوگ بولے کہ اب ہم میں تو جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ جو لوگ یہ گمان رکھتے تھے کہ بالآخر انھیں اللہ سے ملنا ہے انھوں نے للکارا کہ کتنی چھوٹی جماعتیں رہی ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں، اللہ تو ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا تو انھوں نے دعا کی، اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر انڈیل دے، ہمارے قدم جمائے رکھ، اور کافر قوم پر ہمیں غلبہ عطا فرما۔ تو اللہ کے حکم سے انھوں نے ان کو شکست دی۔ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اس کو بادشاہی اور حکمت بخشی اور اس علم سے اس کو سکھایا جس میں سے وہ چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ۲۴۹ - ۲۵۱

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں سناتے ہیں مقصد کے ساتھ اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام کیا، اور بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسٰی بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح دلائل کے بعد نہ لڑتے لیکن انھوں نے اختلاف کیا، سو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ اختلاف نہ کر پاتے لیکن اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ۲۵۲ - ۲۵۳

۷۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (۲۴۳)

'اَلَمْ تَرَ' کے خطاب کی نوعیت

'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب ضروری نہیں کہ واحد کے لیے ہو بلکہ یہ عموماً، جیسا کہ استاذ امامؒ نے سورہ فیل کی تفسیر میں واضح کیا ہے، جمع کے لیے آتا ہے اور خطاب اس میں گویا مخاطب گروہ کے ہر شخص سے فرداً فرداً ہوتا ہے۔ اس کے بعد جس واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یا تو مخاطب گروہ کا عینی شاہد ہوتا ہے یا واقعے کی شہرت اس درجے کی ہوتی ہے کہ اس کی نسبت یہ باور کیا جاتا ہے کہ اس سے مخاطب باخبر ہیں یا انھیں باخبر ہونا چاہیے۔ یا متکلم کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ واقعے کی صداقت ایسی مسلّم ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

الفاظ 'موت' 'حیات' کا مفہوم

موت کے لفظ پر اسی سورہ کی آیت ۵۶ کے تحت ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں یہ لفظ جس طرح زندگی کے فنا ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے اسی طرح نیند، بے ہوشی اور اخلاقی و ایمانی موت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ وہاں ہم نے لسان العرب کا حوالہ دیا ہے۔ یہاں قرآن کے بعض نظائر ملاحظہ ہوں۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ۴۲۔ زمر (اللہ جانوں کو وفات دیتا ہے ان کی نیند کے وقت) ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۵۶۔ بقرہ (پھر ہم نے تمھاری بے ہوشی کے بعد تم کو اٹھایا تاکہ تم شکر کرو) اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ ۸۰۔ نمل (تم اپنی دعوت مردہ دلوں اور بہروں کو نہیں سنا سکتے) اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ ۱۲۲۔ انعام (کیا وہ جو مردہ دل تھا تو ہم نے اس کو حیات ایمانی بخشی اور اس کو نورِ ہدایت عطا کیا جس کو لے کر لوگوں کے درمیان چلتا ہے)

اسی طرح حیات کا لفظ بھی مادی زندگی سے لے کر نیند سے بیداری اور ایمانی و اخلاقی زندگی تک سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ایک واضح نظیر تو انعام کی مقدم الذکر آیت ہی میں موجود ہے، دوسری واضح تر نظیر انفال سے ملاحظہ ہو۔ اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۲۴۔ انفال (اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ تمھیں بلاتا ہے اس چیز کی طرف جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے)

اَلَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ کے واقعہ کا مصداق

اس آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے اس کا تعلق بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دور سے ہے جس کا ذکر صحیفۂ سموئیل میں ہے۔ سموئیل نبی کے ظہور کے ابتدائی دور میں بنی اسرائیل سخت انتشار میں مبتلا تھے، اگرچہ تعداد کے لحاظ سے یہ اس وقت تین لاکھ سے زیادہ تھے، جیسا کہ سموئیل

میں تصریح ہے[1]۔ لیکن بدعات اور شرک کے غلبے کی وجہ سے ان کی مذہبی و اخلاقی حالت بھی بڑی خراب تھی اور اجتماعی تنظیم مفقود ہونے کی وجہ سے سیاسی حالت بھی بڑی ابتر تھی۔ ہر طرف سے دشمنوں کی یورش تھی اور یہ ان سے اس قدر مرعوب اور دہشت زدہ تھے کہ کسی سے مقابلے کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔ خاص طور پر فلسطینیوں نے ان کو بری طرح مرعوب کر لیا تھا۔ انھوں نے ان پر چڑھائی کر کے ان کا قتل عام بھی کیا اور ان سے خدا کا وہ صندوق بھی چھین لے گئے جس کی حیثیت ان کے ہاں بالکل قبلہ کی تھی، جس کو وہ اپنی تمام عبادات اور تمام مہمات میں آگے آگے رکھتے تھے۔ ان کے ڈر سے بنی اسرائیل نے اپنے عقرون سے لے کر جات تک کے سارے شہر بھی خالی کر دیئے تھے[2]۔ خوف و بزدلی کی یہ موت ان پر بیس برس طاری رہی[3]۔ اس کے بعد سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کا کام شروع کیا، ان کو شرک و بدعت سے توبہ کرنے اور اپنے انتشار کو دور کر کے از سر نو منظم و متحد ہونے کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی بخشی اور اس طرح بنی اسرائیل میں بیس سال کی مردنی کے بعد از سر نو ایمانی و سیاسی زندگی کی حرکت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ہوئے کہ فلسطیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور اپنے ان شہروں کو ان سے واپس لے سکیں جن کو خود خالی کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

سموئیل میں یہ داستان بہت پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کے کچھ ضروری حصے یہاں نقل کرتے ہیں جن سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔

فلسطیوں سے بنی اسرائیل کی مرعوبیت، ان کے ہاتھوں ان کے قتل عام اور خدا کے صندوق کے چھن جانے کا ذکر اس طرح ہوا۔

> "اور فلستی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی کیونکہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے وہاں کھیت آئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔" سموئیل باب ۴: ۱۰-۱۱

خدا کے صندوق کے چھن جانے کا جو اثر بنی اسرائیل پر پڑا اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

> "اس خبر لانے والے نے جواب دیا اسرائیلی فلستیوں کے آگے سے بھاگے اور لوگوں میں بڑی خونریزی ہوئی اور تیرے دونوں بیٹے حفنی اور فینحاس بھی مر گئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔ جب اس نے خدا کے صندوق کا ذکر کیا تو وہ کرسی پر سے پچھاڑ کھا کر پھاٹک کے کنارے گرا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی ....
>
> .... اور کہنے لگی کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی اس لیے کہ خدا کا صندوق

---

[1] سموئیل باب ۹   [2] سموئیل باب ۱۴   [3] سموئیل باب ۲

چھن گیا تھا اور اس کا خسر اور خاوند جاتے رہے تھے سو اس نے کہا کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی کیونکہ خدا کا صندوق چھن گیا ہے۔ ۱سموئیل باب ۴۔ ۱۸-۲۲

اس حادثہ کے بعد بنی اسرائیل پر پورے بیس سال تک خوف و بزدلی اور نوحہ و ماتم کی جو مردنی طاری رہی اور پھر سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کی جو دعوت بلند کی اس کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

"اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے ایک مدت ہو گئی یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا اور سموئیل نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں اور عستارات کو اپنے بیچ سے دور کرو اور خداوند کے لیے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اسی کی عبادت کرو اور وہ فلستیوں کے ہاتھ سے تمہیں رہائی دے گا۔ تب بنی اسرائیل نے بعلیم اور عستارات کو دور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے۔ پھر سموئیل نے کہا کہ سب اسرائیل کو مصفاہ میں جمع کرو اور میں تمہارے لیے خداوند سے دعا کروں گا۔"
۱سموئیل باب ۷۔ ۲-۶۔

اس اجتماعی توبہ و استغفار اور تنظیم و اتحاد کے بعد بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور ان کو شکست دے کر ان سے اپنے چھنے ہوئے شہر اور ساتھ ہی اپنی چھنی ہوئی حشمت واپس لے سکیں۔ بنی اسرائیل کی اس نئی زندگی کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

"اور سموئیل بنی اسرائیل کے لیے خداوند کے حضور فریاد کرتا رہا اور خداوند نے اس کی سنی اور جس وقت سموئیل اس سوختنی قربانی کو گزران رہا تھا اس وقت فلستی اسرائیلیوں سے جنگ کرنے کو نزدیک آئے لیکن خداوند فلستیوں کے اوپر اس دن بڑی کڑک کے ساتھ گرجا اور ان کو گھبرا دیا اور انھوں نے اسرائیلیوں کے آگے شکست کھائی اور اسرائیل کے لوگوں نے مصفاہ سے نکل کر فلستیوں کو رگیدا اور بیت کر کے نیچے تک انہیں مارتے چلے گئے...... سو فلستی مغلوب ہوئے اور اسرائیل کی سرحد میں پھر نہ آئے اور سموئیل کی زندگی بھر خداوند کا ہاتھ فلستیوں کے خلاف رہا اور عقرون سے جات تک کے شہر جن کو فلستیوں نے اسرائیلیوں سے لے لیا تھا وہ پھر اسرائیلیوں کے قبضہ میں آئے اور اسرائیلیوں نے ان کی نواحی بھی فلستیوں کے ہاتھ سے چھڑائی۔" ۱سموئیل باب ۷۔ ۱۰-۱۴

ہمارے نزدیک تاریخ بنی اسرائیل کا یہی جزو ہے جس کی طرف آیت زیر بحث میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جب انھوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس ایمانی و اخلاقی موت کے حوالہ کر دیا جس کی تعبیر مُوْتُوْا سے فرمائی ہے۔ یہ معاملہ ٹھیک اس سنت اللہ کے مطابق ہوا جس کی طرف فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی جب انھوں نے گمراہی پسند کی تو اللہ نے ان کو گمراہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر جب ان کے اندر تجدید و احیائے ملت کی دعوت اٹھی اور

انھوں نے از سرِ نو ایمان و اسلام کی حیات تازہ اختیار کر لینے کا عزم کر لیا تو اللہ نے ان کو از سرِ نو زندہ و متحرک کر دیا۔ اسی چیز کو یہاں ثُمَّ اَحۡیَاھُمۡ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اسی اصول پر ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے لیے ذلت و نامرادی کو پسند کرتی ہے تو خدا اس کو ذلت و نامرادی کے حوالہ کر دیتا ہے اور اگر کوئی قوم عروج و سربلندی کی طالب ہوتی ہے اور اس طلب کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کی ہمت دکھاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو عزت و سربلندی بخشتا ہے اور یہ مرتبہ دے کر اس کا امتحان کرتا ہے۔

واقعہ کے ذکر کا مقصد

اس واقعہ کے ذکر سے مقصود مسلمانوں خصوصاً کمزور مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد و انفاق پر ابھارنا ہے۔ گویا یہ اس مضمون کی تمہید ہے جو آگے کی آیات میں بیان ہوا ہے۔ ہم تمہید والی فصل میں اشارہ کر آئے ہیں کہ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بھی ان کے قبلہ کی جنگ سے متعلق ہے اور مسلمانوں کو بھی یہاں جس جنگ اور جس انفاق کے لیے ابھارا جا رہا ہے اس کا تعلق اصلاً قبلہ ہی کی آزادی سے ہے۔ دونوں میں نہایت واضح قدرِ مشترک موجود ہے۔ گویا مسلمانوں کے سامنے بھی اس وقت زندگی اور موت دونوں کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اگر وہ موت سے ڈر گئے تو یاد رکھیں کہ ان کو موت سے کوئی چیز بھی بچا نہ سکے گی۔ ان کے اوپر ذلت و خواری اور نفاق کی موت طاری ہو کر رہے گی اور اگر وہ موت سے بے پروا ہو کر زندگی کی راہ پر بڑھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ ان کو دنیا میں ایمان و اسلام کی باعظمت زندگی اور آخرت میں فوز و فلاح کی حیاتِ جاوداں سے سرفراز فرمائے گا۔

وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۴۴﴾

جہاد کے لیے دو محرک

اوپر کی تاریخی تمہید کے بعد یہ مسلمانوں کو جنگ پر ابھارا ہے۔ اور اس ابھارنے کے لیے دو محرک یہاں نمایاں فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ جنگ اللہ کی راہ میں ہے، نفس یا شیطان کی راہ میں نہیں ہے اس وجہ سے اس میں ہر قدم پر بندے کو اللہ کی معیت حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے، تمہاری جانبازیاں اور قربانیاں، تمہاری دعائیں اور فریادیں، تمہارے دشمنوں کی چالیں اور تدبیریں سب اس کے علم میں ہیں اس وجہ سے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ

مر گئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی

ظاہر ہے کہ ان صفات کا حوالہ دینے سے مقصود یہاں اس کا لازم ہے یعنی جب اللہ سنتا اور جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمہاری پکار پر تمہاری مدد و نصرت فرمائے گا اور تمہاری جانبازیوں کا تمہیں بھرپور صلہ دے گا۔

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗۤ اَضۡعَافًا کَثِیۡرَۃً ؕ وَاللّٰہُ یَقۡبِضُ وَیَبۡصُۜطُ ۪
وَاِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۴۵﴾

انفاق کے لیے قرض کی تعبیر

جانی قربانی کی دعوت کے بعد یہ مالی قربانی کی دعوت ہے اور اس کے لیے جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ غایت درجہ مؤثر ہے۔ سوال تو سوال کا یہ انداز ہی کہ کون ہے جو خدا کو قرض دینے کے لیے آگے بڑھتا ہے! غایت درجہ شوق انگیز ہے، پھر یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو "قرض دینے" سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرض، قرضدار کے ذمہ واجب ہوتا ہے اور یہ رب کریم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ جو مال اس نے خود بندوں کو عنایت فرمایا ہے وہی مال وہ جب ان سے اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کہتا ہے تو اس کو اپنے ذمہ قرض ٹھہراتا ہے یعنی اس کی واپسی از خود اپنے ذمہ واجب قرار دیتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ روح و دل کو بے خود کر دینے والی بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ رب کریم یہ قرض اس لیے مانگتا ہے کہ وہ بندوں کے دیئے ہوئے خزف ریزوں کو خوب بڑھائے اور ان کو بڑھا کر ایک لازوال خزانہ کی شکل میں ان کو واپس کرے۔ یعنی اس قرض کی ضرورت اس لیے نہیں پیش آئی ہے کہ خدا کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے، اس کا خزانہ بھرپور اور وہ بالکل بے نیاز و بے پروا ہے، البتہ اس کی کریمی نے اپنے بندوں کے لیے نفع کمانے کی یہ راہ کھولی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک خرچ کر کے دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک اس کا اجر حاصل کر لیں۔

"قرضِ حسن" کا مفہوم

اس قرض کے متعلق شرط صرف ایک لگائی ہے۔ وہ یہ کہ یہ قرض "قرض حسن" ہو۔ قرض حسن کا مفہوم قرآن کے دوسرے مواقع سے جو نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دل کی تنگی کے ساتھ محض چھدا اتارنے کے لیے نہ دیا جائے بلکہ پوری فراخدلی اور حوصلے کے ساتھ دیا جائے، ریا اور نمائش کے لیے نہ دیا جائے بلکہ صرف خدا کی خوشنودی کے لیے دیا جائے، کسی دنیوی طمع کے حصول کی غرض سامنے رکھ کر نہ دیا جائے بلکہ صرف آخرت کے اجر کی خاطر دیا جائے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حقیر، کم وقعت اور ناجائز ذرائع سے حاصل کیے ہوئے مال میں سے نہ دیا جائے بلکہ محبوب، عزیز اور پاکیزہ کمائی میں سے دیا جائے۔ اسی سورہ میں آگے بھی ان باتوں کی وضاحت ہو گی اور احادیث میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے۔

آخر میں اصل نکتے کی بات فرما دی کہ تنگی اور کشادگی کا انحصار آدمی کی اپنی تدبیروں پر نہیں ہے بلکہ یہ چیز خدا کے اختیار میں ہے اس وجہ سے اگر وہ اپنا مال خدا سے بچاتا اور چھپاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اسی سے چھپاتا ہے جس کے اختیار میں بخشنے کے بعد چھین لینا بھی ہے۔

"وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ" میں یہ پہلو بھی ہے کہ آج خدا سے منہ چھپانے والے اس بات کو نہ بھولیں کہ کل ان کو خدا کو منہ دکھانا بھی ہے۔ اور یہ پہلو بھی ہے کہ جس دنیا کی زندگی کے لیے یہ خدا سے بخالت کر رہے ہیں یہ زندگی تو چند روزہ ہے، اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جس کے لیے اصلی فکر ہونی چاہیے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (۲۴۶)

لفظ 'ملأ' کی تحقیق

'ملأ' کا اصل لغوی مفہوم بھرنا ہے۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کرکے یہ لفظ کسی قوم کے اشراف و اعیان اور اکابر و سادات کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی ہوگی کہ قوم کے اعیان و اشراف ہی ہوتے ہیں جو اس کی چوپالوں، پنچایتوں، مجلسوں، کونسلوں اور اس کے درباروں کو پُر کرتے ہیں۔

'ملک' کا مفہوم

'ملک' کے معنی صاحبِ اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یہ اختیار و اقتدار مطلق قسم کا بھی ہو سکتا ہے جس طرح کا اختیار و اقتدار کسی جبار و مطلق العنان بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے اور محدود و مقید قسم کا بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ ایک پابند آئین و قانون یا پابند شریعت بادشاہ کو یا کسی امیر لشکر یا سپہ سالار کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس کے تقرر کے لیے بنی اسرائیل کے اعیان نے درخواست اس زمانے کے نبی (سموئیل) سے کی اور انہی کے تقرر سے اس کا تقرر ہوا اور تورات کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھی کی ہدایات کے تحت[1] اور انھی کی دعاؤں کے زیر اثر وہ اپنے سارے فرائض انجام دیتا تھا۔ قرآن نے یہ لفظ مدح و ذم دونوں کے محل میں استعمال کیا ہے۔ ایک بادشاہ وہ بھی تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ سے حجت کی اور جس نے زندگی اور موت دونوں پر اختیار کا دعویٰ کیا۔ قرآن نے اس کی مذمت کی۔ اس کے برعکس ذوالقرنین، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ بھی بادشاہ ہیں لیکن قرآن نے ان کی تعریف فرمائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک سیاسی نظام میں اصل اہمیت اس کی صورت کی نہیں بلکہ اس کی روح کی ہے۔ اگر اس کی روح خدا اور اس کے رسول کے قانون کے تابع ہے تو وہ قابلِ ستائش ہے، اس کی شکل کچھ بھی ہو۔ اگر روح خدا اور رسول کی باغی ہے تو وہ قابلِ مذمت ہے عام اس سے کہ وہ ملوکیت ہو یا جمہوریت۔

آیت ۲۴۶ کی تعلیم اور واقعہ کی نوعیت

جس طرح اوپر کی آیات میں بنی اسرائیل کی ایمانی و اخلاقی موت و حیات کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرکے مسلمانوں کو زندگی کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ زندگی خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی سے حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اس آیت میں اور آگے کی چند آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے اسی سلسلے کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کرکے مسلمانوں کو اجتماعی و سیاسی زندگی سے متعلق بعض نہایت اہم سبق دیے گئے ہیں۔

زیر بحث آیت میں جس واقعے کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل تورات کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے کہ سموئیل نبی[2] نے بنی اسرائیل کے اندر تجدید و اصلاح اور ان کی تنظیم کا جو کام شروع کیا اس سے بنی اسرائیل کے اندر کچھ زندگی تو پیدا ہوئی اور وہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہونے اور ان سے اپنے بعض چھنے ہوئے

---

[1] سموئیل باب ۱۰: ۲۵ [2] ان کا زمانہ ۱۰۰۹ قبل مسیح کا زمانہ ہے۔

شہر واپس لینے میں کامیاب ہوئے لیکن بنی اسرائیل ہر طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے، ان کے کے بہت سے شہر اب بھی مخالفوں کے قبضے میں تھے، فلسطیوں کے علاوہ موآب، بنی عمون، ادوم اور ضوباہ کے بادشاہوں سے بھی ہر وقت ان کو خطرہ تھا، پھر سموئیل نبی بوڑھے ہو چکے تھے اور انھوں نے بنی اسرائیل کی قیادت و تنظیم کی جو ذمہ داریاں اپنے بیٹوں کے سپرد کی تھیں وہ ان کو بنی اسرائیل کی توقع کے مطابق نہیں نباہ رہے تھے اس وجہ سے انھوں نے سموئیل سے یہ درخواست کی کہ وہ ان کی قیادت کے لیے کسی امیر کو مامور کریں تاکہ وہ اس کی سربراہی میں جہاد کر سکیں اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکیں[1]۔

سموئیل اپنے تجربات کی بنا پر جانتے تھے کہ بنی اسرائیل کی اصلی کمزوری یہ نہیں ہے کہ میدانِ جنگ میں رہنمائی کرنے والا ان کے پاس کوئی لیڈر نہیں ہے بلکہ ان کی اصلی کمزوری یہ ہے کہ جنگ کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اندر عزم و ایمان نہیں ہے اس وجہ سے انھوں نے، جیسا کہ تورات سے واضح ہوتا ہے، ان کے اس مطالبے کی مخالفت کی اور ان کی اصلی کمزوری کی طرف توجہ دلائی کہ ایسا تو نہیں ہوگا کہ جہاد بھی فرض ہو جائے اور امیر بھی مقرر ہو جائے لیکن پھر تم جہاد سے انکار کر دو، اس پر انھوں نے بڑے جوش و جذبے کا اظہار کیا کہ ہم اپنے گھروں اور بیوی بچوں سے نکالے گئے ہیں، اگر اب بھی ہم جنگ نہ کریں گے تو پھر کب کریں گے، لیکن سموئیل کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ انھوں نے تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان کی قیادت کے لیے امیر بھی مقرر کر دیا اور جہاد کا حکم بھی دے دیا لیکن بنی اسرائیل نے حسب عادت عین وقت پر کندھا ڈال دیا۔ آگے کی تفصیلات سے معلوم ہوگا کہ اول تو انھیں منتخب سردار کی سرداری ہی پر اعتراض ہوا، پھر جب بادلِ ناخواستہ اس کی فوج میں بھرتی ہوئے بھی تو پہلے ہی امتحان میں پھسڈی ثابت ہوئے۔

"وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ" (اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے) سے مراد اس کا لازمی نتیجہ ہے یعنی جب خدا خوب جانتا ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۴۷)

لفظ بعث کا مفہوم — "بَعَثَ" کے معنی اٹھانے، ابھارنے، بھیجنے کے ہیں پھر اسی مفہوم سے اس کے اندر مامور کرنے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ چونکہ اس سالار کا انتخاب سموئیل نے خدا کی ہدایت کے مطابق کیا تھا، جیسا کہ تورات سے بھی ثابت ہے اور قرآن کے الفاظ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ سے بھی واضح ہے، اس وجہ سے اس کے لیے بَعَثَ کا لفظ

---

[1] ملاحظہ ہو سموئیل باب ۸

استعمال ہوا۔

طالوت اور ساؤل

"طالوت" یہ اس مامور سالار کا نام ہے۔ تورات میں ان کا نام ساؤل آیا ہے۔ اور ان کے غیر معمولی طور پر قدآور ہونے کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے: "اور جب وہ لوگوں کے درمیان کھڑا ہوا تو ایسا قدآور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے[1]" کچھ بعید نہیں کہ اپنے اس غیر معمولی قد و قامت کی وجہ سے وہ لوگوں میں اس لقب سے بھی مشہور رہے ہوں۔ طالوت کے معنی "لمبے تڑنگے" کے ہیں۔ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں قریب قریب ہیں اس وجہ سے دونوں میں بہت سے مادے مشترک ہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ تورات نے ان کا ذکر نام سے کیا ہے اور قرآن نے لقب سے۔ ورنہ پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے نام کے بارے میں تورات کا بیان غلط ہے، اصل نام طالوت ہی ہے۔ قرآن نے یہاں بعض دوسرے واقعات کے بارے میں بھی تورات کے بیانات کی تردید کی ہے۔ آگے ہم ان کی طرف اشارہ کریں گے اور یہ بھی واضح کریں گے کہ اس طرح کے اختلافات کی صورت میں قرآن کا بیان کیوں قابل ترجیح ہے۔

طالوت کا انتخاب اور اس پر بنی اسرائیل کا اعتراض

بنی اسرائیل کے اپنے مطالبے پر جب سموئیل نے ایک سالار کا انتخاب کیا اور اس کو ان کے سامنے پیش کیا تو بجائے اس کے کہ خوشی سے اس کو قبول کرتے انھوں نے حسبِ عادت اس انتخاب پر اعتراض کر دیا کہ بھلا یہ ہمارا سردار کیسے ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ حق دار تو ہم اس منصب کے ہیں؟ اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ طالوت کوئی مال دار آدمی نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں طالوت بنیامین کے قبیلہ سے تھے، بنیامین کا قبیلہ اول تو بنی اسرائیل کے تمام قبیلوں میں سب سے چھوٹا قبیلہ تھا پھر طالوت اس قبیلے کے تمام گھرانوں میں سب سے چھوٹے گھرانے کے تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت کو اپنے قبیلے کی کمزوری کا خود بھی احساس تھا چنانچہ جب سموئیل نے ان کے انتخاب کا ان سے ذکر کیا تو انھوں نے بڑی خاکساری کے ساتھ یہ الفاظ کہے۔

"ساؤل نے جواب دیا کیا میں بنیمینی یعنی اسرائیل کے سب سے چھوٹے قبیلے سے نہیں؟ اور کیا میرا گھرانا بنیمین کے قبیلہ کے سب گھرانوں میں سب سے چھوٹا نہیں؟[2]"

ظاہر ہے کہ مالی اور عددی دونوں ہی اعتبار سے ایک کمزور آدمی کو بنی اسرائیل کے وہ قبیلے کس طرح خاطر میں لا سکتے تھے جن کو اپنی مضبوط عصبیت اور اپنی مالی برتری کا گھمنڈ تھا چنانچہ انھوں نے اس انتخاب پر اعتراض کر دیا۔ تورات میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

"پر شریروں میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا، سو انھوں نے اس کی تحقیر کی اور اس کے لیے نذرانے نہ لائے پر وہ اَن سنی کر گیا[3]"

---

[1] سموئیل باب ۱۰ : ۲۴ [2] سموئیل باب ۹ : ۲۱ [3] سموئیل باب ۱۰ : ۲۷

اور لوگ سموئیل سے کہنے لگے کس نے یہ کہا تھا کہ کیا ساؤل ہم پر حکومت کرے گا۔[1]

اعتراض کا جواب

اس اعتراض کا جواب سموئیل نبی نے یہ دیا کہ یہ انتخاب خدا کا انتخاب ہے۔ اسی نے اس کو تمہاری سرداری کے لیے چنا ہے، تم سرداری کو تعداد اور مال کے پیمانوں سے تولتے اور ناپتے ہو لیکن خدا علم اور عمل کے پیمانے سے ناپتا ہے۔ طالوت کے پاس اگرچہ خاندان کی شوکت اور مال کی فراوانی نہیں ہے لیکن علم کی وسعت اور عمل کی قوتوں سے وہ بھرپور ہے اور خدا کے انتخاب میں اصلی اہمیت انہی چیزوں کو حاصل ہے نہ کہ خاندان اور مال کو۔

اس کے بعد فرمایا کہ اقتدار و اختیار خدا کی دین ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور جس کو بخشتا ہے اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت بخشتا ہے۔ اس کا اقتدار تمام اقتداروں کو محیط ہے اور اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس کے پاس نہ بخشنے کے لیے کمی ہے، نہ بخش کر واپس لینے میں کوئی مانع ہے، نہ کسی معاملے کے ظاہر و باطن یا اس کے ماضی و مستقبل کا کوئی گوشہ اس سے مخفی ہے۔

"وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تم ہر معاملے کو اپنی تنگ اور محدود نگاہوں سے دیکھتے ہو لیکن خدا اپنے فیصلے اپنی قدرت اور اپنے علم کی روشنی میں صادر فرماتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۴۸)

تابوت کی حقیقت

"تابوت" کے معنی صندوق کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد بنی اسرائیل کا وہ صندوق ہے جس کو تورات میں "خدا کا صندوق" یا "خدا کے عہد کا صندوق" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے زمانے سے لے کر بیت المقدس کی تعمیر تک اسی صندوق کو بنی اسرائیل کے قبلہ کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ اس کو اپنے خیمۂ عبادت میں ایک مخصوص مقام پر نہایت مخصوص اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور تمام دعا و عبادت میں اسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کے ربّی اور کاہن غیبی رہنمائی کے لیے بھی اسی کو مرجع بناتے۔ مشکل حالات، قومی مصائب اور جنگ کے میدانوں میں بھی بنی اسرائیل کا حوصلہ قائم رکھنے میں اس صندوق کو سب سے بڑے عامل کی حیثیت حاصل رہی۔ حضرت موسیٰ کے زمانے تک تو اس میں تورات اور صحرا کی زندگی کے دور کی بعض یادگاریں محفوظ کی گئیں لیکن پھر اس میں حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور ان کے خاندان کے بعض اور تبرکات بھی محفوظ کر دیے گئے۔

سکینۃ کی تحقیق

"سَكِيْنَة" کے معنی اطمینان، قرار اور حوصلہ کے ہیں، بالخصوص وہ اطمینان و حوصلہ جو پر خطر حالات

[1] سموئیل باب ۱۰: ۱۲

اور جنگ کے مصائب میں آدمی کے عزم کو قائم رکھے۔ مثلاً ھُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا ۴۔ الفتح (وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں عزم واطمینان اتارا تاکہ وہ اپنے ایمان میں اضافہ کریں) فَعَلِمَ مَافِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ۱۸۔ فتح (تو ان کے دلوں میں جو کمزوری تھی اللہ نے اس کو جان لیا پس ان پر عزم واطمینان اتارا اور ایک فوری فتح سے ان کو نوازا) اس تابوت کے ساتھ بنی اسرائیل کو جو والہانہ عقیدت تھی اس کا ایک خاص پہلو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ بھی تھا کہ مصائب ومشکلات اور میدانِ جنگ میں ان کے حوصلے (MORALE) کو قائم رکھنے میں اس کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ سے اس کے اسی خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے۔

تابوت کی بنی اسرائیل میں واپسی

اوپر فلسطیوں کے ہاتھوں اس تابوت کے چھینے جانے کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس کے چھن جانے کو بنی اسرائیل کے بزرگوں نے اسرائیل سے ساری حشمت کے چھن جانے سے تعبیر کیا اور ساری قوم نے اس عظیم حادثے پر ماتم کیا۔ چنانچہ اس دور میں بنی اسرائیل کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس تابوت کو اپنے دشمنوں سے واپس لینے کا تھا۔ اسی بنا پر سموئیل نے طالوت کے انتخاب کے خدائی انتخاب ہونے کی یہ نشانی ٹھہرائی کہ اس کے بعد تابوت تمھارے پاس فرشتوں کی مدد سے آپ سے آپ آجائے گا۔ چنانچہ ان کی یہ پیشینگوئی پوری ہوئی اور فلسطیوں نے اس صندوق کو ایک گاڑی پر رکھ کر اس کو بنی اسرائیل کے علاقے کی طرف ہانک دیا۔ سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

> "اب تم ایک نئی گاڑی بناؤ اور دو دودھ والی گائیں، جن کے جوا نہ لگا ہو، لو۔ اور ان گایوں کو گاڑی میں جوتو اور ان کے بچوں کو گھر لوٹا لاؤ اور خداوند کا صندوق لے کر اس گاڑی پر رکھو اور سونے کی چیزوں کو جن کو تم جرم کی قربانی کے طور پر ساتھ کر دو گے، ایک صندوقچہ میں کر کے اس کے پہلو میں رکھ دو اور اسے روانہ کر دو کہ چلا جائے اور دیکھتے رہنا.......سو ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور دو دودھ والی گائیں لے کر ان کو گاڑی میں جوتا اور ان کے بچوں کو گھر میں بند کر دیا اور خداوند کے صندوق .... اور صندوقچہ کو گاڑی پر رکھ کر دیا۔ ان گایوں نے بیت شمس کا سیدھا راستہ لیا۔ وہ سڑک ہی سڑک ڈکارتی گئیں اور دہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلستی سردار بیت شمس کی سرحد تک ان کے ساتھ گئے اور بیت شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے انھوں نے جو آنکھیں اٹھائیں تو صندوق کو دیکھا اور دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔ سموئیل باب ۶۔ ۷-۱۲۔

تابوت کی گاڑی کا بغیر کسی گاڑیبان اور بغیر کسی محافظ کے اور وہ بھی دو ایسی گایوں کے ذریعے سے جن کے دودھ پیتے بچے گھروں پر روک لیے گئے تھے، اس طرح بغیر دہنے بائیں مڑے ٹھیک منزل پر پہنچ جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو کرو بیوں کی رہنمائی اور فرشتوں کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔ اسی چیز کو

"تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تابوت کی واپسی سے متعلق تورات اور قرآن کے بیانات کا اختلاف

تابوت کی واپسی سے متعلق تورات اور قرآن کے بیان میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کی زیر بحث آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی واپسی کا واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جب طالوت کا خدا کے مقرر کردہ بادشاہ کی حیثیت سے اعلان ہوا ہے اور یہ واقعہ گویا ایک نشان تھا اس بات کا کہ طالوت کا انتخاب من جانب اللہ ہے، سموئیل نے خدا کے حکم سے ان کو مسح کر کے برکت دی ہے اور ان کا تقرر بنی اسرائیل میں ایک نئے دور خیر و برکت اور ایک جدید تاریخ کامیابی و فتحمندی کا آغاز ہے۔

اس کے بالکل برعکس تورات کا بیان یہ ہے کہ اس سے بہت پہلے ہی تابوت کو ایک گاڑی پر رکھ کر، جیسا کہ اوپر کے حوالے میں تصریح ہے، فلسطیوں نے گاڑی بنی اسرائیل کے علاقہ کی طرف ہانک دی تھی۔ اور تابوت پوری حفاظت کے ساتھ ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس طرح واپس کرنے کی وجہ تورات میں یہ بیان ہوئی ہے کہ فلسطینی تابوت چھین لے جانے کو تو چھین لے گئے لیکن وہ ان کے لیے مصیبت بن گیا، انھوں نے اس کو جہاں جہاں رکھا وہاں مختلف قسم کی وبائیں پھوٹ پڑیں جس سے ان کے ہزاروں آدمی مر گئے بالآخر اس سے تنگ آ کر انھوں نے سات ماہ کے بعد اپنے نجومیوں کے مشورے سے اس سے نجات حاصل کرنے کی وہ تدبیر اختیار کی جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا۔

قرآن کے بیان کے صحیح ہونے کے وجوہ

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں بیانوں میں سے کون سا بیان روایت اور درایت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے؟ ہمارے نزدیک مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر قرآن کا بیان صحیح اور تورات کا بیان غلط ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ان واقعات کے بیان کے خاتمہ پر قرآن نے یہ کہا ہے کہ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۲۵۲ - بقرہ (یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو) اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ امر بیان قرآن کے پیش نظر ہے کہ یہ واقعہ جس شکل میں وہ پیش کر رہا ہے وہ تورات کے بیان سے مختلف ہے لیکن واقعہ کی صحیح شکل وہی ہے جس شکل میں اس کو قرآن پیش کر رہا ہے نہ کہ جس شکل میں اس کو تورات پیش کر رہی ہے۔ اور پھر اس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ایک دلیل قرار دیا ہے کہ قدیم آسمانی صحیفوں کی ان سرگزشتوں کے جاننے کا تمھارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ان کو اس صحت کے ساتھ پیش کرنا کہ یہ سرگزشتیں محض بے مقصد داستان سرائی کے بجائے اپنے منطقی ربط و تسلسل اور اپنے حکیمانہ ثمرات و نتائج کے ساتھ لوگوں کے سامنے آئیں بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تم کو اپنا رسول بنایا اور ان باتوں سے تمھیں اپنی وحی کے ذریعہ سے آگاہ فرمایا۔

ایک ہٹ دھرم یہ کہہ سکتا ہے کہ ان واقعات کے پیش کرنے میں قرآن کا بیان تورات کے بیان سے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تورات کا براہ راست کوئی علم نہیں تھا، وہ نعوذ باللہ سنی سنائی باتیں پیش کرتے تھے اس وجہ سے ان کا بیان تورات سے مختلف ہوتا تھا۔ لیکن یہ کہنا کسی طرح بھی

صحیح نہیں ہے۔ اول تو جو سنی سنائی بات کہتا ہے اس کی بات عام اور مشہور روایت کے مطابق ہوتی ہے، نہ کہ اس سے بالکل مختلف، دوسرے یہ کہ جو شخص سنی سنائی بات نقل کرتا ہے وہ کبھی پورے جزم ویقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فلاں بات جو تم کہہ رہے ہو یوں نہیں بلکہ یوں ہے۔ یہ انداز تو وہی اختیار کرتا ہے اور وہی اختیار کر سکتا ہے جو پورے علم وبصیرت کے ساتھ ایک بات کو جانتا ہو اور چیلنج دے کر اس پر تنقید یا اس کی تصحیح کرنا چاہتا ہو۔ یہاں صاف نظر آتا ہے کہ صورت معاملہ یہی ہے۔ قرآن نے ساؤل کے نام کی بھی تصحیح کی، تابوت کی واپسی کے واقعہ کو بھی اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا اور آپ دیکھیں گے کہ نہر والے امتحان کے صحیح موقع ومحل کو بھی معین کیا اور پھر کہا کہ حق یہ ہے جو قرآن میں بیان ہو رہا ہے نہ کہ وہ جو تورات میں بیان ہوا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عقل اور منطق کی رو سے بھی وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ تورات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تابوت کی واپسی تمام تر نتیجہ تھی ان کرامات کا جو خود تابوت سے ظاہر ہوئیں۔ فلسطینی اس کے لے جانے کے بعد سے برابر آفات ومصائب کے ہدف بن گئے۔ انھوں نے ان آفات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بہتری اسی میں دیکھی کہ یہ جن کی چیز ہے ان کے حوالہ کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جان چھڑانے کی وہ شکل اختیار کی جو اوپر بیان ہوئی۔ بنی اسرائیل جیسی ضعیف الاعتقاد اور کرامات پرست قوم کے ذہن سے یہ بات چونکہ بہت قریب تھی اس وجہ سے انھوں نے اس کو گھڑ بھی لیا اور پھر اس عوام پسند روایت کو تورات میں داخل بھی کر دیا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اتنے بڑے بڑے واقعات کسی قوم کی زندگی میں محض بچوں کے کھیل کی طرح ہو جایا کرتے ہیں؟ تابوت کی حیثیت بنی اسرائیل کے قبلہ کی تھی، نہ اس کا چھن جانا کوئی اتفاقی حادثہ ہو سکتا نہ اس کا واپس ہونا کوئی معمولی واقعہ ہو سکتا۔ اس طرح کا حادثہ پیش آیا تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل اس وقت ایسی عملی واعتقادی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے ہوں جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اس سزا کے مستحق قرار پائے ہوں۔ اور اگر وہ اس کے واپس لینے میں کامیاب ہوئے تو اس کی راہ بھی اس طرح کھلی ہوگی کہ انھوں نے اپنے حالات ومعاملات کی ایسی اصلاح کی ہو کہ خدا کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہوئی ہو اور ان کے دشمن ان سے مرعوب ہوئے ہوں۔

تورات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قبلہ کے چھن جانے کا واقعہ پیش آیا ہے اس زمانے میں بنی اسرائیل اعتقادی وعملی اعتبار سے بھی بالکل تباہ حال تھے اور سیاسی اعتبار سے بھی سخت پراگندگی اور انتشار میں مبتلا تھے۔ ہم اوپر اس کے ثبوت میں بعض حوالے نقل کر آئے ہیں۔ سموئیل نے ان حالات کی اصلاح کی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا انتشار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بڑھاپے میں ان کے لیے تنہا اس پر قابو پانا سخت مشکل تھا۔ لیکن طالوت کے تقرر کے بعد سے حالات میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ سموئیل اور طالوت دونوں نے مل کر بنی اسرائیل کے اندر

ایک تازہ امنگ پیدا کر دی۔ طالوت کے تقرر کے موقع پر سموئیل نے جو تقریر بنی اسرائیل کی پوری قوم کے سامنے کی ہم اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ طالوت کے تقرر سے پہلے کے حالات کیا تھے اور بعد میں کن حالات کے پیدا ہونے کی امید بندھی۔

"پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا وہ خداوند ہی ہے جس نے موسیٰ و ہارون کو مقرر کیا اور تمھارے باپ دادا کو ملک مصر سے نکال لایا سو اب ٹھہرے رہو تاکہ میں خداوند کے حضور ان سب نیکیوں کے بارے میں جو خداوند نے تم سے اور تمھارے باپ دادا سے کیں گفتگو کروں۔ جب یعقوب مصر میں گیا اور تمھارے باپ دادا نے خداوند سے فریاد کی تو خداوند نے موسیٰ اور ہارون کو بھیجا جنھوں نے تمھارے باپ دادا کو نکال کر اس جگہ بسایا پر وہ خداوند خدا کو بھول گئے سو اس نے حصور کی فوج کے سپہ سالار سیسرا کے ہاتھ اور فلستیوں کے ہاتھ اور شاہ موآب کے ہاتھ بیچ ڈالا اور وہ ان سے لڑے۔ پھر انھوں نے خداوند سے فریاد کی اور کہا کہ ہم نے گناہ کیا اس لیے کہ ہم نے خداوند کو چھوڑا اور بعلیم اور عستارات کی پرستش کی پر اب تو ہم کو ہمارے دشمنوں کے ہاتھ سے چھڑا تو ہم تیری پرستش کریں گے سو خداوند نے یرتعل اور بدان اور افتاح اور سموئیل کو بھیجا اور تم کو تمھارے دشمنوں کے ہاتھ سے جو تمھارے چاروں طرف تھے رہائی دی اور تم چین سے رہنے لگے اور جب تم نے دیکھا کہ بنی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے حالانکہ خداوند تمھارا بادشاہ ہے۔ سو اب اس بادشاہ کو دیکھو جسے تم نے چن لیا اور جس کے لیے تم نے درخواست کی تھی، دیکھو خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم اور وہ بادشاہ بھی جو تم پر سلطنت کرتا ہے خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو تو خیر، پر اگر تم خداوند کی بات نہ مانو بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو تو خداوند کا ہاتھ تمھارے خلاف ہو گا جیسے وہ تمھارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا۔ سو اب ٹھہرے رہو اس بڑے کام کو دیکھو جسے خداوند تمھاری آنکھوں کے سامنے کرے گا۔"

سموئیل باب ۱۲، ۶-۱۶

ایک طرف سموئیل نبی کی یہ اصلاحی سرگرمیاں تھیں، دوسری طرف طالوت نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ قوم کی تنظیم اور ان کے اندر روح جہاد پیدا کرنے کا کام پورے جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے عمونیوں کے مقابلے کے لیے بنی اسرائیل کے مردوں کی مردم شماری کرائی تو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل تین لاکھ اور یہوداہ کے مرد تیس ہزار ہیں۔ پھر عمونیوں پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ بالکل تتر بتر ہو گئے اور دوستوں، دشمنوں دونوں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ حالات بلاشبہ ان کے مخالفوں کے لیے مرعوب کن ثابت ہوئے ہوں گے اور اس مرعوبیت کی وجہ سے فلسطیوں نے یہ مناسب سمجھا ہو گا کہ تابوت کو واپس کر کے ایک خوفناک جنگ کے خطرے سے اپنے کو بچالے جائیں۔ بلاشبہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ایسا واقعہ تھا جو طالوت کی اقبال مندی اور ان کے مؤید من اللہ بادشاہ ہونے کا نشان ہو سکتا تھا۔ چنانچہ

قرآن نے یہی کہا ہے اور یہ بات ہر اعتبار سے قرین عقل و قیاس معلوم ہوتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ تورات کے اس بیان کی خود تورات ہی کے بیانات سے تردید ہوتی ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے کہ فلسطیوں نے سات مہینے کے بعد ہی تابوت کو اس کی کرامات اور اس کے خوارق سے ڈر کر واپس کر دیا تھا تو تورات کے اس بیان کا کیا مطلب ہے۔

"اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے ایک مدت ہو گئی یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا۔ سموئیل باب ۱

سوال یہ ہے کہ قریت یعریم اگر بنی اسرائیل ہی کے علاقہ میں شامل تھا اور تابوت انہی کی حفاظت میں تھا تو بیس برس تک اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کیوں کرتا رہا؟ اور اس "خداوند کے پیچھے" کے الفاظ کا کیا مطلب ہے؟

اصل یہ ہے کہ سموئیل میں یہود نے متضاد روایات کا اتنا انبار لگا دیا ہے کہ اس کے اندر حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہے۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اس نے بعض واقعات کے صحیح پہلو نمایاں کیے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (۲۴۹)

جنگِ بدر کی تصویر قدیم صحیفوں میں

"فَصَلَ فُصُولًا" کے معنی کہیں سے چلنے، نکلنے اور روانہ ہونے کے ہیں۔ یعنی طالوت اپنی فوجیں لے کر مہم پر روانہ ہوئے۔ تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم فلسطیوں کے مقابلہ کے لیے تھی جن کا سردار جاتی جولیت تھا جس کا ذکر قرآن نے جالوت کے نام سے کیا ہے۔ اس جنگ میں طالوت اور جالوت کی فوجوں کے ایک دوسرے کے بالمقابل فوج آرائی کی جو شکل بیان ہوئی ہے وہ بالکل اس شکل سے ملتی ہے جو ہمارے ہاں بدر کے موقع پر کفار اور مسلمانوں کے مابین پیش آئی۔ سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

پھر فلستیوں نے جنگ کے لیے اپنی فوجیں جمع کیں اور یہوداہ کے شہر شوکہ میں فراہم ہوئے اور شوکہ اور عزیقہ کے درمیان افسدمیم میں خیمہ زن ہوئے اور ساؤل اور اسرائیل کے لوگوں نے جمع ہو کر ایلہ کی وادی میں ڈیرے ڈالے اور لڑائی کے لیے فلستیوں کے مقابل صف آرائی کی اور ایک طرف کے پہاڑ پر فلستی اور دوسری طرف کے پہاڑ پر بنی اسرائیل کھڑے ہوئے اور ان دونوں کے درمیان وادی تھی۔ سموئیل باب ۱۷: ۱-۳

اس نقشہ پر غور کیجیے اور پھر ایک نظر اس نقشہ پر ڈال لیجیے جو سورۂ انفال میں بدر کے موقع پر کفار اور مسلمانوں کے آمنے سامنے ہونے کا بیان ہوا ہے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ بالکل جنگ بدر کی تصویر ہے۔ تحویل قبلہ کے بعد پہلی جنگ جو کم و بیش دو مہینوں کے بعد پیش آئی ہے وہ یہی بدر کی جنگ ہے۔ اس طرح گویا

جنگ بدر کے پیش آنے سے پہلے اس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کی جنگ میں مسلمانوں کو دکھا دیا تھا۔ ہم سورۂ انفال میں یہ واضح کریں گے کہ یہود بدر کا نقشہ دیکھ کر اس حقیقت کو تاڑ گئے تھے لیکن انھوں نے مشرکین کو برانگیختہ کرنے کے معاملہ میں بالکل شیطان کی روش اختیار کی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اس جنگ میں طالوت کے ساتھیوں کی تعداد بھی کم و بیش اتنی ہی تھی جتنی بدر میں حضورؐ کے ساتھیوں کی تھی۔

فوج کی اطاعت کا امتحان

'اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ' دشمن کے آمنے سامنے ہونے سے پہلے طالوت نے اپنی فوج کے ڈسپلن اور ان کی اطاعت و وفاداری کا امتحان لینے کے لیے یہ اعلان کیا کہ سامنے جو فلاں ندی ہماری راہ میں آ رہی ہے اس کے ذریعہ سے اللہ تمھاری جانچ کرے گا، تم میں سے جو اس کا پانی پی لے گا وہ میرا ساتھی نہ بن سکے گا جو اس کو بالکل نہ پیے گا وہ میرا ساتھی ہوگا۔ اگر کسی نے ہاتھ سے ایک آدھ چلو پی لیا تو وہ قابلِ درگزر ہے۔ اس امتحان میں فوج کی اکثریت فیل ہو گئی۔ لوگوں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ اس امتحان میں پورے اترسکے۔

بنی اسرائیل نے امیر لشکر کا انتخاب تو بڑے ہمہمے سے کرایا لیکن یہ لوگ نظم اور ڈسپلن کے معاملے میں، بالخصوص جہاں جان و مال کی قربانی کا سوال ہو، بڑے کچے تھے۔ اس کا اظہار، جیسا کہ اوپر گزرا، سموئیل نبی نے پہلے ہی دن کر دیا تھا۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ انھی کی ہدایت سے طالوت نے اس امتحان کا اعلان کیا تاکہ ان کے کھرے کھوٹے میں پہلے ہی سے امتیاز ہو جائے اور عین میدانِ جنگ میں ان کے ہاتھوں دھوکا نہ کھانا پڑے، جو کچے ہیں وہ پہلے ہی سے چھٹ کے الگ ہو جائیں۔ یہ امتحان چونکہ سموئیل نبی کی ہدایت کے تحت ہوا اس وجہ سے طالوت نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔ جس ندی کے ذریعہ سے یہ امتحان ہوا اس کا نام بیان مذکور نہیں اس لیے کہ مقصود امتحان کا ذکر ہے نہ کہ کسی ندی کا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دریائے اردن ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس وادی کے درمیان کا کوئی چشمہ یا نالا ہو جو دونوں فوجوں کے درمیان حائل تھی۔

اس امتحان میں سو فی صدی کامیابی کے لیے تو شرط یہ تھی کہ اس کا پانی سرے سے کوئی چکھے ہی نہیں جیسا کہ ارشاد ہے 'وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ' لیکن ایک آدھ چلو پی لینے کو قابلِ درگزر قرار دیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ بھی 'بِيَدِهٖ' کی قید لگی ہوئی تھی کہ مبادا یہ اجازت کٹورے، گلاس اور ڈونگے تک نوبت پہنچا دے۔

'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ' سے وہ صداقت شعار اور کامل الایمان لوگ مراد ہیں جو اس امتحان میں پورے اترے۔ یہاں 'اٰمَنُوْا' کا فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ لوگ جو اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ اس امتحان میں پھسڈی ثابت ہوئے وہ اپنے دعوائے ایمان میں بھی منافق تھے۔

'قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ' ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو خوب پانی پی پی کے وہیں ڈھے گئے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ندی کو پار کرنے کی بھی زحمت نہیں

اٹھائی بلکہ اسی پار سے کھڑے کھڑے انھوں نے آگے بڑھنے والے ساتھیوں کو سنا دیا کہ اب ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی ہمت نہیں۔ یہاں جالوت کے نام لینے سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ اس کی ہیبت ان لوگوں کے دلوں پر بہت تھی:

فتح کا انحصار کثرت یا قلت پر نہیں بلکہ عزم وایمان پر ہے

"قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ" الایہ۔ لفظ ظن کی تحقیق ہم آیت ۴۶ کے تحت بیان کر آئے ہیں۔ یہ اوپر والے بزدلوں کے جواب میں طالوت اور ان کے باایمان ساتھیوں کا قول ہے۔ ان کی خاص صفت جس کا یہاں ذکر فرمایا وہ یہ ہے کہ وہ اللہ سے ملنے کا گمان رکھتے تھے۔ اس خاص صفت کے ذکر کی وجہ، جیسا کہ آیت ۱۵۴ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں، یہ ہے کہ وہ حقیقی شجاعت جو خدا کی راہ میں موت کو زندگی سے بھی زیادہ عزیز و محبوب بنا دیتی ہے وہ مومن کے اس عقیدے سے پیدا ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والے مرتے نہیں ہیں بلکہ حقیقی زندگی اور اپنے رب کی ملاقات سے مشرف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے ہمت چھوڑ بیٹھنے والے ساتھیوں کو ابھارا کہ فلسطینیوں کی کثرت تعداد سے مرعوب ہو کر ہمت نہ ہارو۔ اصل شے تعداد نہیں بلکہ اللہ کی تائید اور اس کی نصرت ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ نہایت قلیل التعداد گروہ محض اللہ کے حکم اور اس کی تائید سے دل بادل فوجوں پر غالب آگیا ہے۔ خدا کی تائید حاصل کرنے کے لیے جو چیز مطلوب ہے وہ صبر و استقامت اور عزم و ہمت ہے نہ کہ تعداد کی کثرت و قلت۔

شاید طالوت کے بیٹے یونتن نے اسی موقع پر وہ فقرہ کہا ہو جو سموئیل میں نقل ہے۔

"سو یونتن نے اس جوان سے جو اس کا سلاح بردار تھا کہا آ ہم اور ان نامختونوں کی چوکی کو چلیں، ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے کیونکہ خداوند کے لیے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعے سے بچانے کی قید نہیں۔" سموئیل باب ۱۴۔

فوج کے امتحان کے متعلق تورات اور قرآن کے بیانات کا اختلاف

تورات میں اس امتحان کا ذکر نہیں ہے لیکن اسی سے ملتے جلتے ایک امتحان کا ذکر ہے۔

"اور اسرائیلی مرد اس دن بڑے پریشان تھے کیونکہ ساؤل نے لوگوں کو قسم دے کر یوں کہا تھا کہ جب تک شام نہ ہو اور میں اپنے دشمنوں سے بدلہ نہ لے لوں اس وقت تک اگر کوئی کچھ کھائے تو وہ ملعون ہو۔ اس سبب سے ان لوگوں میں سے کسی نے کھانا چکھا تک نہیں اور سب لوگ جنگل میں جا پہنچے اور وہاں زمین پر شہد تھا اور جب یہ لوگ جنگل میں پہنچ گئے تو دیکھا کہ شہد ٹپک رہا ہے پر کوئی اپنا ہاتھ اپنے منہ تک نہیں لے گیا اس لیے کہ ان کو قسم کا خوف تھا لیکن یونتن نے اپنے باپ کو ان لوگوں کو قسم دیتے نہیں سنا تھا سو اس نے اپنے ہاتھ کے عصا کے سرے کو شہد کے چھتے میں بھونکا اور اپنا ہاتھ اپنے منہ سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں میں روشنی آئی۔ تب ان لوگوں میں سے ایک نے اس سے کہا کہ تیرے باپ نے لوگوں کو قسم دے کر سخت تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ جو شخص آج کے دن کھانا کھائے وہ ملعون ہو۔ اور لوگ بے دم سے ہو رہے تھے۔ تب یونتن نے کہا کہ میرے باپ نے ملک کو دکھ دیا ہے، دیکھو، میری آنکھوں میں ذرا سا شہد چکھنے سے کیسی روشنی آئی! کتنا زیادہ اچھا ہوتا اگر سب لوگ دشمن کی لوٹ میں سے جو ان کو ملی دل کھول کر کھاتے ...... سو وہ لوگ لوٹ پر

گئے اور بھیڑوں، بکریوں، بیلوں اور بچھڑوں کو لے کر ان کو زمین پر ذبح کیا اور خون سمیت کھانے لگے۔

سموئیل باب ۱۴ ۔ ۲۴۔ ۳۲

اس واقعے سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ طالوت نے فلسطینیوں سے جنگ کے موقع پر اپنی فوج کا امتحان لیا تھا اور اس امتحان میں ان کی پوری فوج ناکام رہی تھی یہاں تک کہ طالوت کے بیٹے یونتن بھی، جن کا کردار تورات کے دوسرے بیانات سے نہایت بلند ثابت ہوتا ہے، اس امتحان میں نہ صرف یہ کہ ناکام رہے بلکہ مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انھی کی غلط رہنمائی سے ان کے باپ کی پوری فوج گمراہ ہوئی۔

قرآن کا بیان مندرجہ ذیل پہلوؤں سے تورات کے بیان سے مختلف ہے۔

ایک یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے یہ امتحان اس وقت لیا ہے جب دشمن سے عملاً مڈبھیڑ ہو چکی ہے اور مقصود اس امتحان سے صرف یہ تھا کہ جب تک دشمن کا اچھی طرح قلع قمع نہ ہو جائے لوگ کھانے پینے میں مصروف نہ ہوں۔ برعکس اس کے قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے یہ امتحان دشمن سے مڈبھیڑ ہونے سے پہلے لیا ہے اور مقصود اس سے اپنی فوج کا جائزہ لینا تھا کہ اس میں کتنے ایسے ہیں جو دشمن کے مقابل میں ثابت قدم رہ سکیں گے اور کتنے محض دکھاوے کے مجنون ہیں جن کا دعوائے عشق آزمائش کی پہلی ہی چوٹ سے ہرن ہو جائے گا۔

دوسرا یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے کھانے کی مناہی کی تھی۔ اس کے برعکس قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مناہی فوج کے مارچ کے دوران میں ایک خاص ندی یا نالے کے پانی کے لیے تھی۔

تیسرا یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت کی پوری فوج اس امتحان میں ناکام رہی یہاں تک کہ خود ان کے فرزند بھی ناکام رہے بلکہ انھی نے پوری فوج کے لیے اس ناکامی کی راہ کھولی۔ اس کے خلاف قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اندر سے ایک جماعت اپنے عزم و ایمان پر قائم رہی اور اسی کے عزم و ایمان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فلسطینیوں پر فتح دی۔

قرآن کا بیان صحیح اور بامقصد ہے

اب یا تو یہ مانا جائے کہ تورات میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ الگ ہے اور قرآن میں جو بیان ہوا ہے وہ الگ۔ یا یہ مانا جائے کہ واقعہ تو ایک ہی ہے، تورات میں اس کو بے احتیاط راویوں نے بالکل مسخ اور بے مقصد بنا کے رکھ دیا ہے قرآن نے اس کو بالحق یعنی بالکل ٹھیک ٹھیک اور اس کے فوائد و مصالح کے ساتھ سنا دیا۔ ان دونوں میں سے جو بات بھی صحیح ہو یہ بہرحال ہر صاحب ذوق تسلیم کرے گا کہ قرآن کا بیان ہر پہلو سے بامقصد، نتیجہ خیز اور پُر حکمت ہے۔ برعکس اس کے تورات کا بیان ایک بالکل بے مقصد داستان ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (۲۵۰-۲۵۱)

جالوت

جالوت، فلسطینیوں کا سپہ سالار تھا۔ تورات میں اس کا نام جاتی جولیت آیا ہے۔ یہ بڑا گرانڈیل، دیوہیکل اور ماہر جنگ سپہ سالار مانا جاتا تھا، دشمنوں پر اس کا بڑا رعب تھا، خاص طور پر بنی اسرائیل اس سے بہت مرعوب تھے۔

حضرت داؤدؑ کی زندگی کا آغاز

داؤد، یہ وہی حضرت داؤدؑ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور جن کی صلب سے حضرت سلیمان علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کی ابتداء غریبانہ لیکن انتہا نہایت شاندار ہوئی۔ انھوں نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے کہ خداوند نے مجھے بھیڑ سالے سے نکالا اور اسرائیل کے تخت پر لا بٹھایا۔ یہ طالوت کی اس فوج میں شامل تھے جس کا ذکر چلا آرہا ہے۔ اس شمولیت کے متعلق تورات میں دو مختلف روایتیں ہیں۔ ایک سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس جنگ کے پیش آنے سے پہلے ہی طالوت کے سلاح بردار کی حیثیت سے ان کے لشکر میں داخل ہو چکے تھے اور در پردہ یہ سموئیل کے ممسوح اور مستقبل کے بادشاہ بھی تھے۔ دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل وقت کے وقت اپنی بکریاں چراگاہ میں چھوڑ کر اپنے بڑے بھائیوں کو، جو جنگ میں شریک تھے، اپنے باپ کے حکم سے کچھ کھانے کی چیزیں دینے آئے۔ یہاں انھوں نے دیکھا کہ جالوت مقابلہ کے لیے چیلنج دے رہا ہے لیکن کوئی اس کے مقابلے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ان کی غیرت کو جوش آیا۔ انھوں نے طالوت سے اس کے مقابلہ کی اجازت مانگی۔ یہ اس وقت ایک نوخیز، سرخ رُو اور خوش قامت نوجوان تھے۔ طالوت کو ان کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اجازت دینے میں تردد ہوا۔ لیکن جب انھوں نے کہا کہ میں اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے شیروں اور ریچھوں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں، بھلا اس نامختون فلسطینی کی کیا حیثیت ہے کہ یہ زندہ خداوند کی فوجوں کو رسوا کرے تو طالوت نے ان کے عزم و ہمت کو دیکھ کر ان کو اجازت دے دی اور خود اپنا جنگی لباس پہنا کر اپنے مخصوص اسلحہ سے ان کو لیس کیا۔ اس وقت تک ان کا زمانہ بھیڑوں بکریوں کی چرواہی میں گزرا تھا، اس جنگی لباس اور ان جنگی اسلحہ کا ان کو کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ ان کو پہن کر کچھ بندھا بندھا سا محسوس کرنے لگا۔ آخر طالوت کی اجازت سے اس قید سے رہائی حاصل کی اور چرواہوں کی طرح اپنی فلاخن اٹھائی، چادر کے ایک کونے میں کچھ پتھر رکھے اور وقت کے سب سے بڑے دیو کے مقابل میں جا کے ڈٹ گئے۔ پہلے تو اس نے ان کا مذاق اڑایا۔ لیکن جب ان کی طرف سے اس کو ترکی بہ ترکی جواب ملا تو اس نے کہا کہ "اچھا آ، آج تیرا گوشت چیلوں اور کوؤں کو کھلاتا ہوں"۔ اتنے میں حضرت داؤدؑ نے فلاخن میں پتھر رکھ کر جو اس کو مارا تو پتھر اس کے سر سے چپک کر رہ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے بڑے سپہ سالار کا ایک الھڑ چرواہے کی فلاخن سے اس طرح مارا جانا ظاہر ہے کہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ چنانچہ فلسطینی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور ادھر بنی اسرائیل کی عورتوں کی زبان پر یہ گیت جاری ہو گیا ؎

"ساؤل نے تو ہزاروں کو مارا پر داؤدؑ نے لاکھوں کو مارا۔"

بس اسی واقعہ سے حضرت داؤدؑ کی زندگی کا آغاز ہوا اور پھر وہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس مقام پر

پہنچے جوان کے لیے مقدر تھا۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ، میں اس حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے کہ فتح ہو یا شکست، جو کچھ بھی پیش آتا ہے اس کا اصل تعلق قلت و کثرت اور وسائل و تدابیر سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اس وجہ سے اصل اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہیئے نہ کہ اسباب و وسائل پر۔ اس سے مقصود اسباب و وسائل کے اختیار کرنے کی نفی نہیں بلکہ تنہا انہی کو وسیلۂ ظفر سمجھ لینے کی نفی ہے۔ حضرت داؤد جنھوں نے ایک دیو ہیکل سورما کو ایک پتھر سے ڈھیر کر دیا، اگرچہ اس زمانے تک نبی نہیں تھے، لیکن اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے جالوت کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا کہ

"اور یہ ساری جماعت جان لے کہ خداوند تلوار اور بھالے کے ذریعے سے نہیں بچاتا اس لیے کہ جنگ تو خداوند کی ہے اور وہی تم کو ہمارے ہاتھ میں کر دے گا" سموئیل باب ۱۷ ۴۸

یہی بات قرآن مجید کی آیت وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى سے ثابت ہوتی ہے۔

"وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ" یہ ان انعامات کا بیان ہے جو اس واقعے کے بعد حضرت داؤد پر ہوئے۔ اس کے بعد وہ طالوت کے داماد بھی ہو گئے اور پھر بنی اسرائیل کے بادشاہ بھی۔ علاوہ ازیں ان کو حکمت کا وہ خزانہ بھی عطا ہوا جس کا مظہر زبور ہے۔ درحقیقت یہی حکمت ہے جس کا جوڑ جب بادشاہی کے ساتھ ملتا ہے تو وہ بادشاہی زمین میں خدا کی خلافت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ یہ نہ ہو تو بادشاہی چنگیزی ہے۔ بادشاہی اور درویشی کا یہی امتزاج ہے جو اللہ کی نظروں میں پسندیدہ ہے۔ اور حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سب درویش بادشاہ تھے اس لیے کہ ان کی بادشاہی کا تخت و تاج سونے چاندی سے نہیں بلکہ حکمت کے لعل و گہر سے آراستہ ہوا تھا۔

یہاں ایک چھوٹا سا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ فرمایا عَلَّمَهٗ مَا شَآءَ نہیں فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسلوب اس لیے اختیار فرمایا کہ یہ بات حضرت داؤدؑ کے ساتھ خاص ہو کے نہ رہ جائے۔ بلکہ یہ ایک سنت اللہ کے بیان کا اسلوب اختیار کر لے کہ اللہ نے اس کو وہ کچھ سکھایا اور بتایا جو وہ اپنے ایسے بندوں کے لیے چاہتا ہے کہ وہ ان کو بتائے اور سکھائے۔

جہاد کی ضرورت اور اس کی حکمت

"وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ الآیۃ" یہ جہاد کی ضرورت اور اس کا فلسفہ بیان ہوا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ جہاد کا حکم نہ دیتا اور اس کے صالح بندے زمین کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لیے تلوار نہ اٹھاتے تو اشرار و مفسدین دنیا کو شر و فساد سے بھر دیتے اور اللہ کی زمین نیکی اور تقویٰ کے تمام آثار سے خالی ہو جاتی۔ قرآن میں جہاد کی اس ضرورت و حکمت کی طرف مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ اشارے کیے گئے ہیں، مثلاً سورۂ حج میں فرمایا۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۴۰۔ حج

(اور اگر اللہ ایک کو دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو صومعے اور گرجے اور عبادت خانے اور مسجدیں، جن میں کثرت

سے خدا کا ذکر ہوتا ہے، سب ڈھائے جا چکے ہوتے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ مذہب کے راہبانہ اور جوگیانہ تصور کے اثر سے عام طور پر جنگ اور جہاد کو تقویٰ اور دین داری کے منافی تصور کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جنگِ بدر سے پہلے تک تو قریش مسلمانوں کی کمزوری کو ان کے خلاف ایک دلیل ٹھہراتے رہے اور جنگِ بدر کے بعد ان کے جوشِ جہاد کو ان کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ اس کی تفصیلات اپنے مقام میں آئیں گی۔ یہاں قرآن نے پہلے سے اس طرح کے تمام اعتراضات کا جواب دے دیا کہ انبیاء اور صالحین جو جہاد کرتے ہیں اس سے مقصود حق اور عدل کا قیام اور شر و فساد کا استیصال ہوتا ہے ورنہ خدا کی زمین نیکی اور بھلائی کے لیے بالکل بنجر ہو کے رہ جائے۔ اس وجہ سے صالحین کا جہاد اہلِ زمین کے لیے خدا کی ایک بہت بڑی عنایت ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۵۲)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات اور آپ کی رسالت کا اثبات

یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت، یہ دونوں آیتیں سلسلۂ کلام کے بیچ میں بطور التفات وارد ہیں یعنی اصل سلسلۂ کلام کو روک کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا اور ارشاد ہوا کہ بنی اسرائیل نے اپنی تاریخ کی ایک نہایت اہم سرگزشت بالکل بے مقصد اور بے معنی بنا کر رکھ دی تھی۔ اب ہم نے اس کو بالکل ٹھیک اس کے نتائج و فوائد اور اس کے حِکَم و مصالح کے ساتھ تمہیں سنایا ہے تاکہ اس آئینے میں تم اور تمہارے ساتھی اپنے مستقبل کے نقشۂ کار کو دیکھ سکو اور یہ اس بات کی نہایت روشن دلیل ہے کہ تم انبیاء و رسل کے مبارک سلسلے کی کڑی ہو ورنہ جس چیز کے تمہارے پاس جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس کو تم کس طرح جان سکتے اور وہ بھی ایسی صحت و صداقت کے ساتھ کہ اصل واقعہ تمام غیر منطقی اور غیر فطری ملاوٹوں سے بالکل پاک ہو کر لوگوں کے سامنے آگیا۔ اگر اہلِ کتاب معاملے کے صرف اسی ایک پہلو پر غور کرتے تو تمہاری رسالت کے ثبوت کے لیے یہی دلیل کافی تھی لیکن ان کا اندھا بہرا تعصب اس امر میں مانع ہے کہ وہ اپنے نبی کے سوا کسی اور رسول کی رسالت اور اس کے لیے کوئی فضیلت تسلیم کر سکیں حالانکہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں میں سے کسی کے لیے بھی مطلق برتری کا دعوےٰ صحیح نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے تمام رسولوں کو کسی نہ کسی فضیلت سے مختص کیا ہے اور سب کے لیے مراتب و درجات ہیں لیکن اہلِ کتاب گروہی تعصبات میں مبتلا ہو کر اپنے سوا سب کی تکذیب اور سب کی مخالفت کے لیے کمربستہ ہیں۔ سو اس حالت پر صبر کرو اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں شر کو بھی مہلت دے رکھی ہے۔ بلاشبہ اگر وہ چاہتا تو یہ کچھ وہ نہ کر پاتے لیکن اس نے یہی چاہا ہے اور جو کچھ اس نے چاہا ہے اسی میں حکمت اور مصلحت ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۲۵۳)

تِلْكَ کا اشارہ ان رسولوں کی طرف ہے جن کا حوالہ اوپر وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔

رسولوں کے بارے میں صحیح روش

اس آیت میں اس صحیح رویے کی وضاحت ہے جو اللہ کے رسولوں کے بارے میں ان کی امتوں کو اختیار کرنا تھا، لیکن انھوں نے اس کو اختیار نہیں کیا بلکہ اس کی جگہ ایک بالکل غلط رویہ اختیار کر لیا جس کے سبب سے ان کے درمیان تعصبات کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کی دشمن اور مخالف ہو کر باہم جنگ و جدل میں مبتلا ہو گئیں۔ مقصود اس بیان سے یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ واضح کرنا ہے کہ آج تمھاری مخالفت میں بھی یہ اہل کتاب جو ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اس کی بڑی وجہ ان کی یہی غلط روش ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں میں سے ہر رسول کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اور اس فضیلت کے اعتبار سے وہ دوسروں پر ممتاز ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا ہے یہ ان کی فضیلت کا ایک خاص پہلو ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کھلے کھلے معجزات دیے اور روح القدس کی خاص تائید سے ان کو نوازا، یہ ان کے مخصوصات میں سے ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے رسولوں کو درجات و مراتب عطا ہوئے ہیں جو ان کے لیے خاص ہیں۔ انبیاء و رسل کے فضائل کے باب میں یہی نقطۂ نظر حقیقت کے مطابق ہے۔ لیکن ان انبیا کی امتوں نے جو روش اختیار کی وہ یہ ہے کہ ان میں سے جس نے جس نبی و رسول کو مانا سارے فضائل و خصوصیات کا جامع تنہا اسی کو بنا کر رکھ دیا اور دوسرے کسی نبی و رسول کے لیے کسی فضیلت کا تسلیم کرنا ان کے نزدیک ایمان کے منافی قرار پا گیا۔ اس تعصب و تنگ نظری کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلی امتوں میں سے ہر امت اپنے اپنے خول میں بند ہو کر رہ گئی اور اس کے لیے دوسرے نبیوں اور رسولوں کی برکات سے فائدہ اٹھانے کی راہ مسدود ہو گئی۔ اگر وہ صحیح روش اختیار کرتیں تو ہر رسول ان کا رسول اور ہر ہدایت ان کی ہدایت ہوتی اور وہ اس ہدایت میں سے بھی حصہ پاتیں جو اب قرآن مجید کی صورت میں آخری ہدایت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ظاہر ہوئی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ بنی اسرائیل میں بھی اشارہ فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۵۵ (اور ہم نے انبیا میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عنایت کی)

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی

آیت کے دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ نے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اس نے پسند فرمائی ہے اور جس کا قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں جبر کا طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس میں شبہ نہیں کہ کسی کے لیے بھی ایمان کو چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ بندوں کو آزادی دی کہ وہ اپنی سوچ سمجھ اور اپنے اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ چاہیں کفر

کی راہ اختیار کریں، چاہیں ایمان کی راہ اختیار کریں۔ اگر وہ ایمان کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا صلہ پائیں گے اور اگر کفر کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا انجام دیکھیں گے۔ آخر میں فرمایا کہ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ (اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے) سو اس نے یہی چاہا کہ وہ اس معاملے میں بندوں پر جبر نہ کرے اور جب اس نے یہی چاہا تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ اسی کے اندر حکمت و مصلحت ہے، کیونکہ خدا کا کوئی ارادہ حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتا۔

یہاں اس قانون کے بیان کرنے سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے معاملے میں آپ کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ آپ لوگوں تک حق واضح الفاظ میں پہنچا دیں۔ اس کو قبول کرنا یا رد کرنا یہ ان کے اوپر چھوڑ دیجیے۔ یہ نہ تو آپ کی ذمہ داری ہے اور نہ آپ اس کے لیے پریشان ہوں۔

آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق وَاٰیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے جو الفاظ آئے ہیں ان کی حقیقت اسی سورہ کی آیت ۸۷ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ سے جس کلام کا ذکر ہے اس سے مراد وہ براہِ راست مخاطبۂ الٰہی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مشرف فرمایا۔ اس مخاطبت کا ذکر تورات میں بھی بار بار ہوا ہے اور قرآن نے بھی اس کی طرف جا بجا اشارے کیے ہیں۔

۸۰۔ آگے کا مضمون —— آیات ۲۵۴-۲۵۶

اوپر سے مضمون جہاد اور انفاق کا چلا آ رہا تھا پھر ضمناً دو آیتیں التفات کی بطور تنبیہ و تذکیر آ گئیں جن کی نوعیت جملہ معترضہ کی ہے۔ اس کے بعد انفاق کا مضمون از سرِ نو آ گیا۔ اس مضمون کی وضاحت کے لیے جو استدلال اختیار فرمایا ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی اصل چیز تو خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی ہے لیکن یہ منکرین یہ کرنے کے لیے تو تیار نہیں ہیں البتہ انھوں نے اپنے جی سے خدا کے شریک و شفیع بہت سے گھڑ لیے ہیں اور ان کی شفاعت و حمایت پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں حالانکہ یہ جھوٹے سہارے کچھ کام آنے والے نہیں ہیں۔ جو لوگ اس حماقت میں مبتلا ہیں وہ اپنے اوپر بہت بڑا ظلم ڈھا رہے ہیں۔

اس کے بعد نہایت مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں توحید کی حقیقت واضح فرمائی اور شرک کی تردید کی تاکہ ایک بالکل غلط سہارے پر جو لوگ جی رہے ہیں وہ چوکنے ہوں اور خدا پرستی کی صحیح راہ اختیار کریں۔

اس کے بعد یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ تبلیغ و تعلیم اور انذار و تبشیر کا جو حق تھا وہ ادا ہو چکا ہے۔ اب جس کا جی چاہے وہ غیر اللہ سے کٹ کر اللہ کی مضبوط رسّی کو تھام لے اور جس کا جی چاہے اپنے غلط سہاروں کے اعتماد پر اپنی عاقبت برباد کرے، اللہ کو ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی سمجھ بوجھ سے ایمان لائیں، اگر وہ سب کو نیکی کے راستے پر ہانک دینا چاہتا تو وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن ہدایت و ضلالت

کے معاملے میں اس نے اس جبر کو پسند نہیں فرمایا۔

اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ کون لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دیتا ہے اور کون لوگ ہیں جو حق کی وضاحت کے بعد بھی گمراہی کی وادیوں ہی میں بھٹکتے رہ جاتے ہیں۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ آیات
۲۵۴-۲۵۶ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ
هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۵۴﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ
سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ
ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ
وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ
وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَ
هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۲۵۵﴾ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ
مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ
اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ
عَلِيمٌ ﴿۲۵۶﴾

ترجمہ آیات اے ایمان والو، جو کچھ ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو اس دن کے آنے
۲۵۴-۲۵۶ سے پہلے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش نفع
پہنچائے گی اور جو لوگ انکار کرنے والے ہیں اپنے اوپر اصلی ظلم ڈھانے والے وہی ہیں۔ ۲۵۴
اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے، سب کا قائم رکھنے والا

ہے، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں اور وہ بلند اور عظیم ہے۔ ۲۵۵

دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط رسی پکڑی جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۵۶

۸۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۵۴)

انفاق کی دلیل اور اس کی تسہیل

اوپر آیت ۲۴۵ میں انفاق کی جو دعوت گزری ہے، یہ اس کی مزید تفصیل ہے۔ مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ میں جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، انفاق کی دلیل بھی ہے اور اس کی تسہیل بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تم سے انفاق کا جو مطالبہ کر رہا ہے تو یہ تم پر گراں نہ گزرے۔ وہ تم سے کوئی تمہاری چیز نہیں مانگ رہا ہے بلکہ اپنی ہی بخشی ہوئی چیز مانگ رہا ہے۔ پھر یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اس نے بخشا ہے اس سارے کے لیے اس کا مطالبہ ہے بلکہ وہ اس میں سے صرف ایک حصّہ کے انفاق کا مطالبہ کر رہا ہے۔

پھر فرمایا کہ اس دنیا کے مال و متاع کا کوئی ابدی و دائمی نفع ہے تو صرف اسی صورت میں ہے جب آج اس کو خدا کی راہ میں خرچ کر کے اس کو ایک لازوال خزانے کی صورت میں تبدیل کر لو اس لیے کہ آگے جو دن آنے والا ہے اس میں نفع پہنچانے والی چیز اگر کوئی ہے تو صرف وہ نیکی ہے جو اس دنیا میں کمائی گئی ہو۔ اس کے سوا اس عالم میں کوئی چیز کام آنے والی نہیں۔ اس دنیا میں خرید و فروخت سے بھی کام چل جاتے ہیں، دوستیاں بھی کام دے جاتی ہیں اور سفارشیں بھی بعض اوقات نفع پہنچا دیتی ہیں لیکن اُس دنیا میں ان چیزوں کی ساری راہیں بند ہوں گی، وہ صرف ایمان اور عمل صالح کے نتائج کے ظہور کی دنیا ہو گی۔

لفظ بیع کا مفہوم ہم نے یہاں خرید و فروخت دونوں لیا ہے اس کی وجہ، جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ جب صورت چیز سے چیز کے مبادلہ کی ہو تو بیچنا اور خریدنا دونوں اس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔

'اَلْکٰفِرُوْنَ' سے مراد ہمارے نزدیک وہ لوگ ہیں جو اس طرح کے کسی دن کے ظہور کے منکر ہیں جس سے یہاں ڈرایا گیا ہے۔ جو لوگ آخرت کے منکر ہوں ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کل کے ادھار کے لیے آج کے نقد کو قربان کر سکیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اگرچہ یہ لوگ اپنی دانست میں اپنے آپ کو بہت حقیقت پسند سمجھتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ وہ اپنے کو نفع پہنچا رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ اپنی جانوں پر سب سے بڑے ظلم ڈھانے والے ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۲۵۵)

'قیّوم' کے معنی

'قَیُّوْمُ' مبالغہ کا وزن ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور دوسروں کے قیام و بقا کا واسطہ اور ذریعہ ہو۔

'سِنَة' کے معنی

'سِنَةٌ' کے معنی اونگھ اور نوم کے معنی نیند کے ہیں۔ ان دونوں کی نفی سے نیند کی ابتدا اور انتہا دونوں کی نفی ہو گئی جس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ غفلت کے تمام اثرات سے کمال درجہ پاک ہے۔

'مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم لوگوں کے آگے اور پیچھے اور ان کے ماضی اور مستقبل سب پر حاوی ہے۔ برعکس اس کے دوسروں کی علمی پہنچ صرف اس حد تک ہے جس حد تک خدا نے چاہا کہ وہ اس کے علم میں سے حصہ پائیں۔ اس سے آگے کسی کی رسائی نہیں۔ 'وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ'۔

'کرسی' کے معنی

'کُرْسِیّ' کے معنی عربی لغت میں کسی چیز کی جمی جمائی تہ کے ہیں۔ اسی سے کرسی کا لفظ بنا جو بیٹھنے کی جگہ یا چیز مثلاً تخت وغیرہ کے لیے استعمال ہوا۔ بیٹھنے کی جگہ یا چیز جب کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے خاص ہو اس کے اقتدار کا مرکز ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کرسی کا لفظ اقتدار کی تعبیر کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ 'وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ' کے معنی ہوئے کہ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین کے تمام اطراف و اکناف پر حاوی ہے۔ کوئی گوشہ اور کونہ بھی اس کے دائرۂ اقتدار سے الگ نہیں ہے۔

'اَدَ یَئُوْدُ اَوْدًا' کے معنی ہیں کسی چیز کا ایسا بھاری اور گراں ہونا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے۔ 'وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا' کے معنی یہ ہوئے کہ آسمان و زمین کی دیکھ بھال ذرا بھی خدا پر گراں نہیں ہے کہ اس کو کسی سہارے

یا مددگار کی احتیاج پیش آئے۔

آیت الکرسی توحید کی ایک عظیم آیت ہے

اوپر والی آیت میں یہ فرمایا کہ اس دن کے آنے سے پہلے پہلے خدا کی راہ میں خرچ کر لو جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش کچھ نفع پہنچائے گی۔ یہ اسی مضمون کی مزید تفصیل ہے گویا ردِ شفاعت اور ردِ شرک کے اس مضمون نے توحیدِ خالص کی وضاحت کے لیے ایک تقریب پیدا کر دی اور اس طرح توحید کے بیان میں ایک ایسی آیت نازل ہوگئی جس کی خوبیوں اور بلاغتوں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

سب سے پہلے فرمایا کہ اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے بعد اس کے لیے ان صفات کا اثبات کیا جو اس کی الوہیت کا لازمی تقاضا ہیں اور جن کے نہ ماننے سے اس کی الوہیت کی نفی ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ان باتوں سے اس کو بری قرار دیا جن کے ماننے سے بھی اس کی الوہیت کو بٹہ لگتا ہے۔ جن صفات کا اثبات کیا ہے ان میں سب سے پہلے اس کے حَیّ و قیُّوم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ حَیّ کے معنی زندہ کے ہیں اور قیُّوم کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور سب کو قائم رکھنے والی اور سب کو سنبھالنے والی ہو۔ ظاہر ہے کہ جو خود زندہ نہ ہو وہ تمام دنیا جہان کے لیے زندگی بخش کس طرح ہو سکتا ہے اور جو خود اپنی ذات سے قائم نہ ہو وہ آسمان و زمین کو قائم رکھنے والا کس طرح ہو سکتا ہے اور جو ذات ان صفات سے عاری ہو اس کو خدا ماننے کے کیا معنی؟ اور جب خدا ان صفات سے متصف ہے اور لازماً اس کو ان صفات سے متصف ہونا چاہیے بھی تو پھر کسی کو اس کا شریک و سہیم ماننا ایک بالکل بے جوڑ سی بات ہے۔

اس طرح قرآن نے ان تمام معبودوں کی نفی کر دی جو نہ زندہ ہیں، نہ زندگی کا سرچشمہ اور نہ خود قائم ہیں اور نہ دوسروں کے قائم رکھنے والے بلکہ خود اپنی زندگی اور اپنے قیام و بقا کے لیے ایک حَیّ و قیوم کے محتاج ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی نہ نیند۔ یہ نیند کی ابتدا اور اس کی انتہا دونوں سے اس کو بری قرار دیا گیا ہے اور یہ اس کے حَیّ و قیوم ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ نیند، موت کے ظلال و آثار اور اس کے مظاہر و مبادیات میں سے ہے اس وجہ سے یہ خدا کی شان کے منافی ہے۔ پھر یہ اس کے قیوم ہونے کے بھی منافی ہے، جو خود نیند سے مغلوب ہو کر اپنے کو قائم نہ رکھ سکے گا وہ دنیا کو کیا قائم رکھے گا اور جب وہ ہر لمحہ خود بیدار ہے اور اپنی دنیا کی نگرانی کر رہا ہے تو پھر یہ کیوں فرض کیا جائے کہ وہ اس دنیا کے انتظام و انصرام میں کسی اور کا بھی محتاج ہے۔

شفاعت، ... حقیقت

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے اور اسی کے اختیار میں ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے قرآن کے مخاطبوں میں سے نہ کسی کو انکار تھا اور نہ کسی کے لیے اس سے انکار کی گنجائش تھی، اس لیے کہ اس سے انکار کے معنی خدا کی خدائی کے انکار کے تھے۔ چنانچہ اس مسلّمہ حقیقت سے شفاعت کے اس عقیدے کے باطل ہونے کی طرف رہنمائی فرمائی جس میں عرب کے مشرکین اور اہلِ کتاب سب کسی نہ کسی نوعیت سے مبتلا تھے۔ فرمایا کہ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ

عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ، یعنی جب سب کے سب خدا ہی کے مملوک و محکوم اور اسی کے تابعدار و محکوم ہیں تو کس کی مجال ہے کہ خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور میں کسی کی سفارش کے لیے زبان کھول سکے۔ اس ارشاد نے شفاعت کے اس تصور کا بالکل خاتمہ کر دیا جس کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ بعض شرکا کو خدا کے ہاں اعتماد اور تدلّل کا یہ درجہ حاصل ہے کہ وہ کسی کے لیے خود بڑھ کر خدا سے سفارش کر سکتے ہیں اور خدا ان کی ناز برداری میں لازماً ان کی سفارش قبول بھی فرمائے گا۔ فرمایا کہ نہ خدا کے ہاں کسی کا یہ درجہ ہے اور نہ کوئی اس کے دربار میں اس کی اجازت کے بغیر زبان کھولنے کی جرأت کر سکے گا۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ اس طرح ظاہر فرمایا ہے۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ٢٧ - الانبیاء (اور مشرکین کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے، اللہ ان چیزوں سے پاک و برتر ہے فرشتے خدا کی اولاد نہیں بلکہ اس کے باعزت بندے ہیں، وہ اس کے آگے بات کرنے میں سبقت نہیں کرتے وہ بس اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں)۔

پھر فرمایا کہ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ یعنی خدا کے سامنے کسی کے بارے میں زبان کھولنے کی جسارت تو وہ کرے جو خدا کی معلومات میں کچھ اضافہ کر سکتا ہو اور یہ کہنے کی پوزیشن میں ہو کہ فلاں کے بارے میں نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو پوری آگاہی نہیں ہے لہٰذا سے ہے۔ لیکن یہ حیثیت کس کی ہے؟ اللہ تعالیٰ سب کے آگے اور پیچھے اور اس کے ماضی و مستقبل ہر چیز سے باخبر ہے۔ برعکس اس کے دوسرے کسی کا بھی یہ درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم کے کسی حصّے کا بھی احاطہ کر سکے۔ دوسروں کے لیے اس کے علم میں سے بس اتنا ہی ہے جتنا وہ از خود اپنے بندوں میں سے کسی پر کھول دے۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی یہ وسعت اور دوسروں کے علم کی یہ محدودیت مشرکین کے تصورِ شفاعت کا بالکل خاتمہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے شفاعت کی تردید کرتے ہوئے اکثر مقامات میں علمِ الٰہی کی اس وسعت اور دوسروں کے علم کی محدودیت کا حوالہ دیا ہے مثلاً يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ٢٨ - انبیاء (اللہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر ان کے لیے جن کے لیے اللہ پسند فرمائے اور وہ اس کی خشیت سے ڈرتے ہوں گے) يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ١٠٩-١١٠ طٰہٰ (اور اس دن کسی کو کسی کی شفاعت کچھ نفع نہ پہنچائے گی مگر جس کے لیے خدائے رحمان اجازت دے اور اس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے، وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے پیچھے اور ان کے آگے ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا)

شفاعت کا یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے اس لیے کہ یہ بندے کا اعتماد خدا کے بجائے بندے پر جاتی

ہے اور اس طرح یہ شرک کی راہ کھولتی ہے۔ اس کے بجائے قرآن نے شفاعت کا یہ تصور دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں میں سے جس کو چاہے گا اور جس کے لیے چاہے گا شفاعت کی اجازت دے گا اور وہ خدا سے ڈرتے ہوئے وہی بات زبان سے نکالے گا جو بالکل حق ہوگی۔ یہ شفاعت چونکہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوگی نیز اسی کے لیے ہوگی جس کے لیے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے، اور یہ نہ تو کسی حق کو باطل بنائے گی اور نہ کسی باطل کو حق بلکہ ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہوگی اس وجہ سے یہ بندے کا اعتماد خدا پر جمانے والی اور توحید کے تقاضوں کے مطابق ہے چنانچہ اس شفاعت کے لیے اس نے گنجائش رکھی ہے اور اس سے وہ اپنے ان بندوں کو نوازے گا جن کو چاہے گا۔ اس موضوع پر ہم انشاء اللہ سورۂ انعام میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔ یہاں اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

جس طرح شفاعت میں یہ استثنا ہے اسی طرح علم کے باب میں بھی یہ استثنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم میں سے جتنا کسی بندے کے لیے چاہتا ہے، دیتا ہے۔ یعنی خدا کے تمام علم کا احاطہ کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے نبیوں، رسولوں اور اس کے فرشتوں کو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے جتنا وہ کسی کو بخشتا ہے۔

آگے ارشاد ہوا وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا۔ یعنی اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین کے ہر گوشے اور کونے پر حاوی ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ اس کی وسیع مملکت کے بعض دور دراز گوشے ایسے ہوں جہاں اس کو اپنا اقتدار پوری طرح جمانے میں کامیابی نہ ہو رہی ہو اور وہ ان میں اقتدار جمانے کے لیے دوسرے معبودوں کو اپنا شریک اقتدار بنانے پر مجبور ہو۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں ہے جو اپنی سلطنت کو سنبھالے رکھنے کے لیے نائبوں اور مددگاروں کے محتاج ہوتے ہیں، ان کے بغیر ان کے لیے حکومت کا انتظام دشوار ہو جاتا ہے بلکہ وہ غیر محدود علم، غیر محدود قدرت اور غیر محدود قوتِ تصرف کا مالک ہے اس لیے جس طرح ہم اپنے مکان کے صحن کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں اس سے ہزاروں لاکھوں درجہ سہولت کے ساتھ وہ اپنی اس آسمان و زمین پر حاوی مملکت کا انتظام فرماتا ہے اور ذرا بھی اس کا بوجھ محسوس نہیں کرتا کہ وہ کسی کی طرف سے ہاتھ بٹانے کا محتاج ہو۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ علیؔ اور عظیم ہے۔ یعنی اس کی ہستی بڑی ہی بلند اور بڑی ہی عظیم ہے، اس کے علم، اس کی قدرت اور اس کی وسعت کو اپنے محدود پیمانوں سے نہ ناپو، یہیں سے اس کے بارے میں گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں اور شرک کی راہیں کھلتی ہیں۔ اپنی صفات کے باب میں جو کچھ وہ خود بتاتا ہے اس پر ایمان لاؤ اور ظن و قیاس اور تشبیہ و تمثیل کی خیال آرائیوں سے بچو۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۵۶)

لفظ 'طاغوت' کی تحقیق

طاغوت بروزن ملکوت وجبروت، 'طغی' کے مادہ سے ہے جس کے معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ جو چیز اپنی حد مناسب سے آگے بڑھ جائے اس کے لیے عربی میں کہیں گے 'طغی'۔ 'طغی الماء' پانی حد سے آگے بڑھ گیا۔ قوم ثمود جس آفت سے ہلاک ہوئی اس کے لیے طاغیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی آفت کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ حدود عبدیت و بندگی سے نکل جانے کے لیے استعمال ہوا اور جو حدودِ بندگی سے نکل جائے اس کو طاغوت کہنے لگے۔ پھر وسعت اختیار کر کے یہ لفظ ان چیزوں پر بھی حاوی ہو گیا جو حدودِ بندگی سے نکل جانے کا باعث یا ذریعہ بنیں۔ اہلِ لغت اسی وجہ سے اس کی تشریح عام طور پر یوں کرتے ہیں کہ اَلطَّاغُوْتُ عِبَارَۃٌ عَنْ کُلِّ مُعْتَدٍ وَّکُلِّ مَعْبُوْدٍ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (طاغوت سے مراد ہر وہ وجود ہے جو بندگی سے نکل جائے اور ہر وہ معبود ہے جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے)۔

قرآن نے اس لفظ کو مختلف مقامات میں استعمال کیا ہے اور ہر جگہ اس کے مقابل کا ذکر کر کے اس کے مختلف مفہوموں پر روشنی ڈال دی ہے۔ مثلاً زیر بحث آیت میں ہے فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ یہاں اللہ کے تقابل سے واضح ہے کہ طاغوت سے مراد ماسوا اللہ ہے۔ سورہ نحل میں ہے اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ یہاں بھی اللہ کے سوا دوسرے معبودانِ باطل مراد ہیں۔ سورہ نسا میں ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ اس کے بعد معاً فرمایا فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ جس سے متعین ہو گیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے اور شیطان کا لفظ شیاطین انس اور شیاطین جن دونوں کو شامل ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام میں اس لفظ کو کتاب الٰہی اور طریقۂ رسول کے مخالف طریقہ کے لیے استعمال فرمایا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ○ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا۔ ۶۰-۶۱ اس آیت میں یَتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ کے بالمقابل تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ طاغوت سے یہاں مراد وہ چیزیں ہیں جو کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول کے خلاف ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو خدا کی بندگی و اطاعت سے نکل جائے یا نکل جانے کا باعث اور ذریعہ ہو، وہ سب اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہے۔

'لا اکراہ فی الدین' کا مفہوم

اوپر آیت وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْھُمُ الْبَیِّنٰتُ الآیۃ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے جس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا یہ اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ کے رسول کی اصل ذمہ داری صرف حق کو واضح طور پر پہنچا دینا ہے اور جب یہ کام ہو چکا، حق باطل سے بالکل الگ ہو کر سامنے آ گیا، تو رسول کی جو ذمہ داری ہے وہ پوری ہو چکی۔

اب ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جن پر حجت تمام ہو چکی ہے۔ وہ چاہیں تو ایمان لائیں اور چاہیں تو کفر کی روش پر اڑے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں جبرِ فطری کی راہ نہیں اختیار فرمائی ہے بلکہ لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی بخشی ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ساری دنیا کو نیکی ہی کی ڈگر پر ہانک دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اس نے لوگوں کو آزادی دی ہے۔ جو لوگ ایمان لائیں گے وہ اس کا صلہ پائیں گے، جو کفر کی راہ اختیار کریں گے وہ اس کی سزا بھگتیں گے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے مثلاً وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۚ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ، إِن تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَن يُضِلُّ ۖ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ۳۵-۳۷ نحل (اور یہ مشرکین کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کو نہ پوجتے، نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہراسکتے۔ ایسا ہی سوال اٹھایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو کیا رسولوں پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری بھی ہے؟ ہم نے تو ہر امت میں ایک رسول اٹھایا اس دعوت کے ساتھ کہ لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو، تو ان میں سے کچھ ایسے ہوئے جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کچھ ایسے ہوئے جو گمراہی کے سزاوار ٹھہرے۔ تو ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا! اگر تم ان لوگوں کی ہدایت کے حریص ہو تو یاد رکھو کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت دینے والا نہیں ہے جن کو گمراہی کا سزاوار ٹھہرا چکا اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے)۔

یہ جبرِ فطری کی نفی ہے، جبرِ قانونی کی نہیں

قرآن مجید میں یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے مختلف مقامات میں بیان ہوا ہے۔ ہم نے طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک آیت کے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کے ٹکڑے میں جس جبر و اکراہ کی نفی کی گئی ہے اس سے مقصود جبرِ فطری کی نفی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں یہ طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے کہ وہ اپنی مشیت و قدرت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر چلا دے یا گمراہی کی طرف ہانک دے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا تو نہیں تھا لیکن یہ بات اس کی حکمت اور اس کے عدل کے خلاف ہوتی۔ اس نے اس کے برعکس یہ طریقہ اختیار فرمایا ہے کہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے لوگوں کے سامنے حق اور باطل دونوں کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے، پھر جو لوگ حق کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو راہِ حق اختیار کرنے کی توفیق ارزانی کرتا ہے اور جو لوگ باطل کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو اس کے لیے ڈھیل دے دیتا ہے۔

مقصود اس حقیقت کے واضح کرنے سے ایک تو ان کفار و مشرکین کو جواب دینا تھا جو اس جبر کی آڑ

لے کر اپنے کفر و شرک کو ثواب ٹھہرانا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ان کا عقیدہ و عمل باطل ہے تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، وہ اپنی قدرت کاملہ سے کام لے کر ان کو ٹھیک کیوں نہیں کر دیتا۔ دوسرے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح کرنا تھا کہ بحیثیت نبی اور رسول کے ان کی ذمہ داری صرف دین حق کو اچھی طرح واضح کر دینا ہے۔ یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ لازماً ایمان و ہدایت کی راہ اختیار بھی کر لیں۔

اس زمانے میں بعض کم سواد اس آیت کو اس کے اس مفہوم سے ہٹا کر جبر قانونی کی نفی کے معنی میں لیتے ہیں اور اس سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ چونکہ اسلام میں اکراہ نہیں ہے اس وجہ سے اسلام کے نام سے فلاں اور فلاں باتوں کو جو مستوجب سزا قرار دیا جاتا ہے یہ محض مولویوں کی من گھڑت باتیں ہیں، اسلام سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس گروہ کے اس استدلال کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلامی شریعت حدود و تعزیرات سے ایک بالکل خالی شریعت ہے جس میں ہر شخص کو سب کچھ کر گزرنے کی چھوٹ حاصل ہے۔ نہ زنا، تہمت اور چوری پر کوئی سزا ہے۔ نہ ڈکیتی، رہزنی، فساد فی الارض اور بغاوت پر کوئی تعزیر۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام میں حدود و تعزیرات کا ایک پورا نظام ہے جس کا نفاذ واجباتِ دین میں سے ہے۔ اگر ایک شخص نماز نہ پڑھے یا روزے نہ رکھے تو اسلامی حکومت اس کو بھی سزا دے سکتی ہے یہ چیز لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان اسلام کے خلاف بغاوت کی روش اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے بھی اسلامی قانون میں سزا ہے۔ یہ چیز بھی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے خلاف نہیں ہے۔ فتنہ و فساد کو خدا کی زمین سے مٹانے کے لیے اسلام نے اہل ایمان پر جہاد بھی واجب کیا ہے، یہ چیز بھی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے منافی نہیں ہے۔

اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ایک شخص اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد بھی جو اس کے جی میں آئے کرتا پھرے اور اس پر کوئی گرفت نہ ہو بلکہ وہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسلام کے حدود و قیود کی پابندی کرے۔ لادینی نظاموں میں مذہب کو نجی زندگی سے متعلق مانا جاتا ہے اس وجہ سے ان میں حکومت کی نافرمانیوں پر تو سزائیں اور تعزیرات ہیں لیکن خدا سے بغاوت کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اسلام میں مذہب کے پرائیویٹ زندگی سے مخصوص ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اسلامی حکومت اصلاً خدا ہی کی حکومت ہوتی ہے اور ریاست کا سیاسی ادارہ صرف خدا کے احکام و قوانین کے اجرا و نفاذ کا ایک ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس میں خدا کی ہر نافرمانی قابل گرفت ہوتی ہے۔ خواہ وہ نافرمانی مخفی ہو یا ظاہر۔ فرق ہے تو یہ ہے کہ مخفی نافرمانیوں پر خدا کی اخروی عدالت گرفت کرے گی اور ظاہری نافرمانیوں پر اسلام کی دنیوی عدالتیں گرفت کرنے اور ان پر سزا دینے کی مجاز ہیں۔ ارتداد بھی اسی زمرے کا ایک جرم بلکہ بہت بڑا جرم ہے اور اس پر جو سزا ایک اسلامی نظام میں دی جاتی ہے وہ اس بات پر نہیں دی جاتی کہ ایک

شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس بات پر دی جاتی ہے کہ اس نے خدا کی حکومت اور اس کے قانون کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔

اسی طرح اس امر سے ہمیں انکار نہیں ہے کہ مجرد کسی قوم کے اندر کفر کا وجود اس امر کے لیے کافی وجہ نہیں ہے کہ اسلام کے علمبرداران کے خلاف جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور تلوار کے زور سے ان کو اسلام پر مجبور کر دیں۔ کافر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق لازماً ہر شکل میں معاندانہ ہی نہیں بلکہ مصالحانہ بھی ہو سکتا ہے۔ جہاد اصلاً فتنہ اور فساد فی الارض کے مٹانے کے لیے شروع ہوا ہے اگر یہ چیز کہیں پائی جاتی ہے تو اہلِ ایمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ استطاعت رکھتے ہوں تو اس فتنہ اور فساد فی الارض کو مٹانے کے لیے جہاد کریں، خاص طور پر اس فتنہ کو مٹانے کے لیے جو اہلِ کفر کے ہاتھوں اس لیے برپا کیا جائے کہ اہل ایمان کو ان کے دین سے پھیرا جائے یا اسلامی نظام کو برباد کیا جائے۔ اس فتنے کے استیصال کے بعد اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس نے اپنے نظام میں اس بات کی پوری گنجائش رکھی ہے کہ اہل کفر اپنے کفر پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت کی رعایا رہ سکتے ہیں۔ اور ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ صرف مشرکین بنی اسمٰعیل کا معاملہ اس کلیہ سے ایک استثنا کی نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے وجوہ تفصیل کے ساتھ اسی سورہ کی آیات ۱۹۲-۱۹۳ کے تحت بیان کر چکے ہیں اور مزید وضاحت کے ساتھ اس پر ہم انشاء اللہ سورۂ برأت کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے) یہ مذکورہ اکراہ کی نفی کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ خدا کی طرف سے اتمام حجت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے اپنے نبی کے ذریعے سے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا۔ اس کے بعد اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے جس کا جی چاہے حق کو اختیار کرے اور جس کا جی چاہے باطل کے ساتھ چمٹا رہے۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جو لوگ اس وضاحت کے بعد بھی باطل سے چمٹے رہیں گے تو ایک دن آئے گا کہ خود یہ باطل ان کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ نہ ٹوٹنے والی رسی صرف ان کے ہاتھ میں ہوگی جو آج غیر اللہ سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف یکسو ہو جائیں۔

آخر میں سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ کی صفت کا حوالہ اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ جو لوگ غیر اللہ کو چھوڑ کر اللہ ہی کی رسی پکڑتے ہیں وہ ایک ایسے کا دامن پکڑتے ہیں جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے اس وجہ سے وہ ہر قدم پر اور ہر مرحلے میں ان کا ملجا و ماویٰ ہے۔ برعکس اس کے جو غیر اللہ کی پرستش کر رہے ہیں وہ ایسوں کے سہارے پر جی رہے ہیں جنھیں ان کے آغاز و انجام کا تو درکنار خود اپنے آغاز و انجام کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یہاں تک کہ انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ کچھ نادان لوگ ان کی پرستش کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی اس بے خبری کا اظہار آخرت میں کریں گے اور اپنے ان پرستاروں پر لعنت بھیجیں گے۔

۸۲- آگے کا مضمون ____ آیات، ۲۵-۲۶۰

'لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ الاٰية' میں ہدایت وضلالت سے متعلق جس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے آگے کی چند آیات میں اس کی مزید وضاحت فرمادی ہے۔ پھر کلام اصل سلسلہ بیان یعنی انفاق سے جڑ گیا ہے۔ یہ وضاحت تین واقعاتی مثالوں کے ذریعے سے کی گئی ہے اس لیے کہ حقائق جب تک مثالوں سے نہ واضح کیے جائیں اس وقت تک وہ اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتے۔ قرآن مجید کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ پہلے ہر مسئلے سے متعلق عقلی و فطری دلائل پیش کرتا ہے۔ پھر تاریخی اور واقعاتی مثالوں سے اس کو مدلل اور دل نشین بناتا ہے چنانچہ یہاں بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ ہدایت و ضلالت سے متعلق اصل قانون الٰہی اصولی شکل میں پیش کرنے کے بعد تین مثالیں پیش کی ہیں جن میں سے ایک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جو شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور جن کو گمراہی سے نکل کر ہدایت کی طرف آنا نصیب نہیں ہوتا اور دوسرے یہ واضح ہوتا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ دستگیری فرماتا ہے اور ان کو ہر قسم کی الجھنوں سے نکال کر ایمان ویقین کی روشنی اور شرح صدر کی طمانیت بخشتا ہے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ
۲۵۷-۲۶۰ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ
النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا
۳۴ ع ۲ خٰلِدُوْنَ ۲۵۷ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ اِبْرٰھٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ
وقف لازم اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ
وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ
يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ
فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۲۵۸
اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰي قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا ۚ

قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ
مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا
اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى
طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ
اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا
لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ
اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ
اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ
مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع ۳۵ ۳ ۲

ترجمہ آیات ۲۵۷-۲۶۰

اللہ ان لوگوں کا کارساز ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں، وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف دھکیلتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخی ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۵۷۔

کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا، جب کہ ابراہیم نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے

کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اسے پچھم سے نکال دے، تو وہ کافر یہ سن کر بھونچکا رہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۲۵۸

یا جیسے کہ وہ جس کا گزر ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی، اس نے کہا کہ بھلا اللہ اس کو اس کے فنا ہو چکنے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اس کو سو سال کی موت دے دی، پھر اس کو اٹھایا۔ پوچھا کتنی مدت اس حال میں رہے؟ بولا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ، فرمایا بلکہ تم پورے سو سال اس حال میں رہے۔ اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو، ان میں سے کوئی چیز بسی تک نہیں، اور اپنے گدھے کو دیکھو، ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں تاکہ تمھیں اٹھائے جانے پر یقین ہو اور تاکہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، کس طرح ہم ان کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی وہ پکار اٹھا کہ میں مانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۵۹

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب، مجھے دکھا دے تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ فرمایا کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟ بولا ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا، تو چار پرندے لو اور ان کو اپنے سے ہلا لو، پھر ان کو ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پر ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ وہ تمھارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۲۶۰

٨٣- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اللّٰہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور ۵ والذین کفروا اولیٰئھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمٰت ۵ اولٰئک اصحٰب النار ۚ ھم فیھا خٰلدون (٢٥٧)

ولی کا مفہوم

ولی، کے معنی مددگار، کارساز، ساتھی اور حمایتی کے ہیں۔

نور اور ظلمت سے مراد اور ان کی فطرت

نور سے مراد یہاں عقلی، ایمانی، عملی اور اخلاقی روشنی ہے۔ اسی طرح ظلمت سے یہاں مراد عقلی و اخلاقی ظلمت ہیں، چونکہ حق کی روشنی کا منبع ایک ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ، نیز حق میں انتشار نہیں بلکہ وحدت پائی جاتی ہے اس وجہ سے یہ لفظ واحد استعمال ہُوا۔ برعکس اس کے ظلمت، جمع استعمال ہُوا اس لیے کہ اس کے ظہور میں آنے کے راستے بھی مختلف ہیں اور اس کے مزاج میں انتشار و اختلاف بھی ہے۔

لفظ 'طاغوت' کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں اصلی نکتہ

مطلب یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اصل اہمیت رکھنے والی شے یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کا دامن پکڑتا ہے یا کسی غیر کا۔ اگر خدا کا دامن پکڑتا ہے تو خدا اپنے بندے کا کارساز و مددگار بن جاتا ہے اور اپنی توفیق بخشی سے درجہ بدرجہ اسے نفس و شہوات کی تمام تاریکیوں اور کفر، شرک اور نفاق کی تمام ظلمات سے نکال کر ایمان کامل و توحید خالص کی شاہراہ پر لا کھڑا کرتا ہے اور اگر بندہ اپنے رب سے منہ موڑ کر کسی اور راہ پر جا نکلتا ہے تو پھر وہ شیطان اور اس کی ذریات کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور وہ اس کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے کر عقل و فطرت کی ہر روشنی سے دور کر کے اس کو ضلالت کے کھڈ میں گرا دیتے ہیں۔ مشہور مثل ہے "خانہ خالی را دیو میگیرد" جس گھر میں آدمی نہیں رہتا وہ شیطان کا مسکن بن جاتا ہے۔ اسی طرح جو دل ایمان سے خالی ہوتا ہے وہ شیطان کا اڈا بن جاتا ہے۔ اور پھر شیاطین ایسے شخص کو گمراہی کی وادیوں میں سرگشتہ و حیران رکھتے ہیں، سورۂ انعام میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ قل اندعوا من دون اللّٰہ ما لا ینفعنا ولا یضرنا ونرد علی اعقابنا بعد اذ ھدٰنا اللّٰہ کالذی استھوتہ الشیٰطین فی الارض حیران (۷۱) (کہہ دو کیا ہم اللہ کے سوا ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع پہنچاتے نہ نقصان اور اللہ کی ہدایت بخشی کے بعد پھر الٹے پیچھے پلٹا دیے جائیں، اس شخص کے مانند جس کو شیاطین نے بہکا کر کسی صحرا میں سرگشتہ و حیران چھوڑ دیا ہو) اعراف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ واتل علیھم نبا الذی اٰتینٰہ اٰیٰتنا فانسلخ منھا فاتبعہ الشیطٰن فکان من الغٰوین (۱۷۵) (اور ان کو اس کا ماجرا سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتوں سے نوازا تو وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ گمراہوں میں سے بن گیا)۔ یہی بات سورۂ زخرف میں بھی ارشاد ہوئی ہے۔ ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطٰنا فھو لہ قرین (۳۶) (جو لوگ اللہ کے ذکر سے بے پروا ہو جاتے ہیں، ہم ان پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں

اور وہ ان کا ساتھی بن جاتا ہے)۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرٰهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرٰهِيمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ (۲۵۸)

"أَلَمْ تَرَ" کے خطاب کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

"الذی" آیت ۲۵۸ میں کون مراد ہے

"الَّذِي" سے اگرچہ یہاں واضح نہیں ہے کہ کون مراد ہے لیکن ہمارے مفسرین نے اس سے عام طور پر نمرود کو مراد لیا ہے۔ یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کا ہم عصر بادشاہ تھا اور تالمود میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اس کا وہ مناظرہ بھی مذکور ہے جس کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔

اوتار بادشاہوں کا تصور

"فِي رَبِّهِ" رب کے بارے میں بحث کی وجہ یہ ہوئی ہو گی کہ اس زمانے میں عام طور پر جو بادشاہ ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو اوتار بادشاہ (God Kings) کی حیثیت سے نمایاں کرتے تھے۔ یعنی ان کی قوم کے لوگ جن دیوتاؤں کو پوجتے تھے بادشاہ ان میں سے سب سے بڑے دیوتا کا مظہر سمجھا جاتا تھا، اس طرح بادشاہ کو بیک وقت سیاسی اور مذہبی دونوں قسم کا اقتدار حاصل ہو جاتا تھا۔ ہندوستان، چین اور مصر وغیرہ کے قدیم بادشاہوں میں سے اکثر کی حیثیت یہی تھی۔ نمرود کی قوم جن دیوتاؤں کو پوجتی تھی، قدیم صحیفوں اور قرآن دونوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سورج کو سب سے بڑے دیوتا کا درجہ حاصل تھا اس وجہ سے لازماً نمرود سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا رہا ہو گا۔ اس زعم کے ساتھ، ظاہر ہے کہ اپنی خدائی میں کسی اور خدا کی خدائی کی دعوت اس کے لیے ایک بالکل ناقابلِ برداشت چیز تھی۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اس بات کا اعلان کیا ہو گا کہ ربِ حقیقی صرف اللہ واحد ہی ہے، اس کے سوا کوئی رب نہیں تو اس دعوت کی زد اس نے اپنی خدائی پر بھی پڑتی محسوس کی ہو گی اور حضرت ابراہیمؑ کو بلا کر ان سے بازپرس کی ہو گی کہ یہ کون رب ہے جس کی تم دعوت دے رہے ہو، رب تو میں ہوں کہ سورج دیوتا کا مظہر اور اس کا اوتار ہوں۔

ضلالت کا سب سے بڑا سبب استکبار ہے

"أَنْ آتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ" میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق "أَنْ" سے پہلے حرفِ جر محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس خدائی کے گھمنڈ میں وہ اس وجہ سے مبتلا ہوا کہ اللہ نے اس کو حکومت اور اقتدار بخشا۔ ہونا تو یہ تھا کہ اللہ کی بخشی ہوئی یہ نعمت پا کر وہ خدا کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بنتا لیکن تنگ ظرفوں اور کم عقلوں کے لیے نعمت اکثر گمراہی کا باعث ہوئی ہے اور انھوں نے اس کو شکر کی جگہ کفر کا سبب بنایا ہے۔ جن لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے جب وہ اس اقتدار کو اللہ کے فضل و کرم کے بجائے اپنے استحقاق، اپنے علم اور اپنی تدبیر کا ثمرہ سمجھ بیٹھتے ہیں تو وہ اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ خدا یہ اقتدار بخش کر ان کا امتحان کر رہا ہے بلکہ وہ استکبار میں مبتلا ہو کر خود اپنی خدائی کا تخت بچھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے تدبیر یہ اختیار کرتے ہیں کہ خدا کے اوتار یا مظہر یا ظل اللہ کے روپ میں اپنے کو پیش کرتے ہیں۔

چنانچہ دولت و نعمت اور اقتدار کا گھمنڈ ہمیشہ ضلالت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب رہا ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے نکلے ہیں جو اپنے آپ کو اس فتنہ سے بچا سکے ہیں۔

حضرات انبیاء کا طریق بحث

نمرود کے سوال کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کی تعریف میں سب سے پہلے وہی بات کہی جو سب سے زیادہ واضح تھی۔ یعنی میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔ جو شخص بھی زندگی اور موت کے سوال پر غور کرتا ہے یہ سوال اس کو خدا کے ماننے پر مجبور کر دیتا ہے بشرطیکہ اس کے دماغ میں کوئی خلل نہ ہو لیکن نمرود کے ذہن میں اقتدار کا خناس سمایا ہوا تھا اس وجہ سے اس نے اس واضح حقیقت پر بھی یہ معارضہ کر دیا کہ موت اور زندگی پر اختیار تو میں بھی رکھتا ہوں، جس کا چاہوں سر قلم کر دوں، جس کو چاہوں بخش دوں۔ ظاہر ہے کہ یہ معارضہ ایک بالکل ہی احمقانہ معارضہ تھا اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک بالکل ہی دوسری بات فرمائی تھی اور یہ ایک بالکل ہی دوسری بات تھی۔ حضرت ابراہیمؑ چاہتے تو دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے اس کو واضح کر دیتے لیکن انھوں نے محسوس فرما لیا کہ ان کی واضح بات پر اس قسم کا احمقانہ معارضہ وہی کر سکتا ہے جو کٹ حجتی پر اتر آیا ہو اس وجہ سے انھوں نے اس کو مزید حجت کے لیے موقع دینا پسند نہیں فرمایا۔ انبیاء علیہم السلام مناظر نہیں بلکہ داعی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے خاص اس پہلو پر الجھنے کے بجائے اپنے رب کی ایک دوسری صفت بیان کر دی جس میں نمرود کے لیے کسی بحث کی راہ بالکل مسدود تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ اچھا، اگر یہ بات ہے تو میرا رب روز سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم ایک دن ذرا اس کو مغرب سے نکال کر دکھا دو۔ حجت ابراہیمی کا یہ وار ایسا بھرپور تھا کہ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ یہاں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خاص طور پر سورج کی تسخیر کا ذکر فرمایا جس کو نمرود کی نظر میں معبودِ اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اپنے آپ کو اسی معبودِ اعظم کا مظہر بنائے ہوئے بیٹھا تھا۔ بہترین استدلال اور لطیف ترین طنز کی یہ ایک نہایت خوب صورت مثال ہے۔

ہدایت و ضلالت کے معاملے میں سنت اللہ

آخر میں فرمایا کہ "اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں بخشا کرتا" یہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں بطور خلاصۂ بحث وہ اصول بیان ہوا ہے جس کو واضح کرنے ہی کے لیے اوپر والا واقعہ مذکور ہوا ہے۔ اس میں ظالم کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے جا استعمال کرتے ہیں، جو اللہ کے انعامات کو اس کا فضل قرار دینے کے بجائے ان کو اپنا حق سمجھتے ہیں، جو نعمتوں پر خدائے منعم کے شکر گزار ہونے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوتے اور ابلیس کی طرح اکڑتے ہیں، جو خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کی روش اختیار کرنے کے بجائے خود اپنی خدائی کے تخت بچھاتے اور اپنے کو رب ٹھہراتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اس ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں ان پر ہدایت کی راہ نہیں کھلا کرتی۔ ایسے لوگوں کے سامنے حق کتنے ہی واضح طریقہ پر آئے وہ اس کو قبول کرنے کے بجائے بحث اور کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کو اس کی کوئی راہ ملتی نظر نہیں

آتی تو وہ نمرود کی طرح ہکے بکے اور ششدر ہو کر تو رہ جاتے ہیں لیکن حق کو قبول پھر بھی نہیں کرتے۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ
مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ
يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ
وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُھَا ثُمَّ نَكْسُوْھَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ
قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۵۹)

'او' کا محلِ استعمال

حرف 'اَوْ' اصلاً تقسیم کے لیے آیا کرتا ہے۔ پہلے ان لوگوں کی مثال پیش کی جن کا ذکر اوپر 'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ' کے الفاظ سے فرمایا تھا، اب یہ ان لوگوں کی مثال بیان ہو رہی ہے جن کا ذکر 'اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ' سے فرمایا ہے۔

ایک بندۂ مومن جو طالبِ یقین تھا

اس تقسیم کی مثال اسی سورہ کی آیات ۱۷۔۲۰ میں گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک صاحب کشاف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہاں جس شخص کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کافر تھا بلکہ یہ ایک ایسے بندۂ مومن کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو ایمان سے تو بہرہ ور تھا لیکن وہ اپنے اس ایمان میں اس اطمینانِ قلب اور یقین کا طالب تھا جس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ اس کا یہ سوال کہ اس بستی کو خدا اس طرح فنا ہو جانے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟ انکار کی نوعیت کا نہیں بلکہ اظہارِ حیرت کی نوعیت کا ہے۔ انسان بسا اوقات ایک چیز کو مانتا ہے اس لیے کہ عقل و فطرت اس کی گواہی دے رہی ہوتی ہے لیکن وہ بات بجائے خود ایسی حیران کن ہوتی ہے کہ اس سے متعلق دل میں بار بار یہ سوال ابھرتا رہتا ہے کہ یہ کیسے واقع ہوگی؟ یہ سوال انکار کے جذبہ سے نہیں بلکہ جستجوئے حقیقت کے جوش سے ابھرتا ہے اور خاص طور پر ان مواقع پر زیادہ زور سے ابھرتا ہے جب سامنے کوئی ایسا منظر آجائے جو باطن کو جھنجوڑ دینے والا ہو۔ یہ حالت ایمان کے منافی نہیں بلکہ اس ایمان کے مقتضیات میں سے ہے جس کی بنیاد عقل و بصیرت پر ہو۔ یہ سلوکِ باطن کی ایک ریاضت ہے جس سے ہر طالبِ حقیقت کو گزرنا پڑتا ہے اور یہ سفر برابر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک 'حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ' کے انوار سے قلب و نظر جگمگا نہ جائیں۔ اس سفر میں ہر منزل اگرچہ خوب سے خوب تر کی طرف اقدام کی نوعیت کی ہوتی ہے لیکن عارف کی نظر میں اس کا ہر آج اس کے گزشتہ کل سے اتنا زیادہ روشن ہوتا ہے کہ وہ کل اس کو آج کے مقابل میں شب نظر آتا ہے۔

'الذی' آیت ۲۵۹ میں کون مراد ہے؟

'اَلَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ' سے یہاں کس کی طرف اشارہ ہے؟ اس سوال کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ ارباب تفسیر میں سے کسی نے خضرؑ کا نام لیا ہے، کسی نے عزیرؑ کا لیکن قدیم صحیفوں میں ان دونوں بزرگوں سے متعلق کوئی اس قسم کا واقعہ منقول نہیں ہے جس کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ البتہ صحیفہ حزقی ایل میں اس سے ملتی جلتی ہوئی ایک چیز ملتی ہے جس کی نوعیت ایک مکاشفہ کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

حزقی ایل نبی کا ایک مکاشفہ

"خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے اپنی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے پُر تھی مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے پاس چوگرد پھرایا اور دیکھو وہ وادی کے میدان میں بکثرت اور نہایت سوکھی تھیں اور اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد، کیا یہ ہڈیاں زندہ ہو سکتی ہیں؟ میں نے جواب دیا، اے خداوند خدا تو ہی جانتا ہے، پھر اس نے مجھے فرمایا تو ان ہڈیوں پر نبوت کر اور ان سے کہہ اے سوکھی ہڈیو، خداوند کا کلام سنو۔ خداوند خدا ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ میں تمہارے اندر روح ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گی اور تم پر نسیں پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تم کو چمڑا پہناؤں گا اور تم میں دم پھونکوں گا اور تم زندہ ہو گی اور جانو گی کہ میں خداوند ہوں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور جب میں نبوت کر رہا تھا تو ایک شور ہوا اور ایک زلزلہ آیا اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں، ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے۔ اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور ان پر چمڑے کی پوشش ہو گئی پر ان میں دم نہ تھا، تب اس نے مجھے فرمایا کہ تو نبوت کر، تو ہوا سے نبوت کر اے آدم زاد اور ہوا سے کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے دم تو چاروں طرف سے آ اور ان مقتولوں پر پھونک کہ زندہ ہو جائیں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور ان میں دم آیا اور وہ زندہ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں۔ ایک نہایت بڑا لشکر۔ (حزقی ایل باب ۳۷ ۔ ۱-۱۱)

قرآن اور تورات کے اختلاف کی نوعیت

اگرچہ قرآن اور تورات کے بیان میں کچھ فرق ہے لیکن یہ فرق تضاد کی نوعیت کا نہیں بلکہ اجمال و تفصیل کی نوعیت کا ہے۔ اس طرح کا فرق بسا اوقات ایک ہی مقصد کی دو روایات میں پایا جاتا ہے جس کو تناقض پر نہیں بلکہ اجمال و تفصیل پر محمول کیا جاتا ہے۔ قرآن میں بعض باتیں زیادہ ہیں جو تورات میں نہیں ہیں۔ ایسے مواقع میں قرآن کے بیان کو ترجیح حاصل ہو گی اس لیے کہ وہ براہِ راست خدا کا کلام اور بالکل محفوظ ہے۔ مثلاً تورات میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ خود حزقی ایل پر بھی سو سال کے لیے موت طاری کر دی گئی۔ اسی طرح ان کے کھانے کے نہ بُسنے اور گدھے کے دوبارہ زندہ ہونے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن ان کے ذکر نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ مشاہدات حزقی ایل کو نہیں ہوئے۔ جو مشاہدات ان کو کرائے گئے ان میں یہ بھی ہیں لیکن تورات میں یا تو ان کا ذکر نہیں ہوا یا ذکر تو ہوا لیکن اہلِ تورات نے اس کو ضائع کر دیا۔

آیاتِ الٰہی کے مشاہدہ کے لیے سیرِ ملکوت

اگر قرآن کے اس حوالہ کا تعلق حزقی ایل نبی کے اسی مشاہدہ ملکوت سے مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ آیاتِ الٰہی کے مشاہدہ کے لیے اسی طرح کی ایک سیرِ ملکوت تھی جس طرح کی سیرِ ملکوت کی اس سے اعلیٰ مثال ہمارے یہاں واقعہ معراج ہے۔ یہ معاملات چونکہ ایک ایسے عالم میں پیش آتے ہیں جو ہمارے عالمِ کون و فساد کے ضابطوں اور زمان و مکاں کی حد بندیوں سے ماوراء ہے اس وجہ سے ایک کے احکام کو دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس عالم میں صدیوں اور قرنوں کے معاملات منٹوں

اور لمحوں میں انجام پاتے ہیں۔

'وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا' یہ گری ہوئی بستی کی تصویر ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ کہنہ عمارتیں جب گرتی ہیں تو ان کے انہدام کا آغاز ان کے کنگروں، میناروں اور ان کی چھتوں سے ہوتا ہے۔ پہلے بلندیاں پست ہوتی ہیں، اس کے بعد دیواروں کی باری آتی ہے۔

'أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا' یہ سوال، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، انکار کی نوعیت کا نہیں بلکہ حیرت و استعظام کی نوعیت کا ہے۔ اس سے مقصود حق الیقین کی طلب تھی اس وجہ سے یہ ایمان کے منافی نہیں بلکہ اس کے مدارج و مقامات میں سے ہے۔ یقین کے مختلف مدارج ہیں اس وجہ سے اس کی طلب ہر درجے کے اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حضرات انبیاء بھی جو ایمان و یقین کے بلند ترین مدارج پر فائز ہوتے ہیں، اس سے مستغنی نہیں ہوتے بلکہ اس میں اضافہ کے لیے وہ بھی برابر دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے سوالات کے ابھرنے کا محل ایک طالب حقیقت کا اپنا ہی باطن ہوتا ہے۔ وہ یہ سوال دوسروں سے نہیں بلکہ خود اپنے ہی سے کرتا ہے اور اس کا جواب دوسروں سے نہیں بلکہ اس رہنمائے غیب سے چاہتا ہے جس کی تجلیات اس کے اپنے باطن کے افقِ اعلیٰ پر نمایاں ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، اسی نوعیت کی ایک خلش حزقی ایل بھی اپنے اندر محسوس فرماتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا مشاہدہ کرا کے ان کی یہ الجھن دور فرما دی اور اس طرح ان کو نہ صرف حیات بعد الموت کے معاملے میں اطمینانِ قلب کی ٹھنڈک حاصل ہو گئی بلکہ، جیسا کہ آگے واضح ہوگا، احیائے بنی اسرائیل کی اس مہم کے لیے بھی ان کا دل پوری طرح مضبوط ہو گیا جس پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے تھے۔ یہ سنت الٰہی ہے کہ وہ ہدایت کے طالبوں پر اپنی راہیں کھولتا اور ان کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ان کی تربیت فرماتا اور ان کو روشنی عطا کرتا ہے۔

'أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ' کے سوال کی نوعیت

'كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ' یہ سوال و جواب اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ آدمی کا جو زمانہ عالم برزخ میں گزرے گا، اٹھنے پر اس کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا، ایسا معلوم ہوگا کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ اٹھے ہیں۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی، پھر موت، پھر برزخ، پھر قیامت ایک بہت دور کی بات ہے، اس کے لیے ابھی سے اپنا عیش مکدر کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن جب قیامت کو اٹھیں گے تو معلوم ہوگا جو کچھ گزرا ہے وہ بہت دور کی بات نہیں بلکہ بالکل صبح و شام کا قصہ ہے۔

'وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ' یہاں 'انظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ' کے بعد كَيْفَ نُحْيِيهِ کے الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی دیکھو کہ کس طرح ہم اس گدھے کو زندہ کیے دیتے ہیں۔ اس حذف کی وجہ یہ ہوئی کہ آگے زندہ کرنے سے زیادہ عجیب ماجرے، اس کی سڑی گلی ہڈیوں کو جوڑنے اور ان پر گوشت اور دکھانے

چڑھانے کی تفصیل آرہی ہے۔ اس مذکور کے اندر یہ محذوف آپ سے آپ موجود ہے۔

"وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ" میں حرف عطف کا وجود، درآنحالیکہ یہاں کوئی لفظ ایسا موجود نہیں ہے جو اس کا معطوف علیہ بن سکے، اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہاں معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ آگے جگہ جگہ اس کی وضاحت ہوگی۔ اس حذف کا فائدہ یہ ہے کہ الفاظ بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور بات اس کے اندر بہت زیادہ سما سکتی ہے۔ اس لیے کہ ایسے مواقع میں وہ ساری بات حذف کی جا سکتی ہے جس پر سیاق و سباق دلیل بن سکے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ لِتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ اور اس معنی کے الفاظ حذف ہیں۔ گویا پوری بات یوں ہوگی کہ "اور تم اپنے گدھے کو دیکھو کہ کس طرح ہم اس کو زندہ کیے دیتے ہیں تاکہ حیات بعد الممات پر تمہارا ایمان پکا ہو جائے اور تاکہ تمہیں ہم لوگوں کے لیے نشانی بنائیں۔" یہ نشانی بنانا چونکہ اس کا ایک بعید فائدہ تھا جس کی طرف آسانی سے ذہن منتقل نہیں ہو سکتا تھا اس وجہ سے اس کو ظاہر کر دیا اور ایمان بالبعث اس کا بالکل واضح اور قریبی فائدہ تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور حرف ربط کے ذریعہ سے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

بنی اسرائیل کے لیے پیغام حیات

"اور تاکہ ہم تم کو لوگوں کے لیے نشانی بنائیں" یعنی ہم نے تم کو آیاتِ الٰہی کا یہ مشاہدہ اس لیے بھی کرایا ہے کہ تم بنی اسرائیل کے لیے اس بات کی نشانی بن سکو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ وہ ان کو از سر نو غلامی و محکومی کی ذلت سے چھڑا کر آزادی اور قوت و عزت کی زندگی بخش دے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ حزقی ایل نبی منکروں کی طرف نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے اور ان کا خاص مقصد بنی اسرائیل کو از سر نو زندہ کرنا تھا لیکن تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل اپنے مستقبل کی طرف سے بہت مایوس تھے۔ چنانچہ اوپر ہم نے صحیفہ حزقی ایل کی جو عبارت نقل کی ہے اس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

> "تب اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد یہ ہڈیاں تمام بنی اسرائیل ہیں، دیکھ یہ کہتے ہیں، ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہو گئے اس لیے تو نبوت کر اور ان سے کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے میرے لوگو، دیکھو میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو ان سے باہر نکالوں گا تب تم جانو گے کہ خداوند میں ہوں اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے اور میں تم کو تمہارے ملک میں بساؤں گا تب تم جانو گے کہ میں خداوند نے فرمایا۔" حزقی ایل باب ۳۷۔ ۱۱۔ ۱۴

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حزقی ایل نبی کو ان آیات کا مشاہدہ کرانے سے مقصود ایک تو یہ تھا کہ موت کے بعد زندگی کے مسئلہ میں خود ان کو شرح صدر حاصل ہو جائے، دوسرا یہ کہ ان کا یہ مشاہدہ بنی اسرائیل کے لیے پیغام حیات کا کام دے اور ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ انھیں بھی دوبارہ ایک زندہ قوم بنانے پر قادر ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں کھانے پینے کی چیزوں سے متعلق تو فرمایا کہ لَمْ يَتَسَنَّهْ ان میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا، برعکس اس کے گدھے کی ہر چیز سڑ گل گئی۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ایک ہی طرح کے حالات میں یہ دو مختلف اثرات کیوں نمایاں ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ طالب کی جو اصلی ذہنی خلش تھی وہ یہی تھی کہ ایک چیز مر کھپ جانے اور مٹی میں مل جانے کے بعد از سر نو زندگی کس طرح حاصل کرے گی؟ اس مشاہدے نے اس کی یہ خلش دور کر دی۔ ساتھ ہی کھانے پینے کی چیزوں کا کوئی تغیر نہ قبول کرنا اس کے لیے اس بات کا ثبوت بن گیا کہ اصل شئی اللہ کا حکم ہے، اگر اللہ چاہے تو کسی ایک شے کو اس کے گل سڑ جانے کے بعد بھی از سر نو زندگی بخش سکتا ہے اور اگر چاہے تو کسی شے کو تمام قوانین طبعی کے عمل سے بالاتر بھی رکھ سکتا ہے۔ قرآن میں اصحاب الکہف کا جو واقعہ مذکور ہے وہ اس کی مثال ہے۔

آخر میں فرمایا کہ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ یعنی اس مشاہدے کے بعد جب ان پر حیات بعد الممات کا راز بے نقاب ہو گیا تو وہ پکار اٹھے کہ اب میں مانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہاں أَعْلَمُ کا لفظ اپنے کامل معنی میں ہے۔ یعنی وہ جاننا جس کو قرآن نے علم الیقین سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ علم الیقین ان کو قیامت سے متعلق بھی حاصل ہو گیا اور بنی اسرائیل کے مستقبل کے باب میں بھی۔ گویا اس پردے میں انھوں نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں میں زندگی پیدا ہوتے اور ان پر گوشت پوست چڑھتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اپنے مشن کی کامیابی پر انھیں پورا اعتماد ہو گیا۔ اس پہلو سے وہ اپنی قوم کے لیے ایک نشانی ٹھہرائے گئے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۶۰)

لفظ 'اطمینان' کی حقیقت

'اطمینان' کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ٹھیک اس طرح ٹک جانا کہ اس کے ادھر یا ادھر جھکنے یا لڑھکنے کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ برتن اگر اپنی جگہ پر ٹھیک جم کر بیٹھ گیا ہے تو کہیں گے اطْمَأَنَّ اگر چراغ کی لو بالکل سیدھی ہے، اس میں ہوا کے سبب سے کسی طرف کو جھکاؤ نہیں ہے تو اس کے لیے بھی یہی لفظ لائیں گے۔ یہیں سے یہ لفظ نفس یا دل کی حالت کی تعبیر کے لیے استعمال ہونے لگا۔ جو نفس اپنے عقائد اور اعمال میں بالکل پابرجا ہے، حالات کے تغیر و تلون سے اس کے اطمینان اور اس کی دلجمعی میں کوئی فرق واقع نہ ہو، اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ یہ اطمینان ایمان کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے۔ قرآن مجید میں اس کو شرح صدر کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (کیا ہم نے تمہارے سینے کو کھول نہیں دیا؟) سلوک باطن کے مدارج و مقامات درجہ بدرجہ طے ہوتے ہیں اس وجہ سے سیر باطن کے ایک دور میں حضرات انبیا بھی اس مقام کے طالب رہتے ہیں حالانکہ

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے وہ اس سے روزِ اوّل سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ یہ طلب ایمان کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ اس کی تکمیل ہے۔

'فصُرھُنَّ' کی تحقیق

"صَوْرٌ" کے معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ صُرْتُ الشَّیْءَ یا اَصَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہوں گے میں نے اس کو اپنی طرف مائل کر لیا، جھکا لیا، اپنے سے اس کو ہلا لیا۔ اسی سے فَصُرْھُنَّ ہے۔ یعنی ان پرندوں کو اپنے سے ہلالو۔

حضرت ابراہیم کی درخواست شرحِ صدر کے لیے تھی

جس طرح اوپر والے واقعے میں ایک بندۂ مومن نے اپنی ایک باطنی خلش کا اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار کیا تو اس نے اس کے لیے اپنی ملکوت کا ایک گوشہ بے نقاب کر کے اس کی خلش دور فرما دی اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے سلوکِ باطن کے ایک دور میں (یہ دور ان کی زندگی کا ابتدائی دور ہی ہو سکتا ہے) اس بات کی خواہش کی کہ ان کو مشاہدہ کرا دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حشر کے وقت مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ یہ خواہش اسی طرح کی ایک خواہش ہے جس طرح کی خواہش حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لیے پیدا ہوئی۔ اس خواہش کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قیامت کا اعتقاد نہیں تھا، اعتقاد تو تھا لیکن ایک حقیقت عقل کے نزدیک کتنی ہی واضح اور مدلل کیوں نہ ہو، جب تک وہ نادیدہ ہوتی ہے اس وقت تک اس کو ماننے کے باوجود انسان اس کے باب میں شرحِ صدر کا آرزومند ہی رہتا ہے۔ یہ آرزو انبیاء کی شان کے خلاف نہیں ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن میں یہ دعا سکھائی گئی کہ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (دعا کرتے رہو کہ اے رب میرے علم کو بڑھا) یہ تشنگی تو اسی وقت دور ہو سکے گی جب اسباب کے تمام پردے بیچ سے ہٹا دیے جائیں گے اور اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے گی۔ لیکن یہ چیز اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں حاصل ہو گی۔ البتہ جہاں تک اطمینانِ قلب اور شرحِ صدر کا تعلق ہے اس سے وہ اپنے ان بندوں کو محروم نہیں رکھتا جو صدقِ دل سے اس کے طالب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس مقصد کے لیے اگر اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے تو وہ اپنے خاص بندوں کو اپنی قدرت کے بعض مخصوص گوشوں کا بھی مشاہدہ کرا دیتا ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے فضلِ خاص کی دلیل ہے۔ وہ اپنے اوپر ایمان رکھنے والوں کا مددگار اور ولی ہے وہ ان کو کبھی حیرانگی و تشنگی میں نہیں چھوڑتا بلکہ ان کو ہمیشہ تاریکی سے روشنی اور اضطراب سے اطمینان کی طرف بڑھاتا رہتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے اضطراب کو دور کرنے کے لیے ان کو یہ ہدایت ہوئی کہ چار پرندے لے کر ان کو پہلے اپنے سے ہلالو، پھر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے گوشت کا ایک ایک حصہ اپنے گرد و پیش کی پہاڑیوں پر رکھ دو، پھر ان کو اپنی طرف بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے۔

چار پرندوں کی ہدایت اس لیے ہوئی ہو گی کہ چاروں سمتوں سے ان کے مجتمع ہونے کا ان کو مشاہدہ کرایا جائے تاکہ اس بات پر ان کا یقین مستحکم ہو جائے کہ قیامت کے دن اسی طرح نفخِ صور پر تمام مخلوق ہر سمت

سے اپنے پروردگار کی طرف دوڑے گی۔

اپنے سے ہلا لینے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی ہوگی کہ ان کو وہ اچھی طرح پہچان رکھیں تاکہ ان کو اس امر میں کوئی اشتباہ نہ پیش آئے کہ جو پرندے زندہ ہو کر آئے ہیں وہی ہیں جن کو انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا، دوسرے نہیں ہیں۔ نیز یہ حقیقت بھی ان پر واضح ہو جائے کہ دوبارہ جو زندگی ہوگی اس میں دنیوی زندگی کی ساری یادداشتیں بھی زندہ ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ مانوس پرندے اپنے مالکوں کی آواز بھی پہچانتے ہوں گے۔

اگرچہ یہاں پرندوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے معنی کے لیے کوئی خاص لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن اس سے یہ معنی لینے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اوّل تو یہاں "جزءًا" کا جو لفظ آیا ہے وہ واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہی پہاڑوں پر ڈالنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ اگر ایک ایک پرندے کو زندہ الگ الگ پہاڑ پر رکھوا دینا مقصود ہوتا تو اس مفہوم کے لیے زبان کا یہ اسلوب صحیح نہیں ہے۔ عربی میں اس معنی کو ادا کرنے کے لیے اسلوب اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو تردد مردوں کے زندہ ہونے کے باب میں تھا، یہ تردد اس طرح تو دور نہیں ہو سکتا تھا کہ چند مانوس چڑیاں ان کی آواز پر ان کے پاس آجائیں۔ اس قسم کا تجربہ تو تیتر، بٹیر، کبوتر اور شکرے پالنے والے ہر روز کرتے ہی رہتے ہیں۔ اگر یہی تجربہ حضرت ابراہیمؑ کو کرا دیا جاتا تو اس سے ان کی وہ الجھن کس طرح دور ہو سکتی تھی جو انھوں نے اپنے رب کے سامنے پیش کی تھی۔ یہ دور ہو سکتی تھی تو اسی شکل میں دور ہو سکتی تھی جب ایک شے کے اجزا فنا اور انتشار کے بعد از سر نو مختلف گوشوں سے جمع ہو کر حیات تازہ حاصل کریں۔

پرندوں کا واقعہ حضرت ابراہیمؑ کا مشاہدۂ خاص تھا

البتہ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ واقعہ ان معجزات میں سے نہیں ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے اپنی قوم پر حجت قائم کرنے کے لیے ظاہر ہوئے۔ بلکہ یہ ان مشاہدات میں سے ہے جو ذاتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لیے کرائے گئے کہ ان کو اطمینانِ قلب اور شرح صدر کی دولت حاصل ہو۔ اس قسم کے مشاہدات حضرات انبیاء علیہم السلام کو اس لیے کرائے جاتے ہیں کہ ان کی تربیت ہو اور وہ اس بارِ عظیم کے اٹھانے کے لیے پوری طرح اہل ہو جائیں جو قدرت کی طرف سے ان پر ڈالا جاتا ہے۔ دوسرے طالبینِ حق بھی اس میں سے حصہ پاتے ہیں لیکن ان کا حصہ ان کی استعداد اور ان کے درجے اور مرتبے کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اس قسم کا مشاہدہ عالم ظاہر میں بھی ہو سکتا ہے اور عالم روح میں بھی۔ مگر جس کو ہوتا ہے اس کے لیے موجب اطمینان و یقین ہوتا ہے اور یہی ان کا مقصود ہوتا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات۔ عزیز، حکیم۔ پر نگاہ جمائے رکھنے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ انھی صفتوں کی یاددداشت سے یہ یقین مضبوط ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوبارہ ضرور اٹھائے گا اس لیے کہ وہ اس پر قادر بھی ہے اور ایسا کرنا اس کی حکمت کا مقتضیٰ بھی ہے۔

۸۴- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۶۱-۲۶۴

ہم اوپر یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ یہاں اصل سلسلۂ بیان تو جہاد و انفاق کا تھا لیکن آیت لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ میں ہدایت و ضلالت سے متعلق ایک سنت اللہ کا ذکر آگیا تھا جس کی وضاحت کے لیے مذکورہ مثالوں کا ذکر ضروری ہوا اور اس طرح اس بحث میں وسعت پیدا ہو گئی۔ اب یہ ضمنی بحث ختم ہو گئی اور انفاق کا مضمون جو سلسلے کا اصل مضمون تھا پھر سامنے آگیا اور نہایت تفصیل کے ساتھ انفاق کی برکات، اس کی خصوصیات اور اس کی آفات بیان ہوئیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۶۱تا۲۶۴

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ
حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ
وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا
مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ
صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ
يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ
فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ
فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ
اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ

جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِۚ فَاِنْ
لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾
اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ
اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ
فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ
مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ
وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿٢٦٧﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ
وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾ ۙۖ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ
الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾
وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ
وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ
وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ
عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾ لَيْسَ
عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا

مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَ
مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾
لِلْفُقَرَاۗءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُھُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاۗءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ
تَعْرِفُھُمْ بِسِيْمٰھُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا
ع ۳۷ ۵ مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ
بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ
وقف منزل وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

ترجمہ آیات ۲۶۱-۲۷۴

ان لوگوں کے مال کی تمثیل جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کے مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں اللہ برکت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اللہ بڑی گنجائش والا اور علم والا ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے نہ دل آزاری کرتے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ اور نہ تو ان کے لیے کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ دلداری کا ایک کلمہ کہہ دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو، اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔ اے ایمان والو، احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے اپنی خیرات کو اکارت مت کرو۔ اس شخص کے مانند جو اپنا مال دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر وہ ایمان نہیں رکھتا۔ ایسے شخص کی تمثیل یوں ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کا

مینہ پڑے اور وہ اس کو بالکل سپاٹ پتھر چھوڑ جائے۔ ان کی کمائی میں سے کچھ بھی ان کے پلے نہیں پڑے گا اور اللہ ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا۔ ۲۶۱ - ۲۶۴

اور ان لوگوں کے عمل کی تمثیل جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اس باغ کے مانند ہے جو بلندی پر واقع ہو۔ اس پر بارش ہوگئی تو دوچند پھل لایا، بارش نہ ہوئی تو پھوار بھی کافی ہوگئی اور اللہ جو کچھ بھی تم کر رہے ہو، اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۶۵

کیا تم میں سے کوئی بھی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، نیچے اس کے نہریں بہہ رہی ہوں، اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی ناتواں ہوں اور باغ پر سموم کا بگولا پھر جائے اور وہ جل کر خاک ہو جائے۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تمہارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ ۲۶۶

اے ایمان والو، اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں اور اس میں سے وہ مال تو خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو، جس کو خدا کی راہ میں تو خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ ۲۶۷

شیطان تمہیں تنگ دستی سے ڈراتا اور بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ وہ جس کو

چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔ مگر یاد دہانی وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ ۲۶۸-۲۶۹

اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے یا جو کچھ بھی نذر مانو گے تو یاد رکھو کہ اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے اور ان لوگوں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۲۷۰

اور اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر تم ان کو چھپاؤ اور چپکے سے غریبوں کو دے دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تمہارے گناہوں کو جھاڑ دے گا اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ۲۷۱

ان کو ہدایت دینا تمہارے ذمے نہیں ہے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے اس کا نفع تمھیں کو حاصل ہونا ہے اور نہ خرچ کیجیو مگر اللہ کی رضا جوئی ہی کے لیے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا کر دیا جائے گا اور تمہارے حق میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی۔ ۲۷۲

یہ ان غریبوں کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، زمین میں کاروبار کے لیے نقل و حرکت نہیں کر سکتے، بے خبر ان کی خودداری کے سبب ان کو غنی خیال کرتا ہے، تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ جو لوگ اپنے مال رات اور دن، پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۲۷۳-۲۷۴

۸۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ
كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۶۱)

'فی سبیل اللہ' کا مفہوم

"فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ" قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے تحت وہ سارے کام آتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیے جائیں۔ حالات کے اعتبار سے کوئی کام زیادہ اہم ہو سکتا ہے، کوئی کم، لیکن جو کام بھی رضائے الٰہی کے لیے اور شریعت کی ہدایات کے تحت کیا جائے وہ فی سبیل اللہ ہے۔

'انفاق فی سبیل اللہ' کی تمثیل

یہ اس بڑھوتری کی تمثیل ہے جو راہِ خدا میں خرچ کیے ہوئے مال کے اجر و ثواب میں ہوگی۔ فرمایا کہ جس طرح ایک دانے سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں اسی طرح ایک نیکی کا صلہ سات سو گنے تک بندے کو آخرت میں ملے گا۔ اس مضمون کی وضاحت احادیث میں بھی ہوئی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ نیکیوں کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملے گا۔ یہ فرق ظاہر ہے کہ عمل کی نوعیت، عمل کے زمانے اور عمل کرنے والے کے ظاہری و باطنی حالات پر مبنی ہوگا۔ اگر ایک نیکی مشکل حالات اور تنگ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اس کا اجر زیادہ ہوگا اور اگر ایک نیکی آسان حالات اور کشادہ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اس کا اجر کم ہوگا۔ پھر نیکی کرنے والے کے احساسات کا بھی اس پر اثر پڑے گا۔ ایک نیکی پوری خوش دلی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری سرد مہری اور نیم دلی کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے اجر و ثواب میں بھی فرق ہوگا۔ آیت میں اجر کی وہ شرح بیان ہوئی ہے جو سب سے اونچی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھاتا ہے۔ یہ اس ضابطے کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی چاہنا بھی عدل و حکمت کے خلاف نہیں ہوتا اس وجہ سے یہ بڑھوتری انہی کے لیے وہ چاہتا ہے جو اس کے ٹھہرائے ہوئے ضابطے کے مطابق اس کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

'واسع علیم' کا محل

"وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" میں ایک تو یہ بات واضح فرمائی کہ اجر کی اس وسعت پر بندہ اپنی تنگ دامانی پر قیاس کر کے حیران ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ غیر محدود سمائی رکھنے والا ہے، دوسری یہ بات فرمائی کہ خدا کی راہ میں جو چھوٹی یا بڑی، پوشیدہ یا علانیہ نیکی کی جاتی ہے سب اس کے علم میں رہتی ہے اس وجہ سے ہر شخص اپنے اجر کی طرف سے مطمئن رہے۔ جب دینے والے کا خزانہ بھی غیر محدود ہے اور اس کا علم بھی غائب و حاضر سب پر محیط ہے تو تشویش کی گنجائش کہاں باقی رہی!

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲۶۲)

"اذًی" کا لفظ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو باعثِ رنج و اذیت ہو عام اس سے کہ یہ رنج و اذیت جسمانی ہو یا جذباتی و روحانی۔ یہاں اس سے مراد وہ طعن و تشنیع اور توہین و تحقیر ہے جو عموماً کم ظرفوں کی طرف سے ان لوگوں کے لیے ظاہر ہوتی ہے جن پر وہ کبھی کوئی احسان کر بیٹھتے ہیں۔

انفاق کے اجر کے اصل حق دار

فرمایا کہ یہ اجرِ عظیم جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوا ان خرچ کرنے والوں کے لیے ہے جو خرچ کرنے کے بعد نہ تو ان لوگوں پر کوئی احسان جتائیں جن پر انھوں نے خرچ کیا ہے اور نہ کسی پہلو سے ان کی کوئی دل آزاری کریں۔ واضح رہے کہ یہ احسان جتانا اور دل آزاری کرنا دونوں چیزیں ایک ہی فاسد کردار کے دو پہلو ہیں۔ لئیم اور کم ظرف لوگ اگر کسی پر کچھ خرچ کر بیٹھتے ہیں تو اس کے بدلے میں ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ شخص زندگی بھر ان کا ممنونِ احسان بلکہ زرخرید غلام بن کے رہے۔ اگر وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو رہی ہے تو پھر وہ اس کو اپنے طعنوں کا ہدف بنا لیتے ہیں اور جہاں ان کو موقع ملتا ہے اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔ اجر ان لوگوں کے لیے ہے جن کا انفاق اس بلا سے محفوظ رہے۔

'لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ' دوسری جگہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ جنت کی تعبیر ہے اس لیے کہ جنت ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ ہو گا اور نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا۔ یہاں جنت کی تعریف ان لفظوں میں جو کی گئی ہے اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ انفاق کرنے والے اس جنّت کے سزاوار اس لیے ٹھہریں گے کہ نہ تو خدا کی راہ میں خرچ کر کے انھوں نے کبھی اس بات کا غم کیا کہ کیوں خرچ کر دیا اور نہ کبھی شیطان کے ڈراووں سے متاثر ہو کر مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا ہوئے کہ کل کیا کھائیں گے۔ ان کے اس حوصلے کے صلے میں خدا ان کو سات سو گنے تک اجر بھی دے گا اور وہ بہشت بھی جو ماضی اور مستقبل دونوں طرف سے انھیں مطمئن اور بے غم کر دے گی۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ (۲۶۳)

یہاں اگرچہ صرف "اَذًی" (دل آزاری) کا ذکر ہوا، احسان جتانے کا ذکر نہیں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ مراد دونوں ہی باتیں ہیں۔ ایک کے حذف کر دینے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ یہ درحقیقت ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ جہاں احسان جتانا ہے وہاں ایذا ہے، جہاں ایذا ہے وہاں احسان جتانا بھی ہے۔

دلداری کا ایک کلمہ اس خیرات سے بہتر ہے جس کے ساتھ دل آزاری ہو

فرمایا کہ دلداری کا ایک کلمہ اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ سائلوں اور محتاجوں سے اچھے انداز میں بات کرنے اور ان کے غلط رویہ سے درگزر کرنے کی ہدایت قرآن میں بار بار ہوئی ہے اس کے وجوہ پر ہم اسی سورہ کی آیت ۸۳ کے تحت تفصیل کے ساتھ نظائر قرآن کی روشنی میں بحث کر چکے ہیں۔ آدمی میں اگر غنا کے ساتھ حلم نہ ہو تو وہ انفاق کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اگر وہ انفاق کرتا

بھی ہے تو بسا اوقات ثواب کمانے کے بجائے الٹا اس سے گناہ کما لیتا ہے۔ جن کے پاس مال ہوتا ہے ان کے اندر عموماً ایک احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے اس وجہ سے وہ محتاجوں اور سائلوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اکثر مانگنے والوں کو جھڑک دیتے ہیں۔ بعض اوقات سائلوں کا رویہ بھی کچھ ناگوار ہوتا ہے جو تنک مزاج مال داروں کے پارے کو اور بھی گرم کر دیتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ اصلی مستحقین کو اس لیے نظر انداز کر جاتے ہیں کہ کسی صحیح یا غلط بنیاد پر ان کو ان سے شکایت ہوتی ہے۔ یہ تمام خرابیاں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ اکثر مالداروں کے پاس مال تو ہوتا ہے لیکن ان کے مال کی نسبت سے ان کے اندر عفو و درگزر کی صفت نہیں ہوتی۔ قرآن نے اسی بنیاد پر جہاں انفاق کی تاکید کی ہے وہاں اس صفت کی بھی تاکید کی ہے۔ اس کے بغیر کوئی انفاق احسان کا درجہ حاصل نہیں کرتا۔ آل عمران کی ایک آیت ملاحظہ ہو۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۳۴۔ آل عمران (جو خرچ کرتے ہیں خوش حالی اور تنگ دستی میں اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ خوب کار ہیں اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے)۔

غنیؔ و حلیمؔ کی صفات کا تقاضا

یہاں غنی و حلیم کی صفات کے حوالے میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ اللہ چونکہ غنی ہونے کے ساتھ ساتھ حلیم بھی ہے اس وجہ سے اپنے بندوں کی تمام کوتاہیوں اور نافرمانیوں کے باوجود ان کو اپنے جود و کرم سے نوازتا رہتا ہے، اگر وہ بندوں کی کوتاہیوں پر ان کو اپنے فضل سے محروم کر دیا کرے تو کون ہے جو کسی فضل کا مستحق قرار پا سکے۔ یہ اس غنی کا حلم ہی ہے جس کی بدولت نیکوکار اور گنہگار سب اس کے خزانے سے رزق پا رہے ہیں۔ جب اس کی صفات یہ ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ انہیں صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی نمایاں ہو۔ یعنی جن کو اس نے غنی بنایا ہے، ان کے اندر ان کے غنا کے بقدر بردباری بھی ہو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ غریبوں کی آستینوں کے اندر سے جو ہاتھ مالداروں کے سامنے پھیلتا ہے وہ، جیسا کہ مشہور حدیث قدسی میں وارد ہے، درحقیقت خدا ہی کا ہاتھ ہوتا ہے اس وجہ سے اس ہاتھ کی تحقیر کرنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ جس ہاتھ کو رد کر رہے ہیں یہ درپردہ اسی غنی کا ہاتھ ہے جس کے ہاتھ سے انھوں نے سب کچھ پایا ہے۔ اگر ان کی طرف سے اس طرزِ عمل کے باوجود بھی وہ ان سے درگزر فرما رہا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حلیم ہے۔ ورنہ حق تو یہ تھا کہ ایسے ناشکرے لوگ خدا کی ہر نعمت سے محروم کر دیے جاتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶۴)

صفوانؔ کے معنی

'صَفْوَانٌ' کے معنی چکنے پتھر یا چکنی چٹان کے ہیں۔

'وابل' کے معنی

وابل کے معنی ہیں زور کی بارش۔ زور کا دونگڑا۔

'صلد' کے معنی

صلد کے معنی سخت اور چکنی چیز کے ہیں۔ 'ارض صلد' یا 'مکان صلد' اس زمین کو کہیں گے جہاں کوئی چیز اُگتی نہ ہو۔ 'راس صلد' ایسے سر کو کہیں گے جس پر بال نہ اگتے ہوں۔

تمثیل میں مدنظر صورت

پہاڑوں پر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی بڑی چٹان پر ادھر ادھر سے مٹی آ کر جم جاتی ہے جس سے ایک موٹی تہ بن جاتی ہے۔ کسان بعض اوقات اس کو زرخیز پا کر اس پر کھیتی شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی زمینوں کو کبھی کبھی یہ خطرناک صورت پیش آتی ہے کہ پہاڑ کے بالائی حصے میں زور کی بارش ہوئی اور اس کا ریلا جو آیا تو اس نے ساری مٹی والی سطح وادی کی طرف پھسلا دی اور نیچے صرف سخت چٹان رہ گئی۔ پہاڑی علاقوں سے اس قسم کے حوادث کی اطلاعات اخبارات میں وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں۔ اس کو (landslide) کہتے ہیں۔ یہاں تمثیل میں یہی صورت مدنظر ہے۔

فرمایا کہ جو لوگ انفاق کر کے احسان جتاتے یا دل آزاری کرتے ہیں ان کی خیرات بالکل اکارت جاتی ہے، آخرت میں ان کو اس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ ایمان پر ہونے کے باوجود ان کا یہ عمل اسی طرح ضائع ہو جائے گا جس طرح اس شخص کا عمل ضائع ہو جائے گا جو محض دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس سے احسان جتانے اور ایذا دینے کی غایت درجہ سنگینی واضح ہوتی ہے، کہ آدمی کے انفاق کو برباد کر دینے کے معاملے میں یہ باتیں بالکل کفر کے برابر ہیں۔

ایسے شخص کی تمثیل اس کسان سے دی ہے جس نے اپنی فصل ایک ایسی زمین پر بوئی جس کے نیچے سخت اور چکنی چٹان تھی۔ بارش کا جو ایک زور کا دونگڑا پڑا تو اوپر کی ساری مٹی فصل سمیت وادی میں بہ گئی اور نیچے سے گنجے سر کے مانند چٹان نکل آئی۔ فرمایا کہ جس طرح اس محروم القسمت کسان کی ساری محنت رائگاں چلی جاتی ہے اسی طرح اس خیرات کرنے والے کی خیرات برباد ہو کر رہ جاتی ہے جو خیرات کرنے کے بعد احسان جتاتا اور دل آزاری کرتا ہے۔ فرمایا کہ ایسے لوگ اپنی ساری خیر خیرات ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا کوئی حصہ بھی وہ بچا نہیں پاتے۔

ہدایت کی مختلف صورتیں

"وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الاية" میں جس ہدایت کا ذکر ہے وہ غایت و مقصود کی ہدایت ہے۔ ہم تفسیر کے شروع میں بیان کر آئے ہیں کہ ہدایت کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک ہدایت جبلت و فطرت کی ہدایت ہے جو سب حیوانات اور انسانوں کو عطا ہوئی ہے۔ ایک ہدایت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کی تدبیروں اور کوششوں میں بخشتا ہے جس سے وہ کسی کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت وہ ہے جو انبیا اور شرائع کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور جس سے بندہ قبول حق کی توفیق پاتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک وہ ہدایت ہے جو آخرت میں حاصل ہوگی جس سے بندے اپنی کوششوں کے آخری ثمرات و نتائج کی طرف رہنمائی حاصل کریں گے۔ ہدایت کا لفظ قرآن میں ان تمام مقاصد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ آیت زیر بحث

میں یہ لفظ ہمارے نزدیک اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو کافر اور ناشکرے لوگ ہیں وہ اپنے اعمال میں بامراد نہ ہوں گے بلکہ ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (٢٦٥)

وتثبیت کا مفہوم

"تَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ" تثبیت کے معنی مضبوط کرنے، جمانے اور مستحکم کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ اپنے مال خدا کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ اس مقصد سے بھی خرچ کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے نفس کی تربیت کریں کہ وہ دین کے احکام کی تعمیل میں اچھی طرح پختہ ہو جائے۔ مِنْ یہاں گویا تَثْبِيتًا کے مفعول پر داخل ہے۔

انفاق تربیت نفس کے لیے ریاضت ہے

جس طرح روزے سے مقصود نفس کی تربیت ہے کہ آدمی تقویٰ کے مطالبات پورے کرنے کے لیے اچھی طرح مضبوط ہو جائے اسی طرح انفاق بھی ایک ریاضت ہے جس سے انسان اپنے نفس پر قابو پاتا ہے اور خدا کے قرب کی راہ اس کے لیے آسان ہوتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ بات نکلی کہ تمام دوسری عبادات کی طرح انفاق کا حقیقی فائدہ بھی خدا کی طرف نہیں بلکہ بندے ہی کی طرف لوٹتا ہے، دوسری طرف یہ کہ سب سے اعلیٰ انفاق وہ ہے جو قحط کے زمانے میں ہو، جو غربت کے باوجود ہو، جو اپنی ذاتی ضروریات کو نظر انداز کر کے ہو، جو عزیز و محبوب مال میں سے ہو اور خاص طور پر ان حق داروں کے لیے ہو جن سے آدمی کا دل خوش نہ ہو اس لیے کہ یہی انفاق ہے جس سے نفس کو حق پر جمائے رکھنے کی حقیقی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو خواہشاتِ نفس کے خلاف چلانے میں جتنا مشاق ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کے لیے خدا کا قرب حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

ربوۃ کی تحقیق

"ربوۃ" کے معنی بلند و مرتفع زمین کے ہیں۔ استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتفع ہونے کے ساتھ ساتھ مسطح اور ہموار ہونا بھی اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ قرآن میں اس کی صفت ایک دوسرے مقام میں ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِينٍ (٥٠ مومنون) آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلندی کے ساتھ ہمواری بھی اس کے لوازم میں سے ہے۔ بلند اور ہموار زمین کے لیے آب و ہوا کی خوشگواری ایک مسلّم شے ہے۔ اگر ایسی زمین پر باغ ہو تو اس کی بلندی ایک طرف تو اس کی خوش منظری کا باعث ہوتی ہے، دوسری طرف اس کو سیلاب وغیرہ سے محفوظ کرتی ہے۔ نیز ہموار زمین پر ہونے کے سبب سے اس کے لیے اس طرح پھسل کر فنا ہو جانے کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا جو ڈھلوان زمینوں کے باغوں اور فصلوں کے لیے ہوتا ہے، پھر آب و ہوا کی خوبی اس کی بارآوری کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر موسم سازگار رہا تو پوچھنا ہی کیا ہے اگر سازگار نہ ہوا جب بھی وہ پھل دے جاتا ہے۔

اس انفاق کی تمثیل جو رضائے الٰہی کے لیے ہو

یہ اوپر والے گروہ کے بالمقابل ان لوگوں کے انفاق کی تمثیل ہے جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے نفس کی تربیت کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ فرمایا یہ لوگ بلاشبہ اپنے انفاق کا اجر پائیں گے، انھوں

نے بہہ جانے والی زمین پر باغ لگانے کے بجائے ایسی بلند، مسطح اور اچھی آب و ہوا والی زمین پر اپنا باغ لگایا ہے کہ بارش ہو تو اس کو برباد کرنے کے بجائے اس کی بارآوری کو دوگنا کر دیتی ہے اور اگر بارش نہ ہو تو ہلکی پھوار بھی آب و ہوا کی خوبی کی وجہ سے اس کے لیے کفایت کر جاتی ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ تسکین و تسلی کے لیے ہے۔ یعنی اللہ کے نیک بندے اس کی رضا جوئی اور اپنے نفس کی تربیت کے لیے جو ریاض کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں ہے، وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے ہر بندے کو اس کی محنت اور اس کے ایثار کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (۲۶۶)

باغ کے معاملے میں اہل عرب کا ذوق

جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ یہ عرب کے تصور کے مطابق ایک اچھے باغ کی تصویر ہے۔ ان کے ہاں اچھے باغ کا تصور یہ ہے کہ اس کے کناروں کناروں کھجوروں کے درخت ہوں، بیچ میں انگور کی بیلیں ہوں، مناسب مواقع سے مختلف فصلوں کی کاشت کے لیے قطعات ہوں، باغ بلندی پر ہو، اس کے نیچے نہر بہہ رہی ہو جس کی نالیاں باغ کے اندر دوڑا دی گئی ہوں۔

قرآن نے دوسری جگہ ایک باغ کی تصویر اس طرح کھینچی ہے جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا (کہف ۳۲-۳۳) (ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ بنائے، اور ان کو گھیر دیا کھجوروں سے اور ان کے درمیان کھیتی بھی رکھی، دونوں باغ خوب پھل لائے، ذرا کمی نہ کی، اور ہم نے ان کے درمیان ایک نہر جاری کی) اس سے معلوم ہوا کہ باغ کے کناروں پر کھجوروں کے درخت ہوتے تھے تاکہ ان سے پھل بھی حاصل ہو سکے، گرمی، لُو، بادِ تند اور تمازتِ آفتاب سے باغ محفوظ بھی رہ سکے اور باغ کی رونق میں بھی اضافہ ہو سکے۔ پھر بیچ بیچ میں انگور اور دوسرے پھل دار درخت بھی لگائے جاتے اور مناسب ٹکڑوں میں مختلف فصلوں کی کاشت بھی ہوتی۔ زیرِ بحث آیت میں لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ سے اسی آخری چیز کی طرف اشارہ ہے۔ ہم ایک دوسرے مقام میں یہ بات وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ عربی میں ثمرات کا لفظ صرف میوہ جات کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ غلہ جات بھی اس میں شامل ہیں۔

لفظ اعصار کی تحقیق

اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ۔ اعصار کے معنی گردباد اور بگولے کے ہیں۔ اس کے ساتھ جس آگ کا ذکر ہے وہ ہماری معروف آگ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد سموم اور لُو ہے جو بسا اوقات گردباد کے اندر پائی جاتی ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو باغ اس کی زد میں آجاتا ہے وہ بالکل جھلس کے رہ جاتا ہے۔

اوپر ریاکاری، احسان داری اور ایذارسانی کی آفتوں سے اپنے انفاق کو برباد کرنے والوں کی تمثیل

اوپر والی تمثیل کی مزید وضاحت

سنائی ہے۔ یہ تمثیل اس کی مزید وضاحت ہے۔ اس میں یہ دکھایا ہے کہ اس طرح انفاق کرنے والے عین اس وقت اپنی امیدوں کے باغ کی بربادی کا حسرت انگیز منظر دیکھیں گے جب وہ اس کے سب سے زیادہ محتاج ہوں گے اس لیے کہ اس وقت ان کے لیے سعی و عمل کے دروازے بند ہو چکیں گے۔

یہ تمثیل ایک ایسے شخص کی ہے جس نے انگوروں اور کھجوروں کا باغ لگایا، اس باغ کے نیچے نہر جاری تھی جو اس کی شادابی کی ضامن تھی۔ باغ میں دوسرے مختلف قسم کے پھل بھی تھے اور اس سے ہر قسم کی اجناس بھی حاصل ہوتی تھیں۔ باغ کا مالک بوڑھا ہو گیا اور اس کے بچے سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اسی دوران میں ایک روز سموم کا ایک بگولا اس باغ پر گزرا اور سارا باغ تباہ ہو کر رہ گیا۔ فرمایا کہ یہی حال آخرت میں ان لوگوں کا ہو گا جو اپنے انفاق کو برباد کرنے والی آفتوں سے نہیں بچاتے۔ ان کے خرمن کے لیے بجلی خود ان کی آستینوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہے اور وہ ٹھیک اس وقت ظاہر ہو گی جب ان کے لیے کھو کر پھر پانے کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ (۲۶۷)

طیبات کا مفہوم

مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (اپنی کمائی کے پاکیزہ حصے میں سے) میں طیبات کا لفظ بیک وقت دو باتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنی کمائی میں سے وہی مال خرچ کرو جو پاکیزہ طریقہ سے آیا ہو، غلط یا مشتبہ طریقہ سے نہ آیا ہو۔ دوسری یہ کہ مال بجائے خود اچھا ہو، بے وقعت، گھٹیا اور نکما نہ ہو۔ غلط طریقہ سے آئے ہوئے یا نکمے مال سے نہ تو خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ نفس کی وہ تربیت ہو سکتی جس کا ذکر اوپر تثبیت کے لفظ سے ہوا ہے۔

' وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ' کا علیحدہ ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ ' مَا كَسَبْتُمْ ' والے ٹکڑے سے مراد وہ مال ہے جو تجارت وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ زمین کی پیداوار کے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پیداوار پر زکوٰۃ کا نظام دوسرے اموال سے بالکل مختلف ہے۔

مال خبیث کا انفاق قبول نہیں ہوتا

' وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ ' میں ناپاک اور گھٹیا مال سے بچنے کی غایت درجہ تاکید ہے جس طرح ' لَا تَقْرَبُوْا ' کا لفظ ہے کہ فلاں چیز کے پاس بھی نہ پھٹکو، اسی طرح ' لَا تَيَمَّمُوْا ' کا مفہوم یہ ہے کہ برے مال کے دینے کا تو ارادہ بھی نہ کرو۔ پھر برے مال کی وضاحت بھی فرما دی کہ اس سے مراد اس طرح کا مال ہے جو خدا کی راہ میں دینے کے لیے تو تیار ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو آنکھیں میچے اور دل پر جبر کیے بغیر نہ لے سکو۔ جس چیز کو آدمی اپنے لیے پسند نہ کر سکے وہ خدا کو پیش کرنا، درآں حالیکہ سب کچھ اسی کا بخشا ہوا ہے انتہائی دنائت کی بات ہے اور اس سے خدا کی خوشنودی یا نفس کی تربیت حاصل ہونا تو الگ رہا اس سے مزید دوری و مہجوری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

غنی اور حمید کی وضاحت

خدا، غنی و حمید ہے یعنی اللہ کسی کے مال اور کسی کی خیرات کا محتاج نہیں، وہ اگر لوگوں سے یہ چاہتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کریں تو اس لیے نہیں کہ اس کے خزانے میں کمی ہے بلکہ اس سے لوگوں کی وفاداری کا امتحان مقصود ہے کہ دیکھے کہ لوگ اس کے بخشے ہوئے مال کو جب خود اس کو دینے کا وقت آتا ہے تو کس طرح دیتے ہیں۔ پھر غنی کے ساتھ حمید کی صفت لگائی ہے۔ حمید کے معنی ہیں وہ ذات جو سزاوار حمد و تعریف کاموں کا منبع ہے۔ یعنی سب سے بے نیاز ہونے کے ساتھ اس کی ذات ستودہ صفات ہے، اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے اور سب اس سے فیضیاب ہوتے ہیں، نیک بھی اور بد بھی۔

اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَ یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَ فَضۡلًا ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ (۲۶۸)

فحشاء سے مراد

فحشاء کے معنی کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کے ہیں۔ قرآن میں اس سے زنا، لواطت اور عریانی وغیرہ جیسے کھلے جرائم کو تعبیر کیا گیا ہے۔ امر کا لفظ جس طرح حکم دینے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح مشورہ دینے اور سمجھانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تحقیق اس کی ہم دوسری جگہ بیان کر آئے ہیں۔

انفاق کی راہ کی مزاحمتیں

یہ ان مزاحمتوں کی طرف اشارہ ہے جو شیطان اور اس کی ذریات کی طرف سے انفاق کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ آدمی جب کسی نیک کام میں خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان اور اس کے ایجنٹ اس کو دو طرح سے اس کے ارادے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تو مستقبل کے موہوم خطرات سے اس کو ڈراتے ہیں کہ فلاں اور فلاں مشکل کام اس کے آگے پڑے ہیں اس وجہ سے وہ اپنے ہاتھ روکے رکھے، ورنہ سخت دشواریوں میں پھنس جائے گا۔ دوسرے اس کو عیاشی، مے نوشی، سینمابینی اور اسراف و تبذیر کی دوسری لتوں میں پھنساتے ہیں تاکہ کسی اعلیٰ مقصد میں خرچ کرنے کے لیے کوئی گنجائش اس کے پاس باقی ہی نہ رہ جائے۔ شیطان کا فتنہ بڑا ہی سخت و شدید ہے۔ جو لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اپنی بدمستیوں میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں میں سے کسی کا حق ادا کرنے کے قابل رہ ہی نہیں جاتے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں جہاں انفاق کا حکم دیا ہے وہاں شیطان کے اس ہتھکنڈے سے بچتے رہنے کی خاص طور پر تاکید فرمائی ہے۔

وَ اٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّہٗ وَ الۡمِسۡکِیۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِیۡلِ وَ لَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِیۡرًا ۔ اِنَّ الۡمُبَذِّرِیۡنَ کَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّیٰطِیۡنِ ؕ وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوۡرًا ۔ (۲۶-۲۷ - بنی اسرائیل)

قرابت مند اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور اپنے مال کو عیاشیوں میں نہ اڑاؤ، بے شک اس طرح اپنے مال کو اڑانے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔

بعینہٖ یہی مضمون اسی طرح کے سیاق و سباق کے ساتھ آل عمران کی آیات ۱۳۴، ۱۳۵ میں بیان ہوا ہے۔ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَ فَضۡلًا ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ۔ مغفرت، یہاں فحشاء کے مقابل میں ہے اور فضل کا لفظ فقر کے مقابل میں ہے۔ یعنی شیطان تو تمہیں اللہ کی راہ میں انفاق کے بجائے نفس کی راہ میں فضول خرچی

اور عیاشی کی راہ سجھاتا ہے تاکہ تمہیں سیدھے جہنم میں لے جائے لیکن اللہ اپنی راہ میں خرچ کی دعوت دے کر تمہیں مغفرت اور جنت کی طرف بلاتا ہے۔ اسی طرح شیطان تمہیں فقر کے ہوّے سے ڈرا کر تمہارے دل بٹھاتا ہے لیکن اللہ تم سے اس انفاق کے عوض میں دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے بے پایاں فضل و انعام کا وعدہ فرماتا ہے۔ اللہ بڑا سمائی رکھنے والا اور تمہارے ایک ایک عمل سے واقف ہے۔ نہ اس کے پاس دینے کے لیے کمی ہے اور نہ وہ تمہارے راہِ خدا میں دیے ہوئے کسی پیسے دھیلے سے بے خبر ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲۶۹)

انفاق حکمت کے خزانے کی کلید ہے

لفظ حکمت کی تشریح ہم اسی سورہ کی آیت ۱۵۱ کے تحت کر چکے ہیں۔ یہاں اس کا دہرانا باعثِ طوالت ہوگا۔ البتہ اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کی اصل روح ایمان اور عمل کی وہ پختگی ہے جس کی بنیاد گہری بصیرت پر ہو۔ جس کو یہ چیز حاصل ہوتی ہے وہ اپنا خزانہ اس دنیائے فانی میں نہیں جمع کرتا بلکہ اپنے خدا کے پاس جمع کرتا ہے۔ وہ شیطان کے ڈراووں سے نہیں ڈرتا بلکہ اپنے پروردگار کے وعدوں پر اعتماد کرتا ہے اور اس دنیا کے خزف ریزے نہیں جمع کرتا بلکہ ان کے بدلے میں حکمت کے خزانے کا طالب بنتا ہے اور یہ حکمت کا خزانہ بہت بڑی چیز ہے۔ اتنی بڑی کہ دنیا کا کوئی خزانہ بھی اس کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ یہ خزانہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ یعنی اس کو دیتا ہے جو اس خزانے کے پانے کا استحقاق پیدا کرتے ہیں اس لیے کہ اللہ کا کوئی چاہنا بھی حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کی سنّت یہ ہے کہ جو اس دنیائے فانی کی لذتوں پر فریفتہ ہونے کے بجائے خدا کی مغفرت اور اس کے فضل کے حصول کے لیے اپنے مال لٹاتے ہیں وہ اس کے صلے میں اپنے دل کے خزانے حکمت کے لعل و گہر سے بھرتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ یہ بات ہر ایک کے سمجھنے کی نہیں ہے۔ اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ یعنی جن کی عقل حکمت کے نور سے منوّر ہے۔ اس دنیا کی نقد لذتوں کو چھوڑ کر ایک نادیدہ عالم کی کامرانی کے لیے اپنی کمائی کو لٹانا انھی لوگوں کا حوصلہ ہو سکتا ہے جن کو حکمت سے بہرہ وافر ملا ہو۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۲۷۰)

'نذر' کا مفہوم

'نذر' کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی منت مانے کہ اگر میری فلاں مراد پوری ہو گئی تو میں فلاں عبادت یا ریاضت یا اتنا صدقہ کروں گا۔ اسلام میں، جیسا کہ احادیث سے واضح ہے، منت ماننے کو مستحسن نہیں قرار دیا گیا ہے لیکن کوئی شخص اگر اس طرح کی منت مان بیٹھے اور اس میں کسی شرعی قباحت کا کوئی پہلو نہ ہو تو اس کو پورا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک قسم کا عہد ہے جو منت ماننے والا اپنے رب سے کر رہا ہے اور عہد چھوٹا ہو یا بڑا اگر خلافِ شریعت نہیں ہے تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے اس لیے کہ خدا کے ہاں ہر عہد سے متعلق، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، پرسش ہونی ہے۔ ہم سورۂ مائدہ میں بتائیں گے کہ تمام شریعت

اور تمام اخلاق کی بنیاد عہد ہی پر ہے اس وجہ سے اسلام نے اس پہلو میں کسی ڈھیل کو گوارا نہیں کیا ہے۔

'فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ' یہ ٹکڑا شرط کے جواب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی جو شخص خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرتا ہے یا اس کے لیے کوئی منت مانتا ہے تو وہ یہ اطمینان رکھے کہ خدا اس کی خیرات اور اس کی نذر ہر چیز کو اچھی طرح جانتا ہے۔ 'جانتا ہے' سے مقصود اس کا لازم ہے یعنی جب وہ جانتا ہے تو لازماً وہ اس کا اپنے وعدے کے مطابق صلہ بھی دے گا۔ زبان کا یہ اسلوب عربی زبان اور قرآن میں بہت عام ہے۔

'وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ' ظالم سے مراد یہاں خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں یعنی وہ لوگ جو یا تو دولتِ دنیا ہی کو معبود بنائے بیٹھے ہیں، خدا کی راہ میں سرے سے خرچ کرتے ہی نہیں یا خرچ کرتے ہیں تو ریا، احسان داری اور دل آزاری سے اس کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگ بدقسمت ہیں، ان کا سارا اعتماد انفاق و ایثار اور خدا کے فضل و رحمت کے بجائے اپنے مال اور اپنے جھوٹے معبودوں پر ہے، یہ ان پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں، حالانکہ خدا کے ہاں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۷۱)

علانیہ اور پوشیدہ انفاق کے درجے

یہاں چونکہ زیر بحث عام صدقات و خیرات ہیں، صدقاتِ واجبہ نہیں ہیں جو علانیہ دیے جاتے ہیں، اس وجہ سے ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو پوشیدہ طور پر دینا بہتر ہے یا علانیہ۔ قرآن نے یہ اس سوال کا جواب دیا ہے کہ اگر ظاہر کر کے دو تو یہ بھی اچھا ہے، اس لیے کہ اس کے بھی بعض پہلو مفید ہیں، مثلاً یہ کہ اس سے دوسروں کو بھی انفاق کی ترغیب ہوتی ہے، خاص طور پر ان مواقع میں، جب کسی اجتماعی مہم کے لیے لوگوں کو ابھارنا اور شوق دلانا ہو، لیکن جب اس طرح کے حالات نہ ہوں تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ پوشیدہ طور پر غریبوں کو دے دو تاکہ ریا و نمائش کے فتنہ سے بھی محفوظ رہ سکو اور خوددار حاجت مندوں کی خودداری کی لاج بھی قائم رہ سکے۔ یہاں 'يُكَفِّرُ عَنْكُمْ' کا عطف 'فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ' کے مفہوم پر ہے۔ یعنی اس پوشیدہ انفاق کا اجر بھی سوا ملے گا اور یہ تمہارے دامن سے گناہوں کو جھاڑنے میں بھی زیادہ کارگر ہوگا۔ پھر فرمایا کہ پوشیدہ اور علانیہ کا مسئلہ تمہارے لحاظ سے ہے۔ خدا سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں، تم جو کچھ بھی کرو گے جہاں بھی کرو گے، جس جگہ بھی کرو گے، خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (۲۷۲)

خبر کے اسلوب میں انشائیہ جملہ

اس آیت میں کوئی خاص لفظ تحقیق طلب نہیں ہے صرف 'وَمَا تُنْفِقُوْنَ' الآیہ کے اسلوب کے باب میں کچھ تردد سا ہے۔ مجھے بار بار خیال ہوتا ہے کہ یہ خبر کے اسلوب میں انشائیہ جملہ ہے۔ عربی زبان میں یہ طریقہ معروف ہے۔ قرآن میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں کہ امر یا نہی کے مضمون کو ان مواقع میں خبریہ اسلوب

میں کر دیتے ہیں جب مخاطب کو کوئی بات شفقت اور التفاتِ خاص کے ساتھ سمجھانی ہو۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ کیا ہے۔ پچھلوں میں سے بھی بعض لوگوں نے اس کو اختیار کیا ہے۔ لیکن مجھے اس پر پورا پورا جزم نہیں ہے۔ اہلِ علم اس کو نگاہ میں رکھیں۔

پوری آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بیک وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بطریقِ التفات مخاطب فرمایا ہے اور عام مسلمانوں کو بھی۔

ہدایت وضلالت کے باب میں سنت اللہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اس سنت اللہ کی یاد دہانی کی گئی ہے جو ہدایت وضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اور جس کا ذکر اس سورہ میں بھی ایک سے زیادہ مقامات میں ہوا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی مختلف اسلوبوں اور شکلوں میں ہوا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ نبی کی ذمہ داری لوگوں کی ہدایت کے معاملے میں صرف یہ ہے کہ وہ ان کو اللہ کی تعلیمات و ہدایات سے اچھی طرح آگاہ کر دے سو اگر یہ کام اس نے کر دیا تو اس کا فرض پورا ہو گیا۔ یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ لوگ ان تعلیمات و ہدایات کو قبول بھی کر لیں۔ ان کو قبول کرنے کی توفیق دینا اللہ کا کام ہے اور وہ یہ توفیق ان کو دیتا ہے جن کو چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس 'چاہنے' کے لیے خود اس کا مقرر کیا ہوا ایک ضابطہ ہے جس کی وضاحت ہم آیات ۲۶-۲۷ کے تحت کر چکے ہیں۔

مقصود اس سنت اللہ کی طرف اشارہ کرنے سے یہ ہے کہ در باب انفاق جو باتیں بتانی تھیں وہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفصیل کے ساتھ بتا دیں۔ آپ کا فرض ادا ہو گیا۔ اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ ان کو قبول کریں یا رد کریں۔ آپ اس چیز کے لیے پریشان نہ ہوں۔ اگر لوگ ان کی قدر نہ کریں گے تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتیں گے۔

خدا کو دینا اپنے لیے جمع کرنا ہے

مسلمانوں کو خطاب کر کے آخری تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ جو مال بھی تم خدا کی راہ میں خرچ کرو گے یہ نہ سمجھو کہ یہ کسی دوسرے کو دے رہے ہو بلکہ یہ تم اپنے ہی لیے جمع کر رہے ہو جو تمہیں سات سو گنے تک بڑھ کر ایک دن واپس ملنا ہے۔ بس یہ شرط ہے کہ تمہارا یہ خرچ کرنا اللہ کی خوشنودی کے سوا کسی اور مقصد سے نہ ہو۔ اللہ کی خوشنودی کے لیے جو کچھ خرچ کرو گے سب تمہارا پورا کر دیا جائے گا اس میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۷۳)

'لِلْفُقَرَآءِ' سے پہلے مبتدا محذوف ہے۔ یعنی یہ صدقہ و انفاق جس کی دعوت دی جا رہی ہے ان فقرا کے لیے ہے جن کی صفات یہ یہ ہیں۔ مبتدا کے حذف کر دینے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ قرینہ خود اس پر دلیل ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے صدقے کے اخفا کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہو رہا ہے۔ گویا آیت نے انگلی اٹھا

کر محتاجوں کی طرف تو اشارہ کر دیا لیکن یہ بات کہ کس کام کے لیے اشارہ کیا گیا ہے، مخاطب کے فہم پر چھوڑ دی ہے۔ اس طرح صدقہ کے اخفا کے ساتھ ساتھ محتاجوں کی اس خودداری کی بھی آن محفوظ رہ گئی جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ یعنی کسی دینی مقصد نے ان کو کسبِ معاش کی جدوجہد سے روک رکھا ہے۔ یہ لوگ تجارت وغیرہ کے لیے ادھر ادھر سفر نہیں کر سکتے۔ ضَرْبٌ فِی الْاَرْضِ کے معنی سفر کرنے کے ہیں، مثلاً فرمایا ہے وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔ مزمل (اور کچھ دوسرے ایسے بھی ہوں گے جو فضلِ الٰہی کی تلاش میں زمین میں سفر کریں گے)

یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ، جاہل کے معنی یہاں بے خبر کے ہیں اور تَعَفُّفٌ کے معنی خودداری کے ہیں۔ یعنی یہ لوگ خودداری کے سبب سے کسی کے آگے نہ تو دستِ سوال دراز کرتے نہ اپنے فقروفاقہ کا اظہار کرتے، اس وجہ سے جو شخص ان کے حالات سے بے خبر ہے ان کو مستغنی خیال کرتا ہے۔

تَعْرِفُھُمْ بِسِیْمٰھُمْ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا، سیما کے معنی علامت اور ہیئت کے ہیں جیسا کہ فرمایا ہے سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (ان کی پہچان، ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے)

لَا یَسْـَٔلُوْنَ الآیۃ کا مفہوم

اِلحاف کے معنی لپٹ کر سوال کرنے کے ہیں۔ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے) میں اصل مقصود سوال کرنے کی نفی ہے، اِلْحَافًا کی قید اس کے ساتھ صرف سوال کرنے والوں کی عام حالت کی تصویر اور اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے لگائی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے کہ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ (اپنی اولاد کو فقر کے اندیشے سے قتل نہ کرو) اس میں ممانعت درحقیقت قتل کی ہے، خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ کی قید محض اس کے گھنونے پن کو واضح تر کرنے کے لیے ہے۔ یا فرمایا ہے کہ لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً (اور سود نہ کھاؤ دوگنا چوگنا کر کے) اس میں ممانعت دراصل سود کھانے کی ہے۔ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کی قید محض اس کی کراہت کو نمایاں کرنے کے لیے ہے، یا فرمایا ہے وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ قیدِ نکاح میں آنا چاہتی ہیں) اس میں بھی مقصود مطلق اکراہ کی ممانعت ہے، اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی قید محض اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے ہے۔

اسی طرح لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا میں مقصود ان کے سوال کرنے کی نفی ہے۔ اِلحافًا کی قید محض سوال کرنے والوں کی عام حالت کے اظہار کے لیے ہے کہ بھلا جو لوگ اتنے خوددار ہیں کہ جو ان کے حال سے بے خبر ہو وہ ان کو غنی سمجھتا ہے، وہ گداگروں اور بھک منگوں کی طرح کی حرکت کس طرح کر سکتے ہیں؟ چنانچہ ان کی اسی خودداری اور پردہ داری کی وجہ سے قرآن نے اہلِ انفاق کو ان کا سراغ دینے کے لیے ان

کی پہچان یہ بتائی ہے کہ ان کو صرف چہرے بشرے سے پہچان کر ڈھونڈھنے کی کوشش کرو اور ان کے پاس خود پہنچو، یہ توقع نہ رکھو کہ عام گداگروں کی طرح یہ لوگ تمھارے پیچھے پیچھے بھاگیں گے۔

قرآن کے زمانہ نزول میں اس آیت کے بہترین مصداق اہلِ صفہ تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ احادیث میں ان کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں وہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے ان اشارات کے مطابق ہیں۔ قرآن نے ان آیات میں وہ نمونہ بھی دکھا دیا ہے جو با ایمان فقراء کا ہونا چاہیے اور اس طریقے کی طرف بھی رہنمائی کر دی ہے جو ان فقراء کے معاملے میں با ایمان اغنیا کو اختیار کرنا چاہیے۔ آج کے فقرا اور آج کے اغنیا اس آئینہ میں اپنی شکلیں دیکھیں۔

آخر میں فرمایا کہ "جو تم خرچ کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہے۔" یعنی ایسے خوددار سائلوں کو تلاش کر کے چپ چپاتے ان کی حاجت روائی کرنا خلق سے چھپا رہے گا لیکن خالق سے چھپا نہیں رہے گا، وہ تمھارے ہر انفاق سے باخبر ہے اور وہ اس کا بھرپور صلہ دے گا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (٢٧٤)

اس آیت میں رات اور دن، پوشیدہ اور علانیہ میں جو مناسبت اور تقابل ہے وہ ملحوظ رہے، سارے اوقات بھی سب احاطہ میں آگئے ہیں، اور حالتیں بھی دونوں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ نیز اہلِ ایمان کے اندر انفاق کے لیے جو جوش ہونا چاہیے اسلوبِ کلام سے وہ خود بخود ابلا پڑ رہا ہے۔ علاوہ بریں انفاق کا خدا کے ہاں جو صلہ ہے وہ بھی پورا پورا بیان ہو گیا ہے۔ یہ آیت انفاق کے سلسلے میں خاتمۂ باب کی حیثیت رکھتی ہے۔

٨٦۔ آگے کا مضمون ___ آیات ٢٧٥-٢٨٣

انفاق کے مضمون کے بعد اب آگے سود کی حرمت کا بیان ہوا۔ سود کا تعلق چونکہ قرض سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرض کے لین دین سے متعلق جو ضروری ہدایات ہیں اسی سلسلے میں وہ بھی دی گئیں۔ رہن بھی اسی سے تعلق رکھنے والی چیز ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ اس کا حکم بھی بیان ہوا۔

سود کے متعلق یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ یہ انفاق کا بالکل ضد ہے۔ انفاق کی محرک بلند ہمتی، ہمدردی، فیاضی، ایثار، رحم دلی ہے اور سود کی محرک بزدلی، خود غرضی، سنگ دلی اور دوسروں کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے۔ انفاق ضرورت مندوں کو سہارا دینا چاہتا ہے اور سود گرے ہوؤں کا خون چوسنا چاہتا ہے۔ دونوں میں نسبت ضدین کی ہے اور فطرت کا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت اس وقت تک اچھی طرح واضح نہیں ہوتی جب تک اس کے ساتھ اس کے ضد کا بیان نہ ہو۔ اسی اصول کی بنا پر قرآن نے

اکثر چیزوں کے بیان میں یہ طریقہ ملحوظ رکھا ہے کہ ضدین کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے۔ مثلاً اہلِ ایمان کا بیان ہے تو اس کے ساتھ اہلِ کفر کا بھی بیان ہوا ہے۔ جنّت کا ذکر آیا ہے تو اکثر اس کے ساتھ دوزخ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ یہ چیز قرآن کے نظم کی ایک خصوصیت بن گئی ہے۔ اسی اصول پر قرآن نے انفاق کے ساتھ اکثر یا تو بخل کا ذکر کیا ہے یا سود خواری کا۔ یہاں اس کا ذکر انفاق کے بعد آیا ہے۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۲۷ میں انفاق کے بیان سے پہلے ہے۔ لیکن مقصود دونوں جگہ ایک ہی ہے کہ ایک کی تاریکی دوسرے کی روشنی کو اور ایک کا جمال دوسرے کی بدصورتی کو بے نقاب کر سکے۔ اس نظمِ کلام سے حکمت کے بعض ایسے گوشے آشکارا ہو جاتے ہیں جو کسی اور طریقے سے آشکارا نہیں ہو سکتے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ
۲۷۵-۲۸۳ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا
وقف لازم الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ
جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ
اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧٥﴾
يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ
كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٧٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٧﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا
اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ
تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٩﴾
وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ

إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ
ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ ع ٣٨
آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُبْ
بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ
اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ
وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا
أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ
وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ ۖ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ
فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا
فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ
وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ
عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَنْ
تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ
وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِنْ تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَ
يُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ
وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ
بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ۗ

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع ۳۹

ترجمۂ آیت ۲۷۵-۲۸۳

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کے مانند جس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے اور حال یہ ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا اور سود کو حرام۔ تو جس کو اللہ کی تنبیہہ پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لیے ہے۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو اب اس کے مرتکب ہوں تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا، اور اللہ ناشکروں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے بھلے کام کیے، نماز کا اہتمام کیا، زکوٰۃ ادا کی، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، نہ ان کے لیے کوئی اندیشہ ہوگا نہ ان کو کوئی غم لاحق ہوگا۔ ۲۷۵-۲۷۷

اے ایمان والو، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود تمھارا باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کا تمھیں حق ہے۔ نہ تم کسی کا حق مارو، نہ تمھارا حق مارا جائے۔ اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو فراخی تک اس کو مہلت دو اور بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو جو اس نے کمائی کی ہے پوری پوری مل جائے گی اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ ۲۷۸-۲۸۱

اے ایمان والو، جب تم کسی معیّن مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو اور اس کو لکھے تمھارے مابین کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ۔ اور جسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ جس طرح اللہ نے اس کو سکھایا اس طرح وہ دوسروں کے لیے لکھنے کے کام آئے اور یہ دستاویز لکھوائے وہ جس پر حق عاید ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ سے، جو اس کا رب ہے، ڈرے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ، جس پر حق عاید ہوتا ہے، نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ ٹھہرا لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں سہی۔ یہ گواہ تمھارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں۔ دو عورتیں اس لیے کہ ایک بھول جائے گی تو دوسری یاد دلا دے گی۔ اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں۔ اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مدت تک کے لیے اس کو لکھنے میں تساہل نہ برتو۔ یہ ہدایات اللہ کے نزدیک زیادہ قرینِ عدل، گواہی کو زیادہ ٹھیک رکھنے والی اور اس امر کے زیادہ قرینِ قیاس ہیں کہ تم شبہات میں نہ پڑو۔ ہاں اگر معاملہ دست بدست لین دین اور دست گرداں نوعیت کا ہو تب اس کے نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور تم کوئی معاملہ خرید و فروخت کا کرو تو اس صورت میں بھی گواہ بنا لیا کرو۔ اور کاتب یا گواہ کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمھاری بڑی پاٹدار نافرمانی ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ۲۸۲

اور اگر تم سفر میں ہو اور کاتب نہ مل سکے تو رہن قبضہ میں کرا دو، پس اگر ایک دوسرے پر اعتماد کی صورت نکل آئے تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ اس کی امانت ادا کرے

اور اللہ سے جو اس کا رب ہے ڈرے۔ اور شہادت کو چھپاؤ مت۔ جو اس کو چھپائے تو وہ یاد رکھے کہ اس کا دل گنہگار ہے، اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو جاننے والا ہے۔ ۲۸۳

۸۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ
مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۷۵)

لفظ ربٰو کا مفہوم

'ربا، یربو، ربآء' کے معنی بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں۔ اسی سے 'ربٰو' ہے جس سے مراد وہ معین اضافہ ہوتا ہے جو ایک قرض دینے والا مجرد مہلت کے عوض اپنے مقروض سے اپنی اصل رقم پر وصول کرتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں یہ اصطلاح مذکورہ مفہوم کے لیے مشہور رہی ہے، اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں۔ لیکن اس کی اصل حقیقت یہی ہے کہ قرض دینے والا قرضدار سے ایک معین شرح بہ صرف اس حق کی بنا پر اپنے دیے ہوئے روپے کا منافع وصول کرے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لیے اس کو روپے کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ اس امر کو اس کی حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں ہے کہ قرض کسی غریب و نادار کو دیا گیا ہے یا کسی امیر و تاجدار کو اور نہ اس بات سے اس میں کوئی فرق واقع ہوتا کہ قرض کسی میت کی تجہیز و تکفین کے لیے دیا گیا ہے یا کسی رفاہی اسکیم کے لیے دیا گیا ہے، یا تجارت، زراعت اور صناعت کے کسی انفرادی یا اجتماعی منصوبے کے لیے دیا گیا ہے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں ربٰو کی اصطلاح کا جو مفہوم مسلم رہا ہے اس میں ان ظاہری اختلافات سے سرمو فرق واقع نہیں ہوتا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مقصد قرض یا قرضدار کی نوعیت و حیثیت کی تبدیلی ربٰو کی عرفی حیثیت کو بدل دیتی ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ خود قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی پوری تردید ہو رہی ہے۔

تخبط کی تحقیق

'تخبط' کا لفظ 'خبط اللیل' سے ہے جس کے معنی رات کی تاریکی میں بھٹکنے کے ہیں۔ خابط اللیل اس شخص کو کہیں گے جسے داہنے بائیں کا کچھ ہوش نہ ہو، بس یوں ہی ہرزہ گردی کر رہا ہو۔ اسی سے یخبط خبط عشواء کا محاورہ ان لوگوں کے لیے پیدا ہوا جو بصیرت سے بالکل محروم ہوں اور اندھے بھینسے کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہوں۔ اسی سے تَخَبَّطَهُ الشَّيْطٰنُ نکلا جس کے معنی ہیں مَسَّهُ الشَّيْطٰنُ بِخَبَلٍ اَوْ جُنُوْنٍ، اس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل اور دیوانہ بنا دیا۔

مسّ کے معنی

مَسّ کے اصل معنی چھونے کے ہیں۔ اس کا غالب استعمال کسی برائی، آفت اور دکھ کے پہنچنے اور لاحق ہونے کے لیے ہوتا ہے۔ ہم نے موقع کے لحاظ سے اس کا ترجمہ چھوت کیا ہے۔ جو لفظی بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ یوں تو دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا ہی کے اذن سے ہوتا ہے لیکن شیطان کو جن کاموں کے لیے مہلت ملی ہوئی ہے ان کی نسبت بعض اوقات اس کی طرف کر دی جاتی ہے۔ جیسے حضرت ایوبؑ کی دعا میں ہے اِنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۴۱ - ص (شیطان نے مجھے دکھ اور تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے) نیک بندوں پر تو ارواح خبیثہ کا اثر اس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ ان کو کوئی اذیت یا آزمائش پیش آجائے لیکن جن کی روحیں خود خبیث ہوتی ہیں، جس طرح ان کا قلب شیطان کی مٹھی میں ہوتا ہے اسی طرح کبھی کبھی ان کے عقل و دماغ سب پر شیطان کا تسلّط ہو جاتا ہے اور وہ ظاہر میں بھی بالکل پاگل ہو کر کپڑے پھاڑتے، گریبان چاک کرتے، منہ پر جھاگ لاتے اور پریشان حال، پراگندہ بال جدھر سینگ سمائے ادھر آوارہ گردی اور خاکبازی کرتے پھرتے ہیں۔

صاحب انفاق اور سود خوار کے ساتھ اللہ کے معاملے

اوپر اہل انفاق کے متعلق آپ پڑھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تربیت فرماتا ہے، ان کو علم اور عمل دونوں میں رسوخ و عزیمت عطا فرماتا ہے، ان کے انفاق میں برکت بخشتا ہے، ان کا کارساز بن کر ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے، ان کو حکمت کا لازوال خزانہ بخشتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آخرت میں ان کو لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ کے سرورِ ازلی و ابدی سے نوازے گا۔

اب یہ اس کے بالکل مخالف کردار رکھنے والوں یعنی سود خواروں کا بیان ہے۔ ان کی نسبت فرمایا کہ یہ جب روزِ قیامت کو اٹھیں گے تو بالکل اس طرح اٹھیں گے جس طرح وہ شخص اٹھا کرتا ہے جس پر کسی جنّات یا بھوت کا سایہ ہو، جس سے وہ بالکل مخبوط الحواس ہو رہا ہو۔ اس تشبیہ کی زیادہ وضاحت نہیں فرمائی ہے اس لیے کہ اس کے اجمال ہی میں ساری وضاحت موجود ہے۔ جس طرح قرآن میں ایک جگہ رُءُوسُ الشَّیَاطِیْنِ کی تشبیہ ہے جس کے الفاظ کو سن کر ہی دل پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، اسی طرح یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ کے الفاظ سے خود ہی وحشت زدگی اور پریشان حالی کی ایک ایسی تصویر سامنے آجاتی ہے جو کسی وضاحت کی محتاج نہیں رہ جاتی۔

آگے فرمایا کہ ان کی یہ حالت اس وجہ سے ہوگی کہ سود کی حرمت پر وہ اعتراض اٹھاتے تھے کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے تو پھر بیع کو اللہ نے حلال اور سود کو حرام کیوں ٹھہرایا، چونکہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو بالکل مخبوط الحواس ہو، جس کی عقل ماری گئی ہو اور شیطان نے جس کو اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو اس وجہ سے عمل اور جزا کی مشابہت کے قانون کے تحت، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (جو دنیا میں عقل اور دل کا اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا) ایسا شخص جب قیامت میں اٹھے گا تو پاگلوں اور دیوانوں کی طرح اٹھے گا۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کا موقع و محل

یہاں ان کے قول کا حوالہ دے کر اس کو نظر انداز کر دیا ہے، اس کی تردید نہیں کی ہے۔ اس لیے کہ اس قول کی لغویت اتنی واضح ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو بالکل پاگل ہو چکا ہو اور پاگلوں کی کسی بات کی تردید کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ ہمارے اہل تاویل نے عام طور پر وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کے ٹکڑے کو ان کی اس بات کی تردید کے معنی میں لیا ہے اور اسی پہلو سے اس کی تاویل کی ہے۔ اگرچہ اس بات کا بھی ایک محل ہے کیونکہ اللہ کا کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا بجائے خود اس امر کی بہت بڑی دلیل ہے کہ عقل و فطرت اور معاش و معاد کے نقطۂ نظر سے اس چیز کی حلت یا حرمت بالکل معقول ہے لیکن یہ دلیل صرف مومن کے لیے قابلِ اعتماد ہے، منکر کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس وجہ سے مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا الگ نہیں ہے بلکہ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا کے تحت ہی ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو ربٰو ہی کی طرح ہے، جب ایک تاجر اپنے سرمایہ پر نفع لیتا ہے تو ایک سرمایہ دار اگر اپنے سرمایہ کا نفع حاصل کرتا ہے تو آخر وہ مجرم کیوں ٹھہرے، پھر اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیوں ٹھہرایا؟ ہرچند یہ جملہ بشکل سوال نہیں ہے لیکن اس کے اندر وہی سوال یا اعتراض پوشیدہ ہے جو پہلے ٹکڑے کے اندر ہے۔

تاجر اور سود خوار کے سرمایہ میں فرق

اس اعتراض سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی کہ سود کو بیع پر قیاس کرنے والے پاگلوں کی نسل دنیا میں نئی نہیں ہے بلکہ بڑی پرانی ہے۔ قرآن نے اس قیاس کو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، لائق توجہ نہیں قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بداہتہً باطل اور قیاس کرنے والے کی دماغی خرابی کی دلیل ہے۔ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسے مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی لوگوں کو طلب ہوتی ہے، وہ محنت، زحمت اور خطرات مول لے کر اس مال کو ان لوگوں کے لیے قابلِ حصول بناتا ہے جو اپنی ذاتی کوشش سے اوّل تو آسانی سے اس کو حاصل نہیں کر سکتے تھے اور اگر حاصل کر سکتے تھے تو اس سے کہیں زیادہ قیمت پر جس قیمت پر تاجر نے ان کے لیے مہیا کر دیا۔ پھر تاجر اپنے سرمایہ اور مال کو کھلے بازار میں مقابلہ کے لیے پیش کرتا ہے اور اس کے لیے منافع کی شرح بازار کا اتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس اتار چڑھاؤ کے ہاتھوں بالکل دیوالیہ ہو کر رہ جائے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ نفع حاصل کرے۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں کہ وہ ایک بار ایک روپے کی چیز ایک روپے دو آنے یا چار آنے میں بیچ کر پھر اس روپے سے ایک دھیلے کا بھی کوئی نفع اس وقت تک نہیں کما سکتا جب تک اس کا وہ روپیہ تمام خطرات اور سارے اتار چڑھاؤ سے گزر کر پھر میدان میں نہ اترے اور معاشرے کی خدمت کر کے اپنے لیے استحقاق نہ پیدا کرے۔

بھلا بتایئے کیا نسبت ہے ایک تاجر کے اس جانباز، غیور اور خدمت گزار سرمایہ سے ایک سود خوار کے اس سنگ دل، بزدل، بے غیرت اور دشمنِ انسانیت سرمایہ کو جو جوکھم تو ایک بھی برداشت

کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن منافع بٹانے کے لیے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ سود خور کا سرمایہ دو بھیسوں میں ظاہر ہوتا ہے اور دونوں ہی میں وہ یکساں بزدل اور خونخوار ہے۔ ایک تو یہ سودی کاروبار کرنے والے بنیوں، پٹھانوں اور یہودیوں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، اس شکل میں تو اس کی خونخواری سے کسی کے لیے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ ایک بنیا یا پٹھان جب ایک مرتبہ اپنے جال میں کسی کو پھنسا پاتا ہے تو چاہے اس مظلوم کے جسم پر گوشت کی ایک بوٹی بھی باقی نہ رہ گئی ہو لیکن وہ اپنی ہر میعاد پر آکر اپنا ایک پونڈ گوشت کاٹ لے گا اور مدت العمر کی اس قطع و برید کے بعد بھی بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ نہ صرف بنیے کا اصل سرمایہ قرضدار پر لدا رہتا ہے بلکہ وہ اصل سے کئی گنا ہو کر اکاس بیل کی طرح مظلوم قرض دار کے گھر در، اس کے اثاث البیت اور اس کے زن و فرزند ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور خاندان کے خاندان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ بتایئے کس تاجر کے سرمایہ میں یہ سکت ہے کہ وہ کسی پر یہ ظلم ڈھا سکے؟ وہ تو زیادہ سے زیادہ اگر کر سکتا ہے تو یہ کہ بازار کے سارے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کر کے اگر موقع پائے تو اپنی ایک روپیہ کی چیز ڈیڑھ یا دو روپے میں بیچ لے اور وہ بھی ایک مرتبہ۔

سود خور کے سرمایہ کا دوسرا بھیس وہ ہے جس میں وہ رفاہی کاموں، اجتماعی منصوبوں اور ملکی اسکیموں کی سرپرستی کے نام سے اٹھتا ہے۔ اس زمانے میں بہت سے سادہ لوح اس بھیس میں اس کو بڑا معصوم سمجھتے ہیں لیکن غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس کی بزدلی اور خود غرضی کی فطرتِ بد اس کے اس جامے میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح پہلے بھیس میں موجود ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ فرض کیجیے ملک کی حکومت ملک کے کسی حصے کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے یا کسی اور خطرے سے بچانے کے لیے کوئی بڑا منصوبہ عمل میں لانا چاہتی ہے اور اس کے لیے پانچ یا سات فی صد کی شرح پر لوگوں سے قرض لیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حکومت کا منصوبہ کروڑوں روپے خرچ کرنے کے بعد کسی ارضی و سماوی آفت کی زد میں آکر تباہ ہو جائے۔ اب بتایئے کہ ملک نے تو بحیثیت مجموعی ایک شدید قسم کا نقصان اٹھایا لیکن جن سود خوروں نے اس کے لیے قرض دیے تھے نہ صرف ان کا سرمایہ محفوظ ہے بلکہ ایک معین شرح کے ساتھ اس کا سود بھی دمبدم اس میں اضافے پر اضافہ کیے چلا جا رہا ہے۔ آخر یہ قومی خدمت کی کون سی شکل ہوئی؟ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ پہلی صورت میں اور اس دوسری صورت میں حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ پہلی صورت میں سود خور کو صرف اس امر سے بحث ہے کہ اس کا سرمایہ محفوظ رہے اور منافع کا ایک پونڈ گوشت بلغیر کسی غل و غش کے فصل فصل پر اس کو ملتا رہے، چاہے قرض دار کی سات پشتیں فاقہ کرتی مر جائیں۔ اور اس صورت میں بھی اس کے سامنے یہی چیز ہے کہ اس کا اصل سرمایہ بے داغ محفوظ رہے، معین سود اس کے حساب میں جمع ہوتا رہے، رہا قوم کا مردہ تو وہ چاہے دوزخ میں جائے

یا بہشت میں۔

برعکس اس کے ایک تاجر کا سرمایہ قوم اور ملک کی خدمت کے لیے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ اگر حالات کے ردوبدل، بازار کے اتار چڑھاؤ، یا کسی اور سبب سے اس کو نقصان پہنچ جائے تو اس نقصان کو وہ اپنے ہی اوپر برداشت کرتا ہے۔ اس کے لیے ایک لمحہ کے واسطے بھی اس بات کا امکان نہیں ہوتا کہ وہ سود خور کے سرمائے کی طرح کسی کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھے اور دوسروں سے اپنا نفع وصول کرتا رہے۔ اگر اس کو سازگار سے سازگار حالات بھی میسر آجائیں تب بھی بہرحال اس کے منافع کی شرح پر بازار کا فیصلہ ناطق ہوتا ہے اور اس طرح جو کچھ وہ حاصل کرپاتا ہے در حقیقت وہ اس کا جائز حق المحنت ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاجر کے منافع کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تعبیر فرمایا ہے اور سُود خور کے سرمایہ کو، جیساکہ ہم سورۂ روم کی تفسیر میں واضح کریں گے، اس سانڈ سے تشبیہ دی ہے جو دوسروں کی چراگاہ میں چر کر فربہ ہو رہا ہو۔

سود خواروں کے لیے تنبیہ

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ الاٰیۃ۔ موعظت کے لفظ میں زجر و تنبیہ کا پہلو غالب ہے اس وجہ سے اس کی اصل روح کو پیش نظر رکھ کر ہم نے اس کا ترجمہ تنبیہ کیا ہے۔ اس کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے اس وجہ سے لفظ کے مفہوم کے لحاظ سے اس کے لیے فعل مذکر آیا ہے۔ 'مِنْ رَّبِّهٖ' کے الفاظ نے اس تنبیہ کے اندر ایک خاص زور پیدا کر دیا ہے۔ یعنی یہ تنبیہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے بلکہ یہ سب کے مالک و آقا کی طرف سے تنبیہ ہے اس وجہ سے اس کو سہل نہیں خیال کرنا چاہیے۔ 'فَلَهٗ مَا سَلَفَ' یعنی اس تنبیہ کے بعد جو سودی لین دین سے رک گیا، اس سے اس کے پچھلے لیے ہوئے سود کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اس قانون کا نفاذ اگر ماضی پر بھی اثر انداز ہوتا تو اس سے ناقابلِ حل مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ یعنی ایسے شخص سے اسلامی حکومت تو اس کے سابق سودوں پر کوئی گرفت نہیں کرے گی لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا سے بھی اس کو معافی مل گئی، بلکہ اس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے۔ خدا کے حوالے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کی پکڑ سے بچنے کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہے کہ آدمی سود نہ لے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے دل سے بھی سود کا ہر شائبہ نکل جائے۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس طرح کے لوگ آخرت سے بے خوف ہو کر نہ بیٹھ رہیں بلکہ جس حد تک بھی ہو سکے اپنے پچھلے مظالم کی تلافی کی کوشش کریں، اس لیے کہ یہ مظالم حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے ہیں اور حقوق العباد کا معاملہ خدا کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ یعنی اس واضح تنبیہ کے بعد بھی جو لوگ سودی کاروبار کریں گے وہ دوزخی ہیں اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے دائمی دوزخ کی سزا کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ان کا یہ رویہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ خدا کے اس حکم

کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی اگر جذبات کے غلبے کے سبب سے ہو جاتی ہے تو توبہ کے ذریعے سے اس کی اصلاح کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ توبہ سے غفلت کے باوجود اللہ تعالیٰ کسی کو معاف کر دے یا اس کے گناہوں کے بقدر اس کو سزا دے کر رہائی دے لیکن جب نہایت واضح تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی ایک شخص کسی حکم کی خلاف ورزی پر اصرار کیے چلا جا رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کے اس حکم کا منکر ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ ایمان کا بھی دعویٰ کرتا ہے تو یہ محض ایک منافقانہ قسم کی حرکت ہے جو اس عالم الغیب سے مخفی نہیں ہے جو دلوں کے تمام بھیدوں سے بخوبی واقف ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ یعنی ان کو جہنم کے اس دائمی عذاب میں جھونک دے گا جو کفار و منافقین کے لیے مقرر ہے۔

گناہ کا احاطہ دائمی عذاب کا موجب ہے

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ایک چیز تو ہے کسی جرم کا مرتکب ہونا اور ایک چیز ہے کسی جرم کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا۔ جو جرم اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے وہ مجرم کی زندگی کے کسی ایک ہی پہلو کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کی زندگی کا ہر پہلو اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ اس کا ظاہر، اس کا باطن، اس کا عقیدہ، اس کا عمل اور اس کا ایمان و اسلام سب اس جرم کی چھاپ قبول کر لیتا ہے۔ اس حالت کو قرآن نے 'احاطہ' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے دائمی عذابِ نار ہے۔ مثلاً ارشاد ہے۔ بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓئَتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ھُمۡ فِیۡھَا خٰلِدُوۡنَ (۸۱۔ بقرہ) (البتہ جس نے کوئی بدی کمائی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَ یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ ﴿﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (۲۷۶-۲۷۷)

'محق' کے معنی گھٹانے اور مٹانے کے ہیں۔ اسی سے 'محق اللہ الشیٔ' نکلا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے اس چیز کی برکت مٹا دی۔ 'ارباء' کے معنی بڑھانے اور زیادہ کرنے کے ہیں۔

سود کی بے برکتی اور صدقات کی برکت

مطلب یہ ہے کہ سود خور تو یہ سمجھتا ہے کہ سود سے سرمایہ بڑھتا اور خیرات سے گھٹتا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ یہ گھٹانا اور بڑھانا دنیوی زندگی کے محدود تصور کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کی مجموعی زندگی کے لحاظ سے ہے۔ جب اخروی زندگی کی صبح ہو گی تو سود خور دیکھے گا کہ دنیا کے بنک میں تو اس کے لاکھوں روپے جمع تھے لیکن خدا کے بنک میں اس کی ایک کوڑی بھی نہیں ہے، صرف حسرت و ندامت ہی اس کا سرمایہ ہے۔ برعکس اس کے خدا کی راہ میں انفاق کرنے والا جب اس زندگی میں آنکھ کھولے گا تو دیکھے گا کہ اس کے

خزف ریزوں کے عوض یہاں ابدی قدر و قیمت رکھنے والے جواہرات کے پہاڑ بنے ہوئے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ اس امر کی وضاحت بھی ہے کہ اس گھٹنے اور بڑھنے کا تعلق آخرت ہی کی زندگی سے ہے۔ مثلاً وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۳۹ - روم (اور جو مال تم سود کے لیے دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال میں پل کر بڑھے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور یہ جو تم زکوٰۃ دیتے ہو، اس کی رضا طلبی میں، تو یہی لوگ خدا کے ہاں بڑھانے والے ہیں)

احادیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

> ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کرتا ہے اور اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے لیتا ہے، پھر وہ اس کی تمہارے لیے اس طرح پرورش کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ تمہارا دیا ہوا ایک لقمہ خدا کے ہاں احد پہاڑ کی مانند بن جائے گا۔"

اگرچہ سود کے سرمایہ میں کوئی خیر و برکت اس دنیا کی زندگی میں بھی نہیں ہوتی لیکن آیت کا تعلق آخرت ہی کے نتائج و ثمرات سے ہے۔

سود کی بے برکتی کا باعث

'کفّار' کے معنی یہاں ناشکرے کے ہیں اور 'اثیم' کے معنی، جیسا کہ ہم دوسری جگہ وضاحت کر چکے ہیں، دوسروں کے حقوق تلف کرنے والے کے ہیں۔ یہ ٹکڑا اس بات کی وضاحت کر رہا ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ سود خور کے سرمایہ کو مٹائے گا۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ناشکرا اور اللہ کے بندوں کے حقوق تلف کرنے والا ہے اور اللہ ان لوگوں کو کبھی دوست نہیں رکھ سکتا جو اس کی ناشکری کرنے والے اور اس کی مخلوق کے حقوق تباہ کرنے والے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی ضرورت سے زیادہ مال دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ خدا کا شکر گزار بندہ بنے اور جس طرح اللہ نے اس کے اوپر احسان فرمایا ہے اسی طرح وہ دوسروں پر احسان کرے لیکن جب وہ مال کو پا کر اس مال ہی کی بندگی میں لگ جاتا ہے اور دوسروں کے لیے سہارا بنانے کے بجائے اس کو ان کا خون چوسنے اور ان کے حقوق تلف کرنے کا ذریعہ بنا لیتا ہے تو ایسا قسی القلب اور ناشکرا اسی بات کا سزاوار ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی دولت صرف موجبِ وبال و خسران ہو، اور محرومی کے سوا اس کے پلے کچھ نہ پڑے۔

اس کے بعد اہلِ ایمان کے عظیم اجر و ثواب کا ذکر فرمایا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اشارہ ان اہلِ ایمان کی طرف ہے جن کے صدقات میں برکت کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔ اس آیت کے تمام اجزاء کی تشریح مختلف مقامات میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۲۷۸)

سودی کاروبار پر آخری ضرب

اس آیت میں اہل ایمان کو براہ راست خطاب کر کے اللہ سے ڈرتے رہنے اور سود کا جو حصہ قرضداروں کے ذمہ ابھی باقی تھا اس سے بالکل دستبردار ہو جانے کی ہدایت فرمائی اور اس کو ایمان کا لازمی تقاضا ٹھہرایا۔ اس سے پہلے سود سے متعلق جو آیات نازل ہوئی تھیں ان کی نوعیت نصیحت و موعظت کی تھی اور ان کی بنیاد اس امر پر تھی کہ آسمانی مذاہب اور دنیا کے معروف میں اس کی حیثیت ہمیشہ سے ایک حرام یا کم از کم ایک مکروہ شے کی رہی ہے۔ اہل عرب اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے مکی دور ہی سے اس کا ظلم ہونا واضح کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اسی پہلو سے اس کا ذکر سورۂ روم میں بھی ہوا ہے اور وہ ایک مکی سورہ ہے لیکن چونکہ اس کی نوعیت ایک وسیع معاشی فساد کی تھی جس کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہیں تھی کہ ملک کا پورا نظام عملاً اسلام کے زیر اقتدار ہو اس وجہ سے اس پر آخری ضرب حجۃ الوداع کے موقع پر لگائی گئی۔ یہ آیتیں اسی موقع پر نازل ہوئیں اور مضمون کی مناسبت کی وجہ سے ان کو ترتیب میں یہاں جگہ دی گئی۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲۷۹)

سود خواروں کو الٹی میٹم

اس کی نوعیت بالکل الٹی میٹم کی ہے یعنی اب جو لوگ اس حکم کو نہ مانیں گے وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جائیں۔ سود کے متعلق جو لب و لہجہ ان آیات کا ہے بعینہ یہی لہجہ سود سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع میں معلوم ہوتا ہے جس سے ان آیات کے زمانہ نزول کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس آیت سے صریح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی نظام میں سودی کاروبار کرنے والوں کی حیثیت باغیوں اور مفسدوں کی ہے جن کی سرکوبی کے لیے عندالضرورت فوجی کارروائی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

اس الٹی میٹم کے بعد سودی کاروبار رکھنے والوں کو صرف اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنی اصل رقمیں قرض داروں سے واپس لے سکتے ہیں، نہ وہ اس میں کسی چال سے سود کی کوئی رقم جوڑ کر قرض دار کی حق تلفی کی راہ ڈھونڈھیں اور نہ قرض داروں کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ اس اصلاح سے فائدہ اٹھا کر مہاجنوں کی اصل رقمیں بھی دبا بیٹھنے کی کوشش کریں۔ یہ تنبیہ اس لیے ضروری ہوئی کہ جب کوئی اہم معاشرتی اور معاشی اصلاح عمل میں آتی ہے تو اس سے متاثر ہونے والے طبقات میں بڑی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ جن کو اس اصلاح سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے وہ ایسی تدبیریں اور ایسے حیلے اختیار کرتے ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو نقصان سے بچا لے جائیں اور جنھیں فائدہ پہنچنے کی توقع ہوتی ہے وہ فائدہ کی اسی مقدار پر قناعت نہیں کرنا چاہتے جو انھیں قانون پہنچا رہا ہے بلکہ وہ قانون کی حدود سے آگے بڑھ کر ہاتھ مارنا چاہتے ہیں۔ اس افراتفری اور کشاکش کو روکنے کے لیے قرآن نے اوّل تو اس کے لیے

بہت پہلے سے، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، ذہنوں کو تیار کیا، پھر جب آخری حکم دیا تو اس کے ساتھ یہ ہدایت فرمادی کہ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ اسی ہدایت کی یہ برکت تھی کہ عرب میں یہ عظیم معاشی اصلاح بغیر کسی طبقاتی کش مکش کے عمل میں آگئی۔ نہ مہاجنوں پر کوئی آفت آئی نہ قرضداروں کو کوئی گزند پہنچا بلکہ دونوں اس اصلاح کی برکت سے یکساں طور پر مستفید ہوئے۔ اگر بات کے اپنے حدود سے آگے بڑھ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو یہاں ہم دکھاتے کہ دنیا میں دوسری قوموں کو اس قسم کی اصلاحات کے لیے کیا کیا قیمتیں دینا پڑی ہیں۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲۸۰-۲۸۱)

اوپر مہاجنوں کو یہ اجازت جو دی ہے کہ وہ اپنی اصل رقم قرضداروں سے واپس لے سکتے ہیں، اس کے ساتھ ان کو یہ ہدایت دی کہ اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کو ہاتھ کشادہ ہونے تک مہلت دو، اور اگر ایسی حالت میں اپنی اصل رقم بھی معاف کر دو تو یہ بہت بہتر ہے، اس کا اجر و ثواب بے پایاں ہے۔

حامیانِ سود کا ایک دعویٰ اور اس کا جواب

اس زمانے میں بعض حامیانِ سود یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں زمانہ نزولِ قرآن سے پہلے جو سود رائج تھا یہ صرف مہاجنی سود تھا۔ غریب اور نادار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اور یہ مہاجن ان مظلوموں سے بھاری بھاری سود وصول کرتے تھے۔ اسی سود کو قرآن نے ربٰو قرار دیا ہے اور اسی کو یہاں حرام ٹھہرایا ہے۔ رہے یہ تجارتی کاروباری قرضے جن کا اس زمانے میں رواج ہے تو ان کا اس زمانے میں نہ دستور تھا نہ ان کی حرمت و کراہت سے قرآن نے کوئی بحث کی ہے۔

عرب میں تجارتی قرضوں پر سود لینے کا بھی رواج تھا

ان لوگوں کا نہایت واضح جواب خود اس آیت کے اندر ہی موجود ہے۔ جب قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ اگر قرض دار تنگ دست (ذُوْ عُسْرَۃ) ہو تو اس کو کشادگی (میسرۃ) حاصل ہونے تک مہلت دو تو اس آیت نے گویا پکار کر یہ خبر دے دی کہ اس زمانے میں قرض لینے والے امیر اور مال دار لوگ بھی ہوتے تھے۔ بلکہ یہاں اگر اسلوبِ بیان کا صحیح صحیح حق ادا کیجیے تو یہ بات نکلتی ہے کہ قرض لین دین کی معاملت زیادہ تر مال داروں ہی میں ہوتی تھی۔ البتہ امکان اس کا بھی تھا کہ کوئی قرض دار تنگ حالی میں مبتلا ہو گا اس کے لیے مہاجن کی اصل رقم کی واپسی بھی ناممکن ہو رہی ہو تو اس کے متعلق یہ ہدایت ہوئی کہ مہاجن اس کو اس کی مالی حالت سنبھلنے تک مہلت دے اور اگر اصل بھی معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ اس معنی کا اشارہ آیت کے الفاظ سے نکلتا ہے اس لیے کہ فرمایا ہے کہ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (اگر قرض دار تنگ حال ہو تو اس کو کشادگی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے)۔ عربی زبان میں 'اِنْ' کا استعمال عام اور عادی حالات کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بالعموم نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔ عام حالات کے بیان کے لیے عربی میں 'اذا' ہے۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو آیت کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر قرض دار ذو میسرۃ (خوش حال) ہوتے تھے لیکن گاہ گاہ ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی

کہ قرضدار غریب ہو یا قرض لینے کے بعد غریب ہو گیا ہو تو اس کے ساتھ اس رعایت کی ہدایت فرمائی۔

یوں تو اس تفسیر میں جو کچھ بھی میں لکھ رہا ہوں سب استاذ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا فیض ہے لیکن خاص اس آیت سے متعلق ان کے اپنے الفاظ بھی مجھے مل گئے ہیں جو کم از کم آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ان کے قلم سے نکلے ہیں جب سود کے مسئلہ میں معترضین کی یہ موشگافیاں نہیں پیدا ہوئی تھیں جو اب پیدا ہو گئی ہیں۔ اس وقت مولیناؒ نے بالکل غیر جانبدارانہ ذہن کے ساتھ، مجرد قرآن کے الفاظ سے جو رائے اس مسئلہ پر قائم فرمائی تھی وہ یہ ہے۔

"وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ" يعلم من هذه الكلمات انهم كانوا ياخذون الربوٰ من ذى ميسرة والقريش كانت تجارا واصحاب الربوٰ فلا ارى فرقا بين حالهم وحال ابناء زماننا فى الربوٰ والله اعلم بالصواب۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ الاٰية کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اہل عرب خوش حالوں سے بھی سود لیتے تھے۔ پھر قریش تاجر لوگ تھے اور سودی بیوپار ان میں رائج تھا۔ اس وجہ سے اس معاملے میں ان کے اور ہمارے حالات کے درمیان کوئی خاص فرق مجھے درباب سود نظر نہیں آتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ظاہر ہے کہ مالدار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی کے لیے مہاجنوں کی طرف رجوع نہیں کرتے رہے ہوں گے بلکہ وہ اپنے تجارتی مقاصد ہی کے لیے قرض لیتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے قرض اور اس زمانے کے ان قرضوں میں جو تجارتی اور کاروباری مقاصد سے لیے جاتے ہیں کیا فرق ہوا؟

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ
كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ
وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ
لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ
لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۤءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ
اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۤءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا
اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً
حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۖ وَلَا
يُضَاۤرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ
بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ (۲۸۲)

'املاء' اور 'املال' کا مفہوم

اس آیت میں کوئی خاص لفظی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ لفظ املال کے معنی وہی ہیں جو املاء کے ہیں، یعنی لکھوانے کے۔ قرآن نے ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور بعینہٖ ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ میں نے ان دونوں کے مادے اور مشتقات پر جہاں تک غور کیا ہے اس سے میرا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ لکھوانے کے معنی میں اصل لفظ تو 'املاء' ہی کا ہے لیکن صوتی مشابہت کی وجہ سے 'املال' بھی اس معنی میں استعمال ہونے لگا ورنہ بجائے خود املال کے مادے میں لکھنے یا لکھانے کے مضمون کے لیے کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ صوتی مشابہت کی بنا پر ایک مادے سے دوسرے مادے کی طرف الفاظ کے منتقل ہو جانے کی عربی زبان میں بکثرت مثالیں موجود ہیں لیکن اس قسم کی تفصیلات میں ہمارے لیے زیادہ گھسنے کی گنجائش نہیں ہے۔

'فسوق بکم' کا مفہوم

آیت کے آخر میں لفظ 'فسوق' کے ساتھ جو 'بکم' کا لفظ آیا ہے اس میں 'ب' کا تعلق 'فسوق' کے ساتھ بعض لوگوں کو بیگانہ سا محسوس ہوگا۔ ایسے لوگوں کو عربی زبان کا یہ اسلوب یاد رکھنا چاہیے کہ جب صلہ اور اس کے متعلق میں بیگانگی ہو تو وہاں کوئی ایسا لفظ محذوف مان لیتے ہیں جو اس صلہ سے موافقت رکھنے والا ہو۔ یہاں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'فسوق' کے بعد کوئی لفظ لازم ہو جانے اور چپک جانے کے مفہوم کا محذوف ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم نے فلاں بات کی تو یہ تمھاری طرف سے ایسے فسق کا ارتکاب ہوگا جو تمھارے ساتھ چپک کے رہ جائے گا، اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔

قرض لینے والوں اور دینے والوں کو نقصان اور نزاع سے بچانے کے لیے ہدایات

یہاں سودی قرضوں کے سلسلے کو یک قلم ختم کرنے کے بعد قرض دینے والوں اور قرض داروں دونوں کو نزاع اور نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل ہدایات دی ہیں:۔

(ا) جب کوئی قرض لین دین ایک خاص مدت تک کے لیے ہو تو اس کی دستاویز لکھ لی جائے۔

(ب) یہ دستاویز دونوں پارٹیوں کی موجودگی میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے، اس میں کوئی دخل فصل نہ کرے اور جس کو لکھنے کا سلیقہ ہو اس کو چاہیے کہ وہ اس خدمت سے انکار نہ کرے۔ لکھنے کا سلیقہ اللہ کی ایک نعمت ہے، اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ آدمی ضرورت پڑنے پر لوگوں کے کام آئے۔ اس نصیحت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس زمانے میں لکھے پڑھے لوگ کم تھے۔ دستاویزوں کی تحریر اور ان کی رجسٹری کا سرکاری اہتمام اس وقت تک نہ عمل میں آیا تھا اور نہ اس کا عمل میں آنا ایسا آسان تھا۔

(ج) دستاویز کے لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہوگی۔ وہ دستاویز میں اعتراف کرے گا کہ میں فلاں بن فلاں کا اتنے کا قرضدار ہوں اور لکھنے والے کی طرح اس پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اس اعتراف میں تقویٰ کو ملحوظ رکھے اور ہرگز صاحبِ حق کے حق میں کسی قسم کی کمی کرنے کی کوشش نہ کرے۔

(د) اگر یہ شخص کم عقل ہو یا ضعیف ہو یا دستاویز وغیرہ لکھنے لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی یا وکیل ہو وہ اس کا قائم مقام ہو کر انصاف اور سچائی کے ساتھ دستاویز لکھوائے۔

(ھ) اس پر دو مردوں کی گواہی ثبت ہوگی جن کے متعلق ایک ہدایت یہ ہے کہ وہ مِنْ رِّجَالِكُمْ یعنی اپنے مردوں میں سے ہوں۔ جس سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمان ہوں، دوسری یہ کہ وہ اپنے میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے ہوں کہ فریقین ان کو جانتے پہچانتے ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ یعنی پسندیدہ اخلاق و عمل کے ثقہ، معتبر اور ایماندار ہوں۔

(و) اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسّر نہ آسکیں تو اس کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اس لیے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہوگا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اس کا سدِّباب ہوسکے گا۔ یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں ہے بلکہ اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اس کے لیے ایک بھاری ذمہ داری ہے اس وجہ سے شریعت نے اس کے اٹھانے میں اس کے لیے سہارے کا بھی انتظام فرمادیا ہے۔ یہ موضوع اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ سورہ نساء میں زیرِ بحث آئے گا۔

(ز) جو لوگ کسی دستاویز کے گواہوں میں شامل ہوچکے ہوں، عند الطلب ان کو گواہی سے گریز کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ حق کی شہادت ایک عظیم معاشرتی خدمت بھی ہے اور شہداء اللہ ہونے کے پہلو سے اس اُمّت کے فریضۂ منصبی کا ایک جزو بھی۔

(ح) قرض لین دین کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اگر وہ کسی مدّت کے لیے ہے، دست گرداں نوعیت کا نہیں ہے، تو اس کو قیدِ تحریر میں لانے سے گرانی نہیں محسوس کرنی چاہیئے۔ جو لوگ اس کو زحمت سمجھ کر ٹال جاتے ہیں وہ سہل انگاری کی وجہ سے بسا اوقات ایسے جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں۔ جن کے نتائج بڑے دور رس نکلتے ہیں۔

(ط) مذکورہ بالا ہدایات اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق و عدالت سے قریں، گواہی کو درست رکھنے والی اور شک و نزاع سے بچانے والی ہیں اس لیے معاشرتی صلاح و فلاح کے لیے ان کا اہتمام ضروری ہے۔

(ی) دست گرداں لین دین کے لیے تحریر و کتابت کی پابندی نہیں ہے۔

(ک) ہاں اگر کوئی اہمیت رکھنے والی خرید و فروخت ہوئی ہے تو اس پر گواہ بنا لینا چاہیئے تاکہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اس کا تصفیہ ہوسکے۔

(ل) نزاع پیدا ہوجانے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لیے جائز نہیں ہے۔ کاتب اور گواہ ایک اہم اجتماعی و تمدنی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو بلا وجہ نقصان پہنچانے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ثقہ اور محتاط لوگ گواہی اور تحریر وغیرہ کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں گے اور لوگوں کو پیشہ ور گواہوں کے سوا کوئی معقول گواہ ملنا مشکل ہوجائے گا۔ اس زمانے میں ثقہ اور سنجیدہ لوگ گواہی وغیرہ کی ذمہ داریوں سے جو بھاگتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے

کہ کوئی معاملہ نزاعی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس کے گواہوں کی شامت آجاتی ہے۔ یہ بے چارے ہتک، اغوا اور نقصانِ مال و جائداد بلکہ قتل تک کی تعدیوں کے نشانہ بن جاتے ہیں۔ قرآن نے اس قسم کی شرارتوں سے روکا کہ جو لوگ اس قسم کی حرکتیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ یہ کوئی چھوٹی موٹی نافرمانی نہیں ہے جو آسانی سے معاف ہو جائے گی بلکہ یہ ایک ایسا فسق ہے جو ان کے ساتھ چمٹ کے رہ جائے گا اور اس کے بُرے نتائج سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ یہ اس شہادت کی بنیاد کو ڈھانے کی کوشش ہے جو اس اُمت کی بعثت کی اصل غایت ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا نافرمانیوں پر فوراً نہیں پکڑا کرتا لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس سے چھوٹ نہیں سکتا۔ پھر فرمایا کہ "اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے" جس میں سر تا سر تمھارا اپنا ہی نفع ہے اور وہی ہے جو ساری باتوں سے واقف ہے اس وجہ سے اسی کو تعلیم و ہدایت دینے کا حق پہنچتا ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (۲۸۳)

'رہانِ مقبوضۃ' کا مفہوم

'رہان' 'رہن' کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ شے ہے جو قرض دینے والے کے قرض کی ضمانت کے طور پر اس کے قبضے میں کرا دی جائے۔ 'فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ' بالکل اسی طرح کا جملہ ہے جس طرح سورۂ یوسف میں 'فَصَبْرٌ جَمِيلٌ' ہے۔ اس کو مبتدا مان کر اس کی خبر کو محذوف بھی قرار دے سکتے ہیں اور اس کو خبر مان کر اس کے مبتدا کو محذوف بھی مان سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر لکھا پڑھی اور گواہی شہادت کی صورت مفقود ہو تو کوئی چیز بطور رہن قبضے میں کرا کے بھی قرض کی معاملت کی جا سکتی ہے۔

"امن فلان فلانا" کے معنی یہ ہیں کہ فلاں شخص اپنے آپ کو فلاں کی طرف سے خطرے سے محفوظ سمجھتا ہے، اس کی طرف سے مامون ہے، اس پر اعتماد کرتا ہے۔

'اٰثِم' قلبہ' کی حقیقت

'آثِمٌ قَلْبُهُ' (اس کا دل آلودۂ گناہ ہے) اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر انسان کے محض ظاہری اعضا ہی تک محدود رہتا ہے، اس کی نوعیت بس اوپری گرد و غبار کی ہوتی ہے، مثلاً لغو قسمیں جو بے مقصد کھائی جاتی ہیں۔ اس طرح کے گناہ یا تو انسان کی روزمرہ کی معمولی نیکیوں سے آپ سے آپ جھڑ جاتے ہیں یا معمولی توجہ سے ان کی اصلاح ہو جایا کرتی ہے۔ دوسرے گناہ وہ ہوتے ہیں جن کی تحریک دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہے۔ ایسے گناہوں کے اثرات بھی دل تک متعدی ہوتے ہیں۔ گناہ کی یہ قسم خطرناک ہے، یہ دل کے فساد کی غمازی کرتی ہے۔ اگر اس سے احتیاط نہ کی جائے یا صادر ہو جانے کے بعد فوراً اس کی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے تو اس کے جڑ پکڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اوپر ہم احاطہ کرنے والے گناہ اور چمٹ جانے والے فسق پر گفتگو کر چکے ہیں اس کو نگاہ میں رکھیے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ شہادت

کو چھپانا اسی نوعیت کا گناہ ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ شہادت علی الناس اس امت کا وہ اصل فریضہ منصبی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو مامور فرمایا ہے اس وجہ سے اس سلسلے کی ہر کوتاہی بڑے دوررس نتائج کی حامل ہے۔

رہن کے احکام

اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر حالتِ سفر میں قرض لین دین کی ضرورت پیش آن پڑے اور تحریر و شہادت کا اہتمام ممکن نہ ہو اور قرض دینے والا بغیر کسی ضمانت کے قرض دینے پر آمادہ نہ ہو تو یہ شکل بھی اختیار کی جا سکتی ہے کہ کوئی چیز بطور رہن اس کے قبضے میں کرا دی جائے۔ لیکن یہ شکل صرف اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک قرض دینے والے کے لیے اطمینان و اعتماد کی صورت نہیں پیدا ہو جاتی۔ جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک دوسرے پر اعتماد کے لیے جو باتیں مطلوب ہیں وہ فراہم ہو جائیں، مثلاً سفر ختم کر کے حضر میں آ گئے، دستاویز کی تحریر کے لیے کاتب اور گواہ مل گئے، انہوں کی موجودگی میں قرض معاملت کی تصدیق ہو گئی اور اس امر کے لیے کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہ گئی کہ قرض دینے والا رہن کے بغیر اعتماد نہ کر سکے تو پھر اس کو چاہیئے کہ وہ رہن کردہ چیز اس کو واپس کر دے اور اپنے اطمینان کے لیے چاہے تو وہ شکل اختیار کرے جس کی اوپر ہدایت کی گئی ہے۔ یہاں رہن کردہ مال کو امانت سے تعبیر فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرض دینے والے کے پاس رہن بطور امانت ہوتا ہے جس کی حفاظت ضروری اور جس سے کسی قسم کا انتفاع ناجائز ہے۔

مجاہدؒ اور ضحاکؒ کے متعلق تفسیروں میں منقول ہے کہ یہ حضرات رہن کو سفر کے ساتھ مخصوص مانتے تھے۔ مجھے ان کی یہ رائے قوی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جب اعتماد کرنے کے لیے وجوہ و اسباب موجود ہوں تو رہن پر قبضہ جمائے رکھنے کے لیے کوئی وجہ باقی نہیں رہی یہ امانت، امانت رکھنے والوں کو لوٹا دینی چاہیئے۔ بالخصوص جب معاملہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو تب تو یہ چیز نہ صرف اسلامی اخوت و مروت کے خلاف ہے بلکہ یہ ایک قسم کی دناءت بھی ہے۔ جب ایک شخص دستاویز اور گواہی کی ضمانتیں حاصل کر سکتا ہے تو یہ بات نہایت بھونڈی ہے کہ وہ اپنے قرض کی ضمانت میں قرض دار کا مکان، یا اس کا کھیت، یا اس کا باغ، یا اس کا گھوڑا، یا اس کی بکری یا اس کے بیوی بچوں کے پہننے کے زیور اور کپڑے اپنے قبضہ میں رکھے۔

رہن سے متعلق حدیث کی توجیہ

ہمیں اس روایت سے انکار نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس کچھ جَو کے بدلے رہن رکھی۔ لیکن اس سے جو بات زیادہ سے زیادہ نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کو کسی شدید مجبوری کے سبب سے کسی بنیے یا یہودی سے قرض لینے کی نوبت آ جائے اور وہ رہن کے سوا کسی اور صورت پر معاملہ کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ اور بہت کھینچ تان کی جائے تو اس سے یہ بات بھی نکالی جا سکتی ہے کہ کسی تنگ دل مسلمان سے بھی بدرجۂ

مجبوری اس طرح معاملہ کیا جا سکتا ہے لیکن عام مسلمانوں کے لیے جب باہمی معاملت کی ایک واضح اقابل اعتماد اور اسلامی اخوت و مروّت کے تقاضوں کے مطابق ایک شکل بیان کر دی گئی ہے تو اس کے ہوتے ہوئے کس طرح اس کو پسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ بلا کسی مجبوری کے بھی وہ رہن پر قرض لین دین کریں۔ یہ بات قرآن کی اس آیت کے تو بالکل خلاف ہے، رہی حدیث تو اس سے بھی رہن کے عام جواز پر استدلال کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ ایک تو یہ معاملہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک یہودی کے ساتھ ہوا۔ دوسرے صورت واقعہ صاف گواہی دے رہی ہے کہ یہ بہت مجبوری کی صورت میں ہوا۔

زیر بحث آیت میں مفسرین نے عام طور پر امانت سے وہ قرض مراد لیا ہے جو کوئی شخص کسی کو بغیر رہن کے مجرد اعتماد پر دے دے۔ لیکن قرض کے لیے امانت کی تعبیر گوناگون پہلوؤں سے ہمارے نزدیک غلط ہے۔ اصل میں یہ حضرات چونکہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ سفر ختم ہو جانے کے بعد جب اعتماد و اطمینان کی شکل پیدا ہو جائے تو رہن واپس کر دینا چاہیئے اس وجہ سے انہیں امانت کی تاویل میں یہ تکلف کرنا پڑا لیکن ہم نے جو تاویل کی ہے اس میں آیت و حدیث دونوں کا محل الگ الگ معیّن ہو گیا ہے اس وجہ سے نہ اس تکلف میں پڑنے کی ضرورت باقی رہی اور نہ اس کی تردید میں دلائل جمع کرنے کی ضرورت باقی رہی۔

۸۸۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۸۴-۲۸۶

اب یہ عظیم سورہ ختم ہو گئی۔ آگے کی آیات بطور خاتمہ ہیں۔ اس خاتمہ میں پہلے تو تنبیہ ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت اور اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ بندوں کے تمام ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ وہ ہر چیز کا حساب کرے گا اور اپنے اختیارِ مطلق سے جس کو مغفرت کا سزاوار قرار دے گا اس کی مغفرت فرمائے گا اور جس کو سزا کا مستحق پائے گا اس کو سزا دے گا، کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے ارادے اور فیصلے میں مداخلت کر سکے۔

دین کی یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کا صحیح شعور اس امانت کا اہل بناتا ہے جو اس سورہ میں امتِ مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو فراموش کر دینے کے سبب سے یہود اور نصاریٰ اس امانت کی سعادتوں سے محروم ہوئے۔ اس اہمیت کی وجہ سے جس طرح جگہ جگہ اس سورت میں اس کی یاددہانی کی گئی ہے اسی طرح خاتمہ پر بھی اس کی یاددہانی فرمائی۔

اس کے بعد فرمایا کہ اللہ کے رسول اور اس کے ایمان لانے والے بندوں نے اس چیز کو قبول کر لیا ہے جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔ یہی اس پر ایمان لانے کے سزاوار تھے۔ یہ یہود و نصاریٰ کی طرح خدا کے نبیوں اور رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں مبتلا نہ تھے کہ کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں اس وجہ سے اللہ نے ان کے لیے ہدایت کی راہ کھولی اور وہ فائز المرام ہوئے۔ رہے وہ لوگ جو تعصبات کے پھندوں

میں گرفتار ہیں تو اللہ کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ وہ جس وادی میں چاہیں بھٹکتے پھریں۔ اپنا انجام خود دیکھیں گے۔

اس کے بعد وہ عظیم دعا نمودار ہوتی ہے جو اس امّت کے ہر فرد کی صدائے حال ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے اس بھاری ذمہ داری کا احساس بھی ٹپک رہا ہے جو اس امت پر ڈالی گئی ہے، وہ اعتراف بھی نمایاں ہو رہا ہے جو روحِ ایمان ہے، ان باتوں سے بچائے جانے کی التجا بھی جھلک رہی ہے جو پچھلی امتوں کے لیے ٹھوکر کا باعث ہوئیں اور ادائے فرض کی راہ میں جن مشکلات کے اندیشے ہیں ان میں استعانت اور جن لغزشوں کے خطرے ہیں ان سے درگزر کی درخواست بھی ہے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸۴-۲۸۶

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ
اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ
يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾
اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ
مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ
اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا
كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ
اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ
وَاعْفُ عَنَّا ٙ وَاغْفِرْ لَنَا ٙ وَارْحَمْنَا ٙ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٨٦﴾

ترجمۂ آیات ۲۸۴-۲۸۶

جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔ جو کچھ تمہارے دلوں

میں ہے اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، خدا اس کا تم سے حساب لے گا، پھر جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۸۴

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان لائے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ان کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔ اے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلبگار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ہر ایک پائے گا جو کمائے گا اور بھرے گا جو کرے گا۔ اے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہم سے مواخذہ نہ فرمانا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ لاد جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف کر، ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما، تو ہمارا مولیٰ ہے، پس کافروں کے مقابل میں ہماری مدد کر۔ ۲۸۵-۲۸۶

۸۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۸۴)

"جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے"۔ یہ جملہ اپنے اندر بیک وقت تین مفہوم رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر چیز خدا ہی کی ملکیت ہے، دوسرا یہ کہ ہر چیز اسی کے اختیار و تصرف میں ہے، تیسرا یہ کہ بالآخر ہر چیز کا مرجع خدا ہی ہے۔ اردو میں کوئی ایسا ترجمہ اس کا جو ان تینوں مفہوموں کو بیک وقت اٹھا لے میری سمجھ میں نہیں آیا۔

دل کی پوشیدہ باتوں کے محاسبے کا مفہوم

اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ دل کی پوشیدہ باتوں کا محاسبہ کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ دل میں جو خیالات اور وسوسے گزرتے رہتے ہیں ان کا بھی محاسبہ ہوگا بلکہ اس سے صرف وہ عزائم مراد ہیں جو مضبوط ارادے کے ساتھ دل میں موجود ہیں لیکن کسی مجبوری یا مزاحمت کے سبب سے وہ ظاہر نہ ہو سکے یا عمل میں نہ آسکے۔ مثلاً ایک شخص اگر کسی کے قتل کا دل میں پختہ ارادہ رکھتا ہے تو ہر چند کسی خوف یا مجبوری کے سبب سے اس کا ارادہ بروئے کار نہ آسکے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس ارادے پر اس کی پکڑ ہوگی۔

خدا کی مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ الاية۔ اور اس طرح کی دوسری آیات میں، جیسا کہ ہم بار بار اپنی اس کتاب میں واضح کر چکے ہیں، اصل زور جس بات پر ہوتا ہے وہ اس پر ہوتا ہے کہ خدا کی مشیت میں کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں ہے اور مقصود اس سے شرک کی نفی ہوتی ہے۔ یہ مقصد نہیں ہوتا ہے کہ خدا کی اس مشیت کے لیے سرے سے کوئی ضابطہ و قاعدہ ہی نہیں ہے۔ خدا کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے، چنانچہ یہ مغفرت اور عذاب کا معاملہ بھی اسی ضابطۂ حکمت کے تحت عمل میں آئے گا جو اس کے لیے اس نے مقرر فرما رکھا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی اور کے لیے اس میں کسی مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔

آیت ۲۸۴ کا دو گونہ ربط

اس پوری آیت کے موقع و محل پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک پہلو سے تو اپنے ماسبق سے مربوط ہے اور دوسرے پہلو سے یہ سورہ کے خاتمہ کی نہایت جامع اور مؤثر تمہید ہے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا تھا کہ "شہادت کو نہ چھپاؤ، جو شہادت کو چھپاتا ہے اس کا دل آلودۂ معصیت ہو جاتا ہے۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔" اب اس کے ساتھ اگر یہ مضمون لگا دیجیے کہ "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، اللہ تمہارے ظاہر و باطن سب کا محاسبہ کرنے والا ہے، پھر جس کو چاہے گا وہ بخشے گا اور جس کو چاہے گا، عذاب دے گا۔" تو گویا بات پوری طرح مدلل بھی ہو گئی اور مکمل بھی۔ یہ آیت کا ربط ماسبق سے ہوا۔

آگے سے اس کا ربط، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ ہے کہ یہ توحید کی آیت ہے۔ احکام و قوانین کے باب میں جس طرح نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اسی طرح عقائد کے باب میں توحید کو اساسِ دین کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ یاد ہوگا کہ جہاں سے اس سورہ میں امت کے لیے تعلیمِ شریعت کا باب شروع ہوا ہے وہاں سب سے پہلے توحید کا بیان ہوا ہے اس کے بعد نماز کا۔ اب خاتمے پر امت کو کامل حوالگی اور سپردگی کی تعلیم دینے کے لیے توحید کی پھر یاد دہانی کی اور یاد دہانی کا انداز تعلیم سے زیادہ تنبیہ کا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ امت اس امانت کی گراں باریوں کو سمجھے اور غلط سہاروں پر اعتماد کرنے کے بجائے صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے آگے جوابدہی کے لیے تیار رہے۔

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ ۚ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ (٢٨٥)

ایمان نہ لانے والوں سے بے پروائی

یہاں رسول اور مسلمانوں کے ایمان کی خبر دینے سے مقصود محض ایک واقعے کی خبر دینا نہیں ہے بلکہ قرآن کے مخالفین بالخصوص یہود کی مخالفت سے بے پروائی کا اظہار ہے۔ سورہ کا آغاز، یاد ہوگا، اس بات سے ہوا تھا کہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے میں تو کسی شبے کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس پر ایمان وہی لوگ لائیں گے جن کے اندر خدا ترسی، حقیقت بینی اور حق طلبی ہوگی۔ جو لوگ گروہ پرستی، عصبیت اور اپنی برتری کے زعم میں مبتلا ہوں گے وہ اس کتاب پر ایمان لانے سے محروم رہیں گے۔ اب یہاں خاتمے پر یہ اعلان فرما دیا کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے واضح کر دیا کہ اس ایمان کی سعادت سے بہرہ مند ہونے والے کون لوگ تھے۔ گویا دودھ کے اندر جتنا مکھن تھا وہ نکال کر سامنے رکھ دیا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر دیا کہ اس دودھ کے اندر یہ مکھن تھا جو نکل آیا ہے۔ اب جو بچ رہا ہے یہ چھاچھ ہے خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

قانون کی فرمانبرداری کے معاملے میں نبی اور امتی یکساں ہیں

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ کتابِ الٰہی پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے جس کا ذکر ہوا ہے وہ خود رسول کی ذات ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں قانون کی فرمانبرداری اور اطاعت کے معاملے میں پیغمبرؐ بھی اسی سطح پر ہے جس پر عام اہلِ ایمان ہیں۔ دنیوی بادشاہ اپنی رعایا کو جو قانون دیتے ہیں وہ خود اس قانون سے بالاتر ہوتے ہیں لیکن خدا کے قانون میں خود اس قانون کا لانے والا نہ صرف یہ کہ اس کے تحت ہوتا ہے بلکہ اسے سب سے آگے بڑھ کر اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اور اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ کہتے ہوئے اس کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالنا پڑتا ہے۔ یہ ان پیغمبروں کی سچائی کی ایک ایسی شہادت ہے جس کو صرف ایک ہٹ دھرم ہی جھٹلا سکتا ہے۔

اجمالی ایمان تمام انبیاء اور تمام صحیفوں پر

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ الاٰیۃ میں جن اجزائے ایمان کا ذکر ہوا ہے ان پر ہم اسی سورہ کی آیت ۱۷۷ کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں اللہ، فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان کی حقیقت سمجھنی چاہیے۔ خاص طور پر فرشتوں پر ایمان کی ضرورت ہم نے وہاں تفصیل سے واضح کی ہے۔ البتہ ایک بات کی طرف یہاں بھی اشارہ ضروری ہے، وہ یہ کہ وہاں کتاب کا لفظ ہے، یہاں کتاب کے بجائے کُتُب کا لفظ ہے جو کتاب کی جمع ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے لیے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اہلِ کتاب صرف اپنی کتاب اور صرف اس نبی یا ان نبیوں پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں جن کو وہ اپنے یا اپنا نبی خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے یہ امتِ اللہ کے تمام نبیوں اور تمام کتابوں پر ایمان رکھتی ہے۔ جہاں تک اجمالی ایمان کا تعلق ہے ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء، قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

البتہ چونکہ دوسرے انبیا اور ان کے صحیفوں کی تعلیم محفوظ نہیں رہی نیز ان صحیفوں اور ان انبیا نے خود خبر دی تھی کہ ان کی شریعت کامل نہیں ہے، کامل شریعت قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دنیا کو ملے گی، اس وجہ سے ہم قرآن اور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف اجمالی نہیں بلکہ تفصیلی ایمان بھی رکھتے ہیں اور اسی تفصیلی ایمان کی دعوت دنیا کو بھی دیتے ہیں۔

اسلوب کی تبدیلی میں بلاغت کا نکتہ

'لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ' اس ٹکڑے کی شرح ہم اسی سورہ کی آیت ۱۳۵ کے تحت امتِ وسط کے کلمہ کی وضاحت کرتے ہوئے کر چکے ہیں۔ البتہ اس میں یکایک اسلوب کی جو تبدیلی ہوئی ہے یعنی بات غائب کے صیغے سے نکل کر جو متکلم کے صیغے میں آگئی ہے، یہ دھیان میں رکھنے کی ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی گئی ہے لیکن یہ جملہ براہ راست امت کی طرف سے اعتراف و اظہار کی شکل میں نمایاں ہوا ہے۔ اس میں بلاغت کا یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اوپر کے ٹکڑے میں مسلمانوں کا جو ایمان و عقیدہ بیان ہوا ہے پوری امت اس کا اقرار و اظہار کرتی ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں گرفتار نہیں ہیں، یہ تمام انبیا ایک ہی سلسلۃ الذہب کی کڑیاں ہیں اس وجہ سے ہم یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو رد کر دیں۔ 'احد' کا لفظ چونکہ جمع کے مفہوم میں آتا ہے۔ جیسے لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ 'بین' کا استعمال صحیح ہے۔

سمع و طاعت کا مفہوم

'وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا' سمع کا لفظ یہاں مجرد سننے کے معنی میں نہیں بلکہ ماننے اور قبول کرنے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ اردو میں بھی سننے کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں سَمِعْنَا کا لفظ دل کی قبولیت کا اظہار کرتا ہے اور 'أَطَعْنَا' کا لفظ عملی اطاعت کا۔ اور ایمان و اسلام کی اصل حقیقت یہی ہے۔ اس میں یہود کے 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' پر ایک لطیف تعریض بھی ہے۔

حذفِ فعل کا ایک فائدہ

'غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ' غفرانک فعل محذوف کا مفعول ہے۔ اس طرح کے مواقع میں فعل کا حذف دعا کرنے والے کے اضطراب کو ظاہر کرتا ہے جو قبولیت دعا کے لیے ایک نہایت موثر سفارش ہے۔

سمع و طاعت کے اقرار کے بعد دعا کا تعلق

سمع و طاعت کے اقرار کے بعد معاً دعا کا زبان پر جاری ہو جانا اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ اقرار ایک عظیم ذمہ داری کا اقرار ہے، یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے، اس میں بڑی بڑی آزمائشیں پیش آتی ہیں اور ہر قدم پر لغزشوں، کوتاہیوں اور ٹھوکروں کے اندیشے ہیں۔ اس حقیقت کے شعور نے سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا کے اقرار کے فوراً بعد طلبِ مغفرت کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس لیے کہ جب راہ بھی کٹھن ہے اور پرسش بھی ہر پوشیدہ اور علانیہ پر ہونی ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے اور عذاب اور رحمت سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے تو اس کی مغفرت کے سہارے کے سوا ہر سہارا بے حقیقت

ہے۔ وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ میں کامل سپردگی ہے، یعنی تیرے سوا کوئی نہیں ہے جو کسی پہلو سے مرجع و ماویٰ بن سکے۔ اس میں ایک لطیف تعریض یہود و نصاریٰ پر بھی ہے کہ وہ اپنے آباو اجداد اور شرکا و شفعا کے اعتماد پر سمع و طاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو بیٹھے۔ لیکن اس امت پر یہ حقیقت واضح ہے کہ سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا، اسی کے آگے پیش ہونا اور اسی کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (٢٨٦)

دعا کے بیچ میں جملہ معترضہ

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا) یہ دعا کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ ہے اور مقصود اس کے لانے سے اس اہم حقیقت کا اظہار ہے کہ سمع و طاعت کی یہ ذمہ داری جو اس امت پر ڈالی گئی ہے، ہے تو ایک بھاری ذمہ داری، لیکن اس کے بھاری ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت کا یہ پہلو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص بس اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اس کو طاقت عطا ہوئی ہے، جو چیز اس کے حدود اختیار و امکان سے باہر ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ شریعت نے خود اپنے احکام و قوانین میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے اور مجبوریوں کی صورت میں اس پہلو سے بندوں کو رخصتیں دی ہیں۔ اس وجہ سے نہ تو اللہ کو یہ پسند ہے کہ بندے اپنے آپ کو کسی تکلیف مالا یطاق میں ڈالیں اور نہ کسی دوسرے ہی کے لیے یہ جائز ہے کہ ان پر کوئی ایسا بوجھ ڈالے جس کو وہ اٹھا نہ سکتے ہوں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں سے سمع و طاعت کا عہد لیتے تو از خود یاد دہانی کر کے ان سے "تا بہ حد استطاعت" کی شرط لگوا دیتے۔ یہ حضورؐ کی طرف سے اسی آیت کی تعمیل تھی۔ اس میں اہل ایمان کے لیے جو تخفیف اور بشارت ہے وہ بالکل واضح ہے بالخصوص اس موقع پر جب ان پر ایک عظیم شریعت کی ذمہ داریاں ڈالی جا رہی ہیں۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اس کو ملے گا جو اس نے کیا اور وہ بھگتے گا جو اس نے کیا) یہ بات چونکہ اسی بات کا ایک پہلو ہے جو اوپر گزری ہے اس وجہ سے اسی کے ساتھ اس کو جوڑ دیا ہے، اس سے الگ نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو نفع یا ضرر جو کچھ بھی پہنچے گا اس کے اپنے عمل ہی سے پہنچے گا، کسی اور شے سے نہیں پہنچے گا۔ جو وہ بوئے گا وہی کاٹے گا اور جو کچھ کرے گا وہی بھرے گا، نہ دوسرے کے نیک اعمال کا کریڈٹ اس کو ملنے والا ہے اور نہ دوسرے کی بدیاں اس کے کھاتے میں پڑنے والی ہیں۔

اور نہ کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نفس پر ذمہ داری اس کی طاقت اور اس کے اختیار کے پیمانے سے ناپ کر ڈالی ہے۔ اس وجہ سے ہر شخص کی کامیابی اور ناکامی اس ذمہ داری کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ۔

خطا اور نسیان کا فرق اور اس دعا کی حکمت

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا، اوپر والا جملہ معترضہ محض اہل ایمان کی تسلی اور ایک مناسب موقع حقیقت کی یاد دہانی کے لیے تھا۔ اب اصل دعا پھر زبان پر جاری ہوگئی۔ اس ٹکڑے میں نسیان اور خطا پر مواخذہ نہ کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ نسیان تو یہ ہے کہ آدمی سمع وطاعت کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے کوئی چیز بھول جائے اور خطا یہ ہے کہ اپنی ناسمجھی سے کسی کام کو غلط طور پر کر بیٹھے۔ اگرچہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہیں لیکن معاف شدہ چیزوں کی معافی کی درخواست بندے کی طرف سے غایت درجہ خشیت کا اظہار ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کے مزید دروازے کھلتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف تھے، پھر بھی آپ استغفار میں زیادہ سے زیادہ مشقت اٹھاتے تھے۔ جب آپ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا، کیا میں یہ نہ چاہوں کہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنوں!

اصر کا مفہوم اور اس دعا کا رمز

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا، اصر کے اصل معنی عہد اور ذمہ داری کے ہیں مثلاً ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۸۱- آل عمران (کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور ان باتوں کے لیے میری ڈالی ہوئی ذمہ داری تم نے اٹھائی) یہیں سے اس کا استعمال ان بھاری اور گراں ذمہ داریوں اور بوجھوں کے لیے ہوا جن کا اٹھانا دشوار ہو۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔ یہود کی شریعت میں اس قسم کے اِصر اور اغلال جن کی تفصیل سورۂ اعراف کی تفسیر میں آئے گی، موجود تھے اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپ اللہ کی شریعت کو ان بوجھل طوق وسلاسل سے آزاد کر کے اس کو فطرت کی اساس پر قائم کریں گے جیسا کہ ارشاد ہے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۱۵۷- اعراف (اور ان کے اوپر سے وہ دور کرے گا وہ بوجھ اور وہ طوق جو ان پر پہلے سے ہیں) یہاں دعا کے ان الفاظ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم پر اس قسم کے بوجھ نہ ڈالے جائیں جس قسم کے بوجھ یہود پر ان کی سرکشی کی وجہ سے ڈالے گئے اور جن کو بالآخر وہ اٹھا نہ سکے۔ دعا کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اس امت کے مزاج اور اس کو ملنے والی شریعت کے مزاج میں کامل موافقت ہے۔

طاقت سے باہر آزمائشوں سے بچنے کی دعا

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ، تحمیل کے معنی کسی پر کوئی بھاری بوجھ لادنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس سمع وطاعت کی راہ میں آگے جو آزمائشیں پیش آنے والی ہیں ان میں کوئی آزمائش ایسی نہ ہو جو ہماری برداشت سے زیادہ ہو اور جو ہمیں تیری وفاداری کے امتحان میں ناکام بنا دے۔ جہاں تک

ابتلا و امتحان کا تعلق ہے وہ تو لازمۂ ایمان و اسلام بلکہ لازمۂ حیات ہے جس سے اس دنیا میں مفر نہیں ہے۔ کھرے کھوٹے میں امتیاز اور بندوں کی صلاحیتوں کے اجاگر ہونے کے لیے اس سے گزرنا ضروری ہے لیکن یہ دعا بندے کو کرتے رہنا چاہیئے کہ کوئی امتحان اس کی طاقت سے زیادہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے امتحان کے معاملے میں اپنی کمزوری و ناتوانی کا اعتراف ہی صحیح رویہ ہے، جو لوگ اپنے اوپر زیادہ اعتماد کر بیٹھتے ہیں وہ اکثر اس امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ احادیث میں مختلف پہلوؤں سے اس کی ممانعت آئی ہے۔

یہاں اوپر والے ٹکڑے اور اس ٹکڑے کے فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اوپر والے ٹکڑے میں تو اس بات کی دعا ہے کہ ہماری شریعت اس قسم کے اصر و اغلال سے پاک رہے جو پچھلی شریعتوں میں موجود ہیں۔ اور اس دوسرے ٹکڑے میں ان خارج از استطاعت آزمائشوں سے محفوظ رکھے جانے کی دعا ہے جو اس شریعت کے حقوق ادا کرنے کی راہ میں پیش آسکتی ہیں۔

'وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا' اس میں اکٹھی تین چیزوں کی درخواست ہے۔ عفو، مغفرت اور رحم۔ عفو کے معنی چشم پوشی کے بھی ہیں اور معاف کر دینے کے بھی۔ یہاں لفظ دوسرے معنی میں ہے۔ غفر کے معنی ڈھانک دینے کے ہیں، رحم کا مفہوم واضح ہے۔ بندے کا سارا اعتماد بس انھی تینوں چیزوں پر ہونا چاہیے۔ رب کریم کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، گناہوں کو ڈھانک دے اور اپنی رحمت سے نوازے۔ آخرت کا سارا سہارا بس یہی تین چیزیں ہیں۔

'اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ' 'مَوْلٰى' کے معنی مرجع کے ہیں جس کی طرف مشکلات میں رجوع کیا جائے۔ یہ آخر میں مخالفین اسلام کے مقابل میں مدد و نصرت کی دعا ہے۔ اس لیے کہ سمع و طاعت کا یہ بارِ گراں امت نے ایسے حالات میں اٹھایا ہے جب کہ دوسرے، جیسا کہ پچھلی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے، اس بار کو نہ صرف اپنے کندھوں سے پھینک چکے تھے بلکہ اس بنا پر مسلمانوں کے جانی دشمن بن گئے تھے کہ انھوں نے ان کے پھینکے ہوئے اس بوجھ کو سنبھال کیوں لیا۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں لکھنے کی اس گنہگار و بے مایہ کو توفیق نصیب ہوئی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰىنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

فہرست مضامین

فہرست مضامین

مقدمہ

تفسیر آیت بسم اللہ

تفسیر سورۃ الفاتحۃ - ۱

تفسیر سورۃ البقرۃ - ۲